حضرات اہلِ بیت سلام اللہ ورضوانہ علیہم کی سیرۃ ومناقب کا معطر تذکرہ
گلدستۂ اہلِ بیت
سلام اللہ ورضوانہ علیہم
مولانا طارق جمیل صاحب دامت برکاتہم العالیہ
www.besturdubooks.net

حضرات اہلِ بیت سلامُ اللہ و رضوانہٗ علیہم کی سیرت و مناقب کا معطر تذکرہ

گلدستۂ اہلِ بیت

سلامُ اللہ و رِضوانُہٗ علیہم

زیرِ نگرانی

حضرت مولانا طارق جمیل صاحب دامت برکاتہم العالیہ

جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ ہیں

نام کتاب: گلدستہ اہل بیت سلام اللہ و رضوانہ علیہم

زیر نگرانی: حضرت مولانا طارق جمیل صاحب دامت برکاتہم

ناشر: جامعۃ الحسنین پاکستان

برائے خط و کتابت: alh.eidgah@gmail.com

سٹاکسٹ: مکتبہ عمرؓ بن الخطاب، ملتان

0301.7574977

www.ubkmultan.com

Email:muaaz5151@gmail.com

فہرست مضامین

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ وَالصَّلَاۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی رَسُوْلِہِ النَّبِیِّ الْأَمِیْنِ وَعَلٰی آلِہٖ وَعِتْرَتِہِ الطَّیِّبِیْنَ الطَّاهِرِیْنَ وَأَصْحَابِہِ الْغُرِّ الْمُحَجَّلِیْنَ وَکُلِّ مَنْ تَبِعَهُمْ بِإِحْسَانٍ إِلٰی یَوْمِ الدِّیْنِ

پیشِ لفظ

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ وَکَفٰی وَسَلَامٌ عَلٰی عِبَادِہِ الَّذِیْنَ اصْطَفٰی

اللہ تبارک وتعالیٰ نے جیسے جناب رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو سارے انبیاء کا سردار بنایا اور ساری انسانیت کا سردار بنایا، اولین وآخرین کی سرداری عطا فرمائی، اسی طرح اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو، آپ کے گھر کو، اور آپ کے خاندان کو سب سے عالی خاندان بنایا، سب سے عالی گھرانہ بنایا، سب سے عالی نسل بنایا۔ آپ ﷺ کا ارشاد ہے: اللہ تعالیٰ نے قبائلِ آدم میں سے عربوں کو چھانٹا، پھر قبائلِ عرب میں سے مُضر کو چھانٹا، پھر قبائلِ مضر میں سے قریش کو چھانٹا، پھر قبائلِ قریش میں سے ہاشم کو چھانٹا اور پھر ہاشم میں سے اللہ تعالیٰ نے میرا انتخاب کیا، میں سب سے عالی نسب ہوں اور سب سے عالی نسل ہوں۔

اللہ تبارک وتعالیٰ نے آپ ﷺ کی نسل کو تمام نسلوں سے اعلیٰ اور افضل بنایا، آپ کے نسب کو سب سے افضل نسب بنایا۔ اسی طرح آپ کی اولاد کو بھی سب سے عالی نسب، سب سے عالی حسب اور سب سے عالی خاندان بنایا۔ اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کی نسل اور آپ کی اولاد پر ہمیں درود پڑھنے کا حکم فرمایا اور اللہ کے نبی نے وہی درود ہمیں نماز میں سکھایا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: لوگوں کا نسب چلتا ہے بیٹوں کے ذریعہ سے اور میرا نسب، میری نسل اور میری اولاد چلے گی جناب حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا سے اور ان کی نسل سے۔ اور فرمایا: قیامت والے دن ہر تعلق اور نسب ختم ہوجائے گا سوائے میرے نسب اور تعلق کے (کہ یہ تعلق ورشتہ آخرت میں بھی قائم رہے گا اور نفع بخش ثابت ہوگا)۔ اور ایک موقع پر یہ بھی فرمایا کہ جس نے میری اولاد پر احسان کیا اور وہ اُس محسن کے احسان کا بدلہ دینے پر قادر نہ ہوسکی، تو اُس احسان کرنے والے کے احسان کا بدلہ بروز قیامت میں خود دوں گا۔

جیسے اللہ کے نبی ﷺ کا ہم پر حق ہے ایسے ہی آپ کی اولاد کا اور ازواج کا ہم پر حق ہے اور آپ کے صحابہؓ کا ہمارے اوپر حق ہے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کی ازواج کو "امہات المومنین" بنایا اور اللہ تعالیٰ نے ان کو اپنے محبوب ﷺ کیلیے پسند فرما کر پھر اپنے نبی سے فرمایا کہ اب آپ ان کے علاوہ کسی اور کو اپنے نکاح میں نہیں لے سکتے، نہ ان کو طلاق دے سکتے ہیں۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کے نبی کی اولاد ہے کہ ان کے بارے میں خود اللہ کے نبی ﷺ نے فرمایا: حسنؓ اور حسینؓ جنت کے نوجوانوں کے سردار ہیں اور میری بیٹی فاطمہؓ جنت کی عورتوں کی سردار ہے۔

آپ ﷺ کی تین بیٹیاں آپ کی زندگی میں ہی اللہ کے پاس پہنچ گئیں، حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کا بعد میں انتقال ہوا۔ ان کو یہ خوشخبری سنائی: ''میری بیٹی فاطمہؓ جنت کی عورتوں کی سردار ہے" اور "حسنؓ وحسینؓ جنت کے نوجوانوں کے سردار ہیں" اور حضرت علیؓ کو خوشخبری سنائی کہ "جنت میں تیرا گھر میرے گھر کے سامنے ہوگا"۔ نیز اللہ کے نبیؐ نے فرمایا: "اپنی اولاد کو میری محبت سکھاؤ، میرے اہلِ بیت کی محبت سکھاؤ، اور قرآن پڑھنا سکھاؤ"۔ اللہ کے نبیؐ کی آل واولاد سے محبت ہمارے ایمان کا حصہ ہے، اس کے بغیر ایمان مکمل نہیں ہوتا، ایسے ہی اللہ کے نبیؐ کے صحابہؓ سے محبت ہمارے ایمان کا حصہ ہے بلکہ ایمان اس سے مکمل ہوتا ہے، اس کے بغیر ایمان کی تکمیل نہیں ہوتی، لیکن آپ ﷺ کی آل واولاد کو اس لحاظ سے خاص اہمیت حاصل ہے کہ حضور اکرم ﷺ کی طرح ان پر بھی مستقلاً درود بھیجنے کا ہمیں حکم دیا گیا، چنانچہ '' اللھم صل علی محمد '' کے بعد '' وعلی آل محمد '' کہہ کر ان حضرات کی مستقل حیثیت کو بیان کیا گیا۔ اور ایک حدیث میں آپ ﷺ کا ارشاد ہے: ''دو چیزیں ایسی چھوڑ کے جا رہا ہوں کہ اگر ان کو تھامے رکھو گے تو کبھی گمراہ نہیں ہوگے: ایک قرآن مجید اور دوسری میرے اہلِ بیت''، تو ان کے تذکروں کو زندہ کرنا حقوقِ واجبہ میں سے ہے مگر افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ امت عملاً اس حدیث کو بھول گئی اور اہلِ بیت سلام اللہ وَ رضوانہ علیہم کے مبارک تذکروں کو فراموش کر بیٹھی۔ اس بُھولے سبق کی یاد دہانی کے لیے امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے درج ذیل اشعار بہت اہمیت کے حامل ہیں:

إِنِّي أُحِبُّ بَنِي النبيِّ المُصطفىٰ ... وأَعُدُّهُ مِن واجبـــــاتِ فرائِضي

إِن كانَ رَفضًا حُبُّ آلِ مُحمَّدٍ ... فَلْيَشهَدِ الثَّقَلانِ أَنِّي رافِضي

''میں بھی مصطفیٰ ﷺ کی اولاد سے محبت کرتا ہوں اور اس کو واجباتِ دین میں سے سمجھتا ہوں، اگر محبتِ اہلِ بیتؓ کا نام رافضیت ہے تو جن وانس گواہ رہیں کہ میں بھی رافضی ہوں۔''

آلُ النَّبِيِّ ذَرِيعَتِي ... وَهُمُو إِلَيْهِ وَسِيلَتِي

أَرْجُو بِهِمْ أُعْطَى غَدًا ... بِيَدِيَ الْيَمِينِ صَحِيفَتِي

''آلِ رسول ﷺ (کی محبت) میرا ذریعۂ نجات ہے، اور وہی حضرات حق تعالیٰ کے حضور میرا وسیلہ ہیں۔ میں امید کرتا ہوں کہ کل قیامت کے دن انہی کے وسیلہ سے میرا نامۂ اعمال مجھے داہنے ہاتھ میں دیا جائے گا''۔

يَا آلَ بَيْتِ رَسُولِ اللهِ حُبُّكُم ... فَرْضٌ مِنَ اللهِ فِي الْقُرْآنِ أَنْزَلَه

يَكْفِيكُم مِنْ عَظِيمِ الْفَخْرِ أَنَّكُم ... مَنْ لَمْ يُصَلِّ عَلَيْكُم لَا صَلَاةَ لَه

''اے اہلِ بیت! تم سے محبت رکھنا اللہ کی طرف سے ہم پر فرض ہے، یہ حکم اُس نے قرآن میں نازل فرمایا ہے۔ تمہارے عظیم المرتبت ہونے کیلیے اتنا کافی ہے کہ جو تم پر درود نہ پڑھے اس کی نماز مکمل نہیں ہوتی۔''

اور خود میری ایک عرصہ سے یہ تمنا تھی کہ حضرات اہلِ بیت کے مناقب اور سیرت کو نیز آگے حضرات حسنینؓ سے جو اولاد چلی اُن کے مناقب اور ان کی سیرت کو تھوڑا تھوڑا بیان کیا جائے تا کہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ ان کے خدام اور ان سے محبت کرنے والوں میں ہمیں اٹھائے اور ہماری بخشش کا سامان بن جائے۔

میری یہ تمنا اُس وقت عزمِ مصمم میں بدل گئی جب مَیں ۲۰۰۶ء میں سید نفیس الحسینی شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں ملاقات کیلیے حاضر ہوا تو مولانا ظفر احمد قاسم صاحب بھی وہاں موجود تھے۔ مَیں اپنے تبلیغی دوستوں کے ساتھ ملنے گیا، اس وقت ان کے کمرے میں مریدین بھی تھے، کمرہ بھرا ہوا تھا۔ شاہ صاحبؒ کچھ شوگر کی زیادتی کی وجہ سے صاحبِ فراش تھے۔ مجھے دیکھا تو بیٹھ گئے، بڑے پیار سے ملے، بٹھایا اور اکرام فرمایا۔ پھر تھوڑی دیر کے بعد مجھ سے فرمایا: آپ کو جو اہلِ بیت سے محبت ہے اور جس طرح آپ ہر بیان میں اہلِ بیت کا تذکرہ کرتے ہیں اس پر ہم آپ کو اپنی طرف سے بیعت کی اجازت دیتے ہیں۔ تھوڑی دیر کیلیے ساری محفل میں سناٹا چھا گیا تو میں نے عرض کیا: حضرت! مَیں تو تصوف کی الف، ب بھی نہیں جانتا تو پھر فرمایا کہ آپ جو اہل بیت سے محبت کرتے ہیں اور جس طرح آپ نے اپنے بیانوں میں ان کے تذکروں کو زندہ کیا ہے اس پر ہم آپ کو چاروں سلاسل میں خلافت دیتے ہیں۔

فرمایا: بھائی! تم سب گواہ رہو کہ میں نے مولوی طارق جمیل صاحب کو چاروں سلسلوں میں خلافت دی ہے۔

اور فرمایا: آج کل میرے اوپر غلبہ ہے اہل بیت کی سیرت کو لوگوں کے سامنے لانے کا، بلکہ مَیں اس سے اگلی بات کرتا ہوں کہ مَیں مجبور ہوں اس کو سامنے لانے کیلیے اور اگر زیادہ واضح کروں تو مَیں مامور ہوں سیرتِ اہلِ بیت کو لوگوں کے سامنے لانے کیلیے، کہ ناصبیت (حضرات اہلِ بیت کی حق تلفی) بہت بڑھ رہی ہے، میرا جی چاہتا ہے کہ اہلِ بیت کی شان کو لوگوں کے سامنے بار بار بیان کیا جائے۔۔۔ یہ الفاظ تھے جو حضرت نے ارشاد فرمائے تھے۔

اب اس عزم کو عملی جامہ پہنانے کی خود تو میرے پاس فرصت نہیں تھی، اس لیے میں نے اپنے مدرسہ ''جامعۃ الحسنین'' کے متعدد اساتذہ پر مشتمل ایک جماعت کی مجموعی محنت وکاوش سے یہ کتاب مرتب کروائی اور میں خود بھی اس کتاب کی تیاری کے دوران جمعِ مواد کے سلسلہ میں مختلف مقامات پر اپنے مشورے دیتا رہا، بعض کتب کی طرف مراجعت کا بھی کہتا رہا اور گاہے بگاہے اس کتاب کو دیکھتا رہا حتی کہ اس کا کافی سارا حصہ میری نظر سے گزرا۔

بہر حال میری مشاورت اور رہنمائی سے مضامین کا یہ مجموعہ تیار ہوا جو آپ کے سامنے ہے۔ یہ کاوش اس لیے کی گئی تا کہ لوگوں کے سامنے ان حضرات اہلِ بیت رضی اللہ عنہم کی خوبصورت زندگی آئے اور ہم ان سے رہنمائی حاصل کریں اور اسے اپنی آخرت کا زادِ راہ بنائیں۔ اور قانونِ فطرت ہے کہ کسی شخص کی آل واولاد سے محبت اور ان کی تعریف کرنے والا، خود اُسی شخص کا محبوب ومنظورِ نظر ہوجاتا ہے۔ اسی ضابطہ کے پیشِ نظر مَیں نے آلِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت وفضائل پر یہ کتاب مرتب کروائی ہے تا کہ مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی محبت وشفاعت حاصل ہو اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا قرب اور خصوصی تعلق نصیب ہو کہ یہی سعادتِ دارین کا زینہ اور فلاحِ کونین کی کنجی ہے۔

طارق جمیل

۴ رمضان المبارک ۱۴۳۹ھ / ۲۰ مئی ۲۰۱۸ء

فیصل آباد - پاکستان

پہلا باب

یہ باب درج ذیل فصول پر مشتمل ہے:

۱۔ اہل بیت کا مطلب و مصداق

۲۔ اہل بیت کی عظمت و فضیلت

۳۔ صحابہ کرام اور ائمہ، فقہاء و محدثین کی اہلِ بیت کے ساتھ محبت

۴۔ اہل بیت کے ہمارے اوپر حقوق

فصلِ اول: اہلِ بیت کا مطلب و مصداق

اہلِ بیت کا لغوی مطلب ہے: "گھر والے" اور شریعت مطہرہ کی اصطلاح میں "حضور اکرم ﷺ کے گھر والوں" کو "اہلِ بیت" کہا جاتا ہے۔

ازواجِ مطہرات سلامُ اللہِ ورِضوانہ علیھن، اور حضرت فاطمہ، حضرت علی، حضرات حسنین کریمین سلامُ اللہِ وَرِضوانہ علیھم اجمعین اور ان حضرات حسنین کریمین کی اولاد اور قیامت تک ان کی اولاد در اولاد اہلِ بیت ہیں۔

چناں چہ درج ذیل نصوص و عبارات ملاحظہ ہوں:

۱۔ آیتِ تطہیر:

{إِنَّمَا يُرِيدُ اللَّهُ لِيُذْهِبَ عَنكُمُ الرِّجْسَ أَهْلَ الْبَيْتِ وَيُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيرًا}[1]

ترجمہ: "اے نبی کے اہلِ بیت! (گھر والو!) اللہ تو یہ چاہتا ہے کہ تم سے گندگی کو دور رکھے، اور تمہیں ایسی پاکیزگی عطا کرے جو، ہر طرح مکمل ہو۔"

ف: اس آیت میں مذکور لفظ "اہل بیت" سے پہلے اور بعد میں چونکہ آپ ﷺ کی ازواج مطہرات کا تذکرہ چل رہا ہے اور ان سے خطاب ہو رہا ہے اس لیے ازواج مطہرات تو براہِ راست "اہل بیت" میں شامل ہیں، مگر چونکہ یہ

---

(۱) الأحزاب: ۳۳

لفظ (اہلِ بیت) مطلق استعمال ہوا ہے اس لیے دیگر روایات کی روشنی میں یہ لفظ اپنے اطلاق وعموم کی بناء پر ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن کے ساتھ ساتھ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اولادِ اطہار رضی اللہ عنہم اور اُن اولاد کی اولاد کو بھی شامل ہے۔[1]

۲۔ حدیثِ کساء:

عَنْ عُمَرَ بْنِ أَبِي سَلَمَةَ، رَبِيبِ النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، قَالَ: نَزَلَتْ هَذِهِ الآيَةُ عَلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ {إِنَّمَا يُرِيدُ اللهُ لِيُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ أَهْلَ الْبَيْتِ وَيُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيرًا} [الأحزاب: ۳۳] فِي بَيْتِ أُمِّ سَلَمَةَ، فَدَعَا النَّبِيُّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَاطِمَةَ وَحَسَنًا وَحُسَيْنًا فَجَلَّلَهُمْ بِكِسَاءٍ وَعَلِيٌّ خَلْفَ ظَهْرِهِ فَجَلَّلَهُ بِكِسَاءٍ ثُمَّ قَالَ: »اللَّهُمَّ هَؤُلَاءِ أَهْلُ بَيْتِي فَأَذْهِبْ عَنْهُمُ الرِّجْسَ وَطَهِّرْهُمْ تَطْهِيرًا« قَالَتْ أُمُّ سَلَمَةَ: وَأَنَا مَعَهُمْ يَا رَسُولَ اللهِ؟ قَالَ: »أَنْتِ عَلَى مَكَانِكِ وَأَنْتِ إِلَى خَيْرٍ.«[2]

ترجمہ: حضرت عمر بن ابی سلمہ سے روایت ہے کہ یہ آیت {إِنَّمَا يُرِيدُ اللهُ لِيُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ أَهْلَ الْبَيْتِ وَيُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيرًا} نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر ام المومنین حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کے گھر میں نازل ہوئی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت فاطمہ، حضرت حسن اور حضرت حسین رضی اللہ عنہم کو بلایا اور انہیں اپنی چادر کے نیچے کرلیا اور حضرت علی رضی اللہ عنہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے کھڑے تھے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو بھی اپنی چادر کے نیچے کرلیا، پھر فرمایا: "اے اللہ! یہ (بھی) میرے اہلِ بیت ہیں۔ آپ ان سے گندگی کو دور رکھیے اور انہیں مکمل پاکیزگی عطا فرمایئے۔" حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے عرض کی: یا رسول اللہ! میں بھی ان کے ساتھ ہوں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "تم تو اپنی جگہ پر (اہلِ بیت میں سے) ہو ہی، اور تم خیر پر ہو۔"

ف: مطلب یہ ہے کہ حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا (سمیت دیگر تمام ازواجِ مطہرات رضی اللہ عنہن) اور یہ چار پاکیزہ ہستیاں (حضرت علی رضی اللہ عنہ، حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا اور حضرات حسنین کریمین رضی اللہ عنہما) اہلِ بیت ہیں۔[3]

(ب) عَنْ عَامِرِ بْنِ سَعْدِ بْنِ أَبِي وَقَّاصٍ، عَنْ أَبِيهِ، قَالَ — في حديث طويل —: لَمَّا نَزَلَتْ هَذِهِ الآيَةُ:

---

(۱) انظر: التفسير الكبير ۱۶۸/۲۵، ومدارك التنزيل ۳/۳۰، والجامع لأحكام القرآن ۱۴/۱۸۳، والتفسير لابن كثير ۶/۴۱۵، وآسان ترجمۂ قرآن، ص: ۸۹۲، وروح المعاني: ۱۱/۱۹۵، ۱۹۶، ومعارف القرآن للكاندهلوي: ۶/۲۶۸، وفضل أهل البيت وعلو مكانتهم عند أهل السنة والجماعة، ص: ۸

(۲) سنن الترمذي: ۵/۳۵۱، ومسند أحمد: ۴۴/۱۱۸، ۲۱۷

(۳) انظر: التفسير المظهري: ۷/۳۴۱، وتحفة الأحوذي: ۹/۴۸، ونزل الأبرار بما صح من مناقب أهل البيت الأطهار، ص: ۳۲

{فَقُلْ تَعَالَوْا نَدْعُ أَبْنَاءَنَا وَأَبْنَاءَكُمْ} [آل عمران: ٦١] دَعَا رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَلِيًّا وَفَاطِمَةَ وَحَسَنًا وَحُسَيْنًا فَقَالَ: "اَللّٰهُمَّ هٰؤُلَاءِ أَهْلِي"۔[1]

ترجمہ: حضرت سعد بن ابی وقاصؓ فرماتے ہیں: جب یہ آیت {فَقُلْ تَعَالَوْا نَدْعُ أَبْنَاءَنَا وَأَبْنَاءَكُمْ} نازل ہوئی تو رسول اللہ ﷺ نے حضرت علی، حضرت فاطمہ، حضرت حسن اور حضرت حسین رضی اللہ عنہم کو بلایا، پھر کہا: "اے اللہ! یہ میرے اہلِ بیت ہیں"۔

ف: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ اہلِ بیتؓ میں سے ان مذکورہ چار حضرات رضی اللہ عنہم کی خصوصی شان ہے۔

انتباہ: حضرت خدیجہؓ سے رسول اللہ ﷺ کی چار صاحبزادیاں تھیں: حضرت رقیہؓ، ام کلثومؓ، زینبؓ اور فاطمۃ الزہراءؓ۔ پہلی تین صاحبزادیاں، اہلبیت سے متعلقہ اس آیت کے نزول سے پہلے وفات پا چکی تھیں، صرف حضرت فاطمہؓ باقی تھیں، اس لیے حضور ﷺ نے انہی کو اس دعا کے ساتھ مخصوص فرما کر چادر کے نیچے داخل فرمایا۔[2]

ضروری وضاحت:

واضح رہے کہ بعض دیگر روایات کی بناء پر علماء نے مذکورہ بالا حضرات کے علاوہ رسول اللہ ﷺ کے کچھ اور رشتہ دار حضرات کو بھی اہلِ بیت میں سے شمار فرمایا ہے۔[3] مگر ہماری کتاب کا موضوع صرف رسول اللہ ﷺ کی ازواجِ مطہرات سلام اللہ ورضوانہ علیہن، آپ ﷺ کی اولادِ اطہار سلام اللہ ورضوانہ علیہم (جن میں حضرت فاطمہ سلام اللہ ورضوانہ علیہا بطورِ خاص شامل ہیں)، حضرت علی کرم اللہ وجہہ، حضرت امام حسنؓ، حضرت امام حسینؓ اور ان حضرات حسنین کریمینؓ کی اولاد میں پیدا ہونے والے چند مشہور ائمۂ اہلِ بیت سلام اللہ ورضوانہ علیہم کی سیرت و مناقب کو بیان کرنا ہے۔

---

(۱) صحیح مسلم: ۴/۱۸۷۱

(۲) نقله الكاندهلوي في معارف القرآن: ۲/۲۶۷، عن تفسير ابن كثير: ۳/۴۹۳

(۳) انظر: صحيح مسلم: ۴/۱۸۷۳، ومعارف القرآن للكاندهلوى: ۲/۲۶۸، وتفسير الألوسي /روح المعاني: ۱۱/۱۹۵، ۱۹۶، وحديث عباس - حيث يدل على كون عم النبي صلى الله عليه وسلم من أهل بيته - في سنن ابن ماجة: ۱/۵۰ برقم: ۱۴۰، والمستدرك للحاكم: ۴/۸۵، ومسند أحمد: ۳/۲۹۸، وفتاوى دار العلوم ديوبند: ۱۱/۵۳، ۵۶، وكذا ينظر لزاما: علّموا أولادكم محبة آل بيت النبي، ص: ۱۵ ومابعدها، و[الأنوار الباهرة، ص: ۳۷ ومابعدها.

فصل دوم: اہلِ بیتؓ کی عظمت وفضیلت

اس فصل میں درج ذیل عناوین کے تحت اہلِ بیتؓ کی عظمت وفضیلت کو ذکر کیا جائے گا:

(۱) قرآن مجید کی روشنی میں

(۲) احادیث شریفہ کی روشنی میں

(۳) چند نصیحت آمیز واقعات کی روشنی میں

(۱) قرآن مجید کی روشنی میں

(۱) {إِنَّمَا يُرِيدُ اللهُ لِيُذْهِبَ عَنكُمُ الرِّجْسَ أَهْلَ الْبَيْتِ وَيُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيرًا}[۱]

ترجمہ: "اے نبی کے اہلِ بیت! (گھر والو!) اللہ تو یہ چاہتا ہے کہ تم سے گندگی کو دور رکھے، اور تمہیں ایسی پاکیزگی عطا کرے جو ہر طرح مکمل ہو"۔

ف: اللہ تعالیٰ نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اہلِ بیتؓ کو یہ اعزاز بخشا کہ قیامت تک اپنے زندہ وجاوید کلام "قرآن مجید" میں ان کا ذکرِ خیر فرمایا اوران کے تقویٰ وطہارت کی گواہی دی۔

(۲) {وَمَن يُعَظِّمْ شَعَائِرَ اللهِ فَإِنَّهَا مِن تَقْوَى الْقُلُوبِ}[۲]

ترجمہ: اور جو شخص اللہ کے شعائر کی تعظیم کرے، تو یہ بات دلوں کے تقویٰ سے حاصل ہوتی ہے۔

ف: امام نوویؒ جیسے جلیل القدر محدث وفقیہ نے یہ آیت اپنی معروف کتاب ریاض الصالحین میں باب إکرام أہل بیت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وبیان فضلھم کے تحت ذکر کی ہے،[۳] جس کا مطلب یہ ہے کہ اہل بیت کی تعظیم بھی شعائر اللہ کی تعظیم میں داخل ہے۔ لہٰذا جس طرح دیگر شعائر کی تعظیم ہر مسلم پر لازم ہے اسی طرح اہلبیت کی تعظیم بھی ہر مسلمان پر ضروری ہے کیونکہ شعائر اللہ کی تعظیم درحقیقت اللہ ہی کی تعظیم ہے۔

---

(۱) الأحزاب: ۳۳

(۲) الحج: ۳۲

(۳) ریاض الصالحین: ۱/۱۳۸

(۲) احادیث شریفہ کی روشنی میں

(۱) عَنِ الْمُطَّلِبِ بْنِ أَبِي وَدَاعَةَ، قَالَ: جَاءَ الْعَبَّاسُ إِلَى رَسُولِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَكَأَنَّهُ سَمِعَ شَيْئًا فَقَامَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَلَى الْمِنْبَرِ فَقَالَ: »مَنْ أَنَا«؟ قَالُوا: أَنْتَ رَسُولُ اللّٰهِ عَلَيْكَ السَّلَامُ. قَالَ: »أَنَا مُحَمَّدُ بْنُ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عَبْدِ الْمُطَّلِبِ، إِنَّ اللّٰهَ خَلَقَ الْخَلْقَ فَجَعَلَنِي فِي خَيْرِهِمْ فِرْقَةً، ثُمَّ جَعَلَهُمْ فِرْقَتَيْنِ فَجَعَلَنِي فِي خَيْرِهِمْ فِرْقَةً، ثُمَّ جَعَلَهُمْ قَبَائِلَ فَجَعَلَنِي فِي خَيْرِهِمْ قَبِيلَةً، ثُمَّ جَعَلَهُمْ بُيُوتًا فَجَعَلَنِي فِي خَيْرِهِمْ بَيْتًا وَخَيْرِهِمْ نَفْسًا«۔[۱]

ترجمہ: حضرت مُطّلب بن ابی وَدَاعہ سے روایت ہے کہ ایک دفعہ حضرت عباسؓ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے۔ ایسے لگتا تھا جیسے وہ (اپنے متعلق ناگواری کی) کوئی بات سن کر آرہے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم منبر پر جلوہ افروز ہوئے اور لوگوں سے پوچھا: "میں کون ہوں؟"۔ حاضرین نے کہا: آپ اللہ کے رسول ہیں، آپ پر اللہ کی سلامتی ہو۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"میں محمد بن عبداللہ بن عبدالمطلب ہوں، اللہ تبارک وتعالیٰ نے مخلوق کو پیدا کیا تو مجھے ان میں سے بہترین گروہ میں پیدا فرمایا، پھر اس مخلوق کے مزید دو گروہ بنائے تو مجھے ان میں سے بہترین گروہ میں پیدا فرمایا، پھر ان لوگوں کے قبیلے بنائے تو مجھے ان میں سے بہترین قبیلہ میں پیدا فرمایا، پھر ان کو گھروں میں تقسیم کیا تو مجھے ان لوگوں میں سے کیا جو گھر اور ذات کے اعتبار سے ان سب سے بہتر ہیں۔"

ف: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا گھرانہ لوگوں میں سے سب سے بہترین گھرانہ ہے۔

(۲) عَنْ جَابِرِ بْنِ عَبْدِ اللّٰهِ، قَالَ: رَأَيْتُ رَسُولَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي حَجَّتِهِ يَوْمَ عَرَفَةَ وَهُوَ عَلَى نَاقَتِهِ الْقَصْوَاءِ يَخْطُبُ، فَسَمِعْتُهُ يَقُولُ: "يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنِّي تَرَكْتُ فِيكُمْ مَا إِنْ أَخَذْتُمْ بِهِ لَنْ تَضِلُّوا: كِتَابَ اللّٰهِ، وَعِتْرَتِي أَهْلَ بَيْتِي"۔[۲]

ترجمہ: حضرت جابر بن عبداللہ فرماتے ہیں: میں نے ۹ ذی الحجہ کو (یعنی عرفات والے دن) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حج

---

(۱) سنن الترمذی: ۵/۵۴۴

(۲) سنن الترمذي: ۵/۶۶۲۔ وانظر: مسند أحمد: ۱۷/۱۷۰۔ مع تعليق المحقق۔ والسنة لابن ابی عاصم: ۲/۶۴۳۔ ایضاً.

کے دوران دیکھا کہ آپ ﷺ اپنی "قصواء" اونٹنی پر جلوہ افروز ہوکر خطبہ دے رہے تھے، چناں چہ میں نے اس میں آپ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا:

"اے لوگو! میں تمہارے اندر ایسی چیز چھوڑ کر جارہا ہوں، کہ اگر تم اسے تھامے رہوگے تو کبھی گمراہ نہیں ہوگے: اللہ کی کتاب، اور میرے اہلِ بیت"۔

(۳) عَنِ الْعَبَّاسِ بْنِ عَبْدِ الْمُطَّلِبِ، قَالَ: كُنَّا نَلْقَى النَّفَرَ مِنْ قُرَيْشٍ وَهُمْ يَتَحَدَّثُونَ فَيَقْطَعُونَ حَدِيثَهُمْ، فَذَكَرْنَا ذَلِكَ لِرَسُولِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ: "مَا بَالُ أَقْوَامٍ يَتَحَدَّثُونَ، فَإِذَا رَأَوُا الرَّجُلَ مِنْ أَهْلِ بَيْتِي قَطَعُوا حَدِيثَهُمْ، وَاللهِ لَا يَدْخُلُ قَلْبَ رَجُلٍ الْإِيمَانُ حَتَّى يُحِبَّهُمْ لِلّٰهِ وَلِقَرَابَتِهِمْ مِنِّي"۔[1]

ترجمہ: حضرت عباس بن عبدالمطلب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: قریش کے لوگ آپس میں محوِ گفتگو ہوتے تھے، جب ہم ان سے آکر ملتے تو (ہمارے آنے پر وہ ناراض ہوکر) اپنی باتیں بند کرلیتے تھے (گویا وہ ہم سے بات کرنا بھی گوارا نہیں کرتے تھے)۔ ہم نے رسول اللہ ﷺ کے سامنے اس پریشانی کا ذکر کیا تو یہ سن کر (آپ کے چہرۂ انور پر غصہ کے آثار ظاہر ہوگئے حتی کہ چہرہ مبارک سرخ ہوگیا،[2] پھر) آپ ﷺ نے فرمایا: "لوگوں کو کیا ہوگیا ہے کہ وہ آپس میں بات کررہے ہوتے ہیں پھر میرے اہلِ بیت میں سے جب کسی شخص کو دیکھتے ہیں تو اپنی بات بند کردیتے ہیں۔ اللہ کی قسم! کسی آدمی کے دل میں اس وقت تک ایمان داخل نہیں ہوسکتا جب تک وہ میرے اہلِ بیت سے، اللہ کی خاطر اور میری ان سے رشتہ داری کی وجہ سے ان سے محبت نہ کرے"۔

(۴) عَنْ أُمِّ سَلَمَةَ أَنَّ رَسُولَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ لِفَاطِمَةَ: »ائْتِينِي بِزَوْجِكِ وَابْنَيْكِ« فَجَاءَتْ بِهِمْ، فَأَلْقَى عَلَيْهِمْ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كِسَاءً، ثُمَّ قَالَ: "اللّٰهُمَّ هَؤُلَاءِ آلُ مُحَمَّدٍ فَاجْعَلْ صَلَوَاتِكَ وَبَرَكَاتِكَ عَلَى آلِ مُحَمَّدٍ كَمَا جَعَلْتَهَا عَلَى إِبْرَاهِيمَ إِنَّكَ حَمِيدٌ مَجِيدٌ"۔[3]

---

(۱) سنن ابن ماجہ: ۱/۵۰۔ والمستدرک للحاکم: ۷/۱۷۰۔ مع تعلیق المحقق۔ والسنۃ لابن ابی عاصم: ۲/۶۴۳، ایضاً۔ سنن ابن ماجہ: ۱/۱۵۰۔ والمستدرک للحاکم: رقم: ۲۹۶۰۔ وفضائل الصحابۃ لاحمد بن حنبل: ۲/۹۴۰۔ وینظر لزاما: الاستجلاب للسخاوی مع تعلیقات المحقق: ۳۹۴، ۳۹۹

(۲) کما عند الترمذی من قولہ "فغضب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حتی احمر وجھہ" سنن الترمذي: ۵/۶۵۲، رقم: ۳۷۵۸

(۳) المعجم الکبیر للطبرانی: ۵/۵۳، رقم: ۲۶۶۵۔ ومسند احمد: ۳۲۸، ۳۲۷/۴۴، مع تعلیق المحقق۔

ترجمہ: حضرت ام سلمہؓ کہتی ہیں کہ ایک مرتبہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت فاطمہؓ سے کہا: "اپنے شوہر اور دونوں صاحبزادوں کو بلاؤ"۔ وہ ان کو بلا لائیں۔ حضور ﷺ نے ان پر اپنی چادر مبارک ڈال دی اور پھر فرمایا: "اے اللہ! یہ آلِ محمد ہیں۔ آپ آلِ محمد پر اپنی رحمتیں اور برکتیں نازل فرمایئے جیسے آپ نے ابراہیم علیہ السلام پر نازل فرمائیں، بلاشبہ آپ قابلِ تعریف اور مجد و بزرگی والے ہیں"۔

(۵) عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ، قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: "أَحِبُّوا اللهَ لِمَا يَغْذُوكُمْ بِهِ مِنْ نِعَمِهِ وَأَحِبُّونِي لِحُبِّ اللهِ وَأَحِبُّوا أَهْلَ بَيْتِي لِحُبِّي"۔[1]

ترجمہ: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اللہ تبارک وتعالیٰ سے محبت کرو کہ وہ تمہیں اپنی نعمتوں سے نوازتا ہے، اور اُس اللہ کی محبت کی وجہ سے مجھ سے محبت کرو، اور میری محبت کی وجہ سے میرے اہلِ بیت سے محبت کرو"

(۶) عَنْ زَيْدِ بْنِ أَرْقَمَ قَالَ: قَامَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَوْمًا فِينَا خَطِيبًا، بِمَاءٍ يُدْعَى خُمًّا بَيْنَ مَكَّةَ وَالْمَدِينَةِ فَحَمِدَ اللهَ وَأَثْنَى عَلَيْهِ، وَوَعَظَ وَذَكَّرَ، ثُمَّ قَالَ: " أَمَّا بَعْدُ، أَلَا أَيُّهَا النَّاسُ فَإِنَّمَا أَنَا بَشَرٌ يُوشِكُ أَنْ يَأْتِيَ رَسُولُ رَبِّي فَأُجِيبَ، وَأَنَا تَارِكٌ فِيكُمْ ثَقَلَيْنِ: أَوَّلُهُمَا كِتَابُ اللهِ فِيهِ الْهُدَى وَالنُّورُ فَخُذُوا بِكِتَابِ اللهِ، وَاسْتَمْسِكُوا بِهِ" فَحَثَّ عَلَى كِتَابِ اللهِ وَرَغَّبَ فِيهِ، ثُمَّ قَالَ: "وَأَهْلُ بَيْتِي أُذَكِّرُكُمُ اللهَ فِي أَهْلِ بَيْتِي، أُذَكِّرُكُمُ اللهَ فِي أَهْلِ بَيْتِي، أُذَكِّرُكُمُ اللهَ فِي أَهْلِ بَيْتِي"۔[2]

ترجمہ: حضرت زید بن ارقم رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ مکہ مکرمہ و مدینہ منورہ کے درمیان "خُم" نامی تالاب کے پاس خطبہ دینے کیلئے کھڑے ہوئے اور فرمایا: توجہ سے سنو! اے لوگو! میں ایک انسان ہوں، قریب ہے کہ میرے رب کا قاصد (یعنی فرشتۂ موت) میرے پاس آئے اور میں اس کی دعوت پر لبیک کہوں۔ میں تمہارے اندر دو بھاری (قیمتی) چیزیں چھوڑ کر جا رہا ہوں: ان میں سے پہلی اللہ کی کتاب ہے اس میں ہدایت اور روشنی ہے، لہٰذا تم اللہ کی کتاب کو پکڑو اور اسے مضبوطی سے تھامو، غرض آپ ﷺ نے کتاب اللہ پر ابھارا اور اس کی

---

(۱) أخرجه الحاكم في المستدرك: ۳/۱۶۲، وصححه ووافقه الذهبي في التلخيص۔ وكذا في: سنن الترمذي: ۵/۶۶۴ وغيره۔

(۲) صحيح مسلم: ۴/۱۸۷۳، رقم: ۲۴۰۸

ترغیب دی۔ پھر (دوسری چیز کا ذکر کرتے ہوئے) فرمایا: "اور میرے اہلِ بیت، میں تمہیں اپنے اہلِ بیت کے بارے میں اللہ سے ڈراتا ہوں، میں تمہیں اپنے اہلِ بیت کے بارے میں اللہ سے ڈراتا ہوں، میں تمہیں اپنے اہلِ بیت کے بارے میں اللہ سے ڈراتا ہوں"۔

(۷) عَنْ جَابِرٍ أَنَّهُ سَمِعَ عُمَرَ بْنَ الْخَطَّابِ يَقُولُ لِلنَّاسِ حِينَ تَزَوَّجَ بِنْتَ عَلِيٍّ: أَلَا تُهَنِّئُونِي! سَمِعْتُ رَسُولَ اللهِ -صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ- يَقُولُ: "يَنْقَطِعُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ كُلُّ سَبَبٍ وَنَسَبٍ إِلَّا سَبَبِي وَنَسَبِي".[1]

ترجمہ: حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ حضرت عمر بن خطابؓ نے جب (اہلِ بیت میں سے) حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی صاحبزادی (حضرت ام کلثوم بنت فاطمۃ الزہراءؓ) سے نکاح کیا تو وہ لوگوں سے فرما رہے تھے: کیا تم لوگ مجھے مبارکباد نہیں دیتے! میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے: "قیامت والے دن ہر تعلق اور نسب ختم ہو کے رہ جائے گا سوائے میرے نسب اور تعلق کے (، کہ یہ تعلق آخرت میں بھی قائم رہے گا اور نفع بخش ثابت ہوگا)"۔

فائدہ: اختصار کی وجہ سے ہم نے یہاں صرف چند احادیث پر اکتفاء کیا ہے ورنہ حضرات اہلِ بیتؓ کے فضائل میں بہت ساری احادیث وارد ہوئی ہیں جنہیں علماء امت نے اپنی اپنی کتابوں میں درج کیا ہے،[2] اور علامہ سیوطی نے تو اس پر "إحياء الميت بفضائل أهل البيت" کے نام سے ایک مستقل رسالہ تصنیف کیا ہے جس میں انہوں نے اہلِ بیت کے فضائل پر ساٹھ (۶۰) احادیث جمع کی ہیں۔

---

(۱) ذكره الهيثمي في مجمع الزوائد: ۹/۱۷۳، برقم: ۱۵۰۱۹، وقال: رواه الطبراني في الأوسط والكبير باختصار، ورجالهما رجال الصحيح، غير الحسن بن سهل وهو ثقة.

(۲) ولك على سبيل المثال أن تراجع علموا أولادكم محبة آل بيت النبي، ص: ۲۰ و ما بعدها، وغيره من عشرات المصادر.

(۳) چند نصیحت آمیز واقعات کی روشنی میں

(۱) سیدزادی کے طعام وقیام کا بندوبست کرنا

سید خاندان کے ایک صاحب "بلخ" میں رہتے تھے، ان کی اہلیہ بھی سادات میں سے تھیں۔ اللہ تعالیٰ نے اولاد میں ان کو بیٹیاں دی تھیں۔ ان پر فقر و غربت نے ڈیرے ڈالے، وہ حضرات اسی فاقہ کشی کی زندگی گزار رہے تھے کہ وہ صاحب اپنی اس بیوی اور ان صاحبزادیوں کو چھوڑ کر انتقال کر گئے۔ وہ سیدہ خاتون دشمنوں کے طعنوں کے خوف سے اپنی ان صاحبزادیوں کو لے کر بلخ سے سمرقند روانہ ہوگئی۔ جب یہ سمرقند پہنچی تو وہاں شدید سردی پڑ رہی تھی، اس نے اپنی ان بیٹیوں کو مسجد میں بٹھایا اور خود کھانے کی تلاش میں باہر نکل گئی۔ اسی تلاش میں اس کا گزر دو مجمعوں کے پاس سے ہوا: ایک مجمع ایک مسلمان کے پاس لگا ہوا تھا جو اس شہر کا حاکم تھا، اور دوسرا مجمع اسی شہر کے ایک بڑے مجوسی آدمی کے پاس لگا ہوا تھا۔

سب سے پہلے وہ اس مسلمان حاکم کے پاس گئی اور اس کے سامنے اپنی کسمپرسی کا پورا حال بیان کیا اور کہا کہ مجھے آج رات کا کھانا چاہیے۔ اس مسلمان حاکم نے کہا: پہلے میرے پاس اس بات کے گواہ لا کہ تو واقعی سیدزادی ہے۔ اس خاتون نے کہا: مجھے تو اس شہر میں کوئی نہیں جانتا۔ اس جواب پر اس حاکم نے اس کو بے رخی دکھلائی (جس سے وہ بیچاری آگے چلتی بنی)۔

اس سیدزادی نے پھر اس مجوسی شخص کا رخ کیا، اسے اپنی ساری پریشانی بتائی اور اس مسلمان حاکم کا بھی پورا ماجرا کہہ سنایا۔ اس مجوسی نے اس سیدزادی کی پریشانی سن کر اپنے اہلِ خانہ کو اس عورت کے ساتھ مسجد بھیجا، وہ اسی وقت اس عورت کو بیٹیوں سمیت گھر لے آئے، اس مجوسی نے ان کیلیے اپنے گھر میں قیام وطعام کا انتظام کیا نیز عمدہ قسم کے کپڑوں سے انہیں نوازا۔

جب آدھی رات گزر گئی تو اس مسلمان حاکم نے خواب میں دیکھا کہ قیامت قائم ہوگئی ہے، حضور ﷺ کے ہاتھ میں جھنڈا ہے اور سامنے سبز زمرد کا ایک خوبصورت محل ہے۔ تو اس نے کہا: یارسول اللہ! یہ محل کس کا ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: لِرَجُلٍ مُسْلِمٍ مُوَحِّدٍ (ایک مسلمان آدمی کا ہے)۔ اس نے کہا: یارسول اللہ! میں بھی مسلمان آدمی ہوں۔

آپ ﷺ نے فرمایا: أَقِمْ عِنْدِي الْبَيِّنَةَ بِأَنَّكَ مُسْلِمٌ مُوَحِّدٌ (پہلے اس بات کے میرے پاس گواہ لے آ کہ تو مسلمان شخص ہے)۔ یہ سنتے ہی وہ شخص ہکا بکارہ گیا۔ آپ ﷺ نے اس سے فرمایا: لَمَّا قَصَدَتْكَ الْعَلَوِيَّةُ، قُلْتَ لَهَا: أَقِيمِي عِنْدِي الْبَيِّنَةَ، فَكَذَا أَنْتَ أَقِمْ عِنْدِي الْبَيِّنَةَ (جب وہ سیدزادی تمہارے پاس آئی تھی تو تم نے اس سے کہا تھا کہ پہلے اپنے سیدزادی ہونے پر گواہ لے آ، اسی طرح تم بھی پہلے اپنے مسلمان ہونے پر گواہ لے آؤ)۔ اسی حال میں اس کو جاگ آ گئی، اس نے رونا اور سر پیٹنا شروع کر دیا اور اس سیدزادی خاتون کو ڈھونڈنے کیلئے شہر میں چکر لگانا شروع کر دیا یہاں تک کہ اس کو سراغ مل گیا کہ وہ فلاں مجوسی کے گھر میں ہے۔ وہ اس مجوسی کے پاس آیا اور آ کر کہنے لگا کہ آپ کے پاس جو سیدزادی خاتون ہیں ان کو میں اپنے پاس لے کے جانا چاہتا ہوں۔ مجوسی نے کہا: یہ نہیں ہوسکتا۔ اس نے کہا: ایک ہزار سونے کی اشرفیاں مجھ سے لے لو اور وہ گھرانہ مجھے دے دو۔ مجوسی نے کہا: انہوں نے مجھ سے کھانا طلب کیا تھا، میں نے ان کو کھانا اور ٹھکانا دیا۔ اور اب تو میں اس مبارک گھرانے کی برکات اپنی کھلی آنکھوں مشاہدہ کر چکا ہوں۔ ان بابرکت لوگوں کو اپنے پاس رکھنا میں اپنے لیے ضروری سمجھتا ہوں۔

پھر وہ مجوسی کہنے لگا: جس چیز کو تم طلب کر رہے ہو، میں اس کا زیادہ حقدار ہوں۔ وہ محل جو تم دیکھ کے آ رہے ہو وہ میرے مقدر میں ہے۔ اللہ کی قسم! میں اور میرے اہلِ خانہ گزشتہ رات اس وقت تک نہیں سوئے جب تک ہم نے اس سیدزادی کے ہاتھ پر اسلام قبول نہیں کر لیا۔ اور سنو! جیسا خواب تم نے دیکھا ہے، ویسا ہی خواب میں نے بھی رات دیکھا ہے، اُس میں رسول اللہ ﷺ نے مجھ سے دریافت فرمایا تھا: الْعَلَوِيَّةُ وَبَنَاتُهَا عِنْدَكَ؟ (وہ سیدزادی اور اسکی صاحبزادیاں آپ کے پاس ہیں؟) میں نے عرض کی: جی ہاں! آپ ﷺ نے فرمایا تھا: الْقَصْرُ لَكَ وَلِأَهْلِ دَارِكَ، وَأَنْتَ وَأَهْلُ دَارِكَ مِنْ أَهْلِ الْجَنَّةِ، خَلَقَكَ اللهُ مُؤْمِنًا فِي الْأَزَلِ (یہ محل تمہارا اور تمہارے اہلِ خانہ کا ہے، تم اور تمہارے اہلِ خانہ جنتی لوگ ہیں، اللہ تعالی نے اپنی تقدیر میں تمہیں ایمان والا ہی پیدا کیا تھا)[1]۔

---

(۱) البر والصلة لابن الجوزي: ۱/۲۵۴، ومثله في الشرف المؤبد لآل محمد، ص: ۱۰۳

(۲) سیدزادے کی مالی مدد کرنا

احمد بن خُصَیب کہتے ہیں:

میں خلیفۂ وقت "متوکل" کی والدہ محترمہ "شجاع" کا بطور کاتب ملازم تھا۔ ایک دن میں اپنے دفتر میں بیٹھا ہوا تھا کہ ان کا خادم ایک تھیلی لیے میرے پاس آیا اور آ کر کہنے لگا: امیر المومنین کی والدہ محترمہ آپ کو سلام کہنے کے بعد یہ کہہ رہی ہیں: یہ ایک ہزار دینار میرے عمدہ و پاکیزہ مال میں سے ہے یہ لے لو اور اسے مستحق لوگوں میں تقسیم کر دو اور ان مستحقین کے نام اور پتے بھی لکھ کر مجھے دے دینا، کہ جب اس طرح کا مال ہمارے پاس آیا کرے گا تو ہم انہی مستحقین میں اسے خرچ کیا کریں گے۔ بہر حال میں نے وہ تھیلی لی اور اپنے گھر کی طرف چلتا بنا۔ پھر میں نے اپنے قابلِ اعتماد احباب کو یہ ساری بات بتائی جو "شجاع" نے مجھے کہی تھی اور ساتھ میں نے ان سے یہ کہا کہ مجھے کچھ سفید پوش لوگوں کے نام بتاؤ جنہیں تم پہچانتے ہو۔ انہوں نے مجھے کچھ لوگوں کے نام بتائے۔ میں نے ان لوگوں میں تین سو دینار تقسیم کر دیے۔ ابھی سات سو دینار باقی تھے اور مجھے کوئی مستحق نہیں ملا تھا کہ رات ہوگئی۔ گلیوں کے دروازے بند کر دیے گئے اور میں ان دیناروں کے متعلق ہی سرگرداں تھا کہ گلی کے ایک دروازے کی آواز میں نے سنی کہ کوئی اسے کھٹکھٹا رہا ہے۔ مجھے بتایا گیا کہ دروازے پر کوئی سیدزادہ آیا ہے۔ میں نے کہا: آ جائے۔ وہ اندر آیا اور آ کر مجھے سلام کیا۔ اِدھر میں اپنے دل میں کہنے لگا کہ اس وقت رات کو میرے پاس یہ شخص آیا ہے جس کا رسول اللہ ﷺ کے ساتھ تعلق و رشتہ ہے (یعنی سید خاندان سے ہے)۔ واللہ! اس وقت ہمارے پاس اس کو دینے کیلیے کوئی چیز نہیں تھی، میں نے اس کو صرف ایک دینار دیا اور بس۔ وہ شکر گزاری کے ساتھ اسے لے کر چلا گیا۔

جب وہ چلا گیا تو میری اہلیہ باہر آ کر مجھے کہنے لگی: آپ کو "شجاع صاحبہ" نے مستحقین کو دینے کیلیے ایک ہزار دینار دیے ہیں۔ بھلا آپ کو رسول اللہ ﷺ کی صاحبزادی کی اولاد سے بھی کوئی زیادہ حقدار نظر آتا ہے؟، آپ یہ بقیہ پوری تھیلی اسی سیدزادے کو ہی دے دیں۔ گھر والی کی یہ بات سن کر میں نے اس شخص کو واپس بلوایا اور وہ پوری تھیلی ہی اس کے حوالے کر دی۔ جب وہ چلا گیا تو میرے ذہن میں شیطان نے یہ خیال ڈالا کہ کل اگر خلیفۂ وقت "متوکل"

آپ سے یہ کہے کہ یہ تو سید خاندان کا آدمی نہیں تھا، تمہارے پاس اس کے سید ہونے کی کیا دلیل ہے؟ تو تم کیا جواب دو گے؟ چناں چہ میں نے بیوی سے کہا: تم نے تو مجھے مشکل میں ڈال دیا۔ وہ کہنے لگی: فکر نہ کرو، ہم ان کے نانا (ﷺ) پر اعتماد کرتے ہیں (کہ ان کی برکت سے اللہ تعالیٰ آسانی فرمائیں گے)۔ بہر حال مَیں اسی کشمکش میں اٹھا اور سونے کی غرض سے بستر پر چلا گیا۔ ابھی مجھے گہری نیند نہیں آئی تھی کہ شجاع صاحبہ کا قاصد مجھے بلانے کیلیے آ گیا، میں اٹھا اور ان لوگوں کے ہمراہ چل دیا۔ میں وہاں جب ان کے گھر میں داخل ہونے لگا تو ایک خادم نے میرا ہاتھ پکڑا اور مجھے کہا: احمد! آپ نے خود "امیر المومنین کی والدہ صاحبہ" سے بات کرنی ہے۔ یہ کہہ کر اس نے مجھے اندر داخل کر دیا۔ جب میں داخل ہوا تو دروازے پر ہی مجھے ٹھہرا لیا گیا اور یہ آواز آئی: احمد! میں نے عرض کی: "جی! حاضر!"۔ شجاع صاحبہ کہنے لگیں: حِسَابُ أَلْفِ دِينَارٍ، بَلْ حِسَابُ سَبْعِ مِائَةِ دِينَارٍ ("ایک ہزار دینار کا حساب، بلکہ ان سات سو دینار کا حساب؟") یہ کہہ کر وہ رونے لگیں۔ میں نے دل میں کہا: شاید اُس سیدزادے نے باہر آ کر ساری بات بتا دی ہے (کہ میں نے پورے سات سو دینار کی تھیلی اُس سیدزادے کو بلا تحقیق ہی دے دی ہے) اور میرے قتل کا حکم جاری کیا جا چکا ہے، اب یہ مجھ پر رحم و شفقت کی وجہ سے رو رہی ہیں (کہ عنقریب میرا سر قلم کر دیا جائے گا)۔ پھر انہوں نے دوبارہ وہی بات کہی: "احمد! ایک ہزار دینار کا حساب، بلکہ ان سات سو دینار کا حساب؟" اور رونا شروع کر دیا۔ تین بار انہوں نے اسی طرح کیا، اس کے بعد اس نے بمشکل اپنے رونے کو ضبط کر کے مجھ سے ان کا حساب طلب کیا۔ میں نے ان کو سچ سچ بتانا شروع کر دیا، جب میں اس سیدزادے کا ماجرا بیان کرنے لگا تو وہ ایک بار پھر آبدیدہ ہو گئیں اور کہا: احمد! اللہ تعالیٰ تمہارا بھلا کرے اور تمہاری اہلیہ کا بھی بھلا کرے۔ تم جانتے ہو کہ آج رات میرے ساتھ کیا بات پیش آئی ہے؟ میں نے عرض کیا: نہیں جی!

انہوں نے کہا: میں سوئی ہوئی تھی کہ مجھے رسول اللہ ﷺ کی خواب میں زیارت ہوئی، آپ ﷺ نے مجھ سے فرمایا: جَزَاكِ اللهُ خَيْرًا، وَجَزَا أَحْمَدَ بْنَ الْخُصَيْبِ خَيْرًا، وَجَزَا مَنْ فِي مَنْزِلِهِ خَيْرًا، فَقَدْ فَرَّجْتُمْ لِي هٰذِهِ اللَّيْلَةَ عَنْ ثَلَاثَةٍ مِنْ وُلْدِي مَا كَانَ لَهُمْ شَيْءٌ (اللہ تعالیٰ تمہارا بھلا کرے، احمد بن خُصَیب کا بھلا کرے اور اس کی گھر والی کا بھلا کرے۔ تم لوگوں نے آج رات میری اولاد میں سے تین افراد کی تکلیف دور کی، اُن کے پاس کچھ بھی نہیں تھا)۔

یہ خواب سنانے کے بعد شجاع نے کہا: احمد! یہ زیورات و کپڑے، اور یہ مزید دینار لو اور اُسی سید زادے کو دے دینا، اور انہیں یہ پیغام بھی پہنچا دینا کہ اس طرح کا جو بھی (عمدہ و پاکیزہ) مال ہمارے پاس آتا رہے گا ہم آپ کو آئندہ بھی پہنچاتے رہیں گے۔ نیز یہ زیورات و کپڑے اور یہ مال لو اور اپنی اہلیہ کو دے دینا اور اسے کہنا: اے بابرکت خاتون! اللہ تعالیٰ تمہیں جزائے خیر دے کہ یہ سب تمہاری رہنمائی کی وجہ سے ہوا ہے۔ اور احمد! یہ مال تم لے لو، یہ تمہارا ہے اور مجھے بھی بہت سارا مال اور کپڑے دیے۔

احمد بن حصیب کہتے ہیں: میرے پاس اس طرح بہت سا مال اکٹھا ہوگیا، میں اس کو لے کر نکلا۔ اس کی ادائیگی کے سلسلہ میں، ابتداء میں نے اس سید زادے سے کی، چناں چہ میں نے جا کر ان کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ وہ باہر آئے اور آکر مجھے کہا: لاؤ بھائی وہ سامان؟ میں نے پوچھا: آپ کو کیسے پتا چلا اس سامان کا؟ کہنے لگے: وہ تھیلی لے کر میں اپنی گھر والی کے پاس آیا تھا جو کہ میری چچازاد بہن ہے، میں نے اسے ساری بات بتائی۔ اس نے مجھے کہا: اٹھو نماز پڑھو اور ان کیلیے دعا کرو، میں تمہاری دعا پر آمین کہوں گی۔ تو میں نے اٹھ کر نماز پڑھی اور دعا کی، اس نے آمین کہی۔ اس کے بعد میں سو گیا۔ مجھے خواب میں نانا جان (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی زیارت ہوئی، اور مجھ سے فرمایا: قَدْ شَكَرْتُهُمْ عَلَى مَا كَانَ مِنْهُمْ إِلَيْكَ، وَهُمْ بَارُوكَ بِشَيْءٍ آخَرَ فَاقْبَلْهُ (ان لوگوں نے تمہارے ساتھ جو احسان کیا ہے اس پر میں نے ان کا شکریہ ادا کر دیا ہے۔ وہ تمہارے ساتھ مزید بھی کچھ احسان والا معاملہ کریں گے، تم وہ ان سے قبول کر لینا)۔ احمد کہتے ہیں میں وہ سامان ان کے حوالے کر کے گھر واپس آگیا۔

گھر پہنچا تو دیکھا کہ گھر والی بیچاری کھڑی نماز و دعا میں مشغول ہے (کہ اللہ تعالیٰ خلیفۂ وقت کی طرف سے آنے والی پریشانی سے حفاظت فرمائے)، وہ دعا سے فارغ ہو کر میرے پاس آئی اور آتے ہی میری خیر، خبر دریافت کی۔ میں نے اس کو سارا حال کہہ سنایا، وہ کہنے لگی: میں نے آپ کو کہا نہیں تھا کہ ہم نے ان کے نانا (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر اعتماد کیا ہے۔ اب دیکھا ہے کہ کیسا انہوں نے حسنِ معاملہ کیا؟۔[1]

---

(1) البر والصلة لابن الجوزي: ۱/ ۲۵۳، ومثله في الاتحاف بحب الاشراف، ص: ۴۴۱

(۴) مصیبت زدہ سادات کی مدد کو نفلی حج پر ترجیح دینا

ربیع بن سلیمانؒ کہتے ہیں کہ میں حج کے لئے جا رہا تھا، میرے ساتھ میرے بھائی تھے اور ایک جماعت تھی۔ جب ہم کوفہ میں پہنچے تو وہاں ضروریاتِ سفر خریدنے کے لئے میں بازاروں میں گھوم رہا تھا کہ ایک ویران سی جگہ میں ایک خچر مرا ہوا پڑا تھا، اور ایک عورت جس کے کپڑے بہت پرانے بوسیدہ تھے چاقو لئے ہوئے اس کے گوشت کے ٹکڑے کاٹ کاٹ کر ایک زنبیل میں رکھ رہی تھی۔ مجھے یہ خیال ہوا کہ یہ مردار گوشت لے جا رہی ہے اس پر سکوت کرنا ہرگز نہ چاہیے۔ عجب نہیں، یہ کوئی بھٹیاری عورت ہے۔ یہی پکا کر لوگوں کو کھلا دے گی۔ میں چپکے سے اس کے پیچھے ہولیا اس طرح کہ وہ مجھے نہ دیکھے۔ وہ عورت ایک بڑے مکان میں پہنچی جس کا دروازہ بھی اونچا تھا۔ اس نے جا کر دروازہ کھٹکھٹایا، اندر سے آواز آئی: کون ہے؟ اس نے کہا: کھولو! میں ہی بدحال ہوں۔ دروازہ کھولا گیا اور اس میں سے چار لڑکیاں آئیں جن کے چہرہ سے بدحالی اور مصیبت کے آثار ظاہر ہو رہے تھے۔ وہ عورت اندر گئی اور وہ زنبیل ان لڑکیوں کے سامنے رکھ دی۔ میں کواڑوں کی درزوں سے جھانک رہا تھا، میں نے دیکھا اندر سے گھر بالکل برباد خالی تھا۔ اس عورت نے روتے ہوئے لڑکیوں کو آواز دی کہ "لو! اس کو پکا لو اور اللہ کا شکر ادا کرو۔ اللہ تعالیٰ کا اپنے بندوں پر اختیار ہے اسی کے قبضہ میں لوگوں کے قلوب ہیں"۔

وہ لڑکیاں اس کو کاٹ کاٹ کر آگ پر بھوننے لگیں، مجھے بہت ضیق (بے چینی) ہوئی۔ میں نے باہر سے آواز دی: "اے اللہ کی بندی! اللہ کے واسطے اس کو نہ کھا"۔ وہ کہنے لگی: تو کون ہے؟ میں نے کہا: میں ایک پردیسی آدمی ہوں۔ کہنے لگی: اے پردیسی! تو ہم سے کیا چاہتا ہے؟ ہم خود ہی مقدر کے قیدی ہیں۔ تین سال سے ہمارا نہ کوئی معین ہے، نہ مددگار۔ تو ہم سے کیا چاہتا ہے؟ میں نے کہا: مجوسیوں کے ایک فرقہ کے سوا مردار کا کھانا کسی مذہب میں جائز نہیں۔ وہ کہنے لگی: ہم خاندانِ نبوت کے شریف (سید) ہیں۔ ان لڑکیوں کا باپ بڑا شریف تھا، وہ اپنے ہی جیسوں سے ان کا نکاح کرنا چاہتا تھا۔ اس کی نوبت نہ آئی، اس کا انتقال ہو گیا، جو ترکہ اس نے چھوڑا تھا وہ ختم ہو گیا۔ ہمیں معلوم ہے کہ مردار کھانا جائز نہیں لیکن اضطرار میں جائز ہو جاتا ہے ہمارا چار دن کا فاقہ ہے۔

ربیعؒ کہتے ہیں: اس کے حالات سن کر مجھے رونا آ گیا اور میں روتا ہوا دل بے چین وہاں سے واپس ہوا اور میں نے اپنے بھائی سے آ کر کہا کہ میرا ارادہ تو حج کا نہیں رہا۔ اس نے مجھے بہت سمجھایا، حج کے فضائل بتائے کہ حاجی ایسی

حالت میں لوٹتا ہے کہ اس پر کوئی گناہ نہیں رہتا وغیرہ وغیرہ۔ میں نے کہا: بس لمبی چوڑی باتیں نہ کرو۔ یہ کہہ کر میں نے اپنے کپڑے اور احرام کی چادریں اور جو سامان میرے ساتھ تھا وہ سب لیا اور نقد چھ سو درہم تھے وہ لیے، اور ان میں سے سو درم کا آٹا خریدا، اور سو درم کا کپڑا خریدا، اور باقی درم جو بچے وہ آٹے میں چھپا کر اس بڑھیا کے گھر پہنچا اور یہ سب سامان اور آٹا وغیرہ اس کو دیدیا۔

اس عورت نے اللہ کا شکر ادا کیا اور کہنے لگی: اذهَبْ يا ابنَ سُليمان! غَفَرَ اللهُ لكَ ما تقدَّمَ مِن ذَنبِكَ وما تأخَّرَ ورَزَقَكَ أجرَ الحجِّ والعُمرة وأسكَنَكَ جنّتَه وأخلَفَ عليكَ خلَفاً يَبينُ عليكَ (اے ابن سلیمان! جا، اللہ جل شانہ تیرے اگلے پچھلے سب گناہ معاف کرے، اور تجھے حج وعمرہ کا ثواب عطا کرے، اور اپنی جنت میں تجھے جگہ عطا فرمائے، اور اسکا ایسا بدل عطا فرمائے جو تجھے بھی ظاہر ہو جائے)۔

سب سے بڑی لڑکی نے کہا: ضاعَفَ اللهُ أجرَكَ وغَفَرَ وِزْرَكَ (اللہ جل شانہ تیرا اجر دوگنا کرے اور تیرے گناہ معاف کرے۔) دوسری نے کہا: عَوَّضَكَ اللهُ أكثرَ مِمّا تصدَّقتَ به علينا (اللہ جل شانہ تجھے اس سے بہت زیادہ عطا فرمائے جتنا تو نے ہمیں دیا۔)

تیسری نے کہا: حَشَرَكَ اللهُ مَعَ جَدِّنا (حق تعالیٰ شانہ ہمارے نانے (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کیساتھ تیرا حشر کرے۔)

چوتھی نے، جو سب سے چھوٹی تھی، کہا: إلٰهي! عَجِّلْ علىٰ مَن أحسَنَ إلينا بالخَلَفِ واغفِرْ له ما لَحِقَ مِن ذَنبِه وما سَلَفَ (اے اللہ جس نے ہم پہ احسان کیا تو اس کا نعم البدل اس کو جلدی عطا کر اور اس کے اگلے پچھلے گناہ معاف کر۔)

ربیع کہتے ہیں کہ حج کا قافلہ روانہ ہو گیا، میں کوفہ ہی میں مجبورا پڑا رہا کہ وہ سب حج سے فارغ ہو کر لوٹ بھی آئے۔ مجھے خیال ہوا کہ ان حجاج کا استقبال کروں، ان سے اپنے لئے دعاء کراؤں، کسی کی مقبول دعا مجھے بھی لگ جائے۔ جب حجاج کا ایک قافلہ میری آنکھوں کے سامنے آ گیا تو مجھے اپنے حج سے محرومی پر بہت افسوس ہوا اور رنج کی وجہ سے میرے آنسو نکل آئے۔ جب میں ان سے ملا تو میں نے کہا: اللہ جل شانہ تمہارا حج قبول کرے اور تمہارے اخراجات کا بدل عطا فرمائے۔ ان میں سے ایک نے کہا کہ یہ دعا کیسی؟۔ میں نے کہا: ایسے شخص کی دعا جو دروازہ تک کی حاضری سے محروم رہا۔ وہ کہنے لگے: بڑے تعجب کی بات ہے، اب تو وہاں جانے سے انکار کرتا ہے۔ تو ہمارے ساتھ عرفات کے میدان میں نہیں تھا؟ تو نے ہمارے ساتھ رمی جمرات نہیں کی؟ تو نے ہمارے ساتھ طواف نہیں کئے؟

میں اپنے دل میں سوچنے لگا کہ یہ اللہ کا لطف ہے، اتنے میں خود میرے شہر کے حاجیوں کا قافلہ آ گیا۔ میں نے کہا:

حق تعالی شانہ تمہاری سعی مشکور فرمائے، تمہارا حج قبول فرمائے۔ وہ بھی یہی کہنے لگے کہ تو ہمارے ساتھ عرفات پر نہیں تھا؟ یا رمی جمار نہیں کی؟ اب انکار کرتا ہے۔ ان میں سے ایک شخص آگے بڑھا اور کہنے لگا کہ بھائی اب انکار کیوں کرتے ہو، کیا بات ہے؟ آخر تم ہمارے ساتھ مکہ میں نہیں تھے یا مدینہ میں نہیں تھے۔ جب ہم قبر اطہر کی زیارت کر کے بابِ جبرائیل سے باہر کو آرہے تھے، اس وقت ازدحام کی کثرت کی وجہ سے تم نے یہ تھیلی میرے پاس امانت رکھوائی تھی جس کی مہر پر لکھا ہوا ہے "مَن عَامَلَنا رَبِحَ (جو ہم سے معاملہ کرتا ہے نفع کماتا ہے)"۔ یہ تمہاری تھیلی واپس ہے۔

ربیع کہتے ہیں کہ واللہ! میں نے اس تھیلی کو کبھی اس سے پہلے دیکھا بھی نہ تھا۔ اسکو لے کر گھر واپس آیا۔ عشا کی نماز پڑھی اپنا وظیفہ پورا کیا، اسکے بعد اسی سوچ میں جاگتا رہا کہ آخر یہ قصہ کیا ہے؟ اسی میں میری آنکھ لگ گئی تو میں نے حضور ﷺ کی خواب میں زیارت کی۔ میں نے حضور ﷺ کو سلام کیا اور ہاتھ چومے۔ حضور ﷺ نے تبسم فرماتے ہوئے سلام کا جواب دیا اور ارشاد فرمایا: **یا رَبِیعُ! کَم نُقِیمُ لکَ الشُّهودَ وأنتَ لا تَقبَل. اعْلَم أنه لمّا حضر قلبُک وتصدَّقتَ بصَدقتِک علی المَرأةِ التي هِيَ مِن أهلِ بیتِي وآثرتَ بزادِ سَفرِک وتَخلَّفتَ عَن الحجِ سَألتُ اللہَ أن یُعوِّضکَ خیرًا مِمّا أنفقتَ، فَخلقَ اللہُ تعالی مَلَکًا علی صورتِک یَحُجُّ عنکَ کلَّ سَنةٍ إلی یَومِ القِیامةِ وعَوَّضکَ فِي الدُّنیا سِتَّمائةِ دِینارٍ عَن سِتِّمائةِ درهمٍ، فَطِب نَفسًا وَقَرَّ عَینًا** (اے ربیع! آخر ہم کتنے گواہ اس پر قائم کریں کہ تو نے حج کیا ہے۔ تو مانتا ہی نہیں، سُن بات یہ ہے کہ جب تو نے اس عورت پر۔ جو میری اولاد تھی۔ صدقہ کیا اور اپنا زادِ راہ ایثار کر کے اپنا حج ملتوی کر دیا، تو میں نے اللہ جل شانہ سے دعا کی کہ وہ اسکا نعم البدل تجھے عطا فرمائے تو حق تعالی شانہ نے ایک فرشتہ تیری صورت کا بنا کر اسکو حکم فرما دیا کہ وہ قیامت تک ہر سال تیری طرف سے حج کیا کرے اور دنیا میں تجھے یہ عوض دیا کہ چھ سو درم کے بدل چھ سو دینار (اشرفیاں) عطا کیں۔ تو خوش رہ اور اپنی آنکھ ٹھنڈی رکھ۔) اس کے بعد حضور ﷺ نے بھی وہی الفاظ ارشاد فرمائے: **"مَن عَامَلَنا رَبِح"**۔

ربیع کہتے ہیں جب میں سو کر اٹھا تو اس تھیلی کو کھولا، اس میں چھ سو اشرفیاں تھیں[1]۔

فائدہ: مندرجہ بالا تین قصے بطورِ نمونہ ذکر کیے ہیں ورنہ اس مبارک ومطہر خاندان کے بے شمار قصے کتابوں میں موجود ہیں۔[2]

---

(۱) روضة الصادي، ص: ۲۵۳، ونقلته إلی الأردية من فضائل حج، ص: ۲۲۶، ومثله في الشرف المؤبد لآل محمد، ص: ۱۰۱، نقلا عن المسامرات.

(۲) مثلاً ملاحظه هو: الاستجلاب للسخاوي، ص: ۱۷۹، وما بعدها۔ وتذكرة الخواص، ص: ۳۲۸، وما بعدها۔ والاتحاف بحب الأشراف، ص: ۳۲۹، وما بعدها۔ وفضل آل البيت للمقريزي، ص: ۸۰، وما بعده۔ وروض الرياحين، وغيره.

فصل سوم

صحابہ کرامؓ اور ائمۂ فقہاء و محدثین کی اہل بیتؓ کے ساتھ محبت

حضرت ابوبکر صدیقؓ کی اہلِ بیتؓ سے محبت

(۱) حضرت ابن عمرؓ سے مروی ہے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: حضرت محمد ﷺ کا اُن کے اہلِ بیت کے سلسلہ میں خیال رکھو۔[1]

ف: یعنی ان کے اہلِ بیت کا ادب واحترام کرو اور اُن (اہلِ بیت) کو کسی قسم کی کوئی تکلیف نہ دو۔[2]

(۲) حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے! مجھے اپنی رشتہ داری جوڑنے سے رسول اللہ ﷺ کی رشتہ داری کو جوڑنا زیادہ محبوب ہے۔[3]

(۳) حضرت عُقبہ بن حارث بیان کرتے ہیں کہ حضرت ابوبکرؓ نے عصر کی نماز پڑھی، پھر پیدل چلتے ہوئے باہر نکلے۔ دیکھا کہ حضرت حسنؓ بچوں کے ساتھ کھیل رہے ہیں تو ان کو اپنے کندھے پر اٹھالیا اور فرمایا: "میرا باپ اس پر قربان ہو۔ یہ نبیؐ کے مشابہ ہے، علیؓ کے مشابہ نہیں ہے" اور حضرت علیؓ یہ سن کر مسکرا رہے تھے۔[4]

(۴) حضرت عبدالرحمن بن قاسم اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ حضرت ابوبکرؓ کو جب کوئی ایسا معاملہ پیش آتا جس میں ان کو صاحبِ رائے اور صاحبِ فہم لوگوں کے مشورہ کی ضرورت ہوتی تو وہ مہاجرین وانصار اور بالخصوص حضرت عمر بن خطابؓ، حضرت عثمانؓ، حضرت علی بن ابی طالبؓ، حضرت عبدالرحمن بن عوفؓ، حضرت معاذ بن جبلؓ،

فائدة: ينظر للاستزادة في هذا الباب "الاستجلاب للسخاوي، الباب الثامن: باب اكرام السلف لاهل البيت من الصحابة".

(۱) صحيح البخاري: ۵/ ۲۰، رقم: ۳۷۱۳

(۲) مستفاد من فتح الباري: ۷/ ۷۹، وعمدة القاری: ۱۶/ ۲۲۲

(۳) صحيح البخاري: ۵/ ۲۰، رقم: ۳۷۱۲

(۴) صحيح البخاري: ۴/ ۱۸۷، رقم: ۳۵۴۲

حضرت ابی بن کعبؓ، اور حضرت زید بن ثابتؓ کو بلا کر ان سے مشورہ کرتے۔[1]

(۵) حضرت عبداللہ بن جعفر (جو کہ اہلِ بیت میں سے ہیں) فرماتے ہیں:

اللہ تعالیٰ حضرت ابوبکرؓ کے ساتھ مہربانی والا معاملہ فرمائے کہ وہ ہمارے خلیفہ تھے اور بہترین خلیفہ تھے، ہم نے اُن سے زیادہ بہتر کسی شخص کو نہیں دیکھا جو ہمارا اس طرح خیال رکھتا ہو (جس طرح وہ خیال رکھتے تھے)۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ ہم ان کے پاس گھر میں بیٹھے ہوئے تھے۔ اس دوران حضرت عمرؓ چند صحابہ کرامؓ کے ساتھ تشریف لائے، وہ حضرات آکر دروازہ پر ٹھہر گئے اور حضرت عمرؓ نے اندر آنے کی اجازت طلب کی۔ ایک مرتبہ اجازت مانگی تو نہیں ملی، دوسری دفعہ مانگی تو پھر نہیں ملی، پھر جب تیسری دفعہ اجازت طلب کی تو حضرت ابوبکرؓ نے فرمایا: آجائیں۔

اس پر حضرت عمرؓ اُن صحابہ کرامؓ کے ساتھ اندر تشریف لائے اور آکر کہا: اے خلیفۂ رسول! آپ نے ہمیں دروازے کے پاس روکے رکھا۔ ہم نے دو مرتبہ اجازت مانگی تو آپ نے نہیں دی اور اب یہ تیسری مرتبہ ہے (جس میں ہمیں اندر آنے کی اجازت ملی ہے)۔ حضرت ابوبکرؓ نے فرمایا: بات یہ ہے کہ حضرت جعفر کے صاحبزادوں کے آگے کھانا رکھا ہوا تھا، وہ کھانا کھا رہے تھے۔ مجھے اندیشہ ہوا کہ آپ حضرات اندر آکر ان کے ساتھ کھانے میں شریک ہو جائیں گے۔[2]

ف: اس واقعہ سے معلوم ہوا کہ حضرت ابوبکرؓ اہلِ بیت اور ان کی اولاد کا بہت ہی خیال رکھتے تھے۔

(۶) حضرت خالد بن ولیدؓ نے ایک مرتبہ حضرت ابوبکرؓ کی خدمت میں "حیرہ" مقام سے کچھ مال و سامان بھیجا جس میں ایک قیمتی چادر اور ایک ہزار درہم بھی تھے۔ حضرت ابوبکرؓ نے وہ قیمتی چادر حضرت حسینؓ کو ہبہ کر دی۔[3]

---

(۱) الطبقات الکبری ط العلمیة: ۲/۲٦۷

(۲) فضائل الصحابة للدار قطني، ص: ۴۷

(۳) فتوح البلدان ص: ۲۴۲

حضرت عمر فاروقؓ کی اہلِ بیتؓ سے محبت

(۱) ایک دفعہ حضرت عمرؓ، حضرت فاطمۃ الزہراءؓ کے پاس آئے اور کہا: اے فاطمہ! میں نے آپ سے زیادہ کسی کو رسول اللہ ﷺ کا محبوب نہیں دیکھا۔ اور اللہ کی قسم! مجھے بھی سب لوگوں میں آپ کے والد ﷺ کے بعد آپ سے زیادہ کوئی محبوب نہیں ہے۔[۱]

(۲) حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ جب لوگ قحط میں مبتلا ہوتے تو حضرت عمر بن خطابؓ، (حضور ﷺ کے اہلِ بیت میں سے) حضرت عباس بن عبدالمطلبؓ کے وسیلہ سے اللہ تعالی سے بارش طلب کرتے اور یہ دعا کرتے: "اے اللہ! پہلے ہم آپ کی بارگاہ میں اپنے نبی کریم ﷺ کا وسیلہ پیش کیا کرتے تھے تو آپ ہمیں سیراب کر دیا کرتے۔ اور اب ہم آپ کے پاس اپنے نبیؐ کے چچا جان کا وسیلہ پیش کرتے ہیں، آپ ہمیں سیراب کر دیجیے"، چناں چہ اس دعا پر بارش ہو جاتی۔[۲]

ف: اس روایت سے معلوم ہوا کہ حضرت عمرؓ، اہلِ بیتؓ سے کس قدر عقیدت رکھتے تھے!! کیونکہ آدمی مشکل وقت میں اسی ہستی کے وسیلہ سے ہی دعا کرتا ہے جو اس کے نزدیک برگزیدہ ترین ہو۔

(۳) حضرت عروہ بن زبیر سے روایت ہے کہ حضرت عمر بن خطابؓ کی موجودگی میں ایک شخص نے حضرت علی ابن ابی طالبؓ کی شان میں کوئی نامناسب بات کہی تو حضرت عمرؓ نے اس شخص سے کہا: تم اس قبر والے کو جانتے ہو؟ یہ محمد بن عبداللہ بن عبدالمطلب ہیں، اور وہ علی بن ابی طالب بن عبدالمطلب ہیں (یعنی حضرت علیؓ رسول اللہ ﷺ کے خاندان کے ہیں اور آپ کے اہل بیت میں سے ہیں) لہذا حضرت علیؓ کا تذکرہ خیر کے سوا نہ کرنا، اگر تم حضرت علیؓ سے بغض رکھو گے تو تم اس قبر والے کو تکلیف دو گے۔[۳]

(۴) ایک دفعہ حضرت عمر بن خطابؓ نے حضرت عباسؓ سے کہا: اللہ کی قسم! جس دن آپ اسلام لائے تو اس دن اگر میرے والد خطاب بھی اسلام لاتے تو ان کے اسلام لانے سے آپ کا اسلام لانا مجھے زیادہ محبوب تھا۔ اور یہ اس

---

(۱) اخرجه الحاكم في المستدرك: ۱۶۸/۳، وصححه ولكن تعقبه الذهبي بقوله: غريب عجيب۔

(۲) صحيح البخاري: ۲۰/۵، رقم: ۳۷۱۰

(۳) فضائل الصحابة لأحمد بن حنبل: ۶۴۱/۲

لیے کہ مجھے معلوم تھا کہ آپ کا اسلام لانا خطاب کے اسلام لانے سے رسول اللہ ﷺ کو زیادہ محبوب تھا۔[1]

(۵) حضرت محمد بن ابراہیم تیمی سے روایت ہے کہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے جب رجسٹر مرتب کر کے وظائف مقرر کیے تو حضرات حسنین کریمین رضی اللہ عنہما کی چونکہ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ قرابت اور رشتہ داری تھی اس وجہ سے ان کیلیے ان کے والد (حضرت علی رضی اللہ عنہ) اور اہل بدر کے برابر وظیفہ مقرر کر دیا، چناں چہ ان میں سے ہر ایک کیلیے پانچ، پانچ ہزار مقرر کیے۔[2]

(۶) امام زہری رحمہ اللہ سے روایت ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے (اپنے زمانۂ خلافت میں) صحابہ کے بچوں کو کپڑے دیے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی نظر میں ان کپڑوں کے اندر حضرات حسنین کریمین رضی اللہ عنہما کی شان کے موافق کپڑے نہیں تھے، چناں چہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے یمن کی طرف قاصد بھیج کر ان حضرات کیلیے (عمدہ) کپڑے منگوائے۔ پھر جب ان کیلیے وہ کپڑے لائے گئے تو فرمایا: اب میرا دل خوش ہوا ہے۔[3]

ف: اس سے صاف معلوم ہوا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ، حضرات حسنین کریمین رضی اللہ عنہما کو باقی لوگوں سے الگ اور خصوصی اعزاز دیا کرتے تھے اور ان کی بہت قدر کرتے تھے۔

(۷) ایک مرتبہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت حسین رضی اللہ عنہ سے کہا: پیارے بیٹے! کیا ہی اچھا ہو اگر آپ ہمارے پاس آتے جاتے رہا کریں۔ حضرت حسین رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: چناں چہ ایک دن میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس آیا اور وہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے پاس تنہائی میں بیٹھے تھے۔ (اس وقت اندر جانے کیلیے) حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے صاحبزادے حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ بھی دروازے پر موجود تھے چناں چہ (اجازت نہ ملنے کی وجہ سے) وہ واپس چلے گئے اور ان کو دیکھ کر میں بھی واپس چلا گیا۔

پھر بعد میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے ملاقات ہوئی تو انہوں نے فرمایا: میں نے کب سے آپ کو دیکھا ہی نہیں (یعنی آپ

---

(۱) البدایة والنهایة: ۵۳۷/۶

(۲) تاریخ دمشق لابن عساکر: ۱۷۶/۱۴

(۳) سیر أعلام النبلاء ط الرسالة: ۲۸۵/۳، تاریخ دمشق لابن عساکر: ۱۷۷/۱۴

ہمارے پاس آتے ہی نہیں)۔ میں نے کہا: امیر المومنین! میں آیا تھا، آپ اس وقت حضرت معاویہؓ کے ساتھ تنہائی میں بیٹھے ہوئے تھے۔ آپ کے صاحبزادے بھی دروازے پر موجود تھے چناں چہ (اجازت نہ ملنے کی وجہ سے) وہ واپس چلے گئے اور ان کو دیکھ کر میں بھی واپس چلا گیا تھا۔ اس پر حضرت عمرؓ نے فرمایا: أنتَ أحَقُّ بالإذْنِ مِن ابنِ عُمرَ، فإنّما أنْبتَ مَاتَرىٰ في رُؤُوسِنا اللهُ ثمّ أنتم ''آپ تو ابن عمرؓ سے اجازت کے زیادہ حق دار ہیں۔ اور ہمارے سروں پر جو عزت آپ دیکھ رہے ہیں، اول تو یہ اللہ نے ہمیں عطا کی ہے اور پھر یہ عزت آپ حضرات کے سبب سے ہے''۔[1]

ف: یہاں قابلِ غور مقام یہ ہے کہ اس واقعہ کے وقت سن وعمر کے لحاظ سے حضرت عمرؓ (امیر المومنین ہونے کے ساتھ ساتھ) لوگوں میں ایک عمر رسیدہ بزرگ شخصیت کے حامل ہیں جبکہ حضرت حسینؓ کم عمر بچے یا زیادہ سے زیادہ ایک نوعمر لڑکے ہیں (کیونکہ حضرت حسینؓ کی پیدائش سن 4 ہجری کی ہے اور حضرت عمرؓ نے سن ۱۳ ہجری میں خلافت کی ذمہ داری سنبھالی اور سن ۲۴ ہجری میں شہادت پائی)۔ لیکن اس سب کے باوجود حضرت عمرؓ، حضرت حسینؓ کو اتنا مقام دیا کرتے تھے کہ ان سے ملاقات کی خواہش رکھتے، ان کو اپنے پاس آنے کی دعوت دیتے، ان کو بڑے حضرات جیسا مقام دیتے اور ان کے برابر ان کا احترام کرتے نیز اپنے بیٹے پر بھی ان کو ترجیح دیتے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عمرؓ کو حضرات اہلِ بیت سے کس قدر والہانہ محبت تھی۔

(۸) حضرت عمرؓ تقسیمِ عطایا میں بھی حضرات حسنین کریمینؓ کو دوسرے لوگوں پر ترجیح دیتے تھے، چناں چہ حضرت عمرؓ کے زمانہ میں جب کسریٰ کے خزانے آئے تو ان کی تقسیم کے وقت بھی حضرت عمرؓ نے سب سے پہلے حضرت حسنؓ کو بلا کر دیا پھر حضرت حسینؓ کو بلا کر اسی طرح دیا، ان حضرات کو دینے کے بعد پھر دوسرے لوگوں کو بلا بلا کر دینا شروع کیا۔[2]

(۹) حضرت عبد الرحمن بن ابی لیلی سے روایت ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: حضرت علی رضی اللہ عنہ ہم میں سب سے بہتر فیصلہ کرنے والے ہیں۔[3]

---

(۱) تاريخ دمشق لابن عساكر: ۱۷۶/۱۴، والإصابة: ۶۹/۲، بسند صحيح.

(۲) مصنف عبد الرزاق: ۱۰۰/۱۱، رقم: ۲۰۰۳۶

(۳) الاستيعاب في معرفة الأصحاب: ۱۱۰۲/۳

(۱۰) حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں: مجھے حضرت عمرؓ بدر کے شیوخ کے ساتھ بٹھایا کرتے تھے۔ ان میں سے بعض حضرات کو یہ بات کسی قدر ناگوار گزری۔ ایک دن ان میں سے ایک صاحب نے حضرت عمرؓ سے کہا: یہ ہمارے لڑکوں کے برابر ہے، آپ اس کو کیوں ہمارے ساتھ بٹھاتے ہیں؟ اس پر حضرت عمرؓ نے ان سے فرمایا: اس بات کو تو تم جانتے ہی ہو کہ یہ کون ہستی ہیں؟[۱]

(۱۱) تعدد کتبِ تواریخ واحادیث میں یہ واقعہ موجود ہے کہ حضرت عمر بن خطابؓ نے حضرت علیؓ کی طرف ان کی صاحبزادی "ام کلثوم بنت فاطمة الزهراء" کے ساتھ نکاح کا پیغام بھیجا۔ حضرت علیؓ نے فرمایا: وہ تو ابھی چھوٹی ہے۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا: (میں ان سے نکاح اس لیے کرنا چاہتا ہوں تا کہ آپ کے عالی خاندانِ اہلبیت کے ساتھ میرا تعلق ورشتہ داری قائم ہو جائے کیونکہ) میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا ہے: "قیامت والے دن میرے تعلق اور نسب کے علاوہ ہر تعلق ونسب ختم ہو جائے گا"، لہذا میں چاہتا ہوں کہ میرا رسول اللہ ﷺ کے تعلق اور نسب قائم ہو جائے۔ چناں چہ حضرت علیؓ نے اس کے بھائیوں حضرت حسنؓ وحسینؓ سے فرمایا: اس کا نکاح حضرت عمرؓ سے کردو۔ انہوں نے کہا: یہ بھی دیگر عورتوں کی طرح ایک عورت ہیں یہ خود فیصلہ کرلیں۔ اس پر حضرت علیؓ ناراض ہو کر اٹھ کے جانے لگے تو حضرت حسنؓ نے آپ کا دامن پکڑ لیا اور عرض کی: **لَا صَبْرَ عَلَى هَجْرَانِكَ يَا أَبَتَاهُ** (اے اباجان! آپ کی یہ جدائی ہمارے لیے ناقابلِ برداشت ہے)، چنانچہ انہوں نے پھر حضرت سیدہ ام کلثوم کا نکاح حضرت عمرؓ سے کردیا۔[۲] اور ان کے بطن سے "زید" اور "رقیہ" پیدا ہوئے۔[۳]

(۱۲) حضرت علیؓ کے صاحبزادے "ابن حنفیہ" فرماتے ہیں:

ایک دفعہ حضرت عمر بن خطابؓ تشریف لائے، میں اس وقت اپنی ہمشیرہ "ام کلثوم" کے پاس بیٹھا ہوا تھا۔ آپؓ میرے پاس تشریف لائے اور مجھے محبت سے اپنے ساتھ چمٹا لیا اور "ام کلثوم" سے فرمایا: "مٹھائی کے ساتھ ان کا اکرام کرنا"۔[۴]

---

(۱) صحيح البخاري: ۶/۱۷۹، رقم: ۴۹۷۰

(۲) المعجم الأوسط: ۶/۳۵۷، وسيرة ابن اسحاق = السير والمغازي ص: ۲۴۸

(۳) مختصر التحفة الاثني عشرية، ص: ۳۳۹

(۴) سير أعلام النبلاء ط الرسالة: ۴/۱۱۵، وتاريخ دمشق لابن عساكر: ۵۴/۳۳۱

حضرت عثمان بن عفانؓ کی اہلِ بیتؓ سے محبت

(۱) حضرت عمرؓ اور حضرت عثمانؓ جب رسول اللہ ﷺ کے چچا حضرت عباسؓ کے پاس سے گزرتے اور یہ (یعنی حضرت عمر و عثمان رضی اللہ عنہما) سوار ہوتے تو حضرت عباسؓ کے ادب واحترام میں سواری سے نیچے اتر کر پیدل چلنے لگتے۔[۱]

(۲) ایک آدمی کا حضرت عباسؓ سے کچھ تنازعہ ہوگیا، جس میں اس نے حضرت عباسؓ کی شان میں کچھ ہلکے الفاظ استعمال کیے۔ اس پر حضرت عثمانؓ نے اس شخص کو تنبیہ کے طور پر مارا۔ کسی نے حضرت عثمانؓ سے اس کو مارنے کی وجہ دریافت کی تو آپ نے فرمایا: رسول اللہ ﷺ تو اپنے چچا جان کی عزت وتعظیم کریں اور میں ان کی شان میں خفت آمیز کلمات کہنے کی اجازت دے دوں (یہ کیسے ہوسکتا ہے)؟ پھر فرمایا: جو شخص یہ فعل کرے اور وہ شخص جو اس فعل پر راضی ہو یقیناً اس نے رسول اللہ ﷺ کی مخالفت کی۔[۲]

(۳) حضرت عثمانؓ کے بارے میں آتا ہے کہ وہ حضرات حسنین کریمینؓ کی نہایت عزت اور ان سے بہت محبت کرتے تھے۔ "یوم الدار" (یعنی جس دن حضرت عثمانؓ اپنے گھر میں محصور تھے اور حملہ کیلیے باغیوں نے باہر سے گھر کا احاطہ کررکھا تھا) کے سنگین موقع پر حضرت حسن بن علیؓ تلوار لٹکائے حضرت عثمانؓ کی حفاظت کیلیے حضرت عثمانؓ کے پاس تھے۔ حضرت عثمانؓ نے باغیوں کی شدتِ بغاوت کو دیکھتے ہوئے حضرت حسنؓ کی حفاظتِ جان کی خاطر اُن کو قسم دے کر بھیج دیا کہ آپ اپنے گھر چلے جائیں ایسا نہ ہو کہ یہ باغی لوگ آپ کو بھی نقصان پہنچادیں۔[۳]

---

(۱) البدایة والنهایة طهجر: ۱۰/ ۲۴۹

(۲) تاریخ الطبری: ۴/ ۴۰۰، والتمهید والبیان في مقتل الشهید عثمان، ص: ۹۴، وکنز العمال: ۱۳/ ۵۱۸

(۳) البدایة والنهایة طهجر: ۱۱/ ۱۹۳

ائمہ فقہاء کی اہلِ بیتؓ سے محبت[1]

امام ابوحنیفہؒ کی اہلِ بیتؓ سے محبت

حضرت عبداللہ بن مبارکؒ کی روایت ہے کہ جب امام صاحبؒ کی ملاقات حضرت امام محمد بن علی الباقرؒ سے ہوئی تو آپ نے تعظیماً فرمایا کہ پہلے آپ تشریف رکھیں کہ آپ کی شان کے یہی لائق ہے پھر ہم بیٹھیں گے، پھر فرمایا:

" واللہ! آپ کا احترام ہمارے لیے اسی طرح لازم ہے جس طرح آپ کے نانا حضرت محمد ﷺ کا احترام آپ ﷺ کے صحابہؓ پر لازم تھا اور وہ کرتے تھے۔"

شیخ الاسلام جوینیؒ "فرائد السمطین" میں امام صاحب کی اہلِ بیت کے ساتھ محبت کو بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"بلاشبہ امام اعظم ابوحنیفہؒ اہلِ بیتؓ کے دوستداروں میں سے تھے اور اپنا مال اہلِ بیت کے خفیہ اور ظاہر ائمہ پر نچھاور کرنے والوں میں سے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ آپؒ نے اہلِ بیت کے ایک بزرگ کو جو کہ حکومت سے چھپے ہوئے تھے بارہ ہزار درہم یکشت بطور اکرام پیشِ خدمت کیے۔ امام صاحب اپنے ساتھیوں کو اہلِ بیت کی رعایتِ احوال، ضروریات کی فراہمی اور ان کی اقتداء کا حکم فرماتے تھے۔"

امام شافعیؒ کی اہلِ بیتؓ سے محبت

ایک مرتبہ امام شافعیؒ ایک مجلس میں تشریف لائے جہاں آلِ ابی طالب کے بعض اہلِ علم تھے۔ امام صاحبؒ نے کہا: "ان حضرات کے ہوتے ہوئے میں کلام نہیں کروں گا، یہ حضرات اہلِ فضل و کمال ہیں۔"

آپؒ آلِ نبی ﷺ سے بہت محبت کا اظہار کرتے تھے۔ ایک دفعہ آپ نے اس کی وجہ بیان کرتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے: لَا یُؤْمِنُ أَحَدُکُمْ حَتّٰی أَکُوْنَ أَحَبَّ إِلَیْهِ مِنْ وَالِدِهٖ وَوَلَدِهٖ وَالنَّاسِ أَجْمَعِیْنَ "تم میں سے کوئی اس وقت تک مومنِ کامل نہیں ہوسکتا جب تک کہ میں اس کے نزدیک اس کے والد، اولاد اور تمام لوگوں سے زیادہ محبوب نہ ہو جاؤں"۔

---

(1) استفدنا ما فی ذیله من جلّ المباحث من الکتاب "امام اعظم ابو حنیفه شهید أهل بیت"۔

اور رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ متقی لوگ میرے دوست اور قرابت دار ہیں۔ اور متقی اور نیک رشتہ داروں سے محبت کا حکم ہے، اسی لیے میں رسول اللہ ﷺ کے نیک رشتہ داروں سے محبت کرتا ہوں۔ پھر اپنے مشہور اشعار کہے۔

یا راکِباً قِف بِالمُحَصَّبِ مِن مِنىً... وَاهتِف بِقاعِدِ خَیفِهاوَ النَاهِضِ

سَحَراً إِذا فاضَ الحَجیجُ إِلى مِنىً... فَیضاً كَمُلتَطِمِ الفُراتِ الفائِضِ

إِنّي أُحِبُّ بَني النَبِيِّ المُصطَفى... وَأَعُدُّهُ مِن واجِباتِ فَرائِضي

إِن كانَ رَفضاً حُبُّ آلِ مُحَمَّدٍ... فَلیَشهَدِ الثَقَلانِ أَنّي رافِضي

"اے سوار! منیٰ کے مقامِ مُحَصَّب پر کھڑے ہو کر میدانِ خیف میں بیٹھے اور کھڑے لوگوں کو آواز دو، جب کہ حجاج سحر کے وقت مزدلفہ سے منیٰ کی طرف ٹھاٹھیں مارتے ہوئے دریا کی طرح لوٹتے ہیں، کہ میں نبیٔ مصطفیٰ ﷺ کی اولاد سے محبت کرتا ہوں اور اس کو واجباتِ دین میں سے سمجھتا ہوں، اگر محبتِ اہلِ بیتؓ کا نام رافضیت ہے تو جن و انس گواہ رہیں کہ میں بھی رافضی ہوں"۔

بعض کتبِ تواریخ میں یہ بھی منقول ہے کہ آپؒ نے ہارون الرشید کے دور میں اہلِ بیت کی کسی تحریک میں ان کا ساتھ بھی دیا اور بیعت بھی کی۔ آپ کی شہرۂ آفاق تصنیف "کتاب الأم" میں باغیوں کے بارے میں معاملات کے اسلامی فقہی مسائل آپؒ نے حضرت علیؓ کی لڑائیوں سے مستنبط کیے ہیں اور حضرت علیؓ کے افعال واقوال کو دلیل بنایا ہے۔

نیز امام شافعیؒ نے اپنے دیوان میں متعدد مقامات پر اہلِ بیت سے اپنی انتہاء درجہ کی محبت کا اظہار فرمایا ہے۔ چنانچہ ذیل میں ان کے دیوان میں سے چند مقامات ملاحظہ ہوں۔:[1]

آلُ النَبِيِّ ذَرِیعَتِي... وَهُمو إِلَیهِ وَسِیلَتِي

أَرجو بِهِم أُعطَى غَدًا... بِیَدِيَ الیَمینِ صَحِیفَتِي

"آلِ رسول ﷺ (کی محبت) میرا ذریعۂ نجات ہے، اور وہی حضرات حق تعالیٰ کے حضور میرا وسیلہ ہیں۔ میں امید کرتا ہوں کہ کل قیامت کے دن انہی کے وسیلہ سے میرا نامۂ اعمال مجھے داہنے ہاتھ میں دیا جائے گا"۔

****

(۱) انظر: دیوان الإمام الشافعي، ط: اسلامي كتب خانه كراتشي، وبيت العلم كراتشي.

تَأَوَّهَ قَلْبِي و الفـؤاد كَئِيب ... و أَرِقَ نومي فالسُّهادُ عجيبُ

فمَنْ مُبـلِّغ عني الحسينَ رسـالةً ... وإن كرِهَتها أنفسٌ وقُلوبُ

ذَبِيحٌ بِلا جُـرمٍ كـأنَّ قَميصَـه ... صَبِيغٌ بِمـاءِ الأُرجُـوانِ خَضِيبُ

فَلِلسَّيفِ إعوالٌ ولِلرُّمحِ رَنَّةٌ ... ولِلخَيلِ مِن بعدِ الصَّهِيلِ نَحِيبُ

تَزلزلَتِ الدُنيـا لآلِ محمَّدٍ ... وكادَتْ لهُم صُمُّ الجِبـالِ تذُوبُ

وغارتْ نُجـومٌ واقْشَعَرَّتْ كواكِبُ ... وهُتِّكَ أستارٌ وشُقَّ جُيوبُ

يُصلِّى عَلى المَبعُوثِ مِن آلِ هاشمٍ ... ويُغزىٰ بَنُوه! إنّ ذا لَعَجيبُ

لَئِنْ كَـانَ ذَنبي حُبَّ آلِ محمدٍ ... فَذلكَ ذَنبٌ لستُ عنه أتُوبُ

هُـم شُفَعائِي يومَ حَشْرِي وَمَوقِفِي ... إذا ما بَدَتْ للنَّاظِرين خُطوبُ

(۱) میرا دل آہ آہ کر رہا ہے اور میں کبیدہ خاطر ہوں، میری نیند اڑ گئی ہے اور عجیب بے خوابی کا عالم ہے۔

(۲) ہے کوئی جو سیدنا حسینؓ کو میرا پیغام پہنچادے؟ اگر چہ بعض قلوب اور جانیں اسے ناپسند کرتی ہیں۔

(۳) آپ بلا جرم مظلوم شہید کر دیے گئے گویا آپ کی قمیص، اُرجوان (سرخ قسم کا ایک رنگ ہے) کے پانی سے رنگ دی گئی۔

(۴) تلواریں غلط استعمال پر غم زدہ ہیں اور نیزے چیخ رہے ہیں، اور گھوڑوں کی ہنہناہٹ کے بعد رونے کی آوازیں آرہی ہیں۔

(۵) دنیا آلِ محمد کے غم میں کانپ اٹھی، قریب تھا کہ بے جان پہاڑ بھی پگھل جائیں۔

(۶) ستارے چھپ گئے اور تاروں پر کپکپی طاری ہوگئی، پردے پھاڑ دیے گئے اور گریبان تار تار کر دیے گئے۔

(۷) اس ہاشمی پیغمبر پر درود پڑھا جائے اور ان کی اولاد سے جنگ کی جائے!! کتنی تعجب کی بات ہے۔

(۸) اگر آلِ محمد سے محبت کرنا ہی میرا گناہ ہے، تو یہ ایسا گناہ ہے جس سے میں توبہ نہیں کرسکتا۔

(۹) یہی وہ لوگ ہیں جو میدانِ حشر میں میرے سفارشی ہوں گے جس وقت آنکھیں (عذاب وعقاب کے) ہولناک مناظر دیکھیں گی۔

****

یَـا آلَ بیتِ رَسُـولِ اللہ حُبُّکم ... فَرضٌ مِن اللہ فِي القُـرآنِ أنزَلَه

یَکْفِیکم مِن عَظیمِ الفَخرِ أنکم ... مَن لَم یُصَلِّ علیکُم لَا صَلَاۃَ له

۱- اے اہلِ بیت! تم سے محبت رکھنا اللہ کی طرف سے ہم پر فرض ہے، یہ حکم اُس نے قرآن میں نازل فرمایا ہے۔

۲- تمہارے عظیم المرتبت ہونے کیلیے اتنا کافی ہے کہ جو تم پر درود نہ پڑھے اس کی نماز مکمل نہیں ہوتی۔

****

إذَا فِي مَجلِسٍ نَـذکرُ عَلِیًّـا ... وَسِبطَیـہِ وَفَاطِمَـۃَ الزَّکِیَّہ

یُقَـالُ تَجَـاوزُوا یا قَـومُ هـذا ... فَهٰذَا مِنْ حَدِیثِ الرَّافِضِیَّہ

بَرِئتُ إلَی الـمُهَیمِنِ مِنْ أُنَاسٍ ... یَرَوْنَ الرَّفْضَ حُبَّ الفَاطِمِیَّہ

(۱) جب ہم کسی مجلس میں حضرت علی، حضرات حسنین اور حضرت فاطمہ طاہرہ رضی اللہ عنہم کا ذکر کرتے ہیں

(۲) تو کہا جاتا ہے: اے لوگو! اس کو چھوڑ دو، کیونکہ یہ روافض والی باتیں کررہا ہے۔

(۳) میں اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں ایسے لوگوں سے براءت ظاہر کرتا ہوں جو اولادِ فاطمہ رضی اللہ عنہا سے محبت کو رفض سمجھتے ہیں۔

****

إذا نحنُ فَضَّلْنا عَلِیًّا فإنَّنا ... رَوَافِضُ بالتَّـفضِیلِ عندَ ذَوِي الجَهلِ

وفَضلُ أبي بَکرٍ إذا مَا ذَکَرْتُہ ... رُمِیتُ بنَصْبٍ عِندَ ذِکرِيَ لِلفَضْلِ

فَلَا زِلْتُ ذَا رَفضٍ وَنَصبٍ کِلَاهُمَا ... بِحُبَّیهِما حَتَّی أُوَسَّدَ فِي الرَّمْلِ

(۱) جب ہم حضرت علیؓ کے فضائل بیان کرتے ہیں تو بے علم لوگوں کے ہاں ہم، یہ فضائل بیان کرنے کی وجہ سے، روافض شمار ہوتے ہیں۔

(۲) اور جب میں حضرت ابوبکرؓ کے فضائل بیان کرتا ہوں، تو مجھے، یہ فضائل بیان کرنے کی وجہ سے، "ناصبی" ہونے کا طعنہ دیا جاتا ہے۔

(۳) تو (سن لو!) مَیں قبر میں دفن ہونے تک ان حضرات کی محبت کی وجہ سے ایسا رافضی اور ناصبی ہی رہوں گا۔

امام مالکؒ کی اہلِ بیتؓ سے محبت

امامِ دارالہجرۃ حضرت مالک بن انسؒ نے محبتِ اہلِ بیتؓ میں دردناک مصائب برداشت کیے ہیں۔ والیٔ مدینہ جعفر بن سلیمان عباسی جو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے چچا حضرت عباسؓ کی اولاد میں سے تھے جب انہوں نے حضرت امام صاحبؒ کو زدوکوب کیا اور کوڑے مارے تو آپؒ نے اس کی قرابتِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وجہ سے اسی وقت اس کو معاف کردیا اور فرمایا: وَاللہ ما ارتفعَ سَوطٌ عَن جِسمِي إلا وقد جعلتُه في حِلٍّ لقرابتِه من رسول الله صلى الله عليه وسلم یعنی میرے جسم سے کوڑا اٹھنے سے پہلے ہی میں ان کو، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے رشتہ داری کی وجہ سے، معاف کرچکا ہوتا تھا۔

امام احمد بن حنبلؒ کی اہلِ بیتؓ سے محبت

شیخ ابوزہرہؒ اپنی کتاب "ابن حنبل" میں امام ابن جوزیؒ کی کتاب "مناقب ابن حنبل" کے حوالہ سے لکھتے ہیں:

امام احمدؒ حضرت علیؓ کا دفاع بڑے شد و مد سے کرتے تھے جب کوئی شخص آپ رضی اللہ عنہ کی شان میں طبع آزمائی کرتا کیونکہ وہ زمانہ متوکل عباسی کا تھا اور اس دور میں حضرت علیؓ پر شدید طعن و تشنیع کی جاتی تھی کیونکہ متوکل بھی ناصبی تھا جو حضرت علیؓ کی دشمنی کا علمبردار تھا اور آپ پر طعن کرتا تھا تو امام احمدؒ ان کی باتوں کا جواب دیتے اور آپ رضی اللہ عنہ کے فضائل و مناقب، اور آپؓ کی خلافت کی حقانیت بیان کرتے ہوئے فرماتے: "یقین جانو! خلافت نے علیؓ کو زینت نہیں بخشی، بلکہ علیؓ نے خلافت کو زینت بخشی"۔ اور فرماتے: "علی بن ابی طالب" اہلِ بیتؓ میں سے ہیں ان پر کسی کو قیاس نہیں کیا جاسکتا" اور یہ بھی فرماتے: "کسی بھی صحابیؓ کے بارے میں صحیح اسانید کے ساتھ اتنے فضائل منقول نہیں جتنے کہ سیدنا علیؓ کے بارے میں ہیں"۔

محدثینِ کرامؒ کی اہلِ بیتؓ سے محبت

محدثینِ کرامؒ کے ہاں ائمۂ اہلِ بیتؓ سے سماعِ حدیث وروایتِ حدیث بہت ہی متبرک اور باعثِ فخر ہے۔ چنانچہ محدثین کے ہاں حدیثِ مسلسل کی وہ سند جس کے تمام راوی یا اکثر راوی اگر سادات کرام ہوں تو ایسی سند کو "سلسلۃ الذہب" قرار دیتے ہیں۔ یہ ان سادات کے تقوی، تدین اور حضور ﷺ سے نسبت کے باعث، محدثین کی ان سے عقیدت کا اظہار ہے۔

نمونہ کیلیے ایک سند کا تذکرہ تبرکاً کیا جاتا ہے۔ محدث ابن حجر ہیتمیؒ نے "الصواعق المحرقۃ" میں، امام مُناویؒ نے "شرح الجامع الکبیر" میں، حضرت مدنیؒ نے "مکتوبات شیخ الاسلام" میں، مولانا سرفراز خان صفدرؒ نے "شوقِ حدیث" میں اور مولانا ابوالکلام آزادؒ نے "تذکرہ" میں اور دیگر محدثین نے اپنی کتابوں میں یہ واقعہ درج کیا ہے:

امام حاکمؒ تاریخ نیشابور میں لکھتے ہیں:

حضرت امام علی رضاؒ بن موسیٰ کاظمؒ جب نیشاپور تشریف لائے تو لوگوں کے حد درجہ ازدحام سے نیشاپور کی عجیب صورت حال تھی بیک وقت ہزاروں آدمیوں کے ہجوم ومرور سے تمام شہر گردوغبار میں چھپ گیا تھا، راستوں میں راہ گیر ایک دوسرے کو سوجھائی نہیں دیتے تھے۔ بیس ہزار آدمیوں نے آپ کی خدمت میں حاضر ہوکر آپ سے اپنے آباء کرام کی سند سے حدیث کی روایت کی التجاء کی تاکہ اہلِ بیت کرامؒ کے عالی سلسلۂ سند سے مشرف ومفتخر ہوں۔

ان بیس ہزار آدمیوں میں دو عظیم المرتبت محدثین "امام ابوزرعہؒ" اور "محمد بن اسلم طوسیؒ" بھی تھے، ان کی التجاء پر آپ نے خچر کو روکا اور اپنے نوجوان خدام کو سائبان ہٹانے کا حکم دیا اور مخلوقات نے آپ کے روئے مبارک کی دید سے آنکھوں کو ٹھنڈا کیا، آپ کے گیسوؤں کی دولٹیں آپ کے کندھوں تک لٹکی ہوئی تھیں اور لوگوں کی حالت یہ تھی کہ کچھ چلاّ رہے تھے اور کچھ سسکیاں بھر کے رو رہے تھے۔ علماء محدثین چلاّ چلاّ کر کہہ رہے تھے کہ خاموش ہوجاؤ۔ لوگ خاموش ہوئے تو امام ابوزرعہؒ اور امام محمد بن اسلمؒ نے املاء حدیث کی خواہش کا اظہار کیا تو آپؒ نے فرمایا:

حدثنی ابی سیدنا الامام موسی الکاظم عن ابیہ سیدنا الامام جعفر الصادق عن ابیہ سیدنا الامام

محمد الباقر عن ابیه سیدنا الامام علی زین العابدین عن ابیه سیدنا الامام ابی عبد الله الحسین ریحان رسول الثقلین عن ابیه سیدنا امیر المومنین علی بن ابی طالب رضی الله عنهم قال حدثنی حبیبی و قرة عینی رسول الله صلی الله علیه وسلم قال حدثنی جبرائیل علیه السلام قال قال ربُ العزةِ ذُو الجَلال والإکرام: لَا إلٰهَ إلَّا اللهُ حِصنِي فَمَن قالَها دَخَل حِصنِي وَمَن دَخَل حِصنِي أَمِنَ عَذابِي.

اس کے بعد پردہ گرایا اور چل پڑے ۔ اصحابِ قلم ودوات کے شمار کے مطابق حدیث لکھنے والوں کی تعداد بیس ہزار سے زیادہ تھی۔

فصلِ چہارم: اہل بیت کے ہمارے اوپر حقوق

(۱) ان سے محبت کرنا

اہلِ بیت سے محبت کرنا واجب ہے، اس کے بغیر ایمان مکمل نہیں ہوتا اور اُن سے بغض رکھنا حرام ہے۔[1]

درج ذیل آیت شریفہ و احادیث مبارکہ ملاحظہ ہوں:

(۱) اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

{قُل لَّا أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ أَجْرًا إِلَّا الْمَوَدَّةَ فِي الْقُرْبَىٰ} سورۃ الشوری: ۲۳۔

ترجمہ: اے پیغمبر! کہہ دو کہ: میں تم سے اس (تبلیغ) پر کوئی اجرت نہیں مانگتا، سوائے رشتہ داری کی محبت کے۔

ف: حافظ سخاویؒ اور امام دولابیؒ دونوں نے اہلِ بیتؓ ہی کی سند سے حضرت حسنؓ کا ارشاد نقل کیا ہے، آپؓ نے خطبہ دیتے ہوئے فرمایا: بے شک ہم اہل بیت میں سے ہیں جن سے محبت اور مودّت اللہ تعالیٰ نے ہر مسلم پر فرض کر دی ہے، چناں چہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبیؐ سے کہا:

{قُل لَّا أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ أَجْرًا إِلَّا الْمَوَدَّةَ فِي الْقُرْبَىٰ وَمَن يَقْتَرِفْ حَسَنَةً نَّزِدْ لَهُ فِيهَا حُسْنًا} الشوری: ۲۳۔

ترجمہ: "اے پیغمبر! کہہ دو کہ: میں تم سے اس (تبلیغ) پر کوئی اجرت نہیں مانگتا، سوائے رشتہ داری کی محبت کے اور جو شخص کوئی بھلائی کرے گا، ہم اس کی خاطر اس بھلائی میں مزید خوبی کا اضافہ کر دیں گے۔"

اور یہاں "اقتراف حسنۃ (بھلائی کرنے)" سے مراد اہل بیت سے محبت کرنا ہے۔

اس کے علاوہ شارح عقیدہ واسطیہ لکھتے ہیں:

"اہل سنت والجماعت کثّر اللہ سوادھم، اہلِ بیت عظامؓ سے محبت کرتے ہیں اور ان کی تکریم بجالاتے ہیں کیونکہ ان سے محبت اور انکا اکرام واعزاز اللہ کے رسولؐ سے محبت و اکرام کی مانند ہے اور اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول اکرم دونوں نے اس کا حکم دیا ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا پاک ارشاد ہے:

---

(۱) ينظر: نزل الأبرار بما صح من مناقب أهل البيت الأطهار، ص: ۳۲، وعلموا أولادكم حب آل بيت النبي، ص: ۲۱۔ وكذا ينظر في هذا المقام: [آل رسول الله وأولياؤه] ص: ۶۴

{قُلْ لَاأَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ أَجْرًا إِلَّا الْمَوَدَّةَ فِي الْقُرْبَى} الشوریٰ: ۲۳۔

ترجمہ: اے پیغمبر! کہہ دو کہ: میں تم سے اس (تبلیغ) پر کوئی اجرت نہیں مانگتا، سوائے رشتہ داری کی محبت کے۔[۱]

(۲) حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا فرمان ہے:

أَدِّبُوا أَوْلَادَكُمْ عَلَى ثَلَاثِ خِصَالٍ: حُبِّ نَبِيِّكُمْ وَحُبِّ أَهْلِ بَيْتِهِ وَقِرَاءَةِ الْقُرْآنِ.[۲]

ترجمہ: اپنی اولاد کو تین چیزیں سکھلاؤ: اپنے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی محبت، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اہلِ بیت کی محبت، اور قرآن مجید پڑھنا۔

(۳) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: "أَحِبُّوا اللهَ لِمَا يَغْذُوكُمْ مِنْ نِعَمِهِ وَأَحِبُّونِي بِحُبِّ اللهِ وَأَحِبُّوا أَهْلَ بَيْتِي لِحُبِّي"۔[۳]

ترجمہ: اللہ تبارک وتعالیٰ سے محبت کرو کہ وہ تمہیں اپنی نعمتوں سے نوازتا ہے، اور اُس اللہ کی محبت کی وجہ سے مجھ سے محبت کرو، اور میری محبت کی وجہ سے میرے اہلِ بیت سے محبت کرو"۔

(۴) ایک طویل حدیث میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

"وَاللهِ لَا يَدْخُلُ قَلْبَ رَجُلٍ الْإِيمَانُ حَتَّى يُحِبَّهُمْ لِلهِ وَلِقَرَابَتِهِمْ مِنِّي"۔[۴]

ترجمہ: "اللہ کی قسم! کسی آدمی کے دل میں اس وقت تک ایمان داخل نہیں ہوسکتا جب تک وہ میرے اہلِ بیت سے، اللہ کی خاطر اور میری ان سے رشتہ داری کی وجہ سے ان سے محبت نہ کرے"۔

---

(۱) امامِ اعظم ابو حنیفہ شہیدِ اہل بیت، ص: ۵۳، ۵۴ بحوالہ تفسیر ابن کثیر: ۴/۱۴۳۔ والاستجلاب للسخاوی، ص: ۵۹۔ وشرح العقیدۃ الواسطیۃ، ص: ۱۵۲۔ وکذا ینظر: إحیاء المَیت بفضائل أهل البیت، ص: ۱۳، ۱۴۔ وفضل آل البیت للمَقریزي، ص: ۶۸ ومابعدھا.

(۲) الفتح الکبیر في ضم الزیادۃ إلی الجامع الصغیر: ۱/۵۷۔ وإحیاء المَیت بفضائل أهل البیت، ص: ۳۳

(۳) سنن الترمذي، رقم: ۳۷۸۹۔ وإحیاء المَیت بفضائل أهل البیت، ص: ۱۷، مع نزل الأبرار، ص: ۳۴، والاستجلاب، ص: ۳۹۲

(۴) سنن ابن ماجۃ: ۱/۵۰، رقم: ۱۴۰۔ والمستدرک للحاکم: ۳/۸۵، رقم: ۲۹۶۰

فائدۃ: ینظر للاستزادۃ: الاستجلاب للسخاوي — الباب الثاني: باب الحث علی حبهم — ص: ۳۹۲

(۲) اپنے دلوں کو ان کے بغض سے پاک رکھنا

(۱) ایک دفعہ آپ ﷺ نے بنو عبد المطلب سے مخاطب ہو کر فرمایا:

فَلَوْ أَنَّ رَجُلًا صَفَنَ بَيْنَ الرُّكْنِ وَالْمَقَامِ فَصَلَّى، وَصَامَ ثُمَّ لَقِيَ اللهَ وَهُوَ مُبْغِضٌ لِأَهْلِ بَيْتِ مُحَمَّدٍ دَخَلَ النَّارَ"۔[1]

ترجمہ: "اگر کوئی شخص حجرِ اسود اور مقامِ ابراہیم کے درمیان کھڑا ہو کر نماز پڑھے اور روزے بھی رکھے، پھر وہ اللہ تعالیٰ سے اس حال میں ملے کہ اس کے دل میں حضور ﷺ کے اہلِ بیت کا بغض ہو تو وہ جہنم میں داخل ہوگا۔"

(۲) آپ ﷺ کا ارشاد ہے:

"مَنْ أَحَبَّ عَلِيًّا فَقَدْ أَحَبَّنِي، وَمَنْ أَبْغَضَ عَلِيًّا فَقَدْ أَبْغَضَنِي"۔[2]

ترجمہ: "جس نے علیؓ سے محبت کی اس نے مجھ سے محبت کی اور جس نے علیؓ سے بغض رکھا تو اس نے مجھ سے بغض رکھا"۔

(۳) حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

"مَنْ أَحَبَّ الْحَسَنَ وَالْحُسَيْنَ فَقَدْ أَحَبَّنِي، وَمَنْ أَبْغَضَهُمَا فَقَدْ أَبْغَضَنِي"۔[3]

ترجمہ: "جس نے حضرت حسنؓ اور حضرت حسینؓ سے محبت کی اس نے مجھ سے محبت کی اور جس نے ان سے بغض رکھا تو اس نے مجھ سے بغض رکھا"۔

(۳) ان کی اتباع کرنا

آپ ﷺ نے حج کے موقع پر خطبہ میں یہ فرمایا تھا:

"يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنِّي تَرَكْتُ فِيكُمْ مَا إِنْ أَخَذْتُمْ بِهِ لَنْ تَضِلُّوا: كِتَابَ اللهِ، وَعِتْرَتِي أَهْلَ بَيْتِي"۔[4]

ترجمہ: "اے لوگو! میں تمہارے اندر ایسی چیز چھوڑ کر جا رہا ہوں، کہ اگر تم اسے تھامے رہو گے تو کبھی گمراہ نہیں ہوگے: اللہ کی کتاب، اور میرے اہلِ بیت"۔

---

(۱) أخرجه الحاكم في المستدرك: ۳/ ۱٦۱۔ وقال: هذا حديث حسن صحيح على شرط مسلم، ووافقه الذهبي في التلخيص.

(۲) أخرجه الحاكم في المستدرك: ۳/ ۱۴۱، وقال: هذا حديث صحيح على شرط الشيخين، ووافقه الذهبي في التلخيص.

(۳) سنن ابن ماجه: ۱/ ۵۱

(۴) سنن الترمذي: ۵/ ٦٦۲، رقم: ۳۷۸٦

(۴) ان پر درود وسلام بھیجنا

ان حضرات آلِ بیت کا ہمارے اوپر ایک حق یہ بھی ہے کہ ہم ان پر درود بھیجیں، اور خود اللہ کے نبی ﷺ نے ہمیں ان پر درود بھیجنے کا حکم فرمایا ہے، جیسا کہ ایک حدیث میں آتا ہے کہ صحابہ کرامؓ نے عرض کی: یارسول اللہ! ہم آپ پر کیسے درود بھیجا کریں؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا:

یوں کہا کرو:

اللّٰهُمَّ صَلِّ عَلَى مُحَمَّدٍ، وَعَلَى آلِ مُحَمَّدٍ، كَمَا صَلَّيْتَ عَلَى آلِ إِبْرَاهِيمَ، إِنَّكَ حَمِيدٌ مَجِيدٌ، اللّٰهُمَّ بَارِكْ عَلَى مُحَمَّدٍ وَعَلَى آلِ مُحَمَّدٍ، كَمَا بَارَكْتَ عَلَى آلِ إِبْرَاهِيمَ، إِنَّكَ حَمِيدٌ مَجِيدٌ

"اے اللہ! حضرت محمد ﷺ پر اور ان کی آل پر رحمت نازل فرما جیسا کہ آپ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی آل پر رحمت نازل فرمائی، بلاشبہ آپ تعریف اور بزرگی والے ہیں۔ اے اللہ! حضرت محمد ﷺ پر اور ان کی آل پر برکت نازل فرما جیسا کہ آپ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی آل پر برکت نازل فرمائی، بلاشبہ آپ تعریف اور بزرگی والے ہیں"[1]۔

ابن القیمؒ نے حضور پاک ﷺ پر درود بھیجنے کے فضائل میں ایک مستقل کتاب تالیف کی ہے جس کا نام ہے: "جلاء الأفهام في فضل الصلاة والسلام على محمد خيرِ الأنام"۔ اس میں انہوں نے بڑی وضاحت سے یہ بات لکھی ہے کہ ساری امت میں سے صرف اہلِ بیت کا یہ حق ہے کہ ان پر درود بھیجا جائے۔ اور اس مسئلہ میں پوری امت متفق ہے، کسی کا کوئی اختلاف نہیں ہے۔[2]

---

(۱) صحيح مسلم: ۱/۳۰۵

(۲) جلاء الأفهام ص: ۲۲۳، وراجع أيضا: آل البيت وحقوقهم الشرعية ص: ۱۲، وكذا ينظر لزاما لمزيد من الكلام فيه: الأنوار الباهرة بفضائل أهل البيت والذرية الطاهرة، ص: ۲۷ وما بعدها.

فائدة: ينظر للاستزادة: في هذا الباب "الاستجلاب للسخاوي — الباب الثالث وما بعده من الأبواب — " فتجد فيه ما تجد، و "الأنوار الباهرة لأبي الفتوح التليدي — الباب الأول — ".

دوسرا باب: ازواجِ مطہرات سلامُ اللہ ورِضوانُہٗ علیہن

حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ازواجِ مطہرات سلامُ اللہ ورِضوانُہٗ علیہن کی تعداد گیارہ تھی جن میں سے دو (۲) نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حیاتِ مبارکہ میں ہی وصال فرمایا: ایک حضرت خدیجہ سلامُ اللہ ورِضوانُہٗ علیہا، دوسری حضرت زینب بنت خزیمہ سلامُ اللہ ورِضوانُہٗ علیہا، باقی نو (۹) ازواجِ مطہرات آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات کے وقت باحیات تھیں۔ ذیل میں ان کے اسماءِ گرامی کو بترتیبِ نکاح ذکر کیا جاتا ہے:

۱۔ حضرت خدیجہ بنت خویلد سلامُ اللہ ورِضوانُہٗ علیہا

۲۔ حضرت سودہ بنت زمعہ سلامُ اللہ ورِضوانُہٗ علیہا

۳۔ حضرت عائشہ بنت ابی بکر صدیق سلامُ اللہ ورِضوانُہٗ علیہا

۴۔ حضرت حفصہ بنت عمر بن خطاب سلامُ اللہ ورِضوانُہٗ علیہا

۵۔ حضرت زینب بنت خزیمہ سلامُ اللہ ورِضوانُہٗ علیہا

۶۔ حضرت ام سلمہ ہند بنت ابی امیہ سلامُ اللہ ورِضوانُہٗ علیہا

۷۔ حضرت زینب بنت جحش سلامُ اللہ ورِضوانُہٗ علیہا

۸۔ حضرت جویریہ بنت حارث سلامُ اللہ ورِضوانُہٗ علیہا

۹۔ حضرت ام حبیبہ رملہ بنت ابوسفیان سلامُ اللہ ورِضوانُہٗ علیہا

۱۰۔ حضرت صفیہ بنت حیی بن اخطب سلامُ اللہ ورِضوانُہٗ علیہا

۱۱۔ حضرت میمونہ بنت حارث سلامُ اللہ ورِضوانُہٗ علیہا۔ [۱]

---

[۱] المواهب اللدنية بالمنح المحمدية ۱/۴۹۰ مع السمط الثمين في مناقب أمهات المؤمنين، ص: ۱۳، وسیرت مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم: ۳/۲۷۳، وعقائد أهل السنة والجماعة، ص: ۱۸۲

ازواجِ مطہراتؓ کے مجموعی فضائل

اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیب ﷺ کی زوجیت کیلیے جن مقدس و پاکیزہ خواتین کا انتخاب فرمایا تھا انہیں اپنی طرف سے خصوصی اعزازات اور فضائل سے بھی نوازا تھا۔ چناں چہ درج ذیل آیات وغیرہ ملاحظہ ہوں:

(۱) {النَّبِيُّ أَوْلَىٰ بِالْمُؤْمِنِينَ مِنْ أَنفُسِهِمْ وَأَزْوَاجُهُ أُمَّهَاتُهُمْ}[1]

ترجمہ: ایمان والوں کیلیے یہ نبی اُن کی اپنی جانوں سے بھی زیادہ قریب تر ہیں، اور ان کی بیویاں اُن کی مائیں ہیں۔

ف: مائیں ہونے کا مطلب یہ ہے کہ ادب واحترام اور تکریم وتعظیم میں وہ مائیں ہیں بلکہ ماؤں سے بھی بڑھ کر ان کا احترام ایمان والوں پر لازم ہے۔ یعنی ادب واحترام اور ان کے ساتھ نکاح کے حرام ہونے میں وہ ماؤں کی طرح ہیں ورنہ دیگر احکامات جیسے ان سے پردہ کرنا، ان کے ساتھ خلوت میں بیٹھنا اور میراث جاری ہونا وغیرہ امور میں وہ اجنبی عورتوں کی طرح ہیں۔ بہرحال ازواجِ مطہراتؓ کیلیے بلاشبہ یہ نہایت اعزاز اور فضیلت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے کلامِ مجید میں ان کو تمام ایمان والے مردوں اور عورتوں کی مائیں قرار دے کر انہیں "امہات المومنین" کے لقب سے نوازا ہے۔[2]

(۲) {وَمَن يَقْنُتْ مِنكُنَّ لِلَّهِ وَرَسُولِهِ وَتَعْمَلْ صَالِحًا نُّؤْتِهَا أَجْرَهَا مَرَّتَيْنِ وَأَعْتَدْنَا لَهَا رِزْقًا كَرِيمًا}۔[3]

ترجمہ: اور تم (ازواجِ مطہراتؓ) میں سے جو کوئی اللہ اور اس کے رسول کی تابع دار رہے گی، اور نیک عمل کرے گی، اُسے ہم اُس کا ثواب بھی دوگنا دیں گے، اور اُس کیلیے ہم نے باعزت رزق تیار کررکھا ہے۔

ف: مطلب یہ ہے کہ کوئی نیکی کرنے پر جتنا اجر وثواب دوسرے لوگوں کو ملتا ہے، ان ازواجِ مطہراتؓ کو اس پر دوگنا اجر ملے گا۔ نیز اس دوگنے اجر کے علاوہ، اللہ تعالیٰ نے ان کیلیے جنت میں عالی شان رزق اور ایک خوشگوار زندگی کا سامان بھی تیار کر رکھا ہے۔ ان اعزازات سے واضح ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو خصوصی مقام ومرتبہ سے نوازا ہے۔[4]

---

(۱) الأحزاب: ۶

(۲) انظر: تفسیر ابن کثیر: ۳۴۰/۶، وتفسیر القرطبي: ۱۲۳/۱۴، وتفسیر البغوی: ۵۰۹/۳

(۳) الاحزاب: ۳۱

(۴) انظر: تفسیر الطبري = جامع البیان: ۲۵۶/۲۰ وروح المعاني: ۱۸۵/۱۱

(۳) {يَا نِسَاءَ النَّبِيِّ لَسْتُنَّ كَأَحَدٍ مِّنَ النِّسَاءِ إِنِ اتَّقَيْتُنَّ}۔[1]

ترجمہ: اے نبی کی بیویو! اگر تم تقویٰ اختیار کرو تو تم عام عورتوں کی طرح نہیں ہو۔

ف: یعنی اے ازواجِ مطہرات! جب تم تقویٰ اور نیکی والے اعمال کروگی تو دنیا کی کوئی عورت بھی تمہارے برابر نہیں ہوگی اور نہ ہی کوئی عورت تمہارے مقام و مرتبہ اور تمہاری شان و رفعت کو پا سکے گی، بلکہ تمہارا اجر و مقام اللہ تعالیٰ کے نزدیک باقی تمام تر عورتوں سے کہیں زیادہ وارفع ہے۔[2]

(۴) {إِنَّمَا يُرِيدُ اللَّهُ لِيُذْهِبَ عَنكُمُ الرِّجْسَ أَهْلَ الْبَيْتِ وَيُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيرًا}۔[3]

ترجمہ: اے نبی کے اہلِ بیت (گھر والو)! اللہ تو یہ چاہتا ہے کہ تم سے گندگی کو دور رکھے، اور تمہیں ایسی پاکیزگی عطا کرے جو ہر طرح مکمل ہو۔

ف: یہ آیت ازواجِ مطہرات کے بارے میں نازل ہوئی ہے، اور اس میں اللہ تعالیٰ نے ازواجِ مطہرات کے ساتھ "تطہیر" یعنی گناہوں کی گندگی سے دوری کا وعدہ فرمایا ہے۔ ازواجِ مطہرات کے پاک ہونے کیلیے اتنا ہی کافی ہے کہ خود اللہ تعالیٰ نے انکی پاکی وطہارت کی گواہی دی ہے، یہی وجہ ہے کہ آج تک ان کے ساتھ "مطہرات (پاک عورتیں)" کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ اور اس آیتِ شریفہ کی بحوالہ وضاحت اسی کتاب کے آغاز میں گزر چکی ہے۔

(۵) سنن ابی داؤد وغیرہ کتبِ احادیث میں یہ واقعہ آتا ہے کہ حضرت ابن عباسؓ کو ایک شخص نے ازواجِ مطہراتؓ میں سے کسی کے انتقال کی خبر دی تو آپ سجدہ میں گر گئے۔ کسی نے اس کی وجہ دریافت کی تو فرمایا: رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے:

إِذَا رَأَيْتُمْ آيَةً فَاسْجُدُوا یعنی جب تم کوئی حادثہ دیکھو تو سجدہ میں (یعنی نماز میں) مشغول ہو جاؤ۔ اس سے بڑا حادثہ اور کیا ہوگا کہ حضور ﷺ کی زوجہ مطہرہ کا انتقال ہو گیا۔[4]

---

(۱) الأحزاب: ۳۲

(۲) تفسير ابن كثير: ۶/۳۶۳، وتفسير البغوي: ۶۳۵/۳

(۳) الأحزاب: ۳۳

(۴) سنن أبي داؤد: ۱/۳۱۱

ازواجِ مطہرات سَلامُ اللّٰہِ وَرِضْوانُہٗ علیہن کی سیرت ومناقب

(۱) ام المومنین حضرت خدیجہ سَلامُ اللّٰہِ وَرِضْوانُہٗ علیہا

تمہیدی بات:

امی جان سیدتنا حضرت خدیجۃ الکبریٰ سَلامُ اللّٰہِ وَرِضْوانُہٗ علیہا ہمارے نبیٔ پاک حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی سب سے پہلی زوجہ مطہرہ ہیں جو حضرت فاطمۃ الزہراء سَلامُ اللّٰہِ وَرِضْوانُہٗ علیہا کی والدہ اور حضرت حسنؓ وحسینؓ کی نانی ہیں۔ آپ سَلامُ اللّٰہِ وَرِضْوانُہٗ علیہا وہ محترم خاتون ہیں جو اسلام لانے سے قبل ہی زمانہ جاہلیت میں، اپنی پاکدامنی اور پاکیزہ سیرت کی بدولت اہلِ مکہ کے اندر "طاہرہ" کے لقب سے معروف ومشہور تھیں۔ [1]

نام ونسب:

آپ سَلامُ اللّٰہِ وَرِضْوانُہٗ علیہا کا نام "خدیجہ" تھا، آپؓ کے والد کا نام "خُوَیلِد"، دادا کا نام "اَسَد"، والدہ کا نام "فاطمہ"، نانی کا نام "ہالہ" اور نانا کا نام "زائدہ" تھا۔ آپؓ مکہ مکرمہ کے مشہور وذی وجاہت خاندان "قریش" سے تعلق رکھتی تھیں، بلکہ آپؓ خواتینِ قریش میں سے سب سے معزز اور سب سے مالدار خاتون تھیں۔ [2] آپ صلی اللہ علیہ وسلم بھی چونکہ "قریش" خاندان کے تھے، اس لیے "قُصَی" پر پہنچ کر آپؓ کا نسب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے نسب سے مل جاتا ہے۔ تمام ازواجِ مطہراتؓ میں سے نسب کے لحاظ سے آپؓ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سب سے زیادہ قریب ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے "قُصَی" کی اولاد میں سے ان کے علاوہ صرف ام حبیبہؓ سے نکاح فرمایا تھا۔ [3]

---

(۱) انظر: أسد الغابۃ ط العلمیۃ: ۸۰/۷، وخدیجۃ بنت خویلد، ص: ۱۲ و۴۹

فائدہ: من أراد الاستزادۃ من سیرتھا المیمونۃ فلیراجع کتبا اختصت بھا نحو: "خدیجۃ بنت خویلد للدکتور محمد عبدہ یمانی" وغیرہ.

(۲) مجمع الزوائد ومنبع الفوائد: ۲۱۸/۹، وسیرۃ ابن ھشام ت السقا: ۱۸۹/۱

(۳) فتح الباري لابن حجر: ۱۳۴/۷ وینظر لبسط الکلام في نسبھا: [خدیجۃ بنت خویلد، ص: ۳۳ وما بعدھا]

ولادت باسعادت:

آپ ؓ مکہ مکرمہ میں "قبل الہجرۃ سن "۶۸ میں پیدا ہوئیں۔ یہ عیسوی تاریخ کے اعتبار سے چھٹی صدی کا نصف یعنی تقریباً سن ۵۵۵ یا ۵۵۶ عیسوی بنتا ہے۔ اور یہ "عام الفیل" (یعنی جس سال۔ معاذ اللہ۔ ابرہہ نے ہاتھیوں کے ذریعہ بیت اللہ شریف پر حملہ کیا تھا) سے تقریباً ۱۵ سال پہلے کا زمانہ ہے۔[1]

حضور ﷺ سے قبل آپ ؓ کے نکاح:

رسول اللہ ﷺ کے نکاح میں آنے سے پہلے یکے بعد دیگرے آپ ؓ کے دو نکاح ہو چکے تھے۔ سب سے پہلے آپ ؓ کے نکاح کی بات آپ کے چچازاد بھائی "وَرَقہ بن نَوفل" کے ساتھ چلی، مگر ان کے ساتھ نکاح نہ ہو سکا اور آپ کا نکاح "ابو ہالہ تمیمی" کے ساتھ ہو گیا (جن کا نام "ہند بن نَبّاش" یا "مالک بن نباش" تھا)۔ ان سے دو بیٹے "ہند" اور "ہالہ" پیدا ہوئے۔ ابو ہالہ کے انتقال کے بعد آپ کا نکاح "عتیق بن عابد" سے ہوا۔ ان سے ایک بیٹی "ہند" پیدا ہوئی۔[2]

آپ ؓ کا حضور ﷺ کو تجارت کیلیے اپنا مال دینا:

عام الفیل (جس سال ابرہہ نے ہاتھیوں کے ذریعہ بیت اللہ پر حملہ کیا تھا) کے بیس برس بعد عربوں میں "الفجار" نامی ایک مشہور جنگ ہوئی۔ [3]راجح قول کے مطابق حضرت خدیجہ ؓ کے والد "خُویلد" اس جنگ سے پہلے ہی فوت ہو گئے تھے، [4]اور ادھر یکے بعد دیگر آپ ؓ کے دونوں شوہر بھی فوت ہو گئے۔ [5]تو چونکہ آپ ؓ کے خاندان کا ذریعۂ معاش تجارت تھا، اس لیے آپ ؓ نے اپنی تجارت کی خود نگرانی کی۔ آپ سَلامُ اللہِ وَرِضوانُہ علیہا اپنے قریبی رشتہ داروں کو مضاربت پر اپنا مال دے کر مکہ مکرمہ سے شام کی طرف تجارت کیلیے بھیجا کرتی تھیں۔

چونکہ آپ ؓ بیوہ ہو چکی تھیں اور قریش کی ایک شریف و پاکباز اور مالدار تاجر خاتون تھیں اس لیے قریش کا ہر شریف وصاحبِ حیثیت شخص آپ ؓ سے نکاح کرنے کا خواہش مند تھا، لیکن اللہ تعالیٰ نے آپ ؓ کے مقدر میں رسول اللہ ﷺ

---

(1) سیرت امہات المومنین، ص: ۲۳ مع الطبقات الکبری: ۱۰۵/۱، وزوجات النبي محمد وأسرار الحکمة في تعددهن، ص: ۲۱

(2) الطبقات الکبری: ۸/۱۱ مع سبل الهدی والرشاد في سیرة خیر العباد: ۱۱/۱۵۵، والسمط الثمین، ص: ۴۹ مع التحشیة.

(3) الطبقات الکبری ط العلمیة: ۱/۱۰۲، والبدایة والنهایة ط ہجر: ۳/۳۷۸

(4) الطبقات الکبری ط العلمیة: ۱/۱۰۶، وعیون الأثر: ۱/۶۴

(5) السمط الثمین، ص: ۴۹، وامہات المومنین، ص: ۱۱

کی زوجیت کی بے بدل سعادت لکھ دی تھی، چناں چہ کسی کے ساتھ آپ ؓ کا نکاح نہ ہوا۔ اور بالآخر آپ ؓ کو سید عالَم ﷺ کے مبارک نکاح میں آنا نصیب ہوا اور آپ ؓ "ام المومنین" کے عظیم لقب سے سرفراز ہوئیں۔

جب آپ ﷺ کی عمر مبارک پچیس سال ہوگئی اور آپ ﷺ اپنے شفیق چچا "ابوطالب" کے ساتھ رہتے تھے، اور قریش کے لوگوں کا ذریعۂ معاش تجارت ہی تھا تو ایک دن "ابوطالب" نے کہا کہ بھتیجے! معاشی طور پر آجکل ہمارے ایام تنگی اور سختی سے گزر رہے ہیں لہٰذا روزی کمانے کی ضرورت ہے۔ اور میں مالدار آدمی نہیں ہوں، اس لیے آپ کو اپنی ذاتی رقم یا سامانِ تجارت دے کر تجارت کیلیے بھیجنے سے قاصر ہوں۔ تم ایسا کرو کہ ان دنوں ہمارے یہاں سے مختلف قافلے سامانِ تجارت لے کر شام جانے لگے ہیں تو جس طرح دوسرے لوگ خدیجہ بنت خویلد کا مالِ تجارت ملکِ شام لے جا کر بیچتے ہیں اور نفع کماتے ہیں اسی طرح تم بھی جا کر ان سے بات کرلو، وہ تمہارے صادق و امین ہونے کی وجہ سے دوسروں کے مقابلہ میں تمہیں ترجیح دے گی۔ اگرچہ میرا دل نہیں مانتا کہ میں آپ کو مکہ سے دور کہیں بھیجوں مگر اس وقت ہم مجبور ہو چکے ہیں۔

جب حضرت خدیجہ کو معلوم ہوا کہ محمد بن عبداللہ جو کہ صادق و امین کے لقب سے معروف ہیں، ان کو ان کے چچا میرا مال "شام" لے جا کر فروخت کرنے کا مشورہ دے رہے ہیں، اور آپ ؓ کو بھی اپنی تجارتی سرگرمیوں کیلیے ایسے ہی قابلِ اعتماد آدمی کی ضرورت تھی تو آپ ؓ نے خود، حضور اقدس ﷺ کی سچائی، امانتداری، کریمانہ اخلاق اور معاملہ فہمی کے پیش نظر، آپ ﷺ کی خدمت میں پیغام بھیجا کہ آپ میرا مالِ تجارت لے کر شام جائیں۔ جو معاوضہ میں دوسروں کو دیتی ہوں، آپ کو اس کا دوگنا دوں گی۔ حضور ﷺ نے اس پیش کش کو قبول فرمالیا، اور اپنے چچا ابوطالب کو جا کر بتایا کہ خدیجہ نے آپ کو باقی لوگوں کے مقابلہ میں دوگنا نفع دینے کا کہا ہے تو ابوطالب بہت خوش ہوئے اور کہا: اِنَّ ھٰذَا لَرِزْقٌ سَاقَهُ اللّٰهُ اِلَیْکَ۔ (بلاشبہ یہ روزی اللہ نے ہی تمہاری طرف بھیجی ہے۔)

بہرحال حضور ﷺ، آپ ؓ کا مال لے کر "شام" کی طرف روانہ ہوگئے۔ حضرت خدیجہ نے اپنا ایک غلام بھی ساتھ کردیا جس کا نام "مَیْسَرہ" تھا اور چلتے ہوئے اسے کہا کہ دیکھو! سفر میں ان کی (یعنی آپ ﷺ کی) کسی معاملہ میں مخالفت نہ کرنا۔

سفر پر جب روانہ ہوگئے تو راستہ میں دھوپ کے وقت ایک بادل آیا اور اس نے آکر حضور ﷺ پر سایہ کردیا۔ یہ

عجیب بات دیکھ کر میسرہ بہت حیران ہوا۔

پھر جب یہ دونوں حضرات شام پہنچ گئے تو وہاں یہ بات بھی پیش آئی کہ آپ ﷺ نے وہاں بازار کے قریب ایک درخت کے نیچے قیام فرمایا جو "نسطورا" نامی ایک راہب (یعنی نصرانی عالم) کے عبادت خانہ کے پاس ہی تھا۔ اس راہب نے میسرہ سے پوچھا کہ یہ شخص کون ہے؟ میسرہ نے جواب دیا کہ یہ مکہ کے رہنے والے ایک قریشی نوجوان ہیں۔ راہب نے (آپ ﷺ میں نبی آخرالزمان کی علامات دیکھ کر) کہا: سنو! یہ آخری نبی ہوں گے۔

اس کے بعد جب بازار میں گئے اور آپ ﷺ نے خرید وفروخت شروع کی تو اس دوران ایک دکاندار نے آپ ﷺ سے کہا کہ لات وعزّیٰ (نامی بتوں) کی قسم کھاؤ۔ آپ ﷺ نے اس سے فرمایا: مَا حَلَفْتُ بِهِمَا قَطُّ۔ (میں نے زندگی بھران کی کبھی قسم نہیں کھائی)۔ اس دکاندار نے کہا: چلو ٹھیک ہے، رہنے دو۔ معاملہ ہوجانے کے بعد وہ دکاندار میسرہ کو ایک طرف لے گیا اور کہا کہ یہ صاحب "نبی" ہیں جن کا تذکرہ ہمارے علماء کی کتابوں میں موجود ہے۔ یہ بات یہاں قابل ذکر ہے کہ اس سفر میں حضرت خدیجہ کے مال میں آپ ﷺ کی وجہ سے بہت نفع ہوا، حتیٰ کہ میسرہ نے بھی آپ ﷺ سے اس بات کا اظہار کیا کہ ہمیں زندگی بھر اتنا نفع کبھی نہیں ہوا۔

تجارتی مصروفیات سے فراغت پر مکہ مکرمہ سے گئے ہوئے تمام قافلے واپس چل دیے۔ پورے راستہ میں یہ ہوتا رہا کہ دورانِ سفر جب آپ اونٹ پر سوار ہوتے اور دھوپ شدت پکڑ جاتی تو دو فرشتے آ کر آپ ﷺ کے اوپر سایہ کر دیتے۔ یہ بات عین اس وقت بھی پیش آئی جب آپ ﷺ شدید دھوپ کے اندر اونٹ پر سوار، مکہ میں داخل ہو رہے تھے۔ اتفاق سے اس وقت حضرت خدیجہ اپنے گھر کے بالاخانہ میں بیٹھی ہوئی تھیں انہوں نے بھی اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کیا کہ دو فرشتے ہیں جنہوں نے دھوپ سے بچاؤ کیلیے آپ ﷺ پر سایہ کیا ہوا ہے۔

بہرحال جب حضرت خدیجہؓ کے پاس واپسی ہوگئی تو میسرہ نے آپؓ کو سارا حال کہہ سنایا جس میں راہب اور اس دکاندار کا قصہ بھی سنایا کہ انہوں نے آپ کے نبی آخرالزمان ہونے کی خبر دی ہے۔

اس کے علاوہ حضرت خدیجہؓ غیر متوقع طور پر اتنا زیادہ نفع دیکھ کر خوش ہوئیں اور آپ ﷺ کو مقرر کردہ نفع سے دوگنا نفع دیا۔[1]

---

(۱) سبل الهدى والرشاد في سيرة خير العباد: ۲/ ۱۵۸

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ آپؓ کا نکاح:

قافلۂ شام سے واپسی کے بعد خود حضرت خدیجہؓ نے "نفیسہ بنت مُنیہ" کو پیغامِ نکاح دے کر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس بھیجا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسے قبول فرمالیا۔ اُس نے آکر حضرت خدیجہؓ کو یہ بتایا تو آپؓ نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف بھی کہلا بھیجا کہ فلاں وقت تشریف لے آئیں اور ادھر اپنے چچا زاد بھائی "عمرو بن اسد" کو بھی پیغام بھجوادیا کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ ان کا نکاح کرانے کیلیے وہ بھی آجائیں (کیونکہ آپؓ کے والد فوت ہوچکے تھے)۔ پھر مقررہ وقت پر "عمرو بن اسد" بھی آگئے اور ادھر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آپ کے چچا حضرت حمزہ اور ابو طالب بھی حضرت خدیجہؓ کے مکان پر پہنچ گئے، اور ابو طالب اپنے خاندان کے دس بڑے افراد بھی ساتھ لائے۔ مجلس نکاح منعقد ہوئی اور "عمرو بن اسد" نے حضرت خدیجہؓ کا نکاح آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ کردیا اور نکاح کرنے کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعریف میں "عمرو بن اسد" نے یہ جملہ کہا: هذا الفحلُ لا يُقدَع أنفه یعنی یہ محمد بن عبداللہ عالی نسب اور معزز جواں مرد ہیں۔ نکاح میں ساڑھے بارہ اوقیہ چاندی (جو ۵۰۰ درہم کے مساوی ہوتے ہیں اور آجکل کے پیمانوں کے لحاظ سے ان کا وزن ۱۳۱ تولہ اور ۳ ماشہ چاندی بنتا ہے) مہر مقرر ہوا۔ نکاح کے وقت حضرت خدیجہؓ کی عمر ۴۰ سال اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عمر مبارک ۲۵ برس تھی۔[1] اور آپ سلامُ اللہِ وَرِضوانُہُ علیہا نسب، مال اور دانائی کے لحاظ سے اُس وقت اپنی قوم کی سب سے افضل خاتون تھیں۔[2]
آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا حضرت خدیجہؓ سے یہ نکاح قافلۂ شام سے واپسی کے دو ماہ اور پچیس دن بعد ہوا۔[3]

دعوتِ ولیمہ:

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا جب حضرت خدیجہ سے نکاح ہوچکا اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اٹھ کر باہر تشریف لے جانے لگے تو آپؓ نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پوچھا: آپ کہاں جارہے ہیں؟ پھر کہا: آپ جائیں اور ایک دو اونٹ ذبح کرکے لوگوں کو کھلادیں۔ چناں چہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایسا ہی کیا اور یہ سب سے پہلا ولیمہ تھا جو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کیا۔[4]

---

(۱) سبل الهدى والرشاد في سيرة خير العباد: ۱۶۳/۲، والطبقات الكبرى ط العلمية: ۱۰۵/۱

(۲) الرحيق المختوم ص: ۵۱

(۳) شرح الزرقاني على المواهب اللدنية بالمنح المحمدية: ۳۷۲/۱

(۴) السمط الثمين ص: ۵۴

اولاد:

حضرت خدیجہؓ کو یہ خصوصیت بھی حاصل ہے کہ حضور اقدس ﷺ کی اولاد صرف انہی بیوی سے پیدا ہوئی، اور کسی بیوی سے اولاد نہیں ہوئی۔ صرف ایک صاحبزادے "ابراہیمؓ" آپ ﷺ کی باندی حضرت ماریہ قبطیہؓ کے بطن سے پیدا ہوئے۔ باقی سب اولاد حضرت خدیجہؓ کے بطن مبارک سے پیدا ہوئی جن میں دو صاحبزادے تھے: ایک حضرت قاسمؓ اور دوسرے حضرت عبداللہؓ جن کو "طیب" اور "طاہر" بھی کہا جاتا تھا۔ اور چار صاحبزادیاں تھیں: حضرت زینبؓ، حضرت رقیہؓ، حضرت ام کلثومؓ، اور حضرت فاطمہؓ۔ (اولاد کی قدرے تفصیلی وضاحت دوسرے باب کے شروع میں ذکر کی جائے گی۔)

حضرت خدیجہ کا حضور ﷺ پر ایمان لانا اور مشکل اوقات میں آپ ﷺ کو تسلیاں دینا:

حضرت خدیجہ، اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ پر سب سے پہلے ایمان لانے والی اور آپ ﷺ کے لائے ہوئے دین کی سب سے پہلے تصدیق کرنے والی تھیں۔ آپ سلام اللہ و رضوانہ علیہا کے اسلام لانے سے اللہ تعالیٰ نے حضور ﷺ کے مصائب ہلکے کر دیے۔ چناں چہ جب دعوتِ اسلام دینے پر آپ کو آگے سے ناگوار باتوں کا سامنا کرنا پڑتا کہ وہ لوگ دعوت قبول کرنے کے بجائے آپ کی دعوت کی تردید کرتے اور آپ ﷺ کو جھٹلاتے جس سے آپ غمزدہ ہوتے تو اللہ تعالیٰ حضرت خدیجہ کے ذریعہ اس رنج و غم کو دور فرما دیتے تھے۔

اور پھر جب آپ ﷺ ان کے پاس گھر تشریف لاتے تو وہ آپ ﷺ کی ہمت مضبوط کرتیں اور تسلیاں دے کر آپ کے غم کو ہلکا کرتی تھیں۔ آپ ﷺ کی تصدیق بھی کرتیں اور لوگوں کی ترش روئی اور مخالفت کو آپ ﷺ کے سامنے کمزور اور ناپائیدار بنا کر بیان کرتی تھیں۔[1]

اور آپ سلام اللہ و رضوانہ علیہا کے بارے میں لکھا ہے:

"وَكَانَتْ لَهُ وَزِيرَ صِدْقٍ عَلَى الْإِسْلَامِ، يَشْكُو إِلَيْهَا".[2] یعنی حضور اقدس ﷺ اپنی پریشانیاں حضرت خدیجہ کے سامنے ذکر کرتے اور وہ اسلام کے سلسلہ میں آپ ﷺ کی سچی مخلص مشیر کار تھیں۔

---

(۱) البدایۃ والنہایۃ طہجر: ۵۸/۴

(۲) السیرۃ النبویۃ لابن ہشام ت السقا: ۲۱۶/۱

ہر وہ مصیبت جو آپ ﷺ کو دعوتِ اسلام میں پیش آتی حضرت خدیجہ پوری طرح اس میں آپ ﷺ کی شریکِ غم ہوتیں اور آپ ﷺ کے ساتھ خود بھی تکلیفیں سہتی تھیں۔ چناں چہ کفار مکہ کے بائیکاٹ کرنے کی وجہ سے جب شعب ابی طالب میں حضور ﷺ نے ۷ نبوی سے ۱۰ نبوی تک تین برس کا انتہائی کٹھن وقت گزارا جس میں فاقوں پر فاقے گزرے، مرد و عورت سب ہی بھوک سے بے تاب ہوجاتے تھے اور بچوں کی چیخیں گھاٹی کے پار سنائی دیتی تھیں۔ تو ان مشکل ترین گھڑیوں میں بھی حضرت خدیجہ نے آپ ﷺ کا ساتھ نہیں چھوڑا اور باوجود ایک مالدار خاتون ہونے کے یہ فاقے برداشت کیے اور ان مصائب و تکالیف کو حضور ﷺ کے دوش بدوش سہتے ہوئے تین سال کا پورا عرصہ آپ ﷺ کے ساتھ گزارا اور آپ کی ہمت افزائی میں معاون ثابت ہوئیں۔[1]

اور جب غار حراء میں حضرت جبرائیل علیہ السلام کے ظاہر ہونے پر حضور اقدس ﷺ گھبرا کر گھر تشریف لائے تھے تو اس گھبراہٹ کے وقت بھی حضرت خدیجہ نے حضور ﷺ کو خوب تسلی دیتے ہوئے کہا:

”كَلَّا، أَبْشِرْ فَوَاللهِ لاَ يُخْزِيكَ اللهُ أَبَدًا، فَوَاللهِ إِنَّكَ لَتَصِلُ الرَّحِمَ، وَتَصْدُقُ الحَدِيثَ، وَتَحْمِلُ الكَلَّ، وَتَكْسِبُ المَعْدُومَ، وَتَقْرِي الضَّيْفَ، وَتُعِينُ عَلَى نَوَائِبِ الحَقِّ“

”آپ پریشان نہ ہوں۔ اللہ کی قسم! ہرگز ایسا نہیں ہوسکتا کہ اللہ آپ کی جان کو مصیبت میں ڈال کر آپ کو رسوا کرے۔ واللہ! آپ تو رشتہ داروں کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آتے ہیں۔ آپ سچ بولتے ہیں، عاجز محتاج کی مدد کرتے ہیں، غریبوں کا خرچ برداشت کرتے ہیں، مہمان نوازی کرتے ہیں، اور حق والے مصیبت زدوں کے کام آتے ہیں“۔[2]

شوقِ عبادت:

موجودہ پنجگانہ نمازیں حضرت خدیجہؓ کی زندگی میں فرض نہیں ہوئی تھیں بلکہ آپ سلام اللہ و رضوانہ علیہا کی وفات کے بعد حضور ﷺ کے سفر معراج میں یہ نمازیں فرض ہوئیں، البتہ ویسے ہی عبادت کیلیے کوئی نماز پڑھنا فرض تھا

---

(۱) ینظر: الطبقات الکبری ط العلمیة: ۱/ ۱۲۳ و سیرة ابن ھشام ت السقا: ۱/ ۳۵۴

(۲) صحیح البخاري: ۶/ ۱۷۳

جسے وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ پڑھا کرتی تھیں۔[1]

چناں چہ شروع میں جب ویسے ہی کوئی نماز پڑھنا فرض ہوئی تو حضرت جبریلؑ نے آ کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو عملی طور پر وضو اور دو رکعات نماز پڑھ کر سکھلائی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے گھر تشریف لا کر حضرت خدیجہؓ کو یہ وضو اور نماز سکھلائی۔ اس کے بعد حضرت خدیجہؓ اپنے شوق سے از خود پوشیدہ نماز پڑھا کرتی تھیں۔[2]

وفاتِ پر ملال:

شعب ابی طالب سے خلاصی پانے کے تھوڑی مدت بعد ہی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے مددگار و غمگسار چچا "ابو طالب" کا انتقال ہو گیا، جس سے کفار مکہ کھل کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو تکلیف دینے کے درپے ہو گئے اور ادھر "ابو طالب" کے چند روز بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہمدرد و غمخوار اہلیہ "حضرت خدیجہؓ" بھی انتقال فرما گئیں۔ حضرت خدیجہؓ کی وفات ہجرتِ مدینہ سے تین سال پہلے، مکہ مکرمہ کے اندر، ۱۰ نبوی، رمضان کے مبارک مہینے میں ہوئی۔ جب ایک ہی سال میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے دونوں مددگار انتقال کر گئے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو بہت زیادہ مصائب کا سامنا کرنا پڑا۔ یہ سال آپ صلی اللہ علیہ وسلم کیلیے بہت دکھ اور غم کا سال تھا، چنانچہ (چند دیگر وجوہ سمیت) اس سال کا نام "عام الحزن" (غم کا سال) ٹھہرا۔

وصال کے وقت حضرت خدیجہؓ کی عمر مبارک ۶۵ سال تھی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت میں آپؓ تقریباً ۲۵ سال رہیں، ۱۵ سال آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت سے پہلے اور ۱۰ سال نبوت مل جانے کے بعد۔ جب ان کی وفات ہوئی اس وقت نماز جنازہ کا حکم نازل نہیں ہوا تھا، اس لیے بلا جنازہ ہی کفن دے کر آپؓ کو دفن کیا گیا۔ رحمتِ عالم خود ان کی قبر میں اترے اور انہیں قبر کی آغوش میں رکھا۔ آپؓ کی قبر مبارک "حجون" میں بنائی گئی (جہاں پر واقع قبرستان کو اب "جنت المعلی" کہا جاتا ہے،[3])۔[4]

---

(۱) المعجم الكبير للطبراني: ۲۲/۴۵۱، وفتح الباري لابن رجب: ۲/۳۰۳، ۳۰۲

(۲) ينظر: البداية والنهاية ط هجر: ۴/۶۰

(۳) تحفة النظار في غرائب الامصار وعجائب الأسفار: ۱/۳۸۱، ونهر الذهب في تاريخ حلب: ۲/۴۰۳

(۴) مستفاد من: الطبقات الكبرى ط العلمية: ۸/۱۴ وما بعدها، والبداية والنهاية ط هجر: ۴/۳۰۴ والسيرة الحلبية = إنسان العيون في سيرة الأمين المامون: ۱/۳۸۸، ۴۹۰

فضائل وخصائص

حضرت خدیجہؓ کو متعدد خصوصیتیں اور فضیلتیں حاصل تھیں:

(۱) ایک مرتبہ حضرت خدیجہؓ آپ ﷺ کی خدمت میں کھانا لے کر جا رہی تھیں جبکہ آپ ﷺ غارِ حراء میں تھے، ان کے پہنچنے سے پہلے حضرت جبریل علیہ السلام آپ ﷺ کے پاس آئے اور کہا کہ خدیجہؓ جب آپ کے پاس پہنچ جائیں تو ان کو اللہ کا اور میرا سلام پہنچا دیجئے اور انہیں جنت کے ایسے مکان کی خوشخبری سنا دیجئے جو موتیوں کا بنا ہوگا، جس میں نہ شور وشغب ہوگا اور نہ ذرا بھر کوئی تکلیف ہوگی۔[1]

ایک روایت میں ہے کہ جبریلؑ نے کہا: اے محمد! خدیجہ کو ان کے ربّ کا سلام پہنچا دیجئے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: اے خدیجہ! یہ جبریل ہیں جو تمہیں ربّ کا سلام دے رہے ہیں۔ حضرت خدیجہؓ نے کہا:

> اللہ ھُوَ السلامُ، ومنہ السلامُ، وعلی جبرئیلَ السلامُ "اللہ تو خود ہی سلام ہے اور اسی سے ہی ہمیں سلامتی ملتی ہے (میں اس کے سلام کا کیا جواب دوں؟)، اور جبریل پر سلام ہو"۔[2]

(۲) حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے ایک مرتبہ حضرت خدیجہؓ کے بارے میں پوچھا گیا تو آپ ﷺ نے فرمایا:

> "میں نے انہیں جنت کی نہروں میں سے ایک نہر پر دیکھا ہے، وہ موتیوں کے ایک ایسے مکان میں تھیں جس میں نہ کوئی شور وشغب تھا اور نہ ہی کوئی محنت ومشقت"۔[3]

(۳) حضرت ابن عباس سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

> "جنت کی عورتوں میں سب سے افضل خدیجہ بنت خویلد، فاطمہ بنت محمد، مریم بنت عمران اور زوجۂ فرعون آسیہ بنت مزاحم ہیں"۔[4]

---

(۱) صحیح البخاري: ۵/۳۹ مع فتح الباري لابن حجر: ۷/۱۳۹

(۲) الاستیعاب في معرفة الأصحاب: ۴/۱۸۲۱ وکذا في [المستدرک علی الصحیحین للحاکم: ۳/۲۰۶

(۳) المعجم الکبیر للطبراني: ۲۳/۸

(۴) صحیح ابن حبان - مخرجا: ۱۵/۴۷۰

(۴) ام المومنین حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں: مجھے اپنی زندگی میں کبھی کسی عورت پر اتنا رشک نہیں آیا جتنا مجھے حضرت خدیجہؓ پر رشک آیا حالانکہ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ میرا نکاح ہونے سے تین برس قبل وہ انتقال فرما گئی تھیں، مگر حضور ﷺ کی زبانِ مبارک سے اُن کا بار بار ذکرِ خیر سننے کی وجہ سے مجھے ان پر رشک آتا تھا۔ (اور حضرت خدیجہؓ کا اتنا اونچا مقام تھا کہ) اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کو حکم دیا تھا کہ وہ حضرت خدیجہؓ کو ان کیلیے جنت میں موتیوں کے محل کی خوشخبری سنا دیں۔ نیز حضور ﷺ (ان کی وفات کے بعد بھی ان کے ساتھ اپنی سابقہ رفاقت کی اتنی پاسداری فرماتے تھے کہ آپ ﷺ) جب کوئی بکری ذبح فرماتے تو اس کا کچھ گوشت حضرت خدیجہؓ کی سہیلیوں کے پاس بھیجتے۔[1]

(۵) حضور ﷺ حضرت خدیجہؓ کا بہت زیادہ ذکرِ خیر فرمایا کرتے تھے، چناں چہ ایک مرتبہ آپ ﷺ نے ان کے بارے میں فرمایا:

"وہ میرے اوپر اس وقت ایمان لائیں جب لوگوں نے میرا انکار کیا، انہوں نے میری اس وقت تصدیق کی جب لوگوں نے مجھے جھٹلایا، اور انہوں نے اپنے مال سے میرے ساتھ اس وقت ہمدردی کی جب لوگوں نے مجھے محروم رکھا۔ نیز اللہ تعالیٰ نے مجھے ان سے اولاد عطا فرمائی جبکہ دوسری بیویوں سے میں اولاد سے محروم رہا"۔[2] اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کو حضرت خدیجہؓ سے کس قدر محبت تھی!!! اللہ تعالیٰ ہمارے سینوں کو بھی ازواجِ مطہرات کی محبت سے لبریز فرمائے اور اسی پر موت دے۔ آمین!

(۶) ام المومنین حضرت خدیجہؓ میں چند ایسی منفرد خصوصیات ہیں جن میں دوسری کوئی زوجہ مطہرہ شریک نہیں:

۱۔ سب سے پہلے رسول اللہ ﷺ کی تصدیق کرنے والی۔

۲۔ سب سے پہلے رسول اللہ ﷺ نے ان سے شادی کی۔

۳۔ سب سے پہلے حضور ﷺ کے ساتھ انہوں نے نماز پڑھی۔

۴۔ سب سے پہلے آپ ﷺ کی اولاد ان ہی سے ہوئی۔

۵۔ سب سے پہلے ازواجِ مطہرات میں جنت کی بشارت ان کو ملی۔

---

(۱) صحیح البخاري: ۹/۸

(۲) مسند أحمد ط الرسالة: ۳۵۶/۴۱

۶۔سب سے پہلے اللہ تعالیٰ نے انہیں سلام پیش فرمایا۔

۷۔مومنات میں سب سے پہلی صدیقہ خاتون آپ رضی اللہ عنہا ہیں۔

۸۔سب سے پہلے وفات پانے والی زوجہ مطہرہ بھی آپ ہی ہیں۔

۹۔سب سے پہلی شخصیت آپ رضی اللہ عنہا ہیں جنکی قبر میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم اترے۔[1]

---

(۱) الفصول فی السیرۃ لابن کثیر، ص:۹۷ نقلاً عن سیرۃ امہات المومنین، ص:۱۶۵

(۲) ام المومنین حضرت سودہ سلامُ اللہ ورِضوانُہ علیہا

تمہیدی بات:

حضرت خدیجہ ؓ کے انتقال کے بعد اُسی سال رسول اللہ ﷺ نے حضرت سودہ ؓ اور حضرت عائشہ ؓ سے نکاح فرمایا۔ اوران دونوں میں سے پہلے آپ ﷺ نے حضرت سودہ ؓ سے پھر حضرت عائشہ ؓ سے نکاح فرمایا۔[1] واضح رہے کہ حضرت سودہ ؓ بیوہ تھیں، اور پچھلے شوہر سے ان کا ایک لڑکا (عبدالرحمٰن) تھا۔ اس لیے بچوں کی پرورش اوران کی دیکھ بھال سے باخبر تھیں۔

اور اِدھر حضور ﷺ کے گھر میں آپ ﷺ کی صاحبزادیوں کو ایک ماں کی ضرورت تھی جو خانگی امور سرانجام دینے کے ساتھ ان بچیوں سے متعلقہ امور سنبھال سکے، اگر چہ ان میں سے حضرت رقیہ ؓ، حضرت عثمان بن عفان ؓ کے نکاح میں آکر حبشہ کی طرف ہجرت کر چکی تھیں اور حضرت زینب ؓ کی بھی اپنے خالہ زاد بھائی ابو العاص بن ربیع کے ساتھ رخصتی ہو چکی تھی مگر باقی دو صاحبزادیاں حضرت ام کلثوم ؓ اور حضرت فاطمہ ؓ حضور ﷺ کے ساتھ ہی گھر میں رہتی تھیں۔ چناں چہ حضرت سودہ ؓ نے آپ ﷺ کے گھر آ کر امورِ خانہ داری اور بچیوں کی دیکھ بھال کو نہایت عمدہ طریقہ سے سنبھالا اور عین اس ضرورت کے وقت میں، رسول اللہ ﷺ کیلیے راحت کا سبب بنیں۔[2]

---

(۱) دراصل اس میں مؤرخین کا اختلاف ہے کہ آپ ﷺ نے ان دونوں میں سے پہلے کس سے نکاح فرمایا؟ متعدد مؤرخین کے بیان کے مطابق ام المومنین حضرت خدیجہ ؓ کے بعد سب سے پہلے حضور اقدس ﷺ نے حضرت سودہ سلامُ اللہ ورِضوانُہ علیہا سے ہی نکاح فرمایا، جیسا کہ مشہور مؤرخ ابن سعد، اپنی معروف کتاب (الطبقات الکبری: ۱۵۴/۴) میں حضرت سودہ ؓ کے بارے میں لکھتے ہیں:

فكانَتْ أوَّلَ امرأةٍ تزوَّجها بعدَ موتِ خديجةَ بنتِ خُوَيلدِ بنِ أسدِ بنِ عبدِ العُزّى بنِ قصي. یعنی حضرت سودہ ؓ وہ پہلی خاتون ہیں جن سے آپ ﷺ نے حضرت خدیجہ ؓ کی وفات کے بعد نکاح فرمایا۔

اور یہی مضمون ابن الاثیر جزری نے [أسد الغابة ط العلمية: ۷/۱۵۷، ابن حجر عسقلانی نے [الاصابة فی تمییز الصحابة: ۸/۱۹۶، ابن کثیر نے [الفصول فی السیرة ص: ۲۴۳ اور ابن بکار نے المنتخب من كتاب أزواج النبي صلى الله عليه وسلم ص: ۳۵ میں ذکر کیا ہے۔

اور سیرت مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم: ۳/۲۸۲ و شرح الزرقانی: ۴/۳۷۸ میں تو صراحت کے ساتھ لکھا ہے کہ مذہب جمہور اور صحیح و راجح قول یہی ہے کہ حضرت سودہ ؓ کا نکاح پہلے ہوا۔

(۲) ینظر: موسوعة آل بيت النبي: ۱/۱۵۸ انقلا عن سيرة آل البيت ۱/۹۹

نام ونسب:

آپ ؓ کا اسم گرامی "سَودَہ" اور کنیت "امّ الاَسوَد" تھی۔ آپ ؓ کے والد کا نام "زَمعہ" اور دادا کا نام "قیس بن عبد" تھا۔ آپ ؓ کی والدہ کا نام "شموس" اور نانا کا نام "قیس بن زید" تھا۔ آپ قبیلہ قریش کے معزز گھرانہ سے تعلق رکھتی تھیں، کہ آپ ؓ کے والد قریش کے مشہور قبیلہ "عامر بن لوی" میں سے تھے۔

حضور ﷺ سے پہلے آپ ؓ کا نکاح:

حضور ﷺ کے عقدِ نکاح میں آنے سے پہلے آپ ؓ "سکران بن عمرو" کے نکاح میں تھیں اور یہ "سکران" آپ ؓ کے چچازاد بھائی تھے۔

اسلام قبول کرنا:

یہ اور ان کے شوہر سابقین اولین میں سے ہیں۔ اسلام کے شروع زمانہ میں ہی مکہ میں مسلمان ہو گئے تھے۔ اہلِ مکہ کے مظالم سے تنگ آ کر جب مسلمانوں نے حبشہ کی طرف پہلی ہجرت کی تو یہ دونوں میاں بیوی یہیں مکہ میں ہی رہے انہوں نے ہجرت نہیں کی، مگر جب مشرکینِ مکہ کے ظلم وستم حد سے بڑھ گئے اور مسلمان، حبشہ کی طرف دوسری ہجرت کرنے لگے تو حضرت سودہ ؓ اور ان کے شوہر حضرت سکران ؓ بھی ساتھ ہو لیے۔ ان زوجین نے کچھ عرصہ وہیں حبشہ میں ہی گزارا۔ پھر چند سال بعد یہ دونوں حضرات مکہ مکرمہ واپس آ گئے اور یہاں مکہ آ کر حضرات سکران ؓ کا انتقال ہو گیا۔[1]

بذریعۂ خواب بشارتِ نکاح:

حضرت سودہ ؓ جب حضرت سکران ؓ کے نکاح میں تھیں تو انہوں نے خواب دیکھا کہ حضور ﷺ آئے اور ان کی گردن کو چھوا، اور پھر یہ خواب اپنے شوہر "سکران" کو بتایا۔ انہوں نے کہا: اگر یہ خواب سچا ہے تو اسکی تعبیر یہ ہے کہ میں مر جاؤں گا اور رسول اللہ ﷺ کا تمہارے ساتھ نکاح ہوگا۔ ایک رات پھر حضرت سودہ ؓ نے خواب دیکھا کہ وہ لیٹی ہوئی ہیں اور چاند ان پر آ گرا ہے۔ اور یہ خواب بھی اپنے شوہر کو بتایا۔ انہوں نے تعبیر میں پھر وہی بات کہی کہ میں

---

(۱) ینظر: الطبقات الکبری ط العلمیة: ۸/ ۴۲ و شرح الزرقاني علی المواهب اللدنية بالمنح المحمدية: ۴/ ۳۷۷

بہت جلد فوت ہو جاؤں گا اور میرے بعد تم ایک اور نکاح کروگی۔ اور اللہ کا کرنا ایسا ہوا کہ حضرت سکران رضی اللہ عنہ اسی دن بیمار ہوئے اور تھوڑے عرصہ بعد ہی فوت ہو گئے اور پھر حضرت سودہ رضی اللہ عنہا کی رسول اللہ ﷺ سے شادی ہوئی۔[1]

حضور ﷺ کے ساتھ آپ رضی اللہ عنہا کا نکاح:

حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کی وفات کے بعد حضور ﷺ تنہائی محسوس کرتے تھے کہ ان کی وفات نے آپ ﷺ اور آپ کی صاحبزادیوں کی طبیعت پر بڑا گہرا اثر چھوڑا تھا۔ اور یہ کیسے نہ ہوتا جبکہ بال بچوں کی پرورش اور خانگی امور کو انہوں نے بہت احسن طریقے سے سنبھال رکھا تھا، اس سے بڑھ کر یہ کہ وہ آپ ﷺ کی حقیقی غمگسار اور مونس و مددگار رفیقہ حیات تھیں اور مشکل گھڑیوں میں آپ کو صبر و ہمت کے ساتھ تسلیاں دیتی تھیں جیسا کہ پیچھے ان کی سیرت میں گزرا۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم بھی حضور ﷺ کی اس تنہائی کی کیفیت کو محسوس کر رہے تھے اور آپ ﷺ کیلیے بال بچوں اور گھر کو سنبھالنے کیلیے اہلیہ کی ضرورت محسوس کرتے تھے۔ بالآخر حضرت عثمان بن مظعون کی اہلیہ حضرت خولہ بنت حکیم نے ہمت کر کے اس سلسلے میں حضور ﷺ سے بات کی اور عرض کی: یا رسول اللہ! میں آپ کی طرف سے نکاح کا پیغام نہ دے دوں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: کس کے ساتھ؟ حضرت خولہ نے کہا: جس کے ساتھ آپ چاہیں، خواہ کنواری سے یا بیوہ سے۔ آپ ﷺ نے پوچھا: مَنِ البِكْرُ ؟ ومَنِ الثَّيِّبُ؟ (کون سی کنواری؟ اور کون سی بیوہ؟) حضرت خولہ نے کہا: اگر آپ کنواری سے کرنا چاہیں تو آپ اپنے سب سے محبوب شخص کی بیٹی "عائشہ" سے کر لیں اور اگر بیوہ سے کرنا چاہیں تو وہ سودہ بنت زمعہ ہیں جو آپ پر ایمان لا چکی ہیں اور آپ کی اطاعت و اتباع میں زندگی گزار رہی ہیں۔

آپ ﷺ نے فرمایا: فَاذْكُرِيهِمَا عَلَيَّ (دونوں سے بات کر کے دیکھ لو۔)

اس کے بعد حضرت خولہ پہلے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے پاس گئیں، حضرت عائشہ کا واقعہ آگے ان کی سیرت طیبہ کے ضمن میں انشاء اللہ آئے گا، پھر وہ حضرت سودہ رضی اللہ عنہا کے پاس ان کے گھر گئیں۔ وہاں حضرت سودہ رضی اللہ عنہا سے ملاقات ہوئی تو ان سے کہا: تمہیں خبر بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کس خیر و برکت کا دروازہ تمہارے اوپر کھول دیا ہے؟ وہ کہنے لگیں: وہ کیا؟ انہوں نے کہا: رسول اللہ ﷺ نے پیغامِ نکاح کیلیے مجھے آپ کے پاس بھیجا ہے۔ انہوں نے کہا: میں اس پر راضی ہوں۔ لیکن آپ میرے والد کے پاس جائیں اور ان سے اس کا ذکر کریں کہ وہ کیا کہتے ہیں؟

---

(1) موسوعة آل بيت النبي: ۱/۱۶۰

لیکن آپ میرے والد کے پاس جائیں اور ان سے اس کا ذکر کریں کہ وہ کیا کہتے ہیں؟

حضرت خولہ کہتی ہیں: ان کے والد نہایت عمر رسیدہ شخص تھے۔ میں نے جا کر انہیں (اسلامی طریقے کے مطابق "السلام علیکم" کے ذریعے سلام کرنے کے بجائے) زمانۂ جاہلیت والے طریقہ کے مطابق "أنعِمْ صَباحًا یعنی صبح بخیر" کہہ کر سلام کیا۔ انہوں نے پوچھا: تم کون ہو؟ میں نے کہا: "خولہ"، انہوں نے میری آمد پر مجھے مرحبا کہا اور آنے کی وجہ دریافت کی۔ میں نے کہا: محمد بن عبداللہ بن عبدالمطلب نکاح کے سلسلہ میں آپ کی بیٹی "سودہ" کا تذکرہ کر رہے ہیں۔ وہ جواب میں کہنے لگے: هُوَ كُفْءٌ كَرِيمٌ (یعنی میری نظر میں تو وہ ہماری بیٹی کے ساتھ نکاح کے معاملہ میں بالکل مناسب اور ایک شریف ومعزز شخص ہیں)، لیکن تمہاری سہیلی "سودہ" کی اس بارے میں کیا رائے ہے؟ میں نے کہا: وہ راضی ہیں۔

انہوں نے کہا: ٹھیک ہے آپ ان (یعنی حضرت محمد ﷺ) سے کہہ دیں کہ وہ آجائیں۔ چناں چہ رسول اللہ ﷺ تشریف لائے اور حضرت سودہؓ سے عقدِ نکاح کیا۔ اس دوران حضرت سودہؓ کے بھائی عبداللہ بن زمعہ سفر پر تھے۔ وہ واپس آئے اور انہیں معلوم ہوا کہ ان کی بہن کا رسول اللہ ﷺ کے ساتھ نکاح ہو چکا ہے تو انہوں نے رنج وافسوس میں اپنے سر پر مٹی ڈالنا شروع کر دی۔ پھر جب وہ مسلمان ہو گئے تو فرمایا: میں نے اس دن بڑی بے وقوفی کی تھی جب میں نے اپنی بہن کے حضور ﷺ کے ساتھ نکاح ہو جانے پر اپنے سر پر مٹی ڈالی تھی۔[1]

آپؓ کا حلیہ اور حکمتِ نکاح:

آپ سلام اللہ ورضوانہ علیہا کا قد مبارک لمبا تھا، جسم بھاری تھا۔ آپ ﷺ کے ساتھ نکاح کے وقت آپؓ بیوہ تھیں اور پچھلے خاوند سکران سے آپؓ کا ایک لڑکا (عبدالرحمن) تھا، اور ساتھ ہی آپؓ عمر رسیدہ بھی تھیں اور کوئی خاص حسن وجمال والی بھی نہیں تھیں۔ ان سب امور کے باوجود جب آپ ﷺ نے ان کے ساتھ نکاح کو پسند فرما لیا تو قریشِ مکہ حیرانی کا شکار تھے اور آپس میں آپ ﷺ کی اس شادی کے بارے میں باتیں کرتے تھے کہ حضرت خدیجہؓ جیسی سردار، مالدار اور منظورِ نظر خاتون کے بعد پھر اس عورت سے آپ ﷺ نے کیسے شادی کر لی؟۔ دراصل وہ قریش، دنیوی نقطۂ نظر سے دیکھ رہے تھے اور رسول اللہ ﷺ نے دینی مقاصد ومصالح کے پیشِ نظر نکاح فرمایا تھا کہ یہ حضرت

---

(۱) انظر: موسوعة آل بیت النبي: ۱/ ۵۸۱ والسمط الثمين: ۱۵۱ وتراجم سیدات بیت النبوة ص: ۱۸۱ نقلا عن تاریخ الطبری وطبقات ابن سعد.

سودہؓ ایمان والی، صبر والی اور مجاہدہ کرنے والی خاتون تھیں کہ انہوں نے اپنے اہلِ خانہ اور وطن و دیس کو اپنے دین کی حفاظت کیلیے قربان کردیا تھا کہ حفاظتِ ایمان کیلیے اپنا وطن چھوڑ کر حبشہ کی طرف ہجرت کرگئیں اور کئی سال پردیس میں گزار دیے۔ اس کے علاوہ ان کے ساتھ شادی کرنے میں اور بھی کئی دینی حکمتیں اور مصلحتیں تھیں۔ مثلاً: ایک ایمان والی عورت کی دل جوئی کرنا، شوہر کے انتقال پر تسلی کا سامان مہیا کرنا وغیرہ وغیرہ۔[1]

زہد و تقویٰ اور کمالِ اطاعت:

امی جان حضرت سودہؓ کو اللہ تعالیٰ نے عبادت، دنیا سے بے رغبتی اور خوفِ الٰہی میں بلند مقام عطا فرمایا تھا، چناں چہ ان کے بارے میں لکھا ہے:

وَكَانَتْ ذَاتَ عِبَادَةٍ وَوَرَعٍ وَزَهَادَةٍ.[2]

ترجمہ: "حضرت سودہؓ عبادت گزار، تقوی والی اور دنیا سے بے رغبت خاتون تھیں"۔

اس عبادت اور زہد و تقوی کے ساتھ ساتھ رسول اللہ ﷺ کی کمال تابعداری اور فرمانبرداری کا یہ عالم تھا کہ آپ ﷺ نے حجۃ الوداع میں ایک مرتبہ ازواجِ مطہراتؓ کو فرمایا تھا کہ میرے بعد تم گھر میں بیٹھی رہنا۔ تو اس فرمانِ نبوی پر آپؓ نے اتنا اہتمام سے عمل کیا کہ اس کے بعد پھر کبھی حج کو بھی نہیں گئیں۔ وہ فرماتی تھیں کہ میں حج اور عمرہ دونوں کرچکی ہوں، اب میں حکم کی فرمانبرداری میں اپنے گھر میں بیٹھی رہوں گی۔[3]

خوش طبعی:

آپ سلام اللہ و رضوانہ علیہا کے مزاج میں خوش طبعی بھی تھی۔ وہ کبھی کبھار آپ ﷺ کو کوئی نہ کوئی بات کرکے ہنسا دیتی تھیں۔ ایک دفعہ کا بیان ہے کہ انہوں نے حضور ﷺ سے کہا: یا رسول اللہ ﷺ! کل رات میں نے آپ کے پیچھے نفل نماز پڑھی۔ باوجودیکہ میں ساتھ تھی آپ نے اتنا (لمبا) رکوع کیا کہ میں نے تو اپنی ناک ہی پکڑلی کہ کہیں نکسیر ہی

---

(۱) نفس المرجع السابق، وكذا ينظر: زوجات النبي محمد وأسرار الحكمة في تعددهن، ص: ۳۴

(۲) البداية والنهاية ط هجر: ۱۱/۲۸۰

(۳) الطبقات الكبرى ط العلمية: ۸/۴۴

نہ پھوٹ پڑے۔ یہ سن کر آپ ﷺ ہنس پڑے۔[1]

مال سے بے رغبتی اور سخاوت:

اگرچہ تمام ازواجِ مطہرات رضی اللہ عنہن بلکہ اُس زمانہ کی تمام مسلمان عورتوں کے دل مال کی محبت سے خالی اور اللہ کے نام پر مال بہانے کے جذبوں سے لبریز تھے مگر بعض ہستیاں وصفِ سخاوت میں ممتاز اور منفرد حیثیت کی حامل تھیں۔

ایک مرتبہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے حضرت سودہ رضی اللہ عنہا کی خدمت میں دراہم کی ایک تھیلی بھیجی۔ تھیلی دیکھ کر انہوں نے پوچھا: یہ کیا ہے؟ بتایا گیا: دراہم ہیں۔ فرمایا: دراہم جو کھجور کی طرح تھیلی میں بھرے ہوئے ہیں۔ یہ کہہ کر وہ سب دراہم اللہ کے نام پر تقسیم فرما دیے۔[2]

آخرت میں آپ ﷺ کی زوجہ ہونے کی تمنا:

حضرت سودہ رضی اللہ عنہا کو ایک دفعہ خیال ہوا کہ کہیں رسول اللہ ﷺ مجھے طلاق نہ دے دیں تو انہوں نے آپ ﷺ سے عرض کیا: یارسول اللہ! میری گزارش ہے کہ آپ مجھے طلاق نہ دیں، آپ مجھے اپنے نکاح میں باقی رکھیں (تاکہ مجھے شرفِ زوجیت سے محرومی نہ ہو) اور میری باری کا دن حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو دے دیں۔ میری تو صرف یہ تمنا ہے کہ اللہ تعالیٰ مجھے بروزِ قیامت آپ کی زوجہ ہونے کی حالت میں اٹھائے۔[3]

اور بعض روایات میں ہے کہ حضور ﷺ نے حضرت سودہ رضی اللہ عنہا کو (کسی شرعی وجہ سے) ایک طلاق دے دی تھی۔ اس پر حضرت سودہ رضی اللہ عنہا نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کی تھی: یارسول اللہ! مجھے مرد کی خواہش تو نہیں ہے، البتہ یہ میری دلی آرزو ہے کہ میں قیامت کے دن آپ کی ازواجِ مطہرات رضی اللہ عنہن میں سے اٹھوں، اس لیے آپ رجوع فرمالیں (تاکہ مجھے شرفِ زوجیت سے محرومی نہ ہو)۔ یہ سن کر رحمتِ دو عالم ﷺ نے رجوع فرمالیا یعنی انہیں دوبارہ اپنی زوجیت

---

(۱) نفس المرجع السابق

(۲) الإصابة في تمييز الصحابة: ۸/۱۹۷ وشرح الزرقاني على المواهب اللدنية بالمنح المحمدية: ۸/۳۸۰

(۳) ينظر: الإصابة في تمييز الصحابة: ۸/۱۹۶

میں لے لیا۔[۱]

ایک روایت میں ہے کہ حضرت سودہ رضی اللہ عنہا نے عرض کی: یا رسول اللہ! میں قیامت کے روز آپ کی ازواج مطہرات کے ساتھ اپنا حشر چاہتی ہوں تاکہ جو اجر وثواب ان کو ملے وہ مجھے بھی مل جائے۔[۲]

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رضا طلبی:

حضرت سودہ رضی اللہ عنہا نے اپنی آخر عمر میں اپنی باری کا دن حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو ہبہ کر دیا تھا۔ انہوں نے یہ صرف اس لیے کیا تھا تاکہ انہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی (مزید) خوشنودی اور رضامندی حاصل ہو جائے۔[۳]

وفات:

راجح ومشہور قول کے مطابق ام المومنین حضرت سودہ رضی اللہ عنہا کا انتقال مدینہ طیبہ میں، حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے اخیر زمانہ خلافت میں ہوا۔[۴]

فضائل وخصائص:

(۱) حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جب حج ادا فرمایا تھا اس وقت تمام ازواجِ مطہرات رضی اللہ عنہن آپ کے ساتھ تھیں۔ حضرت سودہ رضی اللہ عنہا کو بھی اس سفر میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ہمرکابی کا شرف حاصل تھا۔ عرفات سے واپسی پر شب مزدلفہ میں آپ سلامُ اللہ ورضوانہ علیہا نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اس بات کی رخصت طلب کی کہ باقی لوگ تو کل صبح منیٰ کی طرف روانہ ہوں گے، آپ سہولت کیلیے (کیونکہ آپ رضی اللہ عنہا کا جسم مبارک بھاری تھا) مجھے اس بات کی اجازت دے دیں کہ میں آج رات ہی دوسرے لوگوں سے پہلے منیٰ کو روانہ ہو جاؤں کیونکہ کل صبح لوگوں کے ساتھ چلنا میرے لیے دشوار ہوگا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کمال شفقت فرماتے ہوئے ان کو اجازت مرحمت فرمادی۔ چناں چہ وہ رات ہی کو مزدلفہ سے منیٰ روانہ ہو گئیں جبکہ لوگ ابھی مزدلفہ

---

(۱) ینظر: سبل الھدیٰ والرشاد في سیرۃ خیر العباد: ۹/ ۵۹ مع الطبقات الکبریٰ ط العلمیة: ۸/ ۴۳

فائدہ: امام ابن سید الناس رحمہ اللہ نے "عیون الأثر" ۲/ ۳۶۸ میں لکھا ہے: صحیح وراجح یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت سودہ رضی اللہ عنہا کو طلاق نہیں دی تھی بلکہ حضرت سودہ رضی اللہ عنہا نے صرف اپنی باری کا دن حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کیلیے ہبہ کر دیا تھا اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کو منظور فرمالیا تھا۔

(۲) المعجم الکبیر للطبراني: ۲۴/ ۳۲

(۳) الطبقات الکبریٰ ط العلمیة: ۸/ ۴۳

(۴) عیون الأثر: ۲/ ۳۶۸ والاستیعاب في معرفة الأصحاب: ۴/ ۱۸۶۷ والمواھب اللدنیة للقسطلاني: ۱/ ۴۹۵

میں ہی تھے۔[1]

(۲) حضرت عائشہؓ، حضرت سودہؓ کی شان بیان کرتے ہوئے فرماتی ہیں:

"حضرت سودہؓ کے علاوہ کسی عورت کو دیکھ کر مجھے یہ خیال پیدا نہیں ہوا کہ اُس کے قالب (جلد) میں میری روح ہوتی"۔[2]

ف: ازواجِ مطہراتؓ کے دلوں کی پاکیزگی کا اندازہ امی عائشہؓ کے اسی قول سے ہی لگایا جاسکتا ہے کہ وہ اِس میں اپنے چھوٹے پن اور اپنی سوکن کی عظمت اوران سے اپنی عقیدت ومحبت کا اظہار کتنے اچھے انداز میں کر رہی ہیں کہ کاش! ان کے جسم میں میری روح ہوتی تو میری زندگی بھی خوبصورت ہوجاتی۔

---

(۱) مستفاد من صحيح البخاري: ۱۶۵/۲ و صحيح مسلم: ۹۳۹/۲

(۲) البداية والنهاية طهجر: ۲۸۰/۱۱، والإصابة في تميز الصحابة: ۱۹۶/۸

(۳) ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ سَلامُ اللّٰہِ وَرِضوانُہٗ علیہا

تمہیدی بات:

رسول اللہ ﷺ کی یہ واحد بیوی ہیں جن سے آپ ﷺ نے اُن کے کنوارے پن میں نکاح فرمایا، ان کے علاوہ آپ کی تمام بیویاں بیوہ تھیں۔ آپ سَلامُ اللّٰہِ وَرِضوانُہٗ علیہا کو رسول اللہ ﷺ کی "محبوب زوجہ"، "صدیق" باپ کی "صدیقہ" بیٹی، کتاب وسنت کی "عالمہ"، صحابہؓ کی "معلّمہ" ہونے کا شرف حاصل ہے، اور یہ کہ آپؓ پر لگنے والی تہمت سے آپؓ کی پاکی اور براءت ظاہر کرنے کیلیے اللہ تعالیٰ نے آپؓ کے حق میں قرآن اتارا اور اس میں خود ربِ کائنات نے آپؓ کی پاکی کی گواہی دی۔

نیز یہ اعزاز بھی سیدہ عائشہؓ ہی کا نصیب ہے کہ آپؓ کی گودِ اطہر میں سرورِ کونین ﷺ سر رکھے ہوئے اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملے اور آپؓ ہی کا حجرہ مبارک رسول اللہ ﷺ کی آخری آرامگاہ ٹھہرا۔ اس کے علاوہ آپؓ تقویٰ، زُہد، عبادت اور صفاءِ قلب (دل کی صفائی و پاکیزگی) جیسے اوصاف سے آراستہ تھیں۔

ملحوظہ: احادیث اور سیرت کی کتابوں میں تمام ازواجِ مطہراتؓ میں سے ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہؓ کی سیرت وفضائل نہایت وضاحت وکثرت سے آئے ہیں، لیکن اس کتاب میں چونکہ "اختصار" خصوصی طور پر پیشِ نظر ہے اس لیے یہاں حضرت عائشہؓ کی سیرت وفضائل کے صرف بعض اہم پہلوؤں پر مختصراً روشنی ڈالی جائے گی۔

نام ونسب:

آپ سَلامُ اللّٰہِ وَرِضوانُہٗ علیہا کا اسم گرامی "عائشہ" اور کنیت (اپنے بھانجے عبداللہ بن زبیر کی نسبت سے) "ام عبد اللہ" تھی۔ آپؓ کے متعدد القابات (جو آپؓ کی بلندئ شان کا پتا دیتے ہیں) میں سے یہ دو زیادہ مشہور ہیں: حُمیراء اور صدّیقہ۔

آپؓ کے والد حضرت ابو بکر صدیقؓ ہیں جن کا نام "عبداللہ" تھا، اور آپ سَلامُ اللّٰہِ وَرِضوانُہٗ علیہا کے دادا "ابوقُحافہ" ہیں۔ جن کا نام "عثمان بن عامرؓ" تھا۔ اور آپؓ کی والدہ ماجدہ کے نام میں اختلاف ہے، بعض نے

زینب بتایا ہے مگر وہ اپنی کنیت "ام رومان" سے مشہور ہیں، آپ سلامُ اللہ وَرِضوانُہ علیہا کے نانا کا نام "عامر بن عویمر" تھا۔[1]

ولادتِ باسعادت:

آپ سلامُ اللہ وَرِضوانُہ علیہا کی ولادت، راجح قول کے مطابق نبوت کے پانچویں سال کے آخر (بمطابق جولائی ۶۱۴ عیسوی) میں ہوئی۔[2]

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے آپؓ کا نکاح

(۱) نکاح سے قبل ہی جبریلؑ کا آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو خبر دینا:

(۱) حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ حضرت جبریل علیہ السلام اُن (یعنی حضرت عائشہؓ) کی صورت ریشم کے ایک (خوبصورت) سبز کپڑے میں لپیٹ کر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں لے کر آئے اور کہا: **هَذِهِ زَوْجَتُکَ فِي الدُّنْيَا وَ الآخِرَةِ** (یہ دنیا و آخرت میں آپ کی زوجہ ہیں)۔[3]

(۲) حضرت عائشہؓ سے یہ بھی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اُن سے فرمایا: تم تین رات تک مجھے خواب میں دکھائی دی جاتی رہیں۔ ایک فرشتہ ریشم کے کپڑے میں تمہیں میرے پاس لاتا اور کہتا: یہ آپ کی بیوی ہے، میں تمہارے چہرے سے کپڑا اٹھاتا تو وہ تم ہی ہوتی۔ پھر میں دل میں کہتا کہ اگر یہ (خواب) اللہ کی طرف سے ہے تو وہ اس کو پورا فرمائے گا۔[4]

فائدہ:

نبی کا خواب، اللہ کی طرف سے ہی ہوتا ہے اس لیے سچا اور یقینی ہوتا ہے اس میں کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں ہوتی۔ اس کے باوجود آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کلمۂ شک (اگر) کے ساتھ یہ فرمایا کہ "اگر یہ خواب اللہ کی طرف سے ہے تو وہ

---

(۱) ینظر: نور الأبصار، ص: ۷۸، موسوعۃ آل بیت النبی: ۱/۱۲۸، ومابعدها، وتاریخ الخلفاء، ص: ۲۲

(۲) سیرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا، ص: ۲۱

(۳) سنن الترمذي ت شاکر: ۵/۷۰۴

(۴) صحیح مسلم: ۴/۱۸۸۹

اس کو پورا فرمائے گا"۔ اس کے کئی مطلب علماء نے بیان فرمائے ہیں: ایک مطلب یہ ہے کہ یہ لفظ بظاہر شک کا ہے مگر درحقیقت اس سے مراد یقین ہی ہے نہ کہ شک، اس کی مثال یہاں ایسے ہے جیسے کوئی بادشاہ اپنے بارے میں یہ کہے: "اگر میں بادشاہ ہوں تو میں اس کو پورا کر کے دکھلاؤں گا"۔ مطلب یہ ہوتا ہے کہ چونکہ میں یقیناً بادشاہ ہی ہوں اس لیے میں اسے ضرور پورا کروں گا۔ [۱]

(ب) واقعۂ نکاح:

حضرت عثمان بن مظعون کی اہلیہ حضرت خولہ بنت حکیم کے مشورہ اور کوشش سے حضور ﷺ کا حضرت سودہؓ اور حضرت عائشہؓ سے نکاح ہوا جیسا کہ ابھی پیچھے حضرت سودہؓ کی سیرت طیبہ میں گزر چکا ہے۔ بہرحال مختصر یہ ہے کہ حضرت خولہ بنت حکیم آپ ﷺ کا پیغامِ نکاح لے کر حضرت ابوبکر صدیقؓ کے گھر گئیں اور جا کر ان سے کہا: اللہ تعالیٰ نے آپ لوگوں کے گھر میں اپنی خیریں اور برکتیں نازل فرمانے کا ارادہ فرمالیا ہے کہ میں "عائشہ" کیلیے رسول اللہ ﷺ کا پیغامِ نکاح لے کر آئی ہوں۔ بالآخر تقدیرِ الٰہی میں لکھا ہوا یہ مبارک رشتہ وجود میں آیا اور حضرت عائشہؓ رسول اللہ ﷺ کی زوجیت سے مشرف ہوگئیں۔ [۲] یہ نکاح مکہ مکرمہ میں ہوا اور اس وقت حضرت عائشہؓ کی عمر چھ سال یا بعض روایات کے مطابق سات سال تھی۔ [۳]

ہجرت اور رخصتی:

حضرت عائشہؓ کا نکاح مکہ مکرمہ میں ہوگیا تھا مگر عمر چونکہ کم تھی اس لیے رخصتی ملتوی رہی، یہاں تک کہ دو تین برس گزر گئے اور مدینہ طیبہ کی طرف ہجرت کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ حضرات صحابہ کرام مدینہ منورہ پہنچنا شروع ہوگئے اور اکثر حضرات پہنچ گئے مگر آپ ﷺ حکمِ الٰہی کی انتظار میں ہجرت سے رکے رہے، جب اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپ ﷺ کو ہجرت کی اجازت ملی تو آپ حضرت ابوبکر صدیقؓ کو اپنے اس مبارک سفر کا ساتھی بنا کر مدینہ طیبہ کی طرف روانہ ہوگئے۔

---

(۱) انظر لتوجیهات قوله صلى الله عليه وسلم هذا، شرح النووي على مسلم: ۲۰۲/۱۵ وما بعدها.

(۲) ينظر تفصيلها في تاريخ الطبري: ۱۶۲/۳

(۳) انظر: صحيح البخاري: ۵۶/۵ وصحيح مسلم: ۱۰۳۹/۲

ان دونوں حضرات کے اہل وعیال ادھر مکہ میں ہی رہے۔ جب آپ ﷺ، اور آپ کے رفیقِ سفر (صدیق اکبرؓ) مدینہ طیبہ پہنچ گئے تو وہاں پہنچ کر ان حضرات نے عمدہ بندوبست فرما کر اپنے اہل وعیال کو بھی بلوالیا، چناں چہ آپ ﷺ کی اہلیہ حضرت سودہؓ، اور آپ کی دو صاحبزادیاں: حضرت فاطمہؓ وحضرت ام کلثومؓ اور حضرت ابوبکرؓ کی اہلیہ حضرت ام رومانؓ اور آپؓ کی دو صاحبزادیاں: حضرت عائشہؓ اور حضرت اسماءؓ اور ایک صاحبزادے حضرت عبداللہ بن ابی بکرؓ بھی چند دنوں میں مدینہ طیبہ پہنچ گئے۔

مدینہ طیبہ پہنچ جانے کے بعد سات آٹھ ماہ تک حضرت عائشہؓ اسی طرح اپنے والدین کے گھر میں رہیں، اس کے بعد ایک مرتبہ حضرت ابوبکرؓ نے حضور ﷺ سے کہا: یا رسول اللہ! آپ اپنی اہلیہ کے ساتھ کس وجہ سے رخصتی نہیں فرما رہے؟۔ آپ ﷺ نے فرمایا: "الصَّدَاق" (یعنی میرے پاس مہر کی ادئیگی کیلیے رقم نہیں ہے)۔ اس پر حضرت ابوبکرؓ نے حضور ﷺ کو ساڑھے بارہ اوقیہ چاندی یعنی ۵۰۰ درہم بطور قرض دیے۔ آپ ﷺ نے یہی ۵۰۰ دراہم بطورِ "مہر"[۱] ادا کیے، اور رخصتی ہوگئی۔[۲]

یہ رخصتی دن کے وقت، ماہِ شوال، سن ۱ ہجری میں ہوئی اس وقت حضرت عائشہؓ کی عمر مبارک نو سال تھی۔[۳]

حضرت ابوبکرؓ کو حضرت عائشہؓ کی غیر معمولی صلاحیت واستعداد کا پورا اندازہ تھا اور جانتے تھے کہ تعلیم وتربیت اور سیرت سازی کا بہترین اور سب سے زیادہ مؤثر ذریعہ صحبت کا اختیار کرنا ہے، اس لیے انہوں نے خود ہی رسول اللہ ﷺ سے آکر عرض کیا کہ اگر کوئی رکاوٹ نہ ہو تو "عائشہ" آپ کی اہلیہ اور شریکِ حیات کی حیثیت سے آپ کے ساتھ رہے (تاکہ آپ سے مکمل استفادہ کرے)، چناں چہ آپ ﷺ نے اس کو قبول فرما کے رخصتی کر لی اور حضرت عائشہؓ نے اس طرح کمسنی سے ہی آپ کے ساتھ رہنا شروع کر دیا اور اپنی تعلیم وتربیت کی آنکھیں اللہ کے برگزیدہ رسول وپیغمبر کی صحبت میں کھولیں اور آپ کی ہر ہر بات اور اَدا کو محفوظ کر کے امت کی رہنمائی کی حتی کہ بڑے بڑے صحابہ کرامؓ بھی آپؓ سے رہنمائی لیا کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ احادیث جو صرف حضرت عائشہؓ سے مروی ہیں ان

---

(۱) واضح رہے کہ رسول اللہ ﷺ کی ازواج مطہرات کا مہر ۵۰۰ درہم ہوتا تھا (کما فی صحیح مسلم: ۱۴۲۶) جو آجکل کے زمانہ میں "تولہ" کے اعتبار سے ۱۳۱ تولے ۳ ماشے اور "گرام" کے لحاظ سے ۱۶۳۲ گرام بنتا ہے۔

(۲) ینظر تفصیلھا فی المستدرک علی الصحیحین للحاکم: ۵/۴ وما بعدھا، والطبقات الکبری ط العلمیۃ: ۸/۴۹ وما بعدھا۔

(۳) فائدہ: حضرت عائشہؓ کی عمر نکاح کے وقت ۶ یا ۷ سال، رخصتی کے وقت ۹ سال اور حضور اقدس ﷺ کے وصال کے وقت ۱۸ سال تھی۔ (انظر صحیح مسلم، رقم: ۱۴۲۲)

کی تعداد دو ہزار سے بھی زیادہ ہے۔[1]

ولیمہ:

حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں: میری شادی پر نہ تو اونٹ ذبح کر کے ولیمہ کیا گیا اور نہ ہی کوئی بکری ذبح ہوئی، حتی کی حضرت سعد بن عبادہؓ نے ایک بڑے پیالے میں کھانا بھیجا اور یہ ان کا طریقہ تھا کہ جب بھی کوئی بیوی رسول اللہ ﷺ کے حرم میں داخل ہوتی تو وہ اسی طرح کھانا بھیجتے تھے۔ اس وقت میری عمر نو (۹) داخل تھی۔[2]

خدمت گزاری:

ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہؓ کا قلبِ اطہر جذبہ خدمت سے سرشار تھا۔ گھر میں اگرچہ خادمہ (حضرت بریرہؓ) موجود تھیں، لیکن سیدہ عائشہؓ سرکارِ دوعالم ﷺ کا کام خود کرتی تھیں۔[3] آٹا خود پیستی تھیں۔[4] خود گوندھتی تھیں۔[5] کھانا خود پکاتی تھیں۔[6] آپ ﷺ کا بستر خود اپنے ہاتھ سے بچھاتی تھیں۔[7] وضو کا پانی خود اپنے ہاتھ سے لا کر رکھتی تھیں۔[8] قربانی کے اونٹوں کا قلادہ (گلوبند) خود بٹتی تھیں۔[9] سید عالم ﷺ کے سر مبارک میں کنگھا خود کرتی تھیں۔[10] آپ ﷺ کے وجود مبارک کو عطر لگاتی تھیں۔[11] آپ ﷺ کے کپڑے خود دھوتی تھیں۔[12] اور سوتے وقت آپ کی مسواک اور پانی سرہانے خود رکھتی تھیں۔[13] مسواک کو

---

(۱) ینظر له وللمزید علیه: موسوعة آل بیت النبي: ۱/ ۱۹۱، وسیرة امهات المؤمنین: ۲۳۸ ومابعدها

(۲) سیرة أمهات المؤمنین، ص: ۲۲۳

(۳) سیرة أمهات المؤمنین، ص: ۲۷۶ نقلا عن الادب المفرد: ۱/ ۴۱

(۴) ایضا نقلا عن صحیح البخاري: ۲/ ۲۹۷ قصة الإفک.

(۵) ایضا نقلا عن صحیح البخاري: ۲/ ۲۹۷

(۶) ایضا نقلا عن نفس المرجع

(۷) ایضا نقلا عن شمائل الترمذي

(۸) ایضا نقلا عن مسند الإمام أحمد: ۶/ ۶۸

(۹) ایضا نقلا عن صحیح البخاري: ۱/ ۲۳۰، ومسند الإمام أحمد: ۲/ ۲۱۸

(۱۰) سیرة أمهات المؤمنین، ص: ۲۷۷ نقلا عن صحیح البخاري: ۱/ ۲۷۴

(۱۱) ایضا نقلا عن صحیح البخاري: ۱/ ۲۰۸

(۱۲) ایضا نقلا عن صحیح البخاري: ۱/ ۳۶

(۱۳) ایضا نقلا عن مسند الإمام أحمد: ۶/ ۵۴

صفائی کی غرض سے دھویا کرتی تھیں۔ گھر میں آپ ﷺ کا کوئی مہمان آجاتا تو مہمانی کی خدمت انجام دیتیں۔[1]

حضور ﷺ کی حضرت عائشہ سے محبت:

حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے پوچھا: یا رسول اللہ! لوگوں میں سے سب سے زیادہ محبت آپ کو کس سے ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: عائشہ سے۔ پھر میں نے دریافت کیا: مردوں میں سے کس سے ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: أَبُوْهَا (اس کے والد (ابوبکر) سے)۔ میں نے کہا: پھر کس سے ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے، اس کے بعد آپ ﷺ نے کچھ اور مردوں کے نام بھی ذکر کیے۔[2]

حضور ﷺ اسی محبت کی بناء پر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ اکٹھے کھانا تناول فرماتے اور آپ ﷺ کو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے اس قدر محبت تھی کہ جو ہڈی حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا چوستیں آپ ﷺ بھی وہی ہڈی چوستے، بلکہ اس حد تک آپ ﷺ محبت کا اظہار فرماتے کہ پانی والے پیالے میں جس جگہ سے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا پانی پیتیں آپ ﷺ بھی اُسی جگہ پر اپنے ہونٹ مبارک رکھ کر پانی نوش فرماتے۔[3]

ایک مرتبہ رسول اللہ ﷺ کے ایک پڑوسی نے آپ کی ضیافت کی اور آپ ﷺ کو اس ضیافت پر بلانے کیلیے آیا، آپ ﷺ نے پوچھا: عائشہ کی بھی ساتھ ضیافت ہے؟ اس نے کہا: نہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: پھر مجھے یہ ضیافت قبول نہیں ہے۔ وہ پڑوسی میزبان دوبارہ حاضرِ خدمت ہوا، آپ ﷺ نے وہی سوال کیا۔ اس نے کہا: نہیں، آپ ﷺ نے بھی فرمایا: پھر نہیں۔ وہ تیسری دفعہ پھر اسی غرض سے حاضر ہوا۔ آپ ﷺ نے وہی سوال دہرایا کہ عائشہ کی بھی ساتھ ضیافت ہے؟ اُس نے کہا: جی ہاں! اس کے بعد آپ ﷺ نے اس کی ضیافت قبول کی اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ اس کے گھر تشریف لے گئے۔[4]

انتباہ: لیکن یہ واضح رہے کہ آپ ﷺ کو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ اس قدر جو طبعی وفطرتی محبت تھی، آپ اس محبت کے باوجود اپنی دوسری بیویوں کی ذرہ بھر بھی حق تلفی نہیں فرماتے تھے۔

---

(۱) سيرة أمهات المؤمنين، ص: ۳۷۷

(۲) صحيح البخاري: ۵/۵، رقم: ۳۶۶۲

(۳) ينظر: سنن أبي داود: ۱/۶۸، رقم: ۲۵۹

(۴) صحيح مسلم: ۳/۱۶۰۹، رقم: ۲۰۳۷

علمی مقام ومرتبہ:

(۱) رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

اگر ازواجِ مطہرات رضی اللہ عنہن سمیت اس امت کی تمام عورتوں کا علم جمع کیا جائے تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا علم ان سب کے علم سے زیادہ ہوگا۔[۱]

(۲) حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے بھانجے حضرت عروہ بن زبیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

میں نے قرآن مجید، فرائض، حلال وحرام، فقہ، شاعری، طب، عربوں کی تاریخ اور نسب کا حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے بڑا عالم کسی کو نہیں دیکھا۔[۲]

(۳) حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

جب کبھی ہم لوگوں یعنی رسول اللہ ﷺ کے صحابہ کو کسی بات (مسئلہ) میں اشکال واشتباہ پیدا ہوا پھر ہم نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے پوچھا تو ان کے پاس اس کے متعلق علم پایا (یعنی بعض دفعہ صحابہ کرام کو ایک مسئلہ کا حل معلوم نہیں ہوتا تھا مگر ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو معلوم ہوتا تھا)۔[۳]

(۴) کسی نے مشہور تابعی حضرت مسروق رحمہ اللہ سے پوچھ لیا: کیا حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرائض کے متعلق اچھی طرح جانتی تھیں؟ تو انہوں نے فرمایا: اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں میری جان ہے! میں نے بڑے بڑے صحابہ کرام کو دیکھا ہے کہ وہ فرائض کے متعلق مسائل حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے پوچھا کرتے تھے۔[۴]

(۵) جلیل القدر تابعی حضرت عطا بن ابی رباح رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سب سے زیادہ فقیہ، سب سے زیادہ صاحبِ علم اور عوام میں سب سے زیادہ اچھی رائے والی تھیں۔[۵]

---

(۱) المعجم الکبیر للطبرانی: ۱۸۴/۲۳

(۲) سبل الھدیٰ والرشاد فی سیرۃ خیر العباد: ۱۷۹/۱۱ ومثلہ فی مجمع الزوائد ومنبع الفوائد: ۲۴۲/۹، والمستدرک علی الصحیحین للحاکم: ۱۲/۴

(۳) سنن الترمذی ت شاکر: ۷۰۵/۵

(۴) المعجم الکبیر للطبرانی: ۱۸۱/۲۳

(۵) المستدرک علی الصحیحین للحاکم: ۱۵/۴

(۶) حضرت موسیٰ بن طلحہ فرماتے ہیں:

میں نے حضرت عائشہؓ سے زیادہ فصیح کسی کو نہیں دیکھا۔[1]

ذوقِ عبادت:

ام المومنین حضرت عائشہ طیبہ طاہرہؓ کو ذکر و عبادت کا خصوصی شغف تھا۔ کثرت سے عبادت الٰہی میں مشغول رہتیں، نفل نمازوں (اشراق، چاشت، تہجد وغیرہ) کا خوب اہتمام کرتیں اور لمبی لمبی نمازیں پڑھتیں۔

آپ سلامُ اللہ و رِضوانُہ علیہا کے بھتیجے حضرت قاسم بن محمد بن ابوبکر بیان کرتے ہیں کہ میرا یہ معمول تھا کہ میں جب صبح کو گھر سے نکلتا تو سب سے پہلے حضرت عائشہؓ کے پاس جاتا اور ان کو سلام کرتا، چناں چہ ایک دن میں صبح کے وقت ان کے پاس گیا تو دیکھا وہ نفل نماز پڑھ رہی تھیں اور اس میں یہ آیت تلاوت کر رہی تھیں:

{فَمَنَّ اللّٰهُ عَلَيْنَا وَ وَقٰىنَا عَذَابَ السَّمُوْمِ} [الطور:۲۷]

جس کا مطلب یہ ہے کہ جنتی لوگ جنت میں پہنچ کر یہ کہیں گے: "اللہ تعالیٰ نے ہم پر بڑا احسان فرمایا اور ہمیں جھلسانے والی ہوا (گرم لُو) کے عذاب سے بچالیا"۔

اس آیت کو پڑھ کر وہ یہ دعا کرتیں:

"مُنَّ عَلَيَّ وَقِنِي عَذَابَ السَّمُوْمِ" (اے اللہ! مجھ پر بھی احسان فرمانا اور مجھے اُس گرم لُو کے عذاب سے بچا لینا) اور رونا شروع کر دیتیں اور اس آیت کو بار بار پڑھتیں۔

میں نماز ختم ہونے کے انتظار میں پیچھے کھڑا ہو گیا کہ سلام عرض کر کے پھر چلا جاؤں گا حتی کہ طبیعت اکتا گئی اور میں ان کو اسی حالت میں چھوڑ کر اپنی ضرورت کیلیے بازار چلا گیا۔ جب اپنا کام کر کے واپس آیا تو دیکھا کہ وہ ابھی تک اسی طرح کھڑی نماز و دعا میں مشغول ہیں اور رو رہی ہیں۔[2]

آپ سلامُ اللہ و رِضوانُہ علیہا چاشت کی نماز خاص اہتمام سے پڑھتیں اور آٹھ رکعات پڑھتی تھیں۔[3] اور نمازِ تہجد

---

(۱) المرجع السابق: ۱۲/۴

(۲) صفة الصفوة: ۳۱۹/۱، و، حلیة الأولیاء وطبقات الأصفیاء: ۴۸/۲

(۳) مشکاة المصابیح: ۴۱۳/۱

کو تو بہت ہی زیادہ اہتمام اور پابندی سے ادا فرماتی تھیں [1]۔ اسی طرح رمضان المبارک میں تراویح کی ادائی کا بھی خاص اہتمام تھا۔ [2]

اس کے علاوہ آپ سلامُ اللہ وَ رِضوانُہُ علیہا ہمیشہ روزے رکھتیں، صرف دونوں عیدوں کے موقع پر روزہ نہیں رکھتی تھیں [3]۔ اسی طرح حج جیسی عظیم الشان عبادت کے سلسلہ میں بھی ہر سال حج کرنے کا عزم کر رکھا تھا۔ [4]

فکرِ آخرت:

حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ ایک مرتبہ انہیں جہنم یاد آ گئی اور انہوں نے رونا شروع کر دیا۔ رسول اللہ ﷺ نے یہ دیکھ کر دریافت فرمایا کہ کیوں رو رہی ہو؟ آپ سلامُ اللہ وَ رِضوانُہُ علیہا نے کہا: مجھے جہنم یاد آ گئی تھی اس لیے رو رہی ہوں۔ [5]

نیز ایک روایت میں حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں: میں نے ایک دفعہ حضور ﷺ سے عرض کی: یا رسول اللہ! اس امت کے لوگوں کو قبروں کے اندر آزمائش میں ڈالا جائے گا۔ میرا کیا بنے گا میں تو کمزور عورت ہوں۔ اس کے جواب میں بطورِ تسلی، آپ ﷺ نے یہ آیت تلاوت فرمائی: {يُثَبِّتُ اللّٰهُ الَّذِينَ آمَنُوا بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَفِي الْآخِرَةِ} یعنی "جو لوگ ایمان لائے ہیں، اللہ اُن کو اس مضبوط بات پر دنیا کی زندگی میں بھی جماؤ عطا کرتا ہے، اور آخرت میں بھی"۔ آخرت میں جماؤ پیدا کرنے کا مطلب [6] یہ ہے کہ قبر میں جب اُس سے سوال و جواب ہوگا تو وہ اپنے اس (توحید کے) کلمے اور عقیدے کا اظہار کرے گا جس کے نتیجے میں اسے آخرت کی ابدی نعمتیں نصیب ہوں گی۔ [7]

---

(1) سیرت عائشہ ص: ۱۸۰ نقلاً عن مسند أحمد و سنن الدار قطني.

(2) موطأ مالک ت الأعظمي: ۱۶۰/۲ ، مع شرحه المنتقى شرح الموطأ: ۲۱۰/۱

(3) صفة الصفوة: ۳۱۹/۱

(4) صحيح البخاري: ۱۹/۳

(5) سنن أبي داود: ۲۴۰/۴

(6) یہ مطلب آسان ترجمۂ قرآن، ص: ۵۵۶ سے ماخوذ ہے۔

(7) شرح الصدور بشرح حال الموتى و القبور، ص: ۱۴۰

حضرت عائشہؓ ہی کا بیان ہے کہ ایک دفعہ رسول اللہ ﷺ میرے پاس تشریف لائے اور میں رو رہی تھی۔ آپ ﷺ نے دریافت فرمایا: کس وجہ سے رو رہی ہو؟ میں نے کہا: مجھے دجال کا خیال آ گیا تھا اس لیے رو رہی ہوں۔[1]

وفات:

آپ سلامُ اللہ وَرِضوانُہ علیہا سن ۵۸ ہجری میں رمضان کے مہینہ میں بیمار ہوگئیں اور کئی دن اسی بیماری میں گزرے۔[2] پھر (جمہور کے قول کے موافق[3]) اسی ماہ چند روز بعد آپؓ نے ۱۷ رمضان المبارک ۵۸ ہجری (بمطابق ۱۳ جون ۶۷۸ عیسوی[4]) کو نمازِ وتر کے بعد ۶۶ سال کی عمر میں رحلت فرمائی۔

آپ سلامُ اللہ وَرِضوانُہ علیہا آخری وقت میں اپنی انتہا درجہ کی عاجزی کے بول ارشاد فرما رہی تھیں اور اپنی تعریف سننے سے بہت گریز کر رہی تھیں۔ نیز آپؓ نے یہ وصیت فرمائی تھی کہ میری نماز جنازہ بلا تاخیر (صبح کی انتظار کیے بغیر) رات کو ہی ادا کر کے مجھے اسی وقت (روضہ مبارک میں دفن کرنے کے بجائے،[5] عمومی قبرستان) جنت البقیع میں دوسری ازواج کے پاس ہی دفن کر دیا جائے۔ چناں چہ وصیت کے موافق آپؓ کو اسی شب ہی دیگر ازواج مطہراتؓ کے ساتھ جنت البقیع میں دفن کر دیا گیا۔ آپؓ کی نماز جنازہ میں اتنا ہجوم تھا کہ لوگوں نے رات کے وقت اتنا ہجوم کبھی نہیں دیکھا تھا۔ حضرت ابو ہریرہؓ نے نماز جنازہ پڑھائی تھی اور آپ سلامُ اللہ وَرِضوانُہ علیہا کے بھتیجوں اور بھانجوں نے آپؓ کو قبر مبارک میں اتارا تھا۔[6]

---

(۱) مسند احمد ط الرسالۃ: ۱۵/۴۱

(۲) سیرت عائشۃ، ص: ۱۶۸

(۳) الإصابۃ: ۸/۲۳۵

(۴) سیرت عائشۃ، ص: ۱۶۹

(۵) السمط الثمین، ص: ۱۲۲

(۶) مستفاد من طبقات ابن سعد: ۸/۵۹ و ما بعدھا

فضائل وخصائص

(۱) رسول اللہ ﷺ سے جب پوچھا گیا کہ تمام لوگوں میں سے سب سے زیادہ محبت آپ کو کس سے ہے؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا: عائشہ سے۔[1]

(۲) ایک دفعہ حضور ﷺ نے حضرت عائشہؓ سے فرمایا: کیا تم اس پر راضی نہیں ہو کہ تم دنیا وآخرت میں میری بیوی ہو؟ آپ سلام اللہ ورضوانہ علیہا نے عرض کیا: کیوں نہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: "تو تم دنیا وآخرت میں میری بیوی ہو"۔[2]

(۳) رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: حضرت عائشہؓ کو عورتوں پر اسی طرح فضیلت حاصل ہے جیسے "ثرید" کو تمام کھانوں پر۔[3]

(۴) حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں: (ایک دن مجھ سے) رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: عائشہ! یہ جبریل علیہ السلام (یہاں میرے سامنے) ہیں، تمہیں سلام کہہ رہے ہیں۔ حضرت عائشہؓ نے اس کے جواب میں کہا: "وَعَلَیْهِ السَّلَامُ وَرَحْمَةُ اللهِ" (اور جبریل پر بھی اللہ کی سلامتی اور رحمت نازل ہو)۔[4]

(۵) رسول اللہ ﷺ نے ایک موقع پر فرمایا تھا کہ تم مجھے عائشہ کے معاملہ میں تکلیف نہ پہنچاؤ، کیونکہ عائشہ ہی میری ایک ایسی بیوی ہے کہ اگر میں اس کے لحاف اور بستر میں ہوتا ہوں تو اس وقت بھی مجھ پر وحی نازل ہوتی ہے۔[5]

خصائص: ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ طاہرہؓ کے چند فضائل ایسے ہیں جو تمام ازواجِ مطہراتؓ میں سے صرف آپ سلام اللہ ورضوانہ علیہا کے ساتھ ہی خاص ہیں اور وہ آپؓ کی "خصوصیات وامتیازات" کہلاتے ہیں، جن کا حضرت عائشہؓ خود اللہ تعالیٰ کے شکر کے طور پر ذکر فرماتی تھیں۔ ان متعدد خصوصیات میں سے دس خصوصیات ذیل میں درج کی جاتی ہیں۔ فرماتی تھیں:

(۱) تنہا مجھے ہی یہ شرف حاصل ہوا کہ رسول اللہ ﷺ کے عقدِ نکاح میں آنے سے پہلے ہی آپ کو خواب میں میری صورت دکھائی گئی اور فرمایا گیا کہ یہ دنیا وآخرت میں آپ کی زوجہ ہونے والی ہے۔

---

(۱) صحيح البخاري: ۵/۵، رقم: ۳۶۶۲

(۲) السمط الثمين، ص: ۴۷

(۳) صحيح البخاري: ۲۹/۵

(۴) صحيح البخاري: ۴۴/۸

(۵) صحيح البخاري: ۱۵۶/۳

(۲) اور آپ ﷺ کی ازواج میں سے تنہا میں ہی ہوں جس کا آپ کی زوجیت میں آنے سے پہلے کسی دوسرے کے ساتھ یہ ازدواجی تعلق اور رشتہ نہیں ہوا۔

(۳) اور تنہا مجھی پر اللہ تعالیٰ کا یہ کرم تھا کہ آپ ﷺ جب میرے ساتھ ایک لحاف میں آرام فرما ہوتے تو آپ پر وحی آتی۔ دوسری ازواج میں سے کسی کو یہ سعادت میسر نہیں ہوئی۔

(۴) اور یہ کہ میں ہی آپ کی ازواج میں سے آپ کو سب سے زیادہ محبوب تھی، اور اس باپ کی بیٹی ہوں جو حضور ﷺ کو سب سے زیادہ محبوب تھے۔

(۵) اور یہ شرف بھی آپ کی ازواج میں سے مجھے ہی نصیب ہے کہ میرے والد اور میری والدہ دونوں مہاجر ہیں۔

(۶) اور یہ کہ بعض منافقین کی سازش کے نتیجہ میں جب مجھ پر ایک گندی تہمت لگائی گئی، تو اللہ تعالیٰ نے اس تہمت سے میری براءت کیلیے قرآنی آیات نازل فرمائیں جن کی قیامت تک اہلِ ایمان تلاوت کرتے رہیں گے اور ان آیات میں مجھے "پاک نبی" (طیب) کی "پاک بیوی" (طیبہ) فرمایا گیا۔
نیز اس سلسلہ کی آخری آیات میں {لَهُمْ مَغْفِرَةٌ وَرِزْقٌ كَرِيمٌ} فرما کر میرے لیے مغفرت اور رزق کریم (باعزت روزی) کا وعدہ فرمایا گیا ہے۔

(۷) کبھی اپنی اس خوش نصیبی کا بھی ذکر فرماتیں کہ آپ ﷺ نے اپنی زندگی کا آخری پورا ایک ہفتہ میرے ہی گھر میں میرے ساتھ قیام فرمایا، اور حیات مبارکہ کا آخری دن میری باری کا دن تھا۔

(۸) اور اللہ تعالیٰ کا خاص الخاص کرم مجھ پر یہ ہوا کہ اسی آخری دن میرا لعابِ دہن آپ کے لعابِ دہن کے ساتھ آپ کے پیٹ مبارک میں گیا۔ [1]

(۹) اور آخری لمحات میں، میں ہی آپ کو اپنے سینے سے لگائے بیٹھی تھی۔ اور جس وقت بحکم الٰہی روح مبارک نے جسدِ اطہر سے مفارقت اختیار کی اس وقت آپ کے پاس میں ہی تھی یا پھر موت کا فرشتہ۔

(۱۰) اور آخری بات یہ کہ میرا ہی گھر قیامت تک کیلیے آپ ﷺ کی آرام گاہ بنا یعنی اسی میں آپ کی تدفین ہوئی۔ [2]

---

(۱) اس میں ایک واقعہ کی طرف اشارہ ہے کہ وفات سے کچھ پہلے حضرت عائشہؓ کے بھائی عبدالرحمن بن ابی بکر مسواک ہاتھ میں لیے آپ ﷺ کے قریب آئے۔ آپ ﷺ نے ان کی مسواک کو اس طرح دیکھا جس سے میں سمجھی کہ آپ مسواک فرمانا چاہتے ہیں تو میں نے مسواک لے کر اپنے منہ میں چبا کر نرم کر کے آپ کو دے دی۔ آپ ﷺ نے تندرستی کی حالت کی طرح اس وقت مسواک فرمائی، اس طرح میرا آبِ دہن آپ کے آبِ دہن کے ساتھ شکم مبارک میں گیا۔ (معارف الحدیث:۳۰۶/۸)

(۲) معارف الحدیث:۳۰۶/۸

(۴) ام المومنین حضرت حفصہ سَلامُ اللہ وَرِضوانُہٗ علیہا

تمہیدی بات:

حضرت حفصہ سَلامُ اللہ وَرِضوانُہٗ علیہا، امیر المومنین حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کی صاحبزادی ہیں، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی چوتھی زوجہ محترمہ ہیں کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی رخصتی کے بعد آپ رضی اللہ عنہا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے نکاح میں آئیں۔ آپ رضی اللہ عنہا معزز اور عالی خاندان سے تعلق رکھتی تھیں، اور ابتدائے اسلام ہی میں مسلمان ہوگئی تھیں۔ نیز آپ رضی اللہ عنہا کی پرورش اور تربیت اسلامی ماحول میں ہوئی کہ آپ رضی اللہ عنہا کے والد (حضرت عمر رضی اللہ عنہ) اور ماموں (حضرت عثمان بن مظعون رضی اللہ عنہ) اسلام کے سابقین اولین کی صف کے لوگ تھے۔ علاوہ ازیں آپ رضی اللہ عنہا اُس زمانہ کی اُن چند خواتین میں سے تھیں جو لکھنا پڑھنا جانتی تھیں۔

نام ونسب:

آپ سَلامُ اللہ وَرِضوانُہٗ علیہا، کا نام "حفصہ" تھا۔ آپ رضی اللہ عنہا کے والد ماجد کا نام مبارک "عمر رضی اللہ عنہ" اور دادا کا نام "خطاب" تھا۔ آپ رضی اللہ عنہا کی والدہ کا نام "زینب رضی اللہ عنہا" اور نانا کا نام "مظعون رضی اللہ عنہ" تھا۔[۱]

آپ سَلامُ اللہ وَرِضوانُہٗ علیہا، مشہور صحابی وراویٔ حدیث حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کی سگی بہن اور معروف صحابی حضرت عثمان بن مظعون رضی اللہ عنہ کی بھانجی تھیں۔[۲]

ولادتِ باسعادت:

آپ سَلامُ اللہ وَرِضوانُہٗ علیہا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو نبوت ملنے سے پانچ سال پہلے مکہ مکرمہ میں پیدا ہوئیں، جس وقت قریش "بیت اللہ شریف" کی تعمیر کر رہے تھے۔ یعنی جس وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے نبوت کا اعلان کیا اس وقت آپ سَلامُ اللہ وَرِضوانُہٗ علیہا کی عمر پانچ سال تھی۔[۳]

---

(۱) الطبقات الکبری ط العلمیۃ: ۸/۶۵

(۲) الاستیعاب فی معرفۃ الأصحاب: ۴/۱۸۱۱

(۳) الطبقات الکبری ط العلمیۃ: ۸/۶۵

نکاحِ اول:

جب حضرت حفصہؓ جوان ہوگئیں تو حضرت عمرؓ نے ان کا نکاح قبیلہ بنوسہم کے ایک ممتاز فرد "خُنَیس بن حُذافہ" سے کردیا۔ حضرت خنیسؓ، ابتدائے اسلام میں ہی مسلمان ہو گئے تھے۔ انہوں نے حبشہ کی طرف ہجرتِ ثانیہ کی اور حبشہ سے مکہ مکرمہ واپسی پر حضرت حفصہؓ سے نکاح کیا، پھر ان دونوں میاں بیوی نے اکٹھے مدینہ طیبہ کی طرف ہجرت کی اور وہیں مدینہ منورہ میں ہی قیام پذیر رہے۔ جب غزوہ بدر ہوا تو اس میں حضرت خنیسؓ بھی شریک ہوئے اور بہت بہادری سے لڑے اور شدید زخمی ہو گئے یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو فتح عطا فرمائی۔ بدر سے جب مدینہ منورہ واپسی ہوئی تو یہ زخموں کی شدت کی وجہ سے انتقال کر گئے[1]۔ حضور ﷺ نے نماز جنازہ پڑھائی اور آپؓ کو جنت البقیع میں دفن کیا گیا۔[2]

حضور ﷺ سے آپؓ کا نکاح:

حضرت خنیس بن حذافہؓ کی وفات کے بعد جب حضرت حفصہؓ بیوہ ہوگئیں تو حضرت عمرؓ اپنی اس صاحبزادی کے نکاح کے سلسلہ میں غمگین رہتے تھے (کہ حضرت حفصہؓ عالمِ شباب میں ہی ۱۸ برس کی عمر میں بیوہ ہوگئی تھیں[3]) اور اُن میں منجانب اللہ اعلیٰ صفات دیکھ کر ان کیلیے کسی بہتر خاوند کی تلاش میں تھے اور اُدھر حضرت عثمان بن عفانؓ کی اہلیہ حضرت رقیہؓ انتقال کر گئی تھیں۔ چناں چہ حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ کے پاس پہنچے اور ان سے اپنی بیٹی کے بارے میں نکاح کی بات کی۔ انہوں نے اس کیلیے کچھ روز کی مہلت مانگی اور پھر چند ایام کے بعد یہ فرما کر معذرت کر لی کہ میرا فی الحال نکاح کا ارادہ نہیں ہے۔

اس کے بعد حضرت عمرؓ، اسی سلسلہ میں حضرت ابوبکر صدیقؓ کے پاس گئے اور ان سے اس بارے میں بات کی مگر انہوں نے آگے سے کوئی جواب نہیں دیا اور محض خاموشی اختیار کی، ان کی اس خاموشی سے حضرت عمرؓ کو دکھ بھی ہوا۔ بالآخر حضرت عمرؓ ان دونوں حضرات (حضرت عثمانؓ وابوبکرؓ) کی عدمِ آمادگی سے رنجیدہ ہوکر بارگاہِ رسالت میں

---

(۱) یہی مشہور روایت ہے اگر چہ بعض مؤرخین نے آپؓ کی وفات "اُحد" سے واپسی پر بیان کی ہے۔(انظر: موسوعة آل بیت النبی: ۱/۲۴۳)

(۲) ینظر: موسوعة آل بیت النبی: ۱/۲۴۳، والمنتظم في تاریخ الملوک والأمم: ۳/۱۸۵، والطبقات الکبری ط العلمیة: ۳/۳۰۰

(۳) تراجم سیدات بیت النبوۃ، ص: ۲۳۰

حاضر ہوئے اور اپنی پریشانی کہہ سنائی، اس پر اول حضور ﷺ مسکرائے پھر ارشاد فرمایا: "حفصہ کو عثمان سے بہتر شوہر اور عثمان کو حفصہ سے بہتر بیوی نصیب ہوگی"۔ انجام کار حضرت حفصہؓ کا رسول اللہ ﷺ سے اور حضرت عثمانؓ کا حضور ﷺ کی صاحبزادی حضرت ام کلثومؓ سے نکاح ہوا۔ آپ ﷺ کا حضرت حفصہؓ سے یہ نکاح راجح قول کے مطابق سن ۳ھ میں ہوا۔ اس طرح گویا رسول اللہ ﷺ سے نکاح کے وقت آپ سلام اللہ و رضوانہ علیہا کی عمر تقریبا ۲۰ برس تھی۔ ایک موقع پر حضرت ابوبکرؓ نے حضرت عمرؓ سے کہا کہ آپ کے نکاح پیش کرنے کے وقت میری خاموشی سے آپ کو دکھ تو ہوا ہوگا، حضرت عمرؓ نے کہا: ہاں! دکھ تو ہوا تھا۔ اس پر حضرت ابوبکرؓ نے کہا: اصل میں بات یہ تھی کہ حضور ﷺ نے حضرت حفصہؓ سے اپنے نکاح کے بارے میں کچھ تذکرہ کیا تھا اس لیے میں نے آپ ﷺ کے راز کو ظاہر کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ البتہ اگر آپ ﷺ حضرت حفصہؓ سے نکاح کا ارادہ ملتوی فرما دیتے تو پھر میں ان سے نکاح کیلیے آمادہ تھا۔[1]

شوہر سے دل لگی کا ایک واقعہ:

حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ زینب بنت جحشؓ کے پاس کہیں سے شہد آ گیا تھا (وہ بھی آنحضرت ﷺ کی بیوی تھیں)۔ آپ ان کے پاس ذرا دیر تک ٹھہرا کرتے تھے اور شہد پیتے تھے۔ میں نے اور حفصہؓ نے آپس میں مشورہ سے یہ طے کرلیا کہ آنحضرت ﷺ سے میاں بیوی والی دل لگی کریں گی۔ ہم میں سے جس کے پاس تشریف لائیں گے ہر ایک یوں کہے کہ آپ ﷺ نے "مغافیر" (مغافیر درخت کے پھل یا کسی گھاس یا پھول کا نام ہوتا تھا جس میں کچھ بُو ہوتی تھی) کھایا ہے۔ آپ کے مبارک منہ سے مغافیر کی بُو آ رہی ہے۔ چناں چہ آپ ﷺ نے جواب میں فرمایا: مغافیر تو میں نے نہیں کھایا البتہ زینبؓ کے پاس شہد پیا ہے۔ اس سے آپ ﷺ کو یہ شبہ ہوا کہ شاید جو شہد میں نے پیا تھا، اس کی مکھی نے مغافیر چوسا ہو۔ چونکہ آنجناب ﷺ کو اپنے مبارک منہ سے کوئی ناگوار بُو محسوس ہونا انتہائی ناپسند تھا، اس لیے آپ ﷺ نے اس وقت یہ قسم کھالی کہ میں آئندہ شہد نہیں پیوں گا۔ یہ آپ ﷺ نے اپنی ان بیویوں کو خوش کرنے کیلیے فرمایا تھا۔ اس پر اللہ جل شانہ نے یہ آیات نازل فرمائیں: {يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ لِمَ تُحَرِّمُ مَا أَحَلَّ اللهُ لَكَ تَبْتَغِي مَرْضَاتَ أَزْوَاجِكَ وَاللهُ غَفُورٌ رَحِيمٌ * قَدْ فَرَضَ اللهُ لَكُمْ تَحِلَّةَ أَيْمَانِكُمْ وَاللهُ مَوْلَاكُمْ وَهُوَ

---

(۱) ينظر: صحيح البخاري: ۷/ ۱۴، والطبقات الكبرى ط العلمية: ۸/ ۶۵، والسمط الثمين، ص: ۱۲۵

الْعَلِيمُ الْحَكِيمُ﴾[التحریم: ۲، ۱]

ترجمہ: اے نبی! جس چیز کو اللہ نے آپ کے لیے حلال کیا، آپ اپنی بیویوں کی خوشنودی حاصل کرنے کیلیے اُسے (قسم کھانے کے ذریعہ) کیوں حرام کرتے ہیں؟ اور اللہ بہت بخشنے والا، بہت مہربان ہے۔ اللہ نے تم لوگوں کو تمہاری قسموں کا کھولنا یعنی کفارہ دینا مقرر کر دیا ہے اور اللہ تمہارا کارساز ہے اور وہی ہے جس کا علم بھی کامل ہے، حکمت بھی کامل۔[1]

والد (حضرت عمرؓ) کی خدمت اور اُن کا زہد:

حضرت حفصہؓ باوجود اُم المومنین ہونے کے، اپنے والد محترم حضرت عمر بن خطابؓ کی خود خدمت کیا کرتی تھیں۔ چناں چہ ایک دفعہ حضرت عمرؓ اپنی بیٹی حضرت حفصہؓ کے پاس تشریف لائے تو انہوں نے اپنے والد کی خدمت میں ٹھنڈا شوربا اور روٹی پیش کی اور اس شوربے میں زیتون کا تیل بھی ملا دیا۔ اس پر حضرت عمرؓ نے ان سے فرمایا: أُدْمَانِ فِي إِنَاءٍ وَاحِدٍ؟ لاأَذُوقُهُ حَتَّى أَلْقَى اللهَ (ایک برتن میں دو سالن؟ میں تو مرتے دم تک اسے نہیں چکھوں گا)۔[2]

علمی فضیلت اور قرآن کی حفاظت:

حضرت حفصہؓ بخوبی پڑھنا اور لکھنا جانتی تھیں۔ آپ سَلامُ اللهِ وَرِضْوانُهُ عليها نے رسول اللہ ﷺ سے دین سیکھ کر اس کو محفوظ کیا اور آگے اس کی تعلیم واشاعت کا اہتمام فرمایا۔ متعدد صحابہ کرام آپؓ سے احادیث روایت کرتے تھے، خود آپؓ کے بھائی اور معروف صحابی حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی آپؓ سے کئی احادیث مروی ہیں نیز بیشتر تابعین نے آپؓ سے احادیث روایت کر کے امت تک پہنچائیں۔ اس کے علاوہ قرآن مجید کی حفاظت کی سعادت بھی آپؓ کے حصہ میں آئی۔ وہ اس طرح کہ حضرت ابوبکرؓ نے اپنے زمانہ میں چمڑے کے مختلف ٹکڑوں وغیرہ پر لکھی متفرق آیات کو جمع کرا کر ایک ہی جگہ قرآن مجید کا ایک نسخہ وصحیفہ تیار کرایا، وہ نسخہ حضرت ابوبکرؓ کی وفات تک انہی (حضرت ابوبکرؓ) کے پاس رہا پھر حضرت عمرؓ کے پاس رہا۔ حضرت عمرؓ اپنی شہادت سے پہلے وہ نسخہ حضرت حفصہؓ کو دے گئے پھر وہ آخر تک حضرت حفصہؓ کے پاس ہی رہا۔ حضرت عثمانؓ کے زمانہ میں جب قرآن مجید کے مختلف نسخے لکھوا کر ان

---

(۱) مستفاد من آسان ترجمہ قرآن، ص: ۱۲۰۲، وامهات المومنين، ص: ۶۰

(۲) الطبقات الكبرى: ۳/۲۴۳، والرياض النضرة في مناقب العشرة: ۲/۳۶۷، ونساء أهل البيت، ص: ۲۰۳

کو سرکاری سطح پر مختلف علاقوں میں بھیجا گیا تو اس تیاری میں حضرت عثمانؓ نے اول حضرت حفصہؓ سے وہ نسخہ منگوایا پھر اسی نسخہ کو سامنے رکھ کر باقی نسخے نقل کروائے تھے۔ اس کے بعد حضرت حفصہؓ کا یہ نسخہ ان کو واپس کر دیا تھا جو موت تک پھر انہی کے پاس رہا۔ اس طرح بلادِ عالم میں جو قرآن پھیلا اس میں حضرت حفصہؓ کے ہی نسخہ کا بنیادی کردار ہے۔ اس لیے آج تک پڑھے جانے والے قرآن مجید میں حضرت حفصہؓ کا پورا حصہ ہے، یعنی حفاظتِ قرآن کی اتنی بڑی فضیلت بھی انہی کے حصہ میں آئی۔[1]

اعزازات:

حضرت حفصہؓ کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ جب حق و باطل کے درمیان پہلا معرکہ "غزوۂ بدر" ہوا تو اکیلے حضرت حفصہؓ کے گھرانہ سے ان کے درج ذیل رشتہ داروں نے اس میں شرکت کی:

ان کے والد حضرت عمرؓ، چچا حضرت زیدؓ، شوہر حضرت خنیس بن حذافہؓ، تین ماموں یعنی حضرت عثمان بن مظعونؓ، حضرت عبداللہ بن مظعونؓ، حضرت قُدامہ بن مظعونؓ، اور ماموں زاد بھائی حضرات سائب بن عثمان رضی اللہ عنہم اجمعین۔[2]

وفات:

جمہور کے مذہب کے مطابق شعبان، ۴۵ھ میں مدینہ منورہ میں آپ سلام اللہ ورِضوانُہ علیہا کا وصال ہوا۔ اس وقت آپؓ کی عمر مبارک ساٹھ (۶۰) برس تھی۔ امیر مدینہ مروان بن حکم نے نماز جنازہ پڑھائی اور کچھ راستہ تک آپؓ کے جنازہ کو کندھا بھی دیا، اس کے بعد قبر پہنچنے تک حضرت ابوہریرہؓ نے کندھا دیا۔ آپ سلام اللہ ورِضوانُہ علیہا کے بھائی اور بھتیجے آپؓ کی قبر میں اترے[3]۔ آپؓ کو جنت البقیع میں دیگر ازواج کے ساتھ دفن کیا گیا۔[4]

---

(۱) ینظر: تراجم سیدات بیت النبوة، ص: ۲۴۰، وموسوعة آل بیت النبی: ۲۵۶/۱، وشرح الزرقانی علی المواهب اللدنیة بالمنح المحمدیة: ۳۹۵/۴

(۲) السمط الثمین، ص: ۱۲۸

(۳) البدایة والنهایة طه جعفر: ۱۷۲/۱۱، وسبل الهدی والرشاد في سیرة خیر العباد: ۱۸۶/۱۱

(۴) تراجم سیدات بیت النبوة، ص: ۲۴۰

فضائل وکمالات:

ایک موقع پر اللہ کے مقرب ترین فرشتے حضرت جبریلؑ نے آ کر رسول اللہ ﷺ سے حضرت حفصہؓ کے متعلق کہا: "وہ راتوں کو بہت زیادہ نماز پڑھنے والی اور دن میں بہت زیادہ روزے رکھنے والی خاتون ہیں، نیز وہ جنت میں بھی آپ کی بیوی ہوں گی"۔[1]

آپؓ موت تک روزے رکھتی رہیں[2]، حتی کہ جس دن آپؓ کا انتقال ہوا اس دن بھی آپؓ روزے سے تھیں۔ نیز آپؓ ایسی کمال اخلاق کی مالک تھیں کہ سوکن ہونے کے باوجود آپؓ میں اور حضرت عائشہؓ میں بہنوں جیسا پیار تھا اور آپ دونوں ایک دوسرے کے معاملات میں اکثر شریک رہتی تھیں۔[3]

حضرت حفصہؓ کی بلندیٔ شان کے متعلق حضرت عائشہؓ کا فرمان ہے: کَانَتْ ابْنَةَ أَبِیهَا "وہ اپنے باپ کی بیٹی تھیں"[4]۔ یعنی صفات میں وہ اپنے والد مکرم حضرت عمر بن خطابؓ کی حقیقی جانشین ہیں۔ نیز لکھا ہے کہ آپؓ انتہائی نیک و پرہیزگار عورت تھیں۔[5]

---

(۱) مجمع الزوائد ومنبع الفوائد: ۹/۲۴۵، رقم: ۱۵۳۴۴

(۲) الإصابة في تمييز الصحابة: ۸/۸۶

(۳) ازواج مطہرات حیات و خدمات، ص: ۱۲۰

(۴) سنن الترمذي ت شاکر: ۳/۱۰۳

(۵) الطبقات الكبرى ط العلمية: ۸/۶۷

(۵) ام المومنین حضرت زینب بنت خزیمہ سلامُ اللہ و رِضوانُہ علیہا

تمہیدی بات:

حضرت حفصہؓ سے نکاح کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے "ام المساکین" حضرت زینب بنت خزیمہؓ سے نکاح فرمایا، چناں چہ آپؓ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پانچویں زوجہ مطہرہ ہیں۔ آپؓ صرف چند ماہ ہی آقائے نامدار صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رفیقۂ حیات رہ کر داعیٔ اجل کو لبیک کہہ گئیں۔ صرف دو ازواجِ مطہراتؓ ہیں جنہوں نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زندگی میں وفات پائی: ایک حضرت خدیجہؓ جو مکہ مکرمہ میں فوت ہوئیں اور وہیں جنت المعلیٰ میں مدفون ہوئیں اور دوسری یہی حضرت زینب بنت خزیمہؓ، جو مدینہ منورہ میں وفات پا کر جنت البقیع میں مدفون ہوئیں۔ باقی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تمام ازواجِ مطہراتؓ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زندگی میں باحیات رہیں اور آپ سے فیضیاب ہوتی رہیں۔

ملحوظہ: چونکہ حضرت زینبؓ، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نکاح میں صرف چند ہی ماہ رہیں، اس لیے آپ سلامُ اللہ و رِضوانُہ علیہا کی سیرت وفضائل کی روایات "کتب سیر وتاریخ" میں بہت ہی کم ملتی ہیں۔ اسی وجہ سے یہاں بھی آپؓ کا تذکرہ اختصار کے ساتھ ہوگا۔

نام ونسب:

آپؓ کا نام "زینب"، والد کا نام "خزیمہ" اور دادا کا نام "حارث" تھا[۱]۔ اور آپؓ کی والدہ کا نام "ہند" اور نانا کا نام "عوف" تھا[۲]۔ آپؓ، ام المومنین حضرت میمونہ بنت حارثؓ کی ماں شریک بہن تھیں۔[۳]

آپؓ کے سابقہ نکاح:

آپ سلامُ اللہ و رِضوانُہ علیہا، حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے عقدِ نکاح میں آنے سے پہلے، راجح قول کے مطابق طفیل بن حارث

---

(۱) الطبقات الكبرى ط العلمية: ٨/ ٩١، وجمهرة أنساب العرب لابن حزم: ١/ ٢٧٣

(۲) المحبر ص: ١٠٩

(۳) أسد الغابة ط العلمية: ٧/ ١٣٠، والإصابة في تمييز الصحابة: ٨/ ١٥٧

کے نکاح میں تھیں۔ طفیل نے ان کو طلاق دے دی تھی۔ پھر طفیل کے بھائی حضرت عبیدہ بن حارث رضی اللہ عنہ نے ان سے نکاح کیا۔ حضرت عبیدہ رضی اللہ عنہ غزوۂ بدر میں شہید ہو گئے، اور یہ بیوہ ہو گئیں۔[1]

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے نکاح:

حضرت عبیدہ رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد حضرت زینب رضی اللہ عنہا کی جب عدت پوری ہو گئی تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انہیں اپنے لیے نکاح کا پیغام بھیجا۔ انہوں نے اپنے اس معاملہ کا اختیار خود حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ہی دے دیا، چناں چہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے گواہوں کی موجودگی میں اُن سے نکاح فرمالیا۔ اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مہر میں ان کو (۵۰۰ درہم،[2] یعنی) ''ساڑھے بارہ اوقیہ'' چاندی دی (جو اِس وقت ''۱۳۱ تولے اور ۳ ماشے چاندی کے مساوی ہے)۔[3]

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ نکاح (غزوۂ احد سے ایک ماہ قبل)، رمضان المبارک ۳ھ میں فرمایا۔[4]

سخاوت:

آپ سلامُ اللہ وَرِضوانُہ علیہا میں سخاوت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ غریبوں، مسکینوں کو نہایت فراخ دلی کے ساتھ کھانا کھلایا کرتی تھیں۔ فقراء اور مساکین سے بہت شفقت سے پیش آتیں، صدقات کے ذریعہ ان کی مدد کرتیں، نیز آپ رضی اللہ عنہا ان کیلیے انتہائی نرم دل تھیں۔ آپ سلامُ اللہ وَرِضوانُہ علیہا کی انہی صفات اور خوبیوں کا یہ ثمرہ تھا کہ آپ رضی اللہ عنہا زمانۂ جاہلیت میں ہی "امّ المساکین" (یعنی مسکینوں کی ماں) کے معزز لقب سے معروف ہو گئی تھیں، حتی کہ جب آپ رضی اللہ عنہا، حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے عقدِ نکاح میں آئیں تو اس وقت بھی آپ رضی اللہ عنہا "ام المساکین" سے ہی مشہور تھیں۔ آپ رضی اللہ عنہا کے اس خوبصورت لقب کی وجہ اس کے علاوہ اور کوئی نہیں تھی کہ آپ رضی اللہ عنہا مسکین وغریب لوگوں کو کثرت سے کھانا کھلاتی تھیں[5]۔

---

(۱) الطبقات الکبری ط العلمیة: ۹۱/۸، ولاحِظ لتحقیق المقام فیه کلامَ الدکتورة عائشة عبد الرحمن الشهیرة بـــــ "بنت الشاطی" فی کتابها الحافل، تراجم سیدات بیت النبوة، ص: ۲۴۲، ۲۴۳

(۲) سیرت مصطفی صلی اللہ علیہ وسلم: ۲۹۰/۳

(۳) الطبقات الکبری ط العلمیة: ۹۱/۸

(۴) الإصابة في تمییز الصحابة: ۱۵۷/۸

(۵) ینظر: سیرة ابن هشام ت السقا: ۶۴۷/۲، ومجمع الزوائد ومنبع الفوائد: ۲۴۸/۹، والطبقات الکبری ط العلمیة: ۹۱/۸، والإصابة في تمییز الصحابة: ۱۵۷/۸، ونساء أهل البیت، ص: ۲۱۴ وما بعدها.

چناں چہ یہ عظیم لقب آپ رضی اللہ عنہا کی ذات کے ساتھ اس حد تک مخصوص ہو گیا کہ سیرت و تاریخ کی جس کتاب میں بھی آپ رضی اللہ عنہا کا نام ذکر کیا گیا ہے وہاں اس لقب کا تذکرہ بھی ضرور کیا گیا ہے۔ [1]

آپ رضی اللہ عنہا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے عقدِ نکاح میں آنے کے بعد بھی اپنی اس سخاوت و فیاضی، اور یتیموں و بے آسروں کی مدد میں پیش پیش رہیں حتیٰ کہ آپ رضی اللہ عنہا اس وصف میں باقی تمام ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن سے ممتاز اور منفرد نظر آتی تھیں۔ [2]

وفات:

راجح قول کے مطابق آپ سلامُ اللہ و رضوانہ علیہا، آٹھ ماہ کی قلیل مدت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عقدِ نکاح میں رہیں اور ماہِ ربیع الاول کے آخر میں سن ۴ھ میں انتقال ہوا، جبکہ آپ رضی اللہ عنہا کی عمر تیس برس تھی [3]۔ خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ رضی اللہ عنہا کی نماز جنازہ پڑھائی اور جنت البقیع میں دفن کیا اور قبر میں آپ سلامُ اللہ و رضوانہ علیہا کے تین بھائی اترے تھے [4]۔ اور مدینہ منورہ میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج میں سے سب سے پہلے آپ رضی اللہ عنہا ہی کی وفات ہوئی۔ [5]

اعزاز و فضیلت:

آپ سلامُ اللہ و رضوانہ علیہا کی حیات طیبہ کے زیادہ حالات تو کتب تاریخ میں درج نہ ہو سکے مگر آپ رضی اللہ عنہا کے شرف و اعزاز اور فضیلت و عظمت کیلیے اتنا ہی کافی ہے کہ آپ سلامُ اللہ و رضوانہ علیہا، امام الانبیاء و سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم کی زوجہ مطہرہ اور تمام اہلِ ایمان کی والدہ محترمہ ہیں، نیز یہ کہ آپ رضی اللہ عنہا کا جنازہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود پڑھایا اور آپ رضی اللہ عنہا کو جنت البقیع میں دفن کیا۔

---

(۱) موسوعة آل بيت النبي: ۱/۳۲۵

(۲) نظر: تراجم سيدات بيت النبوة، ص: ۲۴۵

(۳) سبل الهدى والرشاد في سيرة خير العباد: ۱۱/۲۰۶

(۴) الطبقات الكبرى ط العلمية: ۸/۹۲

(۵) مجمع الزوائد ومنبع الفوائد: ۹/۲۴۸

(٦) ام المومنین حضرت ام سلمہ سلام اللہ و رضوانہ علیہا

تمہیدی بات:

حضرت زینب بنت خزیمہؓ کی وفات کے بعد رسول اللہ ﷺ نے حضرت ام سلمہؓ سے نکاح فرمایا اور جس گھر میں حضرت زینب بنت خزیمہؓ رہا کرتی تھیں اسی گھر میں ان کو ٹھہرایا۔ دنیوی اعتبار سے آپؓ ایک مالدار گھرانہ سے تعلق رکھتی تھیں، آپؓ کے والد اپنی مالداری و فیاضی کے سبب لوگوں میں "زاد الرَّکب" (یعنی مسافروں کا زادِراہ) کے باعزت لقب سے معروف تھے۔ اور دینی لحاظ سے آپؓ "ام المومنین" کے ساتھ ساتھ "ذات الہجرتین" کے لقب سے یاد کی جاتی تھیں۔ نیز ازواج مطہراتؓ میں سے سب سے آخر میں آپ سلام اللہ و رضوانہ علیہا کا انتقال ہوا۔

نام ونسب:

آپ سلام اللہ و رضوانہ علیہا اپنی کنیت "ام سلمہؓ" سے مشہور تھیں مگر آپؓ کا نام "ہند" تھا۔ اسی طرح آپؓ کے والد اپنی کنیت "ابو اُمیہ" سے معروف تھے اور ان کا نام "سہیل" تھا۔ آپؓ کے والد "ابو امیہ" قریش کے ایک ذی وجاہت اور ان میں ایک فیاض و سخی شخصیت کی حیثیت سے جانے جاتے تھے۔ ان کی سخاوت کا یہ عالم تھا کہ جب وہ سفر میں جاتے تو ان کے رفقائے سفر اپنے ساتھ زادِراہ لیے بغیر ان کے ساتھ سفر کرتے اور ابو امیہ اپنی طرف سے ان سب مسافروں کی کفالت کرتے۔ اسی وجہ سے ان کا لقب "زاد الرَّکب" پڑ گیا تھا یعنی مسافروں کا زادِراہ اور توشہ۔

اور حضرت ام سلمہ سلام اللہ و رضوانہ علیہا کی والدہ کا نام "عاتکہ" اور نانا کا نام "عامر" تھا۔[1]

نکاحِ اول و ہجرت:

آپ سلام اللہ و رضوانہ علیہا، حضور ﷺ کے نکاح میں آنے سے پہلے اپنے چچا زاد بھائی "عبد اللہ بن عبد الاسد" کے نکاح میں تھیں جو حضور ﷺ کے پھوپھی زاد بھائی ہونے کے علاوہ آپ ﷺ کے رضاعی بھائی بھی تھے۔[2]

---

(١) ینظر: الطبقات الکبری: ٨/ ٦٩، مع الجزء المتمم لطبقات ابن سعد / الطبقات الکبری - متمم الصحابة - الطبقة الرابعة ص: ٣٤٢، والإصابة في تمییز الصحابة: ٨/ ٣٤٢

(٢) الإصابة في تمییز الصحابة: ٨/ ٤٠٤

آپ سلامُ اللہ وَرِضوانُہٗ علیہا اور آپ رضی اللہ عنہ کے شوہر، یہ دونوں میاں بیوی ابتدائے اسلام میں ہی مسلمان ہوگئے تھے۔ دونوں نے اکٹھے حبشہ کی طرف ہجرت کی۔ وہاں اللہ تعالیٰ نے ان کو ایک بیٹا عطا فرمایا جس کا نام انہوں نے "سلمہ" رکھا، بعد میں اسی بیٹے کی نسبت سے آپ سلامُ اللہ وَرِضوانُہٗ علیہا "ام سلمہ" اور آپ رضی اللہ عنہ کے شوہر "ابو سلمہ" کی کنیت سے معروف ہوئے۔

مکہ مکرمہ میں کفارِ مکہ کے بائیکاٹ والا صحیفہ جب پھٹ گیا تو یہ دونوں میاں بیوی مکہ واپس آگئے اور پھر جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کو بیعت عقبہ کے بعد مدینہ منورہ کی طرف ہجرت کرجانے کی اجازت دی تو ان دونوں حضرات نے مکہ مکرمہ میں اپنا گھر بار چھوڑ کر مدینہ کی جانب ہجرت شروع کردی اور اس ہجرت میں یہ دونوں اکٹھے بھی نہ جا سکے۔ چار و ناچار الگ الگ جانا پڑا۔ حضرت ابو سلمہ کی ہجرت پہلے ہوئی جبکہ حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا بعد میں مدینہ منورہ پہنچیں، آپ سلامُ اللہ وَرِضوانُہٗ علیہا نے بہت قربانی ومشقت کے ساتھ یہ ہجرت کی، جس کا واقعہ کتب تاریخ میں مفصل مذکور ہے۔[1] چناں چہ حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا فرمایا کرتی تھیں: اسلام میں جتنی قربانیاں اور آزمائشیں "ابو سلمہ" کے اہلِ خانہ کو پیش آئیں، میرے علم کے مطابق اتنی کسی اور کے گھرانہ کو پیش نہیں آئیں۔[2]

آپ سلامُ اللہ وَرِضوانُہٗ علیہا مدینہ منورہ پہنچ کر اپنے شوہر کے پاس رہنے لگیں۔ وہاں اللہ تعالیٰ نے آپ حضرات کو ایک بیٹا "عمر" اور دو بیٹیاں عطا فرمائیں جن میں سے ایک کا نام "درہ" اور دوسری کا "زینب" رکھا گیا۔[3]

حضرت ابو سلمہ رضی اللہ عنہ کی وفات اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے نکاح:

حضرت ابو سلمہ رضی اللہ عنہ غزوۂ بدر اور غزوۂ احد دونوں میں شریک ہوئے۔ غزوہ احد میں ان کو ایک گہرا زخم لگا تھا جو ایک ماہ علاج کرانے کے بعد ٹھیک ہوگیا تھا۔ اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو ایک اور لشکر میں بھیجا تھا وہاں سے ایک ماہ بعد واپسی ہوئی اور وہ پچھلا زخم ہَرا ہوگیا جو آپ کی وفات کا سبب بنا، چناں چہ جمہور کے نزدیک آپ رضی اللہ عنہ نے ۸ جمادی الثانی، سن ۴ھ کو انتقال فرمایا۔

---

(۱) تراجم سیدات بیت النبوۃ، ص: ۲۴۸، و الإصابة في تمييز الصحابة: ۸/۴۰۴

(۲) السيرة النبوية لابن كثير: ۲/۲۱۷

(۳) الإصابة في تمييز الصحابة: ۸/۴۰۴

حضرت ام سلمہؓ اور ابو سلمہؓ کی آپس میں بہت ہی زیادہ محبت تھی جس کا تذکرہ کتب میں موجود ہے، چناں چہ حضرت ابو سلمہؓ نے اپنی وفات سے پہلے حضرت ام سلمہؓ کو بلاکر ان کے حق میں یہ دعا کی: "اَللّٰهُمَّ ارْزُقْ اُمَّ سَلَمَةَ بَعْدِيْ رَجُلًا خَيْرًا مِنِّيْ، لَا يُحْزِنُهَا وَلَا يُؤْذِيْهَا" "اے اللہ! میرے بعد ام سلمہؓ کو مجھ سے بہتر شوہر دینا جو اُن کو نہ تکلیف دے اور نہ کوئی دکھ پہنچائے"۔

حضرت ام سلمہؓ فرماتی ہیں: جب ابو سلمہؓ کا انتقال ہوگیا تو میں سوچتی تھی کہ ابو سلمہؓ جیسے شوہر سے بڑھ کر میرے لیے اور کون شخص بہتر ہوگا؟ میں اسی سوچ میں کچھ عرصہ رہی کہ بالآخر (سب سے بہتر شخص یعنی) رسول اللہ ﷺ نے مجھے نکاح کا پیغام بھیجا اور آپ ﷺ سے میرا نکاح ہوگیا۔[1]

اوصافِ حمیدہ:

آپ سلام اللہ ورضوانہ علیہا کو اللہ تعالیٰ نے عالی صفات سے نوازا تھا۔ آپؓ کو اللہ نے حسن وجمال بھی عطا فرمایا تھا نیز بصیرت، دور اندیشی، موقع شناسی اور دانشوری جیسے اوصاف سے بھی سرفراز فرمایا تھا۔[2]

صلح حدیبیہ کے موقع پر رسول اللہ ﷺ کو ایک الجھن پیش آگئی تھی جس کو حضرت ام سلمہؓ نے نہایت عمدہ تدبیر سے سلجھا دیا تھا۔ جس کا مختصر خلاصہ یہ ہے کہ سن ۶ ھ میں حضور ﷺ صحابہ کرامؓ کے ساتھ عمرہ کی ادائیگی کیلیے مدینہ طیبہ سے مکہ مکرمہ روانہ ہوئے۔ حدیبیہ کے مقام پر کفار مکہ نے صحابہ سمیت آپ ﷺ کو مکہ معظمہ جانے سے روک لیا۔ اس موقع پر آپ ﷺ نے بجائے حالات کو کشیدہ کرنے کے چند شرائط پر صلح کو اختیار فرمایا جس میں یہ شرط بھی تھی کہ اس سال آپ ﷺ عمرہ نہیں کریں گے۔ چناں چہ شرط کے موافق آپ ﷺ نے صحابہ میں اعلان کرادیا کہ اٹھو! احرام کھولنے کیلیے اپنے سر منڈا دو۔ صحابہ کرام کی طبیعتیں عمرہ نہ کرنے کا سن کر اندر سے کافی بوجھل ہوگئی تھیں اس لیے آپ ﷺ کے اعلان کرانے بلکہ تین بار اعلان کرانے کے باوجود کسی میں ہمت نہ ہوئی کہ وہ اٹھے اور سر منڈا کر احرام کھول دے۔ یہ کیفیت دیکھ کر آپ ﷺ حضرت ام سلمہؓ کے پاس تشریف لائے اور صحابہ کے احرام نہ کھولنے کی صورتِ حال بیان کی۔ اس پر حضرت ام سلمہؓ نے نہایت دانشوری کا مظاہرہ کرتے ہوئے آپ ﷺ کو ایک عمدہ تدبیر

---

(۱) شرح الزرقاني على المواهب اللدنية بالمنح المحمدية: ۴/۳۹۸، ۴۰۱، والإصابة في تمييز الصحابة: ۸/۳۴۳

(۲) الإصابة في تمييز الصحابة: ۸/۴۰۶

پیش کی کہ آپ جائیں اور سب کے سامنے بیٹھ کر اپنا سر منڈا دیں۔ جب آپ ﷺ نے باہر جا کر حضرت ام سلمہؓ کی بیان کردہ تدبیر کے موافق اپنا سر منڈایا تو سب کے سب صحابہ کرام میں اعلیٰ درجہ کی ہمت پیدا ہوئی۔ وہ سب اٹھے اور آپس میں ایک دوسرے کے سر مونڈنا شروع کر دیے[1]۔ اس طرح حضرت ام سلمہؓ کی تدبیر سے یہ الجھن احسن انداز میں فوراً ہی حل ہوگئی۔

اشاعتِ علم:

حضور ﷺ کے زیادہ شادیاں کرنے میں جہاں اور بہت سی حکمتیں اور دینی مصلحتیں تھیں وہاں ایک حکمت یہ بھی تھی کہ ازواج مطہراتؓ، ہر وقت آپ ﷺ کے ساتھ رہنے کی وجہ سے، آپ ﷺ کے ارشادات وتعلیمات (خواہ وہ گھر کی زندگی سے متعلقہ ہوں یا اس کے علاوہ ہوں) کو محفوظ کر کے امت تک پہنچاتی رہیں، چناں چہ حضرت ام سلمہؓ بھی جب آپ ﷺ کے نکاح میں آ گئیں تو وہ بھی برابر آپ ﷺ کے ارشادات کو محفوظ کرتی رہیں اور آپ سے سوال کر کے علمِ دین سیکھتی رہیں اور پھر اس علم کو انہوں نے خوب پھیلایا۔ صحابہ اور تابعین کی ایک بڑی جماعت نے ان سے دین حاصل کیا، یہاں تک کہ حضرت عائشہؓ، حضرت عبداللہ بن عباسؓ اور حضرت ابوسعید خدریؓ جیسے جلیل القدر صحابہ نے بھی ان سے احادیث لیں۔[2]

حدیث شریف کی کتابوں میں جو حضرت ام سلمہؓ کی روایات ملتی ہیں ان کی تعداد ۳۷۸ ہے۔[3] محمود بن لبید فرماتے ہیں کہ حضور ﷺ کی سب ہی ازواج مطہراتؓ آپ ﷺ کی تعلیمات وارشادات کو یاد رکھتی تھیں مگر حضرت عائشہؓ اور حضرت ام سلمہؓ کے برابر کوئی اور بیوی نہیں تھی۔[4]

مروان بن حکم مسائل کے سلسلہ میں حضرت ام سلمہؓ سے رہنمائی لیا کرتے تھے اور کہتے تھے کہ ہم کسی مسئلہ کے بارے میں اور کسی سے کیوں پوچھیں جبکہ ہمارے اندر نبی کریم ﷺ کی ازواج مطہراتؓ موجود ہیں۔[5]

---

(۱) القصة بتفصيلها في صحيح البخاري: ۱۹۷/۳

(۲) الإصابة في تمييز الصحابة: ۳۴۴/۸

(۳) امهات المومنين، ص: ۸۰

(۴) الطبقات الكبرى ط العلمية: ۲۸۶/۲

(۵) مسند أحمد ط الرسالة: ۳۲۳/۴۴

اور حضرت ام سلمہؓ حدیث بیان کرنے کے ساتھ ساتھ فتویٰ بھی دیا کرتی تھیں، چناں چہ علامہ ابن القیمؒ نے لکھا ہے کہ اگر اُن کے فتاویٰ جمع کیے جائیں تو اُن فتاویٰ کا ایک رسالہ بن سکتا ہے۔[1]

حضرت ام سلمہؓ عورتوں سے متعلقہ مسائل بھی حضور ﷺ سے معلوم کرتی رہتی تھیں، چناں چہ ایک مرتبہ انہوں نے آپ ﷺ سے سوال کیا: یا رسول اللہ! میں اپنے سر کی مینڈھیاں بہت سختی سے باندھتی ہوں تو کیا غسلِ جنابت کے وقت (بالوں کی جڑیں تر کرنے کیلیے) ان کو کھول لیا کروں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: مینڈھیاں کھولنے کی ضرورت نہیں ہے، بس اتنا کافی ہے کہ تین بار اپنے سر پر اچھی طرح پانی ڈال لیا کرو۔ اس کے بعد پورے بدن پر پانی بہالیا کرو، تم پاک ہوجاؤ گی۔[2]

امر بالمعروف ونہی عن المنکر:

حضرت ام سلمہؓ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی بھی پابند تھیں۔ ایک دن ان کے بھتیجے نے ان کے گھر میں دو رکعت نماز پڑھی۔ جب وہ سجدہ کرتے تو زمین پر پھونک مار کر مٹی اڑادیتے تاکہ سجدہ کی جگہ صاف ہوجائے اور پیشانی غبار آلود نہ ہو۔

یہ دیکھ کر حضرت ام سلمہؓ نے ان سے فرمایا: ایسا نہ کرو، کیونکہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا ہے کہ آپ ﷺ نے اپنے غلام کو (جو سجدے کے وقت اسی طرح مٹی اڑا رہا تھا) فرمایا تھا: "اللہ کیلیے اپنا چہرہ مٹی میں ملا"۔[3]

حضرت ام سلمہؓ عام لوگوں کے ساتھ ساتھ وقت کے حاکموں کو بھی امر بالمعروف کرتی تھیں چناں چہ ان کے زمانہ میں بعض حکام نے نماز کے اوقات تبدیل کردیے تھے یعنی مستحب اوقات چھوڑ دیے تھے۔ حضرت ام سلمہؓ نے ان سے فرمایا کہ آنحضرت ظہر جلدی پڑھا کرتے تھے اور تم عصر جلدی پڑھتے ہو۔[4]

---

(۱) إعلام الموقعين عن رب العالمين: ۱/ ۱۰

(۲) صحيح مسلم: ۱/ ۲۵۹

(۳) مسند أحمد ط الرسالة: ۴۴/ ۱۹۶، مع تحفة الأحوذي: ۲/ ۳۲۱

(۴) مسند أحمد ط الرسالة: ۴۴/ ۸۱ مع کلام محققه و مقال بلند شهری فی امهات المومنین، ص: ۸۴ ایضا.

وفات:

آپ سلامُ اللہ و رِضوانُہ علیہا، حضور ﷺ سے نکاح کے بعد ساٹھ سال باحیات رہیں، اور راجح قول کے موافق سن ۶۲ھ میں انتقال فرمایا۔[۱] آپؓ نے ۸۴ برس کی عمر پائی[۲]۔ اور ازواجِ مطہراتؓ میں سے سب سے آخر میں آپؓ ہی کا انتقال ہوا۔[۳]

حضرت ابوہریرہؓ نے نماز جنازہ پڑھائی۔ آپ سلامُ اللہ و رِضوانُہ علیہا کے بیٹوں نے (جو آپؓ کے سابقہ شوہر سے تھے)، آپؓ کو قبر میں اتارا اور جنت البقیع میں مدفون ہوئیں۔[۴]

فضائل واعزازات:

حضرت ام سلمہؓ کو یہ اعزاز حاصل تھا کہ رسول اللہ ﷺ نماز عصر کے بعد جب ہر ہر بیوی کے پاس تشریف لے جاتے تو سب سے پہلے حضرت ام سلمہؓ کے پاس تشریف لے جاتے کیونکہ وہ عمر میں باقی تمام ازواج سے بڑی تھیں اور آپ ﷺ اس دَور کو حضرت عائشہؓ پر ختم فرماتے۔[۵] یعنی آپ ﷺ سب سے آخر میں حضرت عائشہؓ کے پاس تشریف لاتے۔

اور آپؓ کو یہ بھی اعزاز حاصل ہے کہ خواتین میں سے آپؓ سب سے پہلی خاتون ہیں جس نے مکہ سے مدینہ کی طرف ہجرت کی۔[۶]

رسول اللہ ﷺ پر وحی جس طرح حضرت عائشہؓ کے گھر میں اترتی تھی اسی طرح حضرت ام سلمہؓ کے گھر میں بھی

---

(۱) تقریب التہذیب ص: ۷۵۴، وصفة الصفوة: ۱/ ۳۲۳ مع کلام المحقق.

(۲) الطبقات الکبری ط العلمیة: ۸/ ۷۶

(۳) الإصابة فی تمییز الصحابة: ۸/ ۴۰۷

(۴) الطبقات الکبری ط العلمیة: ۸/ ۷۶

(۵) سبل الهدی والرشاد فی سیرة خیر العباد: ۱۱/ ۱۹۰

(۶) الإصابة فی تمییز الصحابة: ۸/ ۳۴۲

اتری تھی۔ جو وحی آپ ؓ کے گھر میں اتری اس میں یہ آیت تھی: {وَقَرْنَ فِي بُيُوتِكُنَّ وَلَا تَبَرَّجْنَ تَبَرُّجَ الْجَاهِلِيَّةِ الْأُولَى وَأَقِمْنَ الصَّلَاةَ وَآتِينَ الزَّكَاةَ وَأَطِعْنَ اللَّهَ وَرَسُولَهُ إِنَّمَا يُرِيدُ اللَّهُ لِيُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ أَهْلَ الْبَيْتِ وَيُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيرًا} [الأحزاب: ۳۳][۱]

حضرت ام کلثوم ؓ سے روایت ہے کہ حضور ﷺ نے جب حضرت ام سلمہ ؓ سے نکاح کیا تو ان سے فرمایا: "إِنِّي قَدْ أَهْدَيْتُ إِلَى النَّجَاشِيِّ حُلَّةً وَأَوَاقِيَّ مِنْ مِسْكٍ، وَلَا أَرَى النَّجَاشِيَّ إِلَّا قَدْ مَاتَ، وَلَا أَرَى إِلَّا هَدِيَّتِي مَرْدُودَةً عَلَيَّ، فَإِنْ رُدَّتْ عَلَيَّ فَهِيَ لَكِ" (میں نے نجاشی بادشاہ کی طرف ایک جوڑا اور چند اوقیہ مشک بطور ہدیہ بھیجی ہے، لیکن میرا خیال ہے کہ نجاشی فوت ہو چکا ہے اور وہ ہدیہ مجھے واپس کر دیا جائے گا۔ اگر وہ مجھے واپس کر دیا گیا تو میں وہ ہدیہ تمہیں دے دوں گا)۔ اللہ کی شان! پھر ایسا ہی ہوا جیسا آپ ﷺ نے فرمایا تھا کہ وہ ہدیہ حضور ﷺ کے پاس واپس پہنچ گیا۔ آپ ﷺ نے اس میں سے ایک اوقیہ مشک اپنی تمام بیویوں کو دی اور باقی تمام مشک اور وہ جوڑا، حسب وعدہ آپ ﷺ نے حضرت ام سلمہ ؓ کو مرحمت فرمایا۔[۲]

---

(۱) موسوعة آل بيت النبي: ۱/ ۲۹۵

(۲) مسند أحمد ط الرسالة: ۴۵/ ۲۳۶

(۷) ام المومنین حضرت زینب بنت جحش سلامُ اللہ ورِضوانُہٗ علیہا

تمہیدی بات:

حضرت ام سلمہؓ سے نکاح کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت زینب بنت جحشؓ سے نکاح فرمایا تھا اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو آپ سلامُ اللہ ورِضوانُہٗ علیہا سے نکاح کرنے کا حکم ساتوں آسمانوں کے اوپر سے آیا تھا۔ آپ رضی اللہ عنہا، حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے منہ بولے بیٹے (زید بن حارثہؓ) کی سابقہ بیوی اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سگی پھوپھی زاد بہن تھیں۔ دیگر ازواج کی طرح آپؓ بھی بیوہ تھیں۔ آپؓ نہایت سخی اور اللہ کی بارگاہ میں خوب آہ وزاری کرنے والی خاتون تھیں حتی کہ آپؓ کی شان میں قرآن اترا جو قیامت تک تلاوت کیا جاتا رہے گا۔

نام ونسب:

آپ سلامُ اللہ ورِضوانُہٗ علیہا کی کنیت "امِ حَکَم"، نام "زینب"، والد کا نام "جحش" اور دادا کا نام "رِیاب" تھا۔ اور آپؓ کی والدہ کا نام "امیمہ" تھا جو عبدالمطلب کی بیٹی اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سگی پھوپھی تھیں، اس طرح آپ سلامُ اللہ ورِضوانُہٗ علیہا کے نانا کا نام "عبدالمطلب" ہوا۔[۱]

واضح رہے کہ حضرت زینبؓ کا نام پہلے "برّہ" تھا پھر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تبدیل کر کے "زینب" رکھا۔[۲] کیونکہ اسلام قبول کرنے والے جن اَفراد کے نام شرعی لحاظ سے نامناسب یا غلط ہوتے تھے ان کو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تبدیل فرمادیا کرتے تھے۔

ولادتِ باسعادت:

آپ سلامُ اللہ ورِضوانُہٗ علیہا کی ولادت بعثتِ نبوی سے ۳۳ سال پہلے مکہ مکرمہ میں ہوئی، سن عیسوی ۵۹۰ تھا۔ قریش کے قبیلہ بنو اسد میں پیدا ہوئیں اور بڑے ناز ونعم، عزت وجمال، اور حسب ونسب کے فخر کے ساتھ ان کی

---

(۱) البدایۃ والنہایۃ طھجر: ۸/۲۰۸ و ۱۰/۱۰۷

(۲) صحیح مسلم: ۳/۱۶۸۷

پرورش ہوئی۔[1]

نکاحِ اول:

حضرت زینبؓ کا پہلا نکاح حضور ﷺ نے حضرت زید بن حارثہؓ سے کر دیا تھا۔ حضرت زید بن حارثہؓ کی ابتدائی زندگی کا یہاں تعارف کرانا ضروری ہے جس کا اختصار یہ ہے:

حضرت زیدؓ کی والدہ اپنے بچے (انہی زید بن حارثہؓ) کو لے کر میکے جارہی تھیں کہ راستہ میں قبیلہ "بنو القین" کے ڈاکوؤں نے حضرت زیدؓ کو چھین لیا اور مکہ مکرمہ جا کر بازارِ "عکاظ" میں بیچ دیا۔ "حکیم بن حزام" نے اپنی پھوپھی حضرت خدیجہؓ کیلیے انہیں چار سو درہم میں خرید لیا۔ پھر جب حضرت خدیجہؓ کا نکاح حضور ﷺ سے ہوا تو انہوں نے آپ ﷺ کو حضرت زید بطور ہدیہ دے دیے۔ آپ ﷺ نے اس ہدیہ کو قبول فرما لیا اور انہیں آزاد کر کے اپنا بیٹا بنا لیا، جس سے وہ لوگوں میں "زید بن محمد" کے نام سے مشہور ہو گئے اور لوگ انہیں اسی نام سے پکارتے تھے۔ اور ادھر اُن کے والدان کی جدائی کے صدمہ میں محبت وجنون سے لبریز عجیب قسم کے اشعار پڑھتے تھے اور انتہائی بے تابی اور بے چینی کے عالم میں انہیں جابجا ڈھونڈتے پھرتے تھے۔ جب پتہ چلا کہ وہ مکہ مکرمہ میں ہیں تو حضرت زید کے والد اور چچا اُن کو چھڑانے کیلیے فدیہ کی رقم لے کر حضور ﷺ کے پاس آئے۔ آپ ﷺ نے فدیہ کی رقم لیے بغیر حضرت زیدؓ کو اختیار دے دیا کہ تم جانا چاہو تو چلے جاؤ، مگر ان کو حضور ﷺ کی مصاحبت (ہم نشینی) اتنی اچھی لگی تھی کہ انہوں نے جانے سے انکار کر دیا اور اپنے والد، خاندان اور وطن کے مقابلہ میں رسول اللہ ﷺ اور آپ کی صحبت کو ترجیح دی۔ حضور ﷺ ان سے بہت ہی محبت کرتے تھے۔ جب حضرت زیدؓ بالغ ہو گئے تو حضور ﷺ نے ان کا نکاح اپنی ایک آزاد کردہ ایک باندی سے کر دیا جس نے آپ ﷺ کی بچپن میں پرورش بھی کی تھی۔ اس باندی کا نام "برکہ" اور کنیت "ام ایمن" تھی۔ حضرت زیدؓ کو اللہ تعالیٰ نے ان سے ایک بیٹا عطا فرمایا جو "اسامہ بن زید" کے نام سے معروف ہیں۔[2]

حضرت ام ایمن، حضرت زیدؓ کے نکاح میں تھیں اور آپ ﷺ نے حضرت زیدؓ کا دوسرا نکاح حضرت زینب بنت جحشؓ سے کرنا چاہا جو آپ ﷺ کی پھوپھی زاد بہن تھیں تو آپ ﷺ نے ان کے پاس حضرت زیدؓ کے نکاح کا

---

(۱) سیرۃ امھات المومنین، ص: ۲۳۰

(۲) البدایۃ والنھایۃ طہجر: ۶/۲۲۸، مع تاریخ الخمیس فی أحوال أنفس النفیس: ۲/ ۷۳

پیغام بھیج دیا۔ مگر حضرت زینبؓ اور ان کے بھائی (عبداللہ بن جحش) نے اپنے ماحول کے اعتبار سے اس نکاح کو ناپسند سمجھا اور اس نکاح پر راضی نہ ہوئے کیونکہ حضرت زیدؓ معاشرے میں کل تک ایک غلام کی حیثیت سے جانے جاتے تھے اور حضرت زینبؓ قریش جیسے عالی خاندان سے تعلق رکھتی تھیں۔

حضور اکرم ﷺ کا بھیجا ہوا پیغام جو زید کیلیے تھا چونکہ حضرت زینبؓ اور ان کے بھائی نے اسے ناپسند جانا اس لیے اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی:

{وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَلَا مُؤْمِنَةٍ إِذَا قَضَى اللَّهُ وَرَسُولُهُ أَمْرًا أَنْ يَكُونَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ أَمْرِهِمْ} [الأحزاب:٣٦]

"اور جب اللہ اور اس کا رسول کسی بات کا حتمی فیصلہ کر دیں تو نہ کسی مومن مرد کیلیے یہ گنجائش ہے نہ کسی مومن عورت کیلیے کہ اُن کو اپنے معاملے میں کوئی اختیار باقی رہے۔"

اس آیت کے نازل ہونے پر حضرت زینب اور ان کے بھائی بخوشی نکاح پر راضی ہو گئے اور حضرت زینبؓ کا حضرت زیدؓ سے نکاح کر دیا گیا۔ حضور ﷺ نے ان کا مہر خود ادا فرمایا جو یہ تھا: ۱۰ دینار (مساوی پونے ۴ تولہ سونا)، ۶۰ درہم (مساوی پونے ۱۶ تولہ چاندی)، کچھ زنانہ کپڑے، "۵۰ مد" (مساوی تقریباً ۴۳ سیر) آٹا اور "۱۰ مد" (مساوی تقریباً ساڑھے ۸ سیر) کھجور۔ ("مد" اس زمانہ میں ایک پیمانے کا نام تھا جیسے ہمارے زمانہ میں "سیر" اور "کلو" ہوتا ہے)۔

رسول اللہ ﷺ نے اس نکاح سے ثابت کر دیا کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک دین داری کی بلندی تمام (خاندانی و دنیوی) بلندیوں سے بڑھی ہوئی ہے اور آپ ﷺ نے اس کو اتنا واضح کیا کہ اپنی حقیقی پھوپھی کی بیٹی کا نکاح ایک ایسے آزاد کردہ غلام سے کر کے دکھایا جو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی فرمانبرداری میں سراپا محو تھا اور اس نکاح کے متعلق اللہ تعالیٰ نے اپنے کلام میں آیات نازل فرمائیں جو ہمیشہ پڑھی جاتی رہیں گی اور نسب پر فخر کرنے والوں کو دینداری کی تاکید کرتی رہیں گی۔[1]

حضور ﷺ سے نکاح:

حضرت زینبؓ، حضرت زیدؓ کے نکاح میں تقریباً ایک سال یا اس سے کچھ زائد عرصہ رہیں، لیکن دونوں میں نباہ نہ ہو

---

(۱) مستفاد من: تفسير القرطبي: ۱۸٦/۱۴، وتفسير ابن كثير ط العلمية: ٦/۳۷۸، وشيء من امهات المؤمنين، ص: ۸۷

سکا۔ آخر آپ ﷺ کی اجازت سے حضرت زیدؓ نے حضرت زینبؓ کو طلاق دے دی اور جب عدت پوری ہوگئی تو آپ ﷺ نے حضرت زیدؓ سے فرمایا: مَا أَجِدُ أَحَدًا آمَنَ عِنْدِي أَوْ أَوْثَقَ فِي نَفْسِي مِنْكَ. ائْتِ إِلَى زَيْنَبَ فَاخْطُبْهَا عَلَيَّ. (مجھے (اس وقت، اس معاملہ میں) تم سے زیادہ کوئی قابل اعتماد آدمی نظر نہیں آ رہا۔ لہذا تم "زینب" کے پاس جاؤ اور اسے میرے نکاح کا پیغام دو)۔ حضرت زیدؓ ان کے پاس پہنچے تو وہ آٹا گوندھ رہی تھیں۔ حضرت زیدؓ کہتے ہیں: میں نے ان کی طرف دیکھے بغیر، پیٹھ پھیر کر، ان سے کہا: یَا زَيْنَبُ! أَبْشِرِي. أَرْسَلَ رَسُولُ اللهِ صلى الله عليه وسلم يَذْكُرُكِ. (زینب! خوشخبری مبارک ہو، رسول اللہ ﷺ نے آپ کے لیے نکاح کا پیغام بھیجا ہے)۔[1]

انہوں نے جواب میں کہا: میں اس وقت تک کچھ نہیں کہہ سکتی جب تک میں اپنے رب سے مشورہ نہ کرلوں۔ یہ کہہ کر وہ نمازِ استخارہ پڑھنے کھڑی ہوگئیں۔ اِدھر وہ استخارہ میں مشغول ہوئیں اور اُدھر اللہ نے حضور ﷺ پر یہ آیت اتار دی:

{فَلَمَّا قَضَى زَيْدٌ مِنْهَا وَطَرًا زَوَّجْنَاكَهَا لِكَيْ لَا يَكُونَ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ حَرَجٌ فِي أَزْوَاجِ أَدْعِيَائِهِمْ إِذَا قَضَوْا مِنْهُنَّ وَطَرًا} [الأحزاب:۳۷]

"پھر جب زید نے اپنی بیوی سے تعلق ختم کرلیا تو ہم نے اس سے تمہارا نکاح کرا دیا، تاکہ مسلمانوں کیلیے اپنے منہ بولے بیٹوں کی بیویوں (سے نکاح کرنے میں) اس وقت کوئی تنگی نہ رہے جب انہوں نے اپنی بیویوں سے تعلق ختم کرلیا ہو"۔

عام دستور وضابطہ سے ہٹ کر محض اس آیت کے نازل ہونے سے حضرت زینبؓ، حضور ﷺ کے نکاح میں آ گئیں۔ اس لیے آیت اترنے کے بعد آپ ﷺ حضرت زینبؓ کے پاس ان کی اجازت کے بغیر ہی اندر تشریف لے گئے۔[2]

حضرت زینبؓ فرماتی ہیں: میں اس وقت گھر میں اپنا سر کھولے بیٹھی تھی، میں آپ ﷺ کو اس طرح گھر کے اندر تشریف لاتا دیکھ کر سمجھ گئی کہ یہ آسمان سے (یعنی اللہ تعالیٰ کی طرف سے) حکم آیا ہوگا، میں نے پھر (اسی پہلو کے پیش نظر) عرض کیا: یارسول اللہ! بغیر نکاح اور گواہوں کے ہی!!۔ آپ ﷺ نے فرمایا: اللهُ زَوَّجَ وَجِبْرِيلُ الشَّاهِدُ (اللہ

---

(۱) البداية والنهاية طهجر: ۱۵۱/۶

(۲) فتح الباري لابن حجر: ۵۲۳/۸، مع الطبقات الكبرى ط العلمية: ۸۲/۸

نے نکاح کرایا ہے اور جبریل گواہ ہے)۔[1]

چونکہ حضرت زینبؓ کا نکاح براہِ راست اللہ نے کرایا تھا، اس لیے اس خوشی میں وہ اظہارِ نعمت کے طور پر فخر کے ساتھ دوسری بیویوں سے کہا کرتی تھیں کہ حضور ﷺ سے تمہارا نکاح تمہارے گھر والوں نے کرایا اور میرا نکاح اللہ تعالیٰ نے کرایا۔[2]

دعوتِ ولیمہ، اور اس کے دوران پردے کا حکم نازل ہونا:

راجح قول کے موافق رسول اللہ ﷺ کا حضرت زینبؓ سے نکاح ذیقعدہ ۵ھ میں ہوا۔[3] اس وقت حضرت زینبؓ کی عمر ۳۵ سال تھی۔[4] رخصتی کے بعد رسول اللہ ﷺ نے حضرت زینبؓ کا ولیمہ کیا۔ آپ ﷺ نے عمدہ قسم کا ایسا شاندار ولیمہ کیا کہ ایسا ولیمہ آپ نے کسی اہلیہ کا نہیں کیا۔ آپ ﷺ نے اس میں عربوں کی پسندیدہ اور ان کے ہاں عمدہ خوراک یعنی گوشت روٹی کا انتظام فرمایا تھا اور لوگوں نے جی بھر کر کھایا تھا۔[5] اس موقع پر حضرت انسؓ کی والدہ حضرت ام سُلَیمؓ نے بھی اپنی طرف سے بطور ہدیہ کھجور، پنیر اور گھی سے تیار کردہ اعلیٰ قسم کا "حریرہ" بھیج دیا تھا۔[6] اس ولیمہ میں بہت سارے لوگوں کو بلایا گیا تھا جن کی تعداد تقریباً ۳۰۰ تھی (اور دعوتِ ولیمہ میں، اُس وقت کے لحاظ سے، یہ ایک بڑی تعداد تھی)۔[7]

حضرت انس بیان کرتے ہیں کہ اس ولیمہ کے موقع پر رسول اللہ ﷺ نے مجھے مقرر فرمایا تھا کہ میں فلاں فلاں شخص کو تو خاص طور پر بلاؤں اور ان کے علاوہ جو شخص بھی ملے اس کو کھانے میں شرکت کیلیے بلا لاؤں۔ چناں چہ میں

(۱) حلية الأولياء وطبقات الأصفياء: ۲/۵۲

(۲) صحيح البخاري: ۹/۱۲۴، والبداية والنهاية طهجر: ۶/۱۵۲

(۳) البداية والنهاية طهجر: ۶/۱۵۰

(۴) سبل الهدى والرشاد في سيرة خير العباد: ۱۱/۲۰۱

(۵) صحيح مسلم: ۲/۱۰۴۹، رقم: ۱۴۲۸ وصحيح البخاري: ۶/۱۱۹، رقم: ۴۷۹۴

(۶) صحيح البخاري: ۷/۲۲، رقم: ۵۱۶۳

(۷) سنن الترمذي ت شاكر: ۵/۳۵۷

باہر سے بہت سارے لوگوں کو بلا لایا۔ یہاں تک کہ میں نے عرض کی: یارسول اللہ! اب باہر کوئی ایسا آدمی مجھے نہیں مل رہا جس کو میں بلا لاؤں۔ آپ ﷺ نے کھانے پر ہاتھ رکھ کر کوئی دعا پڑھی۔ اور آپ ﷺ نے آئے ہوئے لوگوں کے متعلق فرمایا: لِيَتَحَلَّقْ عَشَرَةٌ عَشَرَةٌ وَيُسَمُّوا، وَلْيَأْكُلْ كُلُّ إِنْسَانٍ مِمَّا يَلِيهِ "دس دس آدمی حلقہ بنا کر اکٹھے بیٹھ جائیں، بسم اللہ پڑھ کر کھائیں اور ہر آدمی اپنے سامنے سے کھائے۔" لوگ آتے رہے اور سیر ہو کر کھاتے رہے۔ جو لوگ کھانا کھا لیتے وہ باہر چلے جاتے، مگر آخر میں تین آدمی کھانا کھا کر وہیں بیٹھے رہے اور آپس میں باتیں کرتے رہے اور آپ ﷺ کی زوجہ مطہرہ حضرت زینب ؓ بھی گھر میں اُدھر ہی بغیر پردہ کیے ایک طرف بیٹھی ہوئی تھیں اور دیوار کی جانب اپنا منہ کر رکھا تھا۔ یہ لوگ کافی دیر تک وہاں بیٹھ گئے، جس سے آپ ﷺ کو تکلیف اور گرانی محسوس ہو رہی تھی (کہ آپ کی حیاتِ طیبہ کا ایک ایک لمحہ قیمتی تھا)۔ مگر آپ ﷺ چونکہ بہت شرم وحیا اور رعایت برتنے والی ہستی تھے، اس لیے آپ ﷺ نے ان کو وہاں سے اٹھانا مناسب نہیں سمجھا اور آپ خود باہر تشریف لے گئے۔ اس موقع پر اللہ تعالیٰ نے پردے کی یہ آیت نازل فرمادی:

{يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَدْخُلُوا بُيُوتَ النَّبِيِّ إِلَّا أَنْ يُؤْذَنَ لَكُمْ إِلَى طَعَامٍ غَيْرَ نَاظِرِينَ إِنَاهُ وَلَكِنْ إِذَا دُعِيتُمْ فَادْخُلُوا فَإِذَا طَعِمْتُمْ فَانْتَشِرُوا وَلَا مُسْتَأْنِسِينَ لِحَدِيثٍ إِنَّ ذَلِكُمْ كَانَ يُؤْذِي النَّبِيَّ فَيَسْتَحْيِي مِنْكُمْ وَاللَّهُ لَا يَسْتَحْيِي مِنَ الْحَقِّ وَإِذَا سَأَلْتُمُوهُنَّ مَتَاعًا فَاسْأَلُوهُنَّ مِنْ وَرَاءِ حِجَابٍ، الآية} [الأحزاب: ۵۳]

ترجمہ: اے ایمان والو! نبی کے گھروں میں (بلا اجازت) داخل نہ ہو، سوائے اس کے کہ تمہیں کھانے پر آنے کی اجازت دے دی جائے، وہ بھی اس طرح کہ تم اس کھانے کی تیاری کے انتظار میں نہ بیٹھے رہو، لیکن جب تمہیں دعوت دی جائے تو جاؤ، پھر جب کھانا کھا چکو تو اپنی اپنی راہ لو (یعنی واپس چلے جاؤ)، اور باتوں میں جی لگا کر نہ بیٹھو۔ حقیقت یہ ہے کہ اس بات سے نبی کو تکلیف پہنچتی ہے، اور وہ تم سے (کہتے ہوئے) شرماتے ہیں، اور اللہ حق بات میں کسی سے نہیں شرماتا۔ اور جب تمہیں نبی کی بیویوں سے کچھ مانگنا ہو تو پردے کے پیچھے سے مانگو [واضح رہے کہ پردے کے واجب ہونے کا یہ حکم صرف ازواجِ مطہرات کے ساتھ خاص نہیں بلکہ یہ حکم تمام خواتین کیلیے ہے جیسا کہ

اسی سورت کی آیت نمبر ۵۹ میں اس کی وضاحت موجود ہے[1]۔][2]

وفات:

حضرت زینبؓ نے ۵۳ برس کی عمر پائی۔ آپ سلامُ اللہ و رِضوانُہ علیہا کا انتقال، حضرت عمرؓ کے زمانۂ خلافت میں ۲۰ھ ہجری (بمطابق ۶۴۱ء عیسوی) میں ہوا۔ حضرت عمرؓ نے خود نماز جنازہ پڑھائی۔ آپ ﷺ کی وفات کے بعد ازواج میں سے سب سے پہلے آپ سلامُ اللہ و رِضوانُہ علیہا کا انتقال ہوا اور جنت البقیع میں دفن ہوئیں۔ بوقتِ تدفین امیر المومنین حضرت عمرؓ اگرچہ موجود تھے مگر حکم شرعی کی بناء پر آپ سلامُ اللہ و رِضوانُہ علیہا کی نعش کو قبر کے اندر آپؓ کے محرم مردوں نے اتارا اور قبر میں نعش اتارتے وقت کپڑا تان کر پردہ کرلیا گیا تھا۔[3]

فضائل وخصائل

ذیل میں آپؓ کے چند فضائل ومناقب درج کیے جاتے ہیں:[4]

(۱) ایک دفعہ رسول اللہ ﷺ اپنے گھر تشریف لائے، آپ ﷺ کے ساتھ حضرت عمر بن خطابؓ بھی تھے۔ گھر میں حضرت زینبؓ نماز ودعا میں مشغول تھیں۔ آپ ﷺ نے ان کو دیکھ کر فرمایا: زینبؓ "اَوّاہ خاتون" ہے۔[5] ایک روایت میں آپ ﷺ نے "اواہ" کی وضاحت کرتے ہوئے فرمایا ہے: جس شخص کے دل میں خشوع ہو اور وہ اللہ کے سامنے رورو کر دعائیں مانگتا ہو وہ "اواہ" ہے۔[6]

(۲) حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں:

میں نے دین کے معاملہ میں زینبؓ سے بہتر کبھی کوئی عورت نہیں دیکھی۔ ان سے زیادہ اللہ سے ڈرنے والی، سچ بات کہنے والی، صلہ رحمی کرنے والی اور صدقہ وخیرات کرنے والی میں نے کوئی عورت نہیں دیکھی۔ اور نہ ہی ان سے

---

(۱) مستفاد من "آسان ترجمہ قرآن"، ص: ۱۰۹

(۲) ینظر: البدایة والنهایة ط هجر ۶/ ۱۵۵ ومابعدها، وصحیح البخاري ۶/ ۱۱۹، ۷/ ۲۲، ومسند أحمد ط الرسالة: ۲۰/ ۱۰۵

(۳) ینظر: الطبقات الکبری ط العلمیة: ۸/ ۸۹ ومابعدها.

(۴) فائدہ: من أراد الاستزادة فلیراجع: نساء أهل البیت لأحمد خلیل جمعة، ونساء مبشرات بالجنة له أیضا وغیرهما.

(۵) مجمع الزوائد ومنبع الفوائد: ۹/ ۲۴۷، ونساء مبشرات بالجنة، ص: ۱۶۳

(۶) الزهد والرقائق لابن المبارك: ۱/ ۳۰۵

بڑھ کر کبھی کوئی ایسی عورت دیکھی ہے جو اپنی جان کو محنت میں کھپا کر مال کماتی ہو اور پھر اس کمائی کو صدقہ کر دیتی ہو اور اس کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کا قُرب حاصل کرتی ہو۔[1]

(۳) حضرت ام سلمہؓ نے حضرت زینبؓ کے بارے میں فرمایا:

وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی منظورِ نظر تھیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان کا کثرت سے ذکرِ خیر فرماتے تھے۔ وہ نیک و صالح خاتون تھیں، روزے بہت رکھتی تھیں، راتوں کو کثرت سے نماز میں مشغول رہتی تھیں۔ اپنے ہاتھ سے محنت کر کے کماتیں اور پھر وہ ساری کمائی غریب و مسکین لوگوں پر صدقہ کر دیتی تھیں۔[2]

(۴) آپ سَلامُ اللہ وَ رِضوانُہ علیہا، چمڑے رنگنا اور اس کے علاوہ مختلف قسم کی مزدوری کرتی تھیں اور اس سے حاصل ہونے والی آمدنی کو فقراء وغیرہ پر خرچ کرتی تھیں جیسا کہ ابھی گزرا۔ بلکہ آپؓ کے پاس جو مال بھی کہیں سے آ جاتا تو آپؓ اس مال کو اللہ تعالیٰ کی رضا کیلیے اپنے قریبی رشتہ داروں اور مستحق و محتاج لوگوں پر تقسیم کر دیتی تھیں چناں چہ حضرت عمرؓ نے جب اپنی خلافت میں حضرت زینبؓ کا وظیفہ بارہ ہزار درہم (جو" ۳۷۸۰۰ تولہ چاندی کے مساوی ہیں'') مقرر فرمایا تھا تو انہوں نے صرف ایک سال اسے قبول فرمایا اور وہ بھی اس کیفیت کے ساتھ قبول کیا کہ وہ وظیفہ وصول کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ سے یہ دعا کی: "اے اللہ! یہ مال آئندہ سال میرے پاس نہ آئے کیونکہ یہ فتنہ ہے"۔

اس کے بعد وہ پورے بارہ ہزار درہم (جو تقریباً ۳ کروڑ، ۲ لاکھ، ۴۰ ہزار روپے بنتے ہیں) صلہ رحمی کی غرض سے اپنے قریبی رشتہ داروں، نیز حاجتمندوں میں تقسیم فرما دیے۔

حضرت عمرؓ کو یہ بات معلوم ہوئی کہ انہوں نے وہ ساری رقم اللہ کے نام پر تقسیم کر دی ہے تو حضرت عمرؓ نے فرمایا: یہ ایسی نیک خاتون ہیں جن سے لوگوں کو خیر ہی ملتی ہیں۔ پھر ان کے پاس تشریف لے گئے اور باہر دروازے پر کھڑے ہو کر ان کی خدمت میں سلام بھجوایا اور عرض کی: مجھے آپ کی رقم تقسیم کر دینے کا واقعہ معلوم ہو گیا ہے۔ اس کے بعد مزید ایک ہزار درہم ان کے پاس بھیجے تا کہ وہ اس رقم کو اپنے خرچ کیلیے اپنے پاس رکھیں مگر انہوں نے وہ رقم

---

(۱) صحیح مسلم: ۴/ ۱۸۹۱

(۲) لإصابة في تمييز الصحابة: ۸/ ۱۵۴، ونساء مبشرات بالجنة، ص: ۱۶۴ و ۱۶۶

بھی اُسی طرح تقسیم فرمادی[1]۔ ان کی سخاوت اور مال سے بے رغبتی کے اور بھی کئی واقعات ہیں۔[2]

(۵) حضرت زینب رضی اللہ عنہا کی وفات پر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے اُن کے متعلق فرمایا:

"وہ دنیا سے اِس حال میں روانہ ہوئی ہیں کہ وہ قابلِ تعریف اور عبادت گزار خاتون تھیں اور وہ اپنے جانے کے ساتھ یتیموں اور بیواؤں کو بھی گھبراہٹ میں ڈال گئی ہیں (کیونکہ وہ سوچیں گے کہ اب ہمارے اخراجات کا انتظام کہاں سے ہوگا؟)"۔[3]

(۶) ایک موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن سے فرمایا تھا کہ (میری وفات کے بعد) تم میں سے جو سب سے زیادہ لمبے ہاتھوں والی ہے وہ سب سے پہلے (وفات پاکر) مجھے آملے گی۔ ازواج مطہرات یہ سمجھیں کہ اس سے ظاہری ہاتھ کی لمبائی مراد ہے اس لیے وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد بعض مرتبہ اپنے ہاتھ دیوار پر رکھ کر یا کسی لکڑی کے ذریعہ ناپتی بھی تھیں مگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد سب ازواج میں سے جب حضرت زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا کا پہلے انتقال ہوا تو معلوم ہوا کہ ہاتھ کی لمبائی سے مراد "صدقہ وخیرات اور سخاوت" تھی۔[4]

فائدہ:

اسی سخاوت اور مالی ہمدردی کی وجہ سے لوگوں میں حضرت زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا کا لقب "ماوی المساکین" یعنی "مسکین لوگوں کا ٹھکانہ" پڑ گیا تھا۔[5]

---

(۱) الإصابة في تمييز الصحابة: ۸/ ۱۵۴، ۱۵۵

(۲) انظر لها: الطبقات الكبرى ط العلمية: ۸/ ۸۷، وحلية الأولياء وطبقات الأصفياء: ۲/ ۵۴

(۳) الإصابة في تمييز الصحابة: ۸/ ۱۵۵، ونساء مبشرات بالجنة، ص: ۱۶۵

(۴) ينظر: المستدرك على الصحيحين للحاكم: ۴/ ۲۶، وصحيح البخاري: ۲/ ۱۱۰

(۵) الطبقات الكبرى ط العلمية: ۸/ ۹۰

(۸) ام المومنین حضرت جُوَیرِیہ سلامُ اللہ و رِضوانُہ علیہا

تمہیدی بات:

غزوہ بنی المُصطَلِق (جس میں مسلمانوں کو فتح حاصل ہوئی تھی) میں جو عورتیں باندیاں بن کر آئیں ان میں سردارِ قوم کی بیٹی "برہ بنت حارث" بھی تھی۔ رسول اللہ ﷺ نے ان کو آزاد کر دیا، پھر ان سے خود نکاح فرما کر انہیں اپنی "زوجیت" اور ان کے سردار گھرانہ کو "سسرالیت" کا شرف بخشا جس سے ان سب کی خوب حوصلہ افزائی ہوئی۔ نیز حضور ﷺ نے آپ کا نام "برہ" سے تبدیل کر کے "جویریہ" رکھ دیا۔ حضرت جویریہؓ، حضور ﷺ کے نکاح میں آئیں تو آپ سلامُ اللہ و رِضوانُہ علیہا کے زوجۂ نبی بن جانے کے احترام میں آپؓ کے قبیلہ "بنوالمصطلق" کے سو گھرانے، جو مختلف صحابہؓ کے پاس قیدی بن چکے تھے، آزاد کر دیے گئے۔ اس طرح آپ سلامُ اللہ و رِضوانُہ علیہا اپنی قوم و قبیلہ کیلیے بہت بڑی خیر و برکت کا ذریعہ بنیں۔

نام و نسب:

آپ سلامُ اللہ و رِضوانُہ علیہا کا نام "جُوَیریہ"، والد کا نام "حارث" اور دادا کا نام "ابی ضِرار" تھا۔ آپ سلامُ اللہ و رِضوانُہ علیہا کے والد "حارث بن ابی ضرار" اپنے قبیلہ "بنوالمصطلق" کے سردار تھے۔[۱]

نکاحِ اول:

حضرت جویریہؓ حضور ﷺ کے ساتھ نکاح سے پہلے، اپنے چچازاد بھائی کے نکاح میں تھیں جس کو "ابن ذی الشفر" کہا جاتا تھا مگر اس کا نام "مسافع بن صفوان" تھا اور بعض حضرات نے اس کا نام "صفوان بن مالک" بتایا ہے۔ یہ "غزوۂ مُرَیسیع" (جس کا مختصر تذکرہ ابھی آتا ہے) میں مسلمانوں کے ہاتھوں قتل ہو گیا تھا۔[۲]

---

(۱) الطبقات الکبری ط العلمیۃ: ۸/۹۲

(۲) الإصابۃ فی تمییز الصحابۃ: ۸/۷۲، ۷۳، مع الطبقات الکبری ط العلمیۃ: ۸/۹۲

حضور ﷺ سے نکاح:

حضرت جُوَیریہ سلامُ اللہ و رِضوانُہ علیہا، رسول اللہ ﷺ کے نکاح میں کس طرح آئیں؟ اس بات کو جاننے کیلیے "غزوۂ بنی المصطلق" (جس کو "غزوۂ مُریسیع" بھی کہا جاتا ہے) کا مختصراً حال جاننا ضروری ہے۔

حضور ﷺ کو یہ اطلاع ملی کہ قبیلہ "بنو المصطلق" کے لوگ اپنے سردار "حارث بن ابی ضِرار" (یہ حضرت جویریہؓ کے والد تھے جو بعد میں مسلمان ہو گئے) کی قیادت میں آپ ﷺ کے خلاف جنگ کی تیاری کر رہے ہیں، چناں چہ آپ ﷺ کو جب یہ خبر ملی تو آپ ﷺ شعبان ۵ھ ہجری کو سات سو صحابہ کرامؓ کو ساتھ لے کر ان کی طرف جہاد کیلیے روانہ ہوئے۔ مقامِ "قُدَید" کے قریب پانی کے ایک تالاب پر۔ جسے "مُریسیع" کہا جاتا تھا۔ آمنا سامنا ہوا۔

آپ ﷺ نے مہاجرین کا جھنڈا حضرت ابوبکر صدیقؓ، اور انصار کا جھنڈا حضرت سعد بن عُبادہؓ کے ہاتھ میں دیا اور جنگ شروع کرنے سے پہلے حضرت عمرؓ کو ان کے پاس بھیجا کہ جا کر ان میں یہ اعلان کرو:

"قُولُوا: لَا إِلٰهَ إِلَّا اللهُ. تَمْنَعُوا بِهَا أَنْفُسَكُمْ وَأَمْوَالَكُمْ" یعنی تم لوگ کلمہ پڑھ لو، اس سے تمہاری جانیں اور مال محفوظ ہو جائیں گے۔

مگر ان لوگوں نے کلمہ پڑھنے سے انکار کر دیا اور مسلمانوں پر تیر برسانا شروع کر دیے۔ اس پر آپ ﷺ نے مسلمانوں کو جوابی حملہ کی اجازت دے دی، لڑائی جاری رہی، بالآخر مسلمانوں کو زبردست کامیابی حاصل ہوئی۔ اس غزوہ میں ان کے کئی آدمی قتل ہوئے اور مسلمانوں میں صرف ایک صحابی (حضرت ہشامؓ) شہید ہوئے۔

اس فتح کے نتیجہ میں بہت سا مال حاصل ہوا اور باندیوں کی بھی کثیر تعداد ہاتھ آئی۔ ان میں حضرت جُویریہؓ بھی تھیں۔ آپ ﷺ نے جب یہ مال اور باندیاں تقسیم فرمائیں تو حضرت جُویریہؓ، حضرت ثابت بن قَیسؓ (یا ان کے چچازاد بھائی) کے حصہ میں آئیں۔ مگر وہ سردار کی بیٹی تھیں اس لیے انہوں نے باندی بن کر رہنے کے بجائے حضرت ثابت بن قَیسؓ کو یہ پیشکش کی کہ آپ مجھے مال کے بدلہ میں آزاد کر دیں۔ "نو اوقیہ (جو ۱۱۴ تولے چاندی کے مساوی ہے)" پر یہ معاہدہ طے ہو گیا۔ مگر حضرت جویریہؓ کے پاس چونکہ کچھ بھی نہیں تھا اس لیے وہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں مالی تعاون کیلیے حاضر ہوئیں اور عرض کی: یا رسول اللہ! میں اپنی قوم کے سردار "حارث بن ابی ضِرار" کی بیٹی "جُویریہ" ہوں۔ اس وقت مَیں جس مصیبت میں مبتلا ہوں (یعنی سردار کی بیٹی ہو کر ایک باندی بن چکی ہوں) وہ

آپ پر مخفی نہیں ہے۔ میں "ثابت بن قیس" کے حصہ میں آئی ہوں اور مَیں نے آزادی حاصل کرنے کیلیے اس سے ایک متعینہ مال پر معاہدہ طے کرلیا ہے، اس مال کی ادائیگی کیلیے میں آپ سے مدد طلب کرنے آئی ہوں۔ آپ ﷺ نے یہ سن کر فرمایا: فَهَلْ لَکِ فِي خَيْرٍ مِنْ ذَلِکَ؟ (کیا میں تمہیں اس سے بہتر چیز نہ دوں؟) اُنہوں نے کہا: وہ کیا؟ یا رسول اللہ! آپ ﷺ نے فرمایا: أَقْضِي عَنْکِ کِتَابَکِ، وَأَتَزَوَّجُکِ (میں تمہاری طرف سے وہ سارا مال ادا کردوں اور پھر تمہیں (آزاد کراکے) اپنی زوجیت میں لے لوں؟) عرض کی: یارسول اللہ! مجھے منظور ہے۔ چناں چہ آپ ﷺ نے ان کا مال ادا کیا اور آزادی کے بعد ان سے نکاح فرما کر اپنی زوجیت کا شرف بخشا۔[1] حضرت جُوَیریہؓ سے آپ ﷺ کا یہ نکاح سنہ ۵ھ میں ہوا۔[2]

نکاح کی بشارتِ منامی:

حضرت جُوَیریہؓ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کی آمد سے تین راتیں پہلے میں نے خواب دیکھا کہ یثرب (یعنی مدینہ طیبہ) سے چاند چلتا ہوا آیا اور میرے قریب آکر میری گود میں گر گیا۔ میں نے یہ خواب کسی کو بتانا مناسب نہ سمجھا یہاں تک آپ ﷺ جہاد کیلیے ہمارے پاس تشریف لے آئے۔ جب ہمیں قیدی بنا کر مدینہ طیبہ لایا گیا تو اسی وقت مجھے امید ہوگئی تھی کہ اب خواب پورا ہوگا۔ چناں چہ پھر یہی ہوا کہ آپ ﷺ نے مجھے آزاد فرما کر اپنی زوجیت کا شرف بخشا (اور میرا خواب پورا ہوگیا)۔[3]

برکاتِ نکاح:

جس وقت حضرت جُوَیریہؓ، کا رسول اللہ ﷺ سے نکاح ہوا اس وقت آپ سلامُ اللہ وَرِضوانُہ علیہا کے قبیلہ "بنو المصطلق" کے سو خاندان، غلام و باندی کی صورت میں مختلف صحابہ کرامؓ کے گھروں میں موجود تھے۔ آپ سلامُ اللہ وَرِضوانُہ علیہا کے ازواجِ مطہرات میں داخل ہونے پر صحابہ کرامؓ نے آپس میں کہا کہ قبیلہ "بنو المصطلق" کے یہ لوگ چونکہ اب حضور ﷺ کے سسرالی رشتہ داروں کے قبیلہ والے ہوگئے ہیں لہذا انہیں غلام بنانا مناسب نہیں، چناں چہ

---

(۱) ملخص من البداية والنهاية ط هجر: ۱۸۲/۶ إلى ۱۹۰/۶، وبعضه من الطبقات الكبرى ط العلمية: ۹۲/۸

(۲) السمط الثمين، ص: ۱۸۱

(۳) البداية والنهاية ط هجر: ۱۹۱/۶، ومثله في المستدرک للحاکم: ۲۸/۴

اس احترام میں ان سب لوگوں کو آزاد کر دیا۔ الغرض ان لوگوں کو یہ آزادی بلاشبہ حضرت جُوَیریہؓ کے اس مبارک نکاح کی وجہ سے حاصل ہوئی۔ اس لیے آپ سلامُ اللہ وَرِضوانُہ علیہا اپنے اہلِ قبیلہ کے واسطے بڑی خیر و برکت کا سبب بنیں۔ [1]

حضرت جُوَیریہؓ کا بیان ہے کہ واللہ! میں نے اس بارے میں حضور ﷺ سے کوئی بات نہیں کی تھی، صحابہ کرامؓ نے ازخود (اپنی عقیدت و محبت میں) ان کو آزاد کر دیا۔ میری چچازاد بہن نے آکر مجھے یہ اچانک خبر سنائی تو مجھے بہت خوشی ہوئی اور میں نے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا۔ [2]

آپؓ کے والد کا اسلام قبول کرنا:

آپ سلامُ اللہ وَرِضوانُہ علیہا کے والد "حارث بن ابی ضِرار" بھی حضور ﷺ کا ایک معجزہ دیکھ کر مسلمان ہو گئے تھے۔ وہ اس طرح کہ غزوہ بنی المصطلق میں جب حضرت جُوَیریہؓ قید ہو کر مدینہ آئیں (اور بعد میں آپ ﷺ نے ان سے نکاح بھی فرما لیا) تو آپ سلامُ اللہ وَرِضوانُہ علیہا کے والد اپنی بیٹی چھڑانے کیلیے بطورِ فدیہ بہت سے اونٹ ساتھ لیے مدینہ طیبہ روانہ ہوئے۔ مدینہ منورہ داخل ہونے سے پہلے جب وہ وادیٔ عقیق پہنچے تو ان میں سے دو اونٹ اُن کے دل کو بہت بھانے لگے، اس لیے انہوں نے وہ دو اونٹ وہیں کسی گھاٹی میں چھپا دیے کہ واپسی پر ان کو ساتھ لے جاؤں گا، اور باقی اونٹ ساتھ لیے رسول اللہ ﷺ کی خدمت اقدس میں حاضر ہوئے اور عرض کی: اے محمد! یہ اونٹ میری بیٹی کے فدیہ کے طور پر ہیں۔ آپ ﷺ نے دریافت فرمایا: "وہ دو اونٹ کہاں ہیں جنہیں تم وادیٔ عقیق میں چھپا آئے ہو؟"۔

یہ سنتے ہی انہوں نے کہا: أشهد أن لا إله إلا الله وأنك رسول الله (میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں اور آپ واقعی اللہ کے رسول ہیں)۔ اللہ کی قسم! اس بات کا اللہ کے سوا اور کسی کو پتا نہیں تھا (یہ یقیناً اللہ تعالیٰ نے ہی آپ کو خبر دی ہوگی)۔ چناں چہ وہ خود بھی مسلمان ہو گئے اور ان کے ساتھ ان کے دو بیٹے اور ان کی قوم کے بھی کئی لوگ دائرۂ اسلام میں داخل ہو گئے۔ [3]

---

(1) الطبقات الكبرى ط العلمية: ۹۲/۸، والبداية والنهاية ط هجر: ۱۹۰/۶

(2) البداية والنهاية ط هجر: ۱۹۱/۶

(3) الإصابة في تمييز الصحابة: ۶۷۳/۱، ۶۷۴

اشاعتِ علم:

آپ سَلامُ اللہِ وَرِضْوانُہٗ علیہا نے رسول اللہ ﷺ سے صبح وشام کی رفاقت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے دین کا علم حاصل کیا اور پھر اس کی آگے اشاعت کی۔ اکابر صحابہ کرامؓ سمیت بہت سارے حضرات نے آپ سَلامُ اللہِ وَرِضْوانُہٗ علیہا سے وہ دین حاصل کیا اور آگے پھیلایا، اس طرح دین نسل در نسل امت تک پہنچا۔ جن صحابہ نے آپ سَلامُ اللہِ وَرِضْوانُہٗ علیہا سے استفادہ کیا ان میں مفسرِ قرآن حضرت عبداللہ بن عباسؓ، حضرت عبداللہ بن عمرؓ اور حضرت جابرؓ کے اسماء گرامی سرِ فہرست ہیں۔[1]

ذوقِ عبادت:

آپ سَلامُ اللہِ وَرِضْوانُہٗ علیہا کو ذکر وعبادت سے خاص شغف تھا۔ ایک مرتبہ رسول اللہ ﷺ، نماز فجر پڑھ لینے کے بعد گھر سے باہر تشریف لے گئے اور یہ گھر میں اپنی "عبادت والی جگہ" پر بیٹھی ذکر میں مشغول تھیں۔ آپ ﷺ پھر چاشت کے بعد گھر تشریف لائے تو دیکھا کہ ابھی تک اسی طرح وہیں بیٹھی ذکر میں مشغول ہیں۔ آپ ﷺ نے دریافت فرمایا: جب سے میں گیا ہوں اسی وقت سے یہیں بیٹھی ہو؟ عرض کی: جی ہاں! آپ ﷺ نے فرمایا: میں نے تمہارے پاس سے جانے کے بعد چار کلمات تین مرتبہ کہے ہیں۔ تم نے آج جتنا ذکر کیا ہے اگر ان کلمات کو اس سارے ذکر کے ساتھ تولا جائے تو (ثواب کے لحاظ سے) ان کلمات کا وزن اس ذکر سے بڑھ جائے گا۔ وہ کلمات یہ ہیں (جن کو میں نے تین مرتبہ پڑھا ہے):

سُبْحَانَ اللهِ وَبِحَمْدِهِ، عَدَدَ خَلْقِهِ وَرِضَا نَفْسِهِ وَزِنَةَ عَرْشِهِ وَمِدَادَ كَلِمَاتِهِ۔[2]

وفات:

ام المومنین حضرت جُوَیریہؓ نے ۶۵ برس کی عمر پاکر سنہ ۵۰ھ میں انتقال فرمایا۔ نماز جنازہ مروان بن حَکَم نے پڑھائی، جو اس وقت مدینہ طیبہ کے حاکم تھے[3]۔ اور جنت البقیع میں آپؓ کو دفن کیا گیا۔[4]

---

(۱) موسوعۃ آل بیت النبی: ۱/۳۳۱

(۲) صحیح مسلم: ۴/۲۰۹۰

(۳) الطبقات الکبری ط العلمیۃ: ۸/۹۵، والإصابۃ في تمییز الصحابۃ: ۸/۷۴

(۴) سیرۃ امہات المومنین، ص: ۲۳۴

(۹) ام المومنین حضرت ام حبیبہ سلامُ اللہ و رِضوانُہٗ علیہا

تمہیدی بات:

حضرت جُویریہؓ کے نکاح کے ۲ سال بعد آپ ﷺ نے حضرت ام حبیبہؓ سے نکاح فرمایا۔ حضرت ام حبیبہؓ، "حضرت ابوسفیانؓ" کی بیٹی تھیں جو سالہا سال تک مسلمانوں سے جنگ کرتے رہے اور بالآخر فتح مکہ کے موقع پر اسلام لے آئے تھے۔ اور آپ سلامُ اللہ و رِضوانُہٗ علیہا، کاتبِ وحی "حضرت معاویہؓ" کی سگی بہن تھیں۔

نام ونسب اور پیدائش:

آپ سلامُ اللہ و رِضوانُہٗ علیہا اپنی کنیت "ام حبیبہ" سے معروف تھیں اور نام، راجح قول کے مطابق "رملہ" تھا۔ اسی طرح آپؓ کے والد اپنی کنیت "ابوسفیانؓ" سے مشہور تھے اور نام "صخر" تھا، اور آپ سلامُ اللہ و رِضوانُہٗ علیہا کے دادا کا نام "حرب" تھا۔ آپؓ کے والد "حضرت ابوسفیانؓ" قریش کے نامور سردار تھے۔ ایک مدت تک مسلمانوں کے خلاف جنگوں میں صرف شریک ہی نہیں بلکہ جنگوں کی قیادت تک سنبھالتے رہے۔ آخر کار جب اسلام کو غلبہ حاصل ہوا اور مکہ مکرمہ فتح ہوا تو آپ بھی مشرف باسلام ہوئے۔ رضی اللہ عنہ وارضاہ۔

آپ سلامُ اللہ و رِضوانُہٗ علیہا کی والدہ کا نام "صفیہ" اور نانا کا نام "ابو العاص بن امیہ" تھا۔ آپؓ کی والدہ "صفیہ"، امیر المومنین حضرت عثمان بن عفانؓ کی پھوپھی تھیں۔ حضرت ام حبیبہؓ، رسول اللہ ﷺ کی بعثت سے ۱۷ برس پہلے پیدا ہوئیں، یعنی جس سال حضور ﷺ نے نبوت کا اعلان کیا اس وقت آپ سلامُ اللہ و رِضوانُہٗ علیہا کی عمر ۱۷ سال تھی۔[1]

نکاحِ اول اور قبولِ اسلام:

حضرت ام حبیبہؓ کا پہلا نکاح "عُبید اللہ بن جحش" سے ہوا (یہ ام المومنین حضرت زینب بنت جحشؓ کے بھائی تھے)۔ شروع زمانہ میں ہی اسلام کی دعوت پر یہ مسلمان ہوگئے تھے اور ساتھ ہی ان کی بیوی "حضرت رملہؓ" نے بھی

---

(۱) الإصابة في تمييز الصحابة: ۱۴۰/۸، مع الاستيعاب في معرفة الأصحاب: ۱۸۴۳/۴

اسلام قبول کرلیا۔ جبکہ "ابوسفیان" ابھی تک مسلسل کفر کا علم بردار اور مسلمانوں کے خلاف برسر پیکار تھا۔ اس لیے حضرت رملہؓ اپنے والد کے ظلم وستم سے بچنے کیلیے اپنے شوہر سمیت، دیگر مسلمانوں کے ہمراہ، حبشہ کی طرف ہجرت کر گئیں (مسلمانوں کی حبشہ کو یہ دوسری ہجرت تھی)۔ ہجرت کے وقت یہ حاملہ تھیں اور وہاں حبشہ میں اسی حمل سے اللہ تعالیٰ نے ان کو ایک بیٹی عطا فرمائی جس کا نام "حبیبہ" رکھا (اسی بیٹی کی نسبت سے آپ سلام اللہ و رضوانہ علیہا کی کنیت "ام حبیبہ" ہے)۔ ابھی وہیں حبشہ میں یہ قیام پذیر تھے کہ آپؓ کے شوہر "عُبید اللہ بن جحش" نعوذ باللہ۔ مرتد ہو کر عیسائی ہو گئے۔ اس کے عیسائی ہونے سے پہلے حضرت ام حبیبہؓ نے اس کو خواب میں نہایت بُری شکل اور بگڑی ہوئی صورت میں دیکھا، اگلے دن معلوم ہوا کہ اس نے عیسائی مذہب قبول کرلیا ہے۔ حضرت ام حبیبہؓ نے اس کے سامنے یہ خواب ذکر کیا اور اسے اسلام کی طرف لوٹ آنے کی دعوت دی مگر اس نے نہ مانا اور شراب نوشی میں منہمک ہو گیا حتی کہ اسی حالتِ کفر پر وہیں حبشہ میں مر گیا۔ اس نے حضرت ام حبیبہؓ کو بھی عیسائیت کی دعوت دی تھی مگر یہ اسلام سے نہ ہٹیں۔[1]

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے نکاح:

حضرت ام حبیبہؓ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ اپنے نکاح کا واقعہ خود بیان کرتی ہیں:

فرماتی ہیں کہ جب میرے شوہر "عُبید اللہ بن جحش" کا انتقال ہو گیا (اور میں وہیں حبشہ میں ہی تھی) تو میں نے خواب دیکھا کہ کوئی مجھے کہہ رہا ہے: "اے ام المومنین!"، یہ خواب دیکھ کر میں چونک سی گئی، پھر میں نے اس کی یہ تعبیر سمجھی کہ ان شاء اللہ مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زوجیت کا شرف حاصل ہوگا۔

اس کے بعد ہوا یوں کہ جیسے ہی میری عدت پوری ہوئی تو میرے دروازے پر اسی مُلکِ حبشہ کے بادشاہ "نجاشی" کا ایک قاصد آ پہنچا۔ میں نے دیکھا تو وہ بادشاہ نجاشی کی "ابرہہ" نامی باندی تھی جو اُس کی خاص خادمہ تھی۔ اس نے آکر مجھے کہا: بادشاہ سلامت تم سے کہہ رہے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مجھے پیغام بھیجا ہے کہ میں تمہارا نکاح آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کر دوں۔ یہ سنتے ہی حضرت ام حبیبہؓ نے پیغام لانے والی باندی کو دعا دی: بَشَّرَکِ اللہُ بِخَیْرٍ "اللہ پاک تمہیں بھی خیر کی خوشخبری دے"۔ اور اس خوشی میں اپنے کنگن، پازیب اور انگوٹھی سب اس باندی کو بطورِ انعام

---

(۱) موسوعة آل بيت النبي: ۱/۲۶۰، والسمط الثمين.

دے دیے۔ نیز اس باندی نے کہا کہ بادشاہ صاحب یہ بھی کہہ رہے ہیں کہ اپنے نکاح کا کسی کو وکیل بنادو۔ چناں چہ آپ سلامُ اللہ وَ رِضوانُہٗ علیہا نے اپنے ایک رشتہ دار "خالد بن سعید" کو وکیل مقرر کر دیا جو اس وقت وہیں حبشہ میں مقیم تھے۔ جب شام ہوئی تو نجاشی نے حضرت جعفر بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سمیت حبشہ میں مقیم تمام مسلمانوں کو بلوایا اور ان کی موجودگی میں توحید و رسالت کے اقرار پر مشتمل خطبہ پڑھا اور خطبہ کے بعد کہا: مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ پیغام بھیجا ہے کہ میں "ام حبیبہ بنت ابی سفیان" کے ساتھ اُن کا نکاح کرادوں۔ تو از راہِ تعمیل، مَیں نے ام حبیبہ کے ساتھ اُن کا نکاح کر دیا۔ اور میں نے خود اس کا مہر "چار سو دینار" (جس کی مالیت۔ آج جبکہ سونے کا بھاؤ بہت گر چکا ہے۔ تقریبا ۷۵ لاکھ روپے بنتی ہے) مقرر کیا ہے۔

اِدھر سے حضرت ام حبیبہ رضی اللہ عنہا کے نامزد وکیل "خالد بن سعید" اٹھے اور خطبہ پڑھ کر کہا: حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی فرمائش کے پیش نظر، مَیں نے "ام حبیبہ بنت ابی سفیان" کا نکاح آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے کر دیا۔ اللہ تعالیٰ، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس نکاح میں برکت عطا فرمائے۔ آمین!۔

نکاح منعقد ہو گیا اور نجاشی نے وہ دینار "خالد بن سعید" کے حوالہ کر دیے۔ چونکہ نکاح منعقد ہو چکا تھا اس لیے لوگ اٹھ کر جانے لگے مگر نجاشی نے ان کو روکتے ہوئے کہا: اِجْلِسُوا فَإِنَّ سُنَّةَ الْأَنْبِيَاءِ إِذَا تَزَوَّجُوا أَنْ يُؤْكَلَ طَعَامٌ عَلَى التَّزْوِيجِ. (تشریف رکھیے، انبیاء کی سنت یہ ہے کہ ان کے نکاح کے بعد ولیمہ کا کھانا کھلایا جاتا ہے)۔ اس کے بعد اس نے کھانا منگایا اور لوگ کھانے سے فارغ ہو کر واپس چلے گئے۔

حضرت ام حبیبہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: جب وہ چار سو دینار کی بھاری رقم میرے پاس پہنچی تو میں نے اس میں سے ۵۰ دینار "ابرہہ" کو دیے اور اسے کہا: اُس وقت جب تم میرے پاس نکاح کی خوشخبری لائی تھی تو میرے پاس تمہیں دینے کیلیے کوئی خاص مال نہیں تھا۔ اب میرے پاس یہ مال آ گیا ہے لہٰذا یہ ۵۰ دینار تم رکھ لو اور ان کو اپنے کام میں لے آنا۔ اس نے یہ ۵۰ دینار بھی نہ لیے اور جو کچھ میں نے اس کو پہلے دیا تھا وہ بھی اس نے یہ کہہ کر واپس کر دیا کہ بادشاہ سلامت نے مجھے آپ سے کسی قسم کا کوئی مال لینے سے منع کیا ہے۔ اور اے ام حبیبہ! میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع کر چکی ہوں اور اللہ تعالیٰ کیلیے مسلمان ہو چکی ہوں۔ چناں چہ جب صبح ہوئی تو وہ بادشاہ اور بادشاہ کی بیویوں کی طرف سے بہت ساری خوشبوئیں وغیرہ لے کر میرے پاس آئی۔ اس کے بعد اس نے مجھے کہا: میری آپ سے ایک

گزارش ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں میرا اسلام عرض کرنا اور یہ بھی بتلانا کہ میں اُن کے دین کی اتباع کر چکی ہوں۔ اس کے بعد سے وہ میرے ساتھ بہت محبت واپنائیت کا اظہار کرتی رہی اور جب بھی میرے پاس آتی تو کہتی: جی! میری گزارش بھول نہ جانا۔ پھر جب میں حضور ﷺ کے پاس پہنچی تھی تو میں نے آپ کو اپنے نکاح کا پورا واقعہ بتایا اور "ابرہہ" کا بھی سارا حال کہہ سنایا۔ یہ سن کر آپ ﷺ مسکراتے رہے اور میں نے "ابرہہ" کا سلام عرض کیا تو آپ ﷺ نے جواب میں فرمایا: وَعَلَيْهَا السَّلَامُ وَرَحْمَةُ اللّٰهِ وَبَرَكَاتُهُ

بہر حال نکاح کے اگلے دن نجاشی نے حضرت ام حبیبہؓ کو مختلف قسم کے عطریات اور سامانِ جہیز دے کر، عزت و احترام کے ساتھ حضرت شُرَحْبِیل بن حَسَنہؓ کے ہمراہ مدینہ طیبہ روانہ کیا۔ آپ سلامُ اللہ وَرِضوانُہ علیہا مدینہ طیبہ رسول اللہ ﷺ کے پاس زوجہ مطہرہ کی حیثیت سے پہنچ گئیں اور "اے ام المومنین" والا خواب پورا ہو گیا۔

اُدھر سردارِ قریش ابوسفیان کو (جو اس وقت تک مسلمان نہیں ہوئے تھے) جب یہ خبر پہنچی کہ اُس جیسے سردار کی بیٹی، رسول اللہ ﷺ کے نکاح میں چلی گئی ہے تو اسے (اسلام دشمنی میں سرخرو ہونے کے متعلق) حد درجہ کی مایوسی ہوئی اور حضور ﷺ کے بارے میں کہنے لگا: ذٰلِکَ الْفَحْلُ لَا یُقْدَعُ أَنْفُهٗ "وہ جواں مرد ہیں، ان کی ناک نہیں کاٹی جا سکتی" یعنی حضرت محمد ﷺ اونچی شان واعلیٰ عزت کے مالک ہیں، ہم ان سے دشمنی کر کے ان کا نام نہیں مٹا سکتے۔ گویا بالفاظِ دیگر ابوسفیان اندر ہی اندر اپنی شکست مان گئے کہ اب اسلام کو نیچے نہیں کیا جا سکتا۔

یہ نکاح ۷ھ میں ہوا، اس وقت آپ سلامُ اللہ وَرِضوانُہ علیہا کی عمر مبارک تیس سال سے کچھ اوپر تھی۔[1]

وفات:

راجح قول کے موافق آپ سلامُ اللہ وَرِضوانُہ علیہا کا انتقال ۴۴ھ میں مدینہ طیبہ میں ہوا، اُس وقت آپ سلامُ اللہ

---

(1) ملخص من الطبقات الكبرى ط العلمية: ۸/۷۷، وما بعدها، وكذا في الإصابة في تمييز الصحابة: ۸/۱۴۰ وما بعدها۔

ملحوظہ: رسول اللہ ﷺ کے ساتھ حضرت ام حبیبہؓ کے نکاح کے بارے میں کچھ اور روایات بھی وارد ہوئی ہیں جن کا مضمون بھی قدرے مختلف ہے لیکن عموماً اصحابِ سیرو تاریخ نے اسی روایت کو لیا ہے جو اوپر درج کی گئی ہے۔

فائدہ: حضور ﷺ کے ہر ہر نکاح میں جہاں بے انتہاء حکمتیں تھیں اور علماء کرام نے انہیں مستقل کتابوں میں مفصل ذکر کیا ہے، وہاں اس نکاح کی بھی چند حکمتوں کو "موسوعة آل بیت النبی ﷺ ۱/ ۲۶۰، ۲۶۲ میں پر اثر انداز میں بیان کیا گیا ہے جنہیں پڑھ کر دل بھر آتا ہے اور حضور ﷺ کی محبت سے قلب سرشار اور آپ ﷺ کی بصیرت سے دل ودماغ مسحور ہو کر رہ جاتے ہیں۔

وَرِضْوانُہ علیہا کے بھائی حضرت امیر معاویہؓ کا زمانہ خلافت تھا۔ مروان نے نماز جنازہ پڑھائی اور قبر میں آپ سَلامُ اللّٰہ وَرِضْوانُہ علیہا کے بھانجے اترے[1]، اور آپؓ جنت البقیع میں مدفون ہوئیں۔[2]

فضائل ومناقب:

(۱) آپ سَلامُ اللّٰہ وَرِضْوانُہ علیہا احادیث پر عمل کرنے کا بہت اہتمام کرتی تھیں۔ جب آپؓ کو اپنے والد محترم "حضرت ابوسفیان رضی اللہ عنہ" کے انتقال کی خبر ملی تو آپؓ بطورِ سوگ تین دن تک عمومی حالت میں رہیں۔ جب تین دن گزر گئے تو آپؓ نے خوشبو منگا کر استعمال کی اور فرمایا: واللہ! مجھے خوشبو کی کوئی ضرورت نہیں تھی، میں نے یہ صرف اس لیے استعمال کی ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو منبر پر فرماتے ہوئے سنا تھا: "اللہ اور آخرت پر ایمان رکھنے والی کسی عورت کیلیے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ کسی میت پر تین دن سے زیادہ سوگ کرے، سوائے شوہر کے کہ اس پر چار ماہ دس دن تک سوگ کرسکتی ہے"۔[3] مطلب یہ ہے کہ آپ سَلامُ اللّٰہ وَرِضْوانُہ علیہا نے صرف حدیث شریف پر عمل کرنے کی غرض سے خوشبو کا استعمال کیا تھا۔

(۲) آپ سَلامُ اللّٰہ وَرِضْوانُہ علیہا، رسول اللہ ﷺ سے جب کوئی فرمان سُن لیتیں تو اس پر اہتمام کے ساتھ دائمی طور پر عمل کرتیں۔ ایک دفعہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ نے کو یہ فرماتے ہوئے سنا: جو شخص ہر روز بارہ رکعات پڑھ لے جو کہ نفل کے زمرہ میں آتی ہیں، فرض نہیں ہیں اللہ تعالیٰ اس کیلیے جنت میں گھر بنا دیتا ہے۔

حضرت ام حبیبہؓ فرماتی ہیں کہ یہ فرمان سن لینے کے بعد پھر میں نے یومیہ یہ بارہ رکعات کبھی نہیں چھوڑیں۔[4]

ف: ان بارہ رکعات سے مراد روزانہ پانچوں نمازوں میں ادا کی جانے والی سنت موکدہ کی بارہ رکعتیں ہیں جن کی تفصیل ایک دوسری حدیث میں اس طرح آئی ہے: چار رکعات ظہر سے پہلے اور دو رکعات ظہر کے بعد، دو رکعات

---

(۱) أنساب الأشراف للبلاذري: ۱/۴۴۰، والاستيعاب في معرفة الأصحاب: ۴/۱۹۲۹، والإصابة في تمييز الصحابة: ۸/۱۴۲

(۲) سيرة امهات المومنين، ص: ۲۳۷

(۳) صحيح البخاري: ۷/۵۹

(۴) صحيح مسلم: ۱/۵۰۳

مغرب کے بعد، دو رکعات عشاء کے بعد، اور دو رکعات فجر سے پہلے۔ [1]

(۳) حضرت ام حبیبہؓ کو حضور اقدس ﷺ سے بے پناہ عقیدت و محبت تھی اور آپؓ کی یہ محبت اپنے والد سے محبت پر بھی غالب تھی۔

آپ سلامُ اللہ ورِضوانُہ علیہا کے والد "ابوسفیان" جو ابھی تک مسلمان نہیں ہوئے تھے، معاہدۂ حدیبیہ کے سلسلہ میں کوئی بات کرنے کیلیے حضور ﷺ کے پاس مدینہ منورہ آئے۔ آپ ﷺ سے فارغ ہو کر اپنی بیٹی (حضرت ام حبیبہؓ) سے ملنے ان کے گھر چلے گئے۔ وہاں جا کر جو بستر بچھا ہوا تھا اس پر بیٹھنے لگے تو حضرت ام حبیبہؓ نے فوراً وہ بستر لپیٹ دیا اور ان کو اس پر نہ بیٹھنے دیا۔ یہ عجیب منظر دیکھ کر وہ بولے: بیٹی! تم نے مجھے اس بستر کے لائق نہیں سمجھا یا بستر کو میرے لائق نہیں سمجھا؟۔ حضرت ام حبیبہؓ نے فرمایا: هُوَ فِرَاشُ رَسُولِ اللهِ وَأَنْتَ امْرُؤٌ نَجِسٌ مُشْرِكٌ [یہ اللہ کے رسول ﷺ کا بستر ہے اور تم ناپاک مشرک آدمی ہو (تم اس مقدس بستر پر کیسے بیٹھ سکتے ہو؟)]۔ اس پر ابوسفیان کہنے لگا: میرے بعد تو تیرے اندر شر اور فساد آ گیا ہے۔ [2]

(۴) آپ سلامُ اللہ ورِضوانُہ علیہا کو حقوق العباد کی ادائیگی کی بھی بہت فکر تھی۔ آپؓ نے اپنی موت سے پہلے حضرت عائشہؓ کو اپنے پاس بلایا اور ان سے کہا: میرے اور آپ کے درمیان سوکنوں والا تعلق تھا۔ اس بارے میں جو کوتاہی ہوئی ہو اللہ تعالیٰ اس پر ہم دونوں سے درگزر فرمائے (آپ بھی مجھے معاف کر دیں)۔ حضرت عائشہؓ نے کہا میری اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ آپ سے معافی و درگزر والا معاملہ فرمائے (میری طرف سے تو سب معاف ہے)۔ یہ سن کر حضرت ام حبیبہؓ نے حضرت عائشہؓ سے کہا: تم نے مجھے خوش کیا، اللہ تعالیٰ تمہیں خوش رکھے۔

اس کے بعد حضرت ام حبیبہؓ نے حضرت ام سلمہؓ کو بلایا اور ان سے بھی وہی گفتگو کی جو حضرت عائشہ سے کی تھی۔ [3]

---

(۱) سنن الترمذي ت شاكر: ۲/ ۲۷۳

(۲) الإصابة في تمييز الصحابة: ۸/ ۱۴۲، والطبقات الكبرى ط العلمية: ۸/ ۷۹

(۳) الطبقات الكبرى ط العلمية: ۸/ ۷۹، والإصابة في تمييز الصحابة: ۸/ ۱۴۲

(۱۰) ام المومنین حضرت صَفِیّہ سَلامُ اللہ و رِضوانُہ علیہا

تمہیدی بات:

حضرت ام حبیبہؓ سے نکاح کے بعد آپ ﷺ نے حضرت صَفِیّہؓ سے نکاح فرمایا۔

غزوہ خیبر میں دیگر قیدیوں کے ساتھ آپ سَلامُ اللہ وَ رِضوانُہ علیہا بھی قید ہو کر آئی تھیں اور مالِ غنیمت کی تقسیم میں آپ ﷺ نے ،صحابہؓ کے مشورہ پر، اُن کو اپنے حصہ کیلیے منتخب فرمایا تھا، پھر آزاد فرما کر ان سے نکاح فرمالیا تھا۔

آپ سَلامُ اللہ وَ رِضوانُہ علیہا کو، باپ اور ماں دونوں طرف سے، سردار خاندان میں سے ہونے کا شرف حاصل تھا۔ آپؓ کے والد قبیلہ "بنونَضِیر" کے سردار تھے اور والدہ قبیلہ "بنوقُریظہ" کے سردار کی بہن تھیں، اور دینی شرافت کے لحاظ سے آپؓ حضرت ہارون علیہ السلام کی نسل میں سے تھیں۔

نام ونسب اور ولادت:

آپ سَلامُ اللہ وَ رِضوانُہ علیہا کا اصلی نام "صفیہ" ہی تھا[1]۔ اور آپؓ کے والد کا نام "حُیَیّ" اور دادا کا نام "اَخطب" تھا۔ والدہ کا نام "بَرّہ" اور نانا کا نام "سَمَوْئل" تھا[2]۔ آپؓ والدین کے اعتبار سے سردار گھرانے اور نسل کے لحاظ سے عظیم خاندان سے تعلق رکھتی تھیں جیسا کہ اوپر گزرا۔[3] آپ سَلامُ اللہ وَ رِضوانُہ علیہا واقعۂ ہجرت سے دس سال پہلے مدینہ طیبہ میں پیدا ہوئیں۔[4]

سابقہ نکاح:

آپ سَلامُ اللہ وَ رِضوانُہ علیہا کا پہلا نکاح ۱۴ سال کی عمر میں "سَلّام بن مِشْکَم" سے ہوا، یہ ایک شاعر آدمی تھا۔ پھر دوسرا نکاح "کِنانہ بن اَبِی الحُقَیق" سے ہوا۔ یہ بھی شاعر تھا اور غزوۂ خیبر میں قتل ہو گیا تھا۔ اس کے بعد سنہ ۷ ھ میں

---

(۱) فی شرح الزرقانی علی المواہب اللدنیۃ بالمنح المحمدیۃ: ۳/ ۲۷۱، کان فی السبی "صفیۃ"، الأکثر أنہ اسمہا الأصلی، وقیل: زینب وسمیت بعد السبی والاصطفاء (أی اصطفاءہا الرسول صلی اللہ علیہ وسلم لنفسہ) صفیۃ.

(۲) الطبقات الکبری ط العلمیۃ: ۸/ ۹۵

(۳) ینظر: معارف الحدیث: ۸/ ۳۴۷، وموسوعۃ آل بیت النبی: ۱/ ۳۴۲

(۴) اہل بیت کی پاکیزہ زندگی، ص: ۱۱۹

رسول اللہ ﷺ کے ساتھ آپ سَلامُ اللّٰہِ وَرِضْوانُہٗ علیہا کا نکاح ہوا (جس کی تفصیل نیچے آرہی ہے) [1]۔ البتہ حضور ﷺ کے ساتھ نکاح ہونے سے پہلے حضرت صَفِیّہؓ نے ایک خواب دیکھا تھا جس میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپؓ کو حضور ﷺ کی زوجیت میں آنے کا اشارہ دیا گیا تھا۔ وہ اس طرح کہ حضرت صَفِیّہؓ نے اپنے پہلے شوہر کے پاس ایک رات یہ خواب دیکھا کہ یثرب (مدینہ طیبہ) سے ایک چاند چلتا ہوا آیا ہے اور ان کی گود میں آگرا ہے۔ صبح اٹھ کر اپنے شوہر کو یہ خواب سنایا تو اس نے اِن کے منہ پر اس زور سے طمانچہ مارا کہ چہرے پر اس کا نشان پڑگیا اور کہنے لگا: تَتَمَنَّیْنَ أَنْ یَتَزَوَّجَکِ مَلِکُ یَثْرِبَ؟ ''تُو شاہِ یثرب (حضرت محمد ﷺ) کی بیوی بننا چاہتی ہے''؟ [2]

حضور ﷺ سے نکاح:

۴ھ میں جب رسول اللہ ﷺ نے قبیلہ "بنو نَضیر" کے یہودیوں کو مدینہ سے باہر نکال دیا تو ان میں سے بعض لوگ "شام" اور اکثر لوگ "خیبر" کے علاقہ میں جاکر آباد ہوگئے، جن میں "حیی بن اخطب"، اور "ابو الحُقَیق" کی اولاد بھی تھی۔ یہ لوگ اپنی قوم کے مالدار اور شرفاء و سردار شمار ہوتے تھے۔ وہاں جاکر بھی ان یہودیوں نے اسلام دشمنی اور اسلام کے خلاف سازشوں کا جال بچھانا شروع کردیا۔ محرم ۷ھ میں حضور ﷺ غزوۂ خیبر کیلیے روانہ ہوئے۔ وہاں جاکر مسلمانوں نے ان یہودیوں کو کھلی شکست دی اور تمام قلعے (جن میں یہودی رہتے تھے) فتح کرلیے۔ اس جنگ میں بہت سارے کافر (یہودی) مارے گئے جن میں حضرت صَفِیّہؓ کا شوہر "کنانہ" اور مشہور یہودی پہلوان "مرحب" بھی مارا گیا۔ اور بہت سارے قیدی ہاتھ آئے، ان قیدیوں میں معروف سردار "حیی بن اخطب" کی بیٹی "صَفِیّہ" بھی تھی۔ وہیں خیبر میں ہی جب باندیوں کی تقسیم عمل میں آئی تو آپ ﷺ نے "صَفِیّہ"، حضرت دحیہ کلبیؓ کو دے دی۔ اس پر بعض صحابہ نے حضور ﷺ سے عرض کی کہ "صَفِیّہ" سردار کی بیٹی ہے، لہٰذا اس کی دلجوئی کیلیے مناسب یہ ہے کہ اُسے آپ خود لے لیں۔ آپ ﷺ کو یہ رائے پسند آئی اور آپ نے حضرت دحیہؓ کو بلاکر فرمایا کہ تم اس کے بدلہ کوئی اور باندی لے لو۔ وہ راضی ہوگئے، چناں چہ ان کو اس کی جگہ ایک اور باندی دے دی گئی اور "صَفِیّہ" کو آپ ﷺ نے اپنے لیے منتخب فرمالیا۔ بعض روایات میں ہے کہ آپ ﷺ نے شروع سے ہی "صَفِیّہ" کو اپنے لیے منتخب فرمالیا تھا۔

(۱) السمط الثمین ص: ۱۸۵، و اھل بیت کی پاکیزہ زندگی ص: ۱۱۹

(۲) البدایۃ و النھایۃ طھجر: ۲۲۵/۱۱

بہر حال اس کو ساتھ لیے آپ ﷺ تمام مسلمانوں سمیت واپس مدینہ طیبہ روانہ ہوئے۔

دورانِ سفر جب قافلہ مقامِ "صہباء" پر پہنچا تو آپ ﷺ نے آزاد کرنے کے بعد ان سے نکاح فرمالیا (جبکہ وہ نکاح سے پہلے ہی اسلام لا چکی تھیں)۔ اور وہیں سفر میں ہی رخصتی اور ولیمہ ہوا۔ رخصتی کیلیے کوئی خاص انتظام نہیں کیا گیا ،حتی کہ خیمہ بھی دستیاب نہیں تھا، وہیں چادروں سے عارضی خیمہ بنالیا گیا۔ حضرت ام سُلَیم رضی اللہ عنہا اور حضرت ام سِنان رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ ہم نے حضرت صَفیّہ رضی اللہ عنہا کی تیاری کرائی، اُن کے بالوں میں کنگھی کی اور خوشبو لگائی۔ جب آپ ﷺ ان کے پاس تشریف لائے تو وہ استقبال کیلیے اٹھ کھڑی ہوئیں، دراصل یہ بات ہم نے انہیں کہی تھی، اور ہم پھر وہاں سے اٹھ کر آ گئیں۔ جب صبح ہوئی تو ہم اُن کے پاس گئیں۔ انہیں غسل کی حاجت تھی، لہٰذا ہم انہیں اپنے ساتھ لے کر لشکر سے دور پردہ کی جگہ میں چلی گئیں۔ انہوں نے قضائے حاجت کی اور غسل کیا (اور پھر وہیں خیمہ میں واپس آ گئیں)۔ انہوں نے ہمیں بتایا: **أَنَّهُ سُرَّ بِهَا وَلَمْ يَنَمْ تِلْكَ اللَّيْلَةَ وَلَمْ يَزَلْ يَتَحَدَّثُ مَعَهَا** (رات جب آپ ﷺ میرے پاس اندر تشریف لائے تو آپ ﷺ نے آ کر خوشی کا اظہار کیا، اس کے علاوہ آپ ﷺ نے پوری رات آرام نہیں فرمایا اور صبح تک مجھ سے باتیں کرتے رہے)۔

حضرت صَفیّہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ جس وقت میری رخصتی ہوئی اس وقت میری عمر پورے سترہ سال بھی نہیں ہوئی تھی۔ [1]

ولیمہ:

شب زِفاف کے بعد جب صبح ہوئی تو رخصتی کی طرح ولیمہ بھی انتہائی سادگی کے ساتھ کیا گیا۔ آپ ﷺ نے اعلان کرا دیا: **مَنْ كَانَ عِنْدَهُ شَيْءٌ فَلْيَجِئْ بِهِ** (جس شخص کے پاس جو چیز کھانے کی ہو وہ لے آئے)۔ پھر چمڑے کا دسترخوان بچھا دیا اور لوگ چیزیں لانے لگے: کوئی شخص کھجور لایا، کوئی گھی اور کوئی ستو لے آیا۔ پھر سب نے مل کر ان تمام چیزوں کو اکٹھے ایک جگہ ملا دیا۔ اس سے ایک "مالیدہ" سا تیار ہو گیا جسے لوگوں نے ولیمہ کے کھانے کے طور پر کھایا۔ [2]

---

(۱) ينظر: الطبقات الكبرى ط العلمية: ۸/۹۵ وما بعدها، والبداية والنهاية ط هجر: ۱۱/۲۲۵، صفية بنت حيي: ۵/۵۳۳، غزوة بني النضير، و ۶/۲۴۹ غزوة خيبر.

(۲) صحيح البخاري: ۱/۸۳

سفر سے واپسی اور آپ ﷺ کا بیوی سے حسن سلوک:

اس مختصر سے ولیمہ کے بعد جب مدینہ منورہ واپسی شروع ہوئی تو پورے سفر میں حضور ﷺ کا معمول یہ رہا کہ جب اونٹنی پر سوار ہونے کا وقت آتا تو آپ ﷺ اونٹنی کو بٹھا کر اس کے پاس اپنا گھٹنا مبارک آگے کر کے بیٹھ جاتے، حضرت صَفِیہؓ آپ ﷺ کے گھٹنے پر اپنا پاؤں رکھ کر اونٹنی پر سوار ہو جاتی تھیں، پھر سفر شروع کر دیا جاتا۔[1]

حضرت صَفِیہؓ یہ بھی بیان کرتی ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے زیادہ اچھے اخلاق والا شخص نہیں دیکھا۔ خیبر سے مدینہ کی طرف واپسی کے سفر میں آپ ﷺ نے مجھے اونٹنی پر اپنے پیچھے بٹھا رکھا تھا۔ دوران سفر جب مجھے اونگھ آتی اور میرا سر کجاوہ کے پچھلے حصہ کو لگنے لگتا تو آپ اپنے دستِ مبارک سے میرا سر تھامتے اور فرماتے: "اے حیی کی بیٹی! دھیان سے سوار رہ"۔ پھر جب ہم "صہباء" پہنچے تو آپ نے مجھے فرمایا: أَمَا إِنِّي أَعْتَذِرُ إِلَيْکِ يَا صَفِيَّةُ مِمَّا صَنَعْتُ بِقَوْمِکِ، إِنَّهُمْ قَالُوا لِي كَذَا وَكَذَا [صفیہ! میں نے تمہاری قوم کے ساتھ جو کیا (یعنی ان کو قتل کر کے ان کا علاقہ فتح کیا)، اس پر میں تم سے معذرت خواہ ہوں۔ دراصل بات یہ ہے کہ ان لوگوں نے مجھ (نبی) کو اس اس طرح کہا تھا (اور ان سے جہاد کرنا ایک شرعی حکم تھا، اس لیے میں نے یہ سب کچھ کیا۔ لہٰذا تم اس سے افسردہ اور دل برداشتہ نہ ہو)]۔[2]

اس سفر خیبر کے علاوہ ویسے آپ ﷺ کے سفرِ حج کے دوران جب آپ اپنی ازواجؓ کے ساتھ حج پر تشریف لے جا رہے تھے تو راستے میں ایک جگہ حضرت صَفِیہؓ کا اونٹ بیٹھ گیا اور آپؓ سب سے پیچھے رہ گئیں جس سے آپ سلامُ اللہ وَرِضوانُہ علیہا کو بہت رنج ہوا اور بے اختیار آپ سلامُ اللہ وَرِضوانُہ علیہا نے رونا شروع کر دیا۔ حضور ﷺ کو اس کی اطلاع دی گئی تو آپ تشریف لائے اور اپنی چادر کے کپڑے اور اپنے ہاتھ سے آپ سلامُ اللہ وَرِضوانُہ علیہا کے آنسو پونچھنا شروع کیے۔ آپ سلامُ اللہ وَرِضوانُہ علیہا برابر روتی جاتی تھیں اور حضور ﷺ ان کے آنسو پونچھتے جاتے تھے۔[3]

---

(۱) صحيح البخاري: ۵/۱۳۵

(۲) مجمع الزوائد ومنبع الفوائد: ۹/۲۵۲

(۳) شرح الزرقاني على المواهب اللدنية بالمنح المحمدية: ۴/۴۳۵، ومسند أحمد ط الرسالة: ۴۴/۴۳۵

اشاعتِ علم:

حضرت صَفِیہؓ نے رسول اللہ ﷺ سے علمِ دین کی تحصیل میں اپنی کوششیں صرف کیں اور آپ ﷺ کی تعلیمات وارشادات کو محفوظ کیا اور آگے امت تک پہنچایا چناں چہ آپ سلامُ اللہ وَرِضوانُہ علیہا سے مردوں اور عورتوں کی ایک بڑی تعداد نے علم حاصل کیا، اور امت کے رہنما حضرات نے بھی آپ سے استفادہ کیا جن میں امام زین العابدین علی بن حسینؒ اور حضرت اسحاق بن عبداللہؒ کے نام سرفہرست ہیں۔[1]

اشاعتِ علم کا یہ عالَم تھا کہ بسا اوقات آپ سلامُ اللہ وَرِضوانُہ علیہا کے پاس مسائل شرعیہ معلوم کرنے والوں کا ہجوم ہوتا تھا۔ حضرت صُہَیرہ بنت جُیفَر بیان کرتی ہیں کہ ہم لوگ حج کر کے واپس مدینہ منورہ پہنچے تو حضرت صفیہؓ کے پاس مسائل سیکھنے حاضر خدمت ہوئے۔ وہاں جا کر دیکھا کہ آپ سلامُ اللہ وَرِضوانُہ علیہا کے پاس پہلے سے ہی کوفہ کی بہت سی عورتیں جمع ہیں۔ ہمارے پہنچنے پر وہ عورتیں ہماری طرف متوجہ ہو کر کہنے لگیں: اگر چاہو تو تم مسائل پوچھو اور ہم سنیں گی، اور اگر چاہو تو ہم مسائل پوچھیں گی اور تم سنو گی۔ ہم نے کہا: تم پوچھو۔ تو انہوں نے میاں بیوی سے متعلقہ مسائل دریافت کیے اور کچھ مسائل حیض وغیرہ کے بارے میں پوچھے۔ اور ہم ان مسائل کو سنتی رہیں۔[2]

وفات:

راجح قول کے مطابق آپ سلامُ اللہ وَرِضوانُہ علیہا کی وفات، حضرت معاویہؓ کے دَور میں، رمضان سنہ ۵۰ھ میں ہوئی اور آپؓ جنت البقیع میں دفن ہوئیں۔[3]

فضائل وخصائل:

(۱) نبی کریم ﷺ نے حضرت صفیہؓ سے فرمایا: (صفیہ!) بلاشبہ تم نبی (حضرت ہارونؑ یا حضرت اسحاقؑ) کی صاحبزادی ہو (یعنی ان کی اولاد میں سے ہو)، تمہارے چچا (حضرت موسیٰؑ یا حضرت اسماعیلؑ) بھی نبی تھے، اور اب تم ایک نبی (یعنی مجھ محمد رسول اللہ) کی بیوی ہو۔[4]

---

(۱) الإصابة في تمييز الصحابة: ۲۱۲/۸ ، وسير أعلام النبلاء ط الرسالة: ۲۳۲/۲

(۲) مسند أحمد ط الرسالة: ۴۴/۴۴

(۳) البداية والنهاية ط هجر: ۲۲۵/۱۱ مع السمط الثمين: ۱۹۰

(۴) مشكاة المصابيح: ۱۷۴۵/۳ مع مرقاة المفاتيح: ۳۹۹۴/۹

(۲) آپ سلامُ اللہ وَ رِضوانُہ علیہا کی شان بیان کرتے ہوئے لکھا ہے:

آپؓ عبادت، تقویٰ، دنیا سے بے رغبتی، نیکی اور صدقہ کرنے میں عورتوں کی سردار شمار ہوتی تھیں۔[1]

نیز اللہ تعالیٰ نے آپ سلامُ اللہ وَ رِضوانُہ علیہا کو خاندانی شرافت، عزت و افتخار، عقل و فضل، حسن و جمال، بردباری اور دینداری سے خوب سرفراز فرمایا تھا۔[2]

(۳) آپ سلامُ اللہ وَ رِضوانُہ علیہا مال کی محبت سے پاک اور مجسمۂ سخاوت تھیں:

مشہور تابعی سعید بن مسیبؒ کا بیان ہے کہ حضرت صَفِیّہؓ جب خیبر سے مدینہ تشریف لائیں تو ان کے کانوں میں سونے کا تھوڑا سا زیور تھا (یعنی سونے کی بالیاں تھیں)۔ انہوں نے وہ زیور حضرت فاطمہؓ اور ان کے ساتھ کچھ عورتیں تھیں، اُن کو ہبہ کر دیا۔[3]

(۴) آپ سلامُ اللہ وَ رِضوانُہ علیہا نہایت عالی اخلاق تھیں، حضور ﷺ کی حدیثِ معروف "جو تم سے برا کرے تم اس سے اچھا کرو" کی عملی پیکر اور جیتا جاگتا نمونہ تھیں۔ ایک دفعہ آپ سلامُ اللہ وَ رِضوانُہ علیہا کی باندی نے امیر المومنین حضرت عمر بن خطابؓ کی خدمت میں آپؓ کی شکایت کہ حضرت صَفِیّہؓ (یہودیوں کی طرح) "ہفتہ" کے دن کو اچھا سمجھتی ہے نیز یہودیوں کے ساتھ اچھا سلوک کرتی ہے۔ حضرت عمرؓ نے آپؓ کے پاس آدمی بھجوا کر اس کی حقیقت معلوم کرائی۔ آپ سلامُ اللہ وَ رِضوانُہ علیہا نے فرمایا: جہاں تک "ہفتہ" کی بات ہے تو اللہ تعالیٰ نے جب سے مجھے اس کے بدلہ میں "جمعہ" کا دن عطا فرمایا ہے میں نے اس دن کو (جمعہ کے مقابلہ میں) کبھی اچھا نہیں سمجھا۔ باقی رہی یہود والی بات تو اس کی حقیقت یہ ہے کہ ان میں سے کچھ لوگ میرے رشتہ دار ہیں اور میں محض "صلہ رحمی" کی خاطر ان کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آتی ہوں (کہ کافر رشتہ دار کے ساتھ بھی ہمیں ایک حد تک حسنِ سلوک کا حکم ہے)۔ اس کے بعد آپ سلامُ اللہ وَ رِضوانُہ علیہا نے اس باندی سے پوچھا کہ تمہیں کس چیز نے اس شکایت پر ابھارا۔ اس نے

---

(۱) البداية والنهاية ط هجر: ۲۲۵/۱۱

(۲) سير أعلام النبلاء ط الرسالة: ۲۳۲/۲ مع الاستيعاب في معرفة الأصحاب: ۱۸۷۲/۴

(۳) الإصابة في تمييز الصحابة: ۲۱۱/۸

کہا: شیطان نے مجھے بہکا دیا تھا۔ آپ سلامُ اللہ وَ رِضوانُہ علیہا نے اُس کی اِس مبینہ اور دیدہ و دانستہ غلطی پر اس کو یہ کہا کہ جا! آج سے تو غلامی سے آزاد ہے۔ یعنی بجائے اس کو سزا دینے کے، اس کے ساتھ اعلیٰ درجہ کا احسان کرتے ہوئے اس کو آزاد کر دیا، جس سے وہ ہمیشہ کیلیے آزاد خواتین کے زمرہ میں داخل ہوگئی۔[1]

(۵) مسلمان کو رسول اللہ ﷺ سے محبت ہوتی ہے، مگر ام المومنین حضرت صَفِیہؓ کی سچی محبت کی گواہی آپ ﷺ نے خود اپنی زبان مبارک سے دی ہے: جب حضور ﷺ اپنی اس بیماری میں تھے جس میں آپ ﷺ کا انتقال ہوا اور آپ ﷺ کی ازواج مطہراتؓ بھی وہاں جمع تھیں۔ آپ ﷺ کی شدتِ مرض کو دیکھ کر حضرت صَفِیہؓ نے آپ سے کہا تھا کہ اے اللہ کے برگزیدہ نبی! اللہ کی قسم! میری یہ دلی خواہش ہے کہ اس وقت جس بیماری میں آپ مبتلا ہیں وہ بیماری آپ سے دور ہو جائے اور مجھے لگ جائے۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا تھا: وَ اللہِ اِنَّھَا لَصَادِقَۃ (واللہ! صفیہ اپنی بات میں بالکل سچی ہے)۔[2]

---

(۱) الإصابة في تمييز الصحابة: ۸/ ۲۱۱

(۲) الإصابة في تمييز الصحابة: ۸/ ۲۱۲، و الطبقات الكبرى ط العلمية: ۸/ ۱۰۱

(۱۱) ام المومنین حضرت میمونہ سلامُ اللہ و رِضوانُہ علیہا

تمہیدی بات:

حضرت صَفِیہؓ کے بعد رسول اللہ ﷺ نے حضرت میمونہؓ سے نکاح فرمایا۔ آپ سلامُ اللہ و رِضوانُہ علیہا کا نام بھی آپ ﷺ نے "برّہ" سے تبدیل کر کے "میمونہ" رکھا، "میمونہ" کا معنی ہے "بابرکت خاتون"۔ آپ سلامُ اللہ و رِضوانُہ علیہا، ام المومنین حضرت زینب بنت خزیمہؓ کی ماں شریک بہن تھیں۔ آپؓ، سید عالم ﷺ کی سب سے آخری بیوی ہیں، آپؓ کے بعد حضور ﷺ نے کسی عورت سے نکاح نہیں فرمایا۔

نام ونسب:

آپ سلامُ اللہ و رِضوانُہ علیہا کا نام "میمونہ"، والد کا نام "حارث" اور دادا کا نام "حزن" تھا۔ والدہ کا نام "ہند" اور نانا کا نام "عوف" تھا۔ آپؓ کی والدہ "ہند" مشہور قبیلہ "حِمیر" سے تعلق رکھتی تھیں۔

حضرت میمونہؓ کو نسب کے اعتبار سے یہ شرف حاصل تھا کہ آپؓ ام المومنین حضرت زینب بنت خزیمہؓ کی ماں شریک بہن، حضور ﷺ کے چچا حضرت عباسؓ کی سالی، اور حضرت عبداللہ بن عباسؓ اور حضرت خالد بن ولیدؓ کی سگی خالہ تھیں۔[۱]

اور آپؓ کی والدہ "ہند" کو ایک ایسا عظیم شرف حاصل تھا جو پورے عرب بلکہ پوری روئے زمین پر کسی اور خاتون کو حاصل نہ تھا جس کو ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے: "أکرَمُ عَجوزٍ في الأرضِ أصهارًا" یعنی ہند بنت عوف پوری روئے زمین پر اپنے دامادوں کے لحاظ سے سب سے زیادہ خوش قسمت عورت ہے۔ کیونکہ ان کے دامادوں میں سرِ فہرست رسول اللہ ﷺ کی ذاتِ بابرکت ہے اور پھر انبیاء کے بعد اس دھرتی کی سب سے افضل ہستی حضرت ابوبکر صدیقؓ بھی ان کے داماد ہیں اور اسی طرح متعدد جلیل القدر صحابہ جیسے حضرت حمزہ، حضرت عباس، اور حضرت علی رضی اللہ عنہم اجمعین، وغیرہ ان کے دامادوں میں شمار ہوتے ہیں۔[۲]

---

(۱) الاستیعاب في معرفة الأصحاب: ۴/۱۹۱۵

(۲) شرح الزرقاني علی المواهب اللدنية بالمنح المحمدية: ۴/۴۱۹، والسمط الثمين، ص: ۱۷۳

سابقہ نکاح:

آپ سلامُ اللہ و رِضوانُہ علیہا کا زمانۂ جاہلیت میں پہلا نکاح مسعود بن عمرو ثقفی سے ہوا تھا، پھر دونوں میں جب کسی وجہ سے علیحدگی ہوگئی تو دوسرا نکاح ابورُہم بن عبدالعزیٰ سے ہوا[1]۔ ابورُہم وفات پا گیا جبکہ حضرت میمونہؓ کی عمر ۲۶ سال تھی اور آپؓ بیوہ ہوگئیں۔ اس کے بعد آپؓ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نکاح میں آئیں۔[2]

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے نکاح:

ذی القعدہ سنہ ٦ھ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، صحابہ کرامؓ کے ہمراہ عمرہ کیلئے تشریف لے گئے تھے۔ مکہ مکرمہ پہنچنے سے قبل ہی "حدیبیہ" کے مقام پر آپ کو روک لیا گیا تھا اور "صلح حدیبیہ" وجود میں آئی تھی۔ اس صلح نامہ میں ایک بات یہ بھی تھی کہ ابھی آپ بغیر عمرہ کیے واپس چلے جائیں اور آئندہ سال آپ عمرہ کیلئے آسکتے ہیں اور صرف تین دن مکہ مکرمہ میں قیام کی اجازت ہوگی۔ اس صلح نامہ کے بعد آپ صحابہ کرام کے ساتھ مدینہ واپس تشریف لے آئے۔ اگلے سال ٧ سنہ کے آغاز میں غزوہ خیبر ہوا۔ پھر اسی سال آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حسب صلح نامہ، ذی القعدہ ٧ سنہ ھ میں "عمرة القضاء" کیلئے جاں نثار صحابہ کرامؓ کی معیت میں مدینہ طیبہ سے مکہ مکرمہ روانہ ہوئے۔ جب آپ مقامؑ "یاجج" پر پہنچے تو حضرت جعفر بن ابی طالبؓ بھی حبشہ سے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس وہاں پہنچ گئے۔ چناں چہ آپؐ نے حضرت جعفرؓ کو "حضرت میمونہؓ" کے پاس اپنے نکاح کا پیغام دے کر بھیجا (حضرت جعفرؓ، حضرت میمونہؓ کے بہنوئی تھے کہ حضرت میمونہؓ کی ماں شریک بہن "اسماء بنت عمیس" حضرت جعفرؓ کے نکاح میں تھی)۔ حضرت میمونہؓ اس وقت مکہ مکرمہ میں مقیم تھیں۔ حضرت جعفرؓ نے جا کر حضرت میمونہؓ کو پیغامِ نکاح پہنچایا۔ اس نکاح پر انہوں نے رضامندی کا اظہار کرتے ہوئے اپنے بہنوئی حضرت عباسؓ بن عبدالمطلب (جو اُن کی سگی بڑی بہن "لبابہ کبریٰ" کے شوہر تھے، نیز حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے چچا بھی تھے) کو اپنا وکیل مقرر کیا اور انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے آپ سلامُ اللہ و رِضوانُہ علیہا کا نکاح کرا دیا۔ یہ نکاح

---

(۱) الطبقات الكبرى ط العلمية: ١٠٣/٨، وفيه أقوال أخر تجدها في الإصابة في تمييز الصحابة: ٣٢٢/٨، والاستيعاب في معرفة الأصحاب: ١٩١٦/٤

(۲) تراجم سیدات بیت النبوۃ، ص: ٣١٣

اسی سفر میں ہی (یعنی ذی القعدہ سنہ ۷ھ میں[1]) ہوا جبکہ آپ عمرہ کیلئے تشریف لے جارہے تھے۔ مکہ مکرمہ پہنچ کر آپ ﷺ نے عمرہ ادا فرمایا۔

صلح نامہ کے موافق جب تین دن پورے ہوگئے اور چوتھے دن کی صبح ہوئی جس میں آپ ﷺ نے واپس آنا تھا تو صبح صبح ہی مشرکینِ مکہ کی طرف سے دو قاصد "سہیل بن عمرو" اور "حُویطب بن عبد العزیٰ" آپ ﷺ کے پاس آئے۔ اس وقت آپ ﷺ انصار کے مجمع میں جلوہ افروز تھے اور حضرت سعد بن عُبادہؓ کے ساتھ محوِ گفتگو تھے۔ "حُویطب" نے شور مچاتے ہوئے آپ ﷺ سے کہا: انقضی أجلک، فاخرج عنا "تین دن کی مدت پوری ہوچکی ہے، اب تم یہاں سے نکل جاؤ"۔ حضرت سعد بن عُبادہؓ نے جب اُس کو آپ ﷺ کے ساتھ اس طرح گستاخانہ اور شوخیانہ انداز میں مخاطِب ہوتے دیکھا تو اُسے کہا: یہ مکہ نہ تو تیری ماں کی ملکیت ہے اور نہ تیرے باپ کی۔ رسول اللہ ﷺ اس طرح نہیں جائیں گے۔ البتہ آپ ﷺ نے "سہیل" اور "حویطب" کو بلا کر کہا: میں نے یہاں ایک خاتون سے نکاح کیا ہے۔ اگر تم لوگ مجھے کچھ مزید مہلت دو تو میں اس سے رخصتی کرلوں۔ میں ولیمہ کروں گا تمہیں بھی اس میں شرکت کی دعوت ہے۔ انہوں نے بڑی بے رُخی سے جواب دیا اور کہا: لا حاجة لنا في طعامک فاخرج عنا (ہمیں تمہارے کھانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ بس تم یہاں سے چلے جاؤ)۔ بہرحال آپ ﷺ نے معاہدہ کی پاسداری کرتے ہوئے اپنے غلام "ابورافع" کو حکم دیا کہ جاؤ! صحابہؓ میں واپسی کا اعلان کردو۔ انہوں نے جاکر اعلان کیا اور واپسی کا سفر شروع ہوگیا، اور آپ ﷺ اپنے صحابہ کے ہمراہ واپس مدینہ منورہ روانہ ہوگئے البتہ آپ ﷺ نے اپنے غلام "ابورافعؓ" کو وہیں مکہ مکرمہ میں ہی چھوڑ دیا تھا کہ وہ حضرت میمونہؓ کو اپنے ساتھ لے آئیں گے۔ جب اس مبارک قافلے نے مکہ مکرمہ سے دس میل دُور مقامِ "سَرِف" پر جاکر پڑاؤ ڈالا تو پیچھے سے حضرت "ابورافعؓ" بھی حضرت میمونہؓ کو ساتھ لے کر پہنچ گئے۔ چناں چہ سفر کے دوران وہیں "سرف" میں ہی آپ ﷺ نے رخصتی فرمائی اور پھر مدینہ منورہ کی طرف سفر شروع فرمادیا یہاں تک کہ حضرت میمونہؓ "ام المومنین" کی حیثیت سے بخیر وعافیت مدینہ طیبہ پہنچ گئیں۔[2]

---

(1) الإصابة في تمييز الصحابة: ۸/۳۲۲

(2) البداية والنهاية ط هجر: ۶/۳۷۸ وما بعدها، وبعضه من سبل الهدى والرشاد في سيرة خير العباد: ۱۱/۲۰۸، والاستيعاب في معرفة الأصحاب: ۴/۱۹۱۷، وتراجم سيدات بيت النبوة، ص: ۳۰۲

اشاعتِ علم:

حضرت میمونہؓ نے مدینہ طیبہ میں رسول اللہ ﷺ کی صحبت میں رہ کر آپ ﷺ سے فیضیاب ہونا شروع کر دیا۔ اور پھر آپ سلامُ اللہ وَ رِضوانُہ علیہا کے علم سے آگے کئی حضرات نے استفادہ کیا حتیٰ کہ حضرت عبداللہ بن عباس، حضرت عبداللہ بن شداد بن الہاد، حضرت یزید بن اصم، حضرت عطاء بن یسار وغیرہ جیسے بڑے بڑے حضرات کا شمار آپ سلامُ اللہ وَ رِضوانُہ علیہا کے شاگردوں میں ہوتا ہے۔[1]

حضرت میمونہؓ کی باندی "ندبہ" کہتی ہیں کہ مجھے ام المومنین حضرت میمونہؓ نے اپنے بھانجے حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی بیوی کے پاس کسی کام سے بھیجا۔ میں نے وہاں جا کر دیکھا کہ ان دونوں میاں بیوی کا بستر الگ الگ لگا ہوا ہے۔ میں سمجھی کہ شاید باہمی کسی رنجش کی بناء پر ایسا کر رکھا ہے۔ خیر! میں نے پھر ان کی بیوی سے اس بارے میں پوچھ ہی لیا۔ وہ کہنے لگیں: نہیں! ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ دراصل یہ میرے ماہواری کے دن ہیں۔ جب میرے یہ ایام آتے ہیں تو وہ میرے بستر کے قریب نہیں آتے۔ میں نے واپس آ کر حضرت میمونہؓ کو یہ سارا حال کہہ سنایا تو آپ سلامُ اللہ وَ رِضوانُہ علیہا نے مجھے واپس حضرت ابن عباسؓ کے پاس یہ پیغام دے کر بھیج دیا کہ تم حضور ﷺ کی سنت سے اعراض کیوں کرتے ہو؟ آپ ﷺ تو ان ایام میں اپنی بیوی کے ساتھ سوتے تھے، آپ ﷺ کے اور آپ کی بیوی کے درمیان صرف ایک کپڑا حائل ہوتا تھا جو بیوی (کی ناف سے لے کر اس) کے گھٹنوں سے ذرا نیچے تک ہوتا تھا۔[2]

وفات:

حضرت میمونہؓ کی سیرتِ طیبہ میں ایک عجیب ومنفرد پہلو یہ پایا جاتا ہے کہ جس مقام پر اُن کی رخصتی ہوئی تھی، عین اُسی جگہ پر آپ کا انتقال ہوا اور وہیں قبر بنی۔ اس کا واقعہ کچھ یوں ہے:

حضرت یزید بن اصم بیان کرتے ہیں: ام المومنین حضرت میمونہؓ مکہ مکرمہ میں تھیں کہ آپؓ کی طبیعت کچھ ناساز ہوئی اور اس وقت آپؓ کے پاس آپؓ کا کوئی بھتیجا موجود نہیں تھا۔ آپ سلامُ اللہ وَ رِضوانُہ علیہا نے فرمایا: مجھے یہاں

---

(۱) سیر أعلام النبلاء ط الرسالۃ: ۲/۲۳۹

(۲) مسند أحمد ط الرسالۃ: ۴۴/۴۰۲

سے لے چلو، مجھے یہاں موت نہیں آئے گی کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے ایک دفعہ مجھے فرمایا تھا کہ مجھے مکہ مکرمہ میں موت نہیں آئے گی۔ چناں چہ آپ ؓ کو لے کر چلے یہاں تک کہ جب مقام سَرِف پر اس درخت کے نیچے پہنچے جہاں آپ ﷺ نے ایک خیمہ میں ان کے ساتھ رخصتی فرمائی تھی تو آپ سلامُ اللہ وَرِضوانُہ علیہا کا وہیں انتقال ہوگیا۔[1]

آپ ؓ کے بھانجے حضرت ابن عباس ؓ نے نماز جنازہ پڑھائی اور آپ ؓ کے جسدِ اطہر کو قبر میں اتارنے کیلیے آپ ؓ کے بھانجے (حضرت ابن عباس، حضرت یزید بن اصم اور حضرت عبداللہ بن شداد) اندر اترے[2]۔ راجح قول کے مطابق آپ ؓ نے ۵۱ھ میں انتقال فرمایا۔[3]

فضائل واعزازات:

حضرت عائشہ ؓ نے حضرت میمونہ ؓ کی شان بیان کرتے ہوئے ایک مرتبہ فرمایا تھا:

"غور سے سنو! وہ ہم میں سب سے زیادہ اللہ عزوجل سے ڈرنے والی اور سب سے زیادہ رشتہ داروں کے ساتھ حسن سلوک کرنے والی تھیں"۔[4]

نیز حضرت میمونہ ؓ کو نسب کے اعتبار سے یہ شرف حاصل تھا کہ آپ ؓ ام المومنین حضرت زینب بنت خزیمہ ؓ کی ماں شریک بہن، حضور ﷺ کے چچا حضرت عباس ؓ اور چچازاد بھائی حضرت جعفر ؓ کی سالی، اور حضرت عبداللہ بن عباس ؓ اور حضرت خالد بن ولید ؓ کی سگی خالہ تھیں[5]۔ جیسا کہ پیچھے گزرا۔

---

(۱) مجمع الزوائد ومنبع الفوائد: ۹/ ۲۴۹

(۲) الاستیعاب في معرفة الأصحاب: ۴/ ۱۹۱۸

(۳) البداية والنهاية طهجر: ۹/ ۲۲۴، والعبر في خبر من غبر: ۱/ ۴۰

(۴) المستدرك على الصحيحين للحاكم: ۴/ ۳۴

(۵) الاستیعاب في معرفة الأصحاب: ۴/ ۱۹۱۵

تیسرا باب

اولادِ اطہار سلامُ اللہ ورِضوانُہ علیہم کی سیرت ومناقب

رسول اللہ ﷺ کی اولاد میں تین صاحبزادے اور چار صاحبزادیاں تھیں۔ [1] آپ ﷺ کی یہ سب اولاد آپ کی پہلی زوجہ مطہرہ حضرت خدیجہؓ کے بطنِ مبارک سے پیدا ہوئی، سوائے "ابراہیم" کے، وہ آپ ﷺ کی باندی "حضرت ماریہ قبطیہؓ" سے پیدا ہوئے۔ [2]

تمہیدِ بالا کے بعد واضح ہو کہ بابِ ہذا مندرجہ ذیل دو فصول پر منقسم ہے:

فصلِ اول: صاحبزادوں کی سیرت

فصلِ دوم: صاحبزادیوں کی سیرت ومناقب

فصلِ اول: صاحبزادوں کی سیرت

صاحبزادوں میں سب سے بڑے حضرت قاسمؓ پھر حضرت عبداللہؓ پھر حضرت ابراہیمؓ تھے۔

سیدنا قاسم سلامُ اللہ ورِضوانُہ علیہ:

حضرت قاسم سلامُ اللہ ورِضوانُہ علیہ سب سے پہلے پیدا ہوئے اور انہی کے نام سے آپ ﷺ کی کنیت "ابوالقاسم" مشہور ہوئی۔ مکہ معظمہ ہی میں ان کی ولادت ہوئی، سترہ (۱۷) ماہ زندہ رہے۔ ابھی پاؤں چلنے لگے تھے کہ وہیں مکہ میں ہی آپ ﷺ کو نبوت ملنے سے پہلے انتقال کر گئے اور وہیں مدفون ہوئے۔

سیدنا عبداللہ سلامُ اللہ ورِضوانُہ علیہ:

دوسرے صاحبزادے حضرت عبداللہ سلامُ اللہ ورِضوانُہ علیہ تھے۔ ان کی ولادت، نبوت ملنے کے بعد ہوئی۔ ان کا

---

(۱) نور الأبصار في مناقب آل بيت النبي المختار، ص: ۹۲ وإسعاف الراغبين، ص: ۸۱

(۲) الاستيعاب في معرفة الأصحاب ۱/ ۵۰ وتفسير القرطبي ۱۴/ ۲۴۱

لقب "طیب" بھی تھا اور "طاہر" بھی۔ یہ بھی بچپن میں وہیں مکہ مکرمہ میں انتقال کر گئے، [1] اور ایک سال، چھ ماہ اور آٹھ دن حیات پائی۔ [2] ان کی وفات پر، بدبخت عاص بن وائل نے آپ ﷺ کو طعنہ دیا تھا کہ اب -نعوذ باللہ- محمد (ﷺ) کی جڑ کٹ گئی ہے، اس کی نسل آگے نہیں چلے گی (جس سے رہتی دنیا میں اس کا تذکرہ بھی نہیں ہو سکے گا)۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کی شان میں "سورۃ الکوثر" نازل فرمائی تھی۔ [3]

سیرت سیدنا ابراہیم سلامُ اللّٰہ و رِضوانُہ علیہ:

تیسرے صاحبزادے حضرت ابراہیمؓ تھے۔ یہ ۸ھ میں مدینہ طیبہ میں "عوالی" کے علاقہ میں پیدا ہوئے۔ [4] یہ حضرت خدیجہؓ کے بجائے آپ ﷺ کی باندی "حضرت ماریہ قبطیہؓ" [5] کے بطن سے پیدا ہوئے تھے۔ سیدنا ابراہیم کی پیدائش پر آپ ﷺ بہت زیادہ خوش ہوئے تھے۔ [6] آپ ﷺ نے حضرت ماریہؓ کو وہیں "عوالی" میں گھر دے رکھا تھا چناں چہ وہ موسمِ گرما اور کھجور چننے کے زمانہ میں وہاں رہا کرتی تھیں اور آپ ﷺ اُن کے پاس وہیں تشریف لے جایا کرتے تھے۔ وہ دایہ جس کے ہاتھوں حضرت ماریہؓ سے ابراہیم کی پیدائش ہوئی، رسول اللہ ﷺ کی آزاد کردہ باندی "سلمیٰ" تھی۔ یہ اپنے شوہر "ابورافع" کے پاس گئی اور اسے بتایا کہ حضرت ماریہؓ کا لڑکا پیدا ہوا ہے۔ وہ (دوڑے دوڑے) آئے اور آنحضور ﷺ کو ابراہیمؓ کی ولادت کی خوشخبری دی، اِس بشارت پر آپ ﷺ نے ابورافع کو ایک غلام عنایت فرمایا۔ [7]

---

(۱) شرح الفقہ الأکبر، ص: ۱۰۹

(۲) اہلِ بیت کا مختصر تعارف، ص: ۲۳

(۳) الطبقات الکبری ط العلمیة ۳/۴ والبدایة والنهایة ط هجر ۸/۲۳۷ وإسعاف الراغبین، ص: ۸۲

(۴) سبل الهدیٰ والرشاد في سیرة خیر العباد ۱۱/۲۱ وأسد الغابة وشرح السنة للبغوي ۱۴/۱۱۴

(۵) - فائدہ (۱): آپ ﷺ نے حدیبیہ سے واپسی پر ۶ ہجری میں، حضرت حاطب بن ابی بلتعہؓ کے ہاتھ مصر کے بادشاہ "مقوقس" کے پاس اسلام کا دعوت نامہ بھیجا، خط ملنے پر اُس نے اسلام تو قبول نہ کیا البتہ اچھے الفاظ میں خط کا جواب دیا اور ساتھ ہی بطورِ ہدیہ اس نے آپ ﷺ کی خدمت میں دو باندیاں بھیجیں: ایک ماریہ، دوسری ان کی بہن سیرین۔ آپ ﷺ نے ان پر اسلام پیش کیا تو وہ مسلمان ہوگئیں پھر آپ ﷺ نے ان میں سے حضرت ماریہؓ کو اپنے پاس رکھ لیا اور حضرت سیرینؓ، حضرت حسان بن ثابتؓ کو ہدیہ کر دی تھی۔ اُن سے عبدالرحمن بن حسان پیدا ہوئے اور اِن سے سیدنا ابراہیم کی ولادت ہوئی، چناں چہ عبدالرحمن اور سیدنا ابراہیم رشتہ میں خالہ زاد بھائی ہیں۔ الطبقات الکبری ۱/۱۰۷ مع أسد الغابة ط العلمیة ۱/۱۵۲

فائدہ (۲): حضرت ماریہ قبطیہؓ کی سیرتِ طیبہ متعدد کتب میں مذکور ہے، مثلاً: نساءِ اہلِ بیت فی ضوء القرآن والحدیث، ص: ۴۴۳۔ ۴۴۳ وغیرہ۔

(۶) أسد الغابة ط العلمیة ۱/۱۵۲

(۷) الطبقات الکبری ط العلمیة ۱/۱۰۷

پھر ساتویں دن آپ ﷺ نے اُن کا عقیقہ کیا جس میں دو مینڈھے ذبح کیے۔ [1] اسی ساتویں دن ان کا نام رکھا (دوسری روایت کے مطابق آپ ﷺ نے پیدائش کی رات ہی ان کا نام رکھ دیا تھا۔ اور بعض کے نزدیک یہی روایت صحیح ہے۔ [2]) اور ان کا سر منڈوایا پھر ان بالوں کے وزن کے بقدر چاندی صدقہ کی اور ان بالوں کو زمین میں دفن کر دیا۔ [3] سر مونڈنے والے کا نام ''ابو ہند'' تھا۔ [4]

جب سیدنا ابراہیمؓ کی پیدائش ہوگئی تو انصار کی متعدد عورتوں میں سے ہر عورت بڑھ چڑھ کر اس خواہش کا اظہار کرنے لگی کہ ''ابراہیمؓ'' کو دودھ پلانے کی خدمت کا شرف اسے حاصل ہو، مگر یہ سعادت قبیلہ بنو نجّار کی خوش قسمت خاتون امّ بُردَہ بنت مُنذِر رضی اللہ عنہا کے حصہ میں آئی جو بَراء بن اَوس انصاری رضی اللہ عنہ کی زوجہ تھیں اور وہ بھی بنو نجّار سے تعلق رکھتے تھے۔ چناں چہ آپ ﷺ نے سیدنا ابراہیمؓ کو رضاعت کیلئے ام بُردہؓ کے حوالہ کر دیا۔ وہ اُن کو دودھ پلاتیں اور سیدنا ابراہیمؓ وہیں قبیلہ بنو نجّار میں اپنے رضاعی والدین (بَراء انصاریؓ اور اُمّ بُردہؓ) کے پاس رہتے۔

رسول اللہ ﷺ خود اُمّ بُردہؓ کے گھر تشریف لے جاتے، وہیں دوپہر کو آرام بھی فرما لیتے اور سیدنا ابراہیمؓ کو بھی آپ ﷺ کے پاس لایا جاتا (آپ ﷺ ان سے ملتے اور پھر واپس آ جاتے)۔ حضور ﷺ نے حضرت اُمّ بُردہؓ کو کھجور کے باغ کا ایک حصہ عطا فرمایا تھا۔

اس کے بعد آپ ﷺ نے رضاعت کیلیے سیدنا ابراہیمؓ کو مدینہ طیبہ کی خوش نصیب خاتون ''امّ سیف رضی اللہ عنہا'' کے حوالے فرمایا۔ آپ ﷺ سیدنا ابراہیمؓ کو ملنے کیلیے جب ان کے پاس جاتے تو عموماً حضرت انسؓ بھی ساتھ جایا کرتے۔ حضرت انسؓ کا بیان ہے کہ: مَا رَأَيْتُ أَحَدًا كَانَ أَرْحَمَ بِالْعِيَالِ مِنْ رَسُولِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ إِبْرَاهِيمُ مُسْتَرْضَعًا لَهُ فِي عَوَالِي الْمَدِينَةِ. فَكَانَ يَأْتِيهِ وَنَجِيءُ مَعَهُ. فَيَأْخُذُهُ فَيُقَبِّلُهُ ''میں نے اپنی

---

(۱) فائدہ: بعض روایات میں ہے کہ دو کے بجائے ایک مینڈھا ذبح کیا۔ ملاحظہ ہو: [عیون الأثر ۲/۳۵۹ اور ابن سعد ۱/۱۰۷ کی روایت کے مطابق ایک بکری ذبح کی۔

(۲) أسد الغابة ط العلمية ۱/۱۵۲ مع عيون الأثر ۲/۳۵۹

(۳) نور الأبصار في مناقب آل بيت النبي المختار، ص: ۲۲ مع إسعاف الراغبين، ص: ۸۳

(۴) عيون الأثر: ۲/۳۵۹، وسبل الهدى والرشاد في سيرة خير العباد: ۱۱/۲۱

زندگی میں کوئی ایسا شخص نہیں دیکھا جو آپ ﷺ سے بڑھ کر اپنے عیال کے ساتھ محبت و شفقت سے پیش آتا ہو، سیدنا ابراہیمؓ عوالیِ مدینہ میں رضاعت پر تھے، آپ ﷺ ان کے پاس تشریف لاتے اور ہم بھی آپ کے ساتھ ہوتے، آپ ﷺ گھر کے اندر داخل ہوتے، سیدنا ابراہیمؓ کو اٹھاتے اور ان کو چومتے۔''[1]

ایک دفعہ سیدنا ابراہیمؓ بیمار ہوگئے جب کہ عمر مبارک ابھی دو سال بھی نہیں ہوئی تھی۔ ان کی بیماری پر حضرت ماریہؓ بہت زیادہ دکھی ہوئیں، ہر وقت ان کے پاس رہنے لگیں اور اس کوشش میں لگی رہیں کہ کسی طرح یہ شفایاب ہوجائیں مگر ارادۂ الٰہی یہ ہو چکا تھا کہ ابراہیم اپنی رضاعت جنت میں جا کر پوری کرے گا۔ رسول اللہ ﷺ نے بھی محسوس کیا کہ ابراہیم آخری سانسوں میں ہے۔ آپ ﷺ نے دکھی دل کے ساتھ ان کو اپنی گود میں لیا پھر رضا بر قضا کے تحت فرمایا: یاإبراهیم! إنا لا نغني عنک من اللہ شیئا ''ابراہیم! اللہ کے فیصلہ کے سامنے ہم تیرے کسی کام نہیں آسکتے۔'' اس کے بعد آپ ﷺ کی آنکھوں سے آنسو چھلک پڑے۔[2]

ایک روایت میں حضرت انسؓ کا بیان ہے کہ ہم رسول اللہ ﷺ کے ساتھ سیدنا ابراہیمؓ کے پاس گئے، آپ ﷺ نے ان کو اٹھایا، چوما اور فرطِ محبت سے ان کو سونگھا۔ پھر ہم اس کے بعد دوبارہ آپ ﷺ کے پاس گئے تو دیکھا کہ سیدنا ابراہیمؓ آخری سانسیں لے رہے ہیں اور نبیِ رحمت ﷺ کی آنکھوں سے آنسو رواں ہیں۔ آپ ﷺ کو آنسو بہاتے دیکھ کر حضرت عبدالرحمن بن عوفؓ نے عرض کیا کہ آپ بھی یا رسول اللہ؟ آپ ﷺ نے فرمایا: یا ابنَ عوفٍ إنّها رَحمَةٌ'' ابن عوف! یہ شفقت و نرم دلی ہے''، پھر اس کے بعد دوسرا جملہ یہ ارشاد فرمایا: إنَّ العَینَ تَدمَعُ، وَالقَلبَ یَحزَنُ، وَلا نَقولُ إلّا مَا یَرضَی رَبُّنَا، وَإنّا بِفِراقِکَ یَا إبرَاهِیمُ لَمَحزُونُونَ ''آنکھ پُرنم ہے، دل دکھی ہے اور (اس صدمہ میں بھی) ہم صرف وہی بات زبان سے نکالیں گے جو ہمارے رب کو پسند ہو۔ ابراہیم! حقیقت یہ ہے کہ تمہاری جدائی پر ہم بہت غمزدہ ہیں۔''[3] ایک روایت میں ہے کہ اس وقت جبکہ آپ ﷺ کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے، حضرت اسامہ بن زیدؓ بھی زور زور سے آواز کے ساتھ رو رہے تھے۔ آپ ﷺ نے انہیں روکا تو انہوں نے عرض کی: یارسول اللہ! میں آپ کو بھی تو روتا دیکھ رہا ہوں (اس لیے میں بھی رو رہا ہوں)، آپ ﷺ نے فرمایا: البُکاءُ مِنَ الرَّحمَةِ وَالصُّراخُ مِنَ الشَّیطَانِ ''(آنسوؤں کے ساتھ بلا آواز) رونا رحم دل ہونے کی علامت ہے

---

(۱) الطبقات الکبریٰ ط العلمیة ۱۰۹/۱، ۱۰۸/۱ مع سبل الهدیٰ والرشاد ۲۲/۱۱

(۲) موسوعة آل بیت النبي ۱/ ۳۹۵ مع أسد الغابة ط العلمیة ۱/ ۱۵۲

(۳) صحیح البخاري ۲/ ۸۳

اور آواز کے ساتھ زور زور سے رونا شیطان کی طرف سے ہے۔"[1]

راجح قول کے مطابق سیدنا ابراہیمؓ کا انتقال بروز منگل، ۱۰ ربیع الاول، ۱۰ ہجری میں ہوا۔[2] بوقتِ وفات آپؓ کی عمر عزیز سترہ یا اٹھارہ ماہ تھی۔[3] ابھی آپؓ کا دودھ بھی نہیں چھڑایا گیا تھا کہ انتقال فرما گئے۔[4]

جب انتقال ہوگیا تو حضرت فضل بن عباسؓ نے انہیں غسل دیا اور حضور ﷺ اور حضرت عباسؓ غسل کے دوران وہیں تشریف فرما رہے۔[5]

غسل کے بعد انہیں کفن دیا گیا،[6] رسول اللہ ﷺ نے چار تکبیروں کے ساتھ خود نماز جنازہ پڑھائی،[7] پھر انہیں چھوٹی چارپائی پر اٹھا کر جنت البقیع کی طرف لے جایا گیا،[8] اور آپ ﷺ نے حضرت عثمان بن مظعونؓ (جو آپ ﷺ کے درود شریک بھائی تھے[9]) کے پہلو میں وہیں جنت البقیع میں ان کو دفن فرمایا۔[10] حضرت فضل بن عباسؓ اور حضرت اسامہ بن زیدؓ قبر میں اترے اور حضور ﷺ اور حضرت عباسؓ قبر کے کنارے پر تشریف فرما تھے۔[11] تدفین کے بعد آپ ﷺ نے ان کی قبر پر پانی چھڑکا اور قبر کی شناخت کیلئے قبر پر ایک پتھر کے ذریعے نشانی بھی لگادی۔[12]

کثرت سے احادیث میں آیا ہے کہ سیدنا ابراہیمؓ کی وفات والے دن سورج کو گرہن لگ گیا تھا۔ اس پر بعض مسلمانوں نے یہ سمجھا کہ صاحبزادۂ رسول سیدنا ابراہیمؓ کے انتقال کے غم میں سورج کو گرہن لگا ہے۔ چناں چہ رسول اللہ ﷺ نے ان کے اس غلط خیال کی دُرستی کیلئے ارشاد فرمایا: "سورج اور چاند اللہ کی نشانیوں میں سے دو نشانیاں

---

(۱) الطبقات الكبرى ط العلمية ۱/۱۰۱ مع الاستيعاب في معرفة الأصحاب ۱/۵۷

(۲) موسوعة آل بيت النبي ۳۹۵/۱ و تاريخ الخميس في ۲/۱۴۶ و سبل الهدى و الرشاد ۲۲/۱۱

(۳) سبل الهدى و الرشاد ۲۲/۱۱ و تاريخ الخميس في ۱۴۶/۲ نقلا عن صحيح البخاري

(۴) زاد المعاد في هدي خير العباد ۱۰۱/۱

(۵) تاريخ الخميس في أحوال أنفس النفيس ۱۴۶/۲

(۶) موسوعة آل بيت النبي ۳۹۶/۱

(۷) أسد الغابة ط العلمية ۱۵۲/۱ و سبل الهدى و الرشاد ۲۴/۱۱

(۸) المواهب اللدنية بالمنح المحمدية ۴۸۷/۱

(۹) جمع الوسائل في شرح الشمائل ۱۲۲/۲ و نور اليقين في سيرة سيد المرسلين ص: ۹۱ و السيرة النبوية لأبي شهبة ۱۸۱/۲

(۱۰) أسد الغابة ط العلمية ۱۵۲/۱ و شرح السنة للبغوي ۱۱۴/۱۴

(۱۱) تاريخ الخميس في أحوال أنفس النفيس ۱۴۶/۲

(۱۲) موسوعة آل بيت النبي ۳۹۶/۱ و المواهب اللدنية للقسطلاني ۴۹۷/۱

ہیں، انہیں کسی کی موت یا زندگی کی وجہ سے گرہن نہیں لگتا۔ جب تم انہیں گرہن زدہ دیکھو تو اللہ کو پکارو اور نماز میں مشغول ہو جاؤ یہاں تک کہ گرہن ختم ہو جائے۔'' [1]

سیدنا ابراہیمؓ کا انتقال چونکہ مدت رضاعت پوری ہونے سے پہلے ہی ہو گیا تھا اس لیے آپ ﷺ نے ان کی فضیلت وشان بیان کرتے ہوئے فرمایا: ''ابراہیم کو دودھ پلانے والی جنت میں موجود ہے۔'' [2] اور ایک مرتبہ فرمایا: ''اس کیلیے جنت میں ایک دودھ پلانے والی ہے جو اس کے دودھ کی بقیہ مدت تک وہاں اسے دودھ پلائے گی۔'' [3]

سیدنا ابراہیمؓ اپنی والدہ ماجدہؓ کی طرف سے قبطی یعنی مصری تھے، چناں چہ آپ ﷺ نے اپنے صاحبزادے کو اس قدر عزت دی اور ان کے بیٹے ہونے کا اس قدر حق ادا کیا کہ ان کے اہلِ علاقہ یعنی قبطی لوگوں کے ساتھ نرمی اور حسن سلوک کا خاص طور پر حکم دیا چنانچہ آپ ﷺ نے فرمایا: ''جب مصر فتح ہو تو تم قبطیوں (یعنی اہلِ مصر) کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آنا، (کہ وہ لوگ رعایت ونرمی کے مستحق ہیں) کیونکہ (میرے بیٹے ابراہیمؓ کی وجہ سے) ان کیلیے امان ہے اور (میرے بیٹے ابراہیمؓ کے ساتھ ساتھ میرے جدِ امجد حضرت اسماعیل علیہ السلام کی والدہ محترمہ حضرت ہاجرہؓ کی وجہ سے بھی) ان کی ہمارے ساتھ رشتہ داری ہے (کیونکہ سیدنا ابراہیمؓ کی طرح حضرت ہاجرہؓ بھی مصر کی تھیں)۔'' [4]

---

(1) صحيح البخاري ٢/٣٩ صحيح مسلم ٢/٦٣٠

(٢) صحيح البخاري ٢/١٠٠

(٣) المصباح المضي لابن حديدة ٢/١١٧ والخصائص الكبرى ٢/٤٦٢ وعيون الأثر ٢/٣٥٩

(٤) الجامع الصغير وزيادته، رقم: ٧٠٠ مع شرحيه: التنوير للأمير الصنعاني ٢/١٥٣ وفيض القدير للمناوي ١/٤٠٩ والحديث موجود بهذا المعنى في كثير من المصادر الحديثية نحو: صحيح مسلم ٤/١٩٧٠ ومسند أحمد [409 /35 و[المعجم الكبير ١٩/٦١ وغيرها.

فصلِ دوم

صاحبزادیوں سلامُ اللہِ وَرِضوانہ علیہن کی سیرت ومناقب

آپ ﷺ کی چار صاحبزادیاں تھیں: ان میں سب سے بڑی حضرت زینبؓ، پھر حضرت رُقیہؓ، پھر حضرت ام کلثومؓ، پھر سیدہ حضرت فاطمۃ الزہراءؓ تھیں۔ [1]

آپ ﷺ کے صاحبزادے تو بچپن میں ہی انتقال کر گئے تھے مگر آپ کی تمام صاحبزادیاں بڑی ہوئیں، اسلام لائیں اور سب نے مدینہ طیبہ کی طرف ہجرت کی۔ [2] ذیل میں آپ ﷺ کی چاروں نیک بخت وسعادت مند صاحبزادیوں کی سیرت ومناقب کو درج کیا جاتا ہے:

ا۔ سیدہ حضرت زینب سلامُ اللہ ورضوانہٗ علیہا کی سیرت ومناقب

نام ونسب:

آپ سلامُ اللہ وَرِضوانہٗ علیہا کا نامِ مبارک "زینب" تھا۔ آپ سلامُ اللہ وَرِضوانہٗ علیہا، امام الانبیاء حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ اور ام المومنین حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ کی سب سے بڑی صاحبزادی تھیں، [3] جیسا کہ اوپر معلوم ہو چکا۔

ولادتِ باسعادت:

رسول اللہ ﷺ کے اعلانِ نبوت سے دس برس قبل جب کہ آپ ﷺ کی عمر مبارک تیس برس تھی۔ حضرت زینب سلامُ اللہ وَرِضوانہٗ علیہا کی ولادت ہوئی، یعنی حضرت خدیجہؓ سے آپ ﷺ کے رشتۂ ازدواج کے پانچ برس بعد حضرت زینبؓ پیدا ہوئیں۔ [4]

---

(۱) الاستیعاب في معرفة الأصحاب: ۴/۱۸۹۳، ۱/۱۵۰ الإصابة ۸/۲۶۳

(۲) السیرة الحلبیة: ۲/۲۶۷ وسیرة ابن هشام ت السق: ۱/۱۹۱

(۳) المواهب اللدنیة بالمنح المحمدیة: ۱/۴۵۹

(۴) ذخائر العقبی في مناقب ذوي القربی ص: ۱۵۶ وعیون الأثر ۲/۳۵۸ وغیرهما مع السیرة النبویة علی ضوء القرآن والسنة: ۲/۴۹۰ والإصابه في تمییز الصحابة: ۸/۲۶۱

آپ ؓ کی پیدائش پر حضور ﷺ نے اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا بیان کی اور اللہ تعالیٰ کی اِس عطا پر اُس کا شکر ادا کیا۔ جب حضرت خدیجہ ؓ لڑکی کی پیدائش پر اپنے خاوند ﷺ کو خوشی سے سرشار چہرہ کے ساتھ دیکھتیں تو خوشی سے سرشار ہو جاتیں۔ [1]

تبلیغِ دین میں آپ ﷺ کی معاونت کرنا:

حضرت مُنیب اَزدی ؓ کہتے ہیں: میں نے زمانۂ جاہلیت میں رسول اللہ ﷺ کو دیکھا، آپ ﷺ کہہ رہے تھے: یا أَیُّھَا النَّاسُ! قُولُوا: لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ تُفلِحُوا ''لوگو! لا الٰہ الا اللہ کہہ لو کامیاب ہو جاؤ گے۔'' (اور مجمع تھا کہ نہایت ذلیل حرکتوں سے پیش آ رہا تھا۔ نعوذ باللہ) کوئی آپ ﷺ کے چہرۂ انور پر تھوک رہا تھا، کوئی آپ ﷺ کے بدنِ اطہر پر مٹی پھینک رہا تھا اور کوئی آپ ﷺ کی ذاتِ اقدس کو گالیاں دے رہا تھا، اِسی حال میں آدھا دن گزر گیا۔ اتنے میں ایک لڑکی پانی کا پیالہ لے کر آئی جس سے آپ ﷺ نے اپنے چہرے اور دونوں ہاتھوں کو دھویا اور فرمایا: یَا بُنَیَّةُ! لَا تَخشَيْ عَلٰی أَبِیکِ غِیلَةً، وَلَا ذِلَّةً ''بیٹی! نہ تو تم اپنے باپ کے اچانک قتل ہونے سے ڈرو اور نہ کسی قسم کی ذلت کا خوف رکھو۔''

میں نے پوچھا: یہ لڑکی کون ہے؟ لوگوں نے کہا: ''یہ زینب بنت رسول اللہ ﷺ ہے۔'' وہ روشن چہرے والی بچی تھیں۔ [2]

آپ سلامُ اللہ وَرضوانہ علیہا کی خدمت اور معاونت کا یہ واقعہ ایک دوسرے صحابی حضرت حارث بن حارث غامدی ؓ کی زبانی بھی منقول ہے جس میں انہوں نے اپنا مشاہدہ ذکر کیا ہے کہ لوگ آپ ﷺ کے گرد جمع تھے اور آپ ﷺ کو نعوذ باللہ ''صابی'' (نیا دین اختیار کرنے والے) شخص کہہ کر آپ ﷺ کی دعوت کو رد کر رہے تھے اور آپ ﷺ کو تکالیف پہنچانے میں مگن تھے جبکہ آپ ﷺ ان کو اللہ کی وحدانیت اور ایمان کی دعوت دینے میں مشغول تھے یہ سلسلہ دوپہر تک جاری رہا پھر ایک لڑکی (جس کے متعلق لوگوں نے بتایا کہ یہ زینب ہے) پانی کا بڑا پیالہ اور ایک رومال اٹھائے ہوئے آئی اور یہ چیزیں آپ ﷺ کی خدمت میں پیش کیں۔ آپ ﷺ نے پانی نوش فرمایا اور ہاتھ منہ

---

(۱) ابناء النبي صلی اللہ علیہ وسلم، والاقتباس المذکور من ترجمته إلی الأردیة الموسومة بـ ''خاندان نبوی کے چشم و چراغ''، ص: ۹۸،۹۹

(۲) مجمع الزوائد ومنبع الفوائد: ۶/۲۱، والتاریخ الکبیر للبخاري: ۸/۱۴

صاف کیا۔ پھر حضور ﷺ نے ان کو تسلی دیتے ہوئے فرمایا کہ بیٹی! ان حالات میں اپنے والد پر کسی قسم کا کوئی خوف نہ کرنا (اللہ تعالیٰ حامی و ناصر ہیں)۔[1]

نکاح:

سیدہ زینب رضی اللہ عنہا کی شادی، ابوالعاص[2] کے ساتھ ہوئی۔ یہ شادی اعلان نبوت سے قبل، کم سنی میں ہی ہوگئی تھی پھر جب آپ ﷺ نے نبوت کا اعلان کیا اور اسلام کی طرف دعوت دی تو حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ سیدہ زینب رضی اللہ عنہا بھی اسلام لے آئیں۔ مگر ابوالعاص اُس وقت اسی طرح مذہب قریش پر قائم رہا اور اسلام قبول نہ کیا۔[3] پھر بعد میں انہیں بھی اسلام نصیب ہوا جس کی تفصیل آگے آ رہی ہے۔

ابتداءِ اسلام میں چونکہ کافر اور مسلمان کا آپس میں نکاح درست تھا اس لیے ابوالعاص کے اسلام قبول نہ کرنے کے باوجود ان دونوں کا آپس میں نکاح برقرار رہا۔[4]

ان کی شادی کی داستان کچھ یوں ہے:

ابوالعاص مکہ مکرمہ کی اُن چندگنی چنی شخصیات میں سے تھے جو مال، امانتداری اور تجارت میں معروف تھیں۔ ایک دن حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے رسول اللہ ﷺ سے بات کی کہ زینب کا نکاح میرے بھانجے ابوالعاص سے کردیں۔

---

(۱) ینظر: مجمع الزوائد ومنبع الفوائد: ۲۱/۹ مع أسد الغابة ط العلمية: ۵۹۵/۱

(۲) ابوالعاص کا مختصر تعارف: ابوالعاص کے نام میں اختلاف ہے، راجح قول کے مطابق ان کا نام "لَقِیط" تھا۔ ان کا آبائی سلسلۂ نسب اس طرح ہے: لقیط بن ربیع بن عبدالعزیٰ بن عبدشمس بن عبدمناف۔ اور والدہ کی طرف سے نسب یہ ہے: ہالہ بنت خویلد بن اسد بن عبدالعزیٰ بن قُصَیّ۔ اس لحاظ سے وہ ام المومنین حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے سگے بھانجے تھے کہ ان کی والدہ "ہالہ بنت خُوَیلِد" حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کی حقیقی بہن تھیں۔ لہٰذا حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا ان کی خالہ اور حضرت زینب رضی اللہ عنہا ان کی خالہ زاد بہن ہوئیں۔

ان کو "جِروُ البطحاء" (یعنی کشادہ زمین والا) کے لقب سے یاد کیا جاتا تھا۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے زمانۂ خلافت میں، ذی الحجہ ۱۲ ہجری میں ان کا انتقال ہوا۔ ملاحظہ ہو: (الاستیعاب في معرفة الأصحاب: ۱۳۳۹/۳، و ۱۷۰۴/۴ مع ذخائر العقبی في مناقب ذوي القربی ص: ۱۵۷ وأنساب الأشراف للبلاذري: ۳۹۷/۱، والمنتخب من ذيل المذيل ص: ۸

(۳) أنساب الأشراف للبلاذري: ۳۹۷/۱ مع الطبقات الكبرى: ۲۵/۸، وسیرت فاطمة الزهراء، ص: ۴۳

(۴) بنات اربعہ، ص: ۱۲۴، ۱۲۵، رقم الحاشية: ۱

آپ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت خدیجہؓ کی رائے کی مخالفت نہیں کرتے تھے، چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بات کو قبول فرمالیا[1]۔ اور ابوالعاص کے ساتھ نکاح کے متعلق حضرت زینبؓ کی رضامندی معلوم کرنے کے بعد نکاح کا حتمی فیصلہ فرمادیا۔ اس کے بعد سب شادیوں کی تیاریوں میں مصروف ہوگئے۔ اس شادی کی خبر مکہ اور اس کے گردونواح میں پھیل چکی تھی۔ اہل واقارب اور دوست احباب سب شادی میں شریک تھے، جانور ذبح کیے گئے، دسترخوان بچھائے گئے۔ شادی میں مکہ کے لوگوں کے ساتھ دوسرے علاقوں کے لوگ بھی شریک تھے۔ پھر حضرت زینبؓ اپنے سسرال تشریف لے گئیں۔ (حضرت خدیجہؓ ابوالعاص کو بالکل اپنے بیٹے کی طرح سمجھتی تھیں یعنی ان کو بیٹے والی محبت اور پیار دیتی تھیں۔)[2]

حضرت زینبؓ، ابوالعاص کے ساتھ خوشگوار زندگی گزار رہی تھیں، ابوالعاص تجارت کیا کرتے تھے۔ وہ سوق حباشہ، سرزمین شام اور جزیرہ کے مختلف علاقوں کی طرف تجارتی سفر کیا کرتے تھے۔ ان کے سفر کے دوران حضرت زینبؓ اپنی خالہ (ہالہ ام ابی العاص) کے پاس ٹھہرتیں، اور کئی مرتبہ یہ دونوں خواتین، سیدہ خدیجہؓ کے گھر چلی جاتیں۔[3]

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک صاحبزادی، ابولہب کے بیٹے ''عُتبہ'' کے نکاح میں تھی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے قریش کو جب دعوتِ اسلام دینا شروع کی تو ایک دن وہ آپس میں کہنے لگے: تم لوگوں نے محمد کو غم وفکر سے آزاد کررکھا ہے، ایسا کرو کہ اس کی بیٹیاں چھوڑ دو اور اسے انہی بیٹیوں کے معاملہ میں الجھادو۔ اس پر ابولہب نے اپنے بیٹے عتبہ سے کہا کہ محمد کی بیٹی کو طلاق دے دو، اس نے رخصتی سے پہلے ہی طلاق دے دی۔ پھر وہ سب جمع ہوکر ابوالعاص کے پاس گئے اور انہیں کہا کہ اپنی بیوی کو چھوڑ دو، اس کے بدلہ میں قریش کی جس عورت سے بھی کہو گے ہم اس سے تمہاری شادی کرادیں گے۔

---

(۱) البدایۃ والنہایۃ طھجر: ۵/۲۰۵

(۲) سیرۃ ابن ہشام ت السقا: ۱/۶۵۱

(۳) أبناء النبي صلى الله عليه وسلم، والاقتباس المذكور مستفاد من ترجمته إلى الأردية الموسومة بـ ''خاندان نبوی کے چشم وچراغ''، ص: ۱۰۰، ۱۰۱

ابوالعاص نے جواب دیا: لَا، وَاللهِ! لاأُفَارِقُ صَاحِبَتِي فَإِنَّهَا خَيْرُ صَاحِبَةٍ. وَمَا يَسُرُّنِي أَنَّ لِي بِامْرَأَتِي أَفْضَلَ امْرَأَةٍ مِنْ قُرَيْشٍ ''میں اپنی اس بیوی کو ہرگز نہیں چھوڑ سکتا، یہ بہت اچھی خاتون ہے۔ اس کے مقابلہ میں تم قریش کی سب سے اعلیٰ وافضل خاتون ہی کیوں نہ لے آؤ تو بھی مجھے وہ پسند نہیں ہے''۔ ابوالعاص کے اس طرزِ عمل سے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو خوشی ہوئی اور اس معاملہ میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ابوالعاص کی تعریف بھی فرمایا کرتے تھے۔[1]

ابوالعاص کی گرفتاری اور بطورِ فدیہ حضرت زینب رضی اللہ عنہا کا ہار بھیجنا:

رمضان المبارک ۲ ہجری میں جنگِ بدر ہوئی جس میں کفارِ مکہ کو کھلی شکست ہوئی۔ اس میں جہاں اُن کے بہت سے سردار مارے گئے وہاں ایک بڑی تعداد مسلمانوں کے ہاتھوں گرفتار ہوئی اور مدینہ طیبہ لائی گئی۔ ان قیدیوں میں ابوالعاص بھی تھے، انہیں ایک انصاری صحابی عبداللہ بن جبیر رضی اللہ عنہ نے گرفتار کیا (یہ وہی جلیل القدر صحابی ہیں جو غزوۂ احد میں جبلِ رُماۃ پر متعین دستے کے امیر تھے، اور بڑی جانبازی کے ساتھ لڑتے ہوئے جامِ شہادت نوش کیا تھا)۔ جب یہ خبر، مکہ پہنچی تو اہلِ مکہ سخت پریشان ہوئے اور اپنے اپنے رشتہ داروں کو قید سے چھڑانے کیلیے، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس فدیوں کی رقم بھیجنے لگے۔

حضرت زینب رضی اللہ عنہا نے بھی اپنے شوہر کو چھڑانے کیلیے اپنے دیور ''عمرو بن ربیع'' کے ہاتھ بطورِ فدیہ وہ ہار بھیجا جو حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے سیدہ زینب رضی اللہ عنہا کی شادی کے موقع پر رخصتی کے وقت آپ سلام اللہ ورضوانہ علیہا کو دیا تھا۔ ابوالعاص کی رہائی کیلیے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس جب یہ ہار پیش کیا گیا تو اسے دیکھ کر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پہچان گئے (کہ یہ وہی ہار ہے جو حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے صاحبزادی زینب رضی اللہ عنہا کو بوقتِ رخصتی پکڑایا تھا اور آج وہی ہار میری بیٹی نے میرے پاس بھیجا ہے تاکہ اس کا شوہر اپنے بال بچوں میں پہنچ سکے) اور بس پھر (بلا اختیار) آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر بہت زیادہ رقت طاری ہوگئی، آنکھوں میں آنسو آگئے اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اپنی ہمدرد اور بہترین رفیقۂ حیات حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا یاد آگئیں۔ اس پر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صحابہ رضی اللہ عنہم سے فرمایا: إِنْ رَأَيْتُمْ أَنْ تُطْلِقُوا لَهَا أَسِيرَهَا وَتَرُدُّوا عَلَيْهَا الَّذِي لَهَا فَافْعَلُوا ''اگر تم مناسب سمجھوتو

---

(1) البداية والنهاية ط الفكر: ۳/۳۱۱مع سيرة ابن هشام: ۱/۶۵۱، وذخائر العقبى في مناقب ذوي القربى ص: ۱۵۷، وأنساب الأشراف للبلاذري: ۱/۳۹۷

زینبؓ کے قیدی (ابو العاص) کو رہا کر دو اور اُس کا یہ ہار بھی اُسے واپس بھیج دو۔‘‘ صحابہ کرامؓ تو آپ ﷺ کی خوشی کیلیے سب کو کچھ قربان کرنے والے تھے اس لیے انہوں نے فوراً عرض کی: جی ہاں! یا رسول اللہ! ہم یہ سب کچھ کر دیتے ہیں، چنانچہ بغیر کوئی فدیہ لیے حضور ﷺ نے ابو العاص کو رہا کر دیا، البتہ یہ شرط لگائی کہ وہ واپس پہنچ کر زینبؓ (جو کہ اب تک وہیں اس کے پاس مکہ میں تھیں) کو مدینہ منورہ بھیج دے گا۔ مکہ مکرمہ پہنچ کر ابو العاص نے وہ وعدہ وفا کیا اور حضرت زینبؓ کو مدینہ طیبہ روانہ کر دیا (جس کا قصہ ذیل میں آ رہا ہے)۔ اس پر حضور ﷺ نے فرمایا تھا: حَدَّثَنِي فَصَدَقَنِي، وَوَعَدَنِي فَوَفَى لِي ’’اس نے مجھ سے کہی ہوئی اپنی بات پوری کی اور اپنا وعدہ بھی وفا کیا‘‘۔[1]

مدینہ طیبہ کی طرف ہجرت:

ابو العاص جب مدینہ طیبہ سے رہا ہو کر مکہ مکرمہ پہنچا، تو اس نے حسبِ وعدہ سیدہ زینبؓ کو اپنے والد (ﷺ) کے پاس جانے کی اجازت دے دی۔ آپ سَلامُ اللہِ وَرِضْوانُہٗ علیہا نے سفر کی تیاری شروع کر دی، جب تیاری مکمل ہو گئی تو ابو العاص کے بھائی ’’کِنانہ بن ربیع‘‘ ان کے پاس اونٹ لے کر آ گئے، حضرت زینبؓ کجاوہ میں سوار ہوئیں، ’’کِنانہ‘‘ نے کمان اور ترکش لیا اور آپؓ کو سواری پر بٹھا کر خود آگے آگے چلنے لگا۔ جب قریش کے لوگوں کو پتا چلا کہ محمد (ﷺ) کی بیٹی زینب، دن دِہاڑے ہجرت کر کے مدینہ جا رہی ہے تو انہوں نے آپؓ کا تعاقب کیا یہاں تک کہ مقامِ ’’ذی طُویٰ‘‘ پر ان دونوں کو جا گھیرا۔ سب سے پہلے جو شخص سیدہ زینبؓ کی طرف جارحانہ بڑھا وہ ’’ہَبّار بن اَسوَد‘‘[2] تھا۔ آپؓ کجاوے میں بیٹھی تھیں کہ اُس نے نیزے برسا کر سیدہ زینبؓ کو خوفزدہ کیا جس سے آپؓ کا حمل ساقط ہو گیا (اور ایک روایت کے مطابق اس نے آپؓ کے اونٹ کو بھی بِدکایا، جس سے نعوذ باللہ آپؓ نیچے گریں اور ایک پسلی بھی ٹوٹ گئی)۔[3]

اس پر ’’کِنانہ‘‘ نے اپنا ترکش سنبھالا اور غضبناک ہو کر کہا: وَاللهِ لَا يَدْنُو مِنِّي رَجُلٌ إِلَّا وَضَعْتُ فِيهِ سَهْمًا ’’اللہ

---

(۱) ینظر: أسد الغابة: ۶/ ۱۸۲ مع الطبقات الكبرى: ۸/ ۲۶، والبداية والنهاية ط الفكر: ۳/ ۳۱۲

(۲) فائدہ: ’’ہبار بن اسود‘‘ نے فتح مکہ کے وقت اسلام قبول کر لیا تھا، اور اپنی سابقہ غلطیوں کا اعتراف کر کے آپ ﷺ سے معافی مانگی تھی۔ آپ ﷺ نے ان کا اسلام قبول فرما لیا تھا اور انہیں معاف بھی کر دیا تھا۔ ساتھ ہی یہ بھی ارشاد فرمایا تھا کہ اسلام پچھلے تمام گناہ مٹا دیتا ہے۔ تفصیل کیلیے ملاحظہ ہو: (الإصابة في تمييز الصحابة: ۶/ ۴۱۲، وأنساب الأشراف للبلاذري: ۱/ ۳۹۸

(۳) أنساب الأشراف للبلاذري: ۱/ ۳۹۸

کی قسم! جو شخص بھی میرے قریب آئے گا، میں اُسے اِن تیروں سے چھلنی کر دوں گا"۔ یہ دیکھ کر لوگ پیچھے ہٹ گئے اتنے میں ابوسفیان قریش کی ایک جماعت لیے آیا اور آگے بڑھ کر کہا: ارے نوجوان! اپنے تیر روکو اور ہماری ایک بات سن لو۔ اس پر کنانہ نے ترکش نیچے کر دیا، ابوسفیان نے قریب ہو کر کہا: دیکھو، یہ تم ٹھیک نہیں کر رہے کہ تم محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی بیٹی کو اس طرح سب لوگوں کے سامنے کھلم کھلا اس کے باپ کے پاس لے کر جا رہے ہو، حالانکہ تمہیں معلوم ہے کہ ہمیں ابھی حال ہی میں (جنگِ بدر میں) محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ہاتھوں کس قدر مصیبت و ذلت کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ جب تم اُس کی بیٹی کو ہماری موجودگی میں اس طرح برسرِ عام لے کر چلے جاؤ گے تو لوگ اس کو ہماری ذلت اور ضعف و بزدلی کی علامت سمجھیں گے۔ دیکھو! میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ ہمیں اُسے اُس کے باپ سے روکنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے اور نہ ہی ہم کوئی بدلہ لینا چاہتے ہیں، لیکن فی الحال تم اسے واپس لے کر مکہ آ جاؤ، تاکہ لوگ سمجھیں کہ اسے ہم نے مدینہ جانے سے واپس کر دیا ہے، پھر کسی وقت چپکے سے تم اسے لے کر چلے جانا۔ کنانہ نے ابوسفیان کی یہ بات مان لی اور آپ سلام اللہ و رضوانہ علیہا کو لے کر واپس مکہ مکرمہ چل دیا۔

جب قریش کے یہ لوگ حضرت زینب رضی اللہ عنہا کو مکہ لوٹا کر، خود واپس آ رہے تھے تو راستے میں ہند بنت عتبہ (جس کو اس سارے واقعہ کا علم ہو چکا تھا) سے ان کی ملاقات ہوگئی۔ ہند کو ان پر غصہ آیا، وہ ان کا مذاق اڑانے لگی اور انہیں ملامت کرتے ہوئے کہا:

أَفِي السِّلْمِ أَعْيَارٌ جَفَاءً وَغِلْظَةً... وَفِي الْحَرْبِ أَشْبَاهُ النِّسَاءِ الْعَوَارِكِ

(امن کے وقت، سخت اور ظالم گدھے بن جاتے ہو... اور جنگ میں حائضہ عورتوں کے مثل ہو جاتے ہو؟) یعنی ایک عورت کے خلاف معرکہ جیت کر اب فاتح بن کے دکھلا رہے ہو، یہ بہادری جنگِ بدر میں کہاں گئی تھی۔۔۔؟

بہر حال اس وقت تو حضرت زینب رضی اللہ عنہا کو واپس کر دیا گیا پھر بعد میں رات کے وقت کنانہ نے آپ رضی اللہ عنہا کو مکہ سے باہر حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ اور ان کے ساتھی کے حوالہ کر دیا (جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے آپ رضی اللہ عنہا کو لینے کیلیے مدینہ طیبہ سے آئے ہوئے تھے[1])۔ ان دونوں حضرات نے عزت و احترام کے ساتھ آپ رضی اللہ عنہا کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس مدینہ منورہ

---

(1) سيرة ابن هشام ت السقا: ١/ ٦٥٣، وأنساب الأشراف للبلاذري: ١/ ٣٩٧

پہنچا دیا۔[1] یہ غزوۂ بدر کے تقریباً ایک ماہ بعد کا واقعہ ہے۔[2]

اس طرح حضرت زینب رضی اللہ عنہا مدینہ طیبہ پہنچ کر اپنے بچوں کے ساتھ اپنے والدِ بے مثل صلی اللہ علیہ وسلم کی سرپرستی میں زندگی گزارنے لگیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ان سے ملاقات کرتے، اپنے نواسے اور نواسی کو پیار کرتے (جیسا کہ آگے اس کا تذکرہ آرہا ہے)۔[3]

ابو العاص کو پناہ دینا اور ان کا اسلام قبول کرنا:

حضرت زینب رضی اللہ عنہا جب ہجرت کر کے مدینہ طیبہ پہنچیں تو ابو العاص کو اُسی طرح حالتِ شرک پر چھوڑ آئی تھیں۔ وہ ایک عرصہ تک شرک پر قائم رہا یہاں تک کہ فتح مکہ سے پہلے وہ قریشِ مکہ کا مال لے کر تجارت کی غرض سے شام روانہ ہوا۔ جب وہ مالِ تجارت خرید کر واپس آرہا تھا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اطلاع ملی کہ وہ تجارتی قافلہ شام سے روانہ ہو چکا ہے چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ کی قیادت میں، اُن کی جانب ایک سو ستر گھڑسوار مجاہدین کا لشکر روانہ فرما دیا۔ اُس لشکر نے مقامِ ''عیص'' (جو مدینہ منورہ سے چار میل کے فاصلے پر ہے[4]) کے پاس اس قافلہ کو گھیر لیا یہ جمادی الاولیٰ ۶ ہجری کا واقعہ ہے۔ اس لشکر نے کامیابی کے ساتھ قافلے کے سب سامان پر قبضہ کر لیا، اور لوگوں کو گرفتار کر لیا مگر ابو العاص کسی طرح بچ کر مدینہ طیبہ بھاگ نکلے۔ اِدھر وہ لشکر اس مقبوضہ سامان و افراد کو لے کر مدینہ منورہ پہنچا، اُدھر ابو العاص رات کے کسی وقت حضرت زینب رضی اللہ عنہا کے پاس آ پہنچے اور اُن سے پناہ طلب کی، آپ سلام اللہ و رضوانہ علیہا نے پناہ دے دی۔

اگلی صبح جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم فجر کی نماز سے فارغ ہو چکے تو حضرت زینب رضی اللہ عنہا نے اپنے دروازے پر کھڑے ہو کر قدرے

---

(۱) البداية والنهاية ط هجر: ۵/۲۶۴، وتاريخ الخميس: ۱/۳۹۱، مع الاكتفاء بما تضمنه من مغازي رسول الله - صلى الله عليه وسلم - والثلاثة الخلفاء: ۱/۳۵۲

(۲) الروض الأنف: ۵/۱۳۰، والسيرة النبوية لابن كثير: ۲/۵۱۶، والسيرة النبوية كما جاءت في الأحاديث الصحيحة: ۲/۱۴۷، وإنارة الدجى في مغازي خير الورى صلى الله عليه وآله وسلم، ص: ۱۷۷

(۳) أبناء النبي صلى الله عليه وسلم، والاقتباس المذكور مستفاد من ترجمته إلى الأردية الموسومة بـــ ''خاندان نبوی کے چشم وچراغ''، ص: ۱۱۳

(۴) ينظر: تعليق الطهطاوي على السمط الثمين، ص: ۲۳۸، رقم الحاشية: ۳

بلند آواز میں کہا: أَيُّهَا النَّاسُ! إِنِّي قَدْ أَجَرْتُ أَبَا الْعَاصِ بْنَ الرَّبِيعِ ''لوگو! میں نے ابوالعاص بن ربیع کو پناہ دے دی ہے''۔ آپ ﷺ نے صحابہ کرامؓ کی طرف متوجہ ہو کر کہا: کیا آپ لوگوں نے یہ آواز سنی ہے جو میں سن رہا ہوں؟ انہوں نے عرض کی: جی ہاں! آپؐ نے فرمایا: اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں میری جان ہے! مجھے بھی پہلے اس بات کا کوئی علم نہیں تھا، میں بھی ابھی سن رہا ہوں۔ پھر آپ ﷺ نے بطورِ ضابطہ کے فرمایا: مسلمانوں کو غیر مسلموں پر قدرت واختیار حاصل ہے، ایک ادنیٰ مسلمان بھی غیر مسلم کو پناہ دے سکتا ہے۔ لہذا ہم نے بھی اسے پناہ دی جسے زینب نے پناہ دی ہے۔

اس کے بعد حضور ﷺ حضرت زینبؓ کے گھر تشریف لے گئے اور ان سے فرمایا: أَيْ بُنَيَّةُ! أَكْرِمِي مَثْوَاهُ، وَلَا يَخْلُصَنَّ إِلَيْكِ، فَإِنَّكِ لَا تَحِلِّينَ لَهُ ''پیاری بیٹی! ان کا اکرام کرنا، البتہ یہ تیرے قریب نہ آئے کیونکہ اب تم اس کیلیے حلال نہیں رہی''[1] سیدہ زینبؓ نے کہا: یہ درخواست کر رہے ہیں کہ ان کا مال انہیں واپس کر دیا جائے۔ آپ ﷺ باہر تشریف لائے اور اُس لشکر کو پیغام بھجوایا کہ وہ سب جمع ہو جائیں۔ آپ ﷺ نے اس لشکر کے مجاہدین سے مخاطب ہو کر فرمایا: ''اِس شخص (ابوالعاس) کا ہم سے تعلق ہے جیسا کہ تمہیں بخوبی معلوم ہے۔ تم لوگوں نے اس کا مال حاصل کیا ہے، یہ مالِ غنیمت بلاشبہ اللہ نے تمہیں دیا ہے، لیکن میری چاہت یہ ہے کہ تم اس کے ساتھ احسان والا معاملہ کرو اور اس کا مال اسے واپس کر دو، اگر تم واپس نہ کرو تو تمہیں اس کا حق ہے۔''

صحابہ کرامؓ تو اپنی ہر چاہت کو حضور ﷺ کی چاہت پر قربان کرنا اپنی سعادت سمجھتے تھے، چنانچہ انہوں نے عرض کی: یا رسول اللہ! ہماری طرف سے سارا مال حاضر ہے اور اس کا مال اسے واپس کر دیا حتی کہ کوئی پانی کا مشکیزہ لے کر آ رہا تھا تو کوئی رسی اٹھائے ہوئے تھا، الغرض چھوٹا بڑا سارا سامان واپس کر دیا اور معمولی سی کوئی چیز بھی نہیں بچا رکھی۔

ابوالعاص جب یہ سامان لیے مکہ معظمہ پہنچا تو قریش کے جس جس آدمی نے اس کو تجارت کیلیے مال دے کر بھیجا تھا اُس کو اُس کا مال واپس کر دیا۔ جب تمام اشخاص کا مال لوٹا دیا تو اُس نے سب سے مخاطب ہو کر کہا: اے اہلِ قریش!

---

(1) فائدہ: اس لیے حلال نہیں رہی کہ صلح حدیبیہ کے سال، ۶ ہجری میں اللہ تعالیٰ نے مسلمان عورتوں کو مشرکین پر حرام قرار دے دیا تھا، جبکہ اس سے پہلے مشرک اور مومنہ کا آپس میں نکاح درست ہوتا تھا اور وہ ایک دوسرے کیلیے حلال ہوتے تھے۔ ملاحظہ ہو: (البداية والنهاية ط الفكر: ۳/۳۱۲، مع بنات اربعہ، ص: ۱۲۴، رقم الحاشية: ۱

تم میں سے کسی کا کوئی مال رہ تو نہیں گیا جو اُس نے وصول نہ کیا ہو؟ سب کہنے لگے: ابو العاص! اللہ آپ کو جزائے خیر دے، ہمارے نزدیک تم بڑے شریف اور وفادار شخص ہو۔ اس کے بعد ابو العاص نے علی الاعلان اسلام قبول کیا اور کہا: أَشْهَدُ أَنْ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللہُ، وَأَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُولُهٗ۔ پھر کہا: رب ذو الجلال کی قسم! مجھے وہاں مدینہ میں اسلام قبول کرنے کیلیے اس کے علاوہ کوئی بات رکاوٹ نہیں تھی کہ تم سمجھو گے کہ ہمارا مال کھا (کر مسلمان ہو) گیا ہے۔ جب اللہ تعالیٰ نے تمہارے اموال تم تک پہنچا دیے ہیں تو اب میں نے اسلام قبول کرلیا ہے۔

پھر وہاں سے نکلے اور سیدھے مدینہ طیبہ میں دربارِ نبوت میں حاضرِ خدمت ہوئے۔[1] یہ محرم، ۷ ہجری کا واقعہ ہے۔
[2] اور بعض کے نزدیک ابو العاص کے اسلام لانے کا واقعہ، فتح مکہ سے کچھ قبل، ۸ ہجری میں پیش آیا تھا۔[3]

جب یہ مسلمان ہوکر مدینہ طیبہ آئے تو آپ ﷺ نے اپنی صاحبزادی سیدہ زینب رضی اللہ عنہا کو، دوبارہ نکاح کرائے بغیر، اُسی سابقہ نکاح پر ہی ابو العاص کو واپس کر دیا،[4] اگرچہ بعض حضرات کہتے ہیں کہ آپ ﷺ نے دوبارہ نکاح کرانے کے بعد واپس کیا تھا۔[5]

اولاد:

آپ سلام اللہ و رضوانہ علیہا کی اولاد میں دو بچے تھے جو حضرت ابو العاص رضی اللہ عنہ سے پیدا ہوئے تھے: ایک بیٹا اور ایک بیٹی۔
بیٹے کا نام ''علی'' تھا، ان کو ابو العاص نے دودھ پینے کیلیے قبیلہ بنو غاضرہ میں بھیج رکھا تھا۔ شیر خوارگی سے فارغ ہونے کے بعد رسول اللہ ﷺ نے ان کو مدینہ طیبہ منگوا کر اپنے ساتھ ملا لیا تھا، اور یہ آپ ﷺ کے زیرِ تربیت پرورش پاتے رہے۔ آپ ﷺ ان پر خصوصی شفقت فرماتے حتی کہ فتح مکہ کے موقع پر جب آپ ﷺ مکہ معظمہ میں فاتحانہ

---

(۱) مستفاد من مجموعة ما يلي: ذخائر العقبى ص: ۱۵۸، والبداية والنهاية ط هجر ۵/۲۶۸، والسمط الثمين، ص: ۲۳۸، والمنتخب من ذيل المذيل ص: ۷ والطبقات الكبرى ط العلمية ۸/۲۷، ودلائل النبوة للبيهقي ۴/۸۶

(۲) سبل الهدى والرشاد في سيرة خير العباد: ۱۱/۳۱، والمواهب اللدنية بالمنح المحمدية ۱/۴۷۹

(۳) البداية والنهاية ط هجر ۵/۲۶۹

(۴) البداية والنهاية ط هجر: ۵/۲۷۰، وسبل الهدى والرشاد: ۱۱/۳۰ وزواج أبي العاص بزينب بنت الربيع ص: ۱۰،۷

(۵) أسد الغابة ط العلمية: ۶/۱۸۲، وأنساب الأشراف للبلاذري: ۱/۳۹۹

داخل ہوئے تو آپ ﷺ نے ان کو اپنی سواری پر اپنے پیچھے بٹھا رکھا تھا، مگر یہ زیادہ عمر تک زندہ نہ رہ سکے اور حضور ﷺ کی زندگی میں ہی، بلوغت سے پہلے انتقال کر گئے۔[1]

بیٹی کا نام ''اُمامہ'' تھا۔[2] رسول اللہ ﷺ اُمامہ سے بہت ہی زیادہ پیار کرتے تھے، آپ ﷺ بسا اوقات ان کو اپنے کندھے پر اٹھائے ہوئے مسجد میں تشریف لاتے،[3] حتی کہ بعض دفعہ باجماعت فرض نماز میں بھی آپ ﷺ ان کو اپنے کندھے پر اٹھائے نماز پڑھاتے تھے۔ جب آپ رکوع وسجدہ کیلیے جھکتے تو ان کو اتار دیتے پھر جب قیام کیلیے اٹھتے تو انہیں پھر اپنے اوپر بٹھا لیتے۔[4] ایک مرتبہ آپ ﷺ کے پاس ہدیہ میں ایک قیمتی ہار آیا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: لَأَدْفَعَنَّهَا إِلَى أَحَبِّ أَهْلِي إِلَيَّ ''یہ ہار میں اپنے اہلِ خانہ میں سے اپنے سب سے محبوب فرد کو دوں گا''۔ سب نے کہا: یہ ہار حضرت عائشہؓ کو ملے گا۔ اُمامہ بنت زینب گھر کے اندر ایک طرف مٹی کے ساتھ کھیل رہی تھیں، آپ ﷺ نے انہیں بلایا اور یہ ہار ان کے گلے میں پہنا دیا۔[5]

اسی طرح ایک دفعہ شاہِ حبشہ ''نجاشی'' کی طرف سے حضور ﷺ کی خدمت میں ہدیہ آیا، اُس میں سونے کی ایک انگوٹھی بھی تھی۔ آپ ﷺ نے چند انگلیوں کے پوروں سے، بے التفاتی کے ساتھ، وہ انگوٹھی اٹھائی، پھر اپنی نواسی زینب بنت ابی العاص کو بلایا اور یہ انگوٹھی اُسے دیتے ہوئے فرمایا: میری ننھی منی اور پیاری بیٹی! یہ تو پہن لے۔[6]

آپؓ کی شادی حضرت علیؓ سے ہوئی تھی جس کا قصہ یہ ہے کہ حضرت فاطمۃ الزہراء نے حضرت علیؓ کو وصیت کی تھی کہ میرے انتقال کے بعد میری بھانجی ''اُمامہ'' سے نکاح کر لینا، چنانچہ بمطابق وصیت حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے حضرت فاطمہؓ کی وفات کے بعد حضرت امامہؓ سے نکاح فرما لیا تھا مگر اُن کی کوئی اولاد نہ ہو سکی جس سے حضرت

---

(۱) سبل الهدى والرشاد ۱۱/ ۳۱، مع أسد الغابة: ۴/ ۱۱۸، ورحمة للعالمين: ۲/ ۳۶۰

(۲) سبل الهدى والرشاد ۱۱/ ۳۱، والمواهب اللدنية بالمنح المحمدية ۱/ ۴۷۹

(۳) صحيح البخاري: ۸/ ۷، مع ذخائر العقبى في مناقب ذوي القربى ص: ۱۶۱

(۴) صحيح مسلم: ۱/ ۳۸۶، مع مسند أحمد: ۳۲۶/ ۳۷، وسنن أبي داود: ۱/ ۲۴۲

(۵) مسند أحمد: ۲۳۲/ ۴۱، والطبقات الكبرى: ۸/ ۳۲، مع مجمع الزوائد: ۹/ ۲۵۴ واہل بیت کا مختصر تعارف، ص: ۲۴

(۶) مسند أحمد: ۳۷۳/ ۴۱، والطبقات الكبرى: ۸/ ۳۲

زینبؓ کی نسل بھی آگے نہ چل سکی۔ پھر جب حضرت علیؓ کوفہ میں شہید کر دیے گئے تو یہ بیوہ ہو گئیں۔ اس کے بعد حضرت مغیرہ بن نوفلؓ کے نکاح میں آئیں، اور انہی کے نکاح میں انتقال فرمایا۔[2]

لباس:

ریشم سے بنے ہوئے لباس کا استعمال چونکہ خواتین کیلیے جائز ہے اس لیے آپ سلام اللہ ورضوانہ علیہا بعض مرتبہ ریشم کا لباس بھی زیب تن فرماتی تھیں جو کہ بہت قیمتی ہوتا ہے، چنانچہ رسول اللہ ﷺ کے خادمِ خاص حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ میں نے سیدہ زینبؓ پر ریشم کی ایک دھاری دار چادر دیکھی جو انہوں نے پہن رکھی تھی،[3] اور اسی طرح یہ بھی فرماتے ہیں کہ میں نے ان پر ریشم کی دھاری دار قمیص بھی دیکھی تھی۔[4]

وفات:

آپؓ نے ۸ ہجری کے آغاز میں انتقال فرمایا،[5] اور تقریباً تیس برس عمر پائی۔[6] آپؓ کا یہ انتقال وہیں مدینہ طیبہ میں اپنے شوہر حضرت ابو العاص رضی اللہ عنہ کے پاس ہوا۔[7]

آپؓ کی وفات کا سبب کیا تھا؟ اس بارے میں مؤرخین لکھتے ہیں کہ آپؓ جب مکہ مکرمہ سے مدینہ طیبہ کی طرف ہجرت کر کے آ رہی تھیں تو راستے میں ہبار بن اسود نے ایک آدمی کے ساتھ مل کر آپؓ پر حملہ کیا جس میں ان دونوں میں سے کسی ایک نے آپؓ کو (نعوذ باللہ) زور سے دھکا دیا جس سے آپؓ چٹان پر آ گریں اور خون جاری ہو گیا۔

---

(۱) ذخائر العقبى في مناقب ذوي القربى ص: ۱۶۱، مع سبل الهدى والرشاد ۱۱/۳۱

(۲) اسد الغابة: ۵/۲۳۰، مع الإصابة في تمييز الصحابة ۸/۲۵

(۳) الطبقات الكبرى ط العلمية: ۸/۲۷، و المعرفة والتاريخ ۳/۱۶۳

(۴) سنن النسائي ۸/۱۹۷

(۵) السمط الثمين، ص: ۲۳۹ و زواج أبي العاص بزينب بنت الربيع ص: ۱۳

(۶) بنات اربعہ، ص: ۱۶۱

(۷) اسد الغابة ط العلمية: ۷/۱۳۱، مع المواهب اللدنية [illegible]

کچھ لوگوں نے اٹھا کر آپ رضی اللہ عنہا کو ابوسفیان کے پاس پہنچا دیا، پھر بنو ہاشم کی بعض عورتیں اُس کے پاس آئیں تو اس نے آپ رضی اللہ عنہا کو ان عورتوں کے حوالے کر دیا تھا۔

بعد میں آپ رضی اللہ عنہا ہجرت کر کے مدینہ منورہ اگرچہ آ گئی تھیں مگر یہ تکلیف بدستور برقرار رہی، بالآخر یہی تکلیف وفات کا سبب بنی اور آپ رضی اللہ عنہا اس دارِ فانی سے کوچ کر گئیں۔[1]

وفات پر صبر کی تلقین نبوی:

جب سیدہ زینب رضی اللہ عنہا کا انتقال ہو گیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''(زینب!) تُو ہمارے بہترین پیش رَو ''عثمان بن مظعون رضی اللہ عنہ'' کے ساتھ شامل ہو جا (کہ عثمان بن مظعون اِن سے پہلے انتقال فرما کر جنت البقیع میں مدفون تھے)۔''

سیدہ رضی اللہ عنہا کے انتقال کی خبر پر خواتین بلا اختیار رونے لگیں اور چیخ و پکار تک نوبت جا پہنچی، یہ دیکھ کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ انہیں سختی سے منع کرنے لگے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو روکا اور اس طرح سختی کرنے سے منع کر دیا۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان عورتوں سے فرمایا: ابْكِينَ، وَإِيَّاكُنَّ وَنَعِيقَ الشَّيْطَانِ ''روؤ سہی، مگر شیطانی آواز نکالنے سے (یعنی چیخ و پکار کے ساتھ رونے سے) اجتناب کرو۔''

اور مزید وضاحت کیلیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے یہ بھی فرمایا:

''(اس موقع پر) جو کچھ آنکھ اور دل سے صادر ہو رہا ہوتا ہے (یعنی آنکھ کا آنسو بہانا اور دل کا غمگین ہونا) وہ تو اللہ کی طرف سے ہوتا ہے نیز اُس انسان کے نرم دل ہونے کی علامت ہوتا ہے، البتہ جو کچھ ہاتھ اور زبان سے صادر ہو رہا ہوتا ہے (یعنی ہاتھ سے سینہ وغیرہ پیٹنا اور زبان سے چیخ و پکار کرنا) وہ شیطان کی طرف سے ہوتا ہے۔''[2]

غسل سے تدفین تک کے مراحل:

وفات کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نگرانی میں آپ رضی اللہ عنہا کے غسل کا انتظام شروع کر دیا گیا، ام المومنین حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا، حضرت سودہ بنت زمعہ رضی اللہ عنہا اور حضرت ام ایمن رضی اللہ عنہا جیسی عظیم خواتین نے آپ رضی اللہ عنہا کو غسل دیا۔[3] بعض روایات کے مطابق

---

(1) مجمع الزوائد ومنبع الفوائد: ۹/۲۱۶، مع الاستيعاب في معرفة الأصحاب: ۴/۱۸۵۴

(2) ینظر: مسند أحمد ط الرسالة ۴/۳۱، مع بنات اربعہ، ص: ۱۴۳

(3) أنساب الأشراف ط الثمین، ص: ۲۳۹ وأنساب الأشراف: ۱/۴۰۰، وسبل الهدى والرشاد: ۱۱/۳۱، مع الحاشية الآتية.

حضرت ام عَطِیّہ رضی اللہ عنہا بھی غسل میں شریک تھیں، چنانچہ وہ بیان کرتی ہیں:

جب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی صاحبزادی حضرت زینب رضی اللہ عنہا کا انتقال ہوا تو آپ ہمارے پاس تشریف لائے اور فرمایا: ''بیری کے پتوں اور پانی کے ساتھ (یعنی بیری کے پتے ڈال کر پکائے ہوئے نیم گرم پانی سے) ان کو غسل دو، اور طاق عدد میں غسل دینا: تین مرتبہ یا پانچ مرتبہ، یا ضرورت سمجھو تو اس سے بھی زیادہ، اور آخر میں کافور کی خوشبو لگا دینا۔ پھر جب غسل دے کر تم فارغ ہو چکو تم مجھے اطلاع کر دینا۔''

حضرت ام عَطِیّہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں: جب ہم فارغ ہو چکیں تو ہم نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اطلاع دی، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تشریف لائے اور اپنے تہ بند والی چادر ہمیں دی اور فرمایا کہ یہ چادر بھی اس کو پہنا دو۔[1] یہ تہ بند آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بطورِ تبرک دیا تھا تاکہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مبارک چادر کی برکت سے ان کو فائدہ ہو۔[2] ایک اور روایت میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت ام عطیہ رضی اللہ عنہا سے یہ بھی فرمایا تھا: ''اے ام عطیہ! میری بیٹی کو اچھی طرح کفن میں لپیٹنا، اس کے بالوں کی تین چوٹیاں بنانا اور اسے بہترین خوشبوؤں سے مُعطر کرنا۔''[3] حضرت ام عطیہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں: ہم نے آپ کے بالوں کی تین چوٹیاں بنائیں: ایک چوٹی آگے اور باقی دو، سر کے دائیں اور بائیں جانب۔ پھر ان تینوں چوٹیوں کو ہم نے ان کی پشت کی طرف ڈال دیا۔[4]

بہر حال جب غسل اور کفن ہو چکا تو حضرت اسماء بنت عُمیس نے کہا کہ میں اپنے شوہر کے ساتھ جب ملکِ حبشہ میں تھی تو میں نے وہاں دیکھا تھا کہ فوت ہونے والی عورت کی چار پائی کے اوپر ڈولی بنائی جاتی تھی تاکہ عورت کا بدن پوری طرح چھپا رہے، چنانچہ اُن کے اس مشورہ پر حضرت زینب رضی اللہ عنہا کی چار پائی کے اوپر بھی ڈولی بنائی گئی، اور یہ پہلی مسلم خاتون تھیں جن کی چار پائی پر ڈولی بنائی گئی۔ جب جنازے کی تیاری مکمل ہو گئی تو خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے آپ کی نماز جنازہ پڑھائی۔[5]

---

(۱) صحیح البخاري ۲/۷۳، مع صحیح مسلم: ۲/۶۴۸

(۲) ینظر: فتح الباري لابن حجر: ۳/۱۲۹

(۳) سیرت فاطمة الزهراء، ص: ۴۹/۴۸

(۴) الطبقات الکبری: ۸/۲۹، وکذا ینظر: سبل الهدی والرشاد في سیرة خیر العباد: ۳/۳۵۸

(۵) [أنساب الأشراف: ۱/۴۰۰، وسبل الهدی والرشاد في سیرة خیر العباد: ۱۱/۳۱

جنازے کے بعد تدفین کی تیاری شروع ہوئی، حضرت انسؓ کہتے ہیں: سیدہ زینبؓ کے دفنانے کیلیے ہم لوگ بھی حضور ﷺ کے ہمراہ (جنت البقیع کی جانب) نکلے۔ ہم نے دیکھا کہ آپ ﷺ نہایت غمزدہ تھے، ہمیں آپ ﷺ سے بات کرنے کی ہمت بھی نہیں ہو رہی تھی، آخر ہم قبر کے پاس پہنچ گئے، مگر قبر کی لحد بنانے میں ابھی کچھ دیر تھی۔

اس لیے حضور ﷺ قبر کے قریب بیٹھ گئے اور ہم بھی آپ ﷺ کے اردگرد بیٹھ رہے، آپ ﷺ زیرِ لب کچھ کہہ رہے تھے اور نظرِ مبارک آسمان کی جانب اٹھ رہی تھی، اتنے میں اطلاع دی گئی کہ قبر تیار ہوگئی ہے۔

آپ ﷺ قبر کے اندر اترے، میں نے دیکھا کہ آپ ﷺ پہلے سے زیادہ غمزدہ ہو رہے ہیں، تھوڑی دیر بعد آپ ﷺ باہر تشریف لائے، میں نے دیکھا کہ غم کے آثار زائل ہوگئے تھے، لبوں پہ مسکراہٹ تھی اور چہرۂ انور کھل رہا تھا۔

آپ ﷺ کی طبیعت میں اب بشاشت دیکھ کر ہم میں بات کرنے کی ہمت پیدا ہوگئی اور ہم نے عرض کیا: یا رسول اللہ! پہلے آپ ﷺ کو نہایت غمزدہ دیکھ کر ہمیں آپ ﷺ سے بات کرنے کی ہمت نہیں ہو رہی تھی، اب ہم آپ ﷺ کا چہرہ کھلا ہوا دیکھ رہے ہیں، یہ کیا ماجرا ہے؟

آپ ﷺ نے فرمایا: مجھے اِدھر قبر کی تنگی و سختی اور اُدھر زینبؓ کے ضعف و کمزوری کا خیال دامن گیر تھا اور یہ خیال میرے اوپر بہت شاق گزر رہا تھا۔ چنانچہ میں نے اللہ سے دعا کی کہ وہ زینب کے معاملہ میں آسانی فرمائے، اللہ تعالیٰ نے (دعا قبول کی اور) اس کے ساتھ آسانی کا فیصلہ فرمادیا، اور قبر نے اس کو ایک دفعہ دبایا ہے جس کی آواز جن و انس کے سوا، مشرق و مغرب کے درمیان کی ہر مخلوق نے سنی ہے[1]

فضائل و خصائص

سیدہ زینبؓ نے اسلام کا ابتدائی زمانہ پایا اور اُسی وقت مسلمان ہوگئیں، اس لیے آپؓ ''قدیم الاسلام خواتین'' میں شمار ہوتی تھیں۔[2]

آپؓ کو رسول اللہ ﷺ کے دستِ مبارک پر بیعت کرنے کا شرف بھی حاصل ہوا چنانچہ آپؓ کو ''مُبایعاتُ النبی ﷺ'' میں شمار کیا جاتا ہے۔[3]

---

(۱) مجمع الزوائد و منبع الفوائد ۳/۴۷ و کذا ینظر: ذخائر العقبی في مناقب ذوي القربی ص: ۱۶۰ و أسد الغابۃ ۷/۱۳۱

(۲) مجمع الزوائد ۳/۲۱۳ و سبل الھدی والرشاد ۱۱/۲۹ و ذخائر العقبی ص: ۱۵۶

(۳) المحبر ص: ۴۰۶

آپ رضی اللہ عنہا کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت اور پیار کا اعزاز حاصل تھا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم، آپ رضی اللہ عنہا سے بے حد محبت کرتے تھے۔[1]

آپ رضی اللہ عنہا ''شہادت'' کے عالی مقام پر فائز ہو کر اس دنیائے فانی سے روانہ ہوئیں، چونکہ دورانِ ہجرت کفار کی طرف سے پہنچنے والے زخموں کے سبب ہی آپ رضی اللہ عنہا کا انتقال ہوا تھا اس لیے علما نے لکھا ہے کہ آپ رضی اللہ عنہا ''شہیدہ'' ہیں۔[2]

آپ رضی اللہ عنہا کو زبانِ نبوت سے ایک بڑی فضیلت یہ بھی حاصل ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آپ رضی اللہ عنہا کے بارے میں فرمایا کرتے تھے: ''هِيَ خَيْرُ بَنَاتِي أُصِيبَتْ فِيَّ'' (یہ میری بہترین بیٹی تھی، جو میری وجہ سے ستائی گئی)۔[3]

آپ رضی اللہ عنہا کو اپنی عمدہ صفات کی بدولت اپنے شوہر کے ہاں بھی اعلیٰ مرتبت حاصل تھی، اِسی کا نتیجہ تھا کہ وہ آپ رضی اللہ عنہا سے بہت محبت کرتے تھے۔ ایک مرتبہ وہ ملکِ شام کے سفر پر تھے اور انہیں آپ رضی اللہ عنہا کی یاد آ گئی تو فرطِ محبت میں انہوں نے یہ اشعار کہے جسے کئی مؤرخین نے نقل کیا ہے:

ذَكَرْتُ زَيْنَبَ لَمَّا وَرَّكَتْ إِرَما ... فَقُلْتُ سَقْيًا لِشَخْصٍ يَسْكُنُ الْحَرَمَا

بِنْتُ الأَمِينِ جَزَاهَا اللهُ صَالِحَةً ... وَ كُلُّ بَعْلٍ سَيُثْنِي بِالَّذِي عَلِمَا

ترجمہ:

جب میں ''اِرَم'' (یعنی دِمَشق۔ جو شام کا مشہور شہر ہے۔[4]) سے گزرا تو زینب کو یاد کیا، اور میں نے کہا: اللہ، حرم شریف کے ہر باشندے کو آباد و شاداب رکھے۔ امین (صلی اللہ علیہ وسلم) کی بیٹی کو اللہ جزائے خیر دے کہ وہ ایک اچھی و صالح خاتون ہے، اور ہر شوہر (اپنی بیوی کی) انہی اوصاف کی وجہ سے ہی تعریف کرتا ہے جن اوصاف سے وہ بخوبی واقف ہوتا ہے۔[5]

---

(۱) الاستیعاب في معرفة الأصحاب ۴/۱۸۵۴ وعیون الأثر ۲/۳۵۸

(۲) مجمع الزوائد ومنبع الفوائد: ۹/۲۱۶

(۳) مجمع الزوائد ۹/۲۱۳، وسبل الهدی والرشاد في سیرة خیر العباد ۱۱/۳۰

ملحوظہ: اس مقام پر علمی کلام کیلیے ملاحظہ ہو: (بنات اربعہ، ص: ۱۲۰، ۱۲۱، وسیرة آل بیت النبي الأطهار، ص: ۲۴۰

(۴) مختصر تاریخ دمشق ۲۹/۴۴

(۵) عیون الأثر: ۲/۳۵۸، والطبقات الکبری: ۸/۲۶، مع معجم الشعراء ص: ۳۳۲

۲۔ سیدہ حضرت رُقَیّہ سَلامُ اللّٰہِ وَرِضوانُہ علیہا کی سیرت ومناقب

نام ونسب:

آپ سلامُ اللّٰہِ وَرِضوانُہ علیہا کا نامِ مبارک "رُقَیّہ" تھا۔ آپ سلامُ اللّٰہِ وَرِضوانُہ علیہا ، امام الانبیاء حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ اورام المومنین حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا کی صاحبزادی تھیں۔[1]

ولادتِ باسعادت:

آپ سلامُ اللّٰہِ وَرِضوانُہ علیہا ، رسول اللہ ﷺ کے اعلانِ نبوت سے سات برس قبل پیدا ہوئیں جبکہ آپ ﷺ کی عمر مبارک تینتیس برس تھی۔ اس لحاظ سے آپ رضی اللہ عنہا اپنی بڑی بہن ''سیدہ زینب رضی اللہ عنہا'' سے تین سال بعد پیدا ہوئیں۔[2]

پہلا نکاح:

اسلام سے قبل اُس زمانے کے دستور کے مطابق، رسول اللہ ﷺ نے اپنی صاحبزادی سیدہ رقیہ رضی اللہ عنہا کا نکاح اُن کے چچازاد بھائی ''عتبہ بن ابی الہب'' کے ساتھ کر دیا تھا۔ پھر اسلام کا دَور شروع ہوا اور آپ ﷺ نے توحید اور آخرت کی طرف دعوت دینا شروع کی۔[3]

ایک مرتبہ جبکہ قرآن مجید کی آیت {وَأَنذِرْ عَشِيرَتَكَ الأَقْرَبِينَ} (اور آپ اپنے قریبی رشتہ داروں کو خبردار کیجئے) نازل ہوئی تو آپ ﷺ نے قریش کو صفا پہاڑی پر جمع فرمایا جس میں ابولہب (عبدالعزیٰ) سمیت دیگر قریش بھی شریک ہوئے، پھر آپ ﷺ نے ان سب کی طرف متوجہ ہوکر پوچھا: تم بتاؤ کہ اگر میں تمہیں یہ کہوں کہ اس وادی میں کچھ گھڑسوار ہیں جو تم پر حملہ کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں، تو کیا تم میری اس بات کی تصدیق کروگے؟ سب نے بیک زبان ہوکر کہا: جی ہاں! کیونکہ ہم نے آپ کو ہمیشہ سچ بولتے ہی دیکھا ہے۔ اس پر آپ ﷺ نے ان سے فرمایا: ''تو پھر میں تمہیں (آخرت) کے سخت عذاب سے خبردار کرنا چاہتا ہوں''۔

---

(۱) أنساب الأشراف للبلاذري ۱/۴۰۱ والبداية والنهاية طهجر ۳/۲۶۳

(۲) سبل الهدى والرشاد: ۱۱/۳۳ وتاريخ الخميس في أحوال أنفس النفيس: ۱/۲۷۴ مع موسوعة آل بيت النبي: ۱/۴۱۹

(۳) تاريخ الخميس: ۱/۲۷۴ والمواهب اللدنية ۱/۳۸۰ مع بنات اربعہ، ص: ۱۷۷

یہ سن کر ابولہب طیش میں آ گیا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہنے لگا: تَبًّا لَکَ، أَلِھٰذَا جَمَعْتَنَا؟ ''محمد! تو ہلاک و برباد ہو جائے، کیا اسی لیے تو نے ہمیں جمع کیا تھا؟'' ابولہب کی اس شدید گستاخیٔ رسول پر اللہ تعالیٰ نے ابولہب اور اس کی بیوی (جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایذا رسانی میں ابولہب کی شریک تھی) کی مذمت میں پوری سورۃ اللہب اتار دی:

{تَبَّتْ يَدَا أَبِي لَهَبٍ وَتَبَّ * مَا أَغْنَى عَنْهُ مَالُهُ وَمَا كَسَبَ * سَيَصْلَى نَارًا ذَاتَ لَهَبٍ * وَامْرَأَتُهُ حَمَّالَةَ الْحَطَبِ * فِي جِيدِهَا حَبْلٌ مِنْ مَسَدٍ *}

ترجمہ: ابولہب کے ہاتھ برباد ہوں، اور وہ خود برباد ہو چکا ہے* اس کی دولت اور اس نے جو کمائی کی تھی وہ اس کے کچھ کام نہیں آئی* وہ بھڑکتے شعلوں والی آگ میں داخل ہوگا* اور اس کی بیوی بھی، لکڑیاں ڈھوتی ہوئی* اپنی گردن میں مونجھ کی رسی لیے ہوئے*۔[1]

یہ آیات سن کر عتبہ کی ماں اور ابولہب کی بیوی ''ام جمیل'' کہنے لگی: محمد نے ہماری ہجو (برائی بیان) کی ہے، پھر عتبہ کے ماں باپ دونوں نے سختی سے عتبہ سے کہا کہ وہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی بیٹی ''رقیہ'' کو طلاق دے دے،[2] اور اس کے باپ ابولہب نے تو یہاں تک کہا کہ اگر تم اسے طلاق نہیں دو گے تو میرا تمہارے ساتھ رہنا حرام ہے، چنانچہ اس نے طلاق دے دی۔[3]

ایک روایت میں ہے کہ قریش عتبہ کے پاس چل کر آئے اور اسے کہا کہ تم محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی بیٹی کو طلاق دے دو، پھر قریش کی جس عورت سے بھی تم کہو گے، ہم اس سے تمہاری شادی کرا دیں گے۔ اس نے کہا: اگر تم ''اَبان بن سعید'' یا ''سعید بن العاص'' کی بیٹی سے میری شادی کرا دو تو میں اسے چھوڑ دیتا ہوں۔ اس مطالبہ پر انہوں نے ''سعید بن العاص'' کی بیٹی سے اس کا نکاح کرا دیا اور اس نے سیدہ رقیہ رضی اللہ عنہا کو طلاق دے دی۔ واضح رہے کہ یہ طلاق، رخصتی سے پہلے ہی ہوگئی تھی۔ اس طرح اللہ تعالیٰ نے اِس پاکیزہ دختر کو اُس دشمن کافر کے ہاتھوں سے نکال لیا۔ آپ سلام اللہ و رضوانہ علیہا کی یہ خلاصی یقیناً آپ رضی اللہ عنہا کیلئے باعثِ تکریم تھی [کہ آپ رضی اللہ عنہا کو ان سے بہتر شوہر (یعنی حضرت عثمان رضی اللہ عنہ) ملے] اور اُس کیلئے یہ خلاصی باعثِ تذلیل تھی (کہ اُس کو دخترِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم

---

(۱) ینظر: صحیح البخاري رقم: ۴۷۷۰ و ۴۸۰۱

(۲) أنساب الأشراف للبلاذري ۱/۴۰۱

(۳) الطبقات الکبری: ۸/۲۹ مع شرح الزرقاني علی المواهب اللدنية ۴/۳۲۳

سے بہتر کوئی دختر میسر نہیں آ سکتی تھی)۔[1]

فائدہ: واضح رہے کہ ''عتبہ'' فتح مکہ کے موقع پر مسلمان ہو گئے تھے اور انہیں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رفاقت میں ''غزوۂ حنین'' میں شرکت کی سعادت بھی نصیب ہوئی۔[2]

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے ساتھ شادی (وولیمہ):

اگرچہ شروع میں سیدہ رقیہ رضی اللہ عنہا کا نکاح عتبہ بن ابی لہب کے ساتھ ہوا تھا مگر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو جب اس کا پتا چلا تو ان کے دل میں اس کی بڑی حسرت پیدا ہوئی کہ کاش سیدہ رقیہ کے ساتھ عتبہ کے بجائے ان کا نکاح ہوتا چنانچہ پھر بتقدیرِ الٰہی ایسا ہی ہوا۔[3] لیکن نکاح سے پہلے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس اللہ کی طرف سے وحی آئی کہ حضرت رقیہ رضی اللہ عنہا کا نکاح حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے کر دیا جائے پھر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نکاح کرایا۔[4]

حضرت رقیہ رضی اللہ عنہا کا یہ نکاح مکہ مکرمہ میں ہوا، اور آپ سلام اللہ ورضوانہ علیہا کا یہ نکاح حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے اسلام لانے کے بعد ہوا تھا،[5] اگرچہ بعض نے کہا ہے کہ بعثتِ نبوی یعنی اعلانِ نبوت سے قبل یہ نکاح ہو گیا تھا۔[6]

وہیں مکہ مکرمہ میں نکاح ہوا اور نکاح کے ساتھ ہی رخصتی بھی ہو گئی،[7] شادی کی اس مبارک تقریب میں بہت سے مسلمان شریک ہوئے اور جانور ذبح کیے گئے۔[8] ان دونوں میاں بیوی کو چونکہ اللہ پاک نے نہایت حسن و جمال سے نوازا تھا اس لیے لوگوں میں ان کے حسن و جمال کے متعلق یہ شعر کافی مشہور ہو گیا تھا:

---

(۱) ذخائر العقبى في مناقب ذوي القربى ص: ۱۶۳ مع سيرة ابن هشام: ۱/۶۵۲

(۲) أسد الغابة ۳/۵۶۲ مع الإصابة في تمييز الصحابة ۴/۳۶۵ والاستيعاب في معرفة الأصحاب ۳/۱۰۴۳

(۳) ينظر: [الإصابة في تمييز الصحابة: ۸/۱۷۷،۱۷۶

(۴) تاريخ الخميس: ۱/۲۷۵ وذخائر العقبى في مناقب ذوي القربى ص: ۱۶۳

(۵) مستعذب الإخبار بأطيب الأخبار ص: ۱۲۲ وشرح الزرقاني على المواهب اللدنية بالمنح المحمدية: ۴/۳۲۴ والإصابة في تمييز الصحابة: ۸/۱۷۸

(۶) شرح الزرقاني على المواهب اللدنية: ۴/۳۲۴ وتاريخ الخلفاء، ص: ۱۱۸

(۷) سبل الهدى والرشاد: ۱۱/۳۳ والمعارف: ۱/۱۴۲ مع بنات اربعہ، ص: ۱۸۱

(۸) أبناء النبي والاقتباس من ترجمته الموسومة خاندانِ نبوی کے چشم و چراغ، ص: ۱۳۶

أَحْسَنُ زَوْجٍ رَآهُ إِنْسَانٌ ***** رُقَيَّةُ وَزَوْجُهَا عُثْمَانُ

(بہترین جوڑا جسے کسی انسان نے دیکھا ہے، وہ حضرت رقیہؓ اور حضرت عثمانؓ کا جوڑا ہے۔)[1]

اس مبارک نکاح کے متعلق حضرت عثمانؓ کی خالہ حضرت سُعدیٰ بنت کُریزؓ نے درج ذیل اشعار کہے جسے کئی مؤرخین نے نقل کیا ہے:

هَدَى اللهُ عُثْمَانًا بِقَوْلِي إِلَى الْهُدَى ... وَأَرْشَدَهُ وَاللهُ يَهْدِي إِلَى الْحَقِّ

فَتَــابَعَ بِالرَّأْيِ السَّدِيدِ مُحَمَّــدًا ... وَكَــانَ بِرَأْيٍ لَا يَصُــدُّ عَنِ الصِّــدْقِ[2]

وَ أَنْكَحَهُ الْمَبْعُوثُ بِالْحَقِّ بِنْتَــهُ ... فَكَانَا كَبَدْرٍ مَازَجَ الشَّمْسَ فِي الْأُفُقِ

فِدَاؤُكَ يَــا ابْنَ الْهَــاشِمِيِّينَ مُهْجَتِي ... وَأَنْتَ أَمِينُ اللهِ أُرْسِلْتَ لِلْخَــلْقِ

ترجمہ:

اللہ تعالیٰ نے، میری گفتگو کو ذریعہ بنا کر،[3] حضرت عثمانؓ کو ہدایت دی اور راہِ راست دکھلائی، بلاشبہ اللہ ہی ہے جو سیدھے راستے کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔ انہوں نے اپنی درست رائے استعمال کر

---

(۱) البداية والنهاية طـ هجر: ۱۰/۳۴۹ مع شرح الزرقاني على المواهب اللدنية: ۴/۳۲۳ وتفسير القرطبي: ۱۴/۲۴۲

(۲) وعند البعض "وكان ابنَ ازوىٰ لا يصدُّ عنِ الحَقِّ" مكان قولها: "وَكَـانَ بِرَأْيٍ لَا يَصُـدُّ عَنِ الصِّـدْقِ". فلاحظ له: الإصابة ۸/۱۷۸ وشرح الزرقاني ۴/۳۲۳، ومعنى قولها "كان ابنَ ازوىٰ" أن سيدنا عثمان بن عفان كان اسم أمه أَرْوىٰ بنت كُرَيز، كما في [الإصابة في تمييز الصحابة: ۸/۱۷۷

(۳) توضیح: حضرت عثمانؓ بیان کرتے ہیں کہ میں ایک مرتبہ اپنے گھر آیا تو دیکھا کہ میری خالہ "سُعدیٰ بنت کُریزؓ" میرے اہلِ خانہ کے ساتھ وہاں موجود تھیں۔ انہوں نے مجھے حضور ﷺ کے متعلق کچھ باتیں بتائیں کہ وہ اللہ کے رسول ہیں، ان کے پاس جبریل آتے ہیں، وہ سچی اور درست بات کرتے ہیں، ان کا دین سراپا کامیابی ہے وغیرہ وغیرہ۔ یہ باتیں کہہ کر وہ تو تھوڑی دیر بعد چلی گئیں لیکن ان کی باتیں میرے دل میں گھر کر گئیں اور میں مسلسل اس بارے میں سوچ بچار میں مشغول رہا۔ اور اُدھر میں حضرت ابوبکر صدیقؓ کے پاس بھی آتا جاتا تھا اور ان کے ساتھ اٹھتا بیٹھتا تھا، تو اس دفعہ میں سوموار کے بعد ان کے پاس گیا تو وہ اکیلے بیٹھے تھے اور ان کے پاس کوئی ایک شخص بھی موجود نہیں تھا۔ انہوں نے مجھے پریشان اور فکر مند دیکھ کر پوچھا کہ کیا بات ہے؟ در اصل حضرت ابوبکرؓ ایک نرم دل انسان تھے وہ کسی کو دکھ اور پریشانی کی کیفیت میں نہیں دیکھ سکتے تھے، بہرحال میں نے وہ سب کچھ بتایا جو میں نے اپنی خالہ سے سنا تھا، وہ مجھے کہنے لگے: عثمان! تیرا بھلا ہو، واللہ! تم ایک نہایت سمجھدار شخص ہو۔ تم جیسے شخص پر تو حق، باطل سے مخفی نہیں رہنا چاہیے۔ پھر مجھے بتوں کی حقیقت سمجھائی اور کہا کہ یہ بت جنہیں تمہاری قوم پوجتی ہے کیا یہ بے حس پتھر نہیں ہیں؟ جو نہ سننے کی صلاحیت رکھتے ہیں، نہ دیکھنے کی، نہ کسی کو نفع پہنچا سکتے ہیں، نہ نقصان۔ میں نے کہا: جی ہاں! واللہ! بات تو ایسے ہی ہے جیسے آپ کہہ رہے ہیں۔ انہوں نے کہا: عثمان! مجھے میرے رب کی قسم! تمہاری خالہ نے تمہیں سچ کہا ہے۔

کے حضور ﷺ کی اتباع کا فیصلہ کیا، اور وہ (اپنی درست) رائے (واضح ہوجانے) پر، حق سے (پھر) پیچھے نہیں ہٹتے تھے۔ نبیٔ برحق ﷺ نے اپنی بیٹی ان کے نکاح میں دی، ان دونوں (رقیہؓ وعثمانؓ) کی یوں تشبیہ بیان کی جاسکتی ہے کہ گویا چودھویں کے چاند کو افق میں پھیلے ہوئے سورج کے ساتھ ملا دیا گیا ہو۔ اے آلِ ہاشم کے فرزند (ﷺ)! آپ پر میری جان قربان ہے، اور آپ اللہ کے امین ہیں جو مخلوق کی نفع رسانی کیلیے مبعوث کیے گئے ہیں۔[1]

آپؓ کا حضرت عثمانؓ کے ساتھ یہ نکاح ورخصتی اگرچہ مکہ مکرمہ میں ہی ہوئی تھی، مگر آپؓ نے پھر حضرت عثمانؓ کے ساتھ مکہ مکرمہ سے حبشہ کی طرف دوبار ہجرت کی اور پھر ان کے ہمراہ مدینہ طیبہ چلی گئیں[2] اور زندگی کا آخری حصہ وہیں سرکارِ دوعالم ﷺ کے زیرِ سایہ گزرا، جیسا کہ یہ سب کچھ آگے آرہا ہے۔

حبشہ کی دونوں ہجرتیں اور ہجرتِ مدینہ:

اسلام کا ابتدائی دور چل رہا تھا جب حضرت رقیہؓ وحضرت عثمانؓ رشتۂ ازدواج میں منسلک ہوئے اور مسلمان اس وقت کفارِ مکہ کے ہاتھوں مختلف قسم کے مصائب کا سامنا کررہے تھے اور آپ ﷺ بھی ان مسلمان ہونے والے افراد کو تحفظ فراہم کرنے کی قدرت نہیں رکھتے تھے، اُن کی اس پُرتکالیف زندگی کو دیکھ کر بالآخر آپ ﷺ نے انہیں مشورہ دیا کہ اگر وہ ملکِ حبشہ کی طرف ہجرت کرجائیں تو ان کیلیے بہتر رہے گا کہ حبشہ کا جو بادشاہ ہے اُس کی موجودگی میں کسی پر ظلم نہیں ہوسکتا اور وہ ملک بھی پُرامن ہے۔ یہ مسلمان وہیں رہیں یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ ان کیلیے ان مصائب سے خلاصی کی کوئی صورت پیدا فرمادے۔ آپ ﷺ کی اس تجویز پر بعض مسلمان حبشہ کی طرف ہجرت کرگئے تاکہ اللہ

پھر حضرت ابوبکرؓ نے مجھے حضور ﷺ کے نبیٔ برحق ہونے کی دعوت دی، اتنے میں اتفاق سے آپ ﷺ کا اس طرف گزر ہوا تو انہوں نے اٹھ کر آپ ﷺ سے میرے بارے میں بات کی۔ آپ ﷺ میرے پاس تشریف لائے اور فرمایا: عثمان! جنت کی طرف اللہ کی دعوت پر لبیک کہو، میں تمہاری طرف اور ساری مخلوقِ الٰہی کی طرف اللہ کا رسول بنا کر بھیجا گیا ہوں۔ حضرت عثمانؓ کہتے ہیں کہ آپ ﷺ کی بات سننے کے بعد میں کلمہ پڑھے بغیر نہ رہ سکا اور فوراً مسلمان ہوگیا۔ اس کے پھر تھوڑے ہی عرصے بعد آپ ﷺ کی صاحبزادی حضرت رقیہؓ سے میرا نکاح ہوگیا۔ ملاحظہ ہو: [الإصابة في تمييز الصحابة ۸/۱۷۷،۱۷۸

(۱) البداية والنهاية ط هجر: ۹/۳۴۹ ۱۰ و رحمة للعالمين ص: ۳۶۲ والرياض النضرة في مناقب العشرة ۹/۳ و عثمان بن عفان ذو النورين ص: ۲۲

(۲) سبل الهدى والرشاد ۱۱/۳۳ والمواهب اللدنية بالمنح المحمدية ۱/۴۸۰، وتاريخ الخميس: ۱/۲۷۴، ۲۷۵

کے راستہ میں اس طرح ہجرت کر کے اپنا دین بچا لیں اور ان مصائب سے بھی امن مل سکے جن سے یہ دو چار تھے۔ یہ حضرات چپکے سے سمندری راستہ کے ذریعے دو کشتیوں پر سوار ہو کر حبشہ ہجرت کر گئے، اگرچہ کفار نے ان کا پیچھا بھی کیا مگر انہیں ناکامی کا سامنا کرنا پڑا کیونکہ ان کے ساحل سمندر پر پہنچنے سے پہلے ہی یہ حضرات کشتیوں پر سوار ہو کر جا چکے تھے۔

یہ اسلام میں سب سے پہلی ہجرت تھی جو دین کی بنیاد پر کی گئی اور پھر اس میں سب سے پہلے جس کو ہجرت کر جانے کا شرف حاصل ہوا وہ حضرت رقیہ و حضرت عثمان کا جوڑا تھا، چنانچہ حضرت عثمان ؓ اپنی اہلیہ کو لے کر حبشہ پہنچے اور اپنے دین کی حفاظت کی خاطر وہیں رہنا شروع کیا، ایک مدت تک آپ ﷺ کو اپنی صاحبزادی اور داماد کی کوئی خبر نہ مل سکی کہ وہ کس حال میں ہیں؟ آپ ﷺ ان کی خیر خبر کی اطلاع کے منتظر رہتے اور ان کے متعلق آپ ﷺ کو ایک قسم کی پریشانی لاحق رہتی تھی۔

ایک دفعہ قریش کی کوئی عورت حبشہ سے مکہ معظمہ آئی، اس نے آپ ﷺ کو بتایا کہ میں نے آپ کے داماد اور بیٹی کو وہاں دیکھا ہے۔ آپ ﷺ نے فوراً پوچھا: عَلَى أَيِّ حَالٍ رَأَيْتِهِمَا؟ ''تم نے انہیں کس حال میں دیکھا ہے؟'' اس نے کہا: میں نے دیکھا کہ عثمان ؓ اپنی بیوی کو ایک سواری پر سوار کیے ہوئے لے جا رہے تھے اور خود سواری کو پیچھے سے چلا رہے تھے۔ یہ سن کے آپ ﷺ نے فرمایا: صَحِبَهُمَا اللّٰهُ، إِنَّ عُثْمَانَ أَوَّلُ مَنْ هَاجَرَ بِأَهْلِهِ بَعْدَ لُوطٍ عَلَيْهِ السَّلَامُ ''اللہ ان دونوں کا مُصاحِب و ساتھی ہو! حضرت لوط علیہ السلام کے بعد، عثمان ؓ وہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے اپنے گھر والوں کے ساتھ ہجرت کی۔''[1]

نبوت کے پانچویں سال، ماہِ رجب میں، مسلمانوں نے یہ ہجرت کی تھی۔[2]

بوقتِ ہجرت مسلمانوں کا یہ قافلہ مختصر سی جماعت پر مشتمل تھا جس کی تعداد بارہ سے سترہ افراد تک بتائی جاتی ہے۔ جب مسلمان وہاں پہنچ کر آزادی کے ساتھ عبادتِ الٰہی کرنے اور چین و سکون کی زندگی بسر کرنے لگے تو مکہ سے مزید مسلمان بھی ہجرت کر کے وہاں پہنچ گئے، اس طرح حبشہ کے مہاجرین کی تعداد اسی (۸۰) تک پہنچ گئی جن میں جعفر بن ابی طالب اور ان کی اہلیہ اسماء بنت عُمیس بھی تھے۔

---

(۱) ینظر: [البدایۃ والنهایۃ ط هجر: ۳/۱٦٦ وما بعدها مع سبل الهدى والرشاد: ۲/۳٦۴

(۲) الطبقات الکبری ط العلمیۃ: ۱/۱۵۹

اِدھر مکہ مکرمہ میں ایک مرتبہ آپ ﷺ نے مشرکینِ مکہ کی موجودگی میں سورۃ النجم کی تلاوت کی اور آخر میں سجدہ کیا تو (اللہ کی شان) اُس وقت موجود مشرکین سمیت تمام لوگوں نے آپ ﷺ کے ساتھ سجدہ کیا، جب یہ خبر وہاں حبشہ کے مہاجرین کے پاس پہنچی تو وہ سمجھے کہ اہل مکہ مسلمان ہو گئے ہیں چنانچہ کئی مہاجرین (جو تقریباً تینتیس تھے) وہاں سے واپسی کے ارادہ سے مکہ مکرمہ چل دیے، یہ حضرات وہاں دو ماہ (شعبان و رمضان) کا قیام کر چکے تھے اور تیسرے ماہ (یعنی شوال، ۵ نبوی کو) واپسی ہوئی۔ جب مکہ کے قریب پہنچے تو قبیلہ کنانہ کے کچھ سواروں سے ان کی ملاقات ہوئی انہوں نے ان سے قریشِ مکہ کی دینی حالت کے بارے میں دریافت کیا تو انہوں نے بتایا کہ ہم نے ان کو بدستور اسی سابقہ حالت پر ہی چھوڑا ہے کہ محمد بن عبداللہ ان کے بتوں کو برا بھلا کہتے ہیں اور وہ ان کے ساتھ برا سلوک کرتے ہیں۔

بہرحال جب یہ مہاجرین مکہ واپس آ گئے تو کفار نے اپنی اسلام و مسلمان دشمنی کی بناء پر انہیں پہلے سے بھی زیادہ ستانا شروع کر دیا، جس پر رسول اللہ ﷺ نے انہیں دوبارہ حبشہ کی طرف ہجرت کرنے کی اجازت دے دی۔ اس دوسری ہجرت کرنے والوں میں حضرت عثمان و حضرت رقیہؓ بھی تھے۔

حضرت عثمانؓ نے ہجرت کیلئے روانہ ہونے سے پہلے آپ ﷺ سے عرض کیا: ہماری پہلی ہجرت اور یہ دوسری ہجرت دونوں میں آپ ہمارے ساتھ نہیں ہیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: تم اللہ اور اس کے رسول کی طرف ہجرت کرنے والے ہو، تمہیں ان دونوں ہجرتوں کا ثواب ملے گا۔ یہ سن کر حضرت عثمانؓ نے عرض کی: یا رسول اللہ! بس اب یہ ہمارے لیے کافی ہے۔ چنانچہ یہ دونوں حضرات پھر حبشہ کی طرف روانہ ہو گئے۔ یہ سفر انتہائی پیچیدہ، خوفناک، اجنبیت سے بھرپور اور نہایت شفیق والدین اور پیاری بہنوں کی جدائی پر مشتمل تھا۔

دیگر مسلمان مہاجرین کے ساتھ یہ دونوں حضرات حبشہ پہنچ کر اپنی زندگی گزارنے لگے۔ پھر جب آپ ﷺ نے مکہ سے مدینہ طیبہ کی طرف ہجرت کی اور یہ خبر مہاجرینِ حبشہ کے پاس پہنچی تو ان میں سے بعض تو وہیں سے مدینہ طیبہ روانہ ہو گئے اور کچھ واپس مکہ مکرمہ آئے جن میں حضرت عثمان و حضرت رقیہؓ بھی تھے۔ حضرت رقیہؓ جب مکہ مکرمہ میں اپنے والد کے گھر پہنچیں تو عجیب دکھ و صدمہ کا سامنا ہوا، کہ وہاں گھر میں صرف دو بہنوں (حضرت ام کلثوم و حضرت فاطمہ) کو پایا، والدہ (حضرت خدیجہؓ) انتقال کر چکی تھیں، والدِ مکرم (ﷺ) سے بھی گھر خالی تھا کہ وہ بھی مکہ مکرمہ چھوڑ کر مدینہ منورہ جا چکے تھے۔

یہاں مکہ میں کچھ مدت ٹھہر کر حضرت رقیہؓ اپنے ہمدرد و غمخوار شوہر حضرت عثمانؓ کے ہمراہ دین کیلیے پھر تیسری ہجرت کر کے مدینہ منورہ، اپنے والد ﷺ کے پاس پہنچ گئیں اور وہیں زندگی بسر کرنا شروع کر دی۔ [1]

اولاد:

حضرت رقیہؓ کے بطن سے دو بچے پیدا ہوئے تھے۔ [2]

ایک بچہ تو نا تمام پیدا ہوا تھا جب کہ آپ سلامُ اللہ ورِضوانہٗ علیہا پہلی ہجرت کے دوران حبشہ میں تھیں۔

پھر بعد میں ایک اور بچہ پیدا ہوا جس کا نام "عبداللہ" رکھا گیا، اور اسی بچے کی نسبت سے حضرت عثمانؓ کی کنیت "ابوعبداللہ" ٹھہری۔ [3] یہ بچہ بھی حبشہ میں پیدا ہوا تھا اور پھر اپنے عظیم والدین کے ہمراہ مدینہ طیبہ آ گیا تھا جب انہوں نے ہجرتِ مدینہ کی تھی۔ ابھی آپ بچے ہی تھے کہ ایک مرغ نے آپ کی آنکھ میں چونچ مار کر زخم کر ڈالا، جس سے چہرہ بہت سوج گیا اور پھر مرض بڑھتا ہی گیا بالآخر اسی زخم سے انتقال کر گئے۔ [4]

رسول اللہ ﷺ نے ان کو اپنی گود میں لیا اور ان سے محبت کی وجہ سے آپ ﷺ کی آنکھوں سے آنسو بہہ پڑے اور فرمایا: إِنَّمَا يَرْحَمُ اللهُ مِنْ عِبَادِهِ الرُّحَمَاءَ. "بے شک اللہ تعالیٰ اپنے اُن بندوں پر رحم فرماتا ہے جو شفیق اور رحم دل ہوتے ہیں۔" [5]

آپ نے اپنی والدہ ماجدہ کی وفات کے دو سال بعد، جمادی الاولیٰ، ۴ ہجری میں وہیں مدینہ طیبہ میں انتقال فرمایا جبکہ آپ کی عمر چھ برس تھی۔ خود رسول اللہ ﷺ نے نمازِ جنازہ پڑھائی اور تدفین کیلیے حضرت عثمانؓ خود قبر میں اترے۔ [6]

---

(1) مستفاد مما یلي: البدایة والنهایة ط هجر ۳/۱۲۷ وذخائر العقبی في مناقب ذوي القربی ص: ۱۶۳ وسبل الهدی والرشاد في سیرة خیر العباد ۲/۳۶۳ ومابعدها والطبقات الکبری ط العلمیة ۱۵۹ ومابعدها ومختصر تاریخ دمشق ۱۱۰/۱۲ والأعلام للزرکلي ۳/۳۱ وأبناء النبي والمستفاد من ترجمته الموسومة خاندان نبوی کے چشم و چراغ، ص: ۱۳۷ ومابعدها

(2) ینظر: الإصابة في تمییز الصحابة: ۸/۱۳۸

(3) السمط الثمین، ص: ۲۴۰ والطبقات الکبری ط العلمیة ۸/۳۰

(4) [سبل الهدی والرشاد: ۱۱/۳۵ وتاریخ الخمیس: ۱/۲۷۵ مع بنات اربعه، ص: ۱۹۱ والمعارف: ۱/۱۴۲

(5) أنساب الأشراف للبلاذري: ۱/۴۰۱ وکذا في [فتح الباري لابن حجر: ۳/۱۵۶

(6) مختصر تاریخ دمشق: ۱۶/۱۱۰ وتاریخ الخمیس: ۱/۲۷۵ مع رحمة للعالمین ص: ۳۶۲

والد اور شوہر کی خدمت:

آپ سلام اللہ ورضوانہ علیہا کے مزاج میں عاجزی اور خدمت گزاری کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ رضی اللہ عنہا اپنے والدِ مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور شوہرِ معظم رضی اللہ عنہ کی خوب خدمت کیا کرتی تھیں۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ میں حضرت رقیہ رضی اللہ عنہا کے پاس حاضرِ خدمت ہوا، میں نے دیکھا کہ ان کے ہاتھ میں کنگھا ہے۔ وہ فرمانے لگیں کہ ابا جان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ابھی ابھی میرے پاس سے گئے ہیں، وہ میرے گھر تشریف لائے تھے اور میں نے اِس سے ان کے سر میں کنگھی کی ہے۔ انہوں نے مجھ سے یہ بھی دریافت فرمایا کہ بیٹی! تم ابوعبداللہ (یعنی حضرت عثمان رضی اللہ عنہ) کو کیسا پاتی ہو؟ میں نے کہا: وہ بہت اچھے انسان ہیں، پھر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: فَأَكْرِمِيهِ، فَإِنَّهُ مِنْ أَشْبَهِ أَصْحَابِي بِي خُلُقًا ''ان کی عزت واحترام کیا کرو، میرے صحابہ میں سے اخلاق کے اعتبار سے وہ میرے زیادہ مشابہ ہیں''۔[1]

جیسا کہ شوہروں کی خدمت کرنا صالح بیویوں کی امتیازی خوبی رہی ہے، اسی طرح آپ سلام اللہ ورضوانہ علیہا بھی اپنے شوہر کی خدمت گزاری میں کسر نہیں اٹھا رکھتی تھیں۔

ایک دفعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنی صاحبزادی حضرت رقیہ رضی اللہ عنہا کے گھر تشریف لائے، دیکھا کہ وہ اپنے شوہر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا سر دھو رہی ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کے اس عمل کی حوصلہ افزائی کرتے ہوئے فرمایا: میری پیاری بیٹی! اپنے شوہر ابو عبداللہ (یعنی حضرت عثمان رضی اللہ عنہ) کے ساتھ حسن سلوک اور اچھے معاملے کے ساتھ زندگی گزارتی رہو، وہ اخلاق کے لحاظ سے میرے صحابہ میں سے میرے زیادہ مشابہ ہیں۔[2]

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا صاحبزادی کو ہدایا دینا:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ایک خادمہ تھی جسے ''امّ عیّاش'' کہا جاتا تھا، وہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت کے کام اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خانگی امور سرانجام دیتی تھی، وہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو وضو بھی کرا دیا کرتی، الغرض بہت سارے کاموں میں خوشدلی کے

---

(۱) مجمع الزوائد ومنبع الفوائد ۹/۸۱

(۲) مجمع الزوائد ومنبع الفوائد: ۹/۸۱ و کنز العمال: ۱۱/۵۹۰

ساتھ وہ ہاتھ بٹاتی۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی یہ خاص خادمہ اپنی پیاری صاحبزادی حضرت رقیہؓ کو بطورِ ہدیہ عنایت فرمادی تھی تاکہ حضرت رقیہؓ کیلیے خانگی کام کاج میں سہولت رہے۔[1]

اسی طرح آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ایک خاص خادم اسامہ بن زیدؓ تھے۔ وہ کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مجھے گوشت کا بڑا پیالہ دے کر حضرت عثمانؓ کے گھر بھیجا کہ یہ انہیں پہنچا آؤ۔ میں پہنچا تو دونوں حضرات (یعنی حضرت عثمانؓ وحضرت رقیہؓ) گھر میں موجود تھے، میں نے گوشت سے بھرا وہ پیالہ ان حضرات کی خدمت میں پیش کیا۔ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ میں نے اس جوڑے سے زیادہ حسین جوڑا کبھی نہیں دیکھا، میں حضرت رقیہؓ اور حضرت عثمانؓ میں سے جس پر نظر ڈالتا وہی حسن میں فائق تھا۔ جب پیالہ پہنچا کر میں واپس آیا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پوچھا: تم ان دونوں کے پاس سے ہو آئے ہو؟ میں نے کہا: جی ہاں! آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: فَهَلْ رَأَيْتَ زَوْجًا أَحْسَنَ مِنْهُمَا؟ ''کیا تم نے ان سے زیادہ کوئی حسین جوڑا دیکھا ہے؟'' میں نے عرض کی: نہیں، یارسول اللہ! میرا تو وہاں یہ حال تھا کہ میں کبھی ان میں سے ایک کو دیکھتا اور کبھی دوسرے کو، اللہ نے تو ان دونوں کو ہی خوب حسن وجمال سے نوازا ہے۔ امام طبرانیؒ روایت بالا ذکر کرنے کے بعد فرماتے ہیں کہ یہ واقعہ پردے کا حکم نازل ہونے سے پہلے کا ہے۔[2]

وفات:

۲ ہجری میں جب صحابہ کرامؓ، جنگِ بدر کیلیے روانگی کی تیاریوں میں تھے تو حضرت رقیہؓ کو خسرہ نکل آیا جس سے کافی بیمار ہوگئیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت عثمانؓ کو، ان کے شوقِ جہاد کے باوجود، باقاعدہ حکم دے کر انہیں اپنی بیوی حضرت رقیہؓ کی تیمارداری کیلیے اُن کے پاس ٹھہرنے کا کہا اور پھر حضرت عثمانؓ کو وہیں ان کے پاس مدینہ طیبہ میں ٹھہرا دیا اور جہادِ بدر میں ساتھ نہیں لے گئے،[3] البتہ ساتھ یہ فرمایا کہ تمہیں بدر میں شریک مجاہد کی طرح (آخرت میں

---

(۱) ینظر: أسد الغابة ط العلمية: ۷/۳۶۲ مع بنات اربعہ، ص: ۱۹۳، ۱۹۴

(۲) مستفاد من: مجمع الزوائد ومنبع الفوائد: ۹/۸۰ مع بنات اربعہ، ص: ۱۹۴، ۱۹۵

(۳) ینظر: تاریخ الخمیس ۱/۲۷۵ و ذخائر العقبی ص: ۱۶۳ مع نسب قریش ص: ۱۰۱ والسیرۃ النبویۃ لابن کثیر ۲/۴۷۰ و [التعلیق علی "الإشارة إلى سيرة المصطفى لمغلطاي" ص: ۹۸ وبنات اربعہ، ص: ۱۹۸

پورا) اجر اور (دنیا میں مالِ غنیمت میں سے) ایک مجاہد کے بقدر پورا حصہ ملے گا۔[1] آپ ﷺ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے علاوہ حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ کو بھی ان کی تیمارداری کیلیے مدینہ طیبہ میں چھوڑ گئے تھے۔[2]

ایامِ بدر کے دوران، پیچھے مدینہ طیبہ میں سیدہ رقیہ رضی اللہ عنہا کی طبیعت بہت خراب ہوگئی، پھر جس دن حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ سب سے پہلے غزوۂ بدر کی فتح کی خوشخبری لے کر مدینہ پہنچے عین اسی دن حضرت رقیہ رضی اللہ عنہا انتقال فرما گئی تھیں،[3] چنانچہ حضرت عروہ کے والد کا بیان ہے کہ لوگ حضرت رقیہ کو دفن کر رہے تھے (اور حضرت عثمان قبر کے کنارے پر کھڑے تھے[4])، یکایک حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے ایک زوردار تکبیر (اللہ اکبر) کی آواز سنی، اور کہا: یا أسامة، ما هذا؟ ''اُسامہ! یہ کس چیز کی آواز ہے؟'' پھر لوگ اس آواز کی طرف متوجہ ہوئے تو کیا دیکھتے ہیں کہ سامنے سے حضور ﷺ کی اونٹنی پر سوار حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ، اس بات کی خوشخبری لا رہے ہیں کہ بدر میں مشرکینِ مکہ کو کھلی شکست ہوئی ہے اور وہ مسلمانوں کے ہاتھوں قتل ہوئے ہیں۔[5] جب حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ پہنچے اس وقت لوگ حضرت رقیہ رضی اللہ عنہا کی تدفین سے فارغ ہوکر قبر پر مٹی ڈال رہے تھے،[6] اور یہ اتوار کا دن اور چاشت کا وقت تھا۔[7]

ہجرتِ نبوی کے سترہ مہینے بعد، ماہِ رمضان، ۲ ہجری میں حضرت رقیہ رضی اللہ عنہا کا انتقال ہوا،[9] جب کہ رسول اللہ ﷺ صحابہ کرام کے ساتھ جنگ بدر میں گئے ہوئے تھے۔[10] یہ انتقال حضور ﷺ کی غیر موجودگی میں ہوا، حضرت ام ایمن رضی اللہ عنہا

---

(۱) صحيح البخاري ۴/۸۸

(۲) سيرة ابن هشام ت السقا: ۲/۶۴۲ و دلائل النبوة للبيهقي ۳/۱۳۰

(۳) نسب قريش ص: ۱۰۱

(۴) تاريخ الخميس: ۱/۴۷۵ و ذخائر العقبى في مناقب ذوي القربى ص: ۱۶۳

(۵) الإصابة في تمييز الصحابة ۸/۱۳۹

(۶) أنساب الأشراف للبلاذري ۱/۴۰۱ و سيرة ابن هشام ت السقا ۱/۶۴۲

(۷) الإشارة إلى سيرة المصطفى و تاريخ من بعده من الخلفاء، ص: ۲۰۱ و دلائل النبوة للبيهقي: ۳/۱۳۲

(۸) سبل الهدى و الرشاد في سيرة خير العباد: ۱۱/۳۵ مع الطبقات الكبرى ۸/۳۰ و التعليق على "الإشارة إلى سيرة المصطفى لمغلطاي" ص: ۹۸

(۹) تذكرة الخواص من الأمة، ص: ۴۷۵

(۱۰) الطبقات الكبرى ط العلمية ۸/۳۰

نے غسل دیا،[1] اور کفن و دفن سے متعلقہ تمام امور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے سرانجام دیے،[2] حتی کہ جنازہ بھی حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے خود پڑھایا۔[3] آپ رضی اللہ عنہا نے مدینہ طیبہ میں انتقال فرمایا،[4] اور وہیں جنت البقیع میں دفن ہوئیں۔[5] انتقال کے وقت عمر شریف اکیس برس تھی۔[6]

---

(1) أنساب الأشراف للبلاذري: 1/401

(2) بنات اربعہ، ص: 202

(3) أنساب الأشراف للبلاذري 1/401

(4) تاريخ الخميس في أحوال أنفس النفيس: 1/275 وذخائر العقبى في مناقب ذوي القربى ص: 163

(5) أنساب الأشراف للبلاذري 1/401

(12) رحمة للعالمين ص: 362 وشجرة الأشراف، ص: 53

فضائل وخصائص

آپ سلام اللہ و رضوانہ علیہا کو یہ شرف وفضل حاصل تھا کہ آپ رضی اللہ عنہا نے اسلام کے بالکل ابتدائی دور میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت پر لبیک کہی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی مکمل تصدیق کی جو بلاشبہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کیلئے باعث راحت تھی۔ یہ اُس وقت کی بات ہے جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو عموماً ہر طرف سے ستایا جا رہا تھا، اُس پُرستم گھڑی میں حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائیں۔ آپ رضی اللہ عنہا کے ساتھ آپ رضی اللہ عنہا کی یہ صاحبزادی (حضرت رقیہ رضی اللہ عنہا) بھی اسلام لائیں اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی آنکھوں کی ٹھنڈک بنیں۔[1]

نیز آپ رضی اللہ عنہا کو "مُبایِعات النبی صلی اللہ علیہ وسلم" میں سے بھی شمار ہونے کا اعزاز حاصل تھا کہ جب دیگر خواتینِ اسلام نے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دستِ بابرکت پر بیعت کی تھی تو سیدہ رقیہ رضی اللہ عنہا بھی ان کے ساتھ شامل ہو کر اس بیعت سے مشرف ہوئی تھیں۔[2]

اس کے علاوہ آپ رضی اللہ عنہا ایک "مُستَجابۃُ الدَّعوات" صالح خاتون تھیں یعنی اللہ عزوجل کی بارگاہ میں آپ رضی اللہ عنہا کی دعا کو شرفِ قبول حاصل تھا۔ اس کا ایک واقعہ یہ ہے کہ آپ رضی اللہ عنہا جب ہجرت کر کے ملکِ حبشہ پہنچیں تو چونکہ اللہ پاک نے آپ رضی اللہ عنہا کو نہایت حسن وجمال عطا فرما رکھا تھا حبشہ کے نوجوان لڑکے آپ رضی اللہ عنہا کو دیکھنے کے پیچھے پڑے رہتے اور بُری نظروں سے دیکھتے اور گھورتے تھے جو کہ یقیناً آپ رضی اللہ عنہا جیسی پاکیزہ ہستی کیلیے بہت اذیت ناک تھا۔ اس پر آپ رضی اللہ عنہا نے اللہ تعالیٰ سے ان کے خلاف دعا کی جس سے وہ سب ہلاک ہو گئے۔[3]

آپ رضی اللہ عنہا کو "ذاتُ الہِجرَتَین" کا قابلِ اعزاز لقب بھی حاصل ہے کہ آپ رضی اللہ عنہا نے اسلام کے ابتدائی پُرکٹھن زمانے میں اپنے اسلام کی حفاظت کیلیے دوبارا اپنا وطن چھوڑا اور اللہ کی خاطر مکہ مکرمہ سے حبشہ کی طرف دو مرتبہ ہجرت کی جس کی بناء پر آپ رضی اللہ عنہا مندرجہ بالا خوبصورت لقب سے نوازی گئیں جو آپ رضی اللہ عنہا کی ایک نمایاں فضیلت کی علامت ہے۔[4]

---

(۱) مجمع الزوائد/۲۱۳ ۲ وانساب الأشراف ۳۹۷/ ۱ مع سبل الهدى والرشاد ۳۳/ ۱۱

(۲) سبل الهدى والرشاد ۳۳/ ۱۱ والطبقات الكبرى ۲۹/ ۸

(۳) سبل الهدى والرشاد ۳۳/ ۱۱ و ۳۴/ ۱۱ مع حياة الحيوان الكبرى: ۴۸۲/ ۱

(۴) نساء حول الرسول، ص: ۸۴ و لباب الأنساب والألقاب والأعقاب، بترقيم الشاملة، ص: ۲۳ وذخائر العقبى في مناقب ذوي القربى ص: ۱۶۳ مع مختصر تاريخ دمشق ۱۱۰/ ۱۲

۳۔ سیدہ حضرت امّ کُلثوم سَلامُ اللہِ وَ رِضْوانُہٗ علیہا کی سیرت و مناقب

نام و نسب:

رسول اللہ ﷺ نے آپ ؓ کا نام ''اُمّ کلثوم'' رکھا، اس کے علاوہ آپ ؓ کا کوئی نام ثابت نہیں اور آپ ؓ اپنے اسی کنیت والے نام سے ہی معروف و مشہور تھیں،[۱] آپ ؓ حضرت خدیجہ ؓ کے بطن سے رسول اللہ ﷺ کی صاحبزادی تھیں۔ [۲]

ولادتِ باسعادت:

آپ سَلامُ اللہِ وَ رِضْوانُہٗ علیہا، حضور ﷺ کے اعلانِ نبوت سے چھ سال قبل پیدا ہوئیں، یعنی آپ ؓ کی ولادتِ باسعادت اس وقت ہوئی جب کہ آپ ﷺ کی عمر مبارک چونتیس برس تھی۔ آپ ؓ حضرت رقیہ ؓ سے ایک سال چھوٹی اور حضرت فاطمہ ؓ سے ایک سال بڑی تھیں۔ [۳]

قبولِ اسلام:

ابتداء میں جب رسول اللہ ﷺ نے اسلام کی دعوت دی تو آپ ﷺ کی دعوت پر حضرت خدیجہ ؓ نے لبیک کہتے ہوئے اسلام قبول کیا۔ والدہ ماجدہ کے ساتھ اپنی دیگر بہنوں سمیت حضرت ام کُلثوم ؓ نے بھی اسلام کو دل و جان سے قبول کیا، آپ ﷺ پر ایمان لے آئیں اور اس بات کی گواہی دی کہ آپ ﷺ جو دین لے کر آئے ہیں وہ حق ہے۔ اس کے علاوہ جب دیگر خواتین نے آپ ﷺ کے دستِ مبارک پر بیعت کی تو آپ سَلامُ اللہِ وَ رِضْوانُہٗ علیہا نے بھی بیعت کی۔ [۴]

---

(۱) سبل الهدى والرشاد: ۱۱/۳۶، مع شرح الزرقاني: ۴/۳۲۵ و سیرت مصطفی ۳/۳۳۹ و تاریخ الخمیس ۱/۲۷۲

(۲) أسد الغابة ط العلمية ۷/۳۷۴ مع الذرية الطاهرة للدولابي ص: ۴۲

(۳) سیرت فاطمة الزهراء، ص: ۵۵

(۴) الطبقات الكبرى: ۸/۳۰ مع مجمع الزوائد: ۹/۲۱۳ و أنساب الأشراف للبلاذري: ۱/۳۹۷

نکاحِ اول:

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی بعثت سے قبل، اپنی صاحبزادی حضرت رقیہ رضی اللہ عنہا کا نکاح عُتبہ بن ابی لہب اور دوسری صاحبزادی سیدہ ام کلثوم رضی اللہ عنہا کا نکاح اُس کے دوسرے بھائی عُتَیبَہ بن ابی لہب کے ساتھ کر دیا تھا، لیکن جب ''سورۃ اللہب'' نازل ہوئی (جس میں ابولہب اور اس کی بیوی ''امِ جمیل'' کی مذمت بیان کی گئی) تو ابولہب نے اپنے دونوں بیٹوں (عُتبہ اور عُتَیبہ) سے کہا کہ اگر تم محمد کی بیٹیوں کو طلاق نہیں دوگے تو میرا تمہارے ساتھ رہنا حرام ہے جبکہ ان کی ماں ''ام جمیل'' نے ان سے یہ کہا کہ رقیہ اور ام کلثوم بے دین ہوگئی ہیں لہذا تم انہیں طلاق دے دو، چنانچہ اُن دونوں بد باطن عتبہ اور عُتَیبہ نے ان دونوں پاک صاحبزادیوں کو رخصتی سے پہلے ہی طلاق دے دی۔[1]

فائدہ: ''عتبہ'' تو فتح مکہ کے موقع پر مسلمان ہوگئے تھے جیسا کہ پیچھے گزرا،[2] البتہ ''عتیبہ'' آخر عمر تک بدبخت ہی رہا اور بالآخر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بددعا سے شیر جیسے ظالم درندے کے حملے سے ہلاک ہوا جیسا کہ ذیل میں مفصلاً آرہا ہے:

عُتَیبہ کی شیر کے ذریعے ہلاکت:

طلاق تو عتبہ نے بھی سیدہ رقیہ رضی اللہ عنہا کو دی تھی مگر عتیبہ نے فقط طلاق دینے کو کافی نہ سمجھا بلکہ طلاق دینے کے بعد سیدھا حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس آیا اور کہنے لگا: میں تیرے دین کا منکر ہوں اور تیری بیٹی کو بھی طلاق دے دی ہے، تجھے میں اچھا نہیں لگتا اور مجھے تُو اچھا نہیں لگتا۔ پھر بدبختی کی حد کرتے ہوئے آگے بڑھا، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر حملہ کیا اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی قمیص پھاڑ دی، ایک روایت میں ہے کہ اس نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف تھوکا بھی سہی، جو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر پڑا نہیں۔ اس موقع پر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زبان مبارک پر یہ الفاظ آئے: **اَللّٰھُمَّ سَلِّطْ عَلَیهِ کَلْبًا مِنْ کِلَابِکَ** (اے اللہ! اپنے درندوں میں سے کوئی درندہ اس پر مسلط فرمانا)۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے شفیق چچا ابو طالب اُس وقت وہاں موجود تھے، یہ بددعا سن کر وہ بہت پریشان ہوئے اور عتیبہ سے کہنے لگے: تجھے اب میرے بھتیجے کی بددعا سے کوئی چیز نہیں بچا سکے گی۔

چنانچہ ایک مرتبہ عتیبہ اپنے باپ ابولہب کے ہمراہ تجارتی قافلے کے ساتھ شام کی طرف روانہ ہوا، دورانِ سفر قافلے نے

---

(1) أسد الغابة: ٧/٣٧٣، والإصابة في تمييز الصحابة: ٨/٤٦١، مع الطبقات الكبرى ٨/٣٠

(2) أي في سيرة سيدة رقية، نقلاً عن أسد الغابة: ٣/٥٦٢، و[الإصابة في تمييز الصحابة ٤/٣٦٥، والاستيعاب في معرفة الأصحاب ٣/١٤٣٠

ملکِ شام میں ''زَرقاء'' نامی مقام پر رات کے وقت ایک جگہ پڑاؤ ڈالا۔ جہاں قافلہ پڑاؤ ڈال چکا تھا وہیں قریب میں ہی کسی راہب کا عبادت خانہ تھا، قافلے کو دیکھ کر وہ راہب آیا اور کہنے لگا: اے عرب کے باشندو! تم نے یہاں کیسے پڑاؤ ڈال لیا؟ یہاں تو درندے اور شیر بکثرت رہتے ہیں۔ یہ سن کر ابولہب کو رسول اللہ ﷺ کی وہ بددعا یاد آ گئی، اس نے اہلِ قافلہ کو جمع کیا اور ان سے کہا: اے اہلِ قریش! دیکھو، تمہارے اندر میرا جو مقام ہے وہ تم پر مخفی نہیں، اور اس نسبت سے تمہارے اوپر میرا جو حق ہے اس سے بھی تم بخوبی واقف ہو، مجھے آج محمد کی بددعا کا ڈر کھائے جا رہا ہے، لہٰذا آج رات تم سب میرا تعاون کرو کہ ایک تو سونے کیلیے اس عبادت خانہ کے قریب جگہ بناؤ، دوسرے تم اپنا سارا سامان ایک جگہ جمع کر کے اس کا ڈھیر بناؤ اور پھر اس کی چوٹی پر میرے بیٹے عتیبہ کا بستر لگاؤ اور تم اپنے بستر اس ڈھیر کے ارد گرد لگاؤ تاکہ عتیبہ کسی درندے وغیرہ کے حملے سے مکمل طور پر محفوظ رہ سکے۔ چنانچہ ان لوگوں نے اول، سامان کا ایک اونچا سا ڈھیر لگایا پھر اپنے اپنے اونٹ لا کر اس ڈھیر کے گرد بٹھا دیے اور آخر میں اس ڈھیر کی چوٹی پر عتیبہ کا بستر لگا کر خود اس ڈھیر کے گرد ابولہب سمیت، اس طرح حلقہ بنا کر لیٹ گئے کہ عتیبہ کو چاروں طرف سے مکمل طور پر گھیر رکھا تھا۔

رات کے کسی حصے میں (اللہ کا بھیجا ہوا) ایک شیر آیا جو ایک ایک آدمی کے پاس سے گزرتا ہوا اس کا منہ سونگھتا جاتا تھا، مگر جب اسے اپنا مطلوبہ آدمی نہ ملا تو اس نے دُم موڑی، سمٹ کر ایک زوردار جست لگائی اور سیدھا اوپر سامان کی چوٹی پر لیٹے شخص کے پاس جا پہنچا، پہلے اس کا منہ سونگھا اور پھر اس کو دبوچ کر اس کا سر توڑ کے رکھ دیا، عتیبہ دَم نکلنے سے پہلے چیخا اور کہا: **أَلَمْ أَقُلْ لَكُمْ إِنَّ مُحَمَّدًا أَصْدَقُ النَّاسِ؟** ''میں نے تمہیں کہا نہیں تھا کہ محمد سچا ترین انسان ہے، اس کی بات جھوٹی نہیں ہوسکتی؟'' اس کے بعد وہیں مر گیا۔ ابولہب نے آ کر اسے دیکھا تو کہنے لگا: **لَقَدْ عَرَفْتُ وَاللّٰهِ مَا كَانَ لِيَنْفَلِتَ مِنْ دَعْوَةِ مُحَمَّدٍ** ''واللہ! مجھے یقین تھا کہ یہ محمد کی بددعا سے نہیں بچ سکتا'' اور وہ شیر تو ایسا غائب ہوا کہ کچھ پتا نہ چلا کہ کہاں گیا ہے۔ اسی واقعہ کے متعلق حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ نے کہا تھا:

مَنْ يَرْجِعُ الْعَامَ إِلَى أَهْلِهِ ... فَمَا أَكِيلُ السَّبْعِ بِالرَّاجِعِ

(اس قافلے میں سے کون اپنے اہلِ خانہ کی طرف لوٹے گا؟، بہر حال وہ شخص تو نہیں لوٹ پائے گا جو درندے کی خوراک بن چکا ہے)۔[1]

---

(۱) مستفاد – بتسهيل – من روايات متعددة سيقت في ما يلي: شرح الزرقاني على المواهب اللدنية ۴/۳۲۶، ۳۲۵، وخلاصة سير سيد البشر ص: ۱۳۱ وذخائر العقبى ص: ۱۶۴ وسيرة فاطمة الزهراء، ص: ۵۶ وإمتاع الأسماع ۱۲/۱۱۷ ومابعدها ونهاية الإيجاز في سيرة ساكن الحجاز ۱/۵۰ وموسوعة آل بيت النبي، ۱/۴۴۱

شعبِ ابی طالب اور انتقالِ والدہ:

حضرت ام کلثومؓ مکہ والوں کے بائیکاٹ میں اپنے والد اور بنی ہاشم کے ساتھ شریک تھیں، اس بائیکاٹ کی تحریری دستاویز کو کعبہ میں لٹکایا گیا تھا۔ حضرت ام کلثومؓ اپنے خاندان والوں کے ساتھ شعبِ ابی طالب میں محصور تھیں، بنو ہاشم اور بنو عبدالمطلب ان سے اظہارِ ہمدردی کرتے تھے لیکن ابولہب، اس کے دونوں بیٹوں اور ان کی ماں کو ان سے کوئی ہمدردی نہ تھی۔ مسلمان اس محاصرے میں تین سال رہے، اس دوران کھانے کی اشیاء ان تک انتہائی خفیہ انداز میں پہنچائی جاتی تھیں۔ تین سال بعد مسلمانوں کو جب اس گھاٹی سے نکلنا نصیب ہو رہا تھا اس وقت حضور ﷺ کی عمر انچاس برس ہو چکی تھی۔ حضرت خدیجہؓ اپنی بیٹی ام کلثومؓ کے کندھے پر سہارا لگا کر گھاٹی سے باہر تشریف لائیں، کہ گھاٹی میں قیام کے آخری دنوں میں انہیں شدید مرض لاحق ہو گیا تھا۔

حضرت خدیجہؓ بوجھل پن کے ساتھ، اپنے فطری نشاط کے بغیر نئی زندگی میں داخل ہوئیں۔ بیماری کے باعث نوبت یہاں تک آ پہنچی کہ وہ اپنی ضروری حاجات کو بھی خود ادا نہ کر سکتی تھیں۔ حضرت ام کلثومؓ ان کی مدد کرتیں، ان کو سہارا دیتیں، اور ان کی ضرورت کی اشیاء انہیں پیش کرتیں۔ بالآخر جب حضرت خدیجہؓ کا آخری وقت قریب آیا حضرت ام کلثومؓ اپنی بہن حضرت فاطمہؓ کے ساتھ ان کے پاس کھڑی تھیں، حضور ﷺ بھی قریب تشریف فرما تھے اور ان کیلیے اللہ کی ملاقات میں سامانِ تسلی فراہم کر رہے تھے، حضرت خدیجہؓ دنیاوی زندگی کو خیرباد کہنے والی تھیں، حضور ﷺ نے حضرت خدیجہؓ سے ایک بات یہ بھی فرمائی:

"اے خدیجہ! ہم آپ کے متعلق کتنی بڑی ناگواری دیکھ رہے ہیں، اللہ تعالیٰ ہمارے لیے اس ناگواری میں خیر کثیر شامل فرما دے۔"

پھر حضور ﷺ کے سامنے حضرت خدیجہؓ کی روح پرواز کر گئی، حضرت ام کلثومؓ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں، حضرت فاطمہؓ بھی شدید درد و الم کا شکار تھیں۔ حضرت خدیجہؓ کے انتقال کے بعد گھر میں حضرت ام کلثومؓ، حضرت فاطمہؓ اور حضور ﷺ کے سوا کوئی نہ تھا، پھر رسول اللہ ﷺ نے ارادہ فرمایا کہ اپنی ان صاحبزادیوں کیلیے زندگی کی مشقتوں کو کم کریں، لہٰذا آپ ﷺ سودہ بنت زمعہؓ کو اپنی زوجہ بنا کر گھر لے آئے۔ حضرت سودہؓ دونوں صاحبزادیوں کی راحت کی بھرپور کوشش کرتیں، وہ حضور ﷺ کیلیے بہترین رفیقۂ حیات اور بچیوں کیلیے بہترین موافقت کرنے والی ماں ثابت ہوئیں۔[1]

---

(۱) ابناء النبی، والاقتباس من ترجمتہ الموسومۃ بـ "خاندان نبوی کے چشم و چراغ"، ص: ۱۴۶، ۱۴۹

مدینہ طیبہ کی طرف ہجرت:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی ان دو بیٹیوں (حضرت ام کلثومؓ و حضرت فاطمہؓ) اور زوجہ مطہرہ (حضرت سودہؓ) کے ساتھ مکہ مکرمہ میں رہ رہے تھے۔ کفارِ مکہ کی ایذا رسانیاں حد سے بڑھنے لگیں اور مسلمان آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اجازت سے مدینہ طیبہ کی طرف ہجرت کر کے جانے لگے مگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم وہیں مکہ میں ہی قیام پذیر رہے، آخر اللہ تعالیٰ کے حکم سے حضرت ابوبکر صدیقؓ کو ساتھ لے کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم بھی چپکے سے ہجرت کیلیے روانہ ہو گئے، البتہ ان دونوں ہستیوں (حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور صدیق اکبرؓ) کے اہل وعیال (جن میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اہلخانہ میں سے حضرت ام کلثومؓ بھی تھیں) یہیں مکہ میں مقیم رہے۔ ان حضرات نے مدینہ طیبہ پہنچ کر اپنے اہل وعیال کو بھی مکہ سے وہیں اپنے پاس مدینہ منورہ بلوالیا، چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے (اپنے آزاد کردہ غلام) ابورافعؓ اور (منہ بولے بیٹے) زید بن حارثہؓ کو بلوا کر دو اونٹ اُن کے حوالے کیے اور بوقتِ ضرورت مزید اونٹ خریدنے کیلیے پانچ سو درہم (جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکرؓ سے لیے تھے) بھی ساتھ دے کر انہیں روانہ کیا کہ وہ جائیں اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بال بچوں کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس مدینہ طیبہ لے آئیں۔

اور حضرت ابوبکر صدیقؓ نے اپنے اہل کو بلوانے کا یہ انتظام کیا کہ عبداللہ بن اُرَیقط (جو ہجرتِ مدینہ کے سفر میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکرؓ کے ساتھ بطورِ رہبر آیا تھا، اور ان حضرات کو مدینہ پہنچا کر اب وہ واپس مکہ جا رہا تھا) کو دو یا تین اونٹ سپرد کیے اور اسے اپنے بیٹے عبداللہ بن ابی بکر کے نام ایک خط دے کر ان دونوں حضرات کے ہمراہ روانہ کر دیا، اس خط میں آپؓ نے اپنے بیٹے عبداللہ کو لکھا تھا کہ وہ بھی آپؓ کے اہل وعیال کو وہیں مدینہ طیبہ پہنچائے۔

ان تینوں نے اکٹھے مکہ شریف کی طرف سفر شروع کر دیا، مکہ مکرمہ سے پہلے مقامِ ''قُدَید'' پر جب پہنچے تو حضرت زیدؓ نے یہاں مزید تین اونٹ خرید ے، اس طرح ابورافعؓ اور زید بن حارثہؓ کل پانچ اونٹ ساتھ لیے مکہ مکرمہ پہنچے اور یہاں پہنچ کر سفرِ ہجرت کی تیاری شروع کر دی گئی، حضرت زید بن حارثہؓ اور ابورافعؓ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اہل وعیال کے افراد یعنی زوجہ مطہرہ حضرت سودہؓ، اور دو صاحبزادیوں یعنی حضرت ام کلثومؓ و حضرت فاطمہؓ کو ساتھ لیا، جبکہ باقی دو صاحبزادیوں میں سے حضرت زینبؓ کو تو ان کے شوہر ابوالعاص بن ربیع نے روک لیا اور انہوں نے پھر بعد میں ہجرت کی تھی (جس کی تفصیل پیچھے گزر چکی ہے) اور حضرت رقیہؓ اس سے پہلے ہی اپنے شوہر حضرت عثمانؓ کے

ساتھ مدینہ کو ہجرت کر چکی تھیں۔ حضرت زید بن حارثہؓ نے ان اہلِ بیتِ رسول کے ساتھ اپنی بیوی ام ایمن اور اپنے بیٹے اسامہ بن زید کو بھی ہمراہ کر لیا کہ یہ بھی آپ ﷺ کے اہل وعیال کے ساتھ رہا کرتے تھے۔

اور اُدھر سے حضرت ابوبکرؓ کے صاحبزادے عبداللہ بن ابی بکر نے اپنی سوتیلی ماں حضرت ام رومانؓ[1] اور اپنی بہنوں حضرت عائشہؓ اور حضرت اسماءؓ کو ساتھ لے لیا۔

ان سب حضرات نے اکٹھے سفر جاری رکھا اور آخر چند روز بعد مدینہ طیبہ پہنچ گئے۔[2] اس طرح حضرت ام کلثومؓ کا سفرِ ہجرت اپنے اتمام کو پہنچا اور وہ آپ ﷺ کے دیگر عیال کے ساتھ مل کر مدینہ طیبہ پہنچیں اور پھر زندگی بھر وہیں رہیں۔[3]

نکاحِ ثانی:

آپ سَلامُ اللهِ وَرِضْوانُہ علیہا کی بہن حضرت رقیہؓ کا جب انتقال ہوا تو انہی دنوں میں حضرت عمر بن خطابؓ کی بہن حضرت حفصہؓ کے شوہر حضرت خُنَیس بن حُذافہ سہمیؓ نے بھی وفات پائی اور حضرت حفصہؓ بیوہ ہو گئیں۔[4] چنانچہ حضرت عمرؓ نے حضرت ابوبکر صدیقؓ سے اپنی صاحبزادی حضرت حفصہؓ کے ساتھ نکاح کرنے کی بات کی مگر انہوں نے خاموشی اختیار کی اور کوئی جواب نہ دیا، اس سے حضرت عمرؓ کو بہت دکھ ہوا۔ جب حضرت ابوبکرؓ کی طرف سے کوئی آمادگی ظاہر نہ ہوئی تو حضرت عمرؓ نے حضرت عثمانؓ پر اپنی اسی صاحبزادی کا رشتہ پیش کیا لیکن انہوں نے بھی یہ جواب دیا کہ فی الحال میرا شادی کا ارادہ نہیں ہے۔ اس جواب پر حضرت عمرؓ کو بہت پریشانی ہوئی، وہ اسی حالت میں رسول اللہ ﷺ کے پاس چل دیے اور آپ ﷺ کے سامنے حضرت عثمانؓ کی طرف سے پہنچنے والی اس پریشانی اور افسوس کا اظہار کیا کہ انہوں نے حفصہؓ کا رشتہ قبول نہیں کیا۔ آپ ﷺ نے انہیں تسلی دیتے ہوئے فرمایا: يَتَزَوَّجُ حَفْصَةَ مَنْ

---

(۱) فائدہ: حضرت عبداللہ بن ابی بکر اور حضرت اسماء بنت ابی بکر، یہ دونوں سگے بہن بھائی تھے، ان کی حقیقی والدہ کا نام قُتَیلہ بنت عبدالعزی تھا، چنانچہ ام رومان۔ جن کا نام زینب تھا۔ ان کی سوتیلی والدہ تھیں البتہ حضرت عائشہؓ کی وہ سگی والدہ تھیں۔ ملاحظہ ہو: الطبقات لخليفة بن خياط ص: ۶۲۴ مع الجوهرة في نسب النبي وأصحابه العشرة ۲/۶۲

(۲) مستفاد من: الطبقات الكبرى: ۸/۱۳۲ مع تاريخ الطبري: ۱۱/۶۰۱ و الإصابة في تمييز الصحابة: ۴/۲۲ والبداية والنهاية ط هجر: ۴/۴۹۹

(۳) الطبقات الكبرى ط العلمية ۸/۳۰

(۴) ينظر: ذخائر العقبى ص: ۱۶۵ مع رحمة للعالمين ۲/۳۶۳ و معرفة الصحابة لأبي نعيم ۲/۹۹۰

هُوَ خَيرٌ مِن عُثمانَ وَيَتَزَوَّجُ عُثمانُ مَنْ هِيَ خَيرٌ مِن حَفصَةَ ''حفصہ سے وہ شخص شادی کرے گا جو عثمان سے بہتر ہے اور عثمان اس عورت سے شادی کرے گا جو حفصہ سے بہتر ہے۔''

اس کے بعد آپ ﷺ نے خود حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا سے نکاح فرمالیا۔[1]

اس طرح حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کی، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے بہتر شوہر یعنی رسول اللہ ﷺ کے ساتھ شادی ہوگئی اور آپ ﷺ کی وہ پیش گوئی بھی سب کے سامنے صحیح ثابت ہوگئی۔

باقی رہا حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شادی کا معاملہ کہ ان کو حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا سے بہتر عورت ملے گی تو اس کا قصہ حدیث میں اس طرح درج ہے:

خود حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ حضور ﷺ نے مجھے نہایت غمگین اور پریشان دیکھا تو مجھ سے فرمایا: عثمان! یہ تم اس قدر افسردہ اور غمگین کیوں لگ رہے ہو؟ کیا بات ہے؟ میں نے عرض کی: یارسول اللہ! کیا کسی اور پر بھی کبھی ایسی بیتی ہے جو میرے اوپر بیت رہی ہے؟ اللہ کے نبی ورسول ﷺ کی بیٹی (رقیہ رضی اللہ عنہا) جو میرے نکاح میں تھی وہ فوت ہوچکی ہے۔ اس سے تو میری کمر ٹوٹ کے رہ گئی ہے کہ میرے اور آپ کے درمیان جو سسر اور داماد کا رشتہ تھا وہ اب بالکل ختم ہوگیا ہے، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ ابھی آپ ﷺ سے محوِ گفتگو ہی تھے کہ حضور ﷺ نے فرمایا: يَا عُثْمَانُ! هٰذَا جِبْرِيلُ عَلَيْهِ السَّلَامُ، يَأْمُرُنِي عَنِ اللهِ عَزَّ وَجَلَّ أَنْ أُزَوِّجَكَ أُخْتَهَا أُمَّ كُلْثُومٍ عَلَى مِثْلِ صَدَاقِهَا، وَعَلَى مِثْلِ عِشْرَتِهَا ''عثمان! یہ جبریل علیہ السلام آئے ہیں، یہ مجھے اللہ کا حکم دے رہے ہیں کہ میں رقیہ کی بہن ام کلثوم کا تمہارے ساتھ نکاح کردوں اور جو مہر رقیہ کا مقرر ہوا تھا وہی مہر ان کا ہو اور تمہارا جو حسنِ سلوک (ماشاء اللہ) رقیہ کے ساتھ رہا وہی ان کے ساتھ ہو۔'' اس کے بعد آپ ﷺ نے ام کلثوم رضی اللہ عنہا کو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے ساتھ بیاہ دیا۔[2]

ایک روایت میں ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ حضرت رقیہ رضی اللہ عنہا کے انتقال پر بہت زیادہ دکھی اور رنجیدہ تھے، اور کثرت سے ان کی قبر پر جاتے رہتے تھے، ایک مرتبہ رسول اللہ ﷺ نے ان سے فرمایا: جبریل مجھے حکم دے گئے ہیں کہ میں ان

---

(1) أسد الغابة: ٧/٢٧ ومثله في صحيح البخاري: ٥/٨٣

(2) معرفة الصحابة لأبي نعيم ٦/٣١٩٩ ومعرفة الصحابة لابن منده ص: ٩٣٢ وكذا في ذخائر العقبى في مناقب ذوي القربى ص: ١٦٥

کی بہن سے تمہارا نکاح کردوں اور مہر بھی اتنا ہی مقرر کروں جتنا ان کا تھا۔[1]

اس طرح حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شادی حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا سے بہتر عورت (یعنی رسولِ اعظم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی صاحبزادی) کے ساتھ ہوگئی۔ چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اُس ارشاد کے نتیجہ میں حضرت حفصہ بنت فاروق رضی اللہ عنہا کو "ام المومنین" ہونے کا شرف عطا ہوا اور حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کو "ذوالنورین"[2] کی عزت حاصل ہوئی۔

بہرحال کئی احادیث میں یہ مضمون آیا ہے کہ پہلے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس اللہ کی طرف سے باقاعدہ وحی آئی کہ حضرت ام کلثوم رضی اللہ عنہا کا نکاح حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے کردیا جائے پھر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نکاح کرایا۔[3]

تاریخِ نکاح کے سلسلہ میں علما نے لکھا ہے کہ حضرت ام کلثوم رضی اللہ عنہا سے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا نکاح ربیع الاول، ۳ہجری میں ہوا اور رخصتی اسی سال (۳ہجری میں) ماہِ جمادی الثانی میں ہوئی[4] اور حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا سے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا نکاح بھی اسی ۳ہجری میں ہوا تھا۔[5]

واضح رہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے حضرت کلثوم رضی اللہ عنہا کی زندگی بھر کسی دوسری عورت سے نکاح نہیں کیا۔[6]

اولاد:

حضرت ام کلثوم رضی اللہ عنہا، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے نکاح میں ہی فوت ہوئیں اور آپ سَلامُ اللهِ وَرِضوانُهُ علیہا کی کوئی اولاد نہیں ہوئی۔[7]

---

(۱) أنساب الأشراف للبلاذري ۱/۴۰۱

(۲) فائدہ: حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کو "ذوالنورین" اس لیے کہا جاتا ہے کہ "ذوالنورین" کا معنی ہے: "وہ شخص جس کے پاس دو نور ہوں" تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا چونکہ نبی کی دو صاحبزادیوں سے نکاح ہوا تھا اس لیے آپ رضی اللہ عنہ کو یہ اعزاز بھرا لقب ملا اور یہ ایسا اعزاز ہے جس میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے اندر ممتاز ومنفرد ہیں۔ اور بعض علما نے یہ وجہ ان الفاظ میں بیان کی ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے علاوہ کسی مرد کے نکاح میں کسی نبی کی دو بیٹیاں کبھی جمع نہیں ہوئیں۔ ملاحظہ ہو: نهاية الأرب في معرفة أنساب العرب ص: ۱۴۶ و رحمة للعالمين ۲/۳۶۲ مع الأنساب للسمعاني ۶/۱۶

(۳) مجمع الزوائد ومنبع الفوائد ۹/۸۳، وذخائر العقبى في مناقب ذوي القربى ص: ۱۶۳

(۴) السمط الثمين، ص: ۲۴۱، ۲۴۲ وسبل الهدى والرشاد ۱۱/۳۶ و الطبقات الكبرى ۸/۳۱

(۵) معرفة الصحابة لأبي نعيم ۶/۳۲۰۶ وأسد الغابة ۷/۶۷

(۶) بنات اربعہ، ص: ۲۴۰

(۷) الإصابة في تمييز الصحابة ۸/۱۳۸ وسبل الهدى والرشاد: ۱۱/۳۶

فائدہ: واضح رہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ان سابقہ تین صاحبزادیوں میں سے کسی کی نسل آگے نہیں چل سکی کیونکہ ان میں سے بعض کی اولاد تو ہوئی نہیں (جیسے سیدہ ام کلثوم رضی اللہ عنہا)، اور جن کی ہوئی تو وہ یا بچپن میں فوت ہوگئی (جیسے سیدہ رقیہ رضی اللہ عنہا کہ ان کا ایک ہی بیٹا تھا جو کم سنی میں وفات پا گیا تھا اور اسی طرح سیدہ زینب رضی اللہ عنہا کا بیٹا بھی بچپن میں انتقال کر گیا تھا) یا ان سے آگے اولاد نہ ہو سکی (جیسے حضرت زینب رضی اللہ عنہا کہ ان کی بیٹی "اُمامہ" بڑی ہوئی، پہلے حضرت علی رضی اللہ عنہ اور پھر ان کی شہادت کے بعد حضرت مغیرہ بن نوفل رضی اللہ عنہ سے ان کی شادی ہوئی مگر کسی سے اولاد نہ ہو سکی)۔

اس طرح اللہ تعالیٰ کے ایک مقرر کردہ نظام کے تحت ۔جس کی حکمتیں وہ خود ہی بخوبی جانتا ہے ان تینوں صاحبزادیوں کی نسل آگے نہ چلی، البتہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی چوتھی صاحبزادی سیدہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا سے نسل آگے چلی جس کا سلسلہ الحمدللہ روزِ حاضر تک جاری ہے (جیسا کہ اس کی مزید وضاحت آئندہ صفحات میں سیرتِ سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کے تحت آ رہی ہے)۔[1]

لباس:

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے صاحبزادیٔ رسول حضرت ام کلثوم رضی اللہ عنہا کو ریشم کی دھاری دار چادر اوڑھے ہوئے دیکھا،[2] اور دوسری روایت کے مطابق انہوں نے آپ سلامُ اللہ وَرِضوانُہٗ علیہا کو ایک دھاری دار جوڑا زیبِ تن کیے ہوئے دیکھا۔[3]

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ام کلثوم رضی اللہ عنہا کا لباس عمدہ ہوتا تھا، حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ جیسے خاوند کے ساتھ رہتے ہوئے یہ اندازِ معاشرت لازمی تھا۔ آپ رضی اللہ عنہا اس طرح کے اچھے لباس کو استعمال فرماتی تھیں۔ یہ حالات ان کی معاشی خوشحالی پر بھی دلالت کرتے ہیں اور ان سے زوجین کے درمیان باہمی تعلق اور محبت بھی معلوم ہوتی ہے۔[4]

---

(۱) أسد الغابة ط العلمية، ۷/ ۲۱۶ و ۷/ ۲۰ مع [الاستيعاب في معرفة الأصحاب ۴/ ۱۷۸۹ و [الإصابة ۸/ ۲۵

(۲) صحيح البخاري ۷/ ۱۵۱ والمعرفة والتاريخ ۳/ ۱۶۴

(۳) السمط الثمين، ص: ۲۴۲ والطبقات الكبرى ط العلمية ۸/ ۳۱

(۴) بنات اربعہ—بتغییر یسیر-، ص: ۲۴۱

وفات:

ماہِ شعبان، ۹ ہجری میں آپ سلام اللہ و رضوانہ علیہا کا انتقال ہوا،[1] جبکہ رسول اللہ ﷺ کو مدینہ طیبہ ہجرت کر کے آئے ہوئے ۸ سال، ۲ ماہ اور ۱۰ دن گزر چکے تھے۔[2]

حضرت ام کلثوم رضی اللہ عنہا کے انتقال پر حضور ﷺ نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے اظہارِ مرتبہ اور تسکینِ قلب کیلیے درج ذیل فرامین ارشاد فرمائے:

۱۔ لوگو! عثمان کے ساتھ (اپنی بیٹیوں کا) نکاح کراؤ، میری اگر تیسری بیٹی ہوتی تو میں عثمان کے ساتھ ہی اس کا نکاح کراتا۔[3] (واضح رہے کہ حضرت ام کلثوم کے انتقال کے وقت آپ ﷺ کی تیسری صاحبزادی حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا حضرت علی رضی اللہ عنہ کے نکاح میں تھیں، اس لیے ان کے ساتھ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا نکاح نہ کرانا بالکل ظاہر ہے۔)

۲۔ اگر میری چالیس بیٹیاں بھی ہوتیں تو میں یکے بعد دیگرا نہیں عثمان کے نکاح میں دے دیتا یہاں تک کہ ان میں سے ایک بھی باقی نہ رہتی۔[4]

۳۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے مخاطب ہو کر آپ ﷺ نے فرمایا:

قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے! اگر میری سو بیٹیاں بھی ہوتیں اور وہ ایک ایک کر کے فوت ہو جاتیں تو میں یکے بعد دیگرے آپ کے ساتھ ان کا نکاح کراتا۔[5]

فائدہ:

چونکہ حضرت ام کلثوم رضی اللہ عنہا کا بھی ۹ ہجری میں انتقال ہو گیا۔ جیسا کہ ابھی گزرا۔ تو اس طرح حضور ﷺ کے سارے بیٹے اور ساری بیٹیاں (سوائے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے) آپ ﷺ کی زندگی میں آپ ﷺ کے سامنے ہی فوت ہو گئیں، مگر اس کے باوجود آپ ﷺ نے صبر و شکر کا مظاہرہ کیا۔ آپ ﷺ کے اِس عمل میں ان لوگوں کیلیے رضا بر قضا اور صبر و شکر کا بہترین نمونہ موجود ہے جن کی ساری اولاد یا بعض اولاد ان کے سامنے ہی فوت ہو جائے۔

---

(۱) سبل الهدى والرشاد في سيرة خير العباد ۱۱/۳۶ والطبقات الكبرى ۸/۳۱

(۲) المعارف ۱/۱۴۲

(۳) مجمع الزوائد ومنبع الفوائد ۹/۸۳

(۴) [أسد الغابة ط العلمية ۷/۵۷۸

(۵) المواهب اللدنية بالمنح المحمدية ۱/۳۸۱

غسل و تکفین:

آپ سلام اللہ و رضوانہ علیہا کا جب انتقال ہو گیا تو خود رسول اللہ ﷺ کی نگرانی میں آپؓ کے غسل اور تکفین کا انتظام کیا گیا، آپ ﷺ بنفسِ نفیس ان کے غسل کے انتظامات میں شریک رہے۔

آپ سلام اللہ و رضوانہ علیہا کو غسل دینے میں کئی عورتیں شامل تھیں جن میں مختلف روایات کے پیشِ نظر اسماء بنت عُمیسؓ، آپ ﷺ کی پھوپھی صفیہ بنت عبد المطلبؓ، لیلیٰ بنت قانف ثقفیہؓ، اور ام عَطِیّہ انصاریہؓ کا بطورِ خاص تذکرہ ملتا ہے۔

ام عطیہؓ[1] کی روایت میں ہے وہ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ان کو بیری کے پتوں اور پانی (یعنی بیری کے پتوں میں ابالے ہوئے نیم گرم پانی) کے ساتھ تین، پانچ، سات یا اگر تم مناسب سمجھو تو اس سے بھی زیادہ بار غسل دینا اور غسل کے آخر میں (خوشبو کیلیے) کافور لگا دینا، پھر جب تم غسل سے فارغ ہو جاؤ تو مجھے اطلاع کر دینا، چنانچہ جب ہم فارغ ہو گئیں تو ہم نے آپ ﷺ کو اس کی اطلاع دی۔ آپ ﷺ نے ہمیں اپنی چادر دی اور فرمایا کہ یہ چادر بھی اس کو پہنا دو۔ وہ فرماتی ہیں: اور ہم نے ان کے سر کے بالوں کی تین لٹیں بنائی تھیں اور انہیں ان کی پشت کی جانب ڈال دیا تھا۔ وہ مزید یہ بھی بیان کرتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے یہ بھی فرمایا تھا کہ ان کے دائیں پہلوؤں اور ان کے مقاماتِ سجدہ سے ابتدا کرنا۔[2]

لیلیٰ بنت قانف[3] ثقفیہ کی روایت میں ہے کہ میں بھی ان عورتوں میں شامل تھی جنہوں نے سیدہ ام کلثومؓ کو غسل

---

(۱) فائدہ: پیچھے سیدہ زینبؓ کی سیرت میں گزر چکا ہے کہ ان کے غسل و تکفین کو ام عطیہؓ نے سرانجام دیا تھا اور یہاں بھی ام عطیہؓ کا نام آرہا ہے کہ انہوں نے سیدہ ام کلثوم کے غسل و تکفین کی انجام دہی کی اور یہاں بالکل اُسی طرح کیا جیسے وہاں کیا تھا۔ علما فرماتے ہیں کہ اس کا مطلب یہ ہوسکتا ہے کہ ام عطیہؓ نے دونوں کے غسل و تکفین میں شرکت کی ہو، کیونکہ ان کے بارے میں آتا ہے کہ وہ "غَسَّالۃ المَیّتات" تھیں یعنی وفات پا جانے والی خواتین کے غسل و تکفین میں وہ کثرت سے شرکت کیا کرتی تھیں۔ ملاحظہ ہو: الإصابة في تمييز الصحابة: ۸/۴۲۰ مع الغدۃ في شرح العمدة لابن العطار: ۲/۷۷۰ و بنات اربعہ، ص: ۲۴۵، ۲۴۶

(۲)[ذخائر العقبی ص: ۱۶۶، ۱۶۷ والمواهب اللدنية بالمنح المحمدية: ۱/۳۸۲

(۳) فائدہ: صحیح یہ ہے کہ یہ لفظ قانِف (نون کے ساتھ) ہے، قایف (یا کے ساتھ) نہیں ہے۔ ملاحظہ ہو: أسد الغابة ط العلمية: ۷/۲۵۲ مع تعليق المحقق على مسند أحمد: ۴۵/۱۰۲

دیا تھا۔ وہ فرماتی ہیں کہ (ہم اندر غسل دے رہی تھیں اور) حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم (باہر) دروازے کے پاس تشریف فرما تھے، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ام کلثوم رضی اللہ عنہا کا کفن اپنے پاس رکھ رکھا تھا، (جب کفن دینے کا وقت آیا تو) آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ایک ایک کپڑا کر کے ہمیں پکڑاتے گئے، سب سے پہلے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہمیں چادر دی، اس کے بعد قمیص دی، پھر اوڑھنی، اور اس کے بعد چادر دی۔ پھر آخر میں آپ رضی اللہ عنہا کو ایک اور بڑی چادر میں لپیٹ دیا گیا۔[1]

اسماء بنت عُمیس کی روایت میں ہے کہ میں نے اور صفیہ بنت عبد المطلب نے اکٹھے مل کر سیدہ ام کلثوم کو غسل دیا۔ (غسل و تکفین سے فارغ ہونے کے بعد) میں نے ان کے جنازے والی چارپائی کے اوپر تازی ٹہنیوں کی ایک ڈولی بنادی جس سے ان کا بدن لوگوں کی نظروں سے مکمل طور پر چھپ گیا۔[2]

نمازِ جنازہ و تدفین:

حضرت ام کلثوم رضی اللہ عنہا کے غسل و تکفین کا انتظام جس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی نگرانی میں کرایا اسی طرح ان کا نماز جنازہ بھی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خود پڑھایا۔[3] اس کے بعد پھر تدفین کے آخر تک آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مسلسل شریک رہے اور صحابہ کرام کی جماعت بھی ہمراہ تھی۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قبر پر تشریف لائے اور پوچھا: هَلْ فِيكُمْ مِنْ أَحَدٍ لَمْ يُقَارِفِ اللَّيْلَةَ؟ (کیا تم میں سے کوئی ایسا شخص ہے جو آج رات اپنی اہلیہ کے قریب نہ گیا ہو؟) ابو طلحہ انصاری رضی اللہ عنہ نے کہا: جی ہاں! مَیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان سے فرمایا: تم قبر میں اترو، چنانچہ وہ قبر کے اندر اترے[4] اور ان کے ساتھ حضرت علی بن ابی طالب، فضل بن عباس اور اسامہ بن زید رضی اللہ عنہم بھی قبر میں اترے اور تدفین کا عمل سرانجام دیا گیا،[5] آپ رضی اللہ عنہا کی یہ تدفین جنت البقیع میں ہوئی۔[6]

تدفین کے وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قبر کے کنارے پر بیٹھے ہوئے تھے اور آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔[7]

---

(۱) مسند احمد: ۴۵/۱۰۶ وذخائر العقبی في مناقب ذوي القربی ص: ۱۲۸

(۲) الطبقات الکبری: ۸/۳۱ والسمط الثمین، ص: ۲۴۲

(۳) الطبقات الکبری: ۸/۳۱ وتاریخ الخمیس في أحوال أنفس النفیس ۱/۲۷۶

(۴) ینظر: صحیح البخاري: ۲/۷۹ مع شرح صحیح البخاری لابن بطال: ۳/۳۲۸ وفتح الباري لابن حجر: ۳/۱۵۸ وکشف المشکل من حدیث الصحیحین: ۳/۲۹۵ وغیرها. وکذا ینظر: إمتاع الأسماع ۵/۳۴۵

(۵) الطبقات الکبری: ۸/۳۱، والمنتخب من ذیل المذیل، ص: ۲، وذخائر العقبی، ص: ۱۶۶، ونور الأبصار - ط: مکتبة الفجر الجدید-، ص: ۴۴

(۶) سیرة فاطمة الزهراء، ص: ۵۷

(۷) صحیح البخاري ۲/۷۹

۴۔ سیدہ حضرت فاطمۃ الزہراء سَلامُ اللہ و رِضوانُہ علیہا کی سیرت و مناقب

تمہیدی بات:

صاحبزادیوں میں سے حضرت فاطمہؓ سب سے چھوٹی تھیں اور آپ ﷺ کو ان میں سے سب سے زیادہ پیاری تھیں اور یہی آپ ﷺ کی زندگی بھر باحیات رہیں۔ باقی آپ کی ساری اولاد آپ ﷺ کی زندگی میں ہی انتقال فرما گئی تھی[1]۔ اور آپ ﷺ کی نسل کا آگے سلسلہ بھی تمام صاحبزادیوں میں سے صرف حضرت فاطمہؓ سے چلا (یعنی ان کے صاحبزادوں حضرات حسنین کریمینؓ کی اولاد کے ذریعہ سلسلۂ نسل چلا)۔[2]

نام و نسب:

آپ سَلامُ اللہ وَرِضوانُہ علیہا کا نامِ مبارک "فاطمہؓ" تھا۔ آپ سَلامُ اللہ وَرِضوانُہ علیہا، امام الانبیاء حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ اور ام المومنین حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ کی صاحبزادی تھیں جیسا کہ ابھی گزرا۔ آپ سَلامُ اللہ وَرِضوانُہ علیہا کے دادا کا نام "حضرت عبداللہ"، دادی کا نام "حضرت آمنہ"، نانا کا نام "خُوَیلِد" اور نانی کا نام (آپؓ کے نام کی طرح) "فاطمہ" تھا۔[3]

آپ سَلامُ اللہ وَرِضوانُہ علیہا کے بہت سے القاب ہیں۔ ان میں سے "زہراء" (یعنی روشن چہرے والی) اور "بتول" (یعنی سب سے کٹ کر اللہ کی طرف یکسو ہونے والی[4]) زیادہ مشہور ہیں۔[5]

---

(۱) البدایۃ والنہایۃ طھجر: ۸/۲۳۱ مع تفسیر القرطبي: ۱۴/۲۳۱

(۲) شرح الفقہ الأکبر، ص: ۱۱۰، والإصابۃ: ۸/۲۶۳، وأسد الغابۃ: ۷/۲۱۶

(۳) ینظر تخریج النسب لأم المؤمنین خدیجۃ رضی اللہ عنہا من ھذا الجزء

(۴) اتحاف السائل بما لفاطمۃ من المناقب والفضائل ص: ۲۵، وشرح الفقہ الأکبر، ص: ۱۱۰

(۵) مستفاد من: اللطائف الأحمدیۃ فی المناقب الفاطمیۃ، ص: ۴

ولادتِ باسعادت:

راجح قول کے مطابق، جب حضور ﷺ کی عمر مبارک ۳۵ سال تھی (یعنی اعلانِ نبوت سے ۵ برس قبل)، حضرت فاطمہؓ کی ولادت ہوئی۔ یہ وہی سال ہے جب قریشِ مکہ، خانہ کعبہ کی تعمیرِ نو میں مشغول تھے اور حجرِ اسود کو نصب کرنے میں انہوں نے آپ ﷺ کو اپنا فیصل مقرر کیا تھا۔[۱]

آپ ﷺ کو جب خبر دی گئی کہ آپ کی چوتھی بیٹی پیدا ہوئی ہے تو آپ اس کو سن کر بہت خوش ہوئے، اور خوشگوار چہرہ اور خوشی کے تاثرات کے ساتھ جلدی سے اپنی اہلیہ (حضرت خدیجہؓ) کے پاس گھر تشریف لے گئے۔ انہیں ان کی خیریت وسلامتی پر مبارکباد دی اور بچی کیلیے برکت کی دعا کی۔

حضرت خدیجہؓ نے (اُس وقت کے معاشرے میں چوتھی بیٹی پیدا ہونے کے تناظر میں) کچھ سہمی ہوئی نگاہوں سے حضور ﷺ کی طرف دیکھا، جونہی کچھ کہنے کا ارادہ کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا: "کوئی بات نہ کہنا، ہر بچہ ہمارے لیے برابر ہے۔ ہمارے نزدیک لڑکے اور لڑکی میں کوئی فرق نہیں۔ اللہ تعالیٰ جو چاہتا ہے عطا کرتا ہے، ہم اس کی عطا پر راضی ہیں۔ میں بچی سے بہت خوش ہوں۔ عنقریب یہ ہمارے لیے بھلائی اور قبولیت کا ساماں بنے گی"۔[۲]

ہجرتِ مدینہ اور حضرتِ علیؓ سے نکاح:

حضور ﷺ نے حضرت ابوبکر صدیقؓ کے ہمراہ جب مدینہ طیبہ کو ہجرت کی تو آپ ﷺ اور حضرت صدیق اکبرؓ، دونوں حضرات، اپنے اہل وعیال کو یہیں مکہ مکرمہ میں چھوڑ گئے جن میں حضرت فاطمہؓ بھی تھیں۔ وہاں پہنچنے کے بعد ان حضرات نے اپنے اہل وعیال کو بھی مدینہ طیبہ بلوالیا، چناں چہ کچھ ہی مدت بعد دیگر اہل کے ساتھ حضرت فاطمہؓ بھی ہجرت کر کے مدینہ طیبہ حضور ﷺ کے پاس پہنچ گئیں۔[۳]

ہجرت کے دوسال بعد حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے حضور ﷺ سے آپ کی صاحبزادی حضرت فاطمہؓ سے اپنے

---

(۱) تفسیر القرطبي: ۱۴/ ۲۴۱، والإصابة: ۸/ ۲۶۳، والطبقات الکبری: ۸/ ۲۲، والمنتخب من ذیل المذیل ص: ۹۰، وسبل الھدی: ۱۱/ ۳۷، واتحاف السائل ص: ۲۳، والدر المنثور في طبقات ربات الخدور، ص: ۳۵۹

(۲) أبناء النبي للشیخ إبراھیم محمد حسن الجمل، والاقتباس المذکور من ترجمۃ الموسومۃ بہ خاندانِ نبوی کے چشم وچراغ، ص: ۱۵۷

(۳) ینظر: سیر أعلام النبلاء ط الرسالۃ: ۲/ ۱۵۲

نکاح کے بارے میں درخواست کی تو آپ ﷺ نے دریافت فرمایا: کیا آپ کے پاس مہر کیلیے کچھ ہے؟ حضرت علیؓ نے عرض کی کہ میرے پاس ایک سواری اور ایک زرہ ہے۔[1] بہر حال آپ ﷺ نے نکاح کیلیے آمادگی واطمینان کا اظہار فرما کر حضرت عائشہؓ اور ام سلمہؓ سے فرمادیا کہ فاطمہؓ کی شادی کی تیاری کی جائے۔ چناں چہ انہوں نے عمدہ قسم کی مٹی منگوائی اور پھر دونوں نے مل کر مکان کو صاف کیا اور اس کی لپائی کی اور شادی کیلیے خوب اچھے انتظامات کیے یہاں تک کہ یہ دونوں خود فرماتی تھیں: فَمَا رَأَيْنَا عُرْسًا أَحْسَنَ مِنْ عُرْسِ فَاطِمَةَ "فاطمہؓ کی شادی سے بہتر ہم نے کوئی شادی نہیں دیکھی"۔[2]

شادی کے انتظامات مکمل ہوجانے کے بعد آپ ﷺ نے باقاعدہ مجلسِ نکاح منعقد کی اور (اللہ تعالی کے حکم دینے سے[3])، آپ نے اپنی لختِ جگر حضرت فاطمہؓ کا نکاح اپنے نیک وصالح چچازاد بھائی حضرت علیؓ سے کردیا۔ مجلسِ نکاح میں حضرت ابوبکر صدیق، عمر فاروق وعثمان غنیؓ وغیرہ مدعو تھے۔ نکاح کی یہ تقریب بالکل سادہ تھی۔

یہ نکاح غزوۂ بدر کے بعد رمضان شریف ۲ھ میں ہوا اور اس کے چند ماہ بعد ذی الحجہ ۲ھ میں رخصتی عمل میں آئی۔ اس وقت حضرت فاطمہؓ کی عمر اٹھارہ سال تھی (یا اس سے کچھ کم وبیش تھی)۔ اور حضرت علیؓ کی عمر مشہور قول کے مطابق اکیس برس تھی۔[4]

واضح رہے کہ حضرت علیؓ جب رسول اللہ ﷺ کے پاس، حضرت فاطمہؓ کا نکاح طلب کرنے کیلیے حاضر ہوئے تھے، تو آپ ﷺ نے پہلے جا کر حضرت فاطمہؓ سے پوچھا: إِنَّ عَلِيًّا يَذْكُرُكِ "علی تم سے نکاح کرنے کا کہہ رہے ہیں (تمہاری کیا رائے ہے)؟" آپ سلامُ اللهِ ورضوانُهُ عليها سن کر (شرم کی وجہ سے) خاموش ہوگئیں۔ جب آپ ﷺ نے ان کی یہ خاموشی دیکھی تو (چونکہ کنواری لڑکی کا شرم کی وجہ سے خاموش ہوجانا رضامندی شمار ہوتا ہے، چناں چہ) آپ ﷺ نے حضرت علیؓ سے ان کا نکاح کردیا۔[5]

---

(۱) التاريخ الكبير للبخاري: ۳/ ۶۰

(۲) ينظر: سنن ابن ماجه: ۱/ ۶۱۶

(۳) مجمع الزوائد ومنبع الفوائد: ۹/ ۲۰۴

(۴) ينظر: بنات أربعة، ص: ۳۶۶

(۵) سيرة ابن اسحاق = كتاب السير والمغازي ص: ۲۴۶، ۲۴۷، والطبقات الكبرى: ۸/ ۱۶، واعتمد عليه السيوطي في "الثغور الباسمة في مناقب سيدتنا فاطمة"، ص: ۴۲

حضرت فاطمہ ؓ کا مہر (مہرِ فاطمی):

راجح قول کے مطابق حضرت فاطمہ ؓ کا مہر ۴۸۰ درہم تھا (جو ہمارے زمانہ میں ایک کلو ۶۳۲ گرام چاندی کے مساوی ہے)۔[1]

رخصتی:

حضرت فاطمہ ؓ کی رخصتی کے بارے میں مذکور ہے کہ حضرت علی ؓ نے سرورِ کائنات ﷺ کے کاشانۂ اقدس سے کچھ فاصلے پر ایک مکان کرایہ پر لے رکھا تھا۔ ایک دن حضرت علی ؓ کے بھائی حضرت عقیل ؓ بن ابی طالب ان کے پاس تشریف لائے اور کہا کہ ہم چاہتے ہیں رسول کریم ﷺ اپنی لختِ جگر کو اب رخصت کر دیں۔ حضرت علی ؓ نے جواب دیا: میری بھی یہی خواہش ہے۔ چناں چہ دونوں حضرات، حضرت امّ ایمن ؓ کے پاس تشریف لے گئے جو حضور ﷺ کی آزاد کردہ باندی تھیں اور جنہوں نے حضور ﷺ کے بچپن میں آپ ﷺ کی خبرگیری اور خدمت کی تھی۔ سرور عالم ﷺ ان کی بے حد تعظیم وتوقیر فرماتے تھے اور "میری ماں" کہہ کر مخاطب ہوتے تھے۔ حضرت ام ایمن ؓ ان دونوں کو ازواجِ مطہرات ؓ کے پاس لے گئیں، انہوں نے حضور ﷺ سے عرض کیا: یارسول اللہ! علی ؓ کی خواہش ہے کہ ان کی بیوی کو رخصت کر دیجئے۔ حضور رسالت مآب ﷺ راضی ہو گئے۔ چند درہم حضرت علی ؓ کو دیے اور فرمایا: "جاؤ بازار سے چھوہارے اور پنیر خرید لاؤ۔" حضرت علی ؓ نے پانچ درہم کا گھی خریدا، ایک درہم کا پنیر اور چار درہم کے چھوہارے، اور یہ سب اشیاء لا کر حضور ﷺ کے سامنے رکھ دیں۔ حضور ﷺ نے ان چیزوں کو دعوتِ ولیمہ کیلیے رکھ دیا، پھر آپ ﷺ نے حضرت فاطمۃ الزہراء ؓ کو بلایا، اپنے سینہ مبارک پر ان کا سر رکھا، پیشانی پر بوسہ دیا اور ان کا ہاتھ حضرت علی ؓ کے ہاتھ میں دے کر فرمایا:

"اے علی! پیغمبر کی بیٹی تجھے مبارک ہو"۔

اور "اے فاطمہ! تیرا شوہر بہت اچھا ہے۔ اب تم دونوں میاں بیوی اپنے گھر جاؤ۔"

---

(۱) سنن الترمذي: ۳/۴۱۵، وتاريخ الخميس: ۱/۳۶۱، وشرح الزرقاني: ۲/۳۵۹ مع تسهيل بهشتي زيور: ۲/۳۵

پھر دونوں کو میاں بیوی کے فرائض وحقوق بتائے اور خود دروازے تک رخصت کرنے آئے۔ دروازے پر حضرت علی المرتضیٰؓ کے دونوں بازو پکڑ کر انہیں دعائے خیر و برکت دی۔ سیدنا علی المرتضیٰؓ اور سیدۃ النساءؓ دونوں اونٹ پر سوار ہوئے، حضرت سلمان فارسیؓ نے اس کی نکیل پکڑی۔ حضرت اسماءؓ بنت عُمیس اور بعض روایتوں کے مطابق سلمیٰؓ ام رافع یا حضرت ام ایمنؓ، سیدہ فاطمہؓ کے ہمراہ ہوگئیں۔[1]

جہیز:

سرکارِ دوعالم ﷺ نے اپنی لختِ جگر کو جو جہیز دیا، مختلف روایتوں کے مطابق اس کی تفصیل یہ ہے:

۱۔ایک بستر مصری کپڑے کا، جس میں اون بھری ہوئی تھی۔

۲۔ایک نقشی تخت یا پلنگ

۳۔ایک چمڑے کا تکیہ جس میں کھجور کی چھال بھری ہوئی تھی۔

۴۔ایک مشکیزہ

۵۔دو مٹی کے برتن (یا گھڑے) پانی کیلیے

۶۔ایک چکی (ایک روایت میں دو چکیاں درج ہیں)

۷۔ایک پیالہ

۸۔دو چادریں

۹۔دو بازو بند نُقرَئی (یعنی بازو پر باندھنے کے دو زیور جو چاندی کے تھے)

۱۰۔ایک جائے نماز۔[2]

---

(۱) سیرة فاطمة الزهراء، ص:۹۴، واعتمد عليه المحقق الفاروقي حيث أقره في "سيدة فاطمة الزهراء، ص:۷"، وفي "فاطمة الزهراء البتول، ص:۱۷"، ما يشابهه ففيه: ركبت الزهراء فاطمة رضي الله عنها بغلة رسول الله صلى الله عليه وسلم وأمسك بلجامها سلمان الفارسي، وسار خلفها أبوها ومعه الحمزة وجعفر وعقيل وأبو طالب شاهرينَ السيوف حتى وصلوا إلى بيت علي بن أبي طالب. تابع رسولُ الله رحلته مع العروسَينِ حتى وصلا إلى مكانهما، فدعا بإناء فيه ماء فقرأ عليه بعض آي الذكر الحكيم ثم أمر العروسينِ أن يشربا منه وتوضأ بالباقي ونثره على رأسيهما، ثم دعا لهما قائلاً: "اللهم بارك فيهما وبارك عليهما وبارك لهما في نسلهما".

(۲) سيرة فاطمة الزهراء، ص:۹۵، وبعضه في مسند أحمد ط الرسالة: ۲/۱۹۱ أيضا.

ولیمہ:

جب حضرت علیؓ کی شادی ہوگئی تو حضور ﷺ نے ان سے فرمایا: علی! نئی دلہن کیلیے ولیمہ کا ہونا تو ضروری ہوتا ہے۔ اس پر حضرت سعد نے کہا: میرے پاس ایک مینڈھا کھڑا ہے اور انصار بھی "مکئی" کی کافی مقدار لے آئے۔ اس کے علاوہ حضرت علیؓ بھی ایک یہودی کے پاس اپنی زرہ گروی رکھ کر اُس سے جَو لے آئے اور ساتھ ہی کھجوروں کا بھی انتظام کیا۔ (چناں چہ دسترخوان پر کھجور، پنیر، جَو کی روٹی اور گوشت تھا[1]) بہر حال حضرت علیؓ نے حضرت فاطمہؓ کا شاندار ولیمہ کیا۔ حضرت اسماء بنت عُمیسؓ کہتی ہیں کہ اُس وقت حضرت علیؓ کے ولیمہ سے کسی کا ولیمہ افضل نہیں تھا۔

اور رسول اللہ ﷺ نے بھی حضرت فاطمہؓ کا ولیمہ کیا، چناں چہ حضرت ابن عباسؓ کی حدیث میں آتا ہے کہ آپ ﷺ نے گوشت روٹی کا ولیمہ کیا اور لوگ جب ولیمہ کھا کر فارغ ہوگئے تو باقی بچ جانے والا کھانا آپ ﷺ نے ازواج مطہرات کے پاس بھجوادیا۔[2]

گھر کی زندگی:

حضرت فاطمہؓ جب حضرت علیؓ کے گھر میں آگئیں تو آپ ﷺ نے گھر کے کاموں کو اس طرح تقسیم فرمادیا کہ اندرونِ خانہ سارا کام حضرت فاطمہؓ کے ذمہ اور باہر کے سارے کام حضرت علیؓ کے ذمہ ہوں گے۔[3]

تسبیحاتِ فاطمہ (جو آپؓ کو خادم کے بدلہ میں ملیں):

حضرت فاطمہؓ ایک دفعہ آپ ﷺ کے پاس خادم مانگنے کیلیے حاضر ہوئیں (تاکہ کام کاج میں وہ معاون ثابت ہو سکے)۔ آپ ﷺ نے فرمایا: میں تمہیں ایسی چیز نہ بتاؤں جو اس سے بہتر ہو؟ وہ یہ ہے کہ جب تم سونے لگو تو ۳۳ مرتبہ سبحان اللہ، ۳۳ مرتبہ الحمد للہ اور ۳۴ مرتبہ اللہ اکبر پڑھ لیا کرو۔[4]

---

(۱) سیرۃ فاطمۃ الزہراء، ص: ۹۴

(۲) مستفاد من سبل الهدى: ۱۱/۴۱، ۴۲، والبداية والنهاية ط هجر: ۱۱/۵۴، وسمط النجوم العوالي في أنباء الأوائل والتوالي: ۱/۵۲۱

(۳) سبل الهدى: ۱۱/۴۱، وحلية الأولياء وطبقات الأصفياء: ۶/۱۰۴

(۴) صحيح البخاري: ۷/۶۵

اولاد:

حضرت فاطمہؓ ہی حضرت علیؓ کی پہلی بیوی ہیں اور جب تک حضرت فاطمہؓ زندہ رہیں، تو آپ سَلامُ اللهِ وَرِضْوانُهُ علیہا کی تکریم واحترام میں حضرت علیؓ نے کوئی دوسری شادی نہیں کی، اور حضرت فاطمہؓ کے انتقال کے بعد حضرت علیؓ نے پھر کئی شادیاں کیں۔

بہر حال حضرت فاطمہؓ سے حضرت علیؓ کی جو اولاد ہوئی اس میں تین صاحبزادے اور دو صاحبزادیاں تھیں: صاحبزادوں کے نام حضرت حسنؓ، حضرت حسینؓ اور حضرت مُحَسِّن (سینِ مشدد کی زیر کے ساتھ[1]) تھے۔ ان میں سے حضرت محسّن بچپن میں ہی فوت ہو گئے تھے۔ اور صاحبزادیوں کے نام (حضرت فاطمہؓ کی بہنوں کے نام پر) حضرت زینبؓ اور حضرت ام کُلثومؓ تھے۔ حضرت زینبؓ کا نکاح حضرت عبداللہ بن جعفر طیّارؓ سے ہوا تھا اور حضرت ام کُلثومؓ کا نکاح امیر المومنین حضرت عمر بن خطابؓ سے ہوا تھا بلکہ حضرت عمرؓ نے حضرت علیؓ سے خود ان کا نکاح مانگا تھا تاکہ حضور ﷺ کے معزز و عالی خاندان کے ساتھ ان کا رشتہ اور ناتا قائم ہو جائے اور اسی عزت واحترام کے پیشِ نظر حضرت عمرؓ نے حضرت ام کُلثومؓ کو مہر میں ۴۰ ہزار درہم دیے (جو ساڑھے ۱۰ ہزار تولہ چاندی کے مساوی ہیں اور آجکل ان کی قیمت تقریباً ۸۴ لاکھ روپے بنتی ہے)۔[2] اور بعض حضرات نے ایک تیسری صاحبزادی حضرت رُقَیہؓ کا بھی تذکرہ کیا ہے، کہ وہ بچپن میں ہی وفات پا گئی تھیں[3]۔

وفات:

رسول اللہ ﷺ کے وصال کے بعد حضرت فاطمہؓ بہت غمزدہ رہتیں۔ چند ماہ بعد بیمار ہو گئیں، اور کئی دن تک بیمار رہیں۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ کی اہلیہ اسماء بنت عُمَیسؓ آپؓ کے پاس آتیں اور آپؓ کی خدمت کرتیں۔ بالآخر

---

(۱) سمط النجوم العوالي في أنباء الأوائل والتوالي: ۱/۵۳۰

(۲) ينظر: البداية والنهاية ط هجر: ۱۱/۸، ۲۵/۲۴۳، واتحاف السائل ص: ۳۳، وينظر للاستزادة في شأن زينب منهم: العُجَاجَةُ الزَّرْنَبِيَّةُ فِي السُّلَالَةِ الزَّيْنَبِيَّةِ — ضمن الحاوي للفتاوى —: ۲/۳۷، ۴۱

(۳) ذخائر العقبى في مناقب ذوي القربى ص: ۵۵

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے انتقال کے چھ ماہ بعد تین رمضان المبارک سنہ ۱۱ھ کو منگل کی رات مغرب اور عشاء کے درمیان آپ سلام اللہ و رضوانہ علیہا نے انتقال فرمایا۔ اس وقت آپ رضی اللہ عنہا کی عمر مبارک تقریباً ۲۹ برس تھی۔

حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی وصیت کے مطابق حضرت اسماء بنت عمیس رضی اللہ عنہا نے آپ رضی اللہ عنہا کے غسل کا انتظام کیا۔ ان کے ساتھ غسل کی معاونت میں بعض اور بیبیاں بھی شامل تھیں مثلاً حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے غلام "ابو رافع رضی اللہ عنہ" کی بیوی سلمٰی رضی اللہ عنہا اور ام ایمن رضی اللہ عنہا وغیرہ۔ حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ اس سارے انتظام کی نگرانی فرمانے والے تھے۔

جب غسل اور تجہیز و تکفین ہو گئی تو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے چار تکبیرات کے ساتھ نماز جنازہ پڑھائی، اور عام روایات کے مطابق آپ سلام اللہ و رضوانہ علیہا کو رات کو ہی جنت البقیع میں دفن کر دیا گیا۔ دفن کیلیے قبر میں حضرت علی رضی اللہ عنہ، حضرت عباس رضی اللہ عنہ اور حضرت فضل بن عباس رضی اللہ عنہ اترے۔[۱]

---

(۱) ملخص من بنات أربعة، ص: ۲۹۶ و مابعدها.

فضائل وخصائص

اللہ تعالیٰ نے حضرت فاطمہؓ کو بہت سے فضائل وخصائص سے نوازا تھا جن کو یہاں اس مختصر رسالہ میں جمع کرنا ممکن نہیں ہے۔ اس لیے یہاں صرف چند مشہور واہم فضائل درج کیے جاتے ہیں۔[1] اللہ تعالیٰ اسی کو ہماری مغفرت اور حصولِ شفاعت کا ذریعہ بنائے۔ آمین!

(۱) رسول اللہ ﷺ نے حضرت فاطمہؓ سے فرمایا: (فاطمہ!) جہاں تو ناراض ہوتی ہے وہاں اللہ بھی ناراض ہوتا ہے اور جہاں تو راضی ہوتی ہے وہاں اللہ بھی راضی ہوتا ہے۔[2]

(۲) آپ ﷺ نے فرمایا: فَاطِمَةُ بِضعَةٌ مِنِّي فَمَنْ أَغْضَبَهَا أَغْضَبَنِي ''فاطمہؓ میرے گوشت کا ٹکڑا ہے جس نے فاطمہؓ کو ناراض کیا اُس نے مجھے ناراض کیا''۔ اور ایک روایت میں آپ ﷺ نے فرمایا: يَرِيبُنِي مَا أَرَابَهَا وَيُؤْذِينِي مَا آذاها ''جو چیز فاطمہؓ کی پریشانی اور بے چینی کا سبب بنتی ہے وہ مجھے بھی بے چین کرتی ہے اور جو چیز فاطمہؓ کیلیے باعثِ تکلیف ہے وہ میرے لیے بھی تکلیف دہ ہے''۔[3]

ف: اس حدیث میں ہے کہ حضرت فاطمہؓ، حضور ﷺ کا ٹکڑا ہے اور یہ بات واضح ہے کہ حضرت فاطمہؓ کی اولاد اسی ٹکڑے (یعنی حضرت فاطمہؓ) کا ٹکڑا ہے۔ اسی طرح قیامت تک آنے والی اولادِ فاطمہؓ، بالواسطہ آپ ﷺ کا ہی ٹکڑا ہے۔ لہٰذا رہتی دنیا تک آنے والے سادات اور اہلِ بیت کا احترام اور ان کی تعظیم مسلمانوں پر لازم ہے اور اُن کو تکلیف پہنچانا حضور ﷺ کو تکلیف پہنچانے کے مترادف ہوگا کہ وہ سب بالواسطہ آپ ﷺ کا ہی ٹکڑا ہیں۔[4]

(۳) آپ ﷺ نے حضرت علی، فاطمہ، حسن اور حسین رضی اللہ عنہم سے فرمایا: جو تم سے جنگ کرے گا میری بھی اس سے جنگ ہے اور جو تم سے صلح رکھے گا میری بھی اس سے صلح ہے۔[5]

---

(۱) فائدہ: امام سیوطیؒ نے سیدہ حضرت فاطمۃ الزہراءؓ سے متعلقہ روایات کو متعدد کتبِ حدیث وتاریخ وغیرہ سے اپنے رسالہ ''مسند فاطمۃ الزہراء'' میں نہایت مفصل طور پر یکجا کیا ہے جو اپنی نوعیت کے لحاظ سے منفرد اور جامع رسالہ ہے۔

(۲) المعجم الكبير للطبراني: ۱۰۸/۱ بإسناد حسن كما في مجمع الزوائد ومنبع الفوائد: ۲۰۳/۹

(۳) مشكاة المصابيح: ۱۷۳۲/۳ متفق عليه، ومسند فاطمة الزهراء للسيوطي، رقم: ۱۲۱، ۱۲۳

(۴) مستفاد من اللطائف الأحمدية، ص: ۴۶، ۴۷ نقلاً عن "جواهر العقدين" للسمهودي. وكذا ينظر: الأنوار الباهرة، ص: ۱۵۲

(۵) سنن الترمذي ت شاكر: ۶۹۹/۵

(۴) حضرت جمیع بن عمیرؒ کہتے ہیں: میں اپنی پھوپھی کے ساتھ ام المومنینؓ حضرت عائشہؓ کی خدمت میں حاضر ہوا اور دریافت کیا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو سب سے زیادہ محبت کس سے تھی؟ آپؓ نے جواب دیا: حضرت فاطمہؓ سے۔ پھر پوچھا: مردوں میں سے سب سے زیادہ محبت کس سے تھی؟ آپؓ نے فرمایا: اُن کے شوہر (یعنی حضرت علیؓ) سے، جہاں تک میں جانتی ہوں وہ بہت زیادہ روزہ رکھنے والے اور بہت زیادہ رات کو عبادت کرنے والے تھے۔[1]

(۵) حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے حضرت حذیفہؓ سے فرمایا تھا کہ فرشتہ نے آکر مجھے یہ خوشخبری دی ہے: أَنَّ فَاطِمَةَ سَيِّدَةُ نِسَاءِ أَهْلِ الْجَنَّةِ وَأَنَّ الْحَسَنَ وَالْحُسَيْنَ سَيِّدَا شَبَابِ أَهْلِ الْجَنَّةِ ''فاطمہؓ جنت کی عورتوں کی سردار ہے اور حسنؓ وحسینؓ جنت کے نوجوانوں کے سردار ہیں''۔[2]

(۶) ایک موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے حضرت فاطمہؓ سے فرمایا تھا: کیا تم اس پر راضی نہیں ہو کہ تم تمام جنتی عورتوں کی یا فرمایا تھا: تمام مسلمان عورتوں کی سردار بن جاؤ۔[3]

ف: اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت فاطمہؓ پچھلی امتوں سمیت اس امت کی بھی تمام عورتوں سے زیادہ شان والی ہیں۔[4]

(۷) حضرت عائشہ صدیقہؓ فرماتی ہیں: میں نے حضرت فاطمہؓ سے زیادہ کسی کو نہیں دیکھا جو شکل وصورت، عادات واطوار اور چال ڈھال میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے مشابہ ہو۔ جب وہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے پاس آتیں تو (ان کی محبت میں) آپ کھڑے ہو جاتے، اپنے دستِ مبارک میں اُن کا ہاتھ لے لیتے، پیار کی وجہ سے اس ہاتھ کو چومتے اور پھر اپنی جگہ پر اُن کو بٹھاتے۔ اور (بالکل اسی طرح حضرت فاطمہؓ کو حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے محبت تھی، چناں چہ) جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اُن کے پاس تشریف لے جاتے تو وہ محبت میں آپ کیلئے کھڑی ہو جاتیں، آپ کا دستِ مبارک اپنے ہاتھ میں لے لیتیں، اس کو چومتیں اور پھر اپنی جگہ پر آپ کو بٹھاتیں۔[5]

---

(۱) مشكاة المصابيح: ۱۷۳۵/۳

(۲) ينظر: سنن الترمذي ت شاكر: ۶۶۱/۵

(۳) مشكاة المصابيح: ۱۷۳۲/۳

(۴) مرقاة المفاتيح شرح مشكاة المصابيح: ۳۹۶۴/۹

(۵) سنن أبي داود: ۳۵۵/۴

(۸) آپ ﷺ نے فرمایا: ہر عورت کے بیٹے کا "عصبہ" اُن کا باپ ہوتا ہے سوائے اولادِ فاطمہؓ کے، کہ میں اُن کا "عصبہ" ہوں اور میں اُن کا باپ ہوں۔[۱]

ف: مطلب یہ ہے کہ ہر عورت کی اولاد اپنے باپ کی طرف منسوب ہوتی ہے لیکن حضرت فاطمہؓ کی اولاد، رسول اللہ ﷺ کی طرف منسوب ہوتی ہے یعنی گویا وہ حضور ﷺ کی اولاد ہے۔ اسی وجہ سے حضرت فاطمہؓ کی اولاد "آلِ رسول" کہلاتی ہے یعنی رسول اللہ ﷺ کی اولاد۔[۲]

(۹) آپ ﷺ ایک مرتبہ حضرت فاطمہؓ کے پاس تشریف لائے تو وہ ہاتھ والی چکی سے آٹا پیس رہی تھیں اور اونٹ کی اون سے بنی ہوئی ایک چادر اوڑھ رکھی تھی۔ یہ مجاہدہ و مشقت دیکھ کر آپ ﷺ رو دیے۔ اور فرمایا: فاطمہ! دنیا کی اس مشقت اور کڑواہٹ کو آخرت کی ابدی نعمتوں کے بدلہ میں برداشت کرلو (یعنی عنقریب تمہیں آخرت میں جنت کی لازوال نعمتیں ملنے والی ہیں)۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: {وَلَسَوْفَ يُعْطِيكَ رَبُّكَ فَتَرْضٰى} "میرے حبیب! آپ کا رب عنقریب آپ کو اتنا دے گا کہ آپ راضی ہوجائیں گے"۔[۳]

(۱۰) حضور ﷺ جب کہیں سفر پر تشریف لے جاتے تو اپنے اہلِ خانہ میں سب سے آخر میں حضرت فاطمہؓ سے ملتے اور جب واپس آتے تو سب سے پہلے حضرت فاطمہؓ سے ملتے۔[۴] اور ایک روایت میں ہے کہ آپ ﷺ جب کسی جہاد یا سفر سے واپس تشریف لاتے تو پہلے مسجد میں جاتے، دو رکعات نفل پڑھتے۔ پھر حضرت فاطمہؓ کے گھر جاتے، اس کے بعد ازواجِ مطہراتؓ کے پاس تشریف لے جاتے۔[۵]

---

(۱) المعجم الكبير للطبراني: ۳/۴۴، وفضائل الصحابة لأحمد بن حنبل: ۲/۶۲۶

(۲) مستفاد من اللطائف الأحمدية، ص: ۳۵

(۳) إحياء علوم الدين: ۴/۲۳۳ مع المغني للعراقي ص: ۱۵۸۹

(۴) سنن ابي داود: ۴/۸۷

(۵) المعجم الكبير: ۲۲/۲۲۵، وذخائر العقبى، ص: ۳۷، والإمام الحسن للملطاوي، ص: ۲۶، ومسند فاطمة للسيوطي، رقم: ۱

چوتھا باب

ائمۂ اہلِ بیت سلام اللہ و رضوانہ علیہم کی سیرت ومناقب

اس باب میں امیر المومنین حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ، حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ اور حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کی سیرت ذکر کی جائے گی نیز ان حضرات حسنین کریمین رضی اللہ عنہما کی اولاد میں پیدا ہونے والے بعض مشہور ائمۂ اہلِ بیت کی سیرت ومناقب کو ذکر کیا جائے گا کہ یہ حضرات ائمۂ اہلِ بیت رضی اللہ عنہم اصحابِ فضل وکمال تھے، اور علم وعرفان اور تقویٰ وولایت کے اعلیٰ درجہ پر فائز تھے۔ ان سے خلقِ کثیر نے علمی وروحانی فائدہ حاصل کیا۔ یہی وجہ ہے کہ مشائخ تصوف کے اکثر سلسلے انہی ائمۂ اہلِ بیت پر جا کر ختم ہوتے ہیں۔[1] چنانچہ ان کی سیرت کا تذکرہ جہاں باعثِ برکت ہے وہاں ان کی حیات طیبہ امت مسلمہ کے لیے مشعلِ راہ ہے، کہ ان کی مبارک زندگیوں میں ہمارے لیے کئی دروسِ حیات پوشیدہ ہیں جن کی روشنی میں ہم اپنی زندگی کے مختلف موڑوں پر راہنمائی لے سکتے ہیں۔

ان حضرات کی سیرت بہ آسانی معلوم کرنے کے لیے بابِ ہذا کو درج ذیل تین فصول پر تقسیم کیا گیا ہے:

فصلِ اول: امیر المومنین وخلیفۃ المسلمین حضرت علی بن ابی طالب کرم اللہ وجہہ

فصلِ دوم: امام حسن رضی اللہ عنہ اور ان کے ائمہ صاحبزادے

فصلِ سوم: امام حسین رضی اللہ عنہ اور ان کے ائمہ صاحبزادے

---

(۱) ینظر: التفسیر المظہري: ۸/ ۳۲۰، وکذا ینظر في ہذا المقام: آل رسول اللہ وأولیاؤہ، ص: ۱۸۳ حیث قال صاحبہ فیہ: "علماء أہل البیت أئمۃ أہل السنۃ أیضا، ولم تأتم الشیعۃ بإمام ذي علم وزہد إلا وأہل السنۃ یأتمون بہ."

فصلِ اول

امیر المومنین حضرت علی سلام اللہ ورضوانہ علیہ

نام ونسب:

آپؓ کی والدہ نے پیدائش کے وقت آپؓ کا نام "اسد" (شیر) رکھا تھا۔ آپؓ کے والد اُس وقت کہیں گئے ہوئے تھے جب واپس آئے تو اسے تبدیل کر کے "علی" (اونچی شان والا) نام رکھ دیا۔[1] آپؓ کی کنیت "ابوالحسن" تھی، اور ایک کنیت "ابوتراب" بھی تھی جس کا قصہ آگے آرہا ہے۔[2]

آپؓ کے والد کا نام "عبد مناف" تھا مگر وہ اپنے بڑے بیٹے "طالب" کی نسبت سے اپنی کنیت "ابو طالب" کے ساتھ مشہور تھے۔ اور آپؓ کے دادا کا نام "عبدالمطلب" تھا جو کہ نبی کریم ﷺ کے بھی دادا تھے (لہذا آپؓ، حضور ﷺ کے سگے چچازاد بھائی ہوئے)۔ آپ سلام اللہ ورضوانہ علیہ کی والدہ کا نام "فاطمہ" اور نانا کا نام "اسد" تھا۔ آپ سلام اللہ ورضوانہ علیہ نسب کے اعتبار سے قریشی اور ہاشمی تھے۔[3] آپؓ کی والدہ بھی ہاشمیہ تھیں، بلکہ پہلی ہاشمی خاتون تھیں جو ہاشمی مرد کے نکاح میں آئیں۔[4]

آپ سلام اللہ ورضوانہ علیہ کے والد "ابوطالب" حضور ﷺ کے شفیق اور ہمدرد چچا تھے، اور مشکل گھڑیوں میں آپ ﷺ کا ساتھ دیا مگر اسلام نہ لا سکے،[5] البتہ آپؓ کی والدہ حضرت "فاطمہؓ بنت اسد" مشرف باسلام ہوئیں، خود حضور ﷺ کے ہاتھ پر اسلام قبول کیا اور جلیل القدر صحابیات میں شمار ہوئیں۔[6]

---

(1) غریب الحدیث للخطابي: ۱۷۹/۲

(2) الطبقات الکبری: ۹۱/۶، مع مناقب علي لابن المغازلي ص:۲۷، وحسن الصحابة في شرح أشعار الصحابة: ۱۱۷/۱

(3) البداية والنهاية طهجر: ۲۹/۱۱، وکذا ینظر: مناقب علي لابن المغازلي ص:۲۳ وما بعدها، والنسب والمصاهرة، ص:۱۲۵

(4) تاريخ حلب للعظيمي، ص:۹۵، ومثله في إزالة الخفاء عن خلافة الخلفاء: ۴۰۵/۴، وحسن الصحابة: ۱۱۷/۱

(5) صحيح البخاري: ۱۱۲/۶

(6) ینظر: نسب قریش ص:۴۰، وأسمی المطالب في سیرة علي بن ابي طالب، ص:۲۶ مع تاريخ حلب للعظيمي، ص:۹۵

آپ سلامُ اللہ و رِضوانُہ علیہ کے تین بھائی تھے: سب سے بڑے "طالب"، پھر "عقیل" اور اس کے بعد "جعفر (طیار)"،
اور آپ اپنے بھائیوں میں سب سے چھوٹے تھے۔ اور آپ کی دو سگی بہنیں تھیں: "ام ہانی" اور "جمانہ"۔ [1]

ولادتِ باسعادت:

راجح قول کے موافق آپ، حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اعلانِ نبوت سے دس (۱۰) سال پہلے مکہ مکرمہ میں پیدا ہوئے۔ [2]

کفالت اور اسلام قبول کرنا:

حضرت علی بچپن میں ہی حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی کفالت میں آ گئے تھے۔ [3] ایک مرتبہ انہوں نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اور حضرت خدیجہ کو نماز پڑھتے دیکھا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پوچھا کہ یہ کیا چیز ہے؟ اس پر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کو اسلام کی دعوت دی تو انہوں نے اگلے روز آ کر اسلام قبول کر لیا۔ [4] اُس وقت اُن کی عمر تقریباً دس (۱۰) برس تھی۔ [5] اور نوعمر لڑکوں میں سب سے پہلے آپ اسلام لائے۔ [6]

آپ سلامُ اللہ و رِضوانُہ علیہ نے اسلام لانے سے پہلے بھی کبھی بت پرستی نہیں کی تھی۔ اسی وجہ سے آپ کے نام کے ساتھ "کَرَّمَ اللہُ وَجْهَه" (یعنی اللہ آپ کے چہرہ کو اور عزت دے!) کے کلمات لکھے جاتے ہیں کہ آپ نے بچپن سمیت زندگی بھر کبھی اپنا چہرہ کسی بت کے آگے نہیں جھکایا۔ [7]

ہجرت مدینہ:

جب کفارِ مکہ کی طرف سے مسلمانوں کے اوپر سختیاں اور ایذا رسانیاں حد سے بڑھ گئیں تو مسلمانوں نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اجازت سے مدینہ طیبہ کی طرف ہجرت شروع کر دی کیونکہ وہاں اسلام تیزی کے ساتھ پھیل رہا تھا۔ اور خود آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، اللہ تعالیٰ کی طرف سے اپنے لیے حکمِ ہجرت کی انتظار میں مکہ مکرمہ میں ہی ٹھہرے رہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو

---

(۱) تاریخ الخمیس في أحوال أنفس النفيس: ۱/ ۱۶۳، ونسب قریش ص: ۳۹

(۲) الإصابة في تمييز الصحابة: ۴/ ۴۶۴ مع تاریخ خلیفة بن خیاط ص: ۱۹۹، والشرف المؤبد لآل محمد، ص: ۲۲

(۳) ینظر: سیرة ابن هشام: ۱/ ۲۴۶، وإزالة الخفاء عن خلافة الخلفاء: ۴/ ۴۰۶، وحسن الصحابة: ۱/ ۱۱۸

(۴) ینظر: البداية والنهاية ط هجر: ۴/ ۴۱

(۵) البداية والنهاية ط هجر: ۴/ ۶۴، مع الطبقات الكبرى ط العلمية: ۳/ ۱۵

(۶) البداية والنهاية ط هجر: ۴/ ۷۳

(۷) تاریخ اربل: ۱/ ۱۰۱، وفتح المغيث بشرح ألفية الحديث: ۳/ ۷۵، ونزل الأبرار، ص: ۱۱۶

مکہ میں دیکھ کر کفار نے "دار الندوہ" میں جمع ہو کر یہ منصوبہ بنایا کہ مختلف قبیلوں کے افراد مل کر رات کے وقت اکٹھے حضور ﷺ کو نعوذ باللہ قتل کردیں۔ اللہ تعالیٰ نے جبریلؑ کے ذریعہ، حضور ﷺ کو اس منصوبہ کی اطلاع کردی چناں چہ آپ اس رات اپنے بستر پر نہیں سوئے بلکہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ [1] کو فرمایا کہ وہ آپ ﷺ کی چادر اوڑھ کر ان کے بستر پر سو جائیں اور اہلِ مکہ کی وہ امانتیں جو آپ ﷺ کے پاس رکھی ہوئی تھیں، واپس کر کے پھر ہجرت کی غرض سے مدینہ طیبہ آجائیں۔ بہر حال اس رات حضرت علیؓ، آپ ﷺ کے بستر پر سو گئے۔ آپ ﷺ گھر سے باہر نکلے تو دشمنوں کا ایک دستہ تلواریں لیے مکان کے باہر حملہ کیلیے تیار کھڑا تھا۔ آپ ﷺ نے ایک مٹھی بھر خاک لی اور وہ مٹی ان کے سروں پر پھینکتے ہوئے باہر نکل گئے اس وقت آپ سورۃ یٰس کی آیات کی تلاوت کرتے ہوئے اس آیت تک پہنچے تھے: {فَأَغْشَيْنَاهُمْ فَهُمْ لَا يُبْصِرُونَ} [یٰس: ۹] (ہم نے ان کی آنکھوں پر پردہ ڈال دیا ہے جس سے انہیں کچھ نظر نہیں آتا)۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی آنکھوں پر پردہ ڈال دیا تھا جس سے وہ حضور ﷺ کو نکلتے ہوئے نہیں دیکھ سکے۔

جب صبح ہوئی اور انہوں نے دیکھا کہ اس بستر پر آپ ﷺ کے بجائے حضرت علیؓ موجود ہیں تو انہوں نے حضرت علیؓ کو پہلے مارا اور مسجد میں لے جا کر کچھ دیر باندھے رکھا پھر چھوڑ دیا۔ اور آپ ﷺ حضرت ابوبکر صدیقؓ کے ساتھ ہجرت کر کے مدینہ منورہ پہنچ گئے اور ادھر حضرت علیؓ نے اگلے دن لوگوں کو ان کی امانتیں واپس کرنا شروع کردیں۔ تین دن میں تمام امانتیں ان کے مالکوں تک پہنچا کر حضرت علیؓ بھی سفرِ ہجرت پر روانہ ہو گئے اور چھپتے چھپاتے مدینہ طیبہ پہنچ گئے اور سفر کی مشقت سے پاؤں مبارک پھٹ گئے تھے۔ اس وقت آپ ﷺ "قباء" میں تشریف فرما تھے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: اُدْعُوا إِلَيَّ عَلِيًّا "علی کو میرے پاس بلاؤ"۔ کسی نے کہا کہ وہ چل نہیں سکتے۔ تو آپ ﷺ خود ان کے پاس تشریف لے گئے، ان کو گلے لگایا اور ان کے پھٹے ہوئے پاؤں دیکھ کر آپ ﷺ رو دیے۔ پھر آپ ﷺ نے اپنے ہاتھوں پر اپنا لعاب مبارک لگا کر حضرت علیؓ کے پاؤں پر انہیں پھیرا جس سے وہ ٹھیک ہو گئے اور زندگی بھر، پھر کبھی ان کو پاؤں میں تکلیف نہیں ہوئی۔ اس کے بعد حضرت علیؓ وہیں مدینہ طیبہ رہنا شروع ہو گئے۔ [2]

---

(۱) فائدہ: "كَرَّمَ اللهُ وَجْهَه" لکھنے کی ایک وجہ یہ ذکر کی گئی ہے کہ "خوارج" چونکہ اپنی خباثت کی بدولت، حضرت علیؓ کے ساتھ بغض رکھنے کی وجہ سے آپ سلامُ اللہ و رضوانُہ علیہ کے نام کے ساتھ "سَوَّدَ اللهُ وَجْهَه" کہتے تھے اسی لیے اہلِ سنت وجماعت نے "كَرَّمَ اللهُ وَجْهَه" مقرر کیا۔ ملاحظہ ہو: الیواقیت الغالية: ۲/ ۳۴۴، ونوادر الفقه: ۱/ ۲۱۶، وإمداد الفتاوى: ۴/ ۳۷۴

(۲) ملخص من الكامل في التاريخ: ۱/ ۶۹۸-۶۹۴، وشئ من البداية والنهاية: ۲/ ۴۸۹

شادی:

مدینہ منورہ پہنچنے کے دو برس بعد نبی کریم کی لختِ جگر حضرت فاطمہؓ سے آپ سلامُ اللہ وَرِضوانُہٗ علیہ کی شادی ہوئی۔ شادی کے وقت آپؓ کی عمر ۲۱ برس اور حضرت فاطمہؓ کی ۱۸ سال تھی۔ اس شادی کی قدرے تفصیل پیچھے حضرت فاطمہؓ کے تذکرہ میں گزر چکی ہے، وہاں ملاحظہ کر لی جائے۔ حضرت فاطمہؓ کی زندگی میں آپؓ نے احتراماً کسی اور سے نکاح نہیں کیا، البتہ اُن کے انتقال کے بعد آپؓ نے پھر کئی شادیاں کیں اور ان زوجات سے اولادیں بھی ہوئیں۔[1]

شادی کے بعد "ابوتراب" کنیت پڑنا اور اُس کا قصہ:

ایک دفعہ رسول اللہ ﷺ حضرت فاطمہؓ کے گھر تشریف لائے اور دیکھا کہ حضرت علیؓ نہیں ہیں۔ پوچھا: تمہارا چچازاد بھائی کہاں ہے؟ حضرت فاطمہؓ نے کہا: ہمارے درمیان کچھ رنجش ہوگئی تھی (جیسا کہ میاں بیوی میں کبھی کبھار رنجش کا واقع ہوجانا ایک فطری چیز ہے)، اس لیے وہ مجھ سے ناراض ہوکر باہر چلے گئے اور دوپہر کو آج گھر بھی نہیں سوئے۔ آپ ﷺ نے ایک آدمی (حضرت سہل بن سعد رضی اللہ عنہ[2]) سے کہا: دیکھو کہاں ہیں وہ؟ انہوں نے آکر بتایا: باہر مسجد میں سوئے ہوئے ہیں۔ آپ ﷺ ان کے پاس تشریف لائے، دیکھا تو وہ لیٹے ہوئے تھے اور ان کے ایک پہلو سے چادر ہٹی ہوئی تھی اور وہاں مٹی لگ گئی تھی۔ آپ ﷺ اس مٹی کو صاف کرنے لگے اور ساتھ ہی فرمارہے تھے: قُمْ أَبَاتُرَاب! قُمْ أَبَاتُرَاب! "اٹھو، ابوتُراب! اٹھو، ابوتُراب!"۔ ابوتراب کا مطلب ہے: "مٹی والا شخص"۔[3]

---

(۱) ملحوظہ: ان زوجات اور ان سے ہونے والی اولادوں کا تذکرہ کتاب ہذا کے اختصار کی وجہ سے ترک کر دیا گیا ہے۔ جو ان کی تفصیلات کا خواہشمند ہو وہ البداية والنهاية ط الفكر: ۷/ ۳۳۰ کے عنوان "فصل في ذكر زوجاته وبنيه وبناته"، نسب قريش ص: ۴۰ کے عنوان "ولد علي بن أبي طالب" اور اتعاظ الحنفاء بأخبار الأئمة الفاطميين الخلفاء: ۱/ ۵ کے عنوان "ذكر أولاد أمير المؤمنين علي بن أبي طالب" کا مطالعہ کر لے اور اردو میں اس کیلیے مولانا نافع صاحبؒ کی کتاب نافع "سيرت سيدنا على المرتضى رضی اللہ عنہ" کے عنوان "حضرت علی المرتضیٰؓ کے ازواج واولاد، ص: ۵۲۷ کا مطالعہ کیا جاسکتا ہے۔ بہرحال مذکر اولاد میں سے حسن، حسین، عباس، ابوبکر، عمر، عثمان اور محمد بن حنفیہ کے نام زیادہ مشہور ہیں، البتہ آپؓ کی آگے نسل صرف ان پانچ صاحبزادوں سے چلی: حسن، حسین، محمد بن حنفیہ، عباس بن کلابیہ اور عمر بن تغلبیہ. كما في العَجَاجة الزَّرْنَبِيَّة في السُّلَالَة الزَّيْنَبِيَّة ۲/ ۳۷، واتعاظ الحنفاء: ۱/ ۸، والأنوار الباهرة، ص ۸۱

(۲) فتح الباري لابن حجر: ۱/ ۵۳۶

(۳) صحيح البخاري: ۱/ ۹۶

چونکہ رسول اللہ ﷺ کی زبانِ اطہر سے یہ کنیت صادر ہوئی اس لیے حضرت علیؓ اپنی اس کنیت کو بہت پسند کرتے تھے،[1] بلکہ آپؓ کو اپنے پکارے جانے میں جتنا یہ نام اچھا لگتا تھا اتنا اپنا کوئی اور نام نہیں لگتا تھا۔[2]

غزوات میں شرکت اور جنگی بہادری:

آپ سلام اللہ و رضوانہ علیہ بہت ہی بہادر اور دلیر مجاہد تھے۔ غزوہ تبوک میں رسول اللہ ﷺ نے آپ کو پیچھے مدینہ طیبہ میں ٹھہرایا تھا، اس غزوہ کے علاوہ باقی تمام غزوات میں آپؓ نے شرکت کی۔ کئی غزوات میں خود حضور ﷺ نے اپنے دستِ مبارک سے آپؓ کے ہاتھ میں جھنڈا دیا۔[3] جنگوں میں آپ کے دلیرانہ کارنامے بہت کثرت سے پائے جاتے ہیں۔ اختصار کی وجہ سے بطورِ نمونہ یہاں صرف ایک کارنامہ ذکر کیا جاتا ہے:

۵ھ میں غزوۂ خندق ہوا، اس وقت حضرت علیؓ کی عمر تقریباً ۲۴۔۲۵ سال تھی اور آپؓ نو عمر مجاہدین میں شمار ہوتے تھے۔ ادھر کفارِ قریش کے لشکر میں "عمرو بن عبدِ وُدّ" بھی تھا (جو اکیلا ایک ہزار شہسواروں کے برابر سمجھا جاتا تھا[4]) اور اس نے اپنے آپ کو "آہنی ہتھیاروں" سے لیس کر رکھا تھا۔ اس نے آ کر للکارا: مَنْ یُبَارِزُ؟ "تم میں سے کون ہے جو میرے مقابلہ میں آنے کی طاقت رکھتا ہو؟" حضرت علیؓ نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کی: یا نبی اللہ! میں ہوں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: یہ "عمرو" ہے، بیٹھ جاؤ۔ اس نے پھر توہین آمیز لہجہ میں کہا: أَیْنَ جَنَّتُکُمُ الَّتِي تَزْعُمُونَ أَنَّهُ مَنْ قُتِلَ مِنْکُمْ دَخَلَهَا، أَفَلَا تُبْرِزُونَ إِلَيَّ رَجُلًا؟ "کہاں ہے تمہاری وہ جنت، جس کے بارے میں تم یہ سمجھتے ہو کہ تم میں سے جو قتل ہو جائے وہ اس میں داخل ہوتا ہے؟ اب میرے سامنے اپنا آدمی کیوں نہیں لاتے ہو؟" حضرت علیؓ نے پھر عرض کی: میں جاتا ہوں، یا رسول اللہ! آپ ﷺ نے فرمایا: بیٹھ جاؤ۔ اس نے تیسری مرتبہ اپنی بہادری اور مسلمانوں کی بزدلی پر اشعار پڑھتے ہوئے غصہ دلانے کے انداز میں للکارا۔ حضرت علیؓ نے پھر کہا: میں جاتا ہوں، یا رسول اللہ! آپ ﷺ نے فرمایا: یہ "عمرو" ہے۔ حضرت علیؓ نے کہا: "ہوا کرے عمرو"۔ آپ ﷺ نے اجازت دے دی۔ حضرت علیؓ اٹھے اور اس کی موت و قتل پر مشتمل رجزیہ

---

(۱) حسن الصحابة في شرح أشعار الصحابة: ۱/۱۱۷، وكذا في سيده فاطمة الزهراء، ص: ۱۱

(۲) مناقب علي لابن المغازلي ص: ۳۲

(۳) أسد الغابة: ۴/۸۸، وتاريخ دمشق لابن عساكر: ۴۲/۷۱، ونزل الأبرار، ص: ۱۱۷-۱۱۲ والأنوار الباهرة، ص: ۸۱

(۴) الإمام الحسن بن علي للملطاوي، ص: ۲۴، والمرتضى، ص: ۷۴

اشعار پڑھتے ہوئے سیدھے اس کی طرف بڑھے۔ عمرو نے کہا: تم کون ہو؟ آپ ؓ نے کہا: میں علی بن ابی طالب ہوں۔ اس نے تحقیر کے انداز میں کہا: میرے بچے! کسی اور کو بھیجو۔ اپنے سے بڑی عمر والے اپنے کسی چچا وغیرہ کو میرے سامنے لاؤ۔ میں تم جیسے بچے کا خون بہانا پسند نہیں کرتا۔ اس پر حضرت علی ؓ نے اس سے جرأت مندانہ لب ولہجہ میں کہا: ''لیکن میں تمہارا خون بہانا پسند کرتا ہوں''۔

یہ سن کر وہ ایک دم غصے میں آگ بگولہ ہوگیا، اپنی تلوار لہرائی اور شدید غضبناک ہوکر آگے بڑھا اور حضرت علی ؓ پر حملہ کیا۔ آپ ؓ نے اپنی ڈھال سے اس کو روکا اور پھر اس کے کندھے پر تلوار کا ایک زوردار وار کیا۔ اللہ کے اِس شیر کا ایک وار ہی اسے کافی ہوا جس سے وہ زمین پر ڈھیر ہوگیا، اور ایک دم گرد وغبار اٹھا اور شور برپا ہوا۔ آپ ﷺ نے یہیں سے "اللہ اکبر" کی آواز سنی تو پہچان گئے کہ "علی ؓ" نے اُسے قتل کردیا ہے۔ پھر آپ ؓ وہاں سے نہایت جرأتمندانہ اور ایمان افروز اشعار پڑھتے ہوئے حضور ﷺ کے پاس آئے اور آپ کا چہرہ خوشی سے چمک رہا تھا۔[1]

وصالِ نبوی میں حضرت علی ؓ کی خدمات:

حضرت علی ؓ کو یہ سعادت بھی حاصل ہے کہ جب حضور ﷺ کا وصال ہوا تو آپ ﷺ کے غسل کے فرائض حضرت علی ؓ نے سرانجام دیے۔ آپ سلام اللہ ورضوانہ علیہ کے ساتھ آپ ؓ کے چچا حضرت عباس ؓ، ان کے صاحبزادے حضرت فضل ؓ اور حضرت قثم ؓ، اور حضور ﷺ کے آزاد کردہ غلام "شقران ؓ" اور منہ بولے بیٹے "زید ؓ" کے صاحبزادے "اسامہ بن زید ؓ" بھی شریک تھے۔ ان میں سے حضرت عباس ؓ، اپنے صاحبزادوں فضل ؓ اور قثم ؓ سمیت، آپ ؓ کے ساتھ حضور ﷺ کو کروٹ دیتے تھے، حضرت شُقران ؓ اور اسامہ بن زید ؓ پانی ڈالتے تھے اور حضرت علی ؓ، آپ ﷺ کو اپنے سینے سے سہارا دیے آپ ﷺ کو کپڑوں کے اوپر سے غسل دیے جاتے تھے۔

اور دفن کے وقت آپ ﷺ کی قبر اطہر میں اترنے والے حضرات میں حضرت علی ؓ بھی تھے۔[2]

---

(۱) البدایۃ والنہایۃ ط ھجر: ۶/ ۴۳

(۲) سیرۃ ابن ھشام: ۲/ ۶۶۲، ۶۶۴، وکذا في إزالۃ الخفاء عن خلافۃ الخلفاء: ۳/ ۴۳۹، ۴۴۰

خلافت کی ذمہ داری:

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے ہاتھ پر مسلمانوں نے خلافت کی بیعت کی اور آپ رضی اللہ عنہ کو اپنا متفقہ خلیفہ منتخب کیا۔ ان کے بعد یکے بعد دیگرے حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ اور حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کے ہاتھ پر مسلمانوں نے خلافت کی بیعت کی۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ ان تینوں خلفاء حضرات کے ہاتھ پر بیعت کرنے کے ساتھ ساتھ ان کے زمانہ خلافت کے دوران ان حضرات کے خصوصی معاون ومشیر رہے۔ پھر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو جب باغیوں نے مدینۃ الرسول صلی اللہ علیہ وسلم میں شہید کردیا تو مسلمانوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے دستِ مبارک پر خلافت کی بیعت کی، اول آپ سلام اللہ ورضوانہ علیہ نے یہ ذمہ داری لینے سے صاف انکار کردیا تھا مگر جب لوگوں کا اصرار حد سے بڑھا تو آپ رضی اللہ عنہ نے مجبوراً یہ ذمہ داری قبول فرمالی۔ [1] حقیقت یہ ہے کہ ان تین خلفاء کرام رضی اللہ عنہم کے بعد اس منصب خلافت کیلیے حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے بڑھ کر کوئی اور صاحب مناسب نہیں تھے۔ نہ مقام ومرتبہ، نہ علم وتقویٰ اور نہ دینداری میں کوئی آپ رضی اللہ عنہ کے برابر تھا، اس لیے آپ رضی اللہ عنہ ہی خلیفۃ المسلمین قرار پائے اور آپ رضی اللہ عنہ کے حق میں بیعت منعقد ہوگئی۔ [2] یہ بیعت بروز جمعرات ۲۴ ذی الحجہ ۳۵ھ میں ہوئی۔ خلافت کی یہ ذمہ داری سنبھالنے کے بعد اگلے دن جمعہ کو آپ رضی اللہ عنہ مسجد میں تشریف لائے اور منبر پر ایک جاندار خطبہ دیا جو سنہری حروف سے لکھنے کے قابل ہے اس میں آپ رضی اللہ عنہ نے موقع شناسی اور منجانب اللہ عطا کردہ بصیرت کے پیشِ نظر اس نکتہ پر خاص طور پر زور دیا کہ مسلمانوں کی جانیں اور ان کی عزتیں انتہائی قابل احترام ہیں، کسی مسلمان کا ناحق خون بہانا کسی طرح جائز نہیں ہے وغیرہ وغیرہ۔ [3]

آپ رضی اللہ عنہ نے اپنا دارالخلافہ "مدینہ منورہ" کے بجائے عراق کے شہر "کوفہ" کو بنایا تاکہ باغی وسرکش لوگوں کی شورش، بغاوت اور خون ریزی جیسی ناپاک حرکتوں سے مدینۃ الرسول صلی اللہ علیہ وسلم محفوظ رہے اس کے علاوہ اور بھی کئی حکمتیں تھیں۔ [4]

---

(۱) البدایۃ والنہایۃ ط ھجر: ۱۰/۴۱۹

(۲) العواصم من القواصم ط الأوقاف السعودیۃ ص: ۱۴۲

(۳) البدایۃ والنہایۃ ط ھجر: ۱۰/۴۲۲

(۴) ینظر: المرتضیٰ، ص: ۲۲۲

شہادت:

جب آپ کرم اللہ وجہہ نے اپنا دار الخلافۃ "کوفہ" بنالیا تو آپؓ وہیں امورِ خلافت کی ذمہ داریاں سرانجام دینے میں مشغول رہنے لگے۔ مگر کچھ لوگ جس طرح آپؓ سے پہلے حضرت عثمان بن عفانؓ کے مخالف اور باغی ہو گئے تھے اسی طرح بعض سرکش لوگ آپؓ کی مخالفت میں اپنی کوششیں مسلسل صرف کررہے تھے اور ان میں "خوارج" کا گروہ جو آپؓ سے بغض رکھتا تھا، خاص طور پر آنجنابؓ کا مخالف ودشمن ہو گیا تھا۔ اسی دشمنی ونقصان رسانی کو پروان چڑھانے کیلیے انہوں نے مکہ مکرمہ میں بیٹھ کر ایک منصوبہ تیار کیا اور پھر اسی منصوبہ کے تحت "عبدالرحمن بن مُلجَم" نامی ایک خارجی کو آپؓ کے قتل کیلیے کوفہ روانہ کردیا۔ وہ کوفہ پہنچ کر اس دروازے کے سائبان کے پاس چھپ کر بیٹھ گیا جہاں سے آپؓ نماز فجر کیلیے نکلا کرتے تھے۔ آپؓ کا معمول یہ تھا کہ آپؓ مسجد میں نماز فجر کیلیے جلدی تشریف لاتے تھے اور الصَّلَاةَ، الصَّلَاةَ (نماز، نماز) کی آواز لگاتے ہوئے لوگوں کو بیدار کرتے آتے تھے۔ چناں چہ آپؓ جب منہ اندھیرے اس دروازے سے باہر نکلے تو اس بدبخت نے آگے بڑھ کر آپؓ کے سر مبارک کے اگلے حصہ پر زہر میں بجھی تلوار سے وار کیا جس سے سر پر گہرا زخم آیا اور اس خون سے آپ کی ڈاڑھی مبارک سرخ ہو گئی (اور نبی صادق ﷺ کی پیشین گوئی بھی حرف بحرف سچ ثابت ہو گئی[1])۔

آپؓ نے فرمایا: اس کو پکڑ لو۔ جب اسے پکڑ کر آپ کے سامنے لایا گیا تو آپؓ نے فرمایا: إِنَّهُ أَسِيرٌ فَأَحْسِنُوا نُزُلَهُ وَأَكْرِمُوا مَثْوَاهُ فَإِنْ بَقِيتُ قَتَلْتُ أَوْ عَفَوْتُ وَإِنْ مِتُّ فَاقْتُلُوهُ قِتْلَتِي وَلَا تَعْتَدُوا إِنَّ اللهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِينَ

"اس وقت اس کی حیثیت ایک قیدی کی ہے۔ لہٰذا میں تمہیں حکم دیتا ہوں کہ تم (اس کا خیال رکھو) اسے عمدہ کھانا کھلاؤ اور اس کیلیے اچھی رہائش کا انتظام کرو۔ اگر میں زندہ رہا تو میری مرضی، چاہے میں اس کو قتل کروں یا معاف کردوں۔ اور اگر میں انتقال کر گیا تو میرے قتل کی طرح تم اس کو قتل کردینا، اور اس قتل میں حد سے آگے نہ بڑھنا

---

(۱) فائدہ: ایک دفعہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت علیؓ سے فرمایا تھا: کیا میں تمہیں یہ نہ بتاؤں کہ لوگوں میں سب سے بدبخت شخص کون ہے؟ آپؓ نے عرض کیا: جی ہاں! فرمایئے۔ حضور ﷺ نے فرمایا: وہ بدبخت ترین شخص دو ہیں: ایک تو قومِ ثمود کا وہ سرخ فام شخص جس نے حضرت صالح علیہ السلام کی اونٹنی کی ٹانگیں کاٹی تھیں، اور اے علی! دوسرا وہ شخص ہوگا جو تمہیں اس جگہ (اور پھر آپؓ کے سر کے اگلے حصہ کی طرف اشارہ کیا) پر ضرب لگائے گا جس سے یہ جگہ (اور آپؓ کی ڈاڑھی آپ ﷺ نے اپنے ہاتھ میں لے لی) تر ہوجائے گی۔ ملاحظہ ہو: الشريعة للآجري: ۲۱۰۲/۴، مع قصص الأنبياء لابن كثير ۱۵۶/۱، ومناقب علي لابن المغازلي ص: ۳۱، والآحاد والمثاني لابن أبي عاصم: ۱۴۷/۱، و مثله في المستدرك للحاكم: ۱۵۱/۳، ومسند أحمد: ۲۵۷/۳۰، وسلسلة الأحاديث الصحيحة: ۳۲۴/۴، والسنن الكبرى للنسائي: ۲۶۴/۷

(یعنی اس کے ناک، کان وغیرہ نہ کاٹنا [1]) کہ اللہ حد سے بڑھ جانے والوں کو پسند نہیں کرتا"۔ بہر حال ابن مُلجَم گرفتار کرلیا گیا اور آپ سلامُ اللہ وَ رِضوانُہ علیہ کو اٹھا کر گھر پہنچا دیا گیا۔ یہ ۱۷ رمضان المبارک سنہ ۴۰ھ، جمعہ کی صبح تھی۔ شدتِ زخم کی تاب نہ لاتے ہوئے آپ دو دن بعد شبِ اتوار کو شہادت کے مرتبہ پر فائز ہو کر خالقِ حقیقی سے جا ملے۔ آپؓ نے ۴ سال ۹ ماہ خلافت کی اور ۶۳ برس عمر پائی۔ شہادت کے بعد فوراً آپؓ کے غسل اور کفن و دفن کی تیاری شروع کر دی گئی۔ آپؓ کے صاحبزادوں حضرت حسنؓ و حسینؓ اور بھتیجے عبداللہ بن جعفر طیارؓ نے آپؓ کو غسل اور کفن دیا۔ تجہیز و تکفین کے بعد آپؓ کے بڑے صاحبزادے حضرت حسنؓ نے نمازِ جنازہ پڑھائی اور پھر وہیں کوفہ میں ہی "دارالامارۃ" (یعنی نشستگاہِ امیر المومنین) میں دفن کر دیا گیا۔

اور ابن مُلجَم جو قید کر لیا گیا تھا، اس کو بھی حضرت علیؓ کی شہادت کے بعد قتل کر دیا گیا۔ [2]

---

(۱) مجمع الزوائد ومنبع الفوائد: ۹/ ۱۴۲

(۲) مستفاد من البداية والنهاية طهجر: ۱۲/ ۱۱، و: ۹/ ۲۰۷ و[الطبقات الكبرى: ۳/ ۲۵

فضائل ومناقب

روایاتِ حدیث میں صحابہ کرامؓ میں سب سے زیادہ حضرت علیؓ کے فضائل مروی ہیں،[1] کہ دراصل آپؓ کو جلیل القدر اور عظیم الہمت صحابی ہونے کے ساتھ ساتھ رسول اللہ ﷺ کے قریبی رشتہ دار ہونے کا شرف بھی حاصل تھا۔[2] اور علماء نے آپ سلام اللہ ورضوانہ علیہ کے مناقب وخصائص پر مستقل کتابیں لکھی ہیں،[3] مگر کتابِ ہذا کے اختصار کے پیشِ نظر ذیل میں صرف چند فضائل[4] درج کیے جاتے ہیں:

حضرت علی سلامُ اللہ ورِضوانُہ علیہ سے محبت، علامتِ ایمان ہے:

(۱) حضرت زِر بن حُبیشؒ (تابعی) سے روایت ہے کہ حضرت علی سلامُ اللہ ورِضوانُہ علیہ نے فرمایا: قسم ہے اس ذات کی جس نے دانہ کو پھاڑا (یعنی اُگایا) اور ذی روح کو پیدا کیا، بلاشبہ نبی امی ﷺ نے مجھے یہ یقین دلایا تھا کہ جو مومن ہوگا وہ مجھ سے (یعنی حضرت علیؓ سے) محبت کرے گا اور جو منافق ہوگا وہ مجھ سے بغض رکھے گا۔[5]

ف: اس حدیث شریف سے معلوم ہوا کہ حضرت علی سے محبت رکھنا ایمان کی علامت، اور ان سے بغض وعداوت رکھنا منافقت کی علامت ہے۔

(۲) حضور ﷺ نے فرمایا: **اللّٰھُمَّ مَنْ کُنْتُ مَوْلَاہُ، فَعَلِيٌّ مَوْلَاہُ، اللّٰھُمَّ وَالِ مَنْ وَالَاہُ، وَعَادِ مَنْ عَادَاہُ.**
''اے اللہ! میں جس کا دوست اور محبوب ہوں، علیؓ بھی اس کے دوست اور محبوب ہیں (مطلب یہ ہے کہ جو شخص حضور ﷺ سے محبت کا دعویٰ کرے اور حضرت علیؓ سے محبت نہ کرے وہ اپنے دعویٰ میں سچا نہیں ہے)، اے اللہ! جو علیؓ سے محبت اور دوستی رکھے تُو بھی اس سے محبت کر اور جو علیؓ سے عداوت ودشمنی کرے تو بھی اس سے دشمنی کر''۔[6]

---

(۱) ینظر: الإصابة: ۴/۴۶۴، ونزل الأبرار - نقلا عن النسائي والحاکم -، ص: ۳۷ والأنوار الباهرة، ص: ۸۲

(۲) ینظر: إزالة الخفاء عن خلافة الخلفاء: ۴/۴۴۱

(۳) جیسے امام نسائیؒ کی ''خصائص أمیر المؤمنین علي بن أبي طالب'' اور امام ابن جزریؒ کی ''مناقب الأسد الغالب'' وغیرہ

(۴) ومن أراد الاستزادة فلیرجع إلی مَن بسطَ الکلامَ فیه وهم کثیرون لا یُعَدُّون ولا یُحصَون، منهم - علی سبیل المثال - البدخشاني في نزل الأبرار، والتلیدي في الأنوار الباهرة وغیره.

(۵) صحیح مسلم: ۱/۸۶، رقم: ۱۳۱

(۶) مسند أحمد: ۲/۲۶۲ وکذا لاحِظ لزامًا: الخصائص للنسائي، ص: ۹۶ ومابعدها، وص: ۱۱۳ ومابعدها

حضرت علیؓ کو تکلیف دینا حضور ﷺ کو تکلیف دینے کے مترادف ہے:

(۱) حضرت عمرو بن شاس اسلمی (جو کہ اہلِ حدیبیہ میں سے تھے) فرماتے ہیں: میں ایک مرتبہ حضرت علیؓ کے ہمراہ یمن کی طرف گیا، اس سفر کے دوران انہوں نے میرے ساتھ کوئی خاص توجہ والا معاملہ نہیں کیا، جس سے میرے دل میں ان کے بارے میں کچھ بات سی آ گئی۔ چناں چہ جب میں واپس آیا تو میں نے مسجد میں بیٹھ کر اپنی اس شکایت کو ظاہر کر دیا حتی کہ یہ بات رسول اللہ ﷺ تک پہنچ گئی، پھر جب میں ایک صبح کو مسجد میں گیا اور رسول اللہ ﷺ وہاں اس وقت کچھ صحابہ کرامؓ کے ساتھ تشریف فرما تھے، آپ ﷺ نے جب مجھے دیکھا تو مجھ پر اپنی نظریں جما کر مجھے بغور دیکھا یہاں تک کہ جب ہم لوگ آپ کے پاس آ کر بیٹھ گئے تو آپ ﷺ نے فرمایا: "اے عمرو! واللہ! تم نے مجھے اذیت پہنچائی ہے"۔ میں نے عرض کیا: یا رسول اللہ! میں اس بات سے اللہ کی پناہ چاہتا ہوں کہ میں آپ کو کوئی تکلیف دوں (یعنی میں آپ کو تکلیف دینے کا سوچ بھی نہیں سکتا)۔ آپ ﷺ نے فرمایا: بَلٰی، مَنْ آذٰی عَلِیًّا فَقَدْ آذَانِي "ہاں! جس نے علیؓ کو اذیت دی درحقیقت اس نے مجھے اذیت دی"۔[1]

(۲) حضرت ابو عبداللہ جدلی فرماتے ہیں: میں ام المومنین حضرت ام سلمہ سَلَامُ اللّٰہِ وَرِضْوَانُہٗ علیہا کے پاس حاضر خدمت ہوا تو انہوں نے مجھ سے فرمایا: کیا تم لوگوں کے اندر رسول اللہ ﷺ کو برا بھلا کہا جاتا ہے؟ میں نے کہا: اللہ کی پناہ (یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں؟): انہوں نے فرمایا: میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے: مَنْ سَبَّ عَلِیًّا فَقَدْ سَبَّنِي "جس نے علیؓ کو برا بھلا کہا تو درحقیقت اس نے مجھے برا بھلا کہا"۔[2]

آپؓ کا علمی مقام و مرتبہ:

اللہ تعالیٰ نے آپؓ کو قرآن و سنت کا وسیع علم عطا فرمایا تھا۔ آپؓ حلال و حرام اور جائز و ناجائز کاموں کا گہرا علم رکھتے تھے۔[3] حضرت معاویہؓ فرماتے ہیں کہ آپ کرم اللہ وجہہ کے ہر پہلو سے علم پھوٹتا تھا اور ہر جانب سے حکمت بولتی تھی۔[4]

بڑے بڑے جلیل القدر صحابہؓ آپؓ سے علمی رہنمائی لیا کرتے تھے، حتی کہ حضرت عمرؓ کا قول مشہور ہے: لَوْ لَا

---

(۱) المستدرک علی الصحیحین: ۳/۱۳۱، رقم: ۴۶۱۹

(۲) المستدرک علی الصحیحین: ۳/۱۳۰، رقم: ۴۶۱۵، وخصائص أمیر المؤمنین علي بن أبي طالب، ص: ۱۱۱

(۳) ینظر: أسمی المطالب، ص: ۲۲۸

(۴) حیاۃ الصحابۃ: ۱/۵۵

عَلِيٌّ لَهَلَكَ عُمَرُ،[1] یعنی اگر علی نہ ہوتے تو عمر ہلاک ہو جاتا۔

ایک دفعہ حضرت علیؓ نے لوگوں سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا: کتاب اللہ کے بارے میں جو چاہو پوچھ لو۔ واللہ! قرآن کریم میں کوئی بھی ایسی آیت نہیں ہے جس کے بارے میں مجھے یہ معلوم نہ ہو کہ یہ رات کو نازل ہوئی ہے یا دن کو، (ہموار) راستے میں چلتے ہوئے نازل ہوئی ہے یا اس وقت جب آپ ﷺ کسی پہاڑی پر تھے۔[2] مراد یہ ہے کہ حضرت علیؓ علومِ قرآن کے اتنے بڑے عالم تھے کہ آیات کا مطلب معلوم ہونے کے ساتھ ساتھ ان کا شانِ نزول تک جانتے تھے۔

دنیا سے بے رغبتی:

حضرت علیؓ اس لحاظ سے بھی بہت قابلِ تعریف ہیں کہ انہوں نے سلطنت وحکومت ہونے کے باوجود دنیا سے بے رغبتی اختیار کیے رکھی۔

ایک دفعہ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کی مجلس میں "زاہد" (یعنی دنیا سے بے رغبت) لوگوں کا تذکرہ چھڑ گیا۔ کسی نے کہا کہ فلاں شخص بڑا زاہد گزرا ہے اور کسی نے ایک اور بڑے زاہد کا تذکرہ کیا۔ اس طرح مختلف زاہدین کے بارے میں لوگوں کی آراء واقوال سامنے آتے رہے۔ یہ سب کچھ سن کر حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے فرمایا: أَزْهَدُ النَّاسِ فِي الدُّنْيَا عَلِيُّ بْنُ أَبِي طَالِبٍ "دنیا میں سب سے بڑے زاہد علی بن ابی طالبؓ تھے"۔[3]

ایک دفعہ آپ کرم اللہ وجہہ اپنی تلوار لے کر بازار آئے اور کہا: کون شخص مجھ سے یہ تلوار خریدے گا؟ پھر فرمایا: اگر میرے پاس صرف چار درہم بھی ہوتے جن سے میں اپنی تہہ بند خرید سکتا تو میں اسے نہ بیچتا۔[4]

ایک مرتبہ آپؓ کے سامنے "فالودہ" پیش کیا گیا تو آپؓ نے اس فالودے سے مخاطب ہو کر فرمایا: تیری خوشبو اچھی ہے، رنگ خوبصورت ہے، ذائقہ لذیذ ہے، مگر میں اپنے نفس کو اس چیز کا عادی نہیں بنانا چاہتا جس کا وہ اب تک عادی نہیں ہے۔[5]

---

(۱) الجد الحثيث في بيان ما ليس بحديث ص: ۱۸۶

(۲) إزالة الخلفاء، ص: ۲۶۸ نقلا عن المرتضى، ص: ۱۱

(۳) البداية والنهاية طهجر: ۱۱/۱۰۹

(۴) المرجع السابق: ۱۱/۱۰۴

(۵) حلية الأولياء وطبقات الأصفياء: ۱/۸۱

بلند پایہ تواضع:

(۱) آپؓ نہایت ہی سادہ لباس زیب تن فرماتے تھے۔ ایک مرتبہ کسی نے اس لباس کو بدلنے کے متعلق آپؓ سے بات کی تو آپؓ نے فرمایا: میرا یہ لباس تکبر سے کوسوں دور ہے اور اس لائق ہے کہ اس لباس میں دیگر مسلمان میری اتباع کریں۔ [1]

(۲) آپؓ کے صاحبزادے "محمد بن حنفیہ" کہتے ہیں: میں نے اپنے والدِ مکرم (حضرت علیؓ) سے پوچھا: رسول اللہ ﷺ کے بعد لوگوں میں سب سے افضل انسان کون ہے؟ آپؓ نے فرمایا: ابوبکر صدیقؓ۔ میں نے پوچھا: پھر کون ہے؟ فرمایا: عمر فاروقؓ۔ اس کے بعد مجھے خیال ہوا کہ اب پوچھوں گا تو حضرت عثمانؓ کا نام لیں گے، اس لیے میں نے کہا: پھر آپ؟ فرمانے لگے: میں تو ایک عام سا مسلمان ہوں۔ [2]

(۳) آپؓ بیت المال میں خود جھاڑو دیتے تھے اور اس میں نماز بھی ادا کیا کرتے تھے تاکہ قیامت والے دن یہ جگہ ان کے حق میں گواہی دے۔ [3]

(۴) آپؓ وسعتِ سلطنت اور بیت المال کے بھرے ہونے کے باوجود گدھے پر سواری کر لیتے اور اس پر بھی (ایک عام آدمی کی طرح) ایک ہی جانب اپنے پاؤں لٹکا کر بیٹھ جاتے۔ [4]

(۵) ایک دفعہ آپؓ نے ایک درہم کی کھجوریں خریدیں، انہیں اپنی چادر میں ڈالے اٹھا کر لا رہے تھے۔ راستے میں کسی نے کہا: امیر المومنین! یہ میں اٹھا لیتا ہوں۔ آپؓ نے عمدہ انداز میں اس کو ٹالتے ہوئے فرمایا: صاحبِ عیال ہی اس کو اٹھانے کا زیادہ حق دار ہے (یعنی میں اپنے بال بچوں کیلیے لے کر جا رہا ہوں، لہذا مجھے ہی اٹھانا چاہیے)۔ [5]

---

(۱) التواضع والخمول لابن أبي الدنيا ص: ۱۸۳

(۲) صحيح البخاري: ۵/۷

(۳) حلية الأولياء وطبقات الأصفياء: ۸۱/۱

(۴) البداية والنهاية ط هجر: ۱۰۹/۱۱

(۵) المرجع السابق: ۱۰۸/۱۱

خوفِ آخرت:

جب رات چھا جاتی تو آپ ؓ بسا اوقات محراب میں جا کر اپنی ڈاڑھی مبارک مٹھی میں لے لیتے اور خوفِ آخرت سے ایسے تڑپتے جیسے سانپ کا ڈسا ہوا تڑپتا ہے، آہیں بھر بھر روتے، "میرے اللہ! میرے اللہ!" کی فریادوں سے رب کی بارگاہ میں آہ وزاری کرتے۔ سفرِ آخرت کو یاد کر کے کہتے: آہ! آہ! مِن قِلۃِ الزّادِ وبُعدِ السَّفرِ ووَحشۃِ الطَّریقِ "ہائے! ہائے! (میرا کیا بنے گا) میرے پاس آخرت کا توشہ بہت کم ہے، سفر دور کا ہے اور راستہ وحشتناک ہے"۔[1]

([1]) ینظر: حیاۃ الصحابۃ: ۱/۵۵

چند متفرق فضائل

(۱) رسول اللہ ﷺ نے حضرت علیؓ سے مخاطب ہو کر فرمایا: تم دنیا و آخرت میں میرے بھائی ہو۔[۱]

(۲) ایک مرتبہ حضور ﷺ نے آپؓ سے فرمایا: علی! جنت میں تمہارا گھر میرے گھر کے سامنے ہوگا۔[۲]

(۳) آپ ﷺ نے فرمایا: جنت تین شخصوں کیلیے (خصوصی طور پر) مشتاق ہے: حضرت علیؓ، حضرت عمارؓ اور حضرت سلمان فارسیؓ۔[۳]

(۴) حضور ﷺ کا ارشاد ہے: ''أقضاهم عليُ بنُ أبي طالِب'' (یعنی علیؓ بن ابی طالب میری امت کے بڑے قاضی ہیں)۔[۴] اور حضرت ابن عباسؓ فرمایا کرتے تھے کہ جب ہمارے پاس حضرت علیؓ کا کیا ہوا کوئی فیصلہ پہنچتا تو پھر اس معاملہ میں ہم کسی اور کی طرف رجوع نہیں کرتے تھے۔ اور آپؓ کے علم و حکمت سے بھرے ہوئے دانشورانہ فیصلے مشہور و معروف ہیں، علماء نے ان پر مستقل مضامین و مباحث لکھے ہیں۔[۵]

(۵) غزوۂ خیبر میں حضور ﷺ نے فرمایا تھا کہ کل میں جھنڈا ایسے شخص کو دوں گا جس کے ہاتھوں فتح حاصل ہوگی اور جو اللہ اور اس کے رسول سے محبت کرتا ہے اور جس سے اللہ اور رسول بھی محبت کرتے ہیں۔ پھر اگلے دن آپ ﷺ نے وہ جھنڈا حضرت علیؓ کو دیا۔ اور آپؓ کے ہاتھوں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو خیبر کی فتح عطا فرمائی۔[۶]

(۶) آپ سَلامُ اللہِ وَرِضْوانُہُ علیہ نہایت بہادر اور بہت طاقتور آدمی تھے۔ جنگ میں جو بھی آپؓ کے مقابلہ میں اترتا وہ آپؓ کے ہاتھوں قتل ہی ہوتا، ہاں! اگر وہ بھاگ کر جان بچا جاتا تو اور بات تھی۔[۷]

---

(۱) سنن الترمذي: ۵/۶۳۶

(۲) مسند البزار = البحر الزخار: ۸/۲۷۸

(۳) سنن الترمذي شاكر: ۵/۶۶۷

(۴) سنن ابن ماجه: ۱/۵۵

(۵) لاحظ له ولمعرفة قضاياه: [التبيين في أنساب القرشيين، ص: ۱۰۱ وما بعدها] و [إزالة الخفاء عن خلافة الخلفاء: ۴/۴۷۵

(۶) صحيح البخاري: ۴/۲۰ و ۴/۵۴

(۷) التبيين في أنساب القرشيين، ص: ۱۰۰

شانِ علیؓ میں گلدستۂ اشعار

حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی ابھی آخری فضیلت "فتحِ خیبر" کے عنوان سے مذکور ہوئی ہے، اسی فتح سمیت چند دیگر فضائل پر مشتمل ایک نظم ذیل میں درج کی جاتی ہے جو سیدنا علیؓ کی شانِ عالی کی عکاسی کرتی ہے:

علیؓ شیرِ خدا ہیں ، فاتحِ میدانِ خیبر ہیں
علیؓ شاہِ ہُدیٰ ہیں، زینتِ محراب و منبر ہیں

نبیؐ کے ابنِ عم، اور اُن کے دامادِ مُطہر ہیں
ہیں شوہر فاطمہؓ کے ، والدِ شبیر و شبر ہیں

علیؓ روحانیت کے بادشاہِ عالی گوہر ہیں
فلک ان کا سلامی ہے، بظاہر بوریے پر ہیں

علیؓ کے قلبِ پُرانور سے یکسر منور ہیں
یہ سارے اولیاء جو ملتِ بیضاء کے رہبر ہیں

علیؓ کا مرتبہ اللہ اکبر تنا اونچا ہے
کہ جس کو دیکھ کر جن و مَلَک حیران و ششدر ہیں

پس از شیخینؓ وبعدِ حضرتِ عثمانؓ اے ہم دم
علیؓ باقی سبھی اصحابِ پیغمبر سے بڑھ کر ہیں

فریدیؔ میں بھی اِک ادنیٰ غلامِ شاہِ خیبرؓ ہوں
وہ میرے مرشد و ہادی، مرے آقا و رہبر ہیں۔[1]

---

(۱) کلام مفتی نسیم احمد فریدیؒ از شہادتِ حسینؓ، ص: ۱۱۶

فصلِ دوم

یہ فصل درج ذیل دو مباحث پر مشتمل ہے:

۱۔ حضرت امام حسن سَلامُ اللّٰہِ وَرِضْوانُہٗ علیہ کی سیرت ومناقب

۲۔ امام حسنؓ کے ائمہ صاحبزادگان سَلامُ اللّٰہِ وَرَحمۃُ علیہم کی سیرت ومناقب

۱۔ حضرت امام حسن سَلامُ اللّٰہِ وَرِضْوانُہٗ علیہ

نام ونسب:

آپ سَلامُ اللّٰہِ وَرِضْوانُہٗ علیہ، کا نام "حَسَن" (سین کی شد کے بغیر) ہے۔ آپؓ امیر المومنین حضرت علیؓ بن ابی طالب اور سیدۃ النساء حضرت فاطمۃ الزہراءؓ کے بڑے صاحبزادے، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ام المومنین حضرت خدیجہؓ کے پیارے نواسے ہیں۔ آپؓ کی کنیت "ابو محمد" ہے، نسب کے اعتبار سے قریشی اور ہاشمی ہیں۔[۱] اور پانچویں خلیفۂ راشد ہیں۔[۲] آپؓ کا نام "حسن" اور کنیت "ابو محمد" خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے رکھی۔ آپؓ سے پہلے یہ کسی کا نام نہیں تھا، بلکہ یہاں تک لکھا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے "حسن" اور "حسین" نام رکھنے تک یہ دونوں نام لوگوں سے مخفی رکھے۔ آپؓ کو ریحانۃ النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم (حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پھول) اور "شبیہ النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم (حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مشابہ)" جیسے قابلِ اعزاز القابات سے بھی یاد کیا جاتا ہے،[۳] کہ آپؓ سر سے لے کر سینہ تک یعنی اوپر والے نصف بدن میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ بہت زیادہ مشابہت رکھتے تھے۔[۴]

---

(۱) ینظر: الاستیعاب: ۱/۳۸۳، وتاریخ حلب للعظیمي، ص: ۹۵

(۲) البدایة والنهایة ط هجر: ۱۱/۱۳۴، ومآثر الإنافة في معالم الخلافة: ۱/۱۰۵ والإمام الحسن بن علي، ص: ۱۹ وتحقیق المقام في سیرة الحسن للصلابي، ص: ۱۵، ۹

(۳) أسد الغابة ط العلمیة: ۲/۱۳

(۴) الاستیعاب في معرفة الأصحاب: ۱/۳۸۴

ولادتِ باسعادت اور متعلقہ امور:

راجح قول کے موافق آپ رضی اللہ عنہ نصف رمضان المبارک سن ۳ھ میں مدینہ طیبہ میں پیدا ہوئے۔[1] جب آپ رضی اللہ عنہ پیدا ہوئے تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے آپ رضی اللہ عنہ کے (دائیں) کان میں اذان دی،[2] اور بائیں کان میں اقامت کہی۔[3] اور اپنے مبارک لعابِ دہن سے آپ رضی اللہ عنہ کے منہ میں گھٹی ڈالی۔[4] ولادت کے ساتویں دن آپ رضی اللہ عنہ کا عقیقہ کیا گیا جس میں حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حکم سے آپ رضی اللہ عنہ کے سر کے بال مونڈ کر ان کے وزن کے برابر چاندی صدقہ کی، اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دو بکریاں ذبح کیں۔ ایک روایت میں ہے کہ ایک بکری ذبح کی (اس سے معلوم ہوا کہ اگر کوئی شخص لڑکے کی پیدائش پر صرف ایک بکری ذبح کرنے کی طاقت رکھتا ہو تو اس سے بھی عقیقہ کی سنت ادا ہو جائے گی اگرچہ دو بکریاں یا بکرے کرنا افضل ہے)۔ اور اسی ساتویں دن آپ رضی اللہ عنہ کا ختنہ کیا گیا اور نام رکھا گیا۔[5] (حضرت علی رضی اللہ عنہ نے آپ رضی اللہ عنہ کا نام "حرب" تجویز کیا تھا مگر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسے تبدیل کر کے "حسن" رکھ دیا)۔[6]

پرورش:

آپ رضی اللہ عنہ کی بچپن میں کفالت اور دودھ پلانے کی سعادت حضرت ام الفضل رضی اللہ عنہا کو حاصل ہوئی۔ یہ ام الفضل رضی اللہ عنہا، حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے چچا حضرت عباس رضی اللہ عنہ کی اہلیہ ہیں، ان کا نام "لُبابہ بنت حارث" تھا اور "لُبابہ کبریٰ" کے نام سے مشہور تھیں۔ یہ ابتدائے اسلام میں ہی ہجرت سے قبل مسلمان ہو گئی تھیں اور جلیل القدر صحابیات میں سے شمار ہوئیں۔

شروع میں حضرت ام الفضل رضی اللہ عنہا نے ایک خواب دیکھا تھا جو انہوں نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے عرض کیا تھا کہ یارسول اللہ! میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ آپ کے بدن مبارک کا ایک ٹکڑا میری گود میں آ گرا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: فاطمہ رضی اللہ عنہا کے ہاں ان شاء اللہ، لڑکا پیدا ہوگا جس کی تم کفالت کرو گی۔ فرماتی ہیں: چناں چہ ایک دن حضرت ام الفضل رضی اللہ عنہا حضرت حسن رضی اللہ عنہ کو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس لے کر آئیں اور انہوں نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پیٹھ مبارک پر (اور ایک روایت میں

---

(۱) تاریخ الخمیس: ۱/۴۱۷، والذریۃ الطاھرۃ للدولابی ص: ۶۹ والتبیین فی أنساب القرشیین، ص: ۱۰۳

(۲) سنن أبی داود ۴/۳۲۸

(۳) ذخائر العقبی فی مناقب ذوی القربی ص: ۱۲۰

(۴) البدایۃ والنہایۃ طہجر: ۱۱/۱۸۰

(۵) ینظر: ذخائر العقبی فی مناقب ذوی القربی ص: ۱۱۹، ۱۱۸

(۶) مسند احمد: ۲/۱۵۹، ومسند ابی داود الطیالسی: ۱/۱۱۸

سینہ مبارک پر [1]) پیشاب کر دیا۔ اس پر حضرت ام الفضل رضی اللہ عنہا نے ان کو ہلکا سا تھپڑ مار دیا (جیسا کہ بچے کو ڈانٹنے کیلیے کیا جاتا ہے)۔ یہ دیکھ کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ام الفضل رضی اللہ عنہا سے فرمایا: مَهْلًا، یَرحَمکِ اللہُ، أَوجَعتِ ابنِي "اللہ تم پر رحم کرے! نرمی برتو۔ تم نے میرے بیٹے کو تکلیف دی ہے"۔ [2]

نکاح اور ازواج واولاد وغیرہ:

آپ رضی اللہ عنہ نے ایک سے زیادہ نکاح کیے جن کی تعداد دس کے لگ بھگ ہے یعنی مختلف اوقات میں آپ رضی اللہ عنہ کے نکاح میں رہنے والی ازواج کی کل تعداد دس کے قریب قریب تھی، [3] اور اللہ تعالیٰ نے آپ رضی اللہ عنہ کو بیٹے اور بیٹیوں سے نوازا۔ ذیل میں آپ رضی اللہ عنہ کی زوجات، صاحبزادے، صاحبزادیاں اور دیگر قریبی رشتہ داروں کا مختصر اور اجمالی تذکرہ کیا جاتا ہے تاکہ اس پاکیزہ خاندان کی برکات سے ہم مستفید ہوں کہ ان حضرات کا تذکرہ بھی باعثِ برکت ہے:

زوجات: خولہ بنت منظور، ام بشر بنت ابی مسعود، ام اسحاق بنت طلحہ اور جعدہ بنت اشعث وغیرہ

صاحبزادے: حسن (جو کہ "حسن مثنیٰ" سے مشہور ہوئے۔ [4])، زید، عمرو، قاسم، ابوبکر، عبدالرحمن، حسین اور طلحہ (البتہ آپ رضی اللہ عنہ کی آگے نسل صرف دو صاحبزادوں سے چلی: حسن مثنیٰ اور زید بن حسن۔ [5])

صاحبزادیاں: فاطمہ، رقیہ، ام سلمہ، ام عبداللہ، ام الخیر۔ [6]

بھائی: (امام) حُسین اور مُحسِّن۔ آپ رضی اللہ عنہ کے باپ شریک بھائیوں میں سے "محمد بن حنفیہ" سب سے زیادہ مشہور ہیں، یہ بڑے عالم فاضل اور عابد وزاہد آدمی تھے۔

---

(1) المستدرک علی الصحیحین للحاکم: ۱/۲۷۱ — حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ

(2) ینظر: سیرة الحسن للصلابی، ص: ۲۲، وسبل الهدى والرشاد: ۱۱/۶۴

(3) مستفاد من سیرة الحسن بن علي للصلابي، ص: ۲۴، ۲۳

ضروری انتباہ: بعض مورخین نے آپ رضی اللہ عنہ کے نکاحوں کی تعداد کے سلسلہ میں بہت غلو سے کام لیا ہے اور بعضوں نے تو یہاں تک لکھ ڈالا ہے کہ آپ رضی اللہ عنہ نے تین سو عورتوں سے شادی کی اور بعض نے اڑھائی سو اور بعض نے نوے وغیرہ مختلف عدد ذکر کر دیا ہے جو کہ بالکل درست نہیں ہے اور یہ سب روایتیں، تحقیق لحاظ سے، بالکل ناقابلِ اعتبار ہیں۔ تفصیلی تحقیق کے لیے ملاحظہ ہو: سیرة الحسن بن علي للصلابي، ص: ۲۳ الی ۲۸

(4) الغصن النَدِيّ في سیرة الحسن بن عليّ، ص: ۲۴

(5) اتعاظ الحنفاء بأخبار الأئمة الفاطميين الخلفاء: ۱/۸

(6) فوائد نافعہ، حصہ دوم، ص: ۱۲۶ نقلاً عن "نسب قریش" و "الطبقات الکبری"، اور مختصر التحفة الاثني عشرية، ص: ۳۴۰ کے اندر صاحبزادوں کے ناموں میں ("عمرو" کے بجائے) "عُمر" ذکر کیا ہے۔

بہنیں: زینب اور ام کلثوم۔

چچے: طالب، عقیل اور جعفر

پھوپھیاں: ام ہانی اور جُمانہ

ماموں: قاسم، عبداللہ اور ابراہیم

خالائیں: زینب، رُقیہ اور ام کلثوم۔ [1]

خلفاءِ راشدینؓ کے زمانہ میں آپؓ کی زندگی:

عہد صدیق اکبرؓ:

خلیفۂ اول حضرت ابوبکر صدیقؓ کے زمانہ میں حضرت حسنؓ ابھی بچے تھے۔ اس کے باوجود حضرت ابوبکرؓ ان کا بہت احترام و تعظیم کرتے تھے اور ان کے ساتھ اس قدر والہانہ محبت کرتے تھے کہ ان پر فدا ہوتے تھے۔ [2] ایک دفعہ ان کو بچوں کے ساتھ کھیلتے دیکھا تو اپنے کندھے پر اٹھا لیا اور پیار میں کہنے لگے: شَبِيهٌ بِالنَّبِيِّ لاَ شَبِيهٌ بِعَلِيٍّ "یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مشابہ ہیں، حضرت علیؓ کے مشابہ نہیں ہیں"۔ حضرت علیؓ یہ سن کر مسکرا رہے تھے۔ [3]

عہد فاروقِ اعظمؓ:

خلیفۂ ثانی حضرت عمر بن خطابؓ بھی آپؓ کی بہت قدر اور عزت کرتے تھے اور حد درجہ محبت رکھتے تھے۔ [4]

آپؓ کا زمانۂ خلافت چونکہ فتوحات کا زمانہ تھا اس لیے آپؓ مالی عطیات کے ذریعہ بھی حضرت حسن اور حسین سلام اللہ و رضوانہ علیہما کی عزت افزائی فرمایا کرتے تھے چناں چہ آپؓ نے حضرات حسنینؓ میں سے ہر ایک کا سالانہ وظیفہ ان کی تعظیم کے پیش نظر، عام دستور سے ہٹ کر، بدری صحابہ کے برابر (یعنی ۵ ہزار درہم) مقرر کر رکھا تھا (جو کہ ہمارے زمانہ میں ساڑھے ۱۰ لاکھ روپے کے مساوی ہے)۔ اور عہد فاروقی میں کسریٰ کے خزانے جب مدینہ طیبہ پہنچے

---

(۱) و كلّ هذا قد مرّ ذكره في مواضع شتى من هذا الجزء و كذا ينظر: الفضل النّدي في سيرة الحسن بن علي، ص: ۲۳-۲۱

(۲) البداية والنهاية ط هجر: ۱۱/۱۹۲

(۳) صحيح البخاري: ۴/۱۸۷

(۴) البداية والنهاية ط هجر: ۱۱/۱۹۲

تو ان کی تقسیم کے وقت، سب سے پہلے حضرت عمرؓ نے حضرت حسنؓ کو دیا۔

اس کے علاوہ حضرات حسنین سلامُ اللہ وَ رِضوانُہ علیہما کی ہمشیرہ "حضرت ام کلثومؓ" چونکہ حضرت عمرؓ کے نکاح میں آ گئی تھیں اس لیے آپ حضرات اپنی ہمشیرہ سے ملنے کیلیے حضرت عمرؓ کے گھر بکثرت تشریف لایا کرتے تھے۔[1]

سنہ ۱۶ھ میں حضرت عمرؓ کے زمانہ میں بیت المقدس فتح ہوا۔[2] اسی فتح کے موقعہ پر حضرت عمرؓ ملک شام تشریف لے گئے اس وقت مؤذنِ رسول حضرت بلالؓ بھی ساتھ تھے۔ حضرت عمرؓ جب وہاں سے واپس آنے لگے تو حضرت بلالؓ، آپؓ کی اجازت سے وہیں "شام" ٹھہر گئے۔ ایک مرتبہ خواب میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تشریف لائے اور فرمایا: مَاهٰذِهِ الجَفوَةُ يَا بِلالُ؟ مَا آنَ لَكَ أَنْ تَزُورَنَا؟ ''بلال! یہ کیا جفا ہے؟ تم ہماری ملاقات کو بھی نہیں آتے؟''۔ حضرت بلالؓ گھبرا کر اٹھے، سواری لی اور مدینہ طیبہ کی طرف چل دیے۔ مدینہ منورہ پہنچ کر سیدھا آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی قبر اطہر پر آئے اور قبر شریف کے پاس خوب روتے رہے اور یہ کیفیت ہوگئی کہ اس پر دیر تک لوٹ پوٹ ہوتے رہے۔ حضرات حسنین کریمینؓ سے ملاقات کی، انہیں گلے لگایا اور چوما (اس وقت حضرت حسن اور حسین سلامُ اللہ وَ رِضوانُہ علیہما بچپن کی حدود سے نکل کر نوعمر لڑکے ہو چکے تھے)۔ حضرات کریمینؓ نے ان سے اذان دینے کی فرمائش کی۔ اس فرمائش کی تعمیل میں آپؓ نے اسی جگہ پر کھڑے ہو کر اذان دی جہاں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانہ میں کھڑے ہو کر دیا کرتے تھے۔ جیسے ہی اذان شروع کی اور اللہ اکبر، اللہ اکبر کی آواز کانوں میں پڑی تو (ایک عرصہ بعد حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانہ کی آواز سننے سے) لوگوں پر عجیب حالت طاری ہوگئی، ہر طرف آہ وبکاء شروع ہوگئی، طبیعتیں بے خود ہوگئیں حتی کہ مستورات بھی گھروں سے باہر نکل آئیں۔[3]

حضرت عمرؓ کے انتقال کے وقت حضرت حسنؓ کی عمر تقریبا ۲۱ برس تھی۔ آپؓ پر جب ابولولو فیروز مجوسی نے قاتلانہ حملہ کیا تھا تو حضرت علیؓ اور حضرت حسنؓ آپؓ کے پاس پہنچے، اس وقت حضرت عمرؓ اپنی آخرت کے معاملہ میں بہت فکرمند تھے اور رو رہے تھے۔ حضرت علیؓ نے تسلی دی کہ آپؓ کو جنت کی خوشخبری مبارک ہو کیونکہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بارہا

(۱) مصنف ابن أبي شيبة: ۱۲/۴

(۲) تاريخ الخلفاء للسيوطي، ص: ۱۰۴

(۳) وفاء الوفاء بأخبار دار المصطفى: ۱۸۲/۴، وأسد الغابة: ۱/۱۵ ۴ بسند جيد

یہ فرماتے ہوئے سنا ہے: سَيِّدَا أَهْلِ الْجَنَّةِ أَبُو بَكْرٍ وَ عُمَرُ "ابوبکرؓ وعمرؓ جنت کے (ادھیڑ عمر) لوگوں کے سردار ہیں"۔ اس پر آپؓ نے حضرت علیؓ سے فرمایا کہ آپ اس بشارت کے گواہ ہیں؟ حضرت علیؓ نے فرمایا: ہاں! میں گواہ ہوں اور پھر اپنے صاحبزادے حضرت حسنؓ سے فرمایا کہ تم بھی میری اس گواہی پر گواہی دو کہ حضور ﷺ نے حضرت عمرؓ کے جنتی ہونے کی گواہی دی ہے۔ [2]

عہد عثمان ذوالنورینؓ:

حضرت عثمانؓ کا زمانہ خلافت گیارہ سال سے زائد مدت پر محیط رہا۔ ان کے زمانہ میں حضرت حسن اور حسین سلامُ اللہ وَ رِضوانُہٗ علیہما جوان مرد تھے اور اپنی عملی زندگی میں داخل ہو چکے تھے۔ انہوں نے دنیوی صاحبزادوں کی طرح گھروں میں رہ کر ناز و نعمت والی زندگی اپنانے کے بجائے اشاعتِ دین والی مجاہدانہ زندگی اختیار کی اور کئی جہاد کیے۔

ذیل میں ان حضرات کے جہاد کے صرف ایک دو واقعات درج کیے جاتے ہیں:

(۱) ۲۶ھ میں حضرت عثمانؓ نے اپنے رضاعی بھائی حضرت عبداللہ بن ابی سرح کو مصر کا امیر مقرر کیا۔ اس سے پہلے ۲۵ھ میں حضرت عثمانؓ نے انہی عبداللہ بن ابی سرح کو افریقہ کے جہاد کیلیے امیر بنایا تھا اور ساتھ ہی عقبہ بن نافع اور عبداللہ بن نافع کو بھی ایک ایک لشکر کا امیر بنا کر روانہ کیا تھا مگر جہاد نہ ہو سکا۔ اب جس وقت ان کو پورے مصر کا امیر اور والی مقرر کیا گیا تو انہوں نے امیر المومنین حضرت عثمانؓ سے افریقہ کے جہاد کی اجازت اور اس کیلیے افرادی مدد طلب کی۔ حضرت عثمانؓ نے اس سلسلہ میں صحابہ کرامؓ سے مشورہ کیا تو انہوں نے مشورہ دیا کہ ٹھیک ہے جہاد کیلیے لشکر روانہ کرنا چاہیے۔ چناں چہ حضرت عثمانؓ نے ایک لشکر تیار کر کے مدینہ طیبہ سے ان کی طرف روانہ کیا۔ اس لشکر میں جو حضرات شامل ہوئے ان میں حضرت حسن اور حسین سلامُ اللہ وَ رِضوانُہٗ علیہما بھی تھے۔ لشکر روانہ ہوا۔ راستہ میں "بُرْقَہ" مقام پر "عقبہ بن نافع" سے ملاقات ہوئی وہ بھی مسلمانوں کے ایک لشکر کی قیادت کرتے ہوئے جہاد کیلیے روانہ تھے۔ بہر حال پھر یہ دونوں لشکر "طَرابُلُس" اور پھر "افریقہ" کی طرف روانہ ہوئے اور باقاعدہ جہاد اور قتال ہوا۔ یہی وہ جہاد ہے جس میں طَرابُلُس کا مشہور بادشاہ "جُرجیر" قتل ہوا اور مسلمانوں کو فتح ہوئی۔ [3]

---

(۱) كما عند ابن ماجه، رقم: ۱۰۰ من حديث مرفوع بسند صحيح: «أَبُو بَكْرٍ وَعُمَرُ سَيِّدَا كُهُولِ أَهْلِ الْجَنَّةِ مِنَ الْأَوَّلِينَ وَالْآخِرِينَ، إِلَّا النَّبِيِّينَ وَالْمُرْسَلِينَ» وكذا في عدة كتب حديثية.

(۲) تاريخ دمشق لابن عساكر: ۴۴/۱۶۸، ۱۶۷

(۳) تاريخ ابن خلدون ۲/ ۵۷۳

(ب) سنہ ۳۰ھ میں سعید بن العاص کوفہ سے خراسان کی طرف جہاد کیلیے روانہ ہوئے۔ انہوں نے اپنے ساتھ ایک لشکر لیا جس میں بہت سارے صحابہ تھے۔ اس لشکر میں حضرت حسن و حسین سَلامُ اللہ وَرِضوانُہ علیہما بھی شریک ہوئے تھے۔ یہ لشکر سب سے پہلے "قُومِس" پہنچا، ان سے صلح ہوگئی۔ اس کے بعد "جُرجان" پہنچا، ان سے بھی صلح ہوگئی، یہ صلح ۲ لاکھ (دینار) پر طے پائی۔ اس کے بعد لشکر "طَمِیسہ" پہنچا، یہ جُرجان کے علاقہ میں سمندر کے کنارے ایک شہر تھا۔ یہاں باقاعدہ جہاد کی نوبت آئی، اہلِ طَمِیسہ کے ساتھ لڑائی ہوئی اور زوردار لڑائی ہوئی حتی کہ اس جنگ کے دوران مسلمانوں نے "صلوۃ الخوف" پڑھی، اور ہتھیلیوں پر جانیں رکھ کر اپنی بہادری کے جوہر دکھائے، بالآخر مسلمانوں کو فتح ہوئی۔[1] خاص طور پر حضرت حسنؓ کے بارے میں یہ بھی لکھا ہے کہ جہادِ جُرجان کیلیے جاتے ہوئے وہ "اصبہان" میں مجاہدانہ حیثیت سے داخل ہوئے تھے۔ وہاں سے گزر کر پھر جُرجان گئے تھے۔[2]

حضرت عثمانؓ کے اخیر زمانہ میں حضرت حسنؓ کی عمر مبارک تیس سال سے کچھ اوپر ہو چکی تھی۔ حضرت عثمانؓ کی شہادت سے کچھ مدت قبل باغیوں نے آپؓ کے گھر کا محاصرہ (گھیراؤ) کر لیا تھا اور نعوذ باللہ آپؓ کی جان کے دشمن ہوگئے تھے۔ اس محاصرہ کے زمانہ میں بہت سارے صحابہؓ نے آپؓ کے پاس حاضر ہو کر (اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کرتے ہوئے) ان باغیوں کے خلاف دفاعی کارروائی کی اجازت مانگی مگر حضرت عثمانؓ تقوی کی بناء پر مدینۃ الرسول ﷺ میں اپنی ذات کی وجہ سے خون بہانا پسند نہیں فرماتے تھے اس لیے ان حضرات کو کارروائی کی اجازت نہیں دی۔[3]

اپنی جان کا نذرانہ پیش کرنے والے ان حضرات میں حضرت حسنؓ بھی تھے چناں چہ اس قسم کا ایک واقعہ حضرت عبداللہ بن رباح بیان کرتے ہیں، وہ فرماتے ہیں کہ میں اور ابوقتادہ، حضرت عثمانؓ کے پاس حاضر ہوئے (جبکہ ان کے گھر کا گھیراؤ کیا جا چکا تھا) اور ان سے حج کی اجازت طلب کی، انہوں نے اجازت دے دی اور ہم نے ان سے یہ بھی عرض کی کہ اس وقت جو حالات بن چکے وہ آپ کے سامنے ہیں، اس میں ہمارے لیے کیا حکم ہے؟ آپؓ نے فرمایا: مسلمانوں کی جماعت کو لازم پکڑو۔ ہم نے عرض کی: ہمیں اندیشہ ہے کہ مسلمانوں کی جماعت بھی کہیں ان

---

(۱) تاريخ الطبري=تاريخ الرسل والملوك، وصلة تاريخ الطبري: ۴/۲۶۹

(۲) تاريخ أصبهان=أخبار أصبهان: ۱/۹۶

(۳) مستفاد من فتنة مقتل عثمان بن عفان رضي الله عنه: ۱/۱۷۵-۱۹۱ ومابعدها

باغیوں کے ساتھ نہ ہو۔ آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: بس مسلمانوں کی جماعت کو لازم پکڑو چاہے وہ جدھر ہو۔ پھر ہم وہاں سے اٹھ کر آ گئے، جب ہم باہر نکلے تو دیکھا کہ حضرت حسن رضی اللہ عنہ اندر جا رہے ہیں تو ہم بھی واپس انکے ساتھ ہو لیے تاکہ معلوم کریں کہ یہ کیا کہتے ہیں اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ ان کو کیا جواب دیتے ہیں؟ انہوں نے اندر جا کر کہا: امیر المومنین! میں حاضر ہوں۔ آپ مجھے جو حکم فرمائیں میں تیار ہوں۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اجلِسْ یَا ابْنَ أَخِي! حَتَّى یَأْتِيَ اللهُ بِأَمْرِه "میرے پیارے بھتیجے! آپ بس بیٹھ جائیں (اور اس معاملہ میں کچھ نہ کریں)، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ اپنی تقدیر پوری فرما دے"۔ پھر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے فرمایا: میں دنیا نہیں چاہتا یا یہ فرمایا کہ میں لڑائی نہیں چاہتا۔[1] دراصل حضرت عثمان رضی اللہ عنہ، حضرت حسن رضی اللہ عنہ سے بہت محبت کرتے تھے اور وہ نہیں چاہتے تھے کہ نواسۂ رسول کو ان کی وجہ سے ادنی سی کوئی تکلیف پہنچے اس لیے ان کو کارروائی کی اجازت نہیں دی۔[2]

اس پر حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے امیر المومنین کے حکم کی بدولت دفاعی کارروائی تو نہیں کی البتہ اپنی محبت کی وجہ سے امیر المومنین کی حفاظت کیلیے ان کے مکان پر موجود رہے۔ اس حفاظت میں حضرت حسن رضی اللہ عنہ اُن باغیوں کے ہاتھوں زخمی بھی ہوئے مگر اپنی خوشی سے ان کی حفاظت پر ثابت قدم رہے۔ اس حفاظت میں حضرت حسن رضی اللہ عنہ کے ساتھ بعض دیگر صحابہ کرام بھی تھے۔[3]

ان حضرات کی حفاظت کے باوجود ان ظالم باغیوں نے گھر کی دیواریں پھلانگ کر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو شہید کر دیا۔ یہ المناک واقعہ جمعہ کے دن عصر کے بعد پیش آیا۔ شہید کرنے کے بعد ان بدبختوں نے آپ رضی اللہ عنہ کے جنازے اور کفن ودفن میں بھی رکاوٹ ڈالنے کی بھرپور کوشش کی مگر حضرت حسن رضی اللہ عنہ اور چند مزید صحابہ کرام نے ہمت کر کے، اُسی دن ہی، مغرب اور عشاء کے درمیان، آپ رضی اللہ عنہ کے جنازے اور تدفین کا انتظام کیا اور پھر اُسی رات آپ رضی اللہ عنہ کو جنت البقیع کے قریب ایک باغ میں دفن کر دیا۔[4] بعد میں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے اپنے زمانۂ خلافت میں اس باغ کو جنت البقیع میں شامل کرا دیا تھا۔[5]

---

(۱) مصنف عبدالرزاق: ۱۱/۴۴۶۷، ومثله في تاريخ المدينة لابن شبة: ۴/۱۲۱۰

(۲) انظر: تاريخ المدينة لابن شبة: ۴/۱۲۰۸ والبداية والنهاية ط هجر: ۱۱/۱۹۳ مع سيرة الحسن للصلابي، ص: ۱۲۱

(۳) ينظر: البداية والنهاية ط هجر: ۱۰/۳۱۴

(۴) قال الأندلسي في التمهيد والبيان ص: ۲۴۵ قتل عثمان رض يوم الجمعة بعد العصر ودفن ليلة السبت من تلك الليلة هذا هو الصحيح الذي ذكره أهل التواريخ والسير وقال ابن الأثير في تاريخه قيل بقي عثمان رض ثلاثة أيام لا يدفن. والأول أثبت.

(۵) التمهيد والبيان في مقتل الشهيد عثمان ص: ۲۴۵ ومثله في الفتنة ووقعة الجمل ص: ۸۴

عہد علی المرتضیٰؓ:

(۱) حضرت علیؓ نے اپنے زمانۂ خلافت میں "کوفہ" کو دار الخلافہ بنایا تھا۔ ایک دفعہ کوفہ میں حضرت علیؓ نے تقریر کی۔ اس تقریر میں آپؓ نے یہ بھی فرمایا کہ لوگو! تمہارے بھائی "حسن بن علیؓ" نے مال جمع کیا ہے اور وہ اس مال کو تمہارے درمیان تقسیم کرنا چاہتے ہیں۔ یہ اعلان سن کر کافی سارے لوگ آ گئے۔ جب یہ صورتِ حال دیکھی تو حضرت حسنؓ خود کھڑے ہوئے اور وضاحت کرتے ہوئے فرمایا: یہ مال صرف غریب لوگوں کیلیے ہے۔ اس کے بعد آدھے لوگ بیٹھ گئے اور آدھے کھڑے رہے۔ پھر حضرت حسنؓ نے ان مستحق لوگوں میں وہ مال تقسیم فرما دیا۔[1] اس سے معلوم ہوا کہ حضرت حسنؓ اپنے والد ماجد کے زمانۂ خلافت میں بھی اپنے مال سے لوگوں کا تعاون کرتے تھے۔

(۲) حضرت علیؓ باوجود والد ہونے کے، حضرت حسنؓ کی حد سے بڑھ کر عزت کرتے تھے اور ان کی تعظیم و توقیر کرتے تھے۔ ایک دن انہوں نے آپؓ سے کہا: بیٹے! یہ لوگ جمع ہیں، تم اِن میں تقریر کرو، تاکہ میں بھی سُن لوں۔ آپؓ نے عرض کی: آپ کی موجودگی میں بیان کرنے سے مجھے شرم آتی ہے اور آپ کے سامنے ہمت بھی نہیں ہوتی۔ اس پر حضرت علیؓ اٹھ کر چلے گئے، اور جا کر ایسی جگہ بیٹھ گئے جہاں سے حضرت حسنؓ کو تو دکھائی نہ دیں مگر ان کی آواز سنائی دیتی رہے۔ جب حضرت علیؓ چلے گئے تو حضرت حسنؓ اٹھے، لوگوں میں بیان کیا اور انتہائی فصیح و بلیغ بیان کیا۔ جب بیان ختم ہوا تو حضرت علیؓ نے خوب حوصلہ افزائی کی۔[2]

(۳) عبد الرحمن بن مُلْجَم مُرادی نے جب حضرت علیؓ کو شہید کیا تو آپؓ کے صاحبزادوں حضرت حسن و حسین سَلامُ اللہ وَ رِضوانُہٗ علیہما نے آپؓ کی تجہیز و تکفین کا انتظام کیا اور عبد اللہ بن جعفرؓ بھی ساتھ تھے۔ پھر حضرت حسنؓ نے آپؓ کا جنازہ پڑھایا۔ اور بعد میں ابن مُلْجَم کو حضرت حسنؓ نے ہی قتل کے بدلہ قتل کرایا۔[3]

(۴) حضرت علیؓ کی شہادت کے اگلے دن حضرت حسنؓ نے لوگوں میں تقریر کی اور فرمایا: لوگو! کل تم سے ایک ایسی شخصیت جدا ہوئی ہے جو "علم" میں سب پر فائق تھی۔ اور وہ ایسے شخص تھے کہ جب رسول اللہ ﷺ ان کے ہاتھ میں جھنڈا دے کر انہیں کسی محاذ پر بھیجتے تھے تو وہ اس وقت تک واپس نہیں آتے تھے جب تک ان کو فتح نہ

(۱) مصنف ابن أبي شيبة: ۶/۲۰۴، مع فوائد نافعه، ص: ۱۰۱

(۲) البداية والنهاية طهجر: ۱۱/۱۹۳، مع مختصر تاريخ دمشق: ۷/۲۴

(۳) البداية والنهاية طهجر: ۱۱/۲۳-۱۷

ہو جائے۔ اور وہ اس حال میں دنیا سے روانہ ہوئے ہیں کہ ان کے پاس نہ سونا تھا، نہ چاندی۔ صرف سات سو درہم تھے جو انہوں نے اپنے گھر کے خادم کیلیے رکھے ہوئے تھے۔[1]

حضرت حسنؓ کا اپنا زمانہ خلافت:

حضرت حسنؓ جب امیر المومنین حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی تدفین سے فارغ ہو گئے تو (امت کے شیرازے کو بکھرنے سے بچانے کیلیے) لوگوں کو اپنی بیعت کی طرف دعوت دی۔ لوگوں نے آپؓ کی دعوت پر لبیک کہتے ہوئے آپؓ کے ہاتھ پر خلافت کی بیعت کی۔[2] یعنی اُسی ماہ رمضان المبارک سنہ ۴۰ھ سے ہی کوفہ میں حضرت حسنؓ کے زمانہ خلافت کی ابتداء ہوگئی۔ لیکن چند ماہ بعد ہی، ربیع الاول سنہ ۴۱ھ میں آپؓ نے کاتب وحی حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ صلح کر لی اور ان کے ہاتھ پر بیعت کر لی۔[3] اور اپنے ساتھیوں کو بھی حکم دیا کہ وہ حضرت معاویہؓ کے ہاتھ پر بیعت کرلیں اور ان کی اطاعت کریں۔[4] اس صلح سے مسلمانوں میں اٹھنے والا انتشار ختم ہوگیا اور تمام مسلمان ایک ہی امام (حضرت معاویہؓ) کے امر کے تحت جمع ہو گئے اور اسلامی اتحاد کی ایک مضبوط شکل قائم ہوگئی۔ اسی وجہ سے اس سال کا نام "عام الجماعۃ" (یعنی مسلمانوں کے ایک امام کے تحت جمع ہونے کا سال) مشہور ہوگیا۔[5] حضرت حسنؓ کا یہ بہت بڑا اعزاز ہے کہ وہ مسلمانوں کی دو بڑی جماعتوں کے درمیان صلح کا ذریعہ اور وسیلہ بنے۔ ان کے اس اعزاز کی طرف رسول اللہ ﷺ پیشین گوئی فرما چکے تھے؛ وہ اس طرح کہ حضرت ابو بکرہؓ فرماتے ہیں کہ ایک دفعہ رسول اللہ ﷺ منبر پر تقریر فرما رہے تھے، اتنے میں حضرت حسنؓ سامنے سے آئے۔ آپ ﷺ نے ان کو دیکھ کر فرمایا: ابنِي هَذَا سَيِّدٌ وَلَعَلَّ اللهَ أَنْ يُصْلِحَ بِهِ بَيْنَ فِئَتَيْنِ مِنَ الْمُسْلِمِينَ "میرا یہ بیٹا سردار ہے۔ امید ہے اللہ تعالیٰ اس کے ذریعے مسلمانوں کی دو (بڑی[6]) جماعتوں کے درمیان صلح کرائے گا"۔[7]

---

(1) فضائل الصحابة لأحمد بن حنبل: ۲/۵۹۵

(2) الطبقات الكبرى ط العلمية: ۳/۲۷

(3) سير أعلام النبلاء ط الرسالة: ۳/۱۳۷ و ۱۴۶، وزبدة الحلب في تاريخ حلب ص: ۲۳

(4) تاريخ بغداد و ذيوله ط العلمية ۱/۱۳۹

(5) البداية والنهاية: ۱۱/۱۳۸، وسير اعلام النبلاء: ۳/۱۴۶، مع الاستيعاب: ۱/۳۸۷

(6) كما في رواية أخرى عند البخاري نفسه، رقم: ۲۷۰۴ إِنَّ ابْنِي هَذَا سَيِّدٌ وَلَعَلَّ اللهَ أَنْ يُصْلِحَ بِهِ بَيْنَ فِئَتَيْنِ عَظِيمَتَيْنِ مِنَ الْمُسْلِمِينَ

(7) صحيح البخاری: ۹/۵۷ و ۳/۱۸۶

جب یہ صلح ہوگئی تو دونوں حضرات (حضرت حسنؓ اور حضرت معاویہؓ) سواری پر بیٹھ کر کوفہ میں داخل ہوئے۔[1] پھر کوفہ اور بلکہ تمام اسلامی شہروں کو حضرت معاویہؓ نے سنبھالنا شروع فرمادیا تو حضرت حسن اور حسین سَلامُ اللہ وَرِضْوانُہُ علیہما، کوفہ کی رہائش ترک کر کے مدینہ طیبہ روانہ ہوگئے (کیونکہ حضرت معاویہؓ کے نظام سنبھال لینے کے بعد اب یہ حضرات کوفہ میں رہنا اپنی ضرورت نہیں سمجھتے تھے اس لیے اسے چھوڑ کر مدینۃ الرسول چل دیے) اور پھر وہیں رہنا شروع فرمادیا۔[2] اور حضرت حسنؓ تو پھر ساری زندگی وہیں مدینہ منورہ میں رہے اور وہیں انتقال فرمایا۔

وفات:

حضرت حسنؓ جب مدینہ منورہ تشریف لے آئے تو آپؓ کو قیامِ مدینہ کے دوران کئی بار زہر دیا گیا لیکن جب آخری مرتبہ زہر دیا گیا تو طبیب نے کہا کہ اس زہر نے تو اندر سے انتڑیاں تک کاٹ دی ہیں۔[3] چنانچہ بار بار قضاء حاجت فرماتے تھے، بلکہ نوبت یہاں تک آپہنچی تھی کہ آپؓ کے نیچے ایک "طشت" رکھا جاتا اور دوسرا اٹھایا جاتا۔[4] چالیس دن اسی شدید تکلیف کی حالت میں گزرے۔[5] آپؓ نے نہایت صبر وتحمل کے ساتھ بیماری کے یہ ایام گزارے۔ آخر میں جب طبیعت بہت زیادہ خراب ہوگئی اور انتقال کا وقت قریب محسوس ہونے لگا تو آپؓ کے چھوٹے بھائی حضرت امام حسینؓ تشریف لائے اور آپؓ کے سرہانے بیٹھ گئے اور پوچھا: أَيْ أَخِي! أَنْبِئْنِي مَنْ سَقَاكَ؟ ''بھائی جان! کس نے آپ کو زہر دی ہے؟'' آپؓ نے فرمایا: میرے انتقال پر تم اس کو قتل کرو گے؟ انہوں نے کہا: جی ہاں! فرمایا: مَا أَنَا مُحَدِّثُكَ شَيْئاً، إِنْ يَكُنْ صَاحِبِي الَّذِي أَظُنُّ، فَاللهُ أَشَدُّ نِقْمَةً، وَإِلاَّ - فَوَاللهِ - لَايُقْتَلُ بِي بَرِيْءٌ ''میں کبھی اس کا نام نہیں بتاؤں گا، کیونکہ زہر دینے والا اگر واقعی وہی شخص ہے جس کے بارے میں میرا گمان ہے تو اللہ تعالیٰ زیادہ سخت انتقام لینے والے ہیں (وہ اس سے انتقام لے لیں گے) اور اگر کوئی اور شخص ہے تو واللہ! میں نہیں چاہتا کہ کوئی بے قصور شخص میری وجہ سے قتل کیا جائے''۔[6] اور آپؓ نام بتائے بغیر اس دنیائے فانی

---

(۱) سیر أعلام النبلاء ط الرسالۃ: ۳/۱۴۶

(۲) البدایۃ والنہایۃ ط ھجر: ۱۱/۱۴۱

(۳) سیر أعلام النبلاء ۳/۲۷۴ مع سیرۃ الحسن للصلابی، ص: ۳۷۵، نقلا عن الدوحۃ النبویۃ الشریفۃ، ص: ۹۷

(۴) سیر أعلام النبلاء ط الرسالۃ: ۳/۲۷۵ و البدایۃ والنہایۃ ط ھجر: ۱۱/۲۰۸

(۵) المستدرک علی الصحیحین للحاکم: ۳/۱۸۹

(۶) البدایۃ والنہایۃ ط ھجر: ۱۱/۲۰۷، مع سیر أعلام النبلاء ط الرسالۃ: ۳/۲۷۳

سے رخصت ہوگئے۔ اجب آپؓ کے انتقال کا وقت نزدیک آیا تھا تو آپؓ نے فرمایا تھا کہ مجھے باہر صحن میں لے چلو تاکہ میں آسمان میں اللہ تعالیٰ کی نشانیوں پر غور کروں (اور میرا ایمان مضبوط ہو)۔ ۲

یعنی آخر وقت تک آپؓ کا دل مبارک، اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ اور اس کی عظمت و قدرت میں گم تھا۔ زندگی میں آپؓ جو انگوٹھی پہنا کرتے تھے اُس کا نقش بھی اِس بات کا پتا دیتا ہے کہ آپؓ نے عمر بھر اللہ تعالیٰ کا دھیان دل و دماغ اور نظر و چشم سے ہٹنے نہیں دیا، کہ انگوٹھی جو ہر وقت آنکھوں کے سامنے رہتی تھی اُس پر آپؓ نے یہ الفاظ نقش کرا رکھے تھے: اَللّٰہُ أَکْبَرُ وَبِہٖ أَسْتَعِیْنُ، یعنی اللہ سب سے بڑا ہے اور میں اُسی ذات سے ہی مدد طلب کرتا ہوں۔ ۳

بہر حال آپؓ کی موت چونکہ زہر کی وجہ سے واقع ہوئی، اس لیے علماء نے لکھا ہے کہ آپؓ شہید ہوکر فوت ہوئے ہیں۔ ۴ مشہور قول کے مطابق آپؓ کا انتقال (ربیع الاول) ۴۹ھ میں ہوا۔ ۵ اس وقت آپؓ کی عمرِ مبارک ۴۶ سال تھی۔ ۶ بنو امیہ کے حضرت سعید بن العاص جو امیرِ مدینہ تھے انہوں نے نمازِ جنازہ پڑھائی، ۷ (اور ان کو حضرت امام حسینؓ نے ہی جنازہ پڑھانے کی فرمائش کی تھی ۸) اور آپؓ کو جنت البقیع میں اپنی والدہ حضرت فاطمۃ الزہراء سَلَامُ اللّٰہِ وَرِضْوَانُہٗ علیہا کے پہلو میں سپردِ خاک کیا گیا۔ ۹ آپؓ کے جنازہ میں لوگوں کا اتنا ہجوم تھا کہ اگر سوئی بھی پھینکی جاتی تو وہ زمین پر گرنے کے بجائے کسی آدمی کے سر پر گرتی۔

---

(۱) البدایۃ والنہایۃ طہجر: ۲۰۸/۱۱

(۲) البدایۃ والنہایۃ طہجر: ۲۰۹/۱۱، وینظر لتفصیل ہذا المقام: الغُصن النديّ في سيرة الحسن بن علي، ص: ۲۴۳

(۳) ینظر: تاریخ حلب، ص: ۹۵

(۴) منہاج السنۃ النبویۃ: ۴۲/۴

(۵) البدایۃ والنہایۃ طہجر: ۲۱۲/۱۱، وتہذیب الکمال في أسماء الرجال: ۲۵۷/۶

(۶) تاریخ خلیفۃ بن خیاط ص: ۲۰۳ والمستدرک للحاکم: ۱۸۹/۳

(۷) انساب الأشراف: ۶۴/۳ والاستیعاب ۳۸۹/۱، والتبیین فی انساب القریشین، ص: ۱۰۶

(۸) البدایۃ والنہایۃ طہجر: ۲۱۱/۱۱، والاستیعاب ۳۸۹/۱، والتبیین فی انساب القریشین، ص: ۱۰۶

(۹) سیر اعلام النبلاء: ۲۷۷/۳، البدایۃ والنہایۃ طہجر: ۲۱۱/۱۱، ۲۱۰، والاستیعاب: ۳۹۲/۱

( ) الإصابۃ في تمییز الصحابۃ: ۶۵/۲

فضائل وخصائص

حضرت امام حسنؓ وحسینؓ کے مشترکہ فضائل وخصائص:

(۱) آپ ﷺ نے فرمایا: مَنْ أَحَبَّ الْحَسَنَ وَالْحُسَيْنَ فَقَدْ أَحَبَّنِي، وَمَنْ أَبْغَضَهُمَا فَقَدْ أَبْغَضَنِي ''جس نے حسن وحسین سے محبت کی اُس نے مجھ سے محبت کی اور جس نے ان سے بغض رکھا اُس نے مجھ سے بغض رکھا''۔[۱]

دوسری روایت میں وضاحت کے ساتھ آپ ﷺ نے فرمایا: جو حسن وحسین سے محبت کرتا ہے میں اس سے محبت کرتا ہوں، جس سے میں محبت کرتا ہوں اس سے اللہ محبت کرتا ہے، اور جس سے اللہ محبت کرتا ہے اللہ اسے نعمتوں بھری جنت میں داخل فرماتا ہے۔ اور جو حسن وحسین سے بغض رکھتا ہے یا ان پر ظلم وزیادتی کرتا ہے۔ میں اس سے بغض رکھتا ہوں، جس سے میں بغض رکھتا ہوں اس سے اللہ بغض رکھتا ہے، اور جس سے اللہ بغض رکھتا ہے اللہ اسے جہنم میں داخل فرماتا ہے، اور اس شخص کیلئے دائمی عذاب ہے۔[۲]

(۲) حضور ﷺ سے کسی نے دریافت کیا: آپ کے اہلِ بیت میں سے آپ کو سب سے زیادہ محبت کس سے ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: حسن اور حسین سے۔ اور بسا اوقات آپ ﷺ حضرت فاطمہؓ سے فرماتے: میرے دونوں بیٹوں کو بلاؤ۔ پھر آپ ان کو سونگھتے (جیسے آدمی پھول سونگھتا ہے) اور انہیں اپنے ساتھ چمٹا لیتے۔[۳]

آپ ﷺ حضرت حسن وحسین سَلَامُ اللہِ وَرِضْوَانُہٗ علیہما سے اس قدر محبت ودل لگی کرتے تھے کہ کبھی انہیں اپنے کندھوں پر سوار کراتے، پھر ان کی گُدی کے پیچھے سے اپنا ہاتھ لاکر ان کے مونہوں کو اپنے منہ سے ملالیتے اور فرماتے کہ یہ مجھے بہت پیارے لگتے ہیں۔[۴] اور اسی طرح کبھی یہ دونوں شہزادے آپ ﷺ کے سامنے کھیلتے کودتے، تو کبھی آپ کی گود میں اور کبھی آپ کے پیٹ پر کھیلتے۔ اور آپ ﷺ ان کی معصومانہ اداؤں کو دیکھ کر فرماتے: مَا لِي لَا أُحِبُّهُمَا وَهُمَا رَيْحَانَتَايَ ''میں ان سے کیوں پیار نہ کروں، یہ تو میرے پھول ہیں''۔[۵]

ان صاحبزادوں کے ساتھ آپ ﷺ کی محبت کا یہ عالم تھا کہ کبھی یہ باہر کھیلتے کھیلتے گم ہو جاتے تو آپ ﷺ صحابہ کرام کی موجود تمام جماعت کو حکم فرماتے کہ اٹھو اور ان کو تلاش کر کے لاؤ اور خود بھی ان کی تلاش میں نکل جاتے، جب تک آپ ﷺ انہیں پا نہ لیتے آپ کو چین نہ آتا۔ اسی طرح ایک سفر میں ان شہزادوں کو پیاس لگ گئی تو آپ ﷺ نے ساتھ چلنے والے تمام رفقاء سفر میں یہ اعلان کروادیا: هَلْ أَحَدٌ مِنكُمْ مَعَهُ مَاءٌ؟ ''کسی کے پاس کچھ پانی ہے؟'' مگر جستجو کے باجود، کسی کے پاس پانی کا قطرہ تک نہ ملا (اتفاق سے اس وقت سب کے پاس پانی ختم ہوگیا تھا)۔ اس پر آپ ﷺ اتنے بے قرار ہوئے کہ آپ نے ان دونوں کو ایک ایک کر کے اپنے پاس بلایا، سینے سے چمٹایا اور اپنی زبان مبارک ان کے منہ میں دے دی وہ ان کو چوستے رہے یہاں تک کہ ان کو سکون آ گیا اور اس طرح ان کے بارے میں آپ ﷺ کی بے قراری ختم ہوئی۔ [۲]

(۳) رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اَلْحَسَنُ وَالْحُسَيْنُ سَيِّدَا شَبَابِ أَهْلِ الْجَنَّةِ ''حسن وحسین جنت کے نوجوانوں کے سردار ہیں''۔ [۳]

(۴) حضرت اسامہ بن زید کہتے ہیں کہ ایک رات کسی کام سے میں حضور ﷺ کے دروازے پر حاضر ہوا۔ آپ ﷺ باہر تشریف لائے اور کسی چیز کو چادر میں چھپا رکھا تھا، مجھے نہیں پتا چل سکا کہ وہ کیا چیز ہے؟ جب میں اپنے کام سے فارغ ہوگیا تو میں نے پوچھ ہی لیا کہ یا رسول اللہ! یہ کیا چیز آپ نے چادر کے اندر لے رکھی ہے؟ آپ ﷺ نے کپڑا اٹھایا تو وہ حضرت حسنؓ وحسینؓ تھے جو آپ ﷺ کے اوپر بیٹھے ہوئے تھے۔ آپ ﷺ نے کہا: یہ میرے اور میری بیٹی کے بیٹے ہیں۔ پھر فرمایا: اللَّهُمَّ إِنِّي أُحِبُّهُمَا فَأَحِبَّهُمَا وَأَحِبَّ مَنْ يُحِبُّهُمَا ''اے اللہ! میں ان سے محبت کرتا ہوں، تو بھی ان سے محبت فرما اور جو ان سے محبت کرے تو اُن سے بھی محبت فرما''۔ [۴]

(۵) حضور ﷺ ایک مرتبہ منبر پر بیان فرمارہے تھے۔ اتنے میں حضرت حسن وحسینؓ لڑکھڑاتے ہوئے سامنے سے آئے، انہوں نے سرخ قمیصیں پہن رکھی تھیں۔ انہیں دیکھ کر آپ ﷺ منبر سے نیچے اتر آئے، جا کر انہیں اٹھایا اور اپنے سامنے بٹھایا پھر منبر پر آ کر دوبارہ تشریف فرما ہوئے اور کہا: اللہ نے سچ فرمایا ہے کہ تمہارے مال اور تمہاری

---

(۱) ینظر: مجمع الزوائد ومنبع الفوائد: ۹/۱۸۰، رقم: ۱۵۰۸۱

(۲) ینظر: مجمع الزوائد ومنبع الفوائد: ۹/۱۸۰، رقم: ۱۵۰۷۱

(۳) سنن الترمذي: ۵/۶۵۶

(۴) سنن الترمذي ت شاكر: ۵/۶۵۷، ۶۵۶

اولاد آزمائش ہیں۔ میں نے ان دو بچوں کو لڑکھڑا کر آتے ہوئے دیکھا تو مجھ سے رہا نہ گیا یہاں تک میں نے اپنی بات درمیان میں روک دی اور جا کر انہیں اٹھالیا۔ [1] اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پھر باقی بیان پورا فرمایا۔ [2]

(۶) جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی اُس بیماری میں تھے جس میں آپ کا انتقال ہوا تو حضرت فاطمہؓ، حضرت حسنؓ و حسینؓ کو لے کر آپ کے پاس آئیں اور کہا: یارسول اللہ! یہ آپ کے بیٹے ہیں، انہیں اپنی وراثت میں کوئی چیز دے دیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: حسن کو (وراثت میں) میری ہیبت اور سرداری ملے گی اور حسین کو میری جرأت و بہادری اور سخاوت ملے گی۔ [3]

(۷) حضرت ابوہریرہؓ بیان کرتے ہیں: ہم حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ عشاء کی نماز پڑھ رہے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم جب سجدہ کرتے تو حضرت حسنؓ و حسینؓ چھلانگ لگا کر آپ کی پیٹھ پر سوار ہو جاتے، پھر جب آپ سجدے سے اپنا سر مبارک اٹھانے لگتے تو آپ اپنا ہاتھ اپنے پیچھے لے جا کر ان دونوں کو اپنی کمر سے بہت آرام سے اٹھاتے اور زمین پر بٹھا دیتے۔ پھر جب آپ دوبارہ سجدہ کرتے تو وہ پھر چھلانگ لگا کر کمر پر چڑھ جاتے، یہاں تک کہ آپ نے نماز ختم فرمائی اور ان دونوں کو اٹھا کر اپنی رانوں پر بٹھالیا۔

حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں: میں پھر اٹھ کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس چلا گیا اور عرض کی: یارسول اللہ! (اندھیری رات ہے [4]) میں ان کو گھر پہنچا آؤں؟ میرے اس کہنے کے بعد (اللہ کی طرف سے) آسمان پر بجلی چمکی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان دونوں سے فرمایا: اِلْحَقَا بِأُمِّكُمَا ''اپنی والدہ کے پاس چلے جاؤ''۔ تو جب تک وہ گھر میں داخل نہیں ہوئے اُس وقت تک بجلی کی چمک ٹھہری رہی۔ [5]

بعض روایات میں ہے کہ جب وہ چھلانگ لگا کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی کمر مبارک پر سوار ہوتے تو بعض دفعہ صحابہ کرامؓ ان کو وہاں سے ہٹانا چاہتے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم صحابہؓ کو اشارہ فرمادیتے کہ ان کو رہنے دو (یہاں سے نہ ہٹاؤ)۔ [6]

---

(۱) مسند أحمد ط الرسالة: ۱۰۰/۳۸

(۲) سنن ابن ماجه: ۱۱۹۰/۲

(۳) المعجم الكبير للطبراني: ۴۲۳/۲۲

(۴) مجمع الزوائد ومنبع الفوائد: ۱۸۰/۹

(۵) مسند أحمد: ۳۸۶/۱۶، بسند حسن، ورواته ثقات كما في دَرّ السحابة في مناقب القرابة والصحابة، ص: ۳۰۷

(۶) مسند أبي يعلى الموصلي: ۴۳۴/۸، بسند حسن: ۳

اور ایک روایت میں یہ بھی آیا ہے کہ جب وہ پیٹھ مبارک پر سوار ہو جاتے تو آپ ﷺ سجدہ لمبا فرما دیتے۔[1] اور حضرت براءؓ کی روایت میں ہے کہ آپ ﷺ پھر ان دونوں سے فرماتے: نِعْمَ الْمَطِيَّةُ مَطِيَّتُكُمَا "کتنی ہی اچھی ہے تمہاری سواری!"۔[2]

(۸) جب یہ آیت {إِنَّمَا يُرِيدُ اللّٰهُ لِيُذْهِبَ عَنكُمُ الرِّجْسَ أَهْلَ الْبَيْتِ وَيُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيرًا} نازل ہوئی تو آپ ﷺ نے حضرت فاطمہ، حضرت حسن اور حضرت حسین سلامُ اللہ و رِضوانُہ علیہم کو بلایا اور انہیں اپنی چادر کے نیچے کرلیا اور حضرت علی سلامُ اللہ و رضوانُہ علیہ آپ ﷺ کے پیچھے کھڑے تھے آپ ﷺ نے ان کو بھی اپنی چادر کے نیچے کرلیا، پھر فرمایا: "اے اللہ! یہ (بھی) میرے اہلِ بیت ہیں۔ آپ ان سے گندگی کو دور رکھیے اور انہیں مکمل پاکیزگی عطا فرمایئے"۔[3]

(۹) حضرت سعد بن ابی وقاصؓ فرماتے ہیں: جب یہ آیت {فَقُلْ تَعَالَوْا نَدْعُ أَبْنَاءَنَا وَأَبْنَاءَكُمْ} نازل ہوئی تو رسول اللہ ﷺ نے حضرت علی، حضرت فاطمہ، حضرت حسن اور حضرت حسین سلامُ اللہ و رِضوانُہ علیہم کو بلایا، پھر کہا: اللَّهُمَّ هَؤُلَاءِ أَهْلِي "اے اللہ! یہ میرے اہلِ بیت ہیں"۔[4]

(۱۰) حضرت جابر بیان کرتے ہیں: میں رسول اللہ ﷺ کے پاس گیا، آپ (اونٹ کی طرح) اپنے دونوں ہاتھوں اور دونوں پاؤں پر چل رہے تھے، حضرت حسنؓ و حسینؓ کو اپنی کمر پر اٹھا رکھا تھا اور اُن دونوں سے فرما رہے تھے: نِعْمَ الْجَمَلُ جَمَلُكُمَا، وَنِعْمَ الْعِدْلَانِ أَنْتُمَا "تمہارا اونٹ کتنا اچھا اونٹ ہے اور تم کتنی اچھی گٹھریاں ہو"۔[5]

(۱۱) حضرت عبداللہ بن بُریدہ کے والد سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے خود، حضرت حسنؓ و حسینؓ کا عقیقہ فرمایا۔[6]

(۱۲) اہلِ عراق (جس میں کوفہ بھی ہے) کے ایک شخص نے حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے مسئلہ پوچھا کہ مچھر کا خون

---

(۱) مجمع الزوائد ومنبع الفوائد: ۹/۱۸۰

(۲) المصدر السابق: ۹/۱۸۲

(۳) ینظر: سنن الترمذي ت شاكر: ۳/۳۵۱

(۴) ینظر: صحیح مسلم: ۱۸۷۱

(۵) البداية والنهاية طهجر: ۱۱/۱۹۰، باسناد علی شرط مسلم - مع مجمع الزوائد: ۹/۱۸۲

(۶) مسند أحمد ط الرسالة: ۳۸/۱۶۰

اگر کپڑے میں لگ جائے تو کوئی حرج تو نہیں ہے؟۔ابن عمرؓ نے فرمایا: ذرا ادھر اس شخص کو دیکھو، یہ اب مچھر کے خون کے متعلق پوچھتا ہے حالانکہ ان عراق والوں نے رسول اللہ ﷺ کے صاحبزادے (حضرت حسینؓ) کو قتل کر دیا تھا، جبکہ میں نے حضور ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا: "بلاشبہ حسن وحسین میرے دنیا کے پھول ہیں (یعنی یہ مجھے محبوب ہیں اور انہیں دیکھ کر میری آنکھوں کو سکون ملتا ہے)"۔ [1]

(۱۳) حضرت عثمان بن عفانؓ حضرات حسنین کریمینؓ کا احترام واعزاز اور ان سے حد درجہ محبت کرتے تھے۔ [2]

(۱۴) حضور ﷺ نے حضرت حسن اور حضرت حسینؓ کا ہاتھ پکڑا اور فرمایا: جو شخص مجھ سے محبت کرے، ان دونوں سے محبت کرے اور ان کے ماں باپ سے محبت کرے وہ بروزِ محشر میری جگہ میں میرے ساتھ ہوگا۔ [3]

(۱۵) ایک موقع پر آپ ﷺ نے حضرات حسنینؓ سے فرمایا: میرے ماں باپ تم پر قربان ہوں، تم اللہ کے ہاں کتنی ہی عزت والے ہو۔ [4]

---

(۱)سنن الترمذي ت شاکر: ۹/۶۵۷

(۲)البدایۃ والنہایۃ ط ھجر: ۱۱/۱۹۳

(۳)سنن الترمذي ت شاکر: ۵/۶۴۲

(۴):مجمع الزوائد ومنبع الفوائد: ۹/۱۸۲

حضرات حسنین رضی اللہ عنہما کی شان میں گلدستۂ اشعار

آخر میں اِس دَور کے آلِ رسول کے ولیٔ کامل حضرت مولانا سید نفیس الحسینی شاہ صاحب رحمہ اللہ کے اشعار درج کیے جاتے ہیں جن کے لفظ لفظ سے شانِ حسنین کریمین رضی اللہ عنہما ظاہر ہوتی ہے:

دوشِ نبی کے شاہسواروں کی بات کر
کون ومکاں کے راج دُلاروں کی بات کر

جن کے لیے ہیں کوثر وتسنیم موجزن
ان تشنہ کام، بادہ گساروں کی بات کر

خُلدِ بریں ہے جن کے تقدس کی سیرگاہ
ان خوں میں غرق غرق نگاروں کی بات کر

کلیوں پہ کیا گزر گئی، پھولوں کا کیا ہوا
گلزارِ فاطمہ رضی اللہ عنہا کی بہاروں کی بات کر

جن کے نفس نفس میں تھے قرآں کھلے ہوئے
ان کربلاء کے سینہ فِگاروں کی بات کر

شمرِ لعیں کا ذکر نہ کر میرے سامنے
شیرِ خدا کے مَرگ شِعاروں کی بات کر۔[1]

---

(۱) شہادتِ حسین، ص: ۱۶۰

حضرت امام حسنؓ سے متعلقہ فضائل

(۱) رسول اللہ ﷺ نے حضرت حسنؓ کے بارے میں کہا: اَللّٰھُمَّ إِنِّي أُحِبُّهُ فَأَحِبَّهُ، وَأَحِبَّ مَنْ يُحِبُّهُ "اے اللہ! میں اس سے محبت کرتا ہوں، تو بھی اس سے محبت فرما اور جو اس سے محبت کرے اُس سے بھی تو محبت فرما"۔ آپ ﷺ نے یہ فرمایا اور حضرت حسنؓ کو اپنے سینہ مبارک سے چمٹا لیا۔[1]

(۲) حضرت براء بن عازبؓ کہتے ہیں: میں نے رسول اللہ ﷺ کو دیکھا، آپ نے حضرت حسنؓ کو اپنے کندھے پر اٹھا رکھا تھا اور فرما رہے تھے: اے اللہ! مجھے اِس سے محبت ہے، تو بھی اسے اپنا محبوب بنا لے۔[2] اور ایک روایت میں ہے کہ حضرت حسنؓ آپ ﷺ کی گود میں بیٹھ کر آپ کی ڈاڑھی مبارک میں انگلیاں ڈال رہے تھے اور آپ ﷺ اپنی زبان ان کے منہ میں دیتے تھے اور فرماتے تھے: اے اللہ! میں اس سے محبت کرتا ہوں تو بھی اس سے محبت فرما۔[3]

(۳) حضرت حسنؓ کبھی آتے اور آپ ﷺ سجدے میں ہوتے، تو وہ آپ ﷺ کی پیٹھ پر سوار ہو جاتے۔ آپ ﷺ اس وقت تک سجدے سے سر نہ اٹھاتے جب تک وہ خود نہ اتر جاتے۔ اسی طرح بعض دفعہ وہ آتے اور آپ ﷺ رکوع میں ہوتے تو آپ ان کیلیے اپنی ٹانگوں کو پھیلا دیتے اور وہ ٹانگوں کے درمیان سے گزر کر دوسری طرف نکل جاتے۔[4]

(۴) حضرت ابوبکرہؓ فرماتے ہیں ایک دفعہ رسول اللہ ﷺ، حضرت حسنؓ کو اپنے ساتھ باہر لائے اور انہیں منبر پر (اپنے ساتھ) بٹھایا اور فرمایا: میرا یہ بیٹا سردار ہے۔ امید ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کے ذریعے مسلمانوں کی دو جماعتوں میں صلح کرائے گا۔[5] (اس کی وضاحت عنقریب ہی گزر چکی ہے)۔

---

(۱) سنن ابن ماجه: ۱/ ۵۱

(۲) سنن الترمذي ت شاكر: ۵/ ۶۶۱

(۳) المستدرك على الصحيحين للحاكم: ۳/ ۱۸۵

(۴) تهذيب التهذيب ۲۹۶/ ۲، وذخ السحابة في مناقب القرابة والصحابة ص: ۲۸۷

(۵) صحيح البخاري: ۳/ ۲۰۴

(۵) حضرت حسنؓ سے زیادہ کوئی شخص رسول اللہ ﷺ کے مشابہ نہیں تھا۔[۱] (چناں چہ آپؓ حسین وجمیل اور نہایت خوبصورت تھے۔)[۲]

(۶) آپؓ سر سے لے کر سینہ مبارک تک (یعنی اوپر والے نصف حصۂ بدن میں)، حضور ﷺ کے مشابہ تھے۔[۳] اور باقی بدن میں یعنی سینہ سے لے کر پاؤں تک اپنے والد حضرت علیؓ کے مشابہ تھے، اور حضرت حسینؓ کی مشابہت اس کے برعکس تھی یعنی وہ اوپر والے حصۂ بدن میں حضرت علیؓ کے اور نیچے والے بدن میں حضور ﷺ کے مشابہ تھے، جیسا کہ آئندہ آرہا ہے۔ اسی مناسبت سے آپ ﷺ فرمایا کرتے تھے کہ ''حسن مجھ سے ہے اور حسین، علی سے ہے'' یعنی حسن میرے مشابہ ہے اور حسین، علی کے مشابہ ہے۔[۴]

(۷) حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں: ایک دن حضور ﷺ باہر تشریف لے گئے، میں بھی ساتھ تھا، آپ ﷺ بنو قینُقاع کے بازار گئے اور پھر وہاں سے واپسی پر حضرت فاطمہؓ کے گھر آئے اور (بہت ہی پیار والے انداز میں) حضرت حسنؓ کے بارے میں پوچھا: أَثَمَّ لُكَعُ؟ أَثَمَّ لُكَعُ؟ ''اِدھر ننھا منا بچہ ہے؟ اِدھر ننھا منا بچہ ہے؟'' حضرت حسنؓ باہر نہیں نکلے، ہم یہ سمجھے کہ شاید ان کی والدہ نے ان کو نہلانے کیلیے یا بچوں والا کوئی ہار وغیرہ پہنانے کیلیے روک رکھا ہے۔ بس تھوڑی دیر ہی گزری تھی کہ حضرت حسنؓ دوڑتے ہوئے باہر آئے اور آپ ﷺ اور حضرت حسنؓ میں سے ہر ایک نے دوسرے کو گلے لگالیا اور آپ ﷺ فرمارہے تھے: اللّٰهُمَّ إِنِّي أُحِبُّهُ، فَأَحِبَّهُ وَأَحْبِبْ مَنْ يُحِبُّهُ ''اے اللہ! مجھے حسن سے محبت ہے، تو بھی اسے اپنا محبوب بنالے اور جو اس سے محبت کرے اُسے بھی اپنا محبوب بنالے''۔[۵] ایک روایت میں ہیں کہ آپ ﷺ نے حضرت حسنؓ کو گلے بھی لگایا اور ان کا بوسہ بھی لیا۔[۶]

(۸) رسول اللہ ﷺ نے حضرت حسنؓ کو اپنے کندھے پر اٹھا رکھا تھا۔ کسی آدمی نے کہا: اے لڑکے! کتنی اچھی سواری پر تُو سوار ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: وَنِعْمَ الرَّاكِبُ هُوَ ''اور سوار بھی تو کتنا اچھا ہے''۔[۷]

---

(۱): المرجع السابق: ۲۶/۵

(۲) الغصن النّدي في سيرة الحسن بن علي، ص: ۲۶

(۳) سنن الترمذي ت شاكر: ۶۶۰/۵

(۴) ينظر: سنن ابي داود: ۶۸/۴، و مسند احمد ۴۲۶/۲۸

(۵): صحيح مسلم: ۱۸۸۲/۴

(۶) صحيح البخاري: ۶۶/۳

(۷) سنن الترمذي ت شاكر: ۶۶۱/۵

(۹) عمیر بن اسحاق کہتے ہیں: میں حضرت حسنؓ کے ساتھ کہیں جا رہا تھا۔ راستے میں ہمیں حضرت ابو ہریرہؓ ملے۔ انہوں نے حضرت حسنؓ سے کہا کہ میں نے حضور ﷺ کو آپ کے بدن پر جہاں بوسہ لیتے ہوئے دیکھا تھا مجھے بھی اب وہ جگہ ذرا دکھلاؤ تا کہ میں بھی اس کا بوسہ لوں۔ حضرت حسنؓ نے اپنا کرتا ہٹایا اور حضرت ابو ہریرہؓ نے آپؓ کی ناف کا بوسہ لیا۔[1]

(۱۰) حضرت معاویہؓ فرماتے ہیں: میں نے رسول اللہ ﷺ کو حضرت حسنؓ کی زبان یا فرمایا: ہونٹ کو چوستے ہوئے دیکھا، اور بلاشبہ جس زبان یا ہونٹوں کو حضور ﷺ نے چوسا ہو ان کو کبھی عذاب نہیں ہوگا۔[2]

(۱۱) آپ سلام اللہ و رضوانہ علیہ نے مدینہ منورہ سے بیس پیدل حج کیے۔[3] ایک روایت میں ہے کہ ۲۵ پیدل حج کیے۔[4] (اور اپنے پیدل حج کی وجہ یہ بیان کی کہ مجھے اللہ سے حیا آتی ہے کہ میری اُس سے ملاقات ہو اور میں اُس کے گھر پیدل چل کر نہ گیا ہوں۔[5])

(۱۲) آپؓ بے مثل سخی تھے۔ بعض دفعہ آپؓ ایک ہی آدمی کو ایک لاکھ درہم دے دیتے تھے (جو اِس وقت ۲ کروڑ ۱۰ لاکھ روپے کے مساوی ہیں)۔ ایک مرتبہ آپؓ نے انصار کے کچھ لوگوں سے چار لاکھ درہم کا باغ خریدا، بعد میں آپؓ کو پتا چلا کہ وہ لوگ غریب ہو گئے ہیں تو آپؓ نے وہ باغ ان کو مفت واپس کر دیا۔ اور زندگی بھر آپؓ نے کسی مانگنے والے کو "نہ" نہیں کی۔ اور جس شخص کو بھی آپؓ سے کچھ تعلق تھا تو وہ آپؓ کو چھوڑ کر کسی اور کے سامنے اپنی حاجت بیان ہی نہیں کرتا تھا۔ حیران کن بات یہ ہے کہ دو مرتبہ آپؓ کی زندگی میں سخاوت کا یہ واقعہ بھی پیش آیا کہ آپؓ کے پاس اُس وقت جو کچھ تھا وہ سب کا سب آپؓ نے اٹھا کر دے دیا اور اپنے پاس کچھ بھی نہیں رکھا۔[6]

---

(۱) مسند احمد ط الرسالة: ۱۲/۴۲۷

(۲) مسند احمد ط الرسالة: ۲۸/۶۲

(۳) تاریخ اصبهان = اخبار أصبهان: ۱/۹۶

(۴) تاریخ دمشق لابن عساکر: ۱۳/۲۴۴

(۵) تاریخ دمشق لابن عساکر ۱۳/۲۴۲، وکذا في الغصن الندي في سيرة الحسن بن علي، ص: ۲۹

(۶) سبل الهدى والرشاد في سيرة خير العباد ۱۱/۶۸ مع تاريخ اصبهان: ۱/۹۶

۲۔ امام حسنؓ کے ائمہ صاحبزادگان سلام اللہ ورحمۃ علیہم

اس مبحث میں امام حسنؓ کی نسلِ مبارک میں سے درج ذیل ائمہ حضرات سلام اللہ ورحمۃ علیہم کی سیرت ومناقب کو ذکر کیا جائے گا:

۱۔ امام حسن مثنیٰؒ سلام اللہ ورحمۃ علیہ بن حضرت امام حسن بن علی المرتضیٰؓ

۲۔ امام عبداللہ محض بن حسن مثنیٰؒ سلام اللہ ورحمۃ علیہما

۳۔ امام نفسِ زکیہ بن عبداللہ محض سلام اللہ ورحمۃ علیہما

۴۔ امام مہدی سلام اللہ ورضوانہ علیہ

(۱) امام حسن مثنیٰؒ سلام اللہ ورحمۃ علیہ

(حسن بن حسن بن علی کرم اللہ وجہہ)

نام ونسب:

آپ سلام اللہ ورحمۃ علیہ، کا نام ''حسن'' تھا۔ آپؒ حضرت امام حسنؓ بن علیؓ بن ابی طالب کے بیٹے تھے۔[۱] والدہ کا نام ''خَولہ بنتِ منظور'' تھا،[۲] جو قبیلہ ''فزارہ'' کی تھیں اور اسی نسبت سے خَولہ فزاریہ کہلاتی تھیں۔[۳] آپؒ کی کنیت ''ابو محمد''[۴] اور لقب ''مثنیٰ'' تھا۔[۵] وطن کے اعتبار سے آپؒ ''مدنی''[۶] جبکہ نسب کے لحاظ سے قریشی، ہاشمی اور حسنی تھے۔[۷]

---

(۱) الطبقات الكبرى ط العلمية: ۲۴۵/۵

(۲) بغية الطلب في تاريخ حلب: ۲۳۱۶/۵، والبداية والنهاية ط هجر: ۶۲۳/۱۲

(۳) سير أعلام النبلاء: ۴۸۵/۴، مع الفرائد على مجمع الزوائد ص: ۳۷۷، ومع الانساب للسمعاني: ۲۱۲/۱۰، والطبقات الكبرى: ۲۴۵/۵، ومعجم قبائل العرب القديمة والحديثة: ۳۵۶/۵

(۴): سير أعلام النبلاء ط الرسالة: ۴۸۳/۴، والوافي بالوفيات: ۳۱۸/۱۱

(۵) نور الأبصار في مناقب آل بيت النبي المختار، ص: ۱۷۲، وصحاح الأخبار في نسب السادة الفاطمية الأخيار، ص: ۱۲

فائدہ: چونکہ آپؒ کے نام میں ''حسن'' کا لفظ دو مرتبہ آتا ہے (یعنی حسن بن حسن)، اس لیے آپؒ کو مثنیٰ (یعنی دو والا) کہا جاتا تھا۔

(۶) بغية الطلب في تاريخ حلب: ۲۳۱۶/۵ وسير أعلام النبلاء ط الرسالة: ۴۸۳/۴

(۷) البداية والنهاية ط هجر: ۶۲۳/۱۲

والدہ ماجدہ کا تذکرہ:

آپؒ کی والدہ ماجدہ حضرت خولہؒ قبیلہ ''فزارہ'' سے تعلق رکھتی تھیں، جیسا کہ ابھی گزرا۔ آپ رحمۃ اللہ علیہا کے والد کا نام منظور بن زَبّان، والدہ کا نام ملیکہ بنت خارجہ اور نانی کا نام تُماضِر بنت قَیس تھا۔

حضرت خولہ، امام حسنؒ سے پہلے حضرت محمد بن طلحہ تیمیؓ کے نکاح میں تھیں، اُن سے حضرت خولہؒ کے تین بیٹے پیدا ہوئے: ابراہیم، داود اور قاسم۔ حضرت محمد بن طلحہ تیمیؓ جنگِ جَمل میں جب شہید ہو گئے تو یہ حضرت امام حسن بن علی بن ابی طالب کے نکاح میں آئیں اور ان سے حضرت امام حسن مثنیؒ پیدا ہوئے۔ اس لحاظ سے حضرت محمد بن طلحہ تیمیؓ کے تینوں بیٹے (ابراہیم، داود اور قاسم) امام حسن مثنیؒ کے ماں شریک بھائی تھے۔[1]

ذیل میں حضرت خولہؒ کا تفصیلی تذکرہ درج کیا جاتا ہے:

حضرت خولہ بنت منظور اپنی قوم کی سب سے خوبصورت و باکمال خاتون تھیں۔ ایک مرتبہ مدینہ طیبہ اپنی بہن کو ملنے آئیں جو حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کی بیوی تھیں۔ یہاں مدینہ طیبہ میں (جب کہ وہ اپنی بہن کے ہاں قیام پذیر تھیں) قریش کے کئی افراد نے اُنہیں نکاح کا پیغام بھیجا مگر اُن کے والد نے انکار کر دیا۔ بالآخر حضرت محمد بن طلحہ تیمیؓ سے اُن کا نکاح ہو گیا اور ان سے اُن کی اولاد بھی ہوئی۔ پھر جب جنگِ جَمل پیش آئی تو اس میں حضرت محمد بن طلحہ تیمیؓ شہید ہو گئے۔ اس کے بعد وہ امام حسن بن علیؓ کے نکاح میں آئیں۔ امام حسنؓ کے نکاح میں آنے کا قصہ یہ ہے:

اُن کے شوہر حضرت محمد بن طلحہ تیمیؓ کی شہادت کے بعد بہت سارے نوجوانانِ قریش نے انہیں نکاح کا پیغام بھیجا، جب ہر طرف سے نکاح کے پیغام آنے لگے تو انہوں نے اپنا یہ معاملہ اپنی بہن کے ہاتھ میں دے دیا، اور ان کی بہن نے اس معاملہ کو اپنے شوہر حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کے سپرد کر دیا (کہ وہ معاشرے سے زیادہ واقف اور اس کی بہتر سمجھ رکھتے تھے)۔ انہوں نے اس معاشرے کے سب سے بہترین اور خوبصورت ترین نوجوان امام حسن بن علیؓ سے حضرت خولہ کا نکاح کرا دیا، لیکن جب اس نکاح کی اطلاع ان کے والد (منظور بن زبان) کو ملی تو وہ غصے اور غیرت کے ملے جلے جذبات سے بھرا ہوا سیدھا مدینہ طیبہ پہنچا، آ کر مسجد نبوی کے پاس اپنا جھنڈا اگاڑا (کہ وہ اپنی

---

(1) ینظر: تهذیب الکمال في أسماء الرجال: ٦/ ٩١ مع اسد الغابة: ٥/ ٩٣ و علماء اهل البیت فی عصر التابعین، ص: ١٣٢

قوم کا سردار تھا[1])اور بہ آواز بلند پکارا: یا آلَ قَیس! یا آلَ قَیس! (اے آلِ قَیس! اے آلِ قَیس!) پھر کیا تھا کہ ہر طرف سے تمام آلِ قَیس لپک لپک کر مسجد نبوی کے پاس جمع ہو گئے، پورے مدینہ میں آلِ قَیس کا کوئی ایک فرد بھی ایسا نہیں بچا تھا جس کو آواز پہنچی ہو اور وہ منظور بن زبان کے جھنڈے کے نیچے حاضر نہ ہوا ہو۔

جمع ہونے کے بعد جب اِن آلِ قَیس کو پتا چلا کہ اِسے یہ سارا غصہ، اپنی بیٹی کے امام حسنؓ کے ساتھ نکاح ہو جانے کی وجہ سے ہے اور ہمیں اسی لیے جمع کیا ہے تو ان سب نے اسے کوسا اور کہنے لگے: تمہارا حُسنِ سلوک اور بُردباری اب کہاں چلی گئی ہے؟؟ خولہ سے حسن بن علیؓ نے نکاح کیا ہے، اور تمہیں معلوم ہے کہ ''حسنؓ'' کے مقابلے کا کوئی نوجوان نہیں ہے؟ وہ تو اہلِ بیت کے سیدوں کے بھی سید ہیں، لیکن منظور بن زبان کی سمجھ میں بات نہ آسکی اور وہ اپنی بات پر ہی قائم رہا۔ جب یہ سارے واقعہ کی امام حسنؓ کو اطلاع ملی تو وہ چل کر خود منظور بن زبان کے پاس آئے اور ان سے اس بارے میں بات کی مگر منظور پھر بھی قبول کرنے پر آمادہ نہ ہوا۔ اس پر امام حسنؓ نے اُس سے الجھنے یا بدخلقی سے پیش آنے کے بجائے اس کو کہا: شَأنُکَ بِابنَتِکَ ''تمہیں اپنی بیٹی کے متعلق پورا اختیار ہے، تم اسے لے جانا چاہو تو لے جا سکتے ہو''۔ وہ اپنی بیٹی کے پاس آیا اور اسے اپنے ساتھ سوار کر کے واپس چل دیا۔

جب یہ دونوں مدینہ سے باہر نکل گئے تو حضرت خولہ نے والد سے کہا: آپ یہ کیوں کر رہے ہیں؟ کیا کوئی ایک فرد بھی آپ کے اس فیصلے پر راضی ہے؟ آپ ذرا اس ہستی (یعنی امام حسنؓ) پر نظر تو ڈالیں: یہ، سیدنا حضرت علی کرم اللہ وجہہ اور خواتینِ جنت کی سردار سیدہ فاطمۃ الزہراء رضی اللہ عنہا کے صاحبزادے اور اللہ تعالیٰ کے برگزیدہ رسول حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے نواسے ہیں اور خود بھی جنت کے نوجوانوں کے سردار ہیں!!! بھلا ایسا عظیم دسراپا خیر نوجوان، پوری دنیا میں کہیں آپ کو مل پائے گا؟ وہ مسلسل اُس کو اُس کے اس فیصلے پر احساسِ ندامت دلاتی رہیں، آخر اس کی سمجھ میں بات آ گئی اور انہیں کہنے لگا: خولہ! تم سچ کہتی ہو۔ لیکن اب یہ ہے کہ ہم قباء بستی میں اتر جاتے ہیں اور وہیں کسی جگہ ٹھہر جاتے ہیں، اگر تو ''حسنؓ'' کو تمہاری ضرورت ہوئی تو وہ خود ہمارے پاس آ جائے گا اور میرا خیال ہے کہ وہ ضرور ایسا کرے گا۔

---

(1) الأعلام للزركلي ٧/٣٠٨، والإصابة في تمييز الصحابة: ٦/١٧٥، نقلا عن الأصبهاني في الأغاني، فانظر: الأغاني للأصبهاني: ١٢/٢٢٥

بہرحال وہ دونوں وہیں قباء میں ہی تھے کہ حضرت حسنؓ اپنے بھائی حضرت حسینؓ اور دو مزید جلیل القدر شخصیتوں: حضرت عبداللہ بن عباسؓ اور حضرت عبداللہ بن جعفرؓ کے ہمراہ مدینہ طیبہ سے قباء کی جانب چل دیے۔ جب قباء پہنچے تو منظور بن زبان نے ان حضرات کے شایان شان ان کا استقبال کیا اور اپنی بیٹی (خولہ) کو حضرت حسنؓ کے ساتھ روانہ کر دیا، پھر یہ زندگی بھر حضرت حسنؓ کے ساتھ ہی رہیں اور حضرت حسنؓ کے انتقال کے وقت یہ عمر رسیدہ تھیں۔ جب آپؒ کی عدت پوری ہوگئی تو متعدد افراد کی طرف سے آپؒ کو نکاح کے پیغامات ملے مگر آپؒ نے ان سب کو انکار کرتے ہوئے ایک خوبصورت جملہ کہا جو آپؒ کے تقویٰ و دیانت، فہم و فراست، دور اندیشی اور بالغ نظری کا مکمل عکاس ہے، آپؒ نے فرمایا: وَاللہ لَا کَانَ لِی حَمْوٌ بعدَ رسولِ اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (واللہ! رسول اللہ ﷺ کے بعد اب میرا کوئی سسر نہیں بنے گا)۔ جب یہ جملہ کہا تو لوگ آپؒ سے نکاح کے معاملہ میں بالکلیہ مایوس ہو گئے اور پیغاماتِ نکاح بھیجنے بند کر دیے۔

حضرت خولہؒ حسن اخلاق، صدقہ و خیرات اور کثرتِ سخاوت میں معروف و مشہور تھیں، لوگ اپنی حاجتیں لے کر آپؒ کے پاس حاضر ہوتے اور آپؒ ان کی حاجت برآری کیا کرتیں، آپؒ نے ایک زمانہ تک لوگوں کے دکھ بانٹے اور لمبی عمر پائی۔[1]

حضرت خولہؒ کے حسنِ معاشرت کا ایک حیران کن و خوبصورت ترواقعہ کتابوں میں لکھا ہے کہ ایک مرتبہ حضرت امام حسنؓ اپنے گھر کی چھت پر آرام کرنے کیلئے رات کو لیٹے۔ حضرت خولہؒ نے اپنا دوپٹا اتارا، اس کا ایک کنارا ان کے پاؤں سے باندھا اور دوسرا کنارہ اپنے پازیب سے باندھ کر سو گئیں۔ امام حسنؓ رات کے کسی حصہ میں جب اٹھے تو یہ دیکھ کر دریافت فرمایا کہ یہ کیا ہے؟ آپؒ نے جواب دیا کہ مجھے اندیشہ ہوا کہ رات کی تاریکی میں آپ اٹھیں اور نیند میں ہونے کی وجہ سے کہیں گر نہ جائیں۔ چنانچہ حضرت حسنؓ بھی آپؒ سے بہت محبت کرتے تھے۔

اسی کے ساتھ ہی حضرت خولہؒ کی مہمان نوازی کا بھی کا ایک منفرد واقعہ درج کیا ہے:

ایک دفعہ حضرت ابن عمرؓ نے اپنے ساتھیوں سے کہا: کئی دن ہو گئے ہیں حضرت حسنؓ سے ملاقات نہیں ہوئی، آج ان کی ملاقات کیلئے چلتے ہیں۔ جب ان کے گھر پہنچے اور حضرت خولہ کو مہمانوں کے آنے کی اطلاع ملی تو آپؒ نے

---

(1) علماء اهل البيت في عصر التابعين، ص: ۱۲۳

حضرت حسنؓ سے کہا کہ ان مہمانوں کو کسی طرح روکے رکھو تا کہ میں ان کیلئے کھانا تیار کرلوں۔ حضرت ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ حضرت حسنؓ نے ہمارے ساتھ باتیں کرنا شروع کیں، ہم ان کی دل موہ لینے والی باتوں میں اس طرح مشغول ہوئے کہ وہیں دوران گفتگو ہی کھانا تیار ہوکر ہمارے پاس پہنچ گیا۔[1]

ولادت:

تلاش کے باوجود آپ کا سنِ ولادت ہمیں کہیں نہیں مل سکا۔

مقام ومسکن:

آپ سلام اللہ ورحمۃ علیہ نے اپنی زندگی مدینہ طیبہ میں گزاری حتی کہ وہیں انتقال فرمایا۔[2]

معرکۂ کربلاء میں شرکت:

کربلا میں آپ بھی اپنے چچا امامِ عالی مقام، سیدنا امام حسینؓ کے ساتھ معرکہ میں شریک تھے۔ دشمنوں نے آپؒ کو کم سن ہونے کی وجہ سے چھوڑ دیا تھا لہذا آپ شہید نہیں ہوئے تھے، اس لیے آخر میں قید ہوجانے والے حضرات میں آپ بھی شامل تھے، چنانچہ اسماء بن خارجہ فزاری (جو کہ حضرت حسن مثنیٰ کی والدہ کے قبیلہ ''فزارہ'' سے تعلق رکھتا تھا، بلکہ رشتہ میں آپؒ کی والدہ کا چچازاد بھائی لگتا تھا) نے آپ کو جب قیدیوں کے زمرہ میں دیکھا تو اس نے آپ کو رہائی دلوائی۔ اس طرح آپ ان ظالموں کے ہاتھوں سے صحیح سالم اور محفوظ رہ گئے اور بعد میں آپؒ ستارۂ ہدایت بن کر چمکے اور مخلوقِ الٰہی آپؒ کے علم وتقوی سے خوب سیراب وفیضیاب ہوئی۔[3]

شادی اور گھریلو زندگی:

حضرت حسن مثنیٰ سلام اللہ ورحمۃ علیہ جب جوانی کی عمر کو پہنچ گئے اور رفیقۂ حیات کی ضرورت محسوس کی تو اس سلسلہ میں غور وفکر شروع کی۔ انہوں نے دیکھا کہ میرے چچا جان ''حسینؓ'' ایسے ہیں جن کے تعاون سے ان کی امید برلا

---

(۱) مستفاد من: تهذيب الكمال في أسماء الرجال: ۲۳۶/۶، ومختصر تاريخ دمشق: ۲۷/۷، معلماء اهل البيت فی عصر التابعين، ص: ۱۳۵

(۲) الأعلام للزركلي: ۲/۱۸۷

(۳) ينظر: نور الابصار، ص: ۱۷۳، والفصول المهمة، ص: ۱۲۰، والاتحاف بحب الاشراف، ص: ۲۶۳، مع تهذيب التهذيب: ۲۶۳/۲، وتاريخ الطبري: ۴۶۹/۵، والكامل في التاريخ: ۱۹۵/۳

سکتی ہے کہ آپؒ جانتے تھے کہ ان کی دو صاحبزادیاں ''فاطمہ'' اور ''سکینہ'' دخترانِ اہلِ بیت میں سے عالی صفات و عمدہ سیرت لڑکیاں ہیں اور یہ کہ وہ دونوں علم و ادب سے خوب آراستہ ہیں، چنانچہ وہ خود چل کر حضرت امام حسینؓ کے پاس آئے اور ان سے اپنی چاہت کا اظہار کیا، حضرت امام حسینؓ نے مسکراتے چہرے اور خندہ پیشانی کے ساتھ ان سے ملاقات کی، اور پھر محبت و شفقت اور لطف و عنایت سے لبریز لہجہ میں انہیں مخاطب کرتے ہوئے فرمایا: میرے پیارے بھتیجے! میری طرف سے آپ کو دلی خوش آمدید ہو، میں تو خود یہی چاہتا تھا، آئیں گھر چلتے ہیں، اور انہیں اپنے ساتھ گھر لے آئے۔ وہاں انہیں، فاطمہ اور سکینہ کو بھی دکھلایا گیا پھر امام حسینؓ نے ان سے کہا: یابُنَيَّ! اِختر واحِدۃً منہمَا ''میرے پیارے بیٹے! آپ (کو ان دونوں میں اختیار ہے،) ان میں سے کسی ایک کے بارے میں آپ اپنی رائے بتادیں''۔ آپؒ نے ''فاطمہ'' کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار کیا، چنانچہ انہی کے ساتھ آپؒ کا نکاح کردیا گیا۔[1]

دوسری روایت میں ہے کہ امام حسن مثنیٰ نے چچا جان حضرت امام حسینؓ کے پاس پیغام بھیجا کہ ان کی صاحبزادیوں: فاطمہ و سکینہ میں سے کسی ایک سے ان کا نکاح ہو جائے۔ امام حسینؓ نے جواب میں فرمایا: میرے بیٹے! آپ کو ان میں سے جو زیادہ پسند ہو اس کے بارے میں آپ بتادیں۔ امام مثنیٰ نے شرم کی وجہ سے کوئی جواب نہ دیا، اس پر امام حسینؓ نے (خود انتخاب کرتے ہوئے) فرمایا: میں آپ کیلئے فاطمہ کا انتخاب کرتا ہوں، کہ یہ میری والدہ ماجدہ، صاحبزادیٔ رسول: حضرت فاطمۃ الزہراءؓ کے زیادہ مشابہ ہے۔ اور پھر امام حسینؓ نے ان سے فاطمہ کا نکاح کرادیا، اور فاطمہ، اپنی بہن سکینہ سے بڑی تھیں۔[2]

حضرت امام حسن مثنیٰ اور حضرت فاطمہ بنت حسین کی آپس میں یہ شادی ہونا، دراصل دو عالی نسب ہستیوں کا آپس میں جمع ہونا تھا کہ یہ پہلی شادی تھی جس میں نوجوانانِ جنت کے سرداران: حضرت امام حسن و حسین رضی اللہ عنہما کی اولاد آپس میں رشتۂ ازدواج میں منسلک ہورہی تھی۔[3]

---

(۱) ينظر: علماء أهل البيت في عصر التابعين، ص: ۱۵۴

(۲) الفصول المهمة في معرفة أحوال الائمة، ص: ۱۶۰، ونور الابصار في مناقب آل بيت النبي المختار ص: ۱۷۳، والاتحاف بحب الأشراف، ص: ۲۶۳، مع تحشية علماء أهل البيت في عصر التابعين، ص: ۱۵۵، رقم: ۱

(۳) علماء أهل البيت في عصر التابعين، ص: ۱۵۴

حضرت فاطمہؒ اپنے والد ماجد امام حسینؓ کی شہادت کے بعد جب کربلاء سے شام اور پھر وہاں سے واپس مدینہ طیبہ پہنچائی گئی تھیں تو یہاں آپ کے چچازاد بھائی حضرت حسن مثنیٰؒ کے ساتھ آپؒ کی یہ شادی ہوئی۔ آپؒ زندگی بھر امام مثنیٰؒ کے ساتھ رہیں۔ جب ان کا انتقال ہوگیا تو آپؒ حضرت عثمان بن عفانؓ کے پوتے حضرت عبداللہ بن عمرو کے نکاح میں آئیں۔ جب ان کا بھی انتقال ہوگیا تو آپ رحمۃ اللہ علیہا نے مزید نکاح کرنے سے انکار فرما دیا، اور پھر اسی حالت میں دنیا سے رخصت فرما گئیں۔[1]

اللہ تعالیٰ نے جس طرح امام حسن مثنیٰؒ کو عالی صفات سے نوازا تھا اسی طرح آپؒ کی اہلیہ حضرت فاطمہ بنت حسینؓ کو بھی عمدہ اوصاف سے سرفراز فرمایا تھا۔ آپؒ ایک جلیل القدر تابعیہ، راویۂ حدیث اور عالمہ فاضلہ خاتون تھیں، اس علمی کمال کے ساتھ ساتھ آپؒ عبادت وذکر میں بھی بے مثل تھیں۔ جہاں ان باطنی صفات وکمالات میں اعلیٰ درجہ پر فائز تھیں وہاں ظاہری حسن وجمال میں بھی آپؒ کو وافر حصہ نصیب ہوا تھا کہ آپؒ کو اپنے غیر معمولی حسن کی بناء پر ''حور عین'' سے تشبیہ دی جاتی تھی۔[2]

حضرت امام حسن مثنیٰؒ اپنی گھر کی زندگی میں سراپا شفقت ومحبت، اور مجسمۂ تحمل وبرداشت تھے۔ ناگواری کے اوقات میں بھی اپنی بیویوں کے ساتھ نہایت حسنِ سلوک سے پیش آتے، چنانچہ ایک روایت میں آتا ہے کہ امام حسن مثنیٰؒ کی ایک بیوی نے آپؒ کے ساتھ رہنے میں ''اکتاہٹ'' محسوس کی اور ''کئی اعتبار سے تنگ آجانے'' کا اظہار کیا۔ جب وہ اپنے لحاظ سے پریشانی اور اکتاہٹ کی اس حد کو پہنچ گئی تو آپؒ نہایت تحمل اور وقار کے ساتھ اس کی طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا: یا هٰذه! أمرُكِ فِي يَدِكِ ''ارے! (پریشان ہونے کی بات نہیں ہے،) میں تمہارا معاملہ تمہارے ہاتھ میں دیتا ہوں، (اور تمہیں اختیار دیتا ہوں کہ اگر تم چاہو تو تم اپنے آپ کو مجھ سے آزاد کرلو)''۔

جب اس نے (اعتدال وہمدردی سے بھرا ہوا) یہ جواب سنا تو وہ (حیرت زدہ ہوکر) آپؒ کو دیکھنے لگی اور اب جبکہ اس کو صحیح راہ بھی واضح ہو چکی تھی اور وہ پہلے کی سی اکتاہٹ کی کیفیت بھی نہیں رہی تھی تو اس نے آپؒ کو جواب میں کہا: اے شرفاء کے شریف صاحبزادے! واللہ! میرا معاملہ بیس برس تک آپ کے ہاتھ میں رہا، آپ نے اس کی

---

(۱) الأعلام للزركلي: ۵/۱۳۰، وتاريخ بغداد وذيوله ط العلمية: ۴/۳

(۲) ينظر: علماء أهل البيت في عصر التابعين، ص: ۱۵۴، مع الأعلام للزركلي: ۵/۱۳۰

حفاظت کی اور اسے ضائع نہیں ہونے دیا بلکہ اس کو بہت اچھی طرح نبھایا، تو اب جب کہ وہ معاملہ میرے ہاتھ میں آ گیا ہے تو کیا میں اُسے ایک ہی لمحہ میں ضائع کر دوں؟ دیکھو! میں اس اختیار کو استعمال نہیں کرتی، اور تمہارا وہ حق تمہارے ہاتھ ہی واپس کرتی ہوں (اور تم سے جدائی نہیں چاہتی)۔ اس کی یہ گفتگو آپؒ کو بہت پسند آئی اور اِس جواب سے آپؒ بہت خوش ہوئے، اور اُس کے حالیہ اس ماجرا کو بالکل بھلا دیا، اور آئندہ پھر اس کے ساتھ اُسی حسن سلوک سے ہی پیش آتے رہے۔[1]

اولاد:

اللہ تعالیٰ نے آپ سلامُ اللہ وَ رَحمۃُ علیہ کو چھ صاحبزادوں اور اتنی ہی صاحبزادیوں سے نوازا تھا۔

صاحبزادے:

۱۔ محمد: انہی کے نام سے امام حسن مثنیٰ کی کنیت ''ابو محمد'' تھی، ان (محمد) کی والدہ رَملہ بنت سعید تھیں۔

۲۔ عبداللہ: (ان کی کنیت ''ابو محمد'' تھی، اور حضرت فاطمہ بنت حسین کے بطن سے پیدا ہوئے۔ یہ نہایت نیک اور فاضل آدمی تھے،[2] اور اچھی شہرت پائی، ایک مرتبہ اپنی نوجوانی کی عمر میں حضرت عمر بن عبدالعزیز کے دربار میں گئے تو اُنہوں نے اِن کے آلِ رسول ہونے کی نسبت سے اِن کی بہت عزت وتکریم بجالائی۔[3]) اِنہوں نے کوفہ میں خلیفہ ابو جعفر منصور کی جیل میں انتقال فرمایا۔

۳۔ حسن: (یہ ''حسن مُثلَّث'' کے نام سے معروف تھے،[4] چونکہ ان کے نام میں ''حَسَن'' کا لفظ تین مرتبہ آتا تھا حسن بن حسن مثنیٰؒ بن امام حسنؓ۔ اس لیے انہیں ''مثلث'' کہا جاتا تھا)۔ عبداللہ کی طرح ان کی والدہ بھی فاطمہ بنت حسین تھیں اور انہوں نے بھی خلیفہ ابو جعفر منصور کی جیل میں وفات پائی تھی۔

---

(۱) ینظر: التذکرۃ الحمدونیۃ: ۲۹/۳، ومحاضرات الأدباء: ۲۴۵/۲، مع علماء اهل البیت فی عصر التابعین، ص: ۱۵۶، ۱۵۵

(۲) تهذیب الکمال في أسماء الرجال: ۴۱۵/۱۴، ومختصر تاریخ دمشق: ۱۰۸/۱۲، مع شذرات الذهب في أخبار من ذهب: ۲۰۴/۲

(۳) الصواعق المحرقة: ۵۲۴

(۴) نور الأبصار، ص: ۱۷۳، وصحاح الأخبار، ص: ۱۲ والتعلیق علی "الشجرة المبارکة في أنساب الطالبیة"، ص: ۴

۴۔ ابراہیم: (ان کو اپنے خوبصورت لقب ''القمر'' کی وجہ سے ابراہیم القمر کہا جاتا تھا۔ ان کی والدہ بھی فاطمہ بنت حسین تھیں، یہ بہت حد تک رسول اللہ ﷺ کے ساتھ مشابہت رکھتے تھے۔ ان کو اور ان کے بھائی عبداللہ کو خلیفہ ابو جعفر منصور نے جیل میں بند کر دیا تھا، [۲]) اور یہ وہیں جیل کے اندر انتقال فرما گئے تھے۔

۶،۵ جعفر اور داؤد: ان دونوں صاحبزادوں کی والدہ ''امّ وَلَد'' یعنی باندی تھیں، جنہیں ''حبیبہ فارسیہ'' کہا جاتا تھا۔

صاحبزادیاں:

۱، ۲۔ زینب اور ام کلثوم:

ان دونوں بہنوں کی والدہ حضرت فاطمہ بنت حسین تھیں۔

۶،۵،۴،۳۔ فاطمہ، ام القاسم، مُلَیکہ اور ام کُلثوم:

ان میں سے پہلی تین کی والدہ تو وہی ''ام ولد'' تھیں جو جعفر اور داؤد کی بھی والدہ تھیں جنہیں ''حبیبہ فارسیہ'' کہا جاتا تھا، البتہ ام کلثوم کی والدہ الگ تھیں مگر وہ بھی ام ولد یعنی باندی تھیں۔ [۳]

ملحوظہ:

واضح رہے کہ امام حسن بن علی کرم اللہ وجہہ کی نسل، صرف ان کے دو بیٹوں کے ذریعہ آگے چلی ہے، جن میں سے ایک تو یہی امام حسن مثنیٰ ہیں جن کی اولاد کا ابھی قدرے تفصیلی تذکرہ ہوا ہے اور دوسرے امام زید بن حسن ہیں۔ [۴] اس لحاظ سے امام حسن مثنیٰ کو یہ عظیم شرف حاصل ہے کہ ان کے ذریعہ سے نواسۂ رسول سیدنا امام حسنؓ کی نسلِ مبارک، عالم میں پھیلی ہے۔

---

(۳) الطبقات الکبری: ۲۴۵/۵، وسیرۃ آل بیت النبي الأطهار، ص: ۳۱۲، مع علماء أهل البیت في عصر التابعین، ص: ۱۵۵، ؤ کِرَت الأبناء في المعارف: ۲۱۲/۱، وشذرات الذهب في أخبار من ذهب: ۲۰۴/۲، ایضا

(۴) الفصول المهمة، ص: ۱۵۷

لباس:

آپؒ کے لباس کے متعلق صرف اتنا مل سکا ہے کہ ایک موقع پر آپؒ نے کتان (ایک قسم کا سوتی کپڑا ہے) کی قمیص زیبِ تن فرما رکھی تھی۔ [1]

علم کی تحصیل واشاعت:

علمائے اہلِ بیت میں سے آپؒ ایک نمایاں نام کے حامل ہیں، علمِ حدیث میں آپؒ سے ایسی روایات منقول ہیں جو آپؒ کے صاحبِ علم وفضل ہونے کا پتا دیتی ہیں۔ آپؒ نے اپنے زمانے کے مختلف حضرات سے روایات نقل کی ہیں ،اور آپؒ کی ایک منفرد نوعیت کی خاصیت یہ ہے کہ آپؒ کی تمام تر روایات صرف اور صرف علمائے اہلِ بیت سے منقول ہیں، چنانچہ آپؒ نے اپنے والد گرامی حضرت امام حسنؓ، اور حضرت عبداللہ بن جعفر سے روایات نقل کیں جیسا کہ آپؒ نے اپنی چچازاد بہن فاطمہ بنت حسینؓ (جو کہ اپنے زمانہ کی بہت بڑی عالمہ ہونے کے ساتھ ساتھ آپؒ کی اہلیہ بھی ہیں) سے بھی روایات لی ہیں۔

جس طرح آپؒ نے دیگر علما سے تحصیلِ علمِ حدیث کے میدان میں روایات لیں اسی طرح ان احادیث کی اشاعت کے پیشِ نظر بھی آپؒ نے آگے کئی لوگوں تک یہ احادیث پہنچائیں اور انہوں نے آپؒ سے یہ روایاتِ حدیث نقل کر کے انہیں آگے پھیلانے کا فریضہ سرانجام دیا۔ چنانچہ جن حضرات نے آپؒ سے روایات نقل کیں ان میں بڑے صاحبِ فضل وکمال لوگ شامل ہیں، ان میں سے بعض کے اسامی نیچے ذکر کیے جا رہے ہیں:

۱۔ حضرات اہلِ بیت: آپؒ کے تین صاحبزادے: ابراہیم، حسن اور عبداللہ، اور آپؒ کے چچازاد بھائی حسن بن محمد ابن حنفیہ۔

۲۔ علماءِ تابعین: اسحاق بن یسار مدنی، سعید بن ابی سعد، سہیل بن ابی صالح، فضیل بن مرزوق، ولید بن کثیر مدنی وغیرہ۔ [2]

---

(۲) علماء أهل البيت في عصر التابعين، ص:۱۳۶ مع البداية والنهاية طه‌ج ۱۲/۲۲۳ وتهذيب التهذيب: ۲/۲۶۳ وبغية الطلب في تاريخ حلب: ۵/۲۳۱۶

آپؒ اپنے بلند مقام کے باوجود احادیث بہت کم روایت کیا کرتے تھے، [1] تاہم احادیث کا علمی ذخیرہ جو آپؒ سے مروی ہے اس میں سے چند احادیث نیچے درج کی جارہی ہیں (یہ تمام وہ احادیث ہیں جن میں حضرت امام حسن مثنیٰؒ نے اپنے باپ، دادا کی سند سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے فرامین نقل کیے ہیں):

۱۔ إِنَّ مِنْ مُوجِبَاتِ الْمَغْفِرَةِ إِدْخَالَ السُّرُورِ عَلَى أَخِيكَ الْمُسْلِمِ.

(اپنے مسلمان بھائی کو خوش کرنا بھی مغفرت کا ایک سبب ہے)۔ [2]

۲۔ مَنْ قَرَأَ آيَةَ الْكُرْسِيِّ فِي دُبُرِ الصَّلَاةِ الْمَكْتُوبَةِ كَانَ فِي ذِمَّةِ اللهِ إِلَى الصَّلَاةِ الْأُخْرَى.

(جو شخص فرض نماز کے بعد آیت الکرسی پڑھتا ہے وہ اگلی نماز تک اللہ تعالیٰ کی ذمہ داری میں رہتا ہے)۔ [3]

۳۔ حَيْثُمَا كُنْتُمْ فَصَلُّوا عَلَيَّ، فَإِنَّ صَلَاتَكُمْ تَبْلُغُنِي.

(تم جہاں بھی ہو میرے اوپر درود بھیجا کرو، کیونکہ تمہارا بھیجا ہوا درود مجھے پہنچ جاتا ہے)۔ [4]

۴۔ النَّخْلُ وَالشَّجَرُ بَرَكَةٌ عَلَى أَهْلِهِ، وَعَلَى عَقِبِهِمْ بَعْدَهُمْ، إِذَا كَانُوا لِلّٰهِ شَاكِرِينَ.

(کھجور کا درخت اور کوئی بھی درخت اُس گھر کے لوگوں کیلئے برکت کی چیز ہے، اور ان کے بعد ان کی نسل کیلئے بھی ذریعۂ برکت ہے، بشرطیکہ وہ اللہ کے شکر گزار ہوں)۔ [5]

۵۔ مَنْ ضَحَّى طَيِّبَةً بِهَا نَفْسُهُ، مُحْتَسِبًا لِأُضْحِيَتِهِ، كَانَتْ لَهُ حِجَابًا مِنَ النَّارِ.

(جس شخص نے خوشدلی کے ساتھ، ثواب کی نیت کرتے ہوئے، (عیدالاضحیٰ کے ایام میں) جانور کی قربانی کی، تو وہ جانور اس کیلئے جہنم سے آڑ ہوگا)۔ [6]

۶۔ مَنْ عَالَ أَهْلَ بَيْتٍ مِنَ الْمُسْلِمِينَ يَوْمَهُمْ وَلَيْلَتَهُمْ غَفَرَ اللهُ لَهُ ذُنُوبَهُ. (جو شخص کسی مسلمان گھرانے کی ایک دن رات کی کفالت کرے اللہ تعالیٰ اس کے گناہ معاف فرما دیتا ہے)۔ [7]

---

(۲) المعجم الكبير للطبراني، رقم: ۲۷۳۱ مع علماء أهل البيت في عصر التابعين، ص: ۱۴۰

(۳) المعجم الكبير للطبراني، رقم: ۲۷۳۳ مع علماء أهل البيت في عصر التابعين، ص: ۱۴۰

(۴) المعجم الكبير للطبراني، رقم: ۲۷۲۹

(۵) المعجم الكبير للطبراني، رقم: ۲۷۳۵

(۶) المعجم الكبير للطبراني، رقم: ۲۷۳۶

(۷) البداية والنهاية طه جر: ۲۲۳/۱۲ و مختصر تاريخ دمشق: ۳۲۹/۶ و كنز العمال، رقم: ۴۳۰۴۷

عربی ادب کا ذوق:

آپؒ کو عربی ادب کے ذوق کا بھی حصہ نصیب تھا، اور پھر اس میں آپؒ کو ذوقِ شاعری بھی حاصل تھا، چنانچہ آپؒ سے اشعار بھی منقول ہیں جیسا کہ درج ذیل واقعہ سے معلوم ہوتا ہے:

امام حسن مثنیٰؒ، حضرت عثمان بن عفانؓ کے پوتے عبداللہ بن عمرو کے ساتھ ایک دفعہ باہر صحراء کی جانب نکلے، راستہ میں بارش آ گئی، وہاں ایک بڑا درخت نظر پڑا تو یہ دونوں حضرات اس کے نیچے آ کر بیٹھ رہے۔ امام حسن مثنیٰؒ کے ادبی ذوق نے انگڑائی لی اور انہوں نے اسی درخت کے اوپر یہ اشعار لکھ دیے:

خَبِّرِینَــا خُصِصْتَ یا سَرْحُ بالْغَیــ ... ــثِ بِصِـدقٍ و الصِّدقُ فِیـهِ شِفَــاءُ

هَلْ یَمُوتُ المُحِبُّ مِن لَاعِجِ الشَو ... قِ و یَشفِي مِن الحبیبِ اللِّقَــاءُ؟

(اے درخت! تیرے اوپر تو خاص طور پر بارش برسی ہے، تُو ہمیں سچ سچ بتا- اور سچ تو چیز ہی ایسی ہے جس میں شفاء ہے کہ کیا کوئی عاشق آتشِ عشق سے جان کی بازی ہار بیٹھتا ہے اور محبوب کی ملاقات سے شفایاب ہو جاتا ہے؟)

دوسرے شخص نے جواب میں لکھا:

إنَّ جَهلاً سُؤالُکَ السَّرحَ عَمَّا ... لَیسَ فیهِ عَلَی اللَّبِیبِ خَفاءُ

لَیسَ لِلعَاشِقِ المُحِبِّ مِنَ الحُـــ ... ـبِّ سِوَی لَذَّةِ اللِّقَاءِ شِفاءُ

(اے مخاطب! تمہارا، درخت سے ایسی بات پوچھنا جو کسی عقل مند پر مخفی نہیں، اِس میدان میں تمہاری عدمِ واقفیت کی دلیل ہے، کیونکہ یہ بات بالکل واضح ہے کہ ایک سچا عاشق ومحب، لذتِ ملاقات کے علاوہ کسی چیز سے شفایاب نہیں ہوتا)۔[1]

حجاج بن یوسف اور عبدالملک بن مروان کے ساتھ پیش آمدہ واقعہ:

آپؒ اپنے زمانے میں اپنے جد بزرگوار حضرت امیر المومنین علی ابن ابی طالب کرم اللہ وجہہ کے صدقات کے متولی (نگران) تھے۔ ایک مرتبہ مدینہ طیبہ میں آپؒ حجاج بن یوسف کے ساتھ چل رہے تھے تو اُس نے آپؒ سے کہا، جبکہ وہ (یعنی حجاج) اس وقت گورنرِ مدینہ تھا: حسن! حضرت علیؓ کے صدقات کی نگرانی کے لیے تم اپنے چچا ''عمر

(۱) مختصر تاریخ دمشق: ۲۰۸/۱۳

بن علی'' کو بھی اپنے ساتھ شامل کرلو، کہ وہ تمہارے چچا ہیں اور افرادِ اہل بیت میں سے ہیں۔ امام حسن مثنیٰؒ نے اسے فرمایا: میں حضرت علیؓ کی طرف سے عائد کردہ شرط میں کوئی تبدیلی نہیں کرسکتا اور نہ ہی ان کے صدقات کی نگرانی میں ایسے شخص کو داخل کرسکتا ہوں جسے انہوں نے خود شامل نہ کیا ہو۔

اس پر حجاج بن یوسف بگڑ گیا اور کہنے لگا: پھر میں اسے زبردستی شامل کروں گا۔ حضرت حسنؒ اس وقت تو خاموش ہو گئے لیکن پھر کسی وقت مدینہ سے سیدھے دِمشق (شام)، خلیفۂ وقت عبدالملک بن مروان کے پاس چل دیے۔ وہاں ان کے دروازے پر جا کر اجازت کی انتظار میں کھڑے تھے کہ یحییٰ بن ام الحکم بھی وہاں آ گئے، انہوں نے آپؒ کو سلام کیا اور آنے کی غرض دریافت کی۔ آپؒ نے حجاج کے ساتھ پیش آنے والا سارا ماجرا کہہ سنایا۔ وہ کہنے لگے: میں تم سے پہلے اندر چلا جاتا ہوں، تم میرے بعد آنا اور پھر اپنی یہ ساری بات امیر المومنین کو بتانا، پھر دیکھنا کہ انشاءاللہ میں اس سلسلہ میں کیسے تمہاری مدد کرتا ہوں۔ یہ کہہ کر یحییٰ بن ام الحکم اندر چلے گئے، ان کے پیچھے آپؒ بھی داخل ہو گئے۔

جب آپؒ جا کر بیٹھے تو عبدالملک بن مروان نے آپؒ کو خوش آمدید کہا اور بہت احسن انداز میں آپؒ کی خیر خیریت دریافت کی۔ امام حسن مثنیٰؒ کے سر اور ڈاڑھی کے بال جلدی سفید ہو گئے تھے۔ یہ سفیدی دیکھ کر وہ آپؒ سے مخاطب ہوا: ابو محمد! تمہیں تو جلدی بڑھاپا آ گیا ہے۔ یہ سنتے ہی یحییٰ بن ام الحکم نے جھٹ سے عبدالملک سے کہا: امیر المومنین! انہیں کیسے بڑھاپا نہ آئے۔ اہلِ عراق کے مطالبات نے انہیں بوڑھا کردیا ہے کہ ہر سال اُن کے کئی قاصد ان کے پاس آتے ہیں جو انہیں خلافت وحکومت کی دعوت دیتے ہیں کہ ہم آپ کو اپنا خلیفہ وحکمراں دیکھنا چاہتے ہیں۔ یحییٰ کے اس جواب پر آپؒ کو بہت دکھ ہوا، آپؒ نے اس کے سابقہ وعدے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا: بِئْسَ وَاللهِ الرِّفْدُ رَفَدْتَ، وَلَيْسَ كَمَا قُلْتَ، وَلٰكِنَّا أَهْلَ بَيْتٍ يُسْرِعُ إِلَيْنَا الشَّيْبُ ''واللہ! تم نے تو بہت بُری مدد کی ہے، معاملہ ایسے نہیں ہے جیسے تم کہہ رہے ہو۔ بات دراصل یہ ہے کہ ہم اہلِ بیت کے بالوں میں سفیدی جلدی آ جاتی ہے''، اور عبدالملک ان دونوں کی یہ ساری گفتگو سن رہا تھا۔

عبدالملک امام حسنؒ کی طرف متوجہ ہو کر کہنے لگا: ابو عبداللہ! کوئی بات نہیں، آپ جس کام کے لیے تشریف لائے ہیں بیان کیجیے، میں آپ کی حاجت پوری کروں گا۔ اس پر آپؒ نے اسے حجاج کی دھمکی کے متعلق آگاہ کیا۔ عبدالملک

نے کہا: وہ یہ نہیں کرسکتا، پھر اپنے کاتب کو بلوا کر دھمکی آمیز خط لکھوایا جس میں اُسے اس حرکت سے باز آنے کا حکم جاری کیا۔

اس کے بعد عبد الملک نے آپؒ کو تحائف دے کر نہایت اعزاز و اکرام کے ساتھ واپسی مدینہ طیبہ کی جانب روانہ کردیا۔ آپؒ جب وہاں سے باہر آ گئے تو یحییٰ بن ام الحکم سے ملاقات ہوئی۔ آپؒ اس پر ناراض ہوئے اور اس سے فرمایا: یہی تمہارا وعدہ تھا جو تم نے اندر جانے سے پہلے مجھ سے کیا تھا کہ میں تمہاری وہاں مدد کروں گا؟ یحییٰ کہنے لگا: واللہ! میں نے آپ کا بھلا کرنے اور آپ کی مدد کرنے میں کوئی کوتاہی نہیں کی۔ دراصل اگر میں وہ بات وہاں نہ کرتا تو اس پر آپؒ کی ہیبت نہ چھاتی جس سے وہ شاید آپ کا یہ کام بھی نہ کرکے دیتا، اب تو میں دیکھ رہا تھا کہ میری اس بات کے بعد وہ تم سے اچھا خاصا مرعوب ہوا بیٹھا تھا۔[1]

تواضع و رقتِ قلبی کا ایک واقعہ:

دو مسلمان بھائیوں کے اندر کسی بات پر کبھی رنجش ہوجانا ایک فطری چیز ہے بلکہ ایسے موقع پر بعض دفعہ کچھ ناگوار باتیں زبان سے سرزد ہوجانا بھی کوئی بعید شیٔ نہیں ہے، لیکن یہاں دیکھنے کا امر یہ ہے کہ ایسے مواقع پر رنجش و ناگواری کی کیفیت زائل ہونے کے بعد ایک اچھے انسان کا رویہ کیسا ہونا چاہیے؟ اس کے لیے امام حسن مثنیٰؒ کا درج ذیل واقعہ ملاحظہ ہو:

ابو یعقوب مدنی کہتے ہیں: امام حسن مثنیٰؒ اور ان کے چچازاد بھائی امام زین العابدینؒ کے درمیان کچھ رنجش سی ہو گئی۔ اسی رنج و دکھ کی کیفیت کے دوران امام حسن مثنیٰؒ، امام زین العابدینؒ کے پاس گئے جبکہ وہ اپنے رفقاء کے ہمراہ مسجد میں بیٹھے تھے، اور ان کو کچھ ناگوار باتیں کہہ دیں۔ امام زین العابدینؒ خاموشی سے بیٹھے رہے اور ان کو جواب میں کوئی بات نہ کہی، پھر امام حسن مثنیٰؒ بھی واپس چلے آئے۔

جب رات ہوئی تو امام زین العابدینؒ، امام حسن مثنیٰؒ کے گھر چل کر گئے، ان کا دروازہ کھٹکھٹایا، امام حسنؒ باہر تشریف لائے تو امام زین العابدینؒ نے ان سے کہا: بھائی جان! جو باتیں آپ نے مجھے کہی تھیں اگر وہ سچی ہیں تو میری، اللہ کی

---

(1) ینظر: الاتحاف بحب الأشراف ص: ۲۶۲ والفصول المهمة ص: ۱۵۹ مع تاریخ دمشق لابن عساکر: ۶۵/۱۳ والوافي بالوفیات: ۱۱/۱۹۳ وبغیة الطلب: ۵/۹۱۹۲۳ ونسب قریش ص: ۴۶ وتهذیب الکمال في أسماء الرجال: ۶/۹۲

بارگاہ میں دعا ہے کہ اللہ پاک میری مغفرت فرمائے اور اگر وہ سچی نہیں ہیں تو میری اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ اس سلسلہ میں وہ آپ سے درگزر فرمائے۔ اس کے بعد وہ سلام کر کے واپس چل دے۔ البتہ (امام حسنؒ پر تواضع کا غلبہ اور رقت کی ایسی کیفیت طاری ہوئی کہ) وہ اسی وقت امام زین العابدینؒ کے پیچھے چل دیے اور جا کر ان کو پیچھے سے اپنے سینے سے چمٹا لیا اور رونا شروع ہو گئے حتی کہ روتے روتے ان کی خوبیاں بیان کرنا اور ان کی تعریفیں کرنا شروع فرما دیں، پھر اُن سے کہا: لَا جَرَمَ لَا عُدْتُ فِي أَمْرٍ تَكْرَهُه ''میں آپ کو پورے یقین سے کہتا ہوں کہ آئندہ کبھی ایسی بات نہیں کروں گا جو آپ کو گراں گزرے''، اور امام زین العابدینؒ نے جواب میں فرمایا: کوئی بات نہیں، میں نے آپ کو سب معاف کر دیا ہے۔[1]

''اَشعَب''[2] کے ساتھ آپؒ کے پیش آمدہ واقعات:

(۱) ایک دن اشعب، عُقبہ بن ابی مُعَیط کی اولاد میں سے ایک شخص کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا اور یہ سردیوں کا زمانہ تھا۔ اسی دوران امام حسن مثنیٰؒ کا وہاں سے گزر ہوا تو اشعب سے پوچھا کہ یہاں اس شخص کے پہلو میں کیسے بیٹھے ہو؟ اشعب کو مذاق سوجھا اور جواب دیتے ہوئے کہا: اس کی حرارت سے تپش حاصل کر رہا ہوں۔[3]

(۲) ایک مرتبہ اَشعب، امام حسن مثنیٰؒ کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا، کہ اسی اثناء میں اِن کے پاس ایک بدصورت بدُّو آ پہنچا جس کے بال لمبے اور بکھرے ہوئے تھے، اور کندھے پر کمان ڈال رکھی تھی۔ اشعب نے امام حسنؒ سے کہا: آپ اجازت دیں تو میں اس پر اسلحہ تان لوں (اور اس کو یہاں سے بھگا دوں)۔ اُس بدو نے اشعب کی یہ بات سن لی اور ایک تیر نکالا، اسے اپنی بڑی کمان میں رکھا، پھر اشعب کی طرف اس کا رخ کر کے کہا: اگر تُو نے میرے اوپر اسلحہ تانا تو تیری زندگی کا یہ تیرا آخری مرتبہ اسلحہ تاننا ہوگا۔ یہ سن کر اشعب، امام حسنؒ سے کہنے لگا: میرے آقا! واللہ مجھے تو پسلیوں کے نیچے درد شروع ہو گیا ہے۔[4]

---

(1) صفة الصفوة: ۱/۳۵۴

(2) فائدہ: اشعب سے مراد اشعب بن جُبَیر مدنی ہے جو کہ اپنے زمانہ میں لالچ اور طمع میں نہایت معروف تھا بلکہ لالچ میں وہ ضرب المثل بن گیا تھا، اس کے ساتھ ساتھ وہ بہت مزاحیہ بھی تھا۔ اس کے کئی ایسے قصے منقول ہیں جو اداس طبیعت کو شاداں اور پریشان شخص کو فرحاں کر دیتے ہیں۔: علماء أهل البيت في عصر التابعين، ص: ۱۵۱

(3) التذكرة الحمدونية: ۹/۴۰۸

(4) نثر الدر في المحاضرات: ۵/۲۱۵

(۳) ایک دفعہ خود امام حسن مثنیٰؒ نے اشعب کو اپنے ساتھ ٹھہرنے کے لیے بلایا۔ اسی قیام کے دوران ایک مرتبہ آپؒ نے اپنی ایک بکری کے متعلق اشعب سے کہا: میرا دل چاہ رہا ہے کہ اس بکری کا میں کلیجہ کھاؤں۔ اشعب (کے دل میں اس بکری کے بارے میں طمع پیدا ہوئی کہ یہ مجھے مل جائے، چنانچہ امام حسنؒ سے اس) نے کہا: میرے ماں باپ آپؒ پر قربان ہوں! یہ بکری تو مجھے دے دیجیے، میں آپؒ کے لیے شہر کی موٹی تازی بکری ذبح کر کے اس کا کلیجہ لے آؤں گا۔ آپؒ نے اس سے فرمایا: میں تم سے کہتا ہوں کہ میرا دل اس بکری کے کلیجے کو چاہ رہا ہے اور تم مجھے شہر کی موٹی تازی بکری کا کہتے ہو؟ پھر اپنے غلام کو حکم دیتے ہوئے فرمایا: اے غلام! اس بکری کو ذبح کرو، چنانچہ اس نے وہ بکری ذبح کی اور اس کے کلیجے سمیت دیگر دلپسند حصے بھون کر آپؒ کو پیش کر دیے۔

آپؒ نے انہیں تناول فرمالیا اور اگلے دن، اپنے ایک عمدہ نسل اونٹ کے متعلق جس کی قیمت ہزاروں درہم تھی، اشعب سے فرمایا: اشعب! میرا دل چاہ رہا ہے کہ میں اپنے اس اونٹ کا کلیجہ کھاؤں۔ اشعب نے کہا: یہ اونٹ تو اتنا مہنگا ہے کہ واللہ اس کی قیمت سے میں مالدار ہو جاؤں گا، لہٰذا آپ یہ اونٹ مجھے دے دیں، اور میں آپ کو اس شہرِ مدینہ کے ہر اونٹ کا کلیجہ چکھاؤں گا۔ آپؒ نے فرمایا: میں تمہیں کہتا ہوں کہ میرا دل اِس اونٹ کے کلیجے کو چاہ رہا ہے اور تم مجھے کسی اور اونٹ کا کلیجہ کھلاتے ہو؟ پھر غلام سے فرمایا کہ جاؤ اور یہ اونٹ ذبح کرو۔ اس نے تعمیلِ حکم میں اونٹ ذبح کیا اور اس کا کلیجہ بھون کر آپؒ کو پیش کر دیا۔ امام حسنؒ اور اشعب، دونوں نے مل کر وہ کھایا۔

جب تیسرا دن آیا تو آپؒ نے ازراہِ مزاح اُس سے کہا: یَا أَشْعَب! أَنَا وَاللهِ أَشْتَهِي أَنْ آكُلَ مِنْ كَبِدِكَ "اشعب! میرا دل چاہ رہا ہے کہ آج تمہارا کلیجہ کھاؤں"۔ وہ کہنے لگا: سبحان اللہ! کیا آپ انسانوں کا کلیجہ کھائیں گے؟ آپؒ نے کہا: یہی تو تمہیں کہا ہے۔ یہ سننا تھا کہ اشعب نے ایک زوردار چھلانگ ماری جس سے وہ اوپر والی منزل سے نیچے آ گرا اور ٹانگ ٹوٹ گئی۔ لوگوں نے اُسے ملامت کرتے ہوئے کہا: تیرا ناس ہو! کیا تو نے واقعی یہی سمجھ لیا تھا کہ وہ تمہیں ذبح کروا دیں گے؟ کہنے لگا: میرا کلیجہ تو درکنار اگر سب لوگوں کے کلیجوں کے بارے میں بھی ان کا دل چاہ لے تو وہ انہیں کھائیں گے، جبکہ امام حسن مثنیٰؒ نے یہ سب کچھ اسے محض بطورِ مزاح ہی کہا تھا۔[۱]

---

(۱) التذكرة الحمدونية: ۸/۲۷۲، ۲۷۱

فائدہ: مندرجہ بالا آخری واقعہ سے امام حسن مثنیٰؒ کی سیرت کے دو خوبصورت پہلو اجاگر ہوئے۔ ایک یہ کہ آپؒ کے مزاج میں بے جا سنجیدگی، ترش روی اور شدت پسندی کے بجائے خوش طبعی، ہنسی مذاق اور دل لگی کا وصفِ جمیل تھا۔ دوسرا یہ کہ آپؒ خوش طبعی کے لیے بعض دفعہ مزاحیہ مزاج کے شخص کو خود ہی اپنے پاس بلوا لیا کرتے تھے کہ اس کے ساتھ بیٹھ کر ہنسی مذاق کے ذریعے تفریحِ طبع کر لی جائے۔

ظالم بادشاہ کے سامنے کلمۂ حق کہنا:

خلیفۂ وقت عبدالملک بن مروان ایک دفعہ غصہ میں تھا، چنانچہ اس نے ہشام بن اسماعیل (جو کہ مدینہ طیبہ میں اس کی طرف سے گورنر تھا) کو خط لکھا کہ آلِ علیؓ کو بھرے مجمع میں کھڑا کر کے کہو کہ وہ (نعوذ باللہ) اپنے جدامجد حضرت علی بن ابی طالبؓ کو گالیاں دیں، پھر اسی طرح آلِ زبیر کو بھی کہو کہ وہ اپنے جدامجد حضرت زبیرؓ اور ان کے صاحبزادے حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کو گالیاں دیں۔ خط پہنچنے پر جب آلِ علی اور آلِ زبیر کو اس امر کی اطلاع ہوئی تو انہوں نے اس قبیح حرکت سے باز رہنے کا عزم کر لیا اور صاف انکار کا پروگرام بنا لیا حتیٰ کہ وصیت نامے لکھ لیے اور کفن پہن کر ان پر میت کو لگائی جانے والی خوشبو تک لگا لی اور عزم کر لیا کہ جان تو دے دیں گے مگر اس جرم کا ارتکاب نہیں کر سکتے۔

ہشام کی بہن کو اس سارے قصہ کا پتا چلا تو وہ فوراً ہشام کے پاس پہنچ گئی وہ ایک معاملہ فہم اور عقل مند خاتون تھی اس نے ہشام سے کہا: کیا تم اپنے ہاتھوں اپنے خاندان کی ہلاکت دیکھنا چاہتے ہو؟ تم لوگوں پر یہ حکم جاری کر رہے ہو کہ وہ اپنے آباء واجداد کو گالیاں دیں، تم کیا سمجھتے ہو کہ وہ جیتے جی ایسا کر لیں گے؟ وہ کہنے لگا: پھر میں کیا کروں؟ مجھے تو امیر المومنین نے یہی لکھ بھیجا ہے۔ بہن نے کہا کہ تم امیر المومنین (عبدالملک بن مروان) سے دوبارہ رابطہ کرو اور ان سے کہو: مجھ سے یہ کام نہیں ہو سکتا۔ ہشام نے کہا: اس بارے میں دوبارہ رابطہ کی تو مجھ میں ہمت نہیں ہے۔ اس پر اُس کی بہن نے کہا: پھر تم ان لوگوں پر ایسا حکم جاری کرو جو اس حکم سے ذرا کم درجہ کا ہو جس سے امیر المومنین بھی راضی ہو جائے اور ان لوگوں کے لیے بھی کسی قدر آسان ہو۔ ہشام نے پوچھا: وہ کیا حکم ہو سکتا ہے؟ کہنے لگی: تم آلِ علیؓ کو ان کے اپنے آباء واجداد کو گالی دینے کے بجائے زبیر اور عبداللہ بن زبیر کو گالیاں دینے کو کہو اور اسی طرح آلِ زبیر کو علی بن ابی طالب کو گالیاں دینے کا حکم جاری کر دو۔ ہشام نے کہا: ہاں! یہ ہو سکتا ہے۔ چنانچہ اُس نے اسی بات کا حکم جاری کر دیا اور یہ حکم واقعی پہلے حکم سے طبعاً کم شاق تھا۔

جب آلِ علی اور آلِ زبیر کو اس حکم کی اطلاع ملی تو وہ ایک جگہ آپس میں اکٹھے ہوئے اور ایک دوسرے سے کہا: یہ کل ہمیں سب کے سامنے کھڑا کریں گے اور پھر ہمارے بعض افراد کو دوسرے بعض افراد کے خلاف گالیاں دینے کا کہیں گے جس سے ان کے سینے ٹھنڈے ہوں گے۔ دیکھو، اللہ کا دھیان سامنے رکھنا اور رشتہ داری کے حقوق کا مکمل خیال رکھنا۔ پھر آلِ زبیر نے آلِ علی سے کہا: پہلے تمہیں کھڑا کیا جائے گا، جو کچھ تم کہو گے ہمیں بھی ویسا ہی کہنا ہوگا۔ چنانچہ اگلے دن ایسے ہی ہوا، اور سب سے پہلے آلِ علی میں سے امام حسن مثنیٰؒ کو کھڑا کیا گیا۔ آپؒ کمزور بدن تھے، اور اُس دن باریک سوتی کپڑے کی قمیص پہن رکھی تھی۔

ہشام نے آپؒ سے کہا: چلو، آلِ زبیر کو گالیاں دو۔ آپؒ نے فرمایا: میں یہ نہیں کرسکتا۔ ہشام نے جب یہ انکار دیکھا تو اپنے پہلو میں کھڑے ہوئے سپاہی سے کہا کہ اس کو کوڑا مارو، اس ظالم نے اس مبارک وضعیف بدن پر اس زور سے کوڑا برسایا کہ بدن کی کھال تک پھٹ گئی اور مقدس خون، قدموں تک بہتا ہوا زمین پر پھیل گیا، لیکن آپؒ نے پھر بھی آلِ زبیر کو گالیاں دینے کے بجائے یہ فرمایا: إنَ لِآلِ الزَّبَيرِ رَحِماً أَبُلُّهَا بِبِلَالِهَا و أَرُبُّهَا بِرِ بابِهَا ”آلِ زبیر تو میرے رشتہ دار ہیں، میں اس رشتہ داری کو قائم رکھوں گا اور اس (کے حقوق کا خیال رکھتے ہوئے اس) کی پوری حفاظت کروں گا (لہذا میں انہیں گالیاں نہیں دے سکتا)“۔ اس کے بعد قرآن مجید کی یہ آیت تلاوت فرمائی: {يَاقَوْمِ مَالِي أَدْعُوكُمْ إِلَى النَّجَاةِ وَتَدْعُونَنِي إِلَى النَّارِ} (اے میری قوم! یہ کیا بات ہے کہ میں تمہیں نجات کی طرف دعوت دے رہا ہوں، اور تم مجھے آگ کی طرف بلا رہے ہو؟)۔[1]

ارشادات ونصائح:

آپ علامُ اللہ و رحمۃ علیہ سے متعدد قیمتی ارشادات وگراں قدر نصائح منقول ہیں جن سے زندگی کے مختلف مراحل میں انسان کو رہنمائی حاصل ہوتی ہے، ان میں سے بعض درج ذیل ہیں:

۱۔ آپؒ کا ارشاد ہے کہ دو آدمیوں نے میری کمر توڑ ڈالی ہے یعنی دو قسم کے آدمی لوگوں کے لیے نہایت نقصان دہ ثابت ہوتے ہیں: ایک وہ صوفی جو علمِ دین سے عاری ہو، دوسرا وہ عالم جو زہد وتقوی سے خالی ہو۔ پہلا شخص اپنی بزرگی کے رُوپ میں لوگوں کو جہالت کی طرف بلاتا ہے اور دوسرا اپنے حرص وہوس کی بدولت لوگوں کو اپنے علم سے دُور رکھتا ہے۔[2]

---

(۱) تاریخ دمشق لابن عساکر: ۱۳/۶۸ مع جمهرة نسب قريش وأخبارها ص: ۸۴ ونسب قريش ص: ۴۸

(۲) محاضرات الأدباء للراغب الأصفهاني: ۲/۴۲۷، مع علماء أهل البيت في عصر التابعين، ص: ۱۴۱

۲۔ بعض لوگ آپؒ کی محبت میں شرعی حدود سے تجاوز کرنے لگ گئے تھے، آپؒ نے ان لوگوں سے مختصر خطاب فرمایا، اُس خطاب میں اُن کو جہاں ایک جانب تنبیہ تھی وہاں اُس میں آپؒ کی تواضع بھی شامل تھی، چنانچہ ان سے فرمایا: تمہارا ناس ہو! ہم سے اللہ کے لیے محبت کرو، لہذا اگر ہم اللہ کی اطاعت کریں تو ہم سے محبت کرو اور اگر ہم (نعوذ باللہ) اس کی نافرمانی میں مبتلا ہو جائیں تو ہم سے محبت نہ کرو۔

تمہارا ناس ہو! عملِ صالح کے بغیر، رسول اللہ ﷺ سے محض رشتہ داری اگر اللہ کی بارگاہ میں نفع بخش اور قربِ الٰہی کا سبب ہوتی تو وہ لوگ جو ہم سے زیادہ رسول اللہ ﷺ کے قریبی رشتہ دار تھے (مگر وہ اطاعتِ نبی وعملِ صالح سے خالی تھے) ان کو یہ رشتہ داری ضرور نفع دیتی۔ واللہ میں تو اس بات سے ڈرتا رہتا ہوں کہ ہم میں سے اگر کوئی نافرمانی کا کام کرے گا تو رسول اللہ ﷺ سے قرب ورشتہ داری کی وجہ سے اُسے عام لوگوں کی نسبت دوگنا عذاب ہوگا جیسا کہ اطاعت کی صورت میں دوسرے لوگوں کی نسبت ہمیں ثواب بھی دوگنا ملتا ہے۔ اور یہ بھی فرمایا کہ ہماری تعریف میں صرف وہ بات کہا کرو جو حق اور صحیح ہو، کہ اس طرح کی تعریف تمہارے لیے نفع بخش ثابت ہوگی اور ہم بھی تم سے راضی ہوں گے۔[1]

اپنی اولاد کیلئے ''وصی'' (معاملات کا انتظام کرنے والا) مقرر کرنا:

امام حسن مثنیٰ سلام اللہ ورحمۃ علیہ نے اپنے انتقال سے قبل ابراہیم بن محمد بن طلحہ کو اپنی اولاد کا ''وصی'' مقرر کر دیا تھا، کہ آپؒ کے انتقال کے بعد آپؒ کے متروکہ مال میں سے، یہ آپؒ کی اولاد کی نگرانی اور ان کے اخراجات ودیگر معاملات کا انتظام کرتے رہیں۔

ابراہیم بن محمد، رشتہ کے اعتبار سے آپؒ کے ماں شریک بھائی لگتے تھے، اور اپنے مقام ومنزلت کے لحاظ سے قریش کی اہم شخصیات میں بلکہ سردارانِ قریش میں شمار ہوتے تھے، انہیں ''شیرِ حجاز'' اور ''شیرِ قریش'' کہا جاتا تھا۔

امام حسن مثنیٰؒ کے انتقال کے بعد، اولاد انہی کے زیر پرورش رہی اور انہوں نے بڑے احسن طریقے سے کفالت وپرورش کے فرائض سرانجام دیے۔ وہ ان پر خرچ کرنے کے معاملہ میں بہت فراخ دلی سے کام لیتے، سواری کے لیے

---

(۱) م: الصواعق المحرقۃ: ۲/۶۱۱، مع نسب قریش ص: ۴۹، ومختصر تاریخ دمشق: ۶/۳۳۱، والطبقات الکبریٰ: ۵/۲۴۶، ومختصر کتاب الموافقۃ بین أھل البیت والصحابۃ، ص: ۳۱۸

ان کو عمدہ گھوڑے فراہم کرتے اور لباس میں بیش قیمت کپڑے انہیں مہیا کرتے الغرض ان کا بہت خیال رکھتے تھے۔

بہر حال امام حسن مثنیٰؒ کی یہ اولاد جب بڑی ہوگئی اور اپنے مالی معاملات کو خود سمجھنے لگی اور وہ وقت آ گیا کہ اب ابراہیم بن طلحہ ان کا باقی ماندہ مالِ میراث ان کے سپرد کردیں تو ایک نہایت ہی حیران کُن اور نا قابلِ یقین بات سامنے آئی وہ یہ کہ ابراہیم نے ان کا سارا مال ویسے ہی ٹھہرا ہوا جیسے ان کے والد امام حسنؒ نے بوقتِ انتقال ان کے حوالے کیا تھا ان کی اس اولاد کے سپرد کر دیا، اور مزید حیرت کی بات یہ ہے کہ اس مال کو ہاتھ تک نہیں لگایا تھا اور ان کا مال انہیں سپرد کرتے ہوئے نہایت محبت بھرے لہجے میں کہا: ''میرے پیارے بھتیجو! میں نے اس تمام مدت میں تمہارے اوپر جو کچھ اور جتنا کچھ خرچ کیا وہ سب میری اپنی جیب سے تھا، اور میں نے یہ سب کچھ 'صِلہ رحمی' (یعنی رشتہ داروں کے ساتھ حسنِ سلوک) کی خاطر کیا۔''[1]

وفات:

آپؒ نے ۹۷ ہجری میں، مدینہ طیبہ میں انتقال فرمایا۔[2]

آپؒ کے انتقال پر آپؒ کی زوجہ حضرت فاطمہ بنت حسین کو بہت صدمہ ہوا، انہوں نے جب آپؒ کا جنازہ جاتے دیکھا تو (شدتِ صدمہ سے) اپنے چہرے پر کپڑا ڈال لیا اور یہ شعر پڑھنے لگیں:

وَكَانُوا رَجَاءً ثُمَّ أَمْسَوا رَزِيَّةً ... أَلَا عَظُمَتْ تِلْكَ الرَّزَايَا وَجَلَّتِ

(وہ کبھی آس و امید تھے، پھر تکلیف و صدمہ بن گئے ہیں، ہاں! یہ صدمے تو بہت بڑے اور نہایت بھاری ہیں)۔[3]

پھر جب آپؒ کی تدفین کردی گئی تو حضرت فاطمہ کا صدمہ سکون نہیں پا رہا تھا، چنانچہ انہوں نے آپؒ کی قبر پر ایک سال تک خیمہ نصب کیے رکھا، پھر وہ خیمہ اٹھا لیا گیا۔ لوگوں نے اس موقع پر ایک آواز دینے والے کی آواز سنی جو کہہ رہا تھا: أَلَا هَلْ وَجَدُوا مَا فَقَدُوا (کیا انہوں نے اپنا مطلوب پالیا ہے)، دوسرے آواز دینے والے نے جواب دیا: بَلْ يَئِسُوا فَانْقَلَبُوا (نہیں، بلکہ مطلوب کے پانے سے ناامید ہوکر واپس جارہے ہیں)۔[4]

---

(۱) ينظر: علماء أهل البيت في عصر التابعين، ص: ۱۵۸ أما غرة هذه المقالة ففي كثير من المصادر، نحو: تاريخ دمشق: ۱۳/۷۱ وبغية الطلب في تاريخ حلب: ۵/۲۳۲۵ وتهذيب الكمال في أسماء الرجال: ۶/۹۵ والفصول المهمة، ص: ۱۶۰ ونور الأبصار، ص: ۱۷۲

(۲) تاريخ الإسلام: ۶/۲۶۵، وتهذيب التهذيب: ۲/۲۶۳، ونور الأبصار للشبلنجي، ص: ۱۷۲، وعمدة القارى: ۸/۱۳۴، وتذهيب تهذيب الكمال: ۲/۲۶۸، مع البداية والنهاية ط هجر: ۱۲/۲۶۳

(۳): الوافي بالوفيات: ۱۱/۳۱۹

(۴): صحيح البخاري: ۲/۸۸، مع فتح الباري لابن حجر: ۳/۲۰۰

فضائل وخصائص

آپ سلامُ اللہ و رحمۃُ علیہ کو اللہ تعالیٰ نے متعدد صفات ومناقب سے نوازا تھا، جن کو علماء نے مختلف تعبیرات کے ذریعہ اپنی اپنی کتابوں میں جمع کیا ہے، اس کا کچھ نمونہ درج ذیل ہے:

۱۔ آپؒ صدق وصفا کے پیکر اور جلیل القدر شخصیت تھے۔ اس قدر بلند صفات اور عالی اوصاف کے حامل تھے کہ آپؒ میں امیر المومنین بننے کی مکمل صلاحیت موجود تھی۔[۱]

۲۔ آپؒ بنو ہاشم کی اُن چندگنی چنی ہستیوں میں تھے جن کے فضل وکمال کا چہار سُو ڈنکا بجتا تھا۔[۲]

۳۔ آپؒ کا شمار تابعین کے اُس عظیم المرتبت زُمرہ میں ہوتا تھا جن کی صداقت وعلم پر امت کو بجا طور پر اعتماد تھا۔[۳]

۴۔ روحانیت میں بھی آپؒ اعلیٰ مقام پر فائز تھے کہ آپؒ کا دل اللہ کی ذاتِ عالی سے جُڑا ہوا تھا (یعنی آپؒ کو اعلیٰ درجہ کا "تعلق باللہ" حاصل تھا) اور صفتِ عبادت وشکر میں بھی آپؒ ممتاز حیثیت رکھتے تھے۔[۴]

۵۔ آپؒ صاحبِ تقویٰ وزُہد ہونے کے ساتھ ساتھ بارعب شخصیت بھی تھے اور لوگوں کی نظر میں آپؒ عظیم الشان انسان، سردار اور صاحب فضل وکمال ہستی تھے۔[۵]

۶۔ حُسن اخلاق میں آپؒ اپنے والد ماجد امام حسن بن علیؓ کے سچے جانشین تھے، نسبی فخر وغرور کا ادنیٰ شائبہ تک نہ تھا۔[۶]

فائدہ: بعض اوصاف وخصائص میں آپؒ کو امتیازی شان حاصل تھی، جن میں سے چند کا خاکہ ذیل میں پیش کیا جارہا ہے:

---

(۱) سیر أعلام النبلاء: ۴/۴۸۳و۴۸۷

(۲) عمدة القاري شرح صحيح البخاري: ۸/۱۳۴

(۳) فتح الباري لابن حجر: ۳/۲۰۰

(۴) ينظر: علماء أهل البيت في عصر التابعين، ص: ۱۲۷

(۵) ينظر: الفصول المهمة ص: ۱۵۹، ونور الابصار، ص: ۱۷۲

(۶) سير الصحابة: ۷/۷۲

خوفِ الٰہی:

امام اَصمَعیؒ کہتے ہیں: تہجد کا وقت تھا، میں طواف کرنے کے لیے بیت اللہ شریف کے پاس پہنچا تو کیا دیکھتا ہوں کہ ایک خوبصورت نوجوان لڑکا، سر پر زلفیں سجائے، بڑی چادر اوڑھے، خانہ کعبہ کے پردوں سے چمٹا ہوا ہے اور خالقِ کائنات کے ساتھ مناجات میں والہانہ مشغول ہے اور آہ وبکا کی کیفیت میں یہ رقت آمیز اشعار لب پر جاری ہیں:

أَلَا أيُهَا المأمولُ فِي كلِّ ساعةٍ ... شَكَوتُ إليکَ الضُرَّ فَارْحَمْ شِكَايَتِي

أَلَا يا رَجائِي أنتَ كاشفُ كُربَتِي ... فَهَبْ لي ذُنوبِي كُلَّها وَاقْضِ حاجَتِي

فَزادِي قليلٌ ما أُراه مُبَلِّغِي ... أَلِلزَّادِ أبكِي أمْ لِبُعْدِ مَسَافَتِي

أَتَيتُ بِأعمالٍ قِباحٍ رَدِيئَةٍ ... فما في الوَرىٰ خَلقٌ جَنى كَجِنايتِي

أتُحرِقُنِي بِالنَّارِ يا غايةَ المُنىٰ ... فَأينَ رَجائِي ثُمَّ أينَ مَخافَتِي

ترجمہ:

اے وہ ذات جو ہر لمحہ ہماری امیدوں کا ماویٰ وملجا ہے! میں تیرے سامنے ہی اپنے درد ودکھ کی فریاد کرتا ہوں، تُو میری اس فریاد پر رحم فرما۔

اے وہ ذات جس سے میری امیدیں وابستہ ہیں! تُو ہی میرے دُکھوں کو ٹالنے والا ہے، تُو میرے سب گناہ معاف فرما کر میری حاجت پوری فرمادے۔

میرا زادِ راہ بہت تھوڑا ہے، میں نہیں سمجھتا کہ وہ مجھے منزل تک پہنچادے گا (بلکہ اس سے پہلے ہی ختم ہوجائے گا)، مجھے خود سمجھ نہیں آرہی کہ اپنے زادِ راہ کو روؤں یا سفر کی دُوری کو روؤں؟

جو اعمال لے کر تیری بارگاہ میں آیا بیٹھا ہوں یہ تو کسی کام کے نہیں ہیں، بہت بُرے اور انتہائی گھٹیا ہیں، تیری مخلوق میں بلاشبہ میرے جیسا مجرم نہیں ہوگا۔

اے وہ ذات جو میری امیدوں کی منتہیٰ ہے! کیا تُو مجھے آگ میں جلائے گا؟ تو پھر میری امید اور میرا خوف کہاں ہوگا؟

میں ان کے قریب آیا اور ان کے چہرے سے چادر ہٹا کر دیکھا تو وہ امام حسن بن حسن بن علی بن ابی طالب تھے۔ میں نے عرض کی: میرے آقا! آپ جیسی ہستی اس جیسے اشعار پڑھ رہی ہے حالانکہ آپ تو نبی کریم ﷺ کے اہلِ بیت میں سے ہیں؟ فرمانے لگے: اَصمعی! دُور ہوجا، حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جنت اس شخص کے لیے بنائی ہے جو اس کا فرمانبردار ہو اگرچہ حبشی غلام ہو، اور دوزخ اس کے لیے بنائی ہے جو اس کا نافرمان ہو اگرچہ قریشی ہو۔ اصمعی! کیا تم نے اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان نہیں سنا:

{فَإِذَا نُفِخَ فِي الصُّورِ فَلَا أَنسَابَ بَيْنَهُمْ يَوْمَئِذٍ وَلَا يَتَسَاءَلُونَ * فَمَن ثَقُلَتْ مَوَازِينُهُ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ *} (المؤمنون: ۱۰۱، ۱۰۲)

ترجمہ: پھر جب صور پھونکا جائے گا تو اُس دن نہ ان کے درمیان رشتے ناتے باقی رہیں گے، اور نہ کوئی کسی کو پوچھے گا * اُس وقت جن کے پلڑے بھاری نکلے، تو وہی ہوں گے جو فلاح پائیں گے * ۔[۱]

مشکل وقت میں دعا کو لازم پکڑنا:

خلیفہ عبدالملک بن مروان نے اپنے گورنرِ مدینہ ''ہشام بن اسماعیل'' کو لکھا: مجھے پتا چلا ہے کہ حسن مثنیٰ نے (اپنی خلافت قائم کرنے کے سلسلہ میں) اہلِ عراق کے ساتھ خط و کتابت جاری کر رکھی ہے، لہذا جیسے ہی تمہیں میرا یہ خط موصول ہو تو بلا تاخیر اس کے پاس کسی (قاصد یا پھر دستۂ فوج) کو بھیج کر اسے حاضر کراؤ، اور ایک روایت میں ہے کہ سب لوگوں کے سامنے کھڑا کر کے اسے سو کوڑے بھی مارو۔ خط پہنچنے پر ہشام نے تعمیلِ حکم میں امام حسن مثنیٰؒ کو اپنے پاس حاضر کروالیا، جب آپؒ ہشام کے دربار میں پہنچے تو عین اُسی وقت ہشام کسی کام میں مشغول ہوگیا۔ اسی دوران امام زین العابدینؒ نے امام حسن مثنیٰؒ کے پاس جا کر انہیں کہا: میرے چچازاد بھائی! یہ دعا پڑھ لو۔ ان شاء اللہ، اللہ پاک اس مصیبت سے نجات کا راستہ نکال دے گا:

لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ الْحَلِيمُ الْكَرِيمُ، لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ الْعَلِيُّ الْعَظِيمُ، سُبْحَانَ اللّٰهِ رَبِّ السَّمَاوَاتِ السَّبْعِ

---

(۱) مختصر تاریخ دمشق: ۱۷/ ۲۲۹، بتسہیل و تصرف یسیر

ملحوظہ: ابن عساکر کے بیان کردہ اس قصہ میں کچھ ابہام سا ہے کیونکہ امام حسن مثنیٰؒ کا انتقال 97ھ میں ہوا جبکہ امام اصمعی کی پیدائش ہی 122ھ کی ہے، لہذا ان کی آپس میں ملاقات کیونکر ہوسکتی ہے؟ اس لیے یوں کہا جائے گا کہ یا تو امام اصمعی کے بجائے کوئی اور بزرگ تھے جن کی امام حسن مثنیٰؒ سے یہ ملاقات ہوئی یا پھر صاحبِ دعا و مناجات امام حسن بن حسن (حسن مثنیٰ) کے بجائے ان کے بیٹے امام حسن بن حسن بن حسن (حسن مثلث) ہوں گے، واللہ اعلم۔

ملاحظہ ہو: علماء اہل البیت فی عصر التابعین، ص: ۱۵۱، باضافۃ یسیرۃ

وَرَبِّ الْعَرْشِ الْعَظِيمِ، اَلحمدُ للهِ ربِّ العَالَمِينَ.

[اس اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں جو حلیم وکریم ہے، اس اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں جو اونچی شان والا ہے اور عظمتوں کا مالک ہے، پاک ہے وہ اللہ جو ساتوں آسمانوں کا رب اور عرش عظیم کا رب ہے، تمام تعریفیں اللہ کے لیے ہیں جو سارے جہانوں کا رب ہے۔]

(آپؒ نے اللہ کی طرف متوجہ ہو کر یہ دعائیہ کلمات پڑھ لیے، پھر) جب ہشام آپؒ کی طرح متوجہ ہوا تو آپؒ کو دیکھ کر بولا: مجھے تو ایسے لگ رہا ہے کہ کسی نے ان پر جھوٹی تہمت لگا دی ہے، پھر اپنے سپاہیوں کو کہا: ''انہیں چھوڑ دو، ہم امیر المومنین عبدالملک بن مروان سے خود ان کے معاملہ میں بات کرلیں گے۔'' ایک روایت میں ہے کہ یہ الفاظ کہے: ''انہیں چھوڑ دو، میں امیر المومنین کو خود خط لکھوں گا کہ اس شخص کا کوئی جرم نہیں ہے، وجہ یہ ہے کہ حاضر آدمی جو کچھ دیکھتا ہے، غائب آدمی اسے نہیں دیکھ سکتا (لہذا میرا دیکھنا اور ہے، اور امیر المومنین کا اُن کے متعلق لوگوں سے سننا اور ہے، میرا دیکھنا اور ان کا سننا یہ دونوں برابر نہیں ہو سکتے)۔'' اس کے بعد امام حسن مثنیؒ کو چھوڑ دیا گیا۔[1]

فائدہ: واقعۂ مذکورہ سے اس امر کا اندازہ ہوتا ہے کہ حضرات اہلِ بیت مشکل گھڑی میں کس قدر اللہ کی ذاتِ عالی کی طرف متوجہ ہو جاتے تھے اور یہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنتِ مبارکہ ہے کہ حدیثِ بخاری میں آتا ہے: حضور صلی اللہ علیہ وسلم مشکل وقت میں یہ دعا پڑھا کرتے تھے:

لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ الْحَلِيمُ الْكَرِيمُ، لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ الْعَلِيُّ الْعَظِيمُ، سُبحانَ اللهِ رَبِّ السَّمَاوَاتِ السَّبعِ وَرَبِّ الْعَرْشِ الْعَظِيمِ، اَلحمدُ للهِ ربِّ العَالَمِينَ.

برکاتِ دعا: مذکورہ بالا دعا، جو حدیث شریف میں آئی ہے، بہت بابرکت دعا ہے۔ اس کی برکت سے اللہ تعالیٰ مشکل گھڑیوں میں نجات اور قید خانہ سے رہائی کی شکلیں پیدا فرماتا ہے، چنانچہ محدثین نے اس دعا کی برکات کے ذیل میں ایک واقعہ درج کیا ہے جو فائدۂ عامہ کے لیے یہاں درج کیا جاتا ہے:

امام ابوبکر رازیؒ بیان کرتے ہیں: میں اصفہان کے شہر میں امام ابونُعیم کے پاس احادیث لکھا کرتا تھا۔ وہاں ''ابوبکر

---

(۱) مستفاد مما يلي: تاريخ دمشق: ۱۳/۶۷، ۶۲ والبداية والنهاية ط هجر: ۱۲/۲۲۳ وسير أعلام النبلاء: ۴/۴۸۶، ۴/۴۸۵ وتهذيب الكمال للمزي: ۶/۹۳ والفرج بعد الشدة لابن أبي الدنيا ص: ۶۶ وتذهيب تهذيب الكمال: ۲/۲۶۷

بن علی“ نامی ایک بڑے عالم رہتے تھے جو اپنے زمانے کے سب سے بڑے مفتی شمار ہوتے تھے۔ کسی نے بادشاہ کے پاس ان کی ناحق شکایت لگادی جس پر انہیں گرفتار کرکے جیل میں ڈال دیا گیا۔

میں نے ایک رات خواب میں دیکھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تشریف فرما ہیں، حضرت جبریل علیہ السلام بھی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دائیں جانب کھڑے زیرِ لب ذکر و تسبیح میں مصروف ہیں، اس دوران آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مجھ سے فرمایا: ابوبکر بن علی کو کہنا کہ ”صحیح بخاری“ کی حدیث میں مشکل گھڑی کے لیے جو دعا مذکور ہے اس کو پڑھتا رہے یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ اس کے لیے رہائی کی شکل پیدا فرمادے۔ جب صبح ہوئی تو میں نے اُن کو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یہ پیغام پہنچادیا، وہ اس دعا میں مشغول ہوگئے۔ پھر چند ہی ایام گزرے تھے کہ ان کو جیل سے رہا کردیا گیا۔[1]

علما نے حدیث شریف میں مذکور اس دعا کی اہمیت و افادیت کے متعلق لکھا ہے: ”یہ بہت عظیم الشان دعا ہے، اس کا خوب اہتمام کرنا چاہیے۔ تکالیف، پریشانیوں اور دیگر سنگین مواقع پر اس کا بکثرت وِرد رکھنا چاہیے۔ سلف صالحین اس دعا کا بطورِ خاص اہتمام رکھتے تھے اور اس کو ”دُعاءُ الکَرْب“ (یعنی مصیبت کے وقت کی دعا) کے نام سے یاد کرتے تھے۔[2]

اسی طرح کا ایک واقعہ حضرت عبداللہ بن جعفر رضی اللہ عنہ کی اہلیہ کے ساتھ بھی پیش آیا تھا، وہ بیان کرتی ہیں: مجھے میرے شوہر حضرت عبداللہ بن جعفر رضی اللہ عنہ نے دعا کی تعلیم دیتے ہوئے کہا تھا کہ جب تجھے کوئی گھبراہٹ اور پریشانی والا معاملہ درپیش ہو تو یہ دعائیہ کلمات کہہ لینا:

لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ الْحَلِيمُ الْكَرِيم، لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيمِ، سُبحَانَ اللّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ.

پھر ہوا یہ کہ ایک مرتبہ ”حجاج“ نے مجھے بلوایا، اور میں نے (وہاں پہنچنے سے قبل) وہ کلمات پڑھ لیے۔ جب میں پیش ہوئی تو اس نے مجھے کہا: جس وقت میں نے تجھے بلوایا تھا اُس وقت تو میرا قصد تیری گردن اڑانے کا تھا، لیکن اب تیرے گھرانے میں سے تجھ سے زیادہ میرے نزدیک کوئی معزز نہیں۔[3]

---

(1) صحيح البخاري: ٧٥/٨، رقم: ٦٣٤٦، مع فتح الباري لابن حجر: ١٤٧/١١

(2) شرح النووي على مسلم: ٤٧/١٧

(3) عمل اليوم والليلة للنسائي ص: ٤١٠

حُسنِ تدبیر:

مدینہ میں ''ابن عائشہ'' کی آواز سب سے زیادہ خوبصورت تھی اور وہ اس فن کا ماہر ومشہور آدمی تھا،لیکن اس کے ساتھ ہی سخت مزاج تھا چنانچہ جب اسے کہا جاتا کہ اپنی خوبصورت آواز میں ہمیں کچھ اشعار وغیرہ سناؤ، تو سنانے کے بجائے آگے سے کہتا: کیا میرے جیسے (خاص) آدمی کو اس طرح کہا جاتا ہے؟ اور پھر اپنی اس بات کی پختگی اور لوگوں کو عاجز کرنے کے لیے کہتا: اگر آج سارے دن میں، ایک دفعہ بھی مَیں نے تمہیں کچھ سنا دیا تو میرے اوپر ایک غلام کا آزاد کرنا لازم ہوگا۔ یہ بات سن کر لوگ بیچارے خاموش ہو جاتے۔

ایک دن اللہ کا کرنا ایسا ہوا کہ مدینہ طیبہ کی وادیٔ عقیق میں خوب پانی آ گیا، وہ پانی سے خوب بھری ہوئی بہہ رہی تھی، یہ بات اہلِ مدینہ کے لیے ایک حیران کن وحسین منظر سے کچھ کم نہ تھی، اس لیے کیا مرد، کیا عورتیں، کیا جوان اور کیا بوڑھے، سبھی اس عجیب منظر کو دیکھنے کے لیے نکل پڑے۔ ان لوگوں میں ''ابن عائشہ'' بھی تھا اور اس نے، اپنے آپ کو لوگوں کی نظروں سے چھپانے کے لیے، چادر کا ایک کونہ اپنے منہ پر ڈال رکھا تھا۔ حضرت حسن مثنیٰؒ نے اسے دیکھ کر پہچان لیا، جبکہ آپؒ بھی یہ منظر دیکھنے نکلے تھے، اور آپؒ کے دو دراز قد وسیاہ رنگ غلام بھی آپؒ کے ہمراہ تھے جو آپؒ کی سواری کے آگے آگے چل رہے تھے۔ آپؒ نے ان سے کہا: تم اللہ کے لیے آزاد ہو اگر تم نے وہ کام سرانجام دے دیا جو ابھی میں تمہارے سپرد کرنے لگا ہوں ورنہ میں تمہیں سزا دوں گا۔ انہوں نے عرض کی: اے ہمارے آقا! آپ حکم فرمائیں۔

آپؒ نے ان سے کہا: وہ سامنے نظر آنے والا شخص جس نے چادر سے منہ چھپا رکھا ہے، اس کے پاس جا کر اسے مضبوطی سے پکڑ لو (میں بھی پیچھے آ رہا ہوں)۔ پھر اگر وہ میرا کہنا مان لے تو ٹھیک، ورنہ اسے سامنے وادی میں ڈال دینا۔ یہ دونوں اُس کی طرف چل پڑے اور امام حسن مثنیٰ بھی ان کے پیچھے پیچھے جا رہے تھے۔ ابن عائشہ کو پتا بھی نہیں چلا کہ یہ دونوں غلام اُس کے کندھوں پر اپنے مضبوط ہاتھ جما چکے تھے۔ اس نے ایک دم پوچھا: کون ہے؟ حضرت حسنؒ نے آگے بڑھ کر کہا: اَنَا هٰذَا يَا بْنَ عَائِشَةَ! ''ابن عائشہ! مَیں ہوں''۔ وہ آپؒ کی آواز سن کر فرطِ محبت میں کہنے لگا: میرے ماں باپ آپ پر قربان ہوں، جی! آپ حکم فرمائیں۔

آپؒ نے فرمایا: میں جو کہنے لگا ہوں اس کو توجہ سے سننا۔ اور دیکھو تم اس وقت ان غلاموں کے قبضہ میں ہو، بات یہ

ہے کہ میں نے قسم کھائی ہے کہ اگر تم سو مرتبہ اپنی پُر ترنم آواز میں ہمیں کچھ نہیں سناؤ گے تو یہ دونوں تمہیں اس وادی میں ڈال دیں گے۔ یہ سن کر ابن عائشہ نے شور مچانا شروع کر دیا اور زور زور سے کہنے لگا: ہائے بربادی! ہائے پریشانی! حضرت حسنؓ نے کہا: شور ختم کرو اور سنانا شروع کرو۔ جب اس نے دیکھا کہ اب سنائے بغیر کوئی چارہ نہیں ہے تو کہنے لگا: چلیں، اب آپ اپنی پسند کی مخصوص آواز، میرے لیے منتخب کر کے تجویز کریں تاکہ میں آپ کی اُسی من پسند آواز میں سناؤں، اور ایک آدمی بھی کھڑا کر دیں جو گنتی کرتا رہے۔

اس کے بعد ابن عائشہ نے اپنی مخصوص خوبصورت ترین آواز میں سنانا شروع کر دیا، لوگ وادیٔ عقیق کا نظارہ چھوڑ کر یہاں جمع ہو گئے۔ جب سو کا عدد پورا ہو گیا تو سب لوگوں نے مل کر ایک ہی آواز میں زور سے نعرۂ تکبیر بلند کیا یہاں تک کہ مدینہ کے تمام اطراف کے درو دیوار گونج اٹھے، پھر لوگ امام حسنؒ کی طرف متوجہ ہوئے اور ان سے کہا: اللہ تعالیٰ دنیا و آخرت میں آپ کی روح پر اپنی ڈھیروں رحمتیں نازل فرمائے، اہلِ مدینہ کو آپ اہلِ بیت حضرات سے ہمیشہ بہت خوشیاں ملی ہیں۔ اس کے بعد امام حسنؒ نے ابن عائشہ سے کہا: مَا فَعَلْتُ هٰذَا بِكَ يَا ابْنَ عَائِشَةَ إِلَّا لِأَخْلَاقِكَ الشَّرَاسَةِ ''میں نے یہ جو کچھ تمہارے ساتھ کیا ہے، صرف اور صرف تمہارے سخت مزاج ہونے کی وجہ سے کیا ہے (کیونکہ اگر میں ایسا نہ کرتا تو تم اپنی سخت مزاجی کی وجہ سے کبھی بھی بخوشی لوگوں کو اپنی آواز سنانے پر تیار نہ ہوتے جبکہ لوگ ایک مدت سے اس کے آرزومند ہیں)''۔

ابن عائشہ نے حضرت حسنؒ سے کہا: واللہ! میں نے کبھی آج کے دن سے زیادہ کوئی مشقت نہیں دیکھی، میری بھی آج بس ہو گئی ہے۔ اس کے بعد پھر جب کبھی ابن عائشہ سے پوچھا جاتا کہ تمہاری زندگی میں سب سے زیادہ مشقت تمہارے اوپر کب آئی؟ تو وہ جواب میں کہتا: ''وادیٔ عقیق والے دن''۔ اس طرح امام حسن مثنیٰؒ نے اپنی حسنِ تدبیر کے ذریعے لوگوں کی آرزو پوری کر دی۔

(۱) العقد الفريد: ۳۸/۷، مع المستطرف في كل فنّ مستظرف ص: ۳۹۷، وعلماء أهل البيت في عصر التابعين، ص: ۱۵۳، ۱۵۲

(۲) امام عبداللہ محض سلام اللہ و رحمۃ علیہ

(عبداللہ بن حسن مثنیٰ بن حسن بن علی کرم اللہ وجہہ)

نام ونسب:

آپ سلام اللہ و رحمۃ علیہ کا نام ''عبداللہ'' تھا اور بہت عالی نسب سے آپؒ نوازے گئے تھے کہ آپؒ امام حسن مثنیٰؒ کے جلیل القدر صاحبزادے، اور نوجوانانِ جنت کے سرداروں میں سے ایک (یعنی امام حسن بن علیؓ) کے پوتے اور دوسرے (یعنی امام حسینؓ) کے نواسے تھے، اسی طرح امام زین العابدینؒ کے آپؒ بھانجے اور امام زیدؒ بن حسنؒ کے سگے بھتیجے تھے۔[1]

آپؒ کی والدہ ماجدہ، امام حسینؓ کی صاحبزادی حضرت ''فاطمہ''،[2] تھیں اور آپؒ کی نانی کا نام ''اُمّ اسحاق بنت طلحہ'' تھا۔[3] اور آپؒ کی دادی کا نام ''خولہ بنت منظور'' تھا جو قبیلہ ''فزارہ'' کی تھیں اور اسی نسبت سے ''خولہ فزاریہ'' کہلاتی تھیں جیسا کہ ان کا تفصیلی تذکرہ پیچھے امام حسن مثنیٰ کی سیرتِ طیبہ کے تحت گزر چکا ہے۔

اور آپؒ نسب کے لحاظ سے ہاشمی علوی،[4] جبکہ وطن کے اعتبار سے مدنی تھے۔[5]

آپؒ کی کنیت ''ابومحمد''[6] اور لقب ''محض'' تھا (اور اسی لقب سے معروف ہونے کی بناء پر ''عبداللہ محض'' کہلاتے تھے[7])۔ اس لقب کی وجہ یہ تھی کہ ''محض'' کا مطلب ہے: وہ شخص جس کا نسب خالص ہو (یعنی اس میں اپنے خاندان

---

(۱) البداية والنهاية طه هجر: ۱۳/ ۳۸۰، مع علماء أهل البيت في عصر التابعين، ص: ۱۶۴

(۲) الطبقات الكبرى: ۵/ ۳۸۵، وتاريخ الإسلام: ۹/ ۱۹۱، وتهذيب الكمال: ۱۴/ ۴۱۵

(۳) مقاتل الطالبيين ص: ۱۶۶، والأغاني للأصفهاني: ۱۰/ ۱۲۴

(۴) تاريخ الإسلام: ۹/ ۱۹۱

(۵) المنتظم في تاريخ الملوك والأمم: ۸/ ۹۱، وتاريخ بغداد وذيوله: ۹/ ۴۳۸، والأعلام للزركلي: ۴/ ۷۸، مع تاريخ الإسلام: ۹/ ۱۹۱، وموسوعة أقوال الإمام أحمد: ۲/ ۲۳۶

(۶) الطبقات الكبرى: ۵/ ۳۸۶، ومقاتل الطالبيين ص: ۱۶۶، وتاريخ بغداد وذيوله: ۹/ ۴۳۹

(۷) أنساب الأشراف للبلاذري: ۳/ ۷۵، والتاج المكلل ص: ۴۲۵

کے علاوہ کسی اور نسب کی آمیزش نہ ہو)، تو آپؒ کے چونکہ مادری وپدری دونوں طرف سے نسب حضرات حسنین کریمینؓ پر ہی ختم ہوتے تھے اور یہ دونوں ایک ہی باپ کے صاحبزادے اور آپس میں سگے بھائی تھے، اس لیے آپؒ کا نسب طرفین سے حضرت علی کرم اللہ وجہہ پر جا پہنچتا تھا، اس میں کسی اور نسب کی آمیزش نہ تھی، چنانچہ آپؒ ''محض'' سے ملقب ہوئے۔ [1] اس (لقب محض) کے علاوہ آپؒ کو ''کامل'' بھی کہا جاتا تھا۔ [2]

ولادت:

آپ سلامُ اللہ وَ رَحمۃُ علیہ کی ولادت باسعادت دنیا کے معزز ومقدس گھر کے اندر ہوئی یعنی مسجدِ نبوی اور خانۂ نبوی سے متصل، حضرت فاطمۃ الزہراءؓ کے مبارک گھر میں آپؒ پیدا ہوئے۔ آپؒ کی یہ پیدائش ۷۰ ہجری کے اندر، عبد الملک بن مروان کے دورِ خلافت میں ہوئی۔ [3] اس کے علاوہ آپؒ بھی ان خوش قسمت ہستیوں میں سے تھے جن کی ولادت میں حضرت امام حسن وحسین رضی اللہ عنہما ہر دو کی نسبت یکجا تھی۔ [4]

حلیہ ولباس:

آپ سلامُ اللہ وَ رَحمۃُ علیہ حلیہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مشابہ تھے، [5] اِسی کے ساتھ آپؒ لوگوں میں سب سے زیادہ خوبصورت بھی تھے یہاں تک کہ جب یہ سوال کیا جاتا: ''مَنْ أَحْسَنُ النَّاسِ'' (لوگوں میں سب سے زیادہ حسین کون ہے)؟ تو جواب میں کہا جاتا: ''عبد اللہ بن حسن''۔ الغرض یہاں تک لکھا ہے کہ آپؒ کے زمانہ میں گویا سارا حسن وجمال آپؒ کی ذات میں ہی سمٹ آیا تھا۔ [6]

لباس میں، آپؒ کا دو چادریں پہننا ثابت ہے: ایک نیچے اور ایک اوپر والی چادر۔ [7] اور یہ بھی وارد ہوا ہے کہ ایک

---

(۱) ینظر: التعلیق علی مجمع الآداب: ۵/۳۷، مع الدر المنثور في طبقات ربات الخدور ص: ۳۶۱، وسمط النجوم العوالي: ۲/۳۹۰، والنسب والمصاهرة، ص: ۲۳۳

(۲) مجمع الآداب في معجم الألقاب: ۴/۳۵، ۳۶

(۳) علماء أهل البيت في عصر التابعين، ص: ۱۶۶، مع الأعلام للزركلي: ۴/۷۸، ومقاتل الطالبيين ص: ۱۶۸

(۴) مجمع الآداب في معجم الألقاب: ۴/۳۶

(۵) الدر المنثور في طبقات ربات الخدور ص: ۳۶۱

(۶) علماء أهل البيت في عصر التابعين، ص: ۱۶۷، والأغاني: ۱۰/۳۶، ومقاتل الطالبيين ص: ۱۶۷

(۷) علماء أهل البيت في عصر التابعين، ص: ۱۶۷، ۱۶۶، ومقاتل الطالبيين ص: ۱۶۹

موقع پر آپؒ نے گیروی (یعنی ہلکے سرخ) رنگ کی یہ چادریں زیبِ تن فرمائی ہوئی تھیں۔ اور جوتے کے متعلق آتا ہے کہ آپؒ، گول منہ والا جوتا استعمال فرماتے تھے۔[2]

شادی:

آپؒ نے کئی شادیاں کیں جیسا کہ نیچے عنوانِ ''اولاد'' کے تحت اس کا تذکرہ ہوگا، البتہ آپؒ کی جو شادی ''ہند بنت ابی عبیدہ'' سے ہوئی تھی اُس کی قدرے تفصیل کتب میں مذکور ہے جو کہ درج ذیل ہے:

خلیفہ عبد الملک بن مروان نے اپنے بیٹے عبد اللہ کی شادی دو عورتوں سے کرائی: ہند بنت ابی عُبَیدہ اور رَیطہ بنت عبد اللہ بن عبد المَدَان۔ پھر عبد اللہ بن عبد الملک کا انتقال ہوگیا اور ہند بنت ابی عبیدہ اپنے حصے کی میراث (جو مالِ کثیر پر مشتمل تھی)، لے کر واپس اپنے والدین کے گھر آگئی۔

اِدھر حضرت عبد اللہ بن حسن مُثنّیٰ نے اپنی والدہ ماجدہ حضرت فاطمہ بنت حسین سے عرض کیا: آپ جا کر میرے لیے، ہند بنت ابی عبیدہ کو نکاح کا پیغام دیں۔ آپؒ کی والدہ کہنے لگیں کہ وہ تمہارے ساتھ نکاح کا انکار کر دے گی۔ پھر بیٹے سے مخاطب ہو کر فرمایا: کیا تم ہند سے نکاح کی تمنا رکھتے ہو جب کہ اُس کو تو بادشاہ کے بیٹے ''عبد اللہ بن عبد الملک'' سے میراث کا حصہ ملا ہے اور تم ایک غریب آدمی ہو؟ امام عبد اللہ محضؒ نے والدہ کو مزید تکلیف دینا مناسب نہ سمجھی چنانچہ انہیں مزید کچھ نہ کہا۔ پھر خود، ہند کے والد ابی عبیدہ کے پاس چلے گئے اور ان کی بیٹی ''ہند'' کے ساتھ اپنے نکاح کا انہیں پیغام دیا۔ انہوں نے جواب میں بہت خوشی، فراخدلی اور محبت کا اظہار کیا اور کہا: میں نے اپنی طرف سے تو ابھی اُس کا نکاح آپ کے ساتھ کر دیا ہے۔ پھر کہا: آپ یہیں ٹھہریں، میں آتا ہوں۔ اس کے بعد اپنی بیٹی ''ہند'' کے پاس اندر گئے اور کہا: میری پیاری بیٹی! باہر عبد اللہ بن حسن مُثنّیٰ آئے ہیں وہ تمہارے لیے اپنے نکاح کا پیغام لائے ہیں۔ ہند نے کہا: ابا جان! پھر آپ نے انہیں کیا جواب دیا ہے؟ کہا: میں نے تو اپنی طرف سے ان کا نکاح تمہارے ساتھ کر دیا ہے (بس تمہاری طرف سے صرف اجازت باقی تھی)۔ وہ کہنے لگیں: آپ نے بہت اچھا کیا ہے، اور میری طرف سے بھی اس کی اجازت ہے۔ جب نکاح مکمل طور پر منعقد ہو چکا اور یہ دونوں رشتۂ ازدواج میں منسلک ہو گئے تو ''ہند'' نے حضرت عبد اللہ کو پیغام کہلا بھیجا کہ آپؒ یہیں ٹھہرے رہیں یہاں تک کہ رخصتی ہو جائے، اس کے بعد انہوں نے اپنے شوہر کے لیے زیب و زینت اختیار کی اور پھر اسی

---

(1) التذكرة الحمدونية: ۲۲۶/۷، والاغاني للأصفهاني: ۳۳۰/۱۰، علماء أهل البيت في عصر التابعين، ص: ۲۰۲

(2) الطبقات الكبرى ط العلمية: ۳۸۶/۵

رات ہی رخصتی بھی ہوگئی، اور آپؒ کی والدہ کو اسکا علم نہیں تھا۔ آپؒ سات دن تک وہیں سسرال ٹھہرے، پھر ساتویں روز اپنی والدہ کے پاس آئے۔ والدہ نے دیکھا کہ کپڑوں پر خوشبو کے نشانات ہیں اور کپڑے بھی اور پہنے ہوئے ہیں (جیسے گویا نئی شادی ہوئی ہو)۔ یہ منظر دیکھ کر انہوں نے پوچھا: پیارے بیٹے! کہاں سے آرہے ہو؟ آپؒ نے کہا: مِن عندِ التي زَعمتِ أنها تَرُدُّني ''اُسی کے پاس سے جس کے بارے میں آپ کا خیال تھا کہ وہ انکار کردے گی''۔

آپؒ نے اپنی ازدواجی زندگی کو حسنِ سلوک اور پیار و محبت کے ساتھ مزین کر رکھا تھا۔

آپؒ اپنی بیوی کی کس طرح دلجوئی کیا کرتے اور کس طرح ان سے اظہارِ محبت کرتے، اس کا کچھ نمونہ ان کے درج ذیل اشعار سے واضح ہوتا ہے:

یا هندُ إنکِ لو عَلِمـــتِ بعاذِلَین تَتابَعـــا　　قالا فلَم أَسمَع لِما... قالا و قلتُ بل اسمَعا

هنـــدٌ أحبُّ إليّ مِن... مالي وزوحي فازجِعــا　　ولقد عصَيتُ عَواذِلي... وأطعتُ قلباً مُوجِعا

[اے ہند! کاش! تجھے اس بات کا پتا ہوتا کہ دو شخص مسلسل مجھے ملامت کرتے رہے اور تیرے بارے میں مجھ سے بات کرتے رہے، مگر میں نے اُن کی باتوں پر ذرا بھی کان نہ دھرا اور میں نے انہیں کہا: (تم مجھے ملامت نہ کرو اور مجھے کچھ نہ سناؤ) بلکہ تم میری بات سنو کہ ہند مجھے اپنے مال اور اپنی جان سے بھی زیادہ محبوب ہے، لہٰذا تم (مجھے اس بارے میں کچھ نہ کہو اور) چلے جاؤ اور میں نے یہ طے کر رکھا ہے کہ میں اپنے اِن ملامت کُن لوگوں کی بات کبھی نہ مانوں گا اور ہمیشہ اپنے اِس پُرسوز دل کی آواز پر ہی لبیک کہوں گا۔][1]

اس کے علاوہ آپؒ کی ایک اور شادی کا تذکرہ بھی ملتا ہے، وہ اس طرح کہ ایک مرتبہ آپؒ طواف کر رہے تھے کہ ایک عورت نے دورانِ طواف آپؒ کو آخرت سے متعلقہ ایک قیمتی نصیحت کی (کہ دنیوی لذات اور دینی احکام ایک دوسرے کی ضد ہیں، ان میں سے جس کو چھوڑ دگے دوسری چیز ہاتھ میں آجائے گی)۔ اُس کی یہ دینداری اور فہم و تفقہ وغیرہ دیکھ کر آپؒ کے دل میں، اُس کی عظمت جاگزیں ہوگئی چنانچہ آپؒ نے اسے نکاح کا پیغام دیا۔ پھر وہ آپؒ کے نکاح میں آئیں اور آپؒ کے حرم میں شمار ہو کر اِس عظیم شرفِ زوجیت سے سرفراز ہوئیں۔[2]

---

(۱) مستفادمن: علماء أهل البيت في عصر التابعين، ص: ۱۲۹، ۱۶۸، ومقاتل الطالبين، ص: ۲۱۰-۲۰۸، والاغانی للاصفهانی: ۱۰/۱۳۶، ۱۳۷، و ۱۳۳

(۲) مستفادمن: مختصر تاريخ دمشق: ۱۲/۱۱۳، بتلخیص و تصرف یسیر

اولاد

صاحبزادے:

۱۔ محمد بن عبداللہ: یہ محمد نفس زکیہ سے معروف ہوئے۔ ان کا تفصیلی تذکرہ، آئندہ مستقل آرہا ہے۔

۲۔ ابراہیم بن عبداللہ: یہ خلیفہ ابوجعفر عباسی کے دورِ حکومت میں اُس کے بھیجے ہوئے لشکر کے ہاتھوں کوفہ سے کچھ فاصلہ پر "باخَمرا" میں شہید ہوئے۔ اِن کا کچھ تذکرہ امام نفس زکیہؒ کی سیرت کے تحت آئے گا۔

۳۔ موسیٰ بن عبداللہ

۴۔ اِدریس (اکبر) بن عبداللہ

۵۔ ہارون بن عبداللہ

مذکورہ بالا پانچوں بیٹے، ہند بنتِ ابی عبیدہ کے بطن سے پیدا ہوئے۔

۶۔ عیسیٰ بن عبداللہ

۷۔ ادریس (اصغر) بن عبداللہ

۸۔ داود بن عبداللہ

یہ تینوں، عاتکہ بنت عبدالملک کے بطن سے پیدا ہوئے۔

۹۔ سلیمان بن عبداللہ

۱۰۔ یحییٰ بن عبداللہ

یہ دونوں، قُریبہ بنت رُکیح کے بطن سے پیدا ہوئے۔[1]

---

(۱) الطبقات الکبری ط العلمیۃ: ۵/۳۸۶

صاحبزادیاں:

۱۔ فاطمہ بنت عبداللہ: ان کا نکاح، ابوجعفر عبداللہ بن حسن مثلث سے ہوا، اور ان سے تین بیٹے (جعفر، محمد، ابراہیم) اور ایک بیٹی (ام حسن) پیدا ہوئی۔

۲۔ زینب بنت عبداللہ: ان کا نکاح علی بن حسن سے ہوا، اور ان سے چار بیٹے (عبداللہ، حسن، حسین، ومحمد) اور تین بیٹیاں (رقیہ، ام کلثوم، وفاطمہ) پیدا ہوئیں۔

۳۔ رقیہ بنت عبداللہ: یہ اسحاق بن ابراہیم بن حسن مثنیٰ کے نکاح میں آئیں۔

۴۔ ام کلثوم بنت عبداللہ: ان کا نکاح یعقوب بن ابراہیم بن حسن مثنیٰ سے ہوا۔

۵۔ کُلثَم بنت عبداللہ۔

یہ پانچوں صاحبزادیاں، ہند بنت ابی عبیدہ کے بطن سے پیدا ہوئیں۔[1]

امام عبداللہؒ کی آگے نسل، مندرجہ ذیل چھ بیٹوں سے چلی:

محمد نفس زکیہ، ابراہیم، یحییٰ، ادریس، سلیمان اور موسیٰ۔ پھر ان میں سے بھی پہلے تین سے کم اور آخری تین بیٹوں سے بہت زیادہ نسل چلی۔[2]

علم کی تحصیل واشاعت اور آپؒ کا علمی مقام:

آپؒ نے تحصیلِ علم میں غیر معمولی کوشش صرف کی جیسا کہ ابن ابی سلیم کے بیان سے واضح ہوتا ہے، وہ بیان کرتے ہیں کہ میں حضرت عطاء کے پاس (تحصیلِ علم کے لیے) جایا کرتا تھا، میں جب بھی وہاں پہنچتا تو دیکھتا کہ ''عبداللہ بن حسن'' مجھ سے پہلے پہنچے ہوئے ہیں۔[3]

تحصیلِ علم میں جہاں آپؒ نے غیر معمولی محنت ولگن سے کام لیا وہاں اپنے ہم عصر علماء سے بھی استفادہ میں کوئی عار محسوس نہ کی اور اعلیٰ درجہ کی تواضع کا نمونہ پیش کرتے ہوئے ان کے حلقۂ درس میں جا کر شریک ہوتے اور بیٹھ کر نہایت

---

(۱) الطبقات الکبری ط العلمیة: ۳۸٦/۵، مع نسب قریش ص: ۵۴

(۲) جمهرة أنساب العرب: ۴۵/۱، مع الشجرة المباركة في أنساب الطالبية، ص: ۴، والفخري في أنساب الطالبيين، ص: ۸۵

(۳) موسوعة أقوال الإمام أحمد بن حنبل في رجال الحديث وعلله: ۲۳٦/۲

اہتمام وتوجہ سے ان کا درس سنتے، جیسا کہ امام ابوالزناد عبداللہ بن ذکوان قریشی - جو آپؒ کے ہم عصر ہونے کے ساتھ ساتھ آپؒ کے ہم وطن بھی تھے یعنی وہیں مدینہ طیبہ کے رہنے والے تھے - مسجدِ نبوی میں حلقہ لگایا کرتے تھے اور آپؒ اور داود بن حسنؒ اُن کے حلقۂ درس میں بیٹھ کر ہمہ تن درس کی طرف متوجہ رہتے۔[1]

اور صحیح بخاری کی روایت کے مطابق آپؒ نے محمد بن مُنکَدِر سے ''استخارہ'' کی دعا اور نماز کے طریقے کا استفادہ کیا ہے، چنانچہ عبدالرحمن بن ابی الموالی کہتے ہیں: میں نے محمد بن مُنکَدِر سے سنا، جبکہ وہ عبداللہ بن حسن کو حدیث بتا رہے تھے، وہ کہہ رہے تھے کہ مجھے حضرت جابر بن عبداللہؓ نے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ اپنے صحابہ کو جس اہتمام سے قرآن کی تعلیم دیتے تھے اسی اہتمام سے ان کو تمام کاموں میں استخارہ کرنے کی تعلیم دیتے تھے، آپ ﷺ فرمایا کرتے:

جب تم میں سے کوئی شخص کسی کام کو سرانجام دینے کا ارادہ کرے تو اسے چاہیے کہ دو رکعت نفل پڑھے پھر درج ذیل دعا کرے:

اَللّٰهُمَّ إِنِّي أَسْتَخِيرُكَ بِعِلْمِكَ، وَأَسْتَقْدِرُكَ بِقُدْرَتِكَ، وَأَسْأَلُكَ مِنْ فَضْلِكَ الْعَظِيمِ، فَإِنَّكَ تَقْدِرُ وَلَا أَقْدِرُ، وَتَعْلَمُ وَلَا أَعْلَمُ، وَأَنْتَ عَلَّامُ الْغُيُوبِ، اَللّٰهُمَّ إِنْ كَانَ هٰذَا الْأَمْرُ خَيْرًا لِي فِي دِينِي وَعَاقِبَةِ أَمْرِي فَاقْدُرْهُ لِي، وَيَسِّرْهُ لِي وَبَارِكْ لِي فِيهِ، وَإِنْ كَانَ شَرًّا فِي دِينِي، وَعَاقِبَةِ أَمْرِي فَاصْرِفْهُ عَنِّي، وَاصْرِفْنِي عَنْهُ، وَاقْدُرْ لِيَ الْخَيْرَ حَيْثُ كَانَ ثُمَّ رَضِّنِي بِهِ۔[2]

آپؒ نے علمی استفادے اور اس کی تحصیل میں اس قدر محنت کی کہ بالآخر آپؒ اپنے زمانہ کے چوٹی کے علماء ومشائخ میں شمار ہوئے اور وقت کے مشائخ کے ہاں معظم ومکرم اور معتبر ومعتمد علمی شخصیت قرار پائے[3]، اور پھر آپؒ کی علمی حیثیت کو مختلف حضرات نے مختلف معزز الفاظ سے بیان کیا، بطورِ نمونہ چند تعبیرات درج ذیل ہیں:

۱۔ آپؒ لوگوں میں سب سے بڑے عالم تھے۔[4]

۲۔ آپؒ بنو ہاشم کے جلیل القدر علماء میں سے تھے۔[5]

---

(۱) الطبقات الكبرى: ۵/۴۱۵، مع الأعلام للزركلي: ۴/۸۵، وعلماء أهل البيت في عصر التابعين، ص: ۱۷۳

(۲) صحيح البخاري: ۹/۱۱۸، مع السنة لابن أبي عاصم: ۱/۱۸۳، ومصنف ابن أبي شيبة: ۶/۵۲، وكلمات الدعا لآخر الذكر:

(۳) ينظر: مجمع الآداب: ۵/۳۷، مع البداية والنهاية ط هجر: ۱۳/۳۸۱، ومختصر تاريخ دمشق: ۱۲/۱۱۰

(۴) ينظر: مجمع الآداب في معجم الألقاب: ۵/۳۷،

(۵) مشاهير علماء الأمصار ص: ۲۰۵

۳۔ آپؒ بنو ہاشم کے شیخ، اُن کے صفِ اول کے آدمی اور علم وفضل میں ان سے آگے بڑھے ہوئے تھے۔ [1]

۴۔ آپؒ اہلِ مدینہ کے محدّث تھے۔ [2]

۵۔ آپؒ کی علمی دیانت وصداقت اس قدر مسلَّم ہوچکی تھی کہ علماء کی ایک جماعت نے آپؒ کو ''قابلِ اعتماد راویٔ حدیث'' کے معزز لقب سے نوازا، [3] اور صداقتِ علمیہ کا تو یہ عالَم تھا کہ حضرت مغیرہ جیسی شخصیت کے سامنے جب کوئی شخص عبداللہ بن حسن سے مروی حدیث کا تذکرہ کرتا تو آپؒ برجستہ فرماتے کہ یہ بالکل سچی روایت ہے۔ [4]

اللہ تعالیٰ نے آپؒ کو اس قدر وسیع وعمیق علم سے نوازا تھا کہ آپؒ کی علمی گفتگو سن کر وقت کے جلیل القدر عالم ومفتی بھی عش عش کر اٹھتے اور آپؒ کی برموقع جرأت وبے باکی کے ساتھ ساتھ آپؒ کی علمی پختگی پر داد دیے بغیر نہ رہ سکتے، جس کا ایک نمونہ عبداللہ بن اسحاق جعفری کے بیان سے ظاہر ہوتا ہے، وہ کہتے ہیں کہ امام عبداللہ محضؒ، مفتیٔ مدینہ، امامِ مجتہد، علامۂ وقت ''امام ربیعۃ الرائےؒ'' کی علمی مجلس میں بکثرت شریک ہوا کرتے تھے۔ ایک دن مجلس میں سننِ نبویہ کی بحث چلی اور اس دوران ایک سنت کا تذکرہ ہوا تو مجلس میں موجود ایک صاحب نے کہا کہ: ''اِس وقت کا عمل تو اِس سنت پر نہیں ہے (یعنی اس زمانے کے عمل کی وجہ سے اب یہ سنت، ''معمول بہا'' سنت نہیں قرار پاسکتی، لہٰذا اِس تعامل کی بناء پر اِس سنت کے ترک میں کوئی شرعی حرج نہیں رہا)۔'' اس صاحب کی یہ کمزور علمی دلیل سن کر امام عبداللہ محضؒ سے رہا نہ گیا اور آپؒ مضبوط علمی دلیل لیے میدانِ گفتگو میں اترے اور فرمایا: ''تمہارا کیا خیال ہے کہ اگر کسی زمانے میں جاہلوں کی کثرت ہوجائے حتی کہ وہ حکمران بن بیٹھیں تو کیا سنت کے خلاف ان کا عمل حجت اور دلیل قرار پائے گا؟'' آپؒ کا یہ جواب سن کر امام ربیعۃ الرائےؒ بولے: أَشْهَدُ أَنَّ هٰذَا كَلَامُ أَبْنَاءِ الْأَنْبِيَاءِ ''میں گواہی دیتا ہوں کہ یہ، اولادِ انبیاء کا کلام ہے۔'' [5]

---

(۱) مقاتل الطالبین ص: ۱۶۷

(۲) تاریخ دمشق لابن عساکر: ۲۷/ ۳۶۸

(۳) راجع له: تهذيب الكمال في أسماء الرجال: ۱۴/ ۴۱۷، وتذهيب تهذيب الكمال: ۵/ ۱۲۲، وتاريخ بغداد وذيوله: ۹/ ۴۳۹، وتاریخ الاسلام: ۹/ ۱۹۱

(۴) تهذيب الكمال للمزي: ۱۴/ ۴۱۶، وتاریخ دمشق لابن عساکر: ۲۷/ ۳۷۱،

(۵) الفقيه والمتفقه: ۱/ ۳۸۰، ومختصر تاریخ دمشق: ۱۲/ ۱۱۰، مع سير أعلام النبلاء: ۶/ ۸۹

علمِ فقہ کے میدان میں، آپؒ مجتہدانہ شان رکھتے تھے۔ اسی بناء پر اختلافی مسائل میں بیانِ اقوال کے وقت دیگر ائمہ فقہاء کے ساتھ آپؒ کا قول بھی ذکر کیا جاتا ہے، جیسا کہ سورہ بقرہ کی آیت نمبر ۲۳۳ کی تفسیر کے تحت امام قرطبیؒ ایک فقہی مسئلہ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ: ''اگر زوجین میں سے شوہر مسلمان اور بیوی، ذمیہ (یعنی کافرہ) ہو اور اسے طلاق ہو جائے تو اس صورت میں اگر ان کا چھوٹا بچہ بھی ہو تو طلاق کے بعد اس بچے کو اپنے پاس رکھنے کا زیادہ حقدار کون ہوگا، اس بچے کا باپ یعنی وہ مسلمان شوہر یا اس کی ماں یعنی وہ ذمیہ (کافرہ) بیوی؟ اس میں فقہاء کرام کے اختلاف کی بناء پر دو قول ہیں: پہلا قول یہ ہے کہ ماں زیادہ حقدار ہے چاہے وہ ذمیہ ہو یا مسلمان ۔۔۔، اور دوسرا قول یہ ہے کہ زوجین میں سے وہ زیادہ حقدار ہے جو مسلمان ہو چاہے وہ شوہر ہو یا بیوی، اور یہ قول امام مالک، امام عبداللہ بن حسن وغیرہ کا ہے اور امام شافعی سے بھی یہی قول منقول ہے۔''[1]

اور جہاں تک علمِ حدیث کا تعلق ہے تو آپؒ نے بڑے بڑے مشائخ سے روایتِ حدیث لی، جیسے: معروف و عظیم صحابی حضرت عبداللہ بن جعفرؓ، آپؒ کے والد حضرت حسن مثنیٰؒ، آپؒ کی والدہ حضرت فاطمہ بنت حسین، حضرت عکرمہ مولی ابن عباس، حضرت ابراہیم بن محمد وغیرہ۔

اور پھر آپؒ کا یہ حاصل کردہ فیضِ حدیث لوگوں کی ایک بڑی تعداد تک پہنچا چنانچہ جن لوگوں نے آپؒ سے احادیث روایت کیں ان کی ایک لمبی فہرست ہے اُن میں سے صرف چند حضرات کے اسامی درج ذیل ہیں:

اسحاق بن راشد، اسماعیل بن عبدالرحمن، اسماعیل بن علیہ، جہم بن عثمان، حسین بن حسن اشقر، حسین بن زید بن علی، حفص بن عمر رقاشی، رجاء بن ابی سلمہ، روح بن قاسم، ابو الجارود زیاد بن منذر، سفیان ثوری، فضیل بن مرزوق، مالک بن انس، آپؒ کے بیٹے موسیٰ بن عبداللہ اور یحییٰ بن عبداللہ، محمد بن قاسم اسدی، منذر بن زیاد طائی وغیرہ۔[2]

اس طرح احادیث و روایات کا ایک وسیع ذخیرہ آپؒ کے ذریعہ سے امت تک پہنچا اور اشاعتِ حدیث کا فریضہ سرانجام پایا، چنانچہ آپؒ سے مروی چند احادیث و روایات ذیل میں درج کی جاتی ہیں:

۱۔ رسول اللہ ﷺ جب مسجد میں داخل ہوتے تو پہلے درود شریف پھر یہ دعا پڑھتے: **رَبِّ اغْفِرْ لِي ذُنُوبِي، وَافْتَحْ لِي أَبْوَابَ رَحْمَتِكَ** اسی طرح جب باہر نکلتے تو پہلے درود شریف اور پھر یہ دعا پڑھتے: **رَبِّ اغْفِرْ لِي**

---

(۱) تفسیر القرطبي: ۱۶۷/۳

(۲) تهذيب الكمال للمزي: ۱۴/۴۱۶-۴۱۵، مع البداية والنهاية ط هجر: ۳۸۱/۱۳

ذُنُوبِي، وَافْتَحْ لِي أَبْوَابَ فَضْلِكَ.[1]

۲۔ حضورﷺ نے فرمایا: مَنْ أَجْرَى اللهُ عَلَىٰ يَدَيْهِ فَرَجًا لِمُسْلِمٍ، فَرَّجَ اللهُ عنه كُرَبَ الدنيا والآخِرةِ (جو شخص کسی مسلمان کی پریشانی دور کرے، اللہ تعالیٰ اس کی دنیا وآخرت کی پریشانیاں دور فرماتا ہے)۔[2]

۳۔ رسول اللہﷺ نے فرمایا: شِرارُ أمتِي الّذينَ غُذُّوا بالنَّعيمِ، الّذينَ يأكُلونَ ألوانَ الطَّعامِ، ويَلبَسُونَ ألوانَ الثِّيابِ، ويَتَشَدَّقُونَ فِي الكَلَامِ.

[میری امت کے بدترین لوگ وہ ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ کی نعمتوں سے روزی ملتی ہے، وہ انواع واقسام کے کھانے کھاتے ہیں، مختلف قسم کے کپڑے پہنتے ہیں اور (پھر اپنے طرزِ گفتگو میں تکبر اختیار کرتے ہیں کہ) بات کرنے کے دوران اپنی باچھیں تکلف کے ساتھ موڑتے ہیں]۔[3]

۴۔ حضورﷺ نے فرمایا: أبو بكرٍ مِنّا أهلَ البيتِ (ابوبکرؓ، ہم اہلِ بیت میں سے ہیں)۔[4]

۵۔ آپؒ نے حضرت عبداللہ بن جعفر سے یہ کلمات نقل کیے ہیں: لَا إِلٰهَ إِلَّا اللهُ الْحَلِيمُ الْكَرِيمُ، سُبْحَانَ اللهِ رَبِّ الْعَرْشِ الْكَرِيمِ، الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ، اللّٰهُمَّ اغْفِرْ لِي، اللّٰهُمَّ تَجَاوَزْ عَنِّي، اللّٰهُمَّ اعْفُ فَإِنَّكَ عَفُوٌّ غَفُورٌ، أو غَفُورٌ عَفُوٌّ. حضرت عبداللہ بن جعفر فرماتے ہیں کہ میرے چچا نے مجھے بتایا کہ رسول اللہﷺ نے اُن کو یہ کلمات سکھائے تھے۔[5]

ادبی ذوق:

آپؒ کو اللہ تعالیٰ نے ادبی ذوق بھی مرحمت فرمایا تھا، چنانچہ آپؒ فنِ شعر میں مکمل مہارت رکھتے تھے، اور اس فن میں چونکہ الفاظ ومعانی کی گہری واقفیت خشتِ اول کی حیثیت رکھتی ہے اس لیے آپؒ کو الفاظ ومعانی کے پیچ وتاب اور ان کے نکات وباریکیوں پر کامل دسترس حاصل تھی۔ چونکہ آپؒ فنِ شعر کی ماہر شخصیت تھے اس لیے وقت کے مشہور

---

(۱) سنن الترمذي: ۱۲۸/۲، ومثله في: مسند إسحاق بن راهويه: ۵/۵، والدعوات الكبير للبيهقي: ۱۲۷/۱، والدعاء للطبراني ص: ۱۵۰، وفضل الصلاة على النبي صلى الله عليه وسلم ص: ۷۴

(۲) تاريخ دمشق لابن عساكر: ۳۶۵/۲۷،

(۳) مختصر تاريخ دمشق: ۱۰۹/۱۲

(۴) مختصر تاريخ دمشق: ۱۰۸/۱۳

(۵) مختصر تاريخ دمشق: ۱۰۸/۱۲

شعراء، بلکہ وہ شعراء بھی جو گویا اپنی فطرت میں ہی شاعر پیدا ہوئے تھے، آپ کا رخ کرتے تھے، آپؒ کے پاس بیٹھ کر سرور وفرحت محسوس کرتے تھے اور آپؒ کی مجالس میں شرکت کر کے اپنے آپ کو تسکین پہنچاتے تھے۔ ان حاضر ہونے والے شعراء میں سے ایک بڑا نام ''ابو العتاھیہ'' کا ہے جس نے اتنا زیادہ اشعار کہے ہیں کہ ان سب کا احاطہ بھی ناممکن ہے اور وہ ایسا شاعر تھا جس کی عمومی گفتگو میں بھی شعر وشاعری داخل ہو گئی تھی حتی کہ اس بات کا امکان ہو چلا تھا کہ اس کی ہر بات ہی شعری اوزان پر پوری اترتی ہو اور شعر کہلائے جانے کی مستحق ہو۔[1]

بہر حال امام عبداللہ محضؒ بذاتِ خود ایک ایسی مجلس کا تذکرہ نقل کرتے ہیں جس میں ابو العتاھیہ حاضر ہوا تھا اور اُس کی زبان پر پانی کی طرح اشعار رواں ہوئے تھے، چنانچہ آپؒ فرماتے ہیں:

ایک دفعہ ابو العتاھیہ میرے پاس آئے اور آ کر میرے ساتھ بیٹھ گئے، میں نے انہیں کہا: ابو اسحاق! کیا آپ کو بھی نئے نئے الفاظ ڈھونڈنے میں مشقت پیش آتی ہے جیسا کہ دوسرے شعراء کو طویل قصیدہ وغیرہ لکھنے کے دوران پیش آتی ہے؟ جواب دیا: بالکل نہیں۔ میں نے کہا: میرا خیال ہے کہ پھر آپ آسان ''قافیہ'' (شعر کا آخری لفظ) والے اشعار کہتے ہوں گے اس لیے آپ کو یہ مشقت پیش نہیں آتی ہوگی۔ کہنے لگے: آپ مشکل قافیوں میں سے جونسا چاہیں مجھے بتائیں میں اُس پر ابھی فی البدیہہ اشعار کہہ دیتا ہوں۔ تو چونکہ آپؒ بھی فنِ شعری اور عربی ادب میں مہارت رکھتے تھے اس لیے آپؒ نے انہیں مشکل قافیہ دیتے ہوئے کہا کہ ''البلاغ'' کے قافیہ پر اشعار کہو، اس نے اسی وقت یہ اشعار کہہ ڈالے:

أيُّ عيشٍ يكونُ أفضلَ مِن عَيش...... كَفَافٍ قُوتٍ بقَدرِ البَلاغِ

رُبَّ ذِي لُقمَةٍ تعرَّضَ منها... حَائلٌ بينهَا وبين المَسَاغِ

أبلَغَ الدَّهرُ في مَواعِظِه بل... زَادَ فيهنَّ لي علَى الإبلاغِ

غَشَمَتْني الأيَّامُ عقلِي ومَالِي... وشَبَابِي وصِحَّتي وفَرَاغِي.[2]

یہ اشعار اصل میں تو انہوں نے قافیہ ''البلاغ'' کی تکمیل کے لیے کہے تھے، تاہم بطورِ افادہ ان کا مفہوم بھی نیچے

---

(1) ينظر: علماء أهل البيت في عصر التابعين، ص: ۱۹۸، مع الشعر والشعراء: ۲/ ۷۷۹ والأعلام للزركلي: ۱/ ۳۲۱

(2) التذكرة الحمدونية: ۹/ ۲۳۱

درج کیا جارہا ہے:

بقدرِ ضرورت معمولی روزی والی زندگی سے کونسی زندگی بہتر ہوسکتی ہے؟ کئی دفعہ ایسا بھی ہوتا ہے کہ انسان کھانے کے لیے ایک لقمہ اٹھاتا ہے مگر اس لقمے اور اس کے نگلنے کے درمیان تقدیر حائل ہوجاتی ہے (اور انسان وہ لقمہ اپنے حلق میں بھی نہیں اتار سکتا)۔ زمانہ بہت بڑا ناصح ہے اور یہ میرے لیے تو بطورِ خاص بڑا ناصح ثابت ہوا ہے۔ گردشِ ایام (کسی کے لیے کچھ باقی نہیں رکھتی چنانچہ یہ) میری عقل، میرا مال، میری جوانی، اور صحت وفراغت سب کچھ ہی لے گئی (اور مجھے بھی یہ درس دے گئی کہ یہاں ہر شے کو فنا ہے)۔[1]

امام عبداللہ محضؒ نے خود بھی کئی اشعار کہے ہیں، جو اپنے معنی خیزی کی بدولت وقیع حیثیت کے حامل ہیں، چنانچہ ان میں سے بعض اشعار درج ذیل ہیں جو آپؒ نے اپنی اہلیہ "ہند" کے ساتھ اظہارِ محبت کے طور پر کہے (جیسا کہ پیچھے بھی ان کا تذکرہ ہوچکا ہے) اور پھر "ابن سُرَیج" نے ان اشعار کو اپنی پُرترنم آواز میں پڑھا:

یا هند إنکِ لَو عَلِمــ...ــتِ بعاذِلَین تَتابَعــا ــــ قالا فلَم أَسمَع لِما... قالا وقلتُ بل اسْمَعا

هنـ[2]ـذا احبُّ إليّ مِن... مالي وزَوجي فازِجعـ ــــ ولقد عصَيتُ عَواذِلي... واطعتُ قلباً مُوجِعا.

اسی طرح آپؒ کے چند اور اشعار پیشِ خدمت ہیں جو آپؒ کی جرأت وشجاعت کا پتا دیتے ہیں:

تُخوِّفُني بالقَتلِ يَوماً وإنّني... أَموتُ إذا جاءَ الكِتابُ المُنَزَّلُ

إذا كُنتَ ذا سَيفٍ ورُمحٍ مُصَمِّمٍ... على سابِحٍ أدناكَ مِمّا تُؤمِّلُ

فَإنّكَ إن لَم تَركَبِ الهَولَ لَم تَنَل... مِنَ المالِ ما يَكفِي الصَّدِيقَ ويَفضُلُ

[اے مخاطب! تو مجھے کسی روز قتل ہوجانے سے ڈراتا ہے، حالانکہ مجھے اس وقت تک موت نہیں آسکتی جب تک لکھی ہوئی تقدیر نازل نہ ہو۔ جب تلوار اور تیز نیزہ تیرے ہاتھ میں ہو اور تُو ایسے گھوڑے پر سوار ہو جو تجھے تیرے مطلوب کے قریب کردے تو پھر اگر تُو خوف وخطرہ مول نہ لے تو تجھے کبھی وہ مال حاصل نہیں ہوسکتا جو (تیرے بھی کام آسکے اور تیری ضروریات سے) زائد ہوکر تیرے دوست کی بھی کفایت کرسکے۔][3]

---

(۱) مجمع الآداب في معجم الألقاب: ۴/۴۶

(۲) الأغاني للأصفهاني: ۲۱/۱۲۳، و۱۰/۱۲۳

(۳) البصائر والذخائر: ۷/۲۲

ان کے علاوہ آپؒ نے اور بھی کئی اشعار کہے ہیں، مندرجہ بالا اشعار صرف بطورِ نمونہ نقل کیے گئے ہیں۔[1]

سلاطینِ وقت سے ملاقاتیں:

درج ذیل سلاطینِ وقت کے پاس آپؒ گئے اور ان سے ملاقاتیں کیں: سلیمان بن عبدالملک، عمر بن عبدالعزیز، ہشام بن عبدالملک اور ابوالعباس سفاح۔[2] ان میں سے پہلے تین خلفاء ''بنوامیہ'' میں سے تھے اور آخری خلیفہ ''عباسی'' تھا جیسا کہ اوپر اس کا تذکرہ گزرا۔

آپؒ فرماتے ہیں: مَیں ایک دفعہ ہشام بن عبدالملک کے پاس گیا، اس نے مجھے کہا: کیا بات ہے کہ دوسرے لوگوں کے ساتھ، آپ کے بیٹے ''محمد'' اور ''ابراہیم'' ہمارے پاس نہیں آتے؟ آپؒ نے فرمایا: امیرالمومنین! دراصل انہیں خلوت نشینی پسند ہے اس لیے وہ لوگوں اور آبادیوں سے دور رہتے ہیں، ان کی آپ سے یہ دوری کسی ایسی وجہ سے نہیں ہے جو آپ کے لیے ناگواری کا سبب ہو، یہ سن کر ہشام خاموش ہوگیا۔ پھر جب بنوعباس کی حکومت آئی تو بھی وہ دونوں حضرات اربابِ حکومت سے دور ہی رہے اور جب عباسی خلیفہ ''ابوالعباس سفاح'' نے ان حضرات کے شاہی دربار میں نہ آنے کے متعلق پوچھا تو حضرت عبداللہؒ نے اِسے بھی وہی جواب دیا جو ہشام بن عبدالملک کو دیا تھا؟ اس پر ابوالعباس نے بھی پھر ان کے متعلق مزید کوئی پوچھ گچھ نہ کی۔[3]

یہاں ہمارے لیے ایک درسِ نصیحت ہے، وہ یہ کہ امام عبداللہ محضؒ سلاطینِ وقت سے ملاقات تو کرتے تھے اور ان کے ساتھ وقت بھی گزارتے تھے مگر اُن کے عالی شان مکانات اور مال ومتاع کو دیکھ کر متاثر ہونے کے بجائے، اُنہیں اِن چیزوں سے دل نہ لگانے کی ترغیب دیتے تھے جیسا کہ درج ذیل واقعہ اِس کا شاہد ہے:

مُصعَب بن عبداللہ کہتے ہیں: امیرالمومنین ابوالعباس، حضرت عبداللہ محضؒ کو ساتھ لیے ''اَنبار'' میں اپنے مکانات کا چکر لگا رہا تھا اور آپؒ کو ان مکانات، ان کے نقش ونگار اور ان مضبوط ومستحکم محلات میں فنِ تعمیر کی کاریگری وغیرہ کا نظارہ کرا رہا تھا۔ آپؒ نے اُسے کہا: امیرالمومنین! پھر اُس کے سامنے دو اشعار پڑھے:

أَلَم تَرَ حَوشَبًا أَمسىٰ يُبَنِّي ... قُصُورًا نَفعُها لِبَنِي بُقَيلَه

---

(۱) انظر: مختصر تاریخ دمشق: ۱۲/۱۱۲ و ۱۱۳، وزھر الآداب: ۱/۱۲۱-۱۲۰، مع علماء أھل البیت، ص: ۱۹۴، وغیرھا

(۲) مختصر تاریخ دمشق: ۱۲/۱۰۸، مع تاریخ بغداد و ذیو لہ: ۹/۴۳۸

(۳) مختصر تاریخ دمشق: ۱۲/۱۰۹

يُؤَمِّلُ أن يَعْمُر عُمرَ نُوحٍ ... وأمرُ اللهِ يَحْدُثُ كُلَّ لَيلَه

(کیا تم ''خوشب'' کو نہیں دیکھتے کہ وہ گھر پہ گھر بنائے جا رہا ہے جب کہ ان کا فائدہ ''آلِ بُقَیلَہ'' کو ہوگا، وہ چاہتا ہے کہ اسے عمرِ نوح ملے مگر اللہ کی تقدیر ہر رات رونما ہو رہی ہے۔)

ابو العباس نے کہا: اِن اشعار سے آپ کیا چاہتے ہیں؟ آپؒ نے فرمایا: میں آپ کا دل اِس قلیل دنیا سے ہٹانا چاہتا ہوں جو آپ نے مجھے دکھلائی ہے۔ [1]

کرامت:

ایک موقع پر جب کہ آپؒ ظاہری اسباب سے عاری تھے تو اللہ تعالیٰ نے آپؒ کے ہاتھ پر کس طرح کرامت ظاہر کی، اس کے لیے درج ذیل واقعہ ملاحظہ ہو:

ایک مرتبہ خلیفہ سلیمان بن عبد الملک، شعراء کے ساتھ حج پر گیا۔ واپسی پر مدینہ منورہ سے گزرتے ہوئے وہاں کچھ قیام کیا، اُس کے پاس روم کے قیدیوں کو پیش کیا گیا جن کی تعداد تقریباً چار سو تھی۔ خلیفہ، مسند نشین ہوا۔ جو شخص اس کے سب سے زیادہ نزدیک بیٹھا ہوا تھا وہ امام عبد اللہ محضؒ کی ہستی تھی، آپؒ نے اُس وقت گیروی رنگ کی دو چادریں پہن رکھی تھیں۔ پھر ان قیدیوں میں سے اُن کے کمانڈر کو بیڑیاں ڈالے ہوئے حضرت عبد اللہ محضؒ کے آگے کر دیا گیا۔ خلیفہ نے کہا: عبد اللہ! اٹھو، اور اس کی گردن اڑاؤ! آپؒ اٹھے مگر کسی نے آپؒ کو تلوار نہ دی، آخر ایک پہرے دار نے اپنی تلوار، جو کہ بہت کُند تھی، آپؒ کو تھما دی۔ آپؒ نے اس کے کند ہونے کے باوجود ایک ہی وار سے گردن اڑا دی اور ساتھ ہی اُسی ضرب سے اس کا بازو اور گلے میں پڑے ہوئے طوق کا کچھ حصہ بھی کاٹ دیا۔ یہ ناقابلِ یقین و نہایت حیران کن منظر دیکھ کر سلیمان بن عبد الملک کہنے لگا: مجھے میرے رب کی قسم! یہ تلوار کا کمال نہیں ہے بلکہ یہ اس کے خاندانی کمال و کرامت کا نتیجہ ہے۔ اس کے بعد خلیفہ نے باقی قیدیوں کو وہاں موجود دیگر رؤسائے مدینہ کے حوالے کر کے انہیں قتل کرا دیا۔ [2]

---

(۱) تاریخ بغداد و ذیوله: ۳۳۸/۹، مع تاریخ دمشق لابن عساکر: ۳۸۷/۲۷، والعقد الفرید: ۲۴۸/۷، والمنتظم فی تاریخ الملوک والامم: ۹۲/۸، وتداولت هذه الأبيات مصادر شتى، نحو الحيوان للجاحظ: ۵۸/۳، وعيون الاخبار: ۳۳۳/۱، واساس البلاغة: ۷۸/۱، وغيرها

(۲) تاریخ الطبري: ۵۴۷/۶، مع التذكرة الحمدونیه: ۲۲۶/۷، والكامل في التاريخ: ۹۵/۴، والاغانی للاصفهانی: ۳۳۰/۱۰، وعلماء اهل البيت في عصر التابعين، ص: ۲۰۲

آپؒ کی عزت وتکریم:

آپ سلامُ اللهِ وَ رَحمۃُ اللهِ علیہ کے مقام ومرتبے کو وقت کے امراء وبادشاہ بھی سمجھتے تھے، چنانچہ بنوامیہ کے خلفاء آپؒ کو عزت وقدر کی نظر سے دیکھتے اور آپؒ کی تعظیم وتکریم بجالاتے۔[1] ان اموی خلفاء میں سے حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ تو آپؒ کو بہت اہمیت دیتے اور نہایت عزت کرتے۔[2] امام عبداللہ المحضؒ کا اپنا بیان ہے کہ ایک مرتبہ میں، اپنی کسی ضرورت کے سلسلہ میں، عمر بن عبدالعزیزؒ کے دروازے پر گیا تو انہوں نے کہا: جب آپ کو مجھ سے کوئی کام ہو تو آپ خود تشریف لانے کے بجائے اپنا کوئی قاصد بھیج دیا کریں یا رقعہ لکھ کر مجھے بھجوا دیا کریں میں آپ کا کام کر دیا کروں گا کیونکہ مجھے اللہ سے اس بات کی شرم آتی ہے کہ وہ آپ جیسی ہستی کو میرے دروازے پر دیکھے۔[3] اسی طرح ایک دفعہ جبکہ آپؒ اُن کے پاس آئے ہوئے تھے تو انہوں نے آپؒ سے نہایت ہمدردی میں کہا کہ آپ اپنے اہلِ خانہ کے ہاں واپس چلے جائیں کیونکہ لشکر میں ایک آدمی طاعون کی بیماری میں مبتلا ہو گیا ہے اس لیے مجھے اندیشہ ہے کہ کہیں آپ کو کچھ نہ ہو جائے۔[4]

آپؒ کے زمانۂ شباب کی بات ہے کہ ایک دفعہ آپؒ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کی مجلس میں آئے جبکہ آپؒ نے سر پہ زلفیں سجا رکھی تھیں، جب آپؒ اندر مجلس میں پہنچے تو انہوں نے آپؒ کو مکمل توجہ دینے کے لیے آپؒ کے اکرام واعزاز میں مجلس برخاست کر دی اور تمام افراد کو اٹھا دیا، صرف آپؒ اور امیر المومنین عمر بن عبدالعزیزؒ وہاں موجود رہے۔ بعد میں اُن کے اِس فعل پر لوگوں نے ان پر اعتراض کیا تو انہوں نے جواب میں فرمایا کہ مجھے ایک معتبر آدمی نے یہ حدیث بیان کی ہے کہ گویا میں خود رسول اللہ ﷺ کی زبانِ مبارک سے سن رہا ہوں، آپ ﷺ نے فرمایا: إِنَّمَا فَاطِمَةُ بِضْعَةٌ مِنِّي، يَسُرُّنِي مَا يَسُرُّهَا. (بلاشبہ فاطمہ میرے جسم کا ٹکڑا ہے، جس بات سے فاطمہ کو خوشی ہو مجھے بھی اُس سے خوشی ہوتی ہے)، اور مجھے اس بات کا یقین ہے کہ اگر حضرت فاطمہؓ زندہ ہوتیں تو یہ جو کچھ میں نے، اُن کے

---

(۱) تاریخ الطبري: ۶۵۰/۱۱

(۲) تاریخ الإسلام: ۱۹۱/۹، وتاریخ بغداد وذیوله: ۴۳۰/۹، وتهذیب الکمال: ۴۱۷/۱۴، والمنتظم: ۹۱/۸، مع البدایة والنهایة طهجر: ۳۸۱/۱۳

(۳) الصواعق المحرقة: ۶۸۱/۲، والتذکرة الحمدونیة: ۱۰۶/۳

(۴) المعرفة والتاریخ: ۶۰۹/۱، ومختصر تاریخ دمشق: ۱۰۹/۱۲

بیٹے کے ساتھ کیا ہے اِس سے اُن کو ضرور خوشی ہوتی۔ [1]

دوسری روایت میں ہے کہ آپؒ ایک مرتبہ اپنی جوانی کی عمر میں نہایت سادگی کے ساتھ فقط دو چادروں میں ملبوس، حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کی مجلس میں آئے۔ آپؒ کی آمد پر انہوں نے آپؒ کو خوش آمدید کہا اور سلام ودعا کے بعد اپنے بالکل قریب کرلیا حتیٰ کہ اپنے پہلو میں جگہ دی اور پھر ان کے ساتھ حد سے بڑھ کر اپنائیت کا مظاہرہ کیا اور ہنسی مذاق وگپ شپ میں مشغول رہے پھر اسی دوران خوش طبعی کے طور پر آپؒ کے پیٹ کی سلوٹ میں اپنی انگلی چھوئی اور اس عظیم ہستی کے قرب کی سعادت سے محظوظ ہو کر مسکرائے جارہے تھے۔ پھر جب امام عبداللہؒ اٹھ کر چلے گئے تو حاضرینِ مجلس نے عمر بن عبدالعزیزؒ سے پوچھا: ''امیر المومنین! آپ نے (امیر المومنین ہوکر) اس معزز وجمیل نوجوان کے پیٹ میں انگلی کس غرض کے لیے چھوئی (یعنی آپ نے اس کے ساتھ اس قدر دل لگی اور خوش طبعی کس لیے کی)؟ آپؒ نے ان حاضرین کو جو کہ سب اموی (یعنی بنوامیہ میں سے) تھے۔ جواب میں فرمایا: إِنِّي لَأَرْجُو بِهٰذِهِ شَفَاعَةَ مُحَمَّدٍ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ''میں اپنے اس عمل سے شفاعتِ رسول ﷺ کی امید رکھتا ہوں (کہ کل حوضِ کوثر پر حضور ﷺ میری شفاعت فرمائیں گے کہ میں نے ان کی آل کے ساتھ محبت واپنائیت کا معاملہ کیا)۔'' [2]

بنوامیہ کے بعد بنوعباس کی حکومت شروع ہوئی تو اس کے پہلے خلیفہ ''ابوالعباس سَفّاح عباسی'' نے بھی آپؒ کے ساتھ عزت واحترام بلکہ بہت ہی زیادہ احترام واکرام والا معاملہ کیا، چنانچہ ایک دفعہ آپؒ آلِ ابی طالب کی ایک جماعت کے ہمراہ ابوالعباس کے پاس ''اَنبار'' (بغداد سے کچھ فاصلہ پر دریائے فرات کے کنارے ایک شہر تھا [3]) آئے تو اُس نے آپؒ کی بہت تعظیم کی اور آپؒ کو دس لاکھ درہم (مساوی تقریباً اکیس کروڑ روپے) پر مشتمل ایک غیر معمولی وخطیر رقم بطور ہدیہ دی، اس کے بعد آپؒ واپس مدینہ تشریف لے آئے۔ [4] ایک روایت میں یہ بھی آیا ہے کہ سفاح عباسی نے آپؒ کو ایک ہی مجلس میں یکشت بیس لاکھ درہم تک دیے۔ [5]

---

(۱) الصواعق المحرقة: ۲/۵۲۴

(۲) علماء أهل البيت في عصر التابعين، ص: ۱۲۷، ۱۲۶، ومقاتل الطالبين، ص: ۱۲۹

(۳) موجز دائرة المعارف الإسلامية: ۳/۱۲۳۸، ومعجم البلدان: ۱/۲۵۷، واطلس تاريخ الاسلام، ص: ۱۲۸

(۴) البداية والنهاية ط هجر: ۱۳/۳۸۱، مع المنتظم في تاريخ الملوك والامم: ۸/۹۱، وتاريخ الاسلام: ۹/۱۹۱، وتاريخ بغداد وذيله: ۹/۴۳۰، وتلخيص تهذيب الكمال: ۵/۱۲۱

(۵) تاريخ القضاعي، ص: ۳۹۳، ۳۹۲، وسير اعلام النبلاء: ۶/۸۰، ومآثر الإنافة في معالم الخلافة: ۱/۱۷۱

حفص بن عمر کہتے ہیں: ایک مرتبہ امام عبداللہ محضؒ، سفاح عباسی کے پاس "اَنبار" آئے تو اس نے آپؒ کا بہت اعزاز و اکرام کیا، تحائف و عطایا دیے اور اپنا اس قدر قرب و اپنائیت دی کہ وہ اتنا کسی کو نہیں دیا کرتا تھا، رات کو دیر تک آپؒ کے ساتھ بات چیت میں مشغول رہتا۔ ایک رات، نصف شب تک آپؒ کے ساتھ محوِ گفتگو رہا پھر ایک جوہر (ہیرے کی طرح ایک قیمتی پتھر) منگوایا جو ڈِبیا میں بند تھا، اُسے کھولا اور آپؒ سے مخاطِب ہو کر کہا: ابو محمد! واللہ! یہ وہی جوہر ہے جو "بنوامیہ" کے ہاتھوں میں تھا، پھر اس جوہر کو دو برابر حصوں میں تقسیم کر کے آدھا آپؒ کو بطورِ ہبہ دے دیا۔ [1]

ان انعامات و عطایا کے علاوہ اس نے آپؒ کو غیر معمولی اپنائیت دے رکھی تھی، آپؒ کے ساتھ ایسے رہتا جیسے گھر کے افراد آپس میں بے تکلف رہتے ہیں حتی کہ وہ آپؒ کے سامنے آتے وقت پورے لباس کے اہتمام کو بھی ضروری نہ سمجھتا بلکہ محض ایک معمولی سے کرتے میں آپؒ کے پاس آ جاتا، چنانچہ اسی طرح کے ایک موقع پر اُس نے آپؒ سے کہا: "(اہلِ خانہ کو چھوڑ کر، باقی) لوگوں میں سے آپ کے علاوہ کسی شخص نے امیر المومنین کو (یعنی مجھے) اس بے تکلف حالت میں نہیں دیکھا۔ دراصل بات یہ ہے کہ امیر المومنین آپ کو اپنے چچا اور والد کی جگہ پر سمجھتا ہے۔" [2]

خلافتِ عباسیہ کے قیام سے قبل، اس خلافت کا داعیٔ اکبر و قائدِ عباسیہ "ابراہیم بن محمد" المعروف "امام ابراہیم" ایک موقع پر جب مدینہ طیبہ آیا تو اُس نے اہلِ مدینہ میں بہت مال تقسیم کیا اور حضرت عبداللہ محضؒ کی، خاص طور پر، پانچ سو دینار (مساوی تقریباً ۹۴ لاکھ روپے) کے ہدیہ کے ذریعے خدمت کی۔ [3]

جہاں اللہ تعالیٰ نے آپؒ کو دنیوی عزت سے نوازا تھا جیسا کہ ابھی گزرا، وہاں دینی عزت و تکریم سے بھی خوب سرفراز فرمایا تھا، چنانچہ مصعب بن عبداللہ کہتے ہیں: میں نے علماء کو کسی ہستی کا اتنا احترام و اکرام کرتے ہوئے نہیں دیکھا جتنا انہیں، حضرت عبداللہ محضؒ کا کرتے ہوئے دیکھا ہے۔ [4]

---

(۱) الطبقات الکبری: ۳۸۶/۵، وتاریخ اسلام ۱۹۲/۹، والمنتخب من ذیل المذیل، ص:۱۳۶، وتاریخ دمشق: ۳۸۷/۲۷، وتاریخ الطبری: ۲۵۰/۱۱

(۲) علماء أهل البيت في عصر التابعين، ص: ۲۰۶، وتاريخ بغداد وذيوله: ۳۰۴/۷، ومقاتل الطالبين، ص: ۱۶۲

(۳) الكامل في التاريخ: ۱۷/۵، مع الاعلام للزركلی: ۵۹/۱

(۴) مختصر تاريخ دمشق: ۱۱۰/۱۲، وتاريخ بغداد وذيوله: ۴۳۹/۹، ۴۳۸، وتهذيب الكمال: ۴۱۶/۱۴

تقدسِ حج کی خاطر جنگ رکوانا:

۱۲۹ ہجری میں عبداللہ بن یحییٰ کندی جو "طالب حق" کے نام سے معروف تھا نے "حَضرَ مَوت" (ملکِ یمن کا مشہور صوبہ ہے ۱) پر حملہ کر دیا، اُس وقت "حضر موت" پر ابراہیم بن جابر کندی بطورِ گورنر متعین تھا، چنانچہ اس نے بغیر جنگ کے ابراہیم پر قابو پالیا اور اُسے وہاں سے نکال دیا۔ اس کے بعد "اِباضِیَّہ" (خوارج کا ایک فرقہ جو عبداللہ بن اِباض تمیمی کی طرف منسوب ہے ۲) اِس کے پاس جمع ہو گئے اور اِس کے ہاتھ پر بیعت بھی کر لی۔ ویسے اس کا ساتھ دینے والوں میں زیادہ تعداد اہلِ بصرہ کی تھی اور اب حضر موت کے لوگ بھی اس کے ساتھ ہو گئے۔

پھر اس نے "صَنعاء" (یمن کا مرکزی اور سب سے بڑا شہر ہے ۳) کا رخ کیا، اُس کا گورنر قاسم بن عمر ثقفی تھا۔ طالبِ حق، "شُراۃ (خوارج کا ایک فرقہ)" کے دو ہزار افراد پر مشتمل لشکر کو لے کر آگے بڑھا جبکہ قاسم تقریباً تیس ہزار فوجیوں کے لشکر کے ساتھ مقابلہ میں آیا۔ یمن کے صوبہ "اَبْیَن" کے "جالح" نامی گاؤں میں آمنا سامنا ہوا، جانبین سے نہایت سخت جنگ ہوئی، بالآخر قاسم کو شکست سے دوچار ہونا پڑا، اور طالبِ حق نے، اس کے فوجیوں کو تہِ تیغ کرتے ہوئے، صنعاء کی طرف پیش قدمی جاری رکھی۔ صنعاء کے قریب قاسم نے شہر کے باہر کئی خندقیں کھود رکھی تھیں تاکہ دشمن کو اندر داخلے سے روکا جا سکے مگر طالبِ حق نے رات کو اچانک اس کے لشکر پر حملہ کر دیا اور اگلی صبح ہی وہ خندقیں عبور کر ڈالیں۔ یہ دیکھ کر قاسم شہر چھوڑ کر فرار ہو گیا، اور اُس کی فوج میں سے صَلت بن یوسف سمیت لوگوں کی ایک بڑی تعداد کو قتل کر دیا گیا۔ اس طرح طالبِ حق، صنعاء میں فاتحانہ داخل ہو گیا، اور وہاں کے اموال وخزائن پر قبضہ کر لیا جس سے اِس کو بہت تقویت ملی اور پھر وہاں کئی مہینے قیام کیا۔

اس کے بعد مکہ مکرمہ پر قبضہ کرنے کے لیے قبیلۂ اَزد کے ایک شخص "بلج بن عُقبہ" کو مکہ کی جانب بھیجا پھر اس کے پیچھے ابوحمزہ مختار بن عوف اَزدی کو دس ہزار کا لشکر دے کر روانہ کیا اور اسے کہا کہ مکہ میں جا کر پڑاؤ ڈالے۔ بلج بن عقبہ، حملہ کے ارادے سے، لشکر لے کر جب طائف کے راستے سے مکہ کے قریب پہنچا تو وہ ایامِ حج تھے اور لوگ اس وقت عرفات میں جمع تھے کہ، ان کی بے خبری میں، ایک دم لشکر کے گھوڑے ان کے سامنے نمودار

---

(۱) معجم البلدان: ۲/۲۷۰، مع المعالم الاثیرۃ فی السنۃ والسیرۃ ص: ۱۰۱

(۲) الملل والنحل: ۱/۱۳۴، مع القاموس الوحید، ص: ۱۰۵

(۳) صفۃ جزیرۃ العرب ص: ۵۵، مع آکام المرجان فی ذکر المدائن المشہورۃ فی کل مکان، ص: ۴۵

ہوئے، جنگ کی یہ صورتِ حال دیکھ کر سب لوگ عبدالواحد بن سلیمان جو کہ عبدالملک بن مروان کا پوتا تھا کے پاس جمع ہو گئے اور وہ اس وقت مکہ مکرمہ و مدینہ منورہ کا گورنر تھا۔ عبدالواحد نے ان سے جنگ کو ناپسند سمجھا مگر دشمن کا لشکر مسلح ہو کر سر پر چڑھ چکا تھا، جب جنگ کی صورتِ حال قائم ہوتی ہوئی دکھائی دی تو حضرت عبداللہ بن حسن سلامُ اللہ وَ رحمۃُ علیہ نے ان کے بیچ میں جا کر لے دے کر ان سے اس بات کا عہد لیا کہ جب تک ایامِ حج مکمل نہ ہو جائیں اس وقت تک وہ امن سے رہیں اور کوئی جنگی اقدام نہ کریں، وہ آپؒ کی اس بات پر قائل ہو گئے اور انہوں نے ایامِ حج میں کوئی پیش رفت نہ کی۔ اِدھر سے عبدالواحد نے بھی لوگوں کے ہمراہ توقف اختیار کیا اور اُدھر سے بلج بن مثنّی بھی اپنے لشکر کے ہمراہ خاموش رہا، یہاں تک کہ حجاجِ کرام کے عرفات، مزدلفہ اور منیٰ کے ایام امن و عافیت سے گزر گئے۔[1]

حسنِ معاشرت:

حضرت داود عطار، بیان کرتے ہیں: میں نے حضرت عبداللہ محضؒ کو دیکھا کہ وہ اپنے ماں شریک بھائی ''محمد بن عبداللہ بن عمروؒ'' کے پاس (کسی کام سے) آئے مگر دیکھا کہ وہ سوئے ہوئے ہیں، اس لیے انہیں کچھ نہیں کہا، بس نیچے جھک کر ان کا بوسہ لیا اور ان کو جگائے بغیر واپس چلے گئے۔[2]

اختلافات کے باوجود دوسرے کی عزت واحترام کرنا:

حضرت عبداللہ سلامُ اللہ وَ رحمۃُ علیہ میں یہ عظیم وصف تھا کہ وہ کسی سے اختلاف ہو جانے کے بعد بھی اپنے اس مسلمان بھائی کی عزت و احترام بجالانے میں ذرہ بھر کمی نہ کرتے تھے بلکہ باقاعدہ اہتمام کے ساتھ اس کی تعظیم و تکریم کرتے تھے جیسا کہ درج ذیل واقعہ اس کا مکمل عکاس ہے:

ابو معمر سعید بن خثیم کہتے ہیں: زید بن علی بن حسین اور عبداللہ بن حسن مثنّیٰ میں ''صدقاتِ علیؓ'' کے معاملہ میں اختلاف ہو گیا چنانچہ یہ دونوں قاضیٔ وقت کے پاس اپنے مقدمے کے سلسلہ میں جایا کرتے تھے۔ جب یہ قاضی کے

---

(۱) تاریخ خلیفۃ بن خیاط ص: ۳۸۴، مع تاریخ الاسلام: ۸/۲۴، بتسهیل، وکذا ینظر ایضاً: الکامل فی التاریخ: ۴/۳۷۱، واتحاف الوری باخبار ام القری: ۲/۱۶۰، ۱۵۹، وشفاء الغرام باخبار البلد الحرام: ۲/۲۰۶، وتاریخ ابن خلدون: ۳/۲۱۰

(۲) تاریخ الإسلام للذهبي: ۹/۲۷۴

پاس سے اٹھ کر واپس آنے لگتے تو عبداللہ بن حسن، جلدی سے زید بن علی کی سواری کے پاس پہنچتے اور اُن کے لیے اِس کے رکاب (پاؤں رکھنے کی جگہ) پکڑ کر کھڑے ہوجاتے تاکہ وہ بآسانی رکاب پر پاؤں رکھ کر اپنی سواری پر سوار ہو سکیں۔[1]

فائدہ: آپؒ کی مقدس زندگی کے اس منور پہلو سے ہمیں سبق حاصل کرنا چاہیے کہ دینی یا دنیوی امور میں کسی سے اختلاف ہوجانا ایک فطری چیز ہے مگر اس اختلاف کے بعد دلوں میں اختلاف نہیں ہونا چاہیے بلکہ اس اختلافی معاملہ سے ماوراء، باقی تمام امور و معاملات میں آپس میں پیار و محبت کے ساتھ رہنا چاہیے کہ یہی قرآن و سنت کی تعلیم ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس کی توفیق عطا فرمائے کہ بلاشبہ اس پر عمل پیرا ہونے کے لیے غیر معمولی محنت و مجاہدہ کی ضرورت ہے۔

خوش طبعی و ہنسی مذاق:

حضرت عبداللہ بن ابی عُبیدہ کہتے ہیں: میں امام عبداللہ محضؒ سے ملاقات کے لیے، شہر سے باہر ان کی جگہ پر گیا۔ ابن ہَرمَہ بھی آپؒ سے ملاقات کے لیے آئے ہوئے تھے، پھر ایک اَسلمی (قبیلہ اسلم کا شخص) بھی وہاں آگیا۔ تو ہم وہاں اکٹھے بیٹھے تھے کہ ابن ہَرمہ نے آپؒ سے کہا: اللہ آپ کا بھلا کرے، آپ ذرا اس اَسلمی سے اجازت لیں تاکہ میں آپ کو اپنا اور اس کا ایک قصہ سناؤں۔ آپؒ نے اسلمی سے اجازت طلب کی، اس نے اجازت دے دی۔

اب ابن ہَرمہ نے وہ قصہ سنانا شروع کیا اور کہا:

ایک دفعہ میرے کچھ اونٹ بھاگ گئے، میں انہیں ڈھونڈنے کے لیے نکلا ہوا تھا کہ مجھے بھوک نے آستایا اور میں جا کر اس اسلمی کا مہمان بن گیا۔ اس نے میری بڑی خاطر تواضع کی حتی کہ میرے لیے بکری ذبح کی اور روٹیاں پکوائیں، پھر جب صبح ہوئی تو میں واپس آگیا۔ کچھ عرصہ بعد پھر میں اپنے بھاگے ہوئے اونٹوں کی تلاش میں نکلا ہوا تھا اور بھوک سے بے چین ہوا تو دوبارہ اِسی اَسلمی کے پاس مہمان جا بنا، اب اس نے صرف کھجور اور دودھ سے میری ضیافت کی۔ تیسری دفعہ پھر اسی طرح اونٹوں کے پیچھے جانے کی نوبت آئی اور اسی طرح بھوک سے لاچار ہوا تو میں نے جی میں کہا: بھوک سے تو وہ کھجور اور دودھ بہتر ہے، چنانچہ میں پھر جا کر اس کا مہمان ہوگیا، مگر اس نے اس بار مجھے کھٹا

---

(۱) مقاتل الطالبین ص: ۱۲۶، وعلماء اهل البيت في عصر التابعین، ص: ۱۷۴

دودھ پیش کیا۔

ابن ہَرمہ کی بات مکمل ہوگئی اور اب اسلمی نے آپؒ سے کہا: حضرت! اس کی درخواست پر آپؒ نے مجھ سے اجازت لی تھی اور اب آپؒ اس سے اجازت طلب کریں تاکہ میں بتاؤں کہ میں نے یہ سب کچھ کیوں کیا؟ آپؒ کی طلبِ اجازت پر ابن ہَرمہ نے اجازت دی اور اسلمی نے قصہ بیان کرنا شروع کر دیا، کہا:

پہلی دفعہ جب یہ میرا مہمان بنا تو میں نے اس کا تعارف پوچھا: اس نے کہا: میں قریش میں سے ہوں، چنانچہ میں نے قریش کا نام سن کر، کہ وہ اونچے اور قابلِ احترام لوگ ہیں، اس کے اعزاز واکرام میں بکری ذبح کی جیسا کہ اس نے خود بتایا۔ واللہ! میرے پاس اس بکری کے علاوہ کچھ اور ہوتا تو میں، اس کی یہ بات سن کر کہ وہ اہلِ قریش میں سے ہے، اُس چیز کو بھی ذبح کر دیتا مگر میرے پاس اُس وقت صرف یہی ایک بکری ہی تھی۔ بہرحال جب صبح ہوئی اور یہ میرے پاس سے چلا گیا تو اہلِ محلہ میرے پاس آ گئے، انہوں نے مجھ سے دریافت کیا: رات جو مہمان تمہارے پاس تھا، وہ کون تھا؟ میں نے کہا: قریش کا ایک شخص تھا۔

انہوں نے کہا: کہاں وہ قریش کا تھا؟ وہ تو ان کا بس ایک ''لے پالک'' تھا، وہ اپنے نسب کے لحاظ سے قریشی تو نہیں تھا۔ میں خاموش ہوگیا۔ اگلی دفعہ جب یہ میرے ہاں مہمان ہوا تو میں نے اسے اس کی حیثیت کے موافق کھجور اور دودھ پیش کیا کہ اگرچہ یہ قریشی نہ سہی، لیکن انہی میں رہنے والا اور ان کا لے پالک تو ہے اور میں نے جی میں کہا کہ قریش کا لے پالک، دوسروں سے تو کم از کم بہتر ہے۔ جب صبح کو یہ چلا گیا تو پھر اہلِ محلہ میرے پاس آ گئے اور مجھ سے وہی سوال کیا کہ گزشتہ شب تمہارے پاس کون مہمان تھا؟ میں نے کہا: وہی شخص جس کے بارے میں تم لوگوں نے مجھے بتایا تھا کہ وہ لے پالک قریشی ہے۔ وہ کہنے لگے: واللہ! اصل میں تو وہ قریش کا لے پالک بھی نہیں ہے بلکہ درحقیقت وہ قریش کے لے پالکوں کا لے پالک ہے، جب میں نے یہ سنا تو پھر تیسری بار میں نے اسے کھٹا دودھ ہی پیش کرنا تھا۔

اس کے بعد اسلمی کہنے لگا: وَاللهِ لَوْ كَانَ عِنْدِي شَرٌّ مِنْهُ لَقَرَيْتُهُ إِيَّاهُ'' واللہ! اس دفعہ اگر میرے پاس کھٹے دودھ سے بھی زیادہ کوئی خراب چیز ہوتی تو میں اس کو وہی دیتا''۔

یہ قصہ سن کر حضرت عبداللہ بھی بہت ہنسے اور باقی بھی آپؒ کے ساتھ خوب ہنسے۔[1]

---

[1] انظر - بتسهیل -: التذكرة الحمدونية: ٢/٣٣٨

ارشادات ونصائح:

رسول اللہ ﷺ کی آل بھی عجب، اعلیٰ ونرالا مقام رکھتی ہے کہ اُن کے قیمتی ، رہنما نصائح سے ہر زمانے میں امت فیض یاب ہوتی رہی ہے، اسی طرح آپ ﷺ کی آل میں سے ایک عظیم ہستی حضرت امام عبداللہ محضؒ کے ارشادات ونصائح کا بھی ایک گراں قدر وسیع تر ذخیرہ امت کے ہر طبقے کو مسلسل فیض پہنچاتا ہوا ہم تک پہنچا ہے جس کا کچھ نمونہ درج ذیل ہے:

(۱) کسی کو تکلیف نہ دینا، بداخلاقی سے دور رہنا، خوب سخاوت ودریا دِلی سے کام لینا، اور کسی مقام پر اگر تم کوئی گفتگو کرنا چاہو تو بولنے سے پہلے اچھی طرح غور وفکر کر لینا کیونکہ بات چیت کے دوران کچھ لمحات ایسے ہوتے ہیں کہ جن میں غلطی نہایت نقصان دہ ثابت ہوتی ہے اور پھر اس کی اصلاح سے بھی کوئی خاطر خواہ فائدہ نہیں ہوتا۔[1]

(۲) جاہل شخص سے مشورہ کرنے سے بچنا اگرچہ وہ تیرا ہمدرد ہو، اسی طرح اُس عقلمند سے بھی مشورہ نہ کرنا جو خائن ودھوکے باز ہو یا تیرا دشمن ہو کہ وہ اپنے مشورہ کے ذریعے تمہیں ہلاک کر ڈالے گا۔[2]

(۳) اُس وقت تک کوئی کام نہ کرنا جب تک اس بات کا یقین نہ ہو چلے کہ اس کا انجام تیری ہلاکت کا باعث نہیں ہوگا اور اس کا نتیجہ تیرے لیے نقصان دہ ثابت نہیں ہوگا۔[3]

(۴) کامل عقل والا، سوچ بچار کے بعد مشورہ دیتا ہے جبکہ کم عقل شخص نہ رائے اور مشورہ دینے سے پہلے غور کرتا ہے اور نہ ہی بعد میں سوچتا ہے۔[4]

(۵) لوگوں کی دشمنی سے بچنا کیونکہ تم بردبار انسان کی ''تدبیر'' یا پھر جاہل کمینے شخص کی ''اچانک شرارت'' کو مٹا نہیں سکتے۔[5]

---

(۱) زهر الآداب: ۱/ ۱۲۰، مع التذكرة الحمدونية: ۳/ ۳۱۶، وامالي اليزيدي، ص: ۱۵۲

(۲) :زهر الآداب: ۱/ ۱۲۰، مع امالي اليزيدي، ص: ۱۵۳، والبيان والتبيين: ۱/ ۲۷۰، ومثله في أدب الدنيا والدين ص: ۳۰۱

(۳) :التذكرة الحمدونية: ۳/ ۳۱۶، وزهر الآداب: ۱/ ۱۲۰

(۴) المقتطف من أزاهر الطرف: ۱/ ۵۷

(۵) مختصر تاريخ دمشق: ۱۲/ ۱۱۳، ومحاضرات الادباء: ۱/ ۳۰۴، والشكوى والعتاب، ص: ۷۰، وقوت ا لقلوب: ۲/ ۳۷۳، وموعظة المومنين، ص: ۱۳۴، وروض الاخيار ص: ۸۹، مع امالي اليزيدي، ص: ۱۵۳

(۶) جھگڑا اتنی بُری شے ہے کہ یہ پرانی سے پرانی دوستی کو تباہ اور مضبوط سے مضبوط تعلق کو توڑ دیتا ہے، اور اس کا کم سے کم نقصان یہ ہوتا ہے کہ اس سے جانبین کی طرف سے ایک دوسرے پر غالب آنے اور اُس کو نیچا کرنے کی کوشش شروع ہو جاتی ہے اور پھر یہی چیز باہمی تعلق کے ٹوٹنے کا بڑا مضبوط ذریعہ بن کر ابھرتی ہے۔[1]

(۷) ایک مخصوص وقت میں کسی کام کا ہو سکنا ممکن ہو اُس وقت کے آنے سے پہلے جلد بازی سے کام لینا اور موقع گزر جانے کے بعد تحمل و بردباری اختیار کرنا، بڑی غلطیوں میں سے ایک غلطی ہے۔[2]

(۸) اپنے ایک دوست کو لکھا: تقویٰ کو لازم پکڑو کیونکہ جو شخص تقویٰ اختیار کرتا ہے اللہ تعالیٰ اس کے لیے ناگوار مقامات میں سے راستہ نکالتا ہے نیز اس کو وہاں سے رزق دیتا ہے جہاں سے اسے گمان بھی نہیں ہوتا۔[3]

(۹) جب داؤد بن علی (جو سفاح عباسی کا چچا تھا[4]) نے حجاز میں بنو امیہ کے قتل کا فیصلہ کیا تو آپؒ نے اسے نصیحت کرتے ہوئے فرمایا: چچا جی! جب آپ اپنے ہم پلہ لوگوں کے قتل میں اس طرح جلدی کریں گے تو پھر اپنی بادشاہت کا فخر آپ کن لوگوں پر کریں گے؟ لہٰذا تم ان سے درگزر کرو، اللہ تعالیٰ تم سے درگزر کرے گا۔ آپؒ کی دور اندیشی اور بصیرتِ کاملہ پر مبنی یہ نصیحت اُسے پسند آئی اور پھر اِسی کے مطابق اُس نے اپنا فیصلہ تبدیل کر دیا۔[5]

(۱۰) آپؒ نے اپنے ایک بیٹے سے کہا کہ فلاں بچے نے (قرآن کی) تعلیم مکمل کر لی ہے اور اب استاد کی طرف سے کچھ نہ کچھ مطالبہ ہے۔ بیٹے نے کہا: ابا جان! وہ کیا چیز چاہتے ہیں؟ اُنہیں ایک درہم دے دیں۔ آپؒ نے فرمایا: سبحان اللہ (اتنی کم مقدار)! اُس نے کہا تو پھر اُنہیں دو درہم دے دیں۔ آپؒ نے فرمایا: اِس سے تو وہ خوش نہیں ہوں گے۔ حضرت حسن نے فرمایا کہ آج سے پہلے، جب کسی لڑکے کی اس طرح تعلیم مکمل ہو جاتی تو لوگ اونٹ ذبح کرتے اور کھانے کا انتظام کرتے۔[6]

---

(۱) مختصر تاریخ دمشق: ۱۲/۱۱۳، وزهر الآداب: ۱/۱۰۳، والتذكرة الحمدونية: ۱/۳۸۵، ومجمع الآداب: ۳/۴۶

(۲) المقتطف من أزاهر الطرف: ۱/۵۰، ومختصر تاریخ دمشق: ۱۲/۱۱۴، والتذكرة الحمدونية: ۳/۳۳۴

(۳) نثر الدر في المحاضرات: ۱/۲۵۴، وزهر الآداب وثمر الالباب: ۱/۱۲۰

(۴) الأعلام للزركلي: ۲/۳۳۳

(۵) المجموع اللفيف ص: ۱۸۰، والتذكرة الحمدونية: ۲/۴۰، ونثر الدر في المحاضرات: ۱/۲۵۴

(۶) فص الخواتم فيما قيل في الولائم، ص: ۲۶

طوافِ بیت اللہ اور ایک خاتون کو نصیحت:

سلیمان بن ابی شیخ کہتے ہیں: ایک دفعہ حضرت عبداللہ بن حسنؒ بیت اللہ کا طواف کر رہے تھے، اسی اثناء میں انہوں نے ایک عورت کو دیکھا جو طواف کے دوران یہ اشعار پڑھ رہی تھی:

لَا یَقْبَلُ اللّٰہُ مِنْ مَعْشُوقَۃٍ عَمَلاً... یَوْماً، وَعَاشِقُھَا غَضْبَانُ مَھْجُوْرُ

وَکَیْفَ یَأْجُرُھَا فِي قَتْلِ عَاشِقِھَا،... لٰکِنَّ عَاشِقَھَا فِي ذَاکَ مَأْجُوْرُ

[اللہ تعالی معشوقہ کے کسی عمل کو کبھی بھی قبول نہیں کرے گا جبکہ اس کا عاشق ناراض ہو کر اس سے جدا ہو چکا ہو۔ اور اس معشوقہ کو قتلِ عاشق میں اللہ تعالی کیسے اجر دے گا، ہاں اس کے عاشق کو البتہ اس میں ضرور اجر ملے گا۔]

حضرت عبداللہ محضؒ نے اس عورت سے کہا: اللہ کی بندی! تجھے لحاظ نہیں آتا کہ تُو اس جیسی جگہ میں اس جیسے اشعار کہہ رہی ہے۔ اس نے کہا: ارے نوجوان! کیا تم ادبی ذوق نہیں رکھتے؟ آپؒ نے کہا: کیوں نہیں! اس نے کہا: کیا تم اشعار نہیں کہا کرتے؟ آپؒ نے کہا: کیوں نہیں! وہ بولی: تو پھر کیا تم نے شاعر کو یہ کہتے ہوئے نہیں سنا:

بِیضٌ غَرَائِرُ مَا ھَمَمْنَ بِرِیبَۃٍ... کَظِبَاءِ مَکَّۃَ، صَیْدُھُنَّ حَرَامُ

یُحْسَبْنَ مِنْ لِینِ الْحَدِیثِ زَوَانِیاً،... وَیَصُدُّھُنَّ عَنِ الْخَنَا الْإِسْلَامُ

[وہ سفید اور روشن چہروں والی عورتیں جو کسی تہمت آمیز کام کا ارادہ تک نہیں رکھتیں، ان کی مثال ایسے ہے جیسے مکہ مکرمہ کی ہرنیاں کہ ان کا شکار حرام ہوتا ہے (یعنی جس طرح وہ پُر امن پھرتی رہتی ہیں انہیں کوئی ہاتھ نہیں لگاتا، اسی طرح وہ خواتین بھی پُر امن ہوتی ہیں اور اُنہیں کوئی میلا ہاتھ نہیں لگا سکتا جن کا اپنا ارادہ بُرا نہ ہو)۔

وہ (بداخلاقی وسخت مزاجی سے اجتناب کی بناء پر) اپنی قدرے نرم گفتگو کی وجہ سے، بظاہر بدکار عورتیں لگتی ہیں حالانکہ اسلام انہیں فحش گوئی سے مکمل باز رکھتا ہے (اور وہ ہر قسمی فحش سے دور رہتی ہیں)]۔[1]

(1) مختصر تاریخ دمشق: ۱۲/۱۱۴، ومصارع العشاق: ۲/۱۷۷، والجلیس الصالح، ص: ۲۶۹، مع ثمار القلوب، ص: ۳۰۸،

ملحوظة: وقد تداول كثير من المصادر البيتين الأخيرين - بنفس هذه الكلمات أو بتغيير يسير فيها - خاصة، نحو البيان والتبيين: ۱/۲۳۱، والشكوى والعتاب ص: ۱۵۱ وزهر الآداب وثمر الألباب: ۱/۱۲۱، وربيع الأبرار ونصوص الأخيار: ۳/۲۱۷ والحماسة البصرية: ۲/۱۱۱ والكشكول: ۱/۲۲۰ و ۱/۱۹ وديوان الصبابة، ص: ۱۷۹ وديوان عروة بن أذينة، ص: ۸۳، وديوان بشار بن برد، ص: ۱۰۴۶ والعقد المفصل، ص: ۱۵۹ ونزهة الأبصار، ص: ۲۵۷ وغيرها.

منصور عباسی کی طرف سے آپؒ کی گرفتاری اور شہادت:

بنو عباس کے بادشاہِ اول ''ابو العباس سفاح'' کا رویہ تو آپؒ کے ساتھ اچھا رہا اور وہ اظہارِ ہمدردی کرتا رہا جیسا کہ اس کا کچھ تذکرہ اوپر گزر چکا ہے، مگر بادشاہِ دوم ''ابو جعفر منصور عباسی'' کی جب حکومت آئی تو اس نے آپؒ کے ساتھ روا رکھی جانے والی ہمدردی اور کیے جانے والے اعزاز و اکرام کو بالکل الٹ کر رکھ دیا، چنانچہ اِس کے زیرِ سرپرستی اِسی کے حکم پر آپؒ اور آپؒ کے خاندان کے دیگر افراد کو قید کر کے، ناگفتہ بہ حالت میں، مدینہ طیبہ کی جیل میں ڈال دیا گیا اور پھر وہاں سے، کسمپرسی کی حالتِ زار میں، عراق کی جیلِ ہاشمیہ میں منصور کے پاس پہنچا دیا گیا جہاں انہیں جیل کی تنگ کوٹھڑی میں بند رکھا گیا۔ بہرحال مجموعی حیثیت سے ان حضرات پر بہت سختیاں اور تشدد کیے گئے جس کا تفصیلی بیان، چند ہی صفحات بعد، امام نفس زکیہ کی سیرت کے تحت آئندہ آرہا ہے، یہاں اختصار پر اکتفاء کیا جاتا ہے۔ امام عبداللہ محض رحمہ اللہ کا پھر وہیں جیل میں ہی انتقال ہوا۔[1]

آپؒ کا جب جیل میں انتقال ہو گیا تو عیسیٰ بن موسیٰؒ (یہ منصور کے چچا تھے اور شاہی خاندان کا فرد ہونے کے باوجود امورِ حکومت سے دور رہے اور علم و تقویٰ میں زندگی گزار دی،[2]) منصور کے پاس آئے اور اسے کہا کہ مجھے یہ بات اچھی نہیں لگی کہ بنو ہاشم کا یہ سردار یہاں جیل میں اس طرح (بے دردی سے) مر جائے۔

اس پر منصور، اظہارِ دکھ میں ساتھ دینے کے بجائے، الٹا کہنے لگا: مَا عَلِمْتُ أَنَّ الخِلَافَةَ لَنَا وفِينَا إِلَّا هٰذَا اليَوْمَ ''مجھے تو یقین ہی آج آیا ہے کہ یہ بادشاہت ہماری ہے اور آئندہ ہم میں رہے گی''۔[3]

حافظ ابن کثیرؒ نے لکھا ہے کہ زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ (جیل میں[4]) آپؒ کی یہ موت، طبعی نہیں تھی بلکہ آپؒ کو قتل کیا گیا تھا۔[5]

---

(۱) راجع: البداية والنهاية طهجر: ۳۸۱/۱۳، مع شذرات الذهب: ۲۰۵/۲، والطبقات الكبرى: ۳۸۸/۵، ۳۸۷، وتاريخ الطبرى: ۶۵۱/۱۱

(۲) الأعلام للزركلي: ۱۰۵/۵، مع سير اعلام النبلاء، ۳۰۹/۷

(۳) مجمع الآداب في معجم الألقاب: ۳۶/۳

(۴) مقاتل الطالبيين ص: ۱۷۱

(۵) البداية والنهاية طهجر: ۳۵۲/۱۳

ہاشمیہ کے جیل میں آپ ؒ کی یہ شہادت بعض کے بیان کے موافق، ۱۴۴ھ میں ہوئی، [1] جبکہ دیگر بعض مؤرخین کے نزدیک ۱۴۵ھ میں ہوئی۔ [2] بظاہر یہ صحیح معلوم ہوتا ہے کہ آپ ؒ کا انتقال ۱۴۴ ہجری کے آخر یا پھر ۱۴۵ ہجری کے آغاز میں ہوا جیسا کہ بعض مؤرخین کی تحریروں میں اس کی وضاحت بھی ملتی ہے۔ [3] اور بوقتِ انتقال آپ ؒ کی عمرِ مبارک ۷۵ برس تھی۔ [4]

---

(۱) مرآۃ الجنان وعبرۃ الیقظان: ۱/۲۳۱، وعلماء أهل البیت في عصر التابعین، ص: ۲۱۸

(۲) الأعلام للزرکلي: ۴/۷۸، والإصابة في تمییز الصحابة: ۵/۱۴۳، والثقات لابن حبان: ۴/۱۲۲، ومجمع الآداب فی معجم الالقاب: ۴/۳۶ و ۵/۳۷، والدر المنثور فی طبقات ربات الخدور ص: ۳۶۱، ومقاتل الطالبین، ص: ۱۷۱

(۳) چونکہ بعض روایات میں آپ ؒ کا انتقال ۱۴۴ ہجری اور بعض دیگر میں ۱۴۵ ہجری میں ہونا مذکور ہے، جیسا کہ گزرا، اس لیے بظاہر یہی صحیح معلوم ہوتا ہے کہ آپ ؒ کا انتقال ۱۴۴ ہجری کے آخر یا پھر ۱۴۵ ہجری کے آغاز میں ہوا اور تاریخ میں عموماً ''کسر'' کا اعتبار نہ ہونے کی وجہ سے کچھ مؤرخین نے ۱۴۴ھ جبکہ دوسروں نے ۱۴۵ھ درج کر دیا ہے، جیسا کہ امام ذہبیؒ کی تحریر میں اس کی وضاحت ملتی ہے، چنانچہ وہ لکھتے ہیں: وفي آخرها، أو في أول سنة خمس، توفي عبدالله بن حسن، العبر في خبر من غبر: ۱/۱۵۱

اس امر کی تائیدِ مزید اس سے بھی ہوتی ہے کہ ''تاریخ الاسلام'' میں آپ ؒ کا سنِ وفات، صراحت کے ساتھ ''۱۴۴ ہجری کا آخر'' اور ''تقریب التہذیب'' میں ''۱۴۵ ہجری کا آغاز'' لکھا ہے، فإلیک نصهما: وَمَاتَ فِي أَوَاخِرِ سنة أربع وأربعين ومائة، تاريخ الإسلام: ۹/۹۲، مات في أوائل سنة خمس وأربعين وله خمس وسبعون، تقريب التهذيب ص: ۳۰۰

(۴) تاریخ بغداد: ۱۱/۹۰، والبداية والنهاية ط هجر: ۱۳/۳۸۱، والاصابة فی تمییز الصحابة: ۵/۱۴۳، و تهذیب الکمال فی اسماء الرجال: ۱۴/۴۱۷، ومقاتل الطالبین، ص: ۱۷۱

فضائل وخصائص

ویسے تو نجانے اللہ تعالیٰ نے کتنے ہی فضائل وخصائص سے آپؒ کو نوازا تھا، مگر آپؒ کے جو اوصاف ومناقب مختلف کتب میں منقول ہوئے ہیں، ان میں سے چند یہاں درج کیے جارہے ہیں:

۱۔ آپؒ عبادت میں بہت مشہور تھے، رات بھر نماز پڑھتے رہتے اور جب رات ختم ہونے لگتی تو توبہ واستغفار میں مشغول ہوجاتے۔[1]

۲۔ اللہ تعالیٰ نے آپؒ کو شرف وعزت، رعب وہیبت، لسانِ شدید (ایسی زبان جو حق کے معاملہ میں سخت ہو اور اس میں کسی رعب اور دباؤ کو قبول نہ کرتی ہو) اور زبانِ فصیح سے سرفراز فرمایا تھا، اس کے ساتھ ساتھ آپؒ صاحب بیان اور قادر الکلام بھی تھے۔[2]

۳۔ آپؒ کا شمار اہلِ مدینہ کے سرداروں، وہاں کے عبادت گزاروں اور بنو ہاشم کے علماء میں ہوتا تھا۔[3]

۴۔ آپؒ کے زمانہ میں آلِ حسنؓ کی ترجمانی ونمائندگی کا سہرہ آپؒ کے سر تھا۔[4]

۵۔ حسن وجمال اور فضل وکمال سے بطورِ خاص آپؒ متصف تھے۔[5]

۶۔ آپؒ بنو ہاشم کی عزت وافتخار، اور ایک جلیل القدر تابعی تھے۔[6]

۷۔ اُس زمانے کے معزز وقابلِ قدر لوگ آپؒ کے برابر کسی کا مقام نہیں سمجھتے تھے۔[7]

۸۔ آپؒ اونچی شان کے مالک، قابلِ اعتماد عالم تھے۔[8]

---

(۱)علماء أهل البيت في عصر التابعين، ص:۱۲۶

(۱)مرآة الجنان وعبرة اليقظان: ۱/۲۳۱، مع تذكرة الخواص من الامة، ص:۲۰۸، والطبقات الكبرى:۵/۳۸۶، وتهذيب الكمال: ۱۴/۴۱۷، ومختصر تاريخ دمشق:۱۲/۱۰۹، وتاريخ الاسلام:۹/۱۹۱

(۳)مشاهير علماء الأمصار ص:۲۰۵

(۴)الإصابة في تمييز الصحابة:۵/۱۴۳

(۵)مجمع الآداب في معجم الألقاب:۵/۳۷

(۶)الفخري في أنساب الطالبيين، ص:۸۵، مع البداية والنهاية طهجر:۱۳/۳۸۱

(۷)علماء أهل البيت في عصر التابعين، ص۱۲۶، ومقاتل الطالبين، ص:۱۶۹

(۸)تقريب التهذيب ص:۳۰۰

۹۔ آپؒ محسن و نفع رساں اور بلند کردار شخصیت تھے۔[1]

۱۰۔ آپؒ عزت و فضیلت کے اعلیٰ مقام پر فائز تھے، حتیٰ کہ آپؒ کے زمانے میں جب یہ سوال کیا جاتا: مَن أكرَمُ النَّاس؟ (سب سے معزز آدمی کون ہے؟) تو جواب میں کہا جاتا: عبداللہ بن حسن، اسی طرح جب یہ پوچھا جاتا: مَن أفضَلُ النَّاس؟ (سب سے افضل آدمی کون ہے؟) تو بھی جواب میں آپؒ کا نام آتا۔[2]

ذیل میں چند اہم عناوین کے تحت آپؒ کے بعض فضائل و خصائص کو ذکر کیا جاتا ہے:

خلافت کی صلاحیت:

اربابِ مشورہ اور اصحابِ بصیرت حضرات کی ایک بڑی تعداد کے نزدیک آپؒ خلیفۃ المسلمین بننے کی مکمل صلاحیت رکھتے تھے،

اور ان میں سے بعض حضرات کو تو اس کی توقع بھی تھی کہ ایک نہ ایک دن آپؒ خلافت سنبھالیں گے جبکہ آپؒ اس معاملے میں بالکل لاتعلق رہتے تھے۔[3]

ابوسلمہ خَلّال (جو سفاح عباسی کا وزیر تھا اور سیاست و امورِ خلافت کی بڑی گہری فہم رکھتا تھا،[4]) نے آپؒ کو ایک خط بھی لکھا تھا جس میں درج تھا کہ میرے نزدیک اِس وقت تمام لوگوں میں سے خلافت کے سب سے زیادہ حقدار آپ ہیں۔[5]

صحابۂ کرامؓ، خصوصاً خلفاء راشدینؓ سے اظہارِ محبت و اعتماد:

آپؒ نے پاؤں میں جب موزے پہنے ہوتے تھے تو پاؤں دھونے کے بجائے اُن موزوں پر مسح کرلیا کرتے تھے (جیسا کہ شرعاً یہ بالکل جائز و درست ہے)۔ ایک مرتبہ کسی شخص نے آپؒ سے دریافت کیا کہ کیا آپ موزوں پر مسح کرتے ہیں؟ آپؒ نے فرمایا: جی ہاں! اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ بھی کیا کرتے تھے۔ سائل نے کہا: جی! میں آپ

---

(۱) شذرات الذهب في أخبار من ذهب: ۲/۲۰۴، والمعارف: ۱/۲۱۲

(۲) نثر الدر في المحاضرات: ۱/۲۵۶

(۳) علماء أهل البيت في عصر التابعين، ص: ۱۶۷

(۴) الأعلام للزركلي: ۲/۲۶۴

(۵) مجمع الآداب في معجم الألقاب: ۵/۳۷

سے پوچھ رہا ہوں کہ کیا آپ مسح کرتے ہیں؟ آپؒ نے ناراض ہوکر فرمایا: یہ دلیل تمہیں زیادہ لاجواب کرنے والی تھی۔ میں تمہیں دلیل میں حضرت عمرؓ کا عمل بتاتا ہوں اور تم میری رائے پوچھتے ہو!! عُمَرُ خَيرٌ مِنِّي وَمِلْءِ الأَرْضِ مِن مِثْلِي "حضرت عمرؓ تو مجھ سے اور میرے جیسوں سے پوری زمین بھر جائے، اُن سب سے بہتر ہیں"۔ پھر فرمایا: میں اس وقت قبرِ رسول ﷺ اور منبرِ نبوی کے درمیان موجود ہوں، اے اللہ! میرے ظاہر اور میرے باطن میں یہی بات ہے جو میں نے کہی ہے۔[1]

اسی طرح کا ایک مضمون آپؒ کے آزاد کردہ غلام "حفص بن عمر" سے بھی مروی ہے، ان کا بیان ہے: میں نے دیکھا کہ حضرت عبداللہ محضؒ وضو کے دوران موزوں پر مسح کر رہے تھے۔ میں نے پوچھا: کیا آپ ان پر مسح کرتے ہیں؟ فرمایا: جی ہاں! اور حضرت عمرؓ بھی مسح کرتے تھے، اور جس نے حضرت عمرؓ کو، اپنے اور اللہ کے درمیان کرلیا یقیناً اُس نے ایک مضبوط دلیل کا سہارا لے لیا۔[2]

ابوخالد الاحمر کہتے ہیں: میں نے حضرت عبداللہ محضؒ سے ایک دفعہ حضرت ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما کے متعلق دریافت کیا، آپؒ نے فرمایا: میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان حضرات پر اپنی ڈھیروں رحمتیں نازل فرمائے اور جو شخص ان حضرات کے حق میں دعا نہ کرے اللہ تعالیٰ اسے اپنی رحمتوں سے محروم فرمائے۔[3]

محمد بن قاسم اسدی بیان کرتے ہیں: میں نے حضرت عبداللہ محضؒ کو دیکھا کہ ایک بار انہوں نے حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کی (مظلومانہ) شہادت کا تذکرہ کیا پھر رونا شروع کر دیا۔ اتنا روئے کہ ڈاڑھی مبارک گیلی ہوگئی اور اس دوران کپڑوں پر بھی آنسو مبارک گرتے رہے۔[4]

دورانِ سفر ساتھیوں کے مزاج کی رعایت رکھنا:

عبداللہ بن ابی عُبیدہ کہتے ہیں: میں اور اَحوص بن محمد انصاری، امام عبداللہ محضؒ کے ساتھ حج کے لیے روانہ ہوئے۔ جب ہم مکہ مکرمہ کے قریب مقامِ قُدید پر پہنچے تو ہم نے حضرت عبداللہؒ سے عرض کیا: کیا ہی اچھا ہو اگر آپ

---

(۱) ينظر: سمط النجوم العوالي في أنباء الأوائل والتوالي: ۳۹۰/۲، ومختصر تاريخ دمشق: ۱۱۱/۱۲

(۲) الطبقات الكبرى: ۳۸۶/۵، والمعارف: ۲۱۲/۱، ووفيات الاعيان: ۳۸۸/۶

(۳) مختصر تاريخ دمشق: ۱۱۰/۱۲،

(۴) مختصر تاريخ دمشق: ۱۱۱/۱۲

یہاں سلیمان بن ابی دُباکل خزاعی کو بلوالیں تا کہ وہ ہمیں اپنے کچھ اشعار سنادے!! آپؒ نے (اپنے ساتھیوں کے مزاج اوران کی پسند کی رعایت رکھتے ہوئے) دُباکل کے پاس قاصد بھیج دیا، وہ حاضر خدمت ہوااوراس نے اپنا ایک قصیدہ پڑھ سنایا جس کے ابتدائی اشعار درج ذیل تھے:

يَـــا بَيتَ خَنسَــــاءَ الَّــذِي أَتــجَنَّب... ذَهبَ الزَّمَانُ وحُبُّها لَا يذهَبُ

أَصبَحتُ أمنحُكَ الصُّدودَ وإنَّني... قَسمًا إِلَيكَ مَعَ الصُّدودِ لَأَجنَبُ

مَـــالِي أَحِنُّ إِذا جِمَـــالُكِ قُـــرِّبَتْ... وأُصُــــدُّ عَنــكِ وَأَنتِ مِنِّي أَقــرَبُ

[ارے خنساء کے وہ درودیوار جن سے میں دُور دُور رہتا ہوں! زمانہ گزرتا جارہا ہے مگر اُس کی محبت نہیں جارہی۔ اے خنساء! میں ہر صبح تم سے اپنا خیال ہٹانے کی کوشش کرتا ہوں، مگر میں تمہیں قسم دے کر کہتا ہوں کہ خیالات ہٹانے کے باوجود میرے دل میں تمہاری محبت جاگزیں ہے۔

میں کیا کروں، جب تمہارے اونٹ میرے قریب سے گزرتے ہیں تو میں تمہاری محبت میں مغلوب ہوجاتا ہوں، میں تم سے اپنی توجہ ہٹارہا ہوتا ہوں اور تم عین اسی حالت میں میرے دل کے قریب ہوتی ہو (یعنی خیالات وتوجہ ہٹانے کے باوجود تُم میرے دل سے غائب نہیں ہوتی)]۔[1]

خدمت کا جذبہ:

آپؒ، خود بلند شان کے حامل ہونے کے باوجود، خدمت کے کاموں میں نہایت ذوق وشوق سے حصہ لیا کرتے اور خصوصاً علماء ومحدثین کی حیات وبعداز وفات کی خدمت کو اپنے لیے سرمایۂ سعادت سمجھتے تھے، جیسا کہ درج ذیل واقعہ اس کی مکمل عکاسی کرتا ہے:

عبدالرزاق اپنے والد سے روایت کرتے ہیں: علم وعمل کے امام اور وقت کے محدثِ علّام "طاؤس بن کیسان خولانی" کا، ۱۰۶ھ میں، دورانِ حج منیٰ یا مزدلفہ میں انتقال ہوگیا۔ جنازہ پڑھنے کے لیے اس قدر لوگ جمع ہوگئے کہ جنازہ کا انتظام کرنا ہی مشکل ہوگیا حتیٰ کہ گورنرِ مکہ کو اس کے لیے محافظ دستے بھیجنے پڑے پھر جا کر جنازہ ادا ہوا۔ نمازِ

---

(۱) مختصر تاریخ دمشق: ۲۸/۱۵۷، مع جمع الجواهر للحصری، ص: ۵۸، وخزانة الادب للبغدادی: ۲/۵۲، والجليس الصالح الكافی، ص: ۵۴۹

جنازہ کے بعد غیر معمولی ہجوم کے باعث جب بہت مشقت کے ساتھ چارپائی کو لے جایا جارہا تھا تو میں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ حضرت عبداللہ محضؒ نے اپنے کندھے پر چارپائی کو سنبھال رکھا تھا، حتیٰ کہ اس ہمت طلب خدمت کے دوران آپؒ کی ٹوپی بھی سر سے گر گئی اور آپؒ کی چادر بھی کچھ پھٹ گئی مگر آپؒ نے خدمت سے پہلو تہی نہیں کی بلکہ مسلسل اس خدمت کی انجام دہی میں مشغول رہے یہاں تک کہ چارپائی قبر شریف پر جا اتاری۔[1]

سخاوت:

امام عبداللہ محضؒ اس عالی خاندان کے فرد تھے جو منبعِ سخاوت تھا اور اس حسین گلدستہ کے پھول تھے جس کا ہر ہر پھول سخاوت سے معطر تھا، چنانچہ سخاوت کا یہ وصفِ ممتاز آپؒ میں بھی نمایاں تھا، جس کا ہلکا سا اندازہ درج ذیل چند واقعات سے کیا جاسکتا ہے:

(۱) مشہور کوفی شاعر ''کُمیت بن زَید اَسدی'' مدینہ میں امام باقرؒ کے پاس آیا اور ان کو اپنا ''قصیدۂ میمیہ'' سنایا، جب اس شعر پر پہنچا:

وَقَتِيلٌ بِالطَّفِّ غُودِرَ مِنهُم... بَينَ غَوغَاءِ اُمَّةٍ وَطَغَامٍ

[''طَف'' (کوفہ کے قریب ایک علاقے کا نام، جس کا مشہور مقام ''کربلاء'' ہے[2]) کی شہید ہستی (یعنی امام حسینؓ)، وہ شخصیت ہے جس کو اس امت کے بازاری اور گھٹیا قسم کے لوگوں کے درمیان بے یار و مددگار چھوڑ دیا گیا تھا]

تو امام باقرؒ رو پڑے، پھر اس سے مخاطب ہو کر فرمایا: اے کُمیت! اگر ہمارے پاس مال ہوتا تو ان اشعار کے انعام میں ہم تمہیں ضرور دیتے، مگر اب میں تمہیں وہی جملہ کہہ سکتا ہوں جو رسول اللہ ﷺ نے حضرت حسان بن ثابتؓ سے کہا تھا: ''(اللہ کی طرف سے) جبریلِ امین جیسے فرشتے کی تائید و نصرت تمہارے شاملِ حال رہے جب تک تم (اپنے اشعار سے) ہم اہلِ بیت کا دفاع کرتے رہو۔''

امام باقرؒ سے اٹھنے کے بعد کُمیت، امام عبداللہ محضؒ کے پاس آیا اور ان کے سامنے بھی اشعار کہے۔ ان اشعار کے انعام میں آپؒ نے اسے فرمایا: میری ایک زمین ہے جس پر میں نے چار ہزار دینار (مساوی تقریباً ساڑھے سات

(۱) ینظر: مرآۃ الجنان: ۱/ ۱۸۰، مع حلیۃ الاولیاء: ۳/۴، واعلام للزرکلی: ۳/ ۲۲۴

(۲) معجم البلدان: ۳۶/۴، مع معجم ما استعجم: ۸۹۱/۳، والروض المعطار ص: ۳۹۶

کروڑ روپے) خرچ کیے ہیں، یہ اُس کی رسید ہے اور میں نے تمہارے لیے اس بات کے گواہ بھی بنا دیے ہیں کہ یہ زمین میں نے تمہیں دے دی ہے۔ اس کے بعد وہ رسید آپؒ نے کمیت کو تھما دی۔ کمیت کہنے لگا: میرے ماں باپ آپ پر قربان ہوں! بلاشبہ میں دیگر لوگوں کی مدح میں اشعار کہتا رہتا ہوں اور پھر ان اشعار کے بدلے میں اُن سے دنیا اور مال بھی وصول کرتا ہوں، مگر مجھے میرے اللہ کی قسم! میں نے آپ اہلِ بیت حضرات کی مدح میں یہ اشعار صرف اللہ کی رضا کے لیے کہے ہیں، لہذا اللہ کے لیے کہے جانے والے اِن اشعار کے بدلے میں، مَیں کوئی قیمت اور کسی قسم کا کوئی مال لینے سے قاصر ہوں۔ امام محضؒ دینے پر اور وہ معذرت کرنے پر اصرار کرتے رہے، بالآخر اُس نے یہ رسید لے لی اور روانہ ہو گیا۔

کچھ دنوں بعد وہ دوبارہ امام عبداللہ محضؒ کے پاس آیا اور کہا: اے رسول اللہ ﷺ کے صاحبزادے! مجھے آپ سے ایک کام ہے۔ آپؒ نے فرمایا: وَمَا هِيَ؟ وَكُلُّ حَاجَةٍ لَكَ مَقْضِيَةٌ "بتاؤ، کیا کام ہے؟ تمہاری ہر ضرورت پوری کی جائے گی"۔ کمیت نے کہا: چاہے جو بھی ضرورت ہو؟ آپؒ نے فرمایا: ہاں! جو بھی ضرورت ہو۔ اُس نے وہی رسید نکال کر سامنے رکھ دی اور عرض کی کہ اسے قبول فرمالیں اور اپنی زمین واپس لے لیں۔ یہ سن کر امام محضؒ خاموش رہ گئے، چنانچہ اس نے وہ رسید آپؒ کے سامنے رکھ دی اور آپؒ نے بادلِ نخواستہ وہ قبول فرمالی۔ [1]

(۲) مسعود بن مفضل کا بیان ہے: ابو وجزہ سعدی (جو تابعی تھے، اور مدرسِ قرآن و محدث ہونے کے علاوہ ایک اچھے شاعر بھی تھے [2]) امام محضؒ اور ان کے بھائیوں کے پاس "سُوَیقہ" (مدینہ منورہ کے قریب ایک مقام جہاں آلِ علیؓ رہائش پذیر تھے [3]) آئے، اور لوگ اس سال قحط کا شکار تھے۔ انہوں نے آلِ رسول کی مدح میں یہ اشعار کہے:

أُثْنِي على ابْنَيْ رسولِ الله أفضلَ ما ... أُثْنِي به أحدٌ يوماً على أحَدِ

السيِّدَينِ الكريمَيْ كلِّ منصرَفٍ ... مِنْ وَالِدَيْنِ ومن صِهْرٍ ومن وَلَدِ

ذريةٌ بعضُها مِن بعضِها، عَمِرتْ ... في أصلِ مَجدٍ رفيعِ السَّمْكِ والعَمَدِ

فكرَّمَ اللهُ ذاكَ البيتَ تكرِمةً ... تَبقى وتَخلدُ فيه آخِرَ الأبَدِ

---

(۱) الحياة الأدبية في عصر بني أمية، ص: ۱۹۴، ۱۹۳

(۲) الأعلام للزركلي: ۸/۱۸۵، مع الشعر والشعراء: ۲/۶۹۱

(۳) معجم البلدان: ۳/۲۸۶

مُهَذَّبُونَ هِجَانٌ أُمَّهَاتُهُمُ... إِذَا نُسِبْنَ زُلَالَ البَارِقِ البَرِدِ

بَيْنَ الفَوَاطِمِ مَاذَا تَمَّ مِنْ كَرَمٍ... إِلَى العَوَاتِكِ مَجْدٌ غَيْرُ مُنْتَقَدِ

مَا يَنْتَهِي المَجْدُ إِلَّا فِي بَنِي حَسَنٍ... وَمَا لَهُمْ دُونَهُ مِنْ دَارِ مُلْتَحَدِ

[زمانے میں کبھی کسی نے جس کسی کی جتنی تعریف کی ہو آج میں اس سب سے زیادہ ان دو ہستیوں کی تعریف کرتا ہوں جو رسول اللہ ﷺ کے صاحبزادے ہیں (یعنی حسنین کریمین ؓ)۔

وہ صاحبزادے جو اس امت کے سردار ہیں اور (رشتے کی بھی) ہر جہت سے وہ صاحبِ عز و شرف ہیں، خواہ وہ رشتہ والدین کی صورت میں ہو، چاہے سسرالی رشتہ ہو یا اولاد کی شکل میں ہو (الغرض وہ ہر لحاظ سے معزز و مکرم ہستیاں ہیں)۔

یہ آلِ رسول، سب آپس میں قریبی رشتہ دار ہیں۔ اللہ انہیں بلند شان و شرف والی بزرگی میں دائمی آباد رکھے۔

اور اللہ اس عالی گھرانے کو ایسی عزت سے سرفراز فرمائے جو زوال پذیر نہ ہو اور رہتی دنیا تک باقی رہے۔

یہ حضرات مہذب زندگیوں کے حامل ہیں، اور ان کی ماؤں کا جب نسب بیان کیا جاتا ہے تو وہ عالی شریف النسب ٹھہرتی ہیں، ان کا نسب ایسے صاف اور خالص ہے جیسے چمکتے ہوئے اولوں کی طرح کوئی صاف و شفاف پانی ہو۔

ان کی مائیں جو کہ فواطم (فاطمہ نام والی) کہلاتی ہیں اُن میں عز و شرف کا کونسا حصہ اپنے اتمام کو پہنچا ہے (یعنی ان کی تکریم و عزت روز بروز آگے پھیل رہی ہے)، ان عالی و شریف النسب خواتین کو بزرگی میں وہ مقام حاصل ہے جو عیب جوئی اور تنقید سے بالاتر ہے۔

بلکہ بزرگی و شرافت کی انتہاء ہی آلِ حسن پر ہوتی ہے، ان کا اس بزرگی و عظمت کے علاوہ کوئی اور قابلِ پناہ ٹھکانہ نہیں ہے (یعنی وہ حضرات سراپا محلِ عظمت و شرافت ہیں)۔]

جب ابو وجزہؒ اشعار سے فارغ ہوئے تو امام عبداللہ محضؒ اور آپؒ کے بھائیوں (حضرت حسن و ابراہیم رحمہا اللہ تعالی) نے انہیں بطورِ انعام ۱۵۰ دینار (مساوی تقریباً ۲۸ لاکھ روپے) دیے، پھر اُن کے اونٹوں کو گندم اور کھجور سے لاد دیا۔ اس کے علاوہ ان حضرات نے انہیں کپڑوں کے دو دو سوٹ بھی مرحمت فرمائے۔ وہ سخاوت و اکرام کا یہ غیر معمولی برتاؤ دیکھ کر انہیں دعائیں دیتے ہوئے خوشی خوشی واپس روانہ ہو گئے۔[1]

(۱) علماء أهل البيت في عصر التابعين، ص: ۱۹۹، نقلاً عن الاغاني للاصفهاني: ۲۸۹/۱۲

(۴) سلیمان بن عیاش سعدی کہتے ہیں: عبداللہ بن عمر بن عبداللہ عَبْلی، حضرت حسن مثنیٰ کے صاحبزادوں حضرت عبداللہ محضؒ اور حضرت حسن مثلثؒ کے پاس ''سُوَیقہ'' آئے۔ یہ اُس وقت کی بات ہے جب خلافت بنوامیہ سے، بنو عباس میں ابھی نئی نئی منتقل ہوئی تھی۔ بہرحال جب یہ ان حضرات کے پاس آیا تو امام محضؒ نے اسے کہا کہ ہمیں اپنے کچھ اشعار سناؤ۔ اس نے اپنے کہے ہوئے اشعار سنانا شروع کیے، جب قصیدہ پورا ہوگیا تو امام حسن مثلثؒ اٹھے اور گھر سے جا کر پچاس دینار (تقریباً ساڑھے نو لاکھ روپے) لے کر آئے اور اسے بطورِ انعام دیے، امام محضؒ نے بھی اتنے ہی دینار اُسے دیے، آپؒ کے صاحبزادوں محمدؒ و ابراہیمؒ میں سے بھی ہر ایک نے اسے اتنے ہی دیناروں سے نوازا، پھر ان دونوں صاحبزادوں کی والدہ ہند بنت ابی عبیدہ نے بھی اسی طرح اسے پچاس دینار دیے۔ اِس پر اُس نے حضرت ہند بنت ابی عبید کی مدح میں یہ اشعار کہے:

أَقَامَ ثَوِيُّ بنتِ أبي عبيد ... بخيرِ مَنَازِلِ الجيرانِ جارًا

أتاهم خائفًا وَجِلًا طَرِيدًا ... فصادَفَ خيرَ دُورِ النّاسِ دارًا

إذا ذَمَّ الجِوارَ نزيلُ قومٍ ... شكرتُهمُ ولم أذمُمْ جِوَارًا

[ہند بنت ابی عبید کے مہمان نے، اہلِ محلہ میں سے بہترین پڑوسی کے گھر میں قیام کیا ہے۔

یہ اِن کے پاس آیا تو اس حال میں تھا کہ اسے خوف و ہراس دامن گیر تھا اور یہ لوگوں کا نظرانداز کیا ہوا ایک پردیسی تھا، مگر اس نے اپنے میزبان کے گھر کو، لوگوں کے گھروں میں سے سب سے بہتر گھر پایا۔

جب کسی قبیلے کا کوئی مہمان اُن کے پڑوس کی مذمت کرے گا، تو میں اِن اہلِ خانہ کے گُن گاؤں گا اور اِن کے پڑوس کو ذرا بھر بُرا نہیں کہوں گا۔]

یہ اشعار سن کر ہند بنت ابی عبید نے اپنے شوہر حضرت عبداللہ محضؒ اور اپنے دونوں بیٹوں (محمدؒ و ابراہیمؒ) سے کہا: میں تمہیں قسم دیتی ہوں کہ اس کو پچاس دینار اور دو۔ انہوں نے آپؒ (یعنی حضرت ہند) کی طرف سے اسے پچاس دینار مزید دیے۔ عبلی شاعر، ان مجسمۂ سخاوت حضرات اہلِ بیت کا شکریہ ادا کرتے ہوئے واپس روانہ ہوگیا۔ [1]

---

(1) علماء أهل البيت في عصر التابعين، ص: ۱۹۲-۱۹۱، بتلخیص۔ نقلاً عن الاغانی للاصفهانی: ۳۳۴/۴، ۲۹۸/۱۱، مع مختصر تاريخ دمشق: ۱۸۴/۱۳، وینظر ایضاً: المنازل والديار للكناني، ص: ۴۴۱

(۴) عبید بن عقبہ جہنی کہتے ہیں: میں حضرت عبداللہ محضؒ کے پاس بیٹھا ہوا تھا، ایک شخص نے آ کر مجھے کہا کہ باہر کوئی آدمی آپ کو بلا رہا ہے۔ میں باہر گیا تو دیکھا کہ مشہور اموی شاعر ''ابو عدِی'' کھڑا ہے، اُس نے مجھے کہا کہ اندر جا کر ابو محمد (یعنی حضرت عبداللہ محضؒ) کو میرے متعلق اطلاع دو، پھر حضرت عبداللہ اور ان کے دونوں صاحبزادے باہر تشریف لائے۔ آپؒ نے اُس کو چار سو دینار دیے، آپؒ کے بیٹوں نے بھی چار سو اور آپؒ کی اہلیہ ''ہند'' نے دو سو دینار دے۔ وہ یہ ہزار دینار لے کر واپس چل دیا۔ [۱]

حسنِ اخلاق:

حسین بن یزید کہتے ہیں: ایک شخص نے امام عبداللہ محضؒ کو گالیاں دیں مگر آپؒ نے اس کی ان گالیوں کی طرف کوئی توجہ نہ دی۔ کسی نے آپؒ سے کہا: آپ اسے جواب کیوں نہیں دیتے (یعنی آپ اس کو جواب میں برا بھلا کیوں نہیں کہتے)؟ آپؒ نے فرمایا: اِس کی برائیاں میں جانتا نہیں ہوں اور بہتان لگانا مجھے پسند نہیں ہے۔ [۲]

یحییٰ بن مَعین بیان کرتے ہیں: ایک آدمی نے حضرت عبداللہ محضؒ کو ایسی بات کہی جو غصہ دلانے والی تھی، مگر آپؒ نے غصہ ہونے کے بجائے اسے فرمایا: بھائی! آپ میرے برابر درجہ کے نہیں ہیں کہ میں بھی جواب میں آپ کو برا بھلا کہوں (بلکہ آپ کو میں اپنے سے بڑا سمجھتا ہوں اس لیے آپ کی عزت کرتے ہوئے کچھ کہنے سے قاصر ہوں)، اور نہ ہی آپ میرے غلام ہیں کہ میں آپ کو کوئی سزا یا تکلیف دوں (لہٰذا میں آپ کو جواب میں کچھ نہیں کہہ سکتا)۔ [۳]

ایک شخص نے آپؒ کو بہت زیادہ سخت سست کہا اور نہایت کڑوی کسیلی باتیں سنائیں مگر آپؒ خاموش کھڑے رہے، اور لوگ آپؒ کے اس صبر پر حیران ہو رہے تھے۔ جب اس شخص نے بات بہت لمبی کر دی تو آپؒ نے اس کو جواب میں برا بھلا کہنے کے بجائے، اُس کے سامنے ایک شاعر کے یہ اشعار پڑھ دیے:

أظَنَّتْ سفاهاً مِن سَفاهةِ رأيِها ... أنْ أهْجُوَها لِمَا هَجَتْنِي مُحارِبُ؟

فَلا وأبِيهَا إنَّنِي بِعَشِيرَتِي ... هُنالِكَ عَنْ ذاكَ المَقامِ لَراغِبُ

---

(۱) مقاتل الطالبین، ص: ۱۷۰، والاغانی للاصفہانی: ۲۹۸/۱۲

(۲) مختصر تاریخ دمشق: ۱۱۲/۱۲

(۳) تاریخ ابن معین - روایۃ ابن محرز: ۱۵۵/۱

[کیا قبیلہ "محارب" نے اپنی نادانی سے یہ خیال کرلیا ہے کہ میں اُس کو اِس بناء پر برا بھلا کہوں گا کہ اُس نے مجھے برا بھلا کہا ہے؟
نہیں، واللہ! ہرگز ایسا نہیں ہوگا، میں اپنے خاندان کے ساتھ اس (گرے ہوئے) مقام سے دور رہنے والا ہوں
(یعنی میں اور میرا خاندان گالی کے بدلہ میں گالی کا طریقہ نہیں اختیار کرتا بلکہ خاموشی اور صبر اختیار کرتا ہے)۔] [1]

(1) مختصر تاریخ دمشق: ۱۱۲/۱۲، مع زھر الآداب و ثمر الالباب: ۱۲۲/۲، والتذکرۃ الحمدونیۃ: ۱۳۹/۲، و شرح دیوان الحماسہ للتبریزی: ۱۷۷/۲، وانظر ایضاً الکامل فی اللغۃ والادب: ۳۳/۱، و شرح دیوان الحماسہ للمرزوقی، ص: ۱۰۰۳، والممتع فی صنعۃ الشعر، ص: ۱۸۶،

۳۔ امام نفسِ زکیّہ سلامُ اللہ و رحمتہ علیہ

(محمد بن عبداللہ بن حسن بن حسن بن علی کرم اللہ وجہہ)

نام ونسب:

آپؒ کا نام "محمد" اور والد ماجد کا نام "عبداللہ بن حسن مثنیٰ" تھا، یعنی آپؒ سیدنا امام حسن بن علی کرم اللہ وجہہ کے پڑپوتے تھے [۱]۔ آپؒ نسب میں ہاشمی اور علَوِی، [۲] جبکہ وطن کے لحاظ سے مدنی تھے۔ [۳] آپؒ کی کنیت "ابوعبداللہ" تھی [۴]، اور درج ذیل خوبصورت متعدد القاب سے مُلقب تھے:

"نفسِ زکیہ" (باطن میں پاک وصاف آدمی)، "مہدی" (چونکہ آپؒ کا نام محمد بن عبداللہ تھا، اور حدیث شریف سے بھی امام مہدی کا نام محمد بن عبداللہ معلوم ہوتا ہے، چنانچہ آپؒ کے خاندان نے آپؒ کا یہ لقب تجویز کیا تھا۔ [۵])، "اَرقَط" (جس کا رنگ سیاہی وسفیدی سے مخلوط ہو۔ [۶])، [۷] البتہ ان میں سے "نفسِ زکیہ" کے لقب سے آپؒ زیادہ معروف تھے اور عموماً اسی لقب سے پکارے جاتے تھے، [۸] اگرچہ بعض مؤرخین نے آپؒ کے اسم گرامی (محمد) کے ساتھ مہدی کا لقب استعمال کیا ہے، [۹] مگر زیادہ مشہور لقب وہی "نفسِ زکیہ" ہی ہے۔ اور آپؒ کی والدہ ماجدہ کا نام "

---

(۱) تہذیب التہذیب: ۹/۲۵۲، وغیرہ

(۲) میزان الاعتدال: ۳/۵۹۱

(۳) سیر أعلام النبلاء: ۶/۲۱۰، والمقتنی في سرد الکنی: ۱/۳۵۲، والتحفة اللطیفة فی تاریخ المدینة الشریفة: ۲/۴۹۲

(۴) الجرح والتعدیل لابن أبي حاتم: ۷/۲۹۵، والطبقات الکبری: ۵/۴۳۸

(۵) ینظر: الأعلام للزرکلي: ۶/۲۲۰

(۶) فائدہ: آپؒ کا رنگ شدید گندمی تھا، اور اس کے ساتھ چہرے پر کچھ سفیدی بھی شامل ہوگئی تھی، اس طرح بدن کا رنگ چونکہ سیاہی وسفیدی سے قدرے مخلوط ہوگیا تھا اس لیے آپؒ "اَرقَط" کہلائے، واللہ اعلم۔ ملاحظہ ہو: الإفادة في تاریخ الأئمة السادة، ص: ۲۸، مع البدایة والنهایة ط هجر: ۱۳/۳۶۵، اور عربی میں "ارقط" کا معنی ہے: سیاہی وسفیدی سے مخلوط رنگ والا (جیسا کہ اوپر مذکور ہوا)، اسی بناء پر عرب لوگ چیتے کو بھی "ارقط" کہہ دیتے ہیں کہ اس کا رنگ بھی اسی طرح مخلوط ہوتا ہے۔ ملاحظہ ہو: لسان العرب: ۷/۳۰۴، والقاموس المحیط، ص: ۶۶۸

(۷) الأعلام للزرکلي: ۶/۲۲۰، وأحداث التاریخ الإسلامي –تحت أحداث سنة: ۱۴۵ھ– والمختصر في أخبار البشر: ۲/۳

(۸) تعلیق المحقق علی تهذیب الکمال في أسماء الرجال: ۲۵/۴۶۶، ولسان المیزان: ۷/۳۶۳، وتقریب التهذیب ص: ۴۸۷، و التحفة اللطیفة في تاریخ المدینة الشریفة: ۲/۴۹۲، وتاریخ ابن خلدون: ۴/۷، ونثر الدر فی المحاضرات: ۱/۲۵۶

(۹) کما تری في الوافی بالوفیات: ۳/۲۴۲، وبعض مصادر الاخری

''ہند بنت ابی عُبَیدہ'' تھا۔[1]

ولادت:

آپؒ کے سنِ ولادت میں اختلاف ہے۔ بعض نے ۱۰۰ھ[2] اور دیگر بعض نے ۹۳ھ لکھا ہے[3] لیکن کثرتِ روایات پر نظر کرتے ہوئے بظاہر ۱۰۰ھ راجح معلوم ہوتا ہے، واللہ اعلم بالصواب۔

البتہ یہ بات واضح ہے کہ آپؒ کی ولادت مدینہ طیبہ میں ہوئی اور پھر وہیں پرورش ہوئی اور پلے بڑھے[5]

آپؒ کی ولادت کے سلسلہ میں کئی مؤرخین نے ایک نہایت حیران کن بات لکھی ہے کہ آپؒ اپنی والدہ کے پیٹ میں چار سال رہے، چوتھے سال کے اخیر میں آپؒ کی پیدائش ہوئی[6]

حلیہ ولباس:

آپؒ کا رنگ شدید گندمی تھا[7] اسی بناء پر منصور آپؒ کو طنزاً نعوذ باللہ۔ ''مُحَمَّم'' کہتا تھا، (اور محمم کا مطلب ہے: وہ شخص جس کا منہ کوئلے سے کالا کر دیا گیا ہو)۔[8]

آپؒ کا قد لمبا، جسم بھاری اور سر مبارک بڑا تھا۔ جسم بھاری ہونے کے ساتھ ساتھ آپؒ بہت طاقتور تھے اور حیران

---

(۱) الطبقات الکبری: ۴۳۸/۵، الإفادة في تاريخ الأئمة السادة، ص: ۲۸

(۲) نثر الدر في المحاضرات: ۲۵۹/۱، والافادة في تاريخ الائمة السادة، ص: ۲۸، وریحان عترت، ص: ۱۰۳

(۳) الأعلام للزركلي: ۲۲۰/۶

فائدہ: دراصل اس اختلاف کی بنیاد آپؒ کی عمرِ مبارک میں اختلاف ہے، بعض کے نزدیک آپؒ پینتالیس سال کی عمر میں شہید ہوئے جبکہ دیگر بعض کے ہاں بوقتِ شہادت عمرِ عزیز باون سال تھی (اگرچہ کچھ نے ترپن سال بھی لکھی ہے)، اسی لیے پہلے قول کی بنا پر آپؒ کا سنِ ولادت ۱۰۰ھ اور دوسرے کی بنا پر ۹۳ھ قرار پائے گا، جبکہ آپؒ کا سنِ شہادت ''۱۴۵ھ'' معروف ومتعین ہے۔

(۴) کمافی البداية والنهاية ط هجر: ۳۸۲/۱۳، والتحفة اللطيفة في تاريخ المدينة الشريفة: ۴۹۲/۲، وتهذيب الكمال في اسماء الرجال: ۴۷۰/۲۵، والجرح والتعديل لابن ابي حاتم: ۲۹۵/۷، وغيرها

(۵) الأعلام للزركلي: ۲۲۰/۶، وأحداث التاريخ الإسلامي — تحت أحداث سنة: ۱۴۵ھ۔

(۶) تهذيب الكمال في أسماء الرجال: ۴۷۰/۲۵، والبداية والنهاية ط هجر: ۳۸۲/۱۳، والتحفة اللطيفة في تاريخ المدينة الشريفة: ۴۹۲/۲، والإفادة في تاريخ الأئمة السادة، ص: ۲۸

(۷) الأعلام للزركلي: ۲۲۰/۶، وتاريخ الاسلام: ۲۳/۹، وتاريخ الطبرى: ۵۶۲/۷، والمنتظم في تاريخ الملوك والأمم: ۴۷/۸، والافادة في تاريخ الائمة السادة، ص: ۲۸

(۸) الكامل في التاريخ: ۱۲۹/۵

کن بات یہ ہے کہ بھاری جسم کے باوجود آپؒ میدانِ جنگ میں دلیرانہ لڑتے،[1] اور بڑے بڑے جنگجوؤں کو پل بھر میں ڈھیر کردیتے جس کا کچھ نمونہ آئندہ آرہا ہے۔ پیدائش کے وقت سے ہی، آپؒ کے دونوں کندھوں کے درمیان انڈے کی شکل کا ایک سیاہ تل تھا۔[2]

آپؒ کی سیرت پر نظر کرنے سے مختلف مواقع پر کہیں کہیں ضمناً آپؒ کے لباس کا جو تذکرہ ملتا ہے، اس کو سامنے رکھ کر آپؒ سے جن چیزوں کا بطورِ لباس پہننا ثابت ہے وہ یہاں یکجا درج کی جاتی ہیں:

سفید قمیص، سفید عمامہ،[3] سفید چوغہ،[4] گیروی رنگ (سرخ رنگ کے مشابہ ایک قسم کا رنگ ہے) کا جبہ،[5] زرد ٹوپی، زرد جبہ،[6] کبھی کمر کے درمیان میں پٹکا بھی باندھ لیتے تھے۔[7]

شادی واولاد:

آپؒ کے چچا "محمد بن حسن مثنیٰ" کی تین بیٹیاں تھیں: فاطمہ، ام سلمہ اور ام کلثوم۔ ان میں سے ام سلمہ کا نکاح آپؒ سے ہوا جن سے درج ذیل اولاد ہوئی:

صاحبزادے:

(۱) عبداللہ اَشتر بن محمد: یہ "کابل" میں شہید ہوئے اور انہی سے آگے نسل چلی۔

(۲) علی بن محمد: انہیں مصر سے گرفتار کیا گیا اور خلیفہ مہدی کی جیل میں وفات پائی۔

(۳) حسین بن محمد [بعض نے ان کا نام حسن بن محمد لکھا ہے۔[8]]: یہ "فخ" میں شہید ہوئے (فخ، مکہ مکرمہ

---

(۱) ینظر: البدایة والنهایة ط هجر: ۳۸۲/۱۳، و ۳۶۵/۱۳، مع الکامل فی التاریخ: ۱۲۹/۵، والمختصر في أخبار البشر: ۳/۲، وتاریخ الاسلام: ۲۳/۹، والمنتظم فی تاریخ الملوک والامم: ۴۷/۸، والافادة فی تاریخ الائمة السادة، ص: ۲۸

(۲) تهذیب الکمال: ۴۷۰/۲۵، ومثله فی الافادة فی تاریخ الائمة السادة، ص: ۲۸

(۳) تاریخ الطبري = تاریخ الرسل والملوک، وصِلَة تاریخ الطبري: ۵۷۷/۷

(۴) البدایة والنهایة ط هجر: ۳۶۵/۱۳

(۵) تاریخ الإسلام للذهبي: ۲۹/۹

(۶) تاریخ الطبري = تاریخ الرسل والملوک، وصِلَة تاریخ الطبري: ۵۵۷/۷

(۷) البدایة والنهایة ط هجر: ۳۶۵/۱۳

(۸) الطبقات الکبری ط العلمیة: ۳۸۵/۸، والافادة فی تاریخ الائمة السادة، ص: ۲۹

کی ایک بڑی وادی ہے جو مکہ سے تین میل کی مسافت پر واقع ہے [1])۔

صاحبزادیاں:

(۱) فاطمہ بنت محمد: یہ اپنے چچازاد بھائی ''حسن بن ابراہیم بن عبداللہ'' کے نکاح میں آئیں۔

(۲) زینب بنت محمد: ان کے یکے بعد دیگرے کئی نکاح ہوئے۔ سب سے پہلا نکاح محمد بن ابی العباس سے ہوا ،اُن کے انتقال کے بعد عیسیٰ بن علی سے ہوا، جب اُن سے جدائی ہوئی تو محمد بن ابراہیم بن محمد سے ہوا اور ان سے ایک لڑکی بھی پیدا ہوئی جو بچپن میں فوت ہوگئی۔ جب محمد بن ابراہیم سے جدائی ہوئی تو ابراہیم بن ابراہیم بن حسن کے نکاح میں آئیں۔

امام نفسِ زکیہ کی ایک شادی ''فاختہ بنت فُلَیح'' سے ہوئی جن سے صاحبزادے ''طاہر بن محمد'' پیدا ہوئے۔ ان کے علاوہ آپؒ کی ایک باندی تھی جن سے ''ابراہیم بن محمد'' پیدا ہوئے۔ [2]

علم کی تحصیل واشاعت اور علمی مقام:

علم کی تحصیل کے لیے آپ سلامُ اللہ وَ رَحمۃ علیہ در بدر گئے، اس کے لیے غیر معمولی محنتیں وقربانیاں کیں اور اس بات کی پروا نہ کی کہ مَیں اونچے خاندان کا فرد اور وقت کی مشہور و عظیم شخصیت کا بیٹا ہوں، چنانچہ آپؒ اپنی تحصیلِ علم کا ایک چھوٹا سا واقعہ بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

میں انصار کے گھروں میں جا کر علم حاصل کیا کرتا تھا حتی کہ وہیں ان میں سے کسی کے پاس ایسے ہی بس کسی چیز کا سہارا لے کر آرام کرنے کیلیے لیٹ جاتا۔ پھر کوئی شخص آ کر نماز کے لیے مجھے جگاتا اور کہتا: اٹھو! تمہارا آقا تو نماز کے لیے چلا گیا ہے، وہ دراصل میرے متعلق یہ سمجھتا کہ اس طرح یہاں لیٹا ہوا اُن کا کوئی غلام ہی ہوگا۔ [3]

اصل بات یہ ہے کہ علم کی حقیقی تحصیل اور پھر اس میں اونچا مقام پانے کے لیے اسی طرح اپنے آپ کو مٹا کر قربانیاں

---

(۱) معجم البلدان: ۲۳۷/۴، مع معجم مااستعجم من اسماء البلاد والمواضع: ۱۰۱۴/۳، والروض المعطار في خبر الأقطار ص: ۴۳۶، ومعجم المعالم الجغرافية في السيرة النبوية ص: ۲۳۴

(۲) نسب قریش ص: ۵۳ و ۵۴، مع طبقات الکبری: ۴۳۸/۵

(۳) ینظر: نثر الدر في المحاضرات: ۲۵۹/۱،

دینی پڑتی ہیں۔ پھر اسی کا تو نتیجہ ہوا کہ آپ علم کے میدان میں وقت کے امام ثابت ہوئے جیسا کہ درج ذیل سطور سے آپ کو معلوم ہوگا۔

یحییٰ ہارونی لکھتے ہیں: آپؒ ایک بلند پایہ عالم تھے۔ فقہ اور حدیث میں تو خاص طور پر، اعلیٰ مقام پر فائز تھے۔ [1]

علمِ حدیث میں آپؒ نے اپنے والد ماجد امام عبداللہ بن حسن مثنیٰ، ابو زِناد عبداللہ بن ذَکوان اور نافع مولیٰ ابن عمر سے احادیث روایت کیں، اور پھر آگے کئی حضرات نے آپؒ سے احادیث حاصل کیں (جس سے اشاعتِ حدیث کی خدمت آپؒ کے ہاتھوں سرانجام پائی) جیسے زید بن حسن انماطی، عبداللہ بن جعفر مخرمی، اور عبدالعزیز بن محمد دَراوَردِی وغیرہ۔ [2]

علم العقائد کے عالم "واصل بن عطاء" نے تو مستقل آپؒ کی صحبت اختیار کر رکھی تھی۔ [3]

علم الفقہ پر آپؒ کی دسترس اور مہارت کے سلسلہ میں درج ذیل واقعہ نقل کر دینا کافی ہوگا:

قاسم بن مسلم جو آپؒ کے ساتھیوں میں سے تھے، انہوں نے ایک دفعہ آپؒ سے کہا: لوگ ہمیں کہتے ہیں کہ تمہارے ساتھی محمد بن عبداللہ "علمِ فقہ" سے ناواقف ہیں (یعنی جائز وناجائز اور حلال وحرام کے احکامات کے عالم نہیں ہیں، لہٰذا وہ خلیفۃ المسلمین کیسے بن سکتے ہیں؟)۔ یہ سن کر آپؒ نے زمین سے اپنا عصا اٹھایا پھر اُن سے فرمایا: قاسم! (لوگ یہ کیسی بات کر رہے ہیں!!) مجھے تو یہ بھی پسند نہیں ہے کہ میرے ہاتھ پر امت کے افراد کا صرف اتنا حصہ جمع ہوجائے جتنا اس لاٹھی کا مڑا ہوا حصہ، اور پھر مجھ سے حلال وحرام کا کوئی مسئلہ معلوم کیا جائے اور مجھے اس کا جواب نہ آتا ہو۔ اس کے بعد آپؒ نے ایسے شخص کی انتہائی مذمت بیان کی حتی کہ اُسے گمراہ بلکہ اُس سے بھی پرلے درجہ کا مستحقِ ملامت ٹھہرایا جو امتِ مسلمہ کا خلیفہ بن بیٹھے اور وہ جائز وناجائز کے احکامات کا عالم نہ ہو۔ [4]

تصنیف کے میدان میں آپؒ کے متعلق، پانچویں صدی کے مذکورہ عالم "یحییٰ ہارونی" لکھتے ہیں: "کتابُ السِّیَر" امام نفسِ زکیہ کی مشہور کتاب ہے، اور میں نے فقہائے احناف کی ایک جماعت سے سنا ہے، وہ حضرات

---

(1) الإفادة في تاريخ الأئمة السادة، ص: ٢٨

(2) تهذيب الكمال في أسماء الرجال: ٢٥/٣٦٦، وسير اعلام النبلاء: ٦/٢١٠

(3) الإفادة في تاريخ الأئمة السادة، ص: ٢٨

(4) مقاتل الطالبيين ص: ٢٥٨

فرماتے ہیں کہ امام محمد بن حسن شیبانی نے اپنی "کتاب السِّیَر" میں اکثر مسائلِ سِیَر اسی کتاب سے لیے ہیں۔"[1]

خطابت وتقریر کے میدان میں بھی آپؒ ایک ماہر وفاضل خطیب تھے، البتہ دورانِ خطابت کبھی زبان رک جاتی تھی، اُس وقت آپؒ سینے پر اپنا ہاتھ مارتے اور زبان کُھل جاتی۔[2]

الغرض مختلف مصنفین نے آپؒ کی اس بلند علمی شان کو مختلف لفظوں و پیراؤں میں بیان کیا ہے، مثلاً: "آپؒ وسیع علم کے حامل تھے"، [3] "علم وزہد کی آپؒ پر انتہا تھی"، [4] "قابلِ اعتماد راوی حدیث تھے"، [5] وغیرہ۔

آپؒ کے ہاتھ پر بیعتِ خلافت، اور عباسی حکمرانوں کی ناانصافی اور نازیبا رویے:

جہاں آپ سلامُ اللہ وَ رَحمۃُ علیہ کو قرآن وسنت کے علم میں بلند مقام حاصل تھا اور وقت کے اکابر علما میں آپؒ کا شمار ہوتا تھا جیسا کہ پیچھے گزرا۔ وہاں ملکی سیادت وریاستی قیادت کا وصفِ جمیل بھی آپؒ میں نمایاں اور ممتاز تھا۔ اس کے ساتھ ہی دینی کڑھن اور انسانی ہمدردی بھی آپؒ میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی، گویا آپؒ وصفِ قیادت اور دردِ دین وامت سے مرکب انسان تھے۔

چنانچہ بنوامیہ کی حکومت کے آخری ایام میں، جبکہ اموی حکومت کا عنقریب سقوط تقریباً یقینی ہو چکا تھا، مکہ مکرمہ کے اندر ماہِ ذی الحجہ ۱۳۱ھ میں ایک خصوصی مجلس منعقد ہوئی، جو عباسی اور علوی لوگوں پر مشتمل تھی۔ اس میں یہ معاملہ زیرِ بحث لایا گیا کہ اب کون شخص نیا خلیفہ بننے کی صلاحیت واستحقاق رکھتا ہے؟ ابوجعفر منصور عباسی نے "محمد نفس زکیہ" کے حق میں اپنی رائے کا اظہار کیا چونکہ اس کی یہ رائے بالکل درست اور انصاف پر مبنی تھی اس لیے سب اہلِ مجلس نے اس رائے سے اتفاق کر کے "محمد نفس زکیہ" کے ہاتھ پر بیعتِ خلافت کرلی، دیگر حاضرین کے ساتھ منصور عباسی نے بھی بیعت کی تھی۔ یعنی ابوجعفر منصور، امام نفس زکیہؒ کے مستحقِ خلافت ہونے کا زبان سے اقرار اور اپنے ہاتھ سے ان کے ہاتھ پر خلافت کی بیعت کر چکا تھا، لیکن جب اموی حکومت کا سقوط ہو گیا تو امام نفس زکیہ کو خلیفہ بنانے کے بجائے ابوالعباس عبداللہ سَفّاح عباسی خلیفہ بن گیا، حالانکہ دورِ بنی امیہ میں یہ خود لوگوں کو اس بات کی دعوت دیا کرتا تھا کہ محمد

---

(۱) الإفادة في تاريخ الأئمة السادة، ص: ۲۸، مع ريحان عترت، ص: ۱۰۴

(۲) نفس المرجع السابق

(۳) الأعلام للزركلي: ۶/ ۲۲۰، وأحداث التاريخ الإسلامي —تحت أحداث سنة: ۱۴۵هـ-

(۴) الوافي بالوفيات: ۳/ ۲۴۲

(۵) تهذيب الكمال في أسماء الرجال: ۲۵/ ۴۶۶

نفس زکیہ کو خلیفۃ المسلمین منتخب کیا جائے۔[1] (''سفاح'' عربی میں ''خونریز'' کو کہتے ہیں، اس کا نام عبداللہ تھا، مگر چونکہ یہ انتہادرجے کا ظالم تھا اور مسلمانوں کا خون بہانے میں نہایت بے باک اور سنگدل ہوگیا تھا اس لیے ''سفاح'' کے لقب سے مشہور ہوا۔)[2]

سَفاح نے بادشاہ بننے کے بعد امام نفس زکیہ کے والد ''عبداللہ بن حسن مثنیٰ'' سے پوچھا کہ جس طرح دوسرے لوگ میرے پاس یہاں شاہی دربار میں آتے رہتے ہیں، تمہارے بیٹے ''محمد (نفس زکیہ)'' اور ''ابراہیم'' یہاں نہیں آتے۔ انہوں نے کہا کہ وہ ''گوشہ نشینی'' پسند کرتے ہیں اور زیادہ آنا جانا نہیں رکھتے اور شہر سے بھی باہر ہی رہتے ہیں، سفاح نے پھر کوئی بات نہ کی، لیکن اس کے بعد جب اس کا بھائی ''منصور'' عباسی خلیفہ بنا تو اس کا تو رنگ ہی کچھ اور تھا۔ اس نے سختی کے ساتھ ان دونوں بھائیوں کو اپنے دربار میں حاضر کرانے کی کوشش کی، مگر جب ان کو پتا چلا کہ منصور ہماری تلاش میں ہے تو وہ اس کے دربار میں حاضر ہونے کے بجائے کہیں رُوپوش ہو گئے (کیونکہ بظاہر وہ سمجھ گئے ہوں گے کہ منصور ہمیں قتل کرانا چاہتا ہے اس لیے کہ منصور کو تو علم تھا کہ محمد نفس زکیہ کے ہاتھ پر خلافت کی بیعت ہو چکی ہے، لہٰذا لوگ کہیں اُن کا ساتھ دے کر میرے اقتدار کے خلاف نہ ہو جائیں اور مجھے بادشاہت سے ہٹا دیا جائے)۔

منصور ان کی تلاش میں بے چین ہو کر اس میں اپنی پوری قوت صرف کرنے لگا۔ منصور خود عراق میں رہتا تھا کہ اس کی حکومت کا دارالخلافہ وہیں تھا اور امام نفس زکیہ چونکہ مدینہ طیبہ رہتے تھے اس لیے منصور نے زیاد بن عبیداللہ حارثی کو مکہ مکرمہ سمیت مدینہ منورہ کی گورنری کا عہدہ عطا کر کے اسے بطورِ خاص حکم دیا کہ ان دونوں بھائیوں کو تلاش کر کے پیش کرو، مگر زیاد ان حضرات کے خلاف کوئی اِقدام کرنے سے باز رہا۔ جب منصور کو پتا چلا کہ زیاد ان کے معاملہ میں پس وپیش سے کام لے رہا ہے تو اس نے ان کو معزول کر کے محمد بن خالد قسری کو مدینہ کا گورنر بنا دیا اور اسے حکم دیا کہ ان دونوں کی تلاش میں کوئی کسر نہ چھوڑو، مگر اس نے بھی زیاد کی طرح ان حضرات اہل بیت کے ساتھ نرمی والا معاملہ برتا بلکہ اسے جب کوئی اطلاع ملتی کہ وہ فلاں علاقے میں ہیں تو اُدھر کے بجائے وہ کسی اور جانب گھوڑے دوڑا دیتا، اہل بیت کے ساتھ اس کی محبت کا یہ عالم تھا کہ وہ پسِ پردہ ان دونوں حضرات کی ضروریات بھی پوری کر دیا کرتا۔

---

(1) ینظر: تاریخ اسلام لنجیب آبادی: ۲/۳۲۵، ۳۱۴، ۳۱۳، مع سیر اعلام النبلاء: ۶/۲۱۰، و شذرات الذھب: ۲/۲۰۲، و تاریخ الاسلام للذھبی: ۹/۳۲

(2) الأعلام للزرکلي: ۴/۱۱۶، و مآثر الإنافة في معالم الخلافة: ۱/۱۷۰

آپؒ کے اہلِ خانہ کو جیل میں ڈالنا:

منصور کو ان کے متعلق جب اس طرح کی خبریں ملیں تو وہ ان پر بہت غضبناک ہوا اور انہیں گورنری سے معزول کر دیا۔ اس مرتبہ منصور نے، ان کا سراغ لگانے کے لیے، ایک سخت قسم کے آدمی کو مدینہ طیبہ کا گورنر بنایا اور اسے ان دونوں کو ڈھونڈ لانے کے تاکیدی آرڈر بھی دیے، اس گورنر کا نام "رِیاح بن عثمان مُرِّی" تھا۔ اس نے ان کی جستجو میں اپنے لحاظ سے پوری کوشش صرف کر ڈالی، وہ حضرات اس کی شدت و سختی کے خوف سے مدینہ سے باہر پہاڑوں کی طرف نکل گئے۔ جب ریاح کو ان کی تلاش میں کامیابی نہ ہو سکی تو اس نے ان حضرات کے اہلِ خانہ کو تنگ کرنا اور انہیں تکلیفیں پہنچانا شروع کر دیں،[1] اور (منصور کے حکم سے [2]) مندرجہ ذیل رشتہ داروں کو گرفتار کر کے ان کے پاؤں میں بیڑیاں ڈال دیں اور پھر انہیں جیل میں قید کر دیا:

(۱) عبداللہ بن حسن مثنیٰ (امام نفس زکیہؒ کے والد)

(۲) حسن بن حسن مثنیٰ (آپؒ کے چچا)

(۳) ابراہیم بن حسن مثنیٰ (آپؒ کے چچا)

(۴) جعفر بن حسن مثنیٰ (آپؒ کے چچا)

(۵) سلیمان بن داود بن حسن مثنیٰ (آپؒ کے چچازاد بھائی)

(۶) عبداللہ بن داود بن حسن مثنیٰ (آپؒ کے چچازاد بھائی)

(۷) محمد بن ابراہیم بن حسن مثنیٰ (آپؒ کے چچازاد بھائی)

(۸) اسماعیل بن ابراہیم بن حسن مثنیٰ (آپؒ کے چچازاد بھائی)

(۹) اسحاق بن ابراہیم بن حسن مثنیٰ (آپؒ کے چچازاد بھائی)

(۱۰) عباس بن حسن مثنیٰ (آپؒ کے چچا)

(۱۱) موسیٰ بن عبداللہ بن حسن مثنیٰ (آپؒ کے بھائی)

(۱۲) علی بن حسن مثنیٰ (آپؒ کے چچا)

---

(۱) الطبقات الکبری ط العلمیۃ: ۵/۴۳۹

(۲) الطبقات الکبری: ۵/۳۸۷، وتاریخ الطبری: ۷/۵۵۰، وتاریخ دمشق: لابن عساکر: ۵۳/۳۸۹

ان مبارک وعظیم ہستیوں کی بے قصور گرفتاری وقید کے بعد، منصور نے رِیاح کو خط لکھا کہ ان کے ساتھ محمد بن عبداللہ المعروف ''محمد دِیباج'' کو بھی گرفتار کرلو کہ وہ ماں کی طرف سے عبداللہ بن حسن مثنیٰ کا بھائی لگتا ہے کیونکہ ان دونوں کی والدہ حضرت فاطمہ بنت حسین رضی اللہ عنہا تھیں، چنانچہ ان کو بھی پکڑوا کر ان حضرات کے ہمراہ وہیں جیل میں ڈلوا دیا گیا۔ اِدھر یہ حضرات مدینہ طیبہ میں پابندِ سلاسل کردیے گئے اور اُدھر امام نفس زکیہ اپنے بھائی ابراہیم کے ہمراہ حجاز کے قبائل اور غیر معروف مقامات میں مسلسل رُوپوش رہے اور جلد جلد اپنی جائے قیام کو تبدیل کرتے رہے، کہ منصور ان کی کڑی تلاش میں مصروف تھا۔ الغرض حضرت حسن بن علی کرم اللہ وجہہ کی اولاد میں سے کوئی شخص ایسا نہ تھا جو قید نہ کرلیا گیا ہو یا اپنی جان بچانے کے لیے چھپا چھپا نہ پھرتا ہو۔[۲]

جیلِ مدینہ سے، عراق کی طرف منتقلی اور ظلم وتشدد کی دردناک داستان:

۱۴۴ھ میں منصور جب حج کے لیے گیا تو اس نے محمد بن عمران اور مالک بن انس کو (مدینہ طیبہ) بھیجا کہ وہاں جیل خانہ میں اولادِ حسن کے پاس جاکر انہیں میری طرف سے کہو کہ محمد (نفس زکیہ) اور ابراہیم کو میرے حوالے کرو۔ یہ جب وہاں پہنچے تو حضرت عبداللہ بن حسن مثنیٰ نماز میں مشغول تھے، نماز سے فارغ ہوئے تو اِن قاصدوں نے اُن کو بادشاہ منصور عباسی کا پیغام دیا۔ آپ رحمہ اللہ نے فرمایا: واللہ! میں تمہیں ایک لفظ برابر بھی جواب نہیں دوں گا، ہاں! اگر بادشاہ مجھے اپنے پاس آنے کی اجازت دے تو اس سلسلہ میں، مَیں خود اُن سے بات کرنا چاہتا ہوں۔ قاصدوں نے جاکر منصور کو حضرت عبداللہ کا یہ پیغام پہنچایا تو منصور ان کی ملاقات اور ان سے بات کرنے پر آمادہ نہ ہوا جب تک وہ اپنے بیٹے اس کے سپرد نہ کریں۔ دراصل حضرت عبداللہ کے متعلق معروف تھا کہ وہ جس کسی سے بات کرتے ہیں اُسے اپنے دلائلِ حقہ سے قائل کرلیتے ہیں۔

منصور جب حج سے فارغ ہوگیا تو مدینہ طیبہ جانے کے بجائے عراق کی طرف واپسی شروع کردی، جب ''رَبذہ'' کے مقام پر پہنچا تو ''رِیاح مُرّی'' بھی ملاقات کے لیے مدینہ سے وہاں پہنچ گیا۔ منصور نے ریاح کو یہ کہہ کر واپس مدینہ بھیج دیا کہ محمد دیباج سمیت، اولادِ حسن کے ان تمام قیدیوں کو یہاں میرے پاس پہنچادو (تاکہ ان کو یہاں مدینہ سے عراق منتقل کیا جاسکے)۔ ریاح نے آکر ان کو جیل سے نکالا اور ان مبارک حضرات کی گردنوں میں طوق، (ہاتھوں

---

(۱) ینظر: الکامل فی التاریخ: ۵/۱۰۴، ۱۰۳

(۲) بتاریخ اسلام: ۲/۳۲۸

میں ہتھکڑیاں [1]) اور پاؤں میں بیڑیاں ڈالیں اور کوئی کپڑا وغیرہ بچھائے بغیر ایسے ہی سخت کجاووں میں بٹھا کر ربذہ کی طرف لے کر چل پڑا تاکہ وہاں سے آگے منصور کی طرف سے متعین سپاہیوں کے دستے کی نگرانی میں عراق روانہ کیا جاسکے۔ (بہرحال ان حضرات کے ساتھ اور بھی کئی افراد کو گرفتار کر کے انہیں ربذہ پہنچا دیا گیا اور پھر وہاں ان کے ہاتھوں کو پیچھے کی طرف رسی سے باندھ کر، انہیں دھوپ میں ڈال دیا گیا [2])۔ (ہائے افسوس! یہ آلِ رسول کے ساتھ کیا ہو رہا ہے، اِسے لکھتے ہوئے اور پڑھتے ہوئے دل تھام کے بیٹھنا پڑتا ہے)۔

رِیاح جب ان کو لے کر مدینہ سے نکلنے لگا تو امام جعفر صادقؒ (جو کہ اولادِ حسینؓ میں سے تھے) کسی پردے کی اوٹ میں ان حضرات کو اس مظلومانہ حالت میں دیکھ کر رو رہے تھے حتیٰ کہ آنسوؤں سے ڈاڑھی گیلی ہوئی جارہی تھی اور ان حضرات کے حق میں اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں دعا کر رہے تھے۔

جب یہ حضرات منصور کے پاس ''رَبذہ'' پہنچ گئے تو منصور کی طرف سے ان حضرات پر ظلم وستم شروع ہوگیا۔ اس نے سب سے پہلے ان میں سے حضرت محمد دیباج کو بلوایا، انہوں نے ایک معمولی سی چادر اور قمیص پہن رکھی تھی۔ اس نے پہلے آپؒ کو بہت برا بھلا کہا اس کے بعد حکم جاری کر دیا کہ اس کے کپڑے اتار کر ڈیڑھ سو کوڑے لگائے جائیں، کپڑے اتارے گئے تو آپؒ کا جسم صاف چاندی کی طرح خوبصورت تھا، ایک روایت میں آتا ہے کہ اس میں ان کا ستر تک کھل گیا تھا، پھر منصور کے سامنے کوڑے مارے گئے، ان ظالمانہ کوڑوں کی بوچھاڑ کے دوران ایک کوڑا آپؒ کے چہرۂ انور پر لگا تو آپؒ نے فرمایا: تیرا بھلا ہو، میرے چہرے پر تو نہ مار کہ میرے آلِ رسول میں سے ہونے کی وجہ سے آخر اس چہرے کا کچھ تو احترام ہے۔ اس پر منصور نے برانگیختہ ہو کر جلاد سے کہا: الرَّأسَ، الرَّأسَ۔ ''سر پر، سر پر''۔ جلاد نے اس حکم کی تعمیل میں سرِ مبارک پر تقریباً تیس کوڑے برسائے۔ اس دوران ایک کوڑا آنکھ پر بھی لگا جس سے وہ بری طرح متاثر ہوئی۔

کوڑے مکمل کرنے کے بعد جب آپؒ کو باہر لایا گیا تو مار کی نیلاہٹ اور جلد پر خون کے جم جانے کے باعث آپؒ کا جسم کالا پڑ چکا تھا حالانکہ آپؒ لوگوں میں سب سے زیادہ حسین تھے۔ جب آپؒ کو باہر لایا جارہا تھا تو ایک

---

(1) تاریخ اسلام: ۳۲۸/۲

(2): ینظر: تاریخ الطبري: ۵۵۰/۷، مع مقاتل الطالبیین ص: ۲۵۳، و تذکرة الخواص، ص: ۱۹۸، وتاریخ الاسلام: ۱۸/۹، والطبقات الکبریٰ: ۳۸۸/۵

غلام نے آپؒ کی طرف بڑھ کر کہا: میں اپنی چادر آپ پر نہ ڈال دوں؟ آپؒ نے فرمایا: بَلٰی جُزِیتَ خَیرًا! وَاللّٰہِ إِنَّ لَشُفُوفَ إِزَارِي أَشَدُّ عَلَيَّ مِنَ الضَّرْبِ. ''ڈال دو، اللہ ہی تجھے اس کا نیک صلہ عطا فرمائے، واللہ! میرے ستر کا کھل جانا، کوڑوں سے زیادہ میرے لیے تکلیف دہ ہے''۔ اس کے بعد آپؒ نے پانی مانگا تو کسی میں یہ جرأت نہیں تھی کہ آپؒ کو پانی پلا سکے، آخر ایک خراسانی نے منصور کی آنکھوں سے اوجھل ہو کر پانی پلا دیا۔

پھر منصور کو پتا چلا کہ اہلِ خُراسان ''محمد بن عبداللہ'' (نفس زکیہ) کے ساتھ محبت و ہمدردی رکھتے ہیں، چنانچہ منصور نے ان کو یہ دھوکا دینے کے لیے کہ ''محمد بن عبداللہ'' (محمد نفس زکیہ) جس سے تمہیں عقیدت ومحبت ہے قتل کر دیا گیا ہے، جلاد کو حکم دیا کہ اِسی ''محمد بن عبداللہ'' (محمد دِیباج) کا سر قلم کر دو، چنانچہ سر تن سے جدا کر دیا گیا۔ پھر دھوکا دہی کی غرض سے منصور نے یہ سر خراسان بھجوایا اور اس سر کے ساتھ چند آدمی بھیجے جنہوں نے وہاں جا کر جا بجا لوگوں میں قسمیں کھا کھا کر یہ اعلان کیا: لوگو! یہ محمد بن عبداللہ کا سر ہے اور یہ محمد بن عبداللہ وہی ہے جو فاطمہ بنت رسول اللہ ﷺ کی اولاد میں سے ہے۔[1]

اسی طرح عبدالرحمن بن اَبی المَوالی کا بیان ہے کہ حضرت عبداللہ بن حسن مثنیٰ کے ساتھ میں بھی قیدیوں میں شامل تھا۔ رَبذہ میں منصور کے پاس جب میں اندر پہنچا تو میں نے اسے سلام کیا۔ اس نے مجھے سلام کا جواب نہ دیا بلکہ مجھے ڈانٹنا شروع کر دیا اور کہا: اللہ تجھے برباد کرے، یہ بتا کہ فاسق اور جھوٹے شخص کے وہ دونوں فاسق اور جھوٹے بیٹے کہاں ہیں؟ میں نے کہا: کیا سچ میرے لیے نفع بخش ثابت ہو سکتا ہے؟ کہنے لگا: وہ کیا؟ میں نے کہا: اگر مجھے ان کا کچھ پتا ہو تو میری بیوی کو طلاق ہو اور مزید میرے اوپر یہ ہو اور یہ ہو۔۔۔ مگر اس سب کے باوجود اس نے میری ایک نہ سنی اور کہا: کوڑے لاؤ، چنانچہ کوڑے لائے گئے اور مجھے ''عُقابَین'' (وہ دو لکڑیاں جن کے درمیان آدمی کو باندھ کر مارا جاتا ہے[2]) کے بیچ میں کھڑا کر کے چار سو کوڑے لگائے گئے جس سے میں اپنی عقل کھو بیٹھا، اس کے بعد مجھے میرے قیدی ساتھیوں کی طرف بھجوا دیا گیا۔[3]

---

(۱): ینظر الکامل فی التاریخ: ۵/ ۱۰۶-۱۰۴، بتلخیص وتسھیل، وبعضہ من البدایۃ والنھایۃ طھجر: ۱۳/ ۳۵۱، ومابعدھا

ملحوظـــــــة: ومن أراد الاستزادة فلیراجع: تاریخ الطبري: ذِکر حمل ولد حسن بن حسن الی العراق: ۷/ ۵۵۱-۵۳۹

(۲) انظر کلام المحقق فی التعلیق علی الطبقات الکبری، متمم التابعین - ص: ۲۵۶، نقلاً عن لسان العرب

(۳): سیر اعلام النبلاء: ۶/ ۲۱۳، والعبر فی خبر من غبر: ۱/ ۲۰۴، مع الطبقات الکبری: ۵/ ۳۸۸

اس ظالمانہ کارروائی سے فارغ ہو کر، منصور ان قیدیوں کو اپنی نگرانی میں لیے ہوئے ربذہ سے (عراق کی طرف) روانہ ہو گیا۔ [1]

ان حضرات کو اسی طرح طوق و بیڑیاں ڈال کر نہایت تنگ اور ننگے کجاووں میں بٹھایا گیا، راستے بھر ان میں سے ہر ایک کے اوپر ایک ایک فوجی مسلط رہا، اور کئی اعتبار سے ذلت آمیز و رسوا کن حالت میں ان حضرات کو عراق پہنچایا گیا۔ جب یہ عراق پہنچ گئے تو انہیں "ہاشمیہ" (عراق کا ایک شہر، جو کوفہ کے قریب واقع تھا اور اُس وقت کا دارالخلافہ تھا، [2]) کی تنگ جیل میں منتقل کر دیا گیا۔ ان حضرات میں محمد بن ابراہیم بن عبداللہ بھی تھے، یہ بھی بہت خوبصورت تھے، لوگ ان کے حسن و جمال کو دیکھنے آیا کرتے، انہیں "دیباجِ اصغر" کہا جاتا تھا۔ منصور نے انہیں اپنے سامنے بلا کر کہا: "دیباجِ اصغر" تجھے کہتے ہیں؟ آپؒ نے فرمایا: ہاں! مجھے کہتے ہیں۔ وہ ظالم کہنے لگا: لَأَقْتُلَنَّکَ قِتْلَةً مَا سَمِعَ بِهَا "آج تجھے اس طرح قتل کروں گا کہ کسی نے ایسا قتل سنا بھی نہ ہوگا"۔ پھر ایک ستون کے متعلق حکم دیا کہ اس کو اندر سے کُرید کر خلا بنا دیا جائے، اس کے بعد آپؒ کو زندہ حالت میں اس کے اندر ڈال کر اوپر سے بند کر دیا گیا۔

منصور نے ان کو جس جیل میں ڈال رکھا تھا وہ ہر طرف سے اس طرح بند اور باہر کی زندگی سے اس طور پر منقطع تھی کہ ان حضرات کو وہاں نہ اذان کی آواز سنائی دیتی تھی اور نہ ہی سورج کی روشنی پہنچتی تھی کہ جس سے نماز کا وقت ہی کم از کم معلوم ہو سکتا۔ ان حضرات کو وہاں جیل میں مختلف طریقوں سے مارا جاتا اور اسی طرح انواع و اقسام کی اذیتیں اور سزائیں دی جاتیں، جس سے ان میں سے بہت سارے حضرات وہیں جیل میں ہی فوت ہو گئے تھے جن میں حضرت عبداللہ بن حسن مثنیٰ اور ابراہیم بن حسن مثنیٰ بھی شامل تھے، بلکہ حضرت عبداللہ کے بارے میں زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ انہیں قتل کیا گیا تھا۔ [3] بعض نے کہا ہے کہ سب ہی اسی جیلِ ہاشمیہ میں فوت ہو گئے تھے، ان میں سے ایک بھی زندہ نہیں بچا تھا اور اس کی صورت بعض نے یہ بتائی ہے کہ ان سب حضرات کو وہاں جیل کے اندر ایک کمرے میں ڈال کر اوپر گارے سے اچھی طرح لپائی کرا دی تھی جس سے یہ حضرات وہیں اندر ہی شہید ہو گئے تھے۔ [4]

---

(۱) الکامل فی التاریخ: ۵/۱۰۶

(۲) الروض المعطار ص: ۵۹۱، مع الاعلام للزرکلی: ۴/۱۱۷-۱۱۶، و معجم البلدان: ۵/۳۸۹

(۳) ینظر: البدایۃ والنہایۃ ط ھجر: ۳۵۲ و ۱۳/۳۸۱، مع سیر اعلام النبلاء ۶/۲۱۳، و نثر الدر فی المحاضرات: ۱/۲۵۵، والکامل فی التاریخ: ۵/۱۰۷، ۱۰۶، و مجمع الآداب فی معجم الالقاب: ۵/۳۷

(۴) الطبقات الکبری: ۵/۳۳۹، مع شذرات الذہب فی اخبار من ذہب: ۲/۲۰۱

خروجِ نفسِ زکیہؒ (یعنی ظلم و ستم کے خلاف آوازِ حق کیلئے آپؒ کا باہر نکلنا) اور خلافتِ اسلامیہ کے قیام کی مہم

امام محمد نفس زکیہ سلامُ اللہ وَ رَحمۃُ علیہ، مدینہ طیبہ میں رُوپوش تھے، ان کو جب عباسیوں کے ہر طرف بڑھتے ہوئے اس ظلم کی اطلاعات موصول ہوئیں جس کا تھوڑا سا نقشہ اوپر بیان ہوا، تو اس ''ظلم'' کو روکنے اور ''حق'' کو قائم کرنے کے لیے آپؒ اٹھ کھڑے ہوئے (تاکہ اس ظالمانہ بادشاہت کو ختم کر کے، قرآن وسنت کی روشنی میں ایک اسلامی خلافت کے قیام کو عمل میں لایا جائے)، ''جُہَینہ'' (ایک معروف بہت بڑا قبیلہ جو مدینہ طیبہ کے اطراف میں دور دراز تک پھیلا ہوا تھا،[1]) اور ان کے ساتھ کچھ دیگر غیر معروف قبائل کے عرب لوگ، خود مدینہ طیبہ کی ایک بڑی تعداد (جس میں قریش وغیرہ سب شامل تھے) اور اس کے علاوہ بدوؤں کی بڑی اکثریت سمیت مختلف لوگ بھی حق کا ساتھ دینے کے لیے آپؒ کے ہمنوا ہو گئے۔[2]

آپؒ نے مدینہ طیبہ کو اپنا مرکز بنایا۔[3] آپؒ کے بھائی ابراہیم - جو آپؒ کے ہمراز و ہمسفر تھے پہلے ہی بصرہ پہنچ چکے تھے تاکہ وہ وہاں جا کر عباسی حکومت کے خلاف، ایک صحیح معنوں میں اسلامی خلافت کے قیام کی دعوت چلائیں،[4] اور اب آپؒ نے اپنے بیٹے ''عبداللہ اَشتر'' کو ایک جماعت کے ہمراہ، عمدہ نسل کے گھوڑے بطورِ ہدیہ دے کر، سندھ کی طرف روانہ کیا جہاں انہوں نے گورنرِ سندھ ''عمر بن حَفص'' سے ملاقات کر کے اُسے اس خلافتِ اسلامیہ کے قیام کے لیے امام نفسِ زکیہؒ کے ہاتھ پر بیعت کی دعوت دینی تھی کہ وہ اہلِ بیت سے گہری عقیدت و محبت رکھتا تھا۔ جب یہ حضرات اُسے جا کر ملے تو اُس نے یہ ہدایا قبول کر لیے، پھر انہوں نے اُسے مخفی طور پر امرِ مذکور کی دعوت دی، اُس نے دعوت قبول کر کے بیعتِ خلافت بھی کر لی۔ اس کے بعد اُس نے رؤسائے شہر، اپنی فوج کے سپہ سالاروں اور اپنے اہلِ خانہ کو بلا کر دعوت دی، انہوں نے بھی اس دعوت پر لبیک کہی اور بیعت کر لی، مگر حضرت عبداللہ اَشتر ابھی

([1]) المعالم الأثیرۃ فی السنۃ والسیرۃ، ص:۹۳

([2]) ینظر: ہماری بادشاہی/مختصر تاریخ اسلام، ص:۷۹، مع الطبقات الکبری:۵/۴۳۹

([3]) ہماری بادشاہی، ص:۷۹، وکذا یستفاد من میزان الاعتدال:۳/۵۹۱

([4]) البدایۃ والنہایۃ طہجر:۱۳/۳۷۳

وہیں مصروفِ دعوت تھے کہ امام نفسِ زکیہ شہید ہو گئے۔ [1]

اور مکہ مکرمہ کے لیے آپؒ نے حسن بن معاویہ بن عبداللہ کو دس گھڑ سواروں اور ستر پیادوں کے لشکر کا امیر بنا کر روانہ کیا، انہوں نے اس مٹھی بھر جماعت کے ساتھ، مدمقابل "سَرِی بن عبداللہ" -جو کہ منصور کی طرف سے مکہ کا گورنر تھا، کو اس کے ہزاروں جنگجوؤں پر مشتمل لشکر کے باوجود شکست دے دی اور مکہ مکرمہ پر غلبہ حاصل کر لیا۔ حضرت حسن بن معاویہ کو مکہ کے قیام میں ابھی چند ہی روز گزرے تھے کہ امام نفس زکیہ کا انہیں خط آیا جس میں آپ نے ان کو لکھا کہ منصور نے جنگ کے لیے عیسی بن موسی کی قیادت میں ایک بڑا لشکر روانہ کر دیا ہے اور وہ لشکر مدینہ کے قریب پہنچ چکا ہے لہذا تم بلا تاخیر اپنے ساتھ مجاہدین کی نَفَرِی لے کر مدینہ روانہ ہو جاؤ۔ خط ملنے کے بعد انہوں نے حکم تعمیل میں بہت سارے افراد پر مشتمل مجاہدین کا ایک بڑا دستہ تیار کیا، پیچھے مکہ میں ایک انصاری کو اپنا نائب مقرر کیا اور پیر کے روز شدید بارش کے دن میں، ان مجاہدین کو ساتھ لے کر مدینہ کی جانب روانہ ہو گئے، مگر افسوس کہ یہ لشکر امام نفس زکیہ کے کام نہ آسکا، وہ اس لیے کہ لشکر ابھی راستے میں مقامِ قُدَید کے قریب پہنچا تھا کہ ان کے پاس یہ اطلاع پہنچ گئی کہ امام نفسِ زکیہ شہید کر دیے گئے ہیں۔

اسی طرح مدینہ میں آپؒ کے غلبہ کے بعد وہاں بصرہ میں آپؒ کے بھائی ابراہیم کو بھی غلبہ حاصل ہو گیا تھا، اور آپؒ کو ان کے غلبہ کی اطلاع بھی ہو گئی جس سے آپؒ کو اور آپؒ کے ساتھیوں کو بہت خوشی ہوئی تھی (کہ قرآن وسنت کی روشنی میں اسلامی خلافت کے قیام کا منصوبہ، اب جلد اپنی تکمیل کو پہنچنے والا ہے (اور آپؒ فجر اور مغرب کی نماز کے بعد لوگوں میں یہ اعلان کیا کرتے تھے: أُدْعُوا اللهَ لِإِخْوَانِكُمْ أَهْلِ الْبَصْرَةِ وَلِلْحَسَنِ بْنِ مُعَاوِيَةَ بِمَكَّةَ، وَاسْتَنْصِرُوهُ عَلَى أَعْدَائِكُمْ. (اپنے بصرہ والے بھائیوں کے لیے، اور حسن بن معاویہ جو مکہ میں ہے اُس کے لیے اللہ تعالیٰ سے دعا کرو، اور اپنے دشمنوں کے خلاف اللہ سے مدد طلب کرو)، (تاہم بصرہ، مکہ کی نسبت چونکہ مدینہ سے بہت زیادہ دور ہے اس لیے وہاں کی کمک بھی آپؒ کی شہادت سے پہلے یقیناً آپؒ تک نہ پہنچ سکی ہوگی)۔ [2]

---

(1) البداية والنهاية ط هجر: ١٣/ ٣٢١ مع الكامل في التاريخ: ٥/ ١٦٦، والمنتظم في تاريخ الملوك والامم: ٨/ ١٢٥

(2) ينظر: البداية والنهاية ط هجر ١٣/ ٣٦٣، مع ط الفكر: ١٠/ ٨٧، مع تاريخ الطبرى: ٧/ ٥٧٦، ٥٧٥، والكامل: ٥/ ١٢٠

بہر حال اس دوران مختلف شہروں اور علاقوں میں آپؒ کے ہاتھ پر لوگوں کی بیعت ہوچکی تھی، [1] اور اِدھر مدینہ طیبہ میں آپؒ کے خروج کے بعد ایک بڑی تعداد آپؒ کے ساتھ مل چکی تھی اگرچہ یہ تعداد اتنی بڑی نہیں تھی جتنا آپؒ نے خروج سے قبل اس کا اندازہ کر رکھا تھا، وہ اس لیے کہ دراصل آپؒ کے اتنا طویل عرصہ روپوش رہنے کے دوران منصور عباسی نے آپؒ کی جستجو میں جہاں زور وزَر کا استعمال کیا تھا وہاں جھوٹ ودھوکا دہی پر مشتمل یہ حیلہ بھی بکثرت استعمال کیا تھا کہ وہ مسلسل مختلف شہروں کے لوگوں کی طرف سے امام نفس زکیہؒ کے نام خطوط لکھوا لکھوا کر مکہ معظمہ ومدینہ منورہ کے ایسے لوگوں کے پاس بھجواتا رہتا تھا جن کے متعلق اس کو شبہ تھا کہ یہ "محمد نفس زکیہ" کے ہمدرد اور ان کے حال سے باخبر ہیں۔ ان جھوٹے خطوط میں لوگوں کی طرف سے اظہارِ عقیدت اور منصور کی برائیاں درج ہوتی تھیں اور امام نفس زکیہ کو "خروج" کے لیے ترغیب دی جاتی تھی۔ منصور کا مدعا یہ تھا کہ اس طرح ممکن ہے خود محمد نفس زکیہ تک بھی کوئی جاسوس پہنچ جائے اور وہ گرفتار ہوسکیں۔ یہ مدعا تو حاصل نہ ہوا لیکن یہ ضرور ہوا کہ نفس زکیہ کو ایسے خطوط کی اطلاع اپنے دوستوں کے ذریعہ پہنچتی رہی اور ان کو اپنے ہمنواؤں اور فدائیوں کا اندازہ کرنے میں کسی قدر غلط فہمی ہوگئی یعنی انہوں نے اپنی جماعت کا اندازہ حقیقت سے زیادہ کرلیا۔ [2]

"خروج" کا مقصد، طریقۂ کار اور پیش آمدہ حالات:

امام نفس زکیہ سَلامُ اللّٰہِ وَرَحمَۃُ علیہ کے "خروج" کی قدرے تفصیل یہ ہے کہ یکم رجب ۱۴۵ھ کی شب، آپؒ نے اڑھائی سو (۲۵۰) گھڑسواروں پر مشتمل ایک جماعت کو ساتھ لیا اور وقت کی جابر حکومت کے خلاف، مدینہ طیبہ میں آوازِ حق بلند کردی، اور سب کے سامنے باہر آگئے۔ [3]

---

(۱) المنتظم فی تاریخ الملوک والامم: ۲۱۲/۷،

فائدہ: آپؒ کے بھائی ابراہیم کی دعوت بصرہ کے متعلق دو قول ہیں: ایک قول یہ ہے کہ امام نفس زکیہ کی حیات میں وہ بصرہ میں آپؒ کے ہاتھ پر بیعت کی دعوت دیتے رہے، جب آپؒ کی شہادت ہوگئی تو پھر اپنے ہاتھ پر بیعت دعوت دینا شروع کی، دوسرا قول یہ ہے کہ بصرہ پہنچ کر انہوں نے شروع سے ہی اپنے ہاتھ پر بیعت کی دعوت دی (کہ انہوں نے حکمت اور مصلحت اسی میں سمجھی)۔ پہلا قول مشہور مورخ "واقدی" کا ہے، اور ابن کثیر کے بیان کے موافق دوسرا قول مشہور ہے، واللہ اعلم۔ ملاحظہ ہو: البدایۃ والنہایۃ ط الفکر: ۹۱/۱۰، بہر حال مختلف شہروں اور علاقوں میں امام نفس زکیہ کے ہاتھ پر لوگوں کی بیعت ہوچکی تھی جیسا کہ: المنتظم فی تاریخ الملوک والامم: ۲۱۲/۷، کے حوالہ سے اوپر گزرا۔

(۲) تاریخ اسلام: ۳۲۹/۲، بعضہ فی المنتظم فی تاریخ الملوک والأمم: ۶۴/۸

(۳) البدایۃ والنہایۃ ط ھجر: ۳۵۷/۱۳، ۳۵۶، وتاریخ الطبری: ۵۵۶/۷، والعبر فی خبر من غبر: ۱۵۲/۱، وتاریخ اسلام: ۲۲/۹ سیر اعلام النبلاء: ۲۱۴/۴

واضح رہے کہ متعدد اصحابِ تاریخ کی وضاحت کے مطابق آپؒ کا یہ ''خروج'' کسی دنیوی غرض سے نہ تھا، بلکہ یہ خروج صرف اور صرف آخرت کے جذبے اور رضائے الٰہی کی بنیاد پر تھا۔ [1]

آپؒ بوقتِ خروج، گدھے پر سوار تھے۔ مُضَری قبیلہ کی زرد ٹوپی پر عمامہ باندھ رکھا تھا، زرد رنگ کا ایک جبہ زیبِ تن کیا ہوا تھا، کوکھ پر کپڑا باندھ کر کمر کس رکھی تھی، تلوار کو ہاتھ میں تھامنے کے بجائے گلے میں لٹکا رکھا تھا اور اپنے ساتھیوں کو پکار پکار کر کہہ رہے تھے: ''لَاتَقْتُلُوْا اَلَاتَقْتُلُوْا اِلَّا یَقْتُلُوْا'' (کسی کو قتل نہ کرنا، کسی کو قتل نہ کرنا، مگر یہ کہ وہ تمہیں قتل کرنے لگیں)۔ [2] سب سے پہلے سیدھے، مدینہ میں بنائی گئی جیل میں گئے اور وہاں قید میں پڑے افراد کو رہا کر دیا پھر ''دارُ الِامارۃ'' (حاکمِ شہر کی رہائشی عمارت) میں آئے۔ اس کا محاصرہ کر کے اسی وقت فتح کر لیا اور حاکمِ مدینہ ''رِیاح بن عثمان مُرّی'' کو گرفتار کر کے مروان کے گھر میں قید کر دیا اور اس کے ساتھ مسلم بن عقبہ کے بیٹے کو بھی قید کر دیا کہ اُس نے اِسی شب کے آغاز میں ''رِیاح مُری'' کو آلِ حسین کے قتل کا مشورہ دیا تھا، وہ تو بچ گئے تھے مگر یہ خود محاصرے میں آ گیا۔ الغرض جب صبح ہوئی تو امام نفس زکیہ کو مدینہ پر غلبہ حاصل ہو چکا تھا اور اہلِ مدینہ نے ان کی اطاعت کر لی تھی۔ آپؒ نے لوگوں کو فجر کی نماز پڑھائی اور اس میں ''سورۂ فتح'' کی تلاوت کی۔ اور دن کو اہلِ مدینہ سے خطاب کیا جس میں بنوعباس پر ہونے والے اعتراضات پر بات کی اور ان کی قابلِ مذمت چیزوں کو ذکر کیا۔ نیز اپنے متعلق لوگوں کو یہ بھی بتایا کہ میں جس شہر میں بھی گیا ہوں وہاں کے لوگوں نے مکمل اطاعت و تابعداری کے ساتھ میرے ہاتھ پر بیعت کی ہے، چنانچہ سوائے چند افراد کے تمام اہلِ مدینہ نے آپؒ کے ہاتھ پر بیعت کر لی۔

اب جبکہ مدینہ منورہ پر مکمل کنٹرول حاصل ہو چکا تھا، آپؒ انتظامی امور کی طرف متوجہ ہوئے چنانچہ عثمان بن محمد کو مدینہ میں اپنا نائب مقرر کیا، عبدالعزیز بن مُطّلِب مخزومی کو قاضی متعین کیا، عثمان بن عبیداللہ کو پولیس کا سربراہ بنایا، عبداللہ بن جعفر کو وظائف و عطیات کے دفتر کا امیر طے کیا۔

جس رات آپؒ نے خروج کیا، اُسی رات مدینہ کا ایک شخص مدینہ سے روانہ ہو کر لمبے لمبے سفر طے کرتا ہوا سات راتوں کی مسافت طے کر کے منصور کے پاس پہنچ گیا، جب وہاں پہنچا تو رات کا وقت تھا اور منصور سو چکا تھا۔ اِس نے

---

(۱) ینظر دول الاسلام: ۱/۱۳۲، ومرآۃ الجنان: ۱/۲۳۳، والعبر فی خبر من غبر: ۱/۱۵۲، والتحفۃ اللطیفۃ: ۲/۴۹۲،

(۲) تاریخ الطبری: ۷/۵۵۷، مع الافادۃ فی تاریخ الائمۃ السادۃ، ص: ۲۸، والکامل فی التاریخ: ۵/۱۱۰، والتحفۃ اللطیفۃ فی تاریخ المدینۃ الشریفۃ: ۲/۴۹۲

دربان سے کہا: امیر المومنین سے میرے بارے میں اندر جانے کی اجازت طلب کریں۔ اُس نے کہا: یہ اُن کے جگانے کا وقت نہیں ہے۔ اِس نے کہا: بہت ضروری بات ہے۔ دربان نے جاکر بادشاہ کو اطلاع دی، وہ نیند سے بیدار ہوا اور باہر آتے ہی اِسے کہا: تیرا ناس ہو! کیا بات ہے؟ اِس نے بتایا کہ محمد نفس زکیہ نے مدینہ میں آپ کے خلاف خروج کر لیا ہے۔ منصور نے کسی گھبراہٹ اور پریشانی کا اظہار کیے بغیر اِسے کہا کہ کیا تُو نے خود یہ دیکھا ہے؟ اِس نے کہا: جی ہاں، حضور! یہ سن کر منصور کہنے لگا: واللہ! وہ ہلاک ہو گیا ہے اور اپنے پیروکاروں کو بھی ہلاک کر دیا ہے۔ پھر یہ کہہ کر اندر چلا گیا کہ فی الحال اِس شخص کو قید میں رکھو۔ اس کے بعد یکے بعد دیگرے خروجِ نفس زکیہ کی اتنی اطلاعات اور خبریں موصول ہونے لگیں کہ اس کے سچ ہونے میں ذرہ بھر شبہ نہ رہا، اس پر منصور نے اِس کو قید سے رہا کر دیا اور ہر رات کی قید کے عوض ایک ہزار درہم دیا، اس طرح اسے کُل سات ہزار درہم دے کر قید سے آزاد کر دیا۔

[اس دوران منصور نے ایک خواب بھی دیکھا کہ اُس نے امام نفس زکیہ کے ساتھ کشتی کی ہے جس میں اُنہوں نے اِس کو زمین پر گرا دیا اور اِس کے سینے پر چڑھ کر بیٹھ گئے۔ اِس خواب نے منصور کی نیندیں اڑا دیں اور وہ نہایت مغموم ہوا چنانچہ اس نے معبّرین (تعبیر بتانے والوں) کو اکٹھا کیا اور اُن کے سامنے خواب رکھا، یہ خواب سن کر وہ سب خاموش رہ گئے کسی ایک نے بھی تعبیر نہ بیان کی۔ آخر ایک معبر نے کہا: اس کی تعبیر یہ ہے کہ آپ کو فتح حاصل ہوگی۔ منصور نے پوچھا کہ یہ تعبیر تم نے کیسے بیان کی؟ جواب دیا: کیونکہ آپ زمین پر تھے لہذا یہ زمین آپ کی ہوگی اور وہ آپ کے اوپر تھا، لہذا آسمان اُس کا ہوگا (یعنی قتل ہو کر اس کی روح آسمان کو پرواز کرے گی)، یہ سن کر منصور کا غم کچھ ہلکا ہوا۔][1]

منصور کی طرف سے جنگ کی تیاری اور خطوط کی مراسلت:

بہرحال آپؒ کے خروج کی یقینی خبروں سے منصور ایک حد تک کافی پریشان تھا، بعض نجومیوں نے تسلی دینے کی کوشش کی اور کچھ لوگوں نے جنگ کرنے کا مشورہ دیا، چنانچہ اُس نے اپنے خاص سپہ سالار ''عیسیٰ بن موسیٰ'' کو بلوا کر اِس جنگی مہم پر اُسے مامور کیا، پھر کہا: میں جنگ کرنے سے پہلے ایک خط لکھ کر اُسے تنبیہ کرتا ہوں، اور درج ذیل خط لکھ کر روانہ کر دیا:

---

(1) نثر الدر في المحاضرات: ۷/۱۲۲

بسم اللہ الرحمن الرحیم

امیر المومنین عبداللہ (منصور کا نام ''عبداللہ بن محمد بن علی'' تھا، ''منصور'' اس کا لقب تھا، ۱) کی طرف سے، محمد بن عبداللہ کی طرف:

اس کے بعد قرآن مجید کی درج ذیل آیات لکھیں جو اس مقام و موقع سے متعلق تو نہیں تھیں مگر اُس نے اِن آیات کو حضرت امام نفس زکیہ جیسی نیک و پاکیزہ ہستی پر ناحق چسپاں کر دیا:

{إِنَّمَا جَزَاءُ الَّذِينَ يُحَارِبُونَ اللهَ وَرَسُولَهُ وَيَسْعَوْنَ فِي الْأَرْضِ فَسَادًا أَنْ يُقَتَّلُوا أَوْ يُصَلَّبُوا أَوْ تُقَطَّعَ أَيْدِيهِمْ وَأَرْجُلُهُمْ مِنْ خِلَافٍ أَوْ يُنْفَوْا مِنَ الْأَرْضِ ذَلِكَ لَهُمْ خِزْيٌ فِي الدُّنْيَا وَلَهُمْ فِي الْآخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيمٌ إِلَّا الَّذِينَ تَابُوا مِنْ قَبْلِ أَنْ تَقْدِرُوا عَلَيْهِمْ فَاعْلَمُوا أَنَّ اللهَ غَفُورٌ رَحِيمٌ (المائدہ: ۳۳، ۳۴)

ترجمہ: جو لوگ اللہ اور اس کے رسول سے لڑائی کرتے اور زمین میں فساد مچاتے پھرتے ہیں، ان کی سزا یہی ہے کہ انہیں قتل کر دیا جائے، یا سولی پر چڑھا دیا جائے، یا ان کے ہاتھ پاؤں مخالف سمتوں سے کاٹ ڈالے جائیں، یا انہیں زمین سے دور کر دیا جائے۔ یہ تو دنیا میں ان کی رسوائی ہے اور آخرت میں ان کے لیے زبردست عذاب ہے* ہاں وہ لوگ اس سے مستثنیٰ ہیں جو تمہارے ان کو قابو میں لانے سے پہلے ہی توبہ کر لیں۔ ایسی صورت میں یہ جان رکھو کہ اللہ بہت بخشنے والا، بڑا مہربان ہے*

اس کے بعد لکھا: تمہارے لیے اللہ کا عہد و میثاق اور اللہ و رسول کی امان ہے، اگر تم اپنے اس اِقدام سے باز آ کر میری اطاعت کی طرف لوٹ آؤ گے تو میں تمہیں اور تمہارے پیروکاروں کو ضرور امان دوں گا، اور مزید یہ کہ تمہیں دس لاکھ درہم (مساوی تقریباً اکیس کروڑ روپے) دوں گا، اس کے علاوہ تمہاری ہر ضرورت پوری کروں گا اور جس شہر میں بھی تم رہائش اختیار کرنا چاہو میری طرف سے اس کی کھلی اجازت ہوگی۔ الغرض (اس طرح کی اور بھی کئی پیش کشوں پر مشتمل ۲) ایک مفصل خط لکھا۔

---

(۱) نزهة الألباب في الألقاب: ۲/۲۰۲، والاعلام للزركلي: ۴/۱۱۷،

(۲) كما ترى في الكامل في التاريخ: ۵/۱۱۵، ۱۱۴، وتاريخ الطبرى: ۷/۵۶۶، وتاريخ ابن خلدون: ۴/۷

اس کے جواب میں امام نفس زکیہؒ نے لکھا:

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اللہ کے بندے مہدی محمد بن عبداللہ کی طرف سے (عبداللہ بن محمد کی طرف [1]):

اس کے بعد آپؒ نے درج ذیل چند آیات لکھیں جن کے اندر زمین میں سرکشی اختیار کرنے اور ظلم وستم ڈھانے کی مذمت کی گئی ہے، یقیناً ان آیات میں منصور کے لیے نصیحت کا سامان تھا اگر وہ سمجھتا۔

{طسم (۱) تِلْکَ آیَاتُ الْکِتَابِ الْمُبِینِ (۲) نَتْلُو عَلَیْکَ مِنْ نَبَإِ مُوسَی وَفِرْعَوْنَ بِالْحَقِّ لِقَوْمٍ یُؤْمِنُونَ (۳) إِنَّ فِرْعَوْنَ عَلَا فِي الْأَرْضِ وَجَعَلَ أَهْلَهَا شِیَعًا یَسْتَضْعِفُ طَائِفَةً مِنْهُمْ یُذَبِّحُ أَبْنَاءَهُمْ وَیَسْتَحْیِي نِسَاءَهُمْ إِنَّهُ كَانَ مِنَ الْمُفْسِدِینَ (۴) وَنُرِیدُ أَنْ نَمُنَّ عَلَى الَّذِینَ اسْتُضْعِفُوا فِي الْأَرْضِ وَنَجْعَلَهُمْ أَئِمَّةً وَنَجْعَلَهُمُ الْوَارِثِینَ (۵)} (سورۃ القصص)

ترجمہ: طسم * یہ اس کتاب کی آیتیں ہیں جو حقیقت واضح کرنے والی ہے * ہم ایمان والے لوگوں کے فائدے کے لیے تمہیں موسیٰ اور فرعون کے کچھ حالات ٹھیک ٹھیک پڑھ کر سناتے ہیں * واقعہ یہ ہے کہ فرعون نے زمین میں سرکشی اختیار کر رکھی تھی، اور اس نے وہاں کے باشندوں کو الگ الگ گروہوں میں تقسیم کر دیا تھا جن میں سے ایک گروہ کو اس نے اتنا دبا کر رکھا ہوا تھا کہ ان کے بیٹوں کو ذبح کر دیتا تھا، اور ان کی عورتوں کو زندہ چھوڑ دیتا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ ان لوگوں میں سے تھا جو فساد پھیلایا کرتے ہیں * اور ہم یہ چاہتے تھے کہ جن لوگوں کو زمین میں دبا کر رکھا گیا ہے، اُن پر احسان کریں، اُن کو پیشوا بنائیں، اُنہی کو ملک ومال کا وارث بنادیں *

اس کے بعد لکھا: میں بھی تم پر اسی طرح امان پیش کرتا ہوں جس طرح تم نے مجھ پر پیش کی ہے، اور دیکھو میں تم سے زیادہ اس امارت وخلافت کا حق دار ہوں۔ اس کے بعد امام نفس زکیہؒ نے اپنی نسبتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور شرف نسب کی طرف، اُسے توجہ دلائی جس میں اور باتوں کے ساتھ یہ بات بھی لکھی کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت فاطمۃ الزہراءؓ کی اولاد میں سے ہوں اور سلسلۂ آباء میں میرے والد

---

(۱) تاریخ الطبري: ۷/ ۵٦٦

حضرت حسنؓ اوران کے بھائی حضرت حسینؓ جنت کے نوجوانوں کے سردار ہیں۔

پھر آخر میں لکھا بہر حال میں تم سے امارت کا زیادہ حقدار ہوں، (میں نے تم سے ''امان'' کا وعدہ کیا ہے) اور میں تم سے زیادہ وعدہ وفا کرنے والا ہوں۔ تم تو وعدہ کر کے توڑ دیتے ہو اور اُسے پورا نہیں کرتے جیسا کہ تم نے ''ابنِ ہُبیرہ'' کے ساتھ کیا ہے، تم نے پہلے اسے عہد دیا پھر تم نے اس سے خیانت کی، اور خائن امام سے بڑھ کر کسی کو سخت عذاب نہیں ہوگا۔ اسی طرح تم نے اپنے چچا عبداللہ بن علی اور ابو مسلم خُراسانی کے ساتھ خیانت کی۔ اگر مجھے معلوم ہوتا کہ تم سچ بول رہے ہوتو (ممکن ہے) میں تمہاری دعوت قبول کر لیتا، لیکن تم جیسے شخص کا میرے جیسے آدمی کے ساتھ وعدہ پورا کرنا بہت بعید لگتا ہے (بظاہر تمہاری طرف سے مجھے قتل کرنے کا یہ محض ایک فریب معلوم ہوتا ہے، واللہ اعلم)۔ والسلام۔[1]

منصور نے اس کے جواب میں غصے سے بھرا ہوا انتہائی نامناسب الفاظ پر مشتمل تفصیلی خط لکھا جس میں اس نے سیدنا حضرت علی کرم اللہ وجہہ اور نوجوانانِ جنت کے سرداران حضرت حسن وحسین رضی اللہ عنہما کے بارے میں نہایت نازیبا الفاظ استعمال کیے مثلاً حضرت حسنؓ کے متعلق لکھا: ''تمہارے دادا حسن نے اپنی خلافت، معاویہ کے ہاتھ چند چیتھڑوں اور کوڑیوں کے بدلے فروخت کردی تھی اور پھر مدینے چلا گیا تھا، اور حرام مال لے کر حکومت کی باگ ڈور نااہل شخص کے سپرد کردی تھی۔'' اس کے بعد امام نفس زکیہؒ کو مخاطب کرتے ہوئے لکھا: لہٰذا اگر خلافت میں تمہارا کوئی حق تھا بھی سہی، تو تم اس کو بیچ کر اس کے پیسے وصول کر چکے ہو (چنانچہ اب خلافت میں تمہارا کوئی حق نہیں ہے اور تم خلیفہ بننے کے قطعاً مستحق نہیں رہے ہو)۔[2]

---

(۱) ينظر: البداية والنهاية: ط هجر: ۱۳/۳۵٦ وما بعدها، مع ط الفكر: ۱۰/۸۳ وما بعدها بتلخيص. وإن شئت التفصيل فراجع معه: الكامل في التاريخ: ۵/۱۰۹ وتاريخ الطبري: ۷/۵۵۲ وتاريخ الإسلام للذهبي: ۹/۲۱، والمنتظم في تاريخ الملوك والأمم: ۸/۶۳

(۲) البداية والنهاية ط هجر: ۱۳/۳٦۱، مع الكامل في التاريخ: ۵/۱۸ وتاريخ ابن خلدون: ۹/۳ وتذكرة الخواص، ص: ۲۰۲

منصور کی طرف سے جنگی لشکر کی روانگی:

منصور نے مذکورہ بالا، غصے سے بھرا ہوا، آخری خط امام نفس زکیہ کی طرف روانہ کر دیا۔ اس کے بعد اپنے خاص سپہ سالار ''عیسیٰ بن موسیٰ'' کو بلوایا [جو کہ رشتہ میں منصور کا بھتیجا تھا،[1] اور اپنی جنگی مہارت وشجاعت کی بناء پر ''فَحلُ بَنِي العَبّاس'' (عباسیوں کا طاقتور جوانمرد) کہلاتا تھا[2]] پھر اپنی فوج میں سے چھانٹ چھانٹ کر چار ہزار طاقتور و بہادر جنگجوؤں کا ایک لشکر مرتب کیا، جن میں محمد بن ابی العباس سَفّاح، حُمید بن قَحطَبہ طائی، ہزار مَرد [اس کا نام عمر بن حفص تھا مگر عجم اسے ''ہزار مرد'' (یعنی ہزار مَردوں کے برابر ایک مرد) کہا کرتے تھے، پھر یہ اسی نام سے معروف ہو گیا]،[3] کثیر بن حُصَین عَبدی اور جعفر بن حنظلہ بَہرانی کے نام سرفہرست ہیں۔

لشکر کو بھیجنے سے قبل منصور نے اسی جعفر بن حنظلہ بَہرانی سے، خروجِ نفس زکیہ کے معاملہ میں، مشورہ بھی لیا تھا کیونکہ یہ اپنے زمانے کا سب سے بڑا ماہرِ جنگ شمار ہوتا تھا، اس نے کہا تھا: امیر المومنین! اللہ کا شکر ادا کریں (پریشان نہ ہوں) کیونکہ محمد بن عبداللہ ایسے شہر میں ہے جہاں نہ مال ہے نہ جوان ہیں، نہ گھوڑے ہیں اور نہ ہتھیار ہیں۔ آپ اس طرح کریں کہ اپنے قابلِ اعتماد غلاموں کو بلا کر اُن کا ایک گروہ وادی القُریٰ کی طرف بھیج دیں جو شام سے مدینہ آنے والے غلے کو وہیں روک لیا کرے تاکہ محمد بن عبداللہ اور اس کے ساتھی بھوک سے مر جائیں، چنانچہ امام نفسِ زکیہ کو بھوکا مارنے کی خاطر، منصور یہ بھی کر گزرا۔

پھر عیسیٰ بن موسیٰ کو مذکورہ بھاری بھر وغیر معمولی لشکرِ جرار دے کر جنگ کے لیے مدینہ طیبہ کی طرف روانہ کر دیا۔

---

(۱) -فائدہ: صحیح یہی ہے کہ یہ منصور کا بھتیجا تھا، کیونکہ اِس کا نسب نامہ یہ تھا: عیسی بن موسی بن محمد بن علی بن عبداللہ بن عباس، اور منصور کا نسب نامہ تھا: عبداللہ بن محمد بن علی بن عبداللہ بن عباس، لہذا اِس کا والد، ''منصور'' اور ''سفاح'' کا بھائی تھا، چنانچہ وہ دونوں اِس کے چچے اور یہ اُن کا بھتیجا ہوا۔
کماتری فی الکامل فی التاریخ: ۵/ ۱۲۱، وسیر اعلام النبلاء: ۷/ ۴۰۱، والانباء فی تاریخ الخلفاء، ص: ۶۳، وتجارب الأمم وتعاقب الهمم: ۳/ ۳۲۳، وغیرها من المصادر الکثیرة، وأما لتحقیق هذا المقال فراجع: [سیر أعلام النبلاء: ۷/ ۴۳۴، مع تاریخ بغداد وذیوله: ۹/ ۲۵، تعلیق المحقق على الأعلام للزرکلي: ۴/ ۱۱۷، الأعلام للزرکلي: ۵/ ۱۱۰ الهذا (تاریخ الإسلام للذهبي: ۹/ ۲۶، ومرآة الجنان للیافعي: ۱/ ۲۳۳، وغیرہ میں جو اِس کو منصور کا چچازاد بھائی لکھا ہے وہ تسامح ہے، واللہ اعلم۔
(۲) الوافی بالوفیات: ۳/ ۲۴۲
(۳) الأعلام للزرکلي: ۵/ ۴۴، والاشتقاق، ص: ۴۸۲، والإعلام بمن في تاریخ الهند من الأعلام المسمی بـ ''نزهة الخواطر وبهجة المسامع والنواظر'': ۱/ ۴۷

منصور نے عیسیٰ بن موسیٰ کو رخصت کرتے وقت کہا: عیسیٰ! میں تجھے اپنے دونوں پہلوؤں کی طرف بھیج رہا ہوں، اگر تُو اس شخص پر فتح پالے تو اپنی تلوار نیام میں کرلینا، اور لوگوں میں امان کا اعلان کرا دینا، اور اگر وہ چھپ جائے تو لوگوں کو اُس کا ذمہ دار ٹھہرانا یہاں تک وہ اُسے تیرے پاس لے آئیں کیونکہ وہ اُس کے راستوں کو تم سے بہتر جانتے ہیں، آلِ ابی طالب میں سے جو تمہیں ملنے آجائے اس کا نام لکھ کر مجھے بھیج دینا اور جو تمہیں ملنے نہ آئے اس کے مال پر قبضہ کرلینا۔

آپؒ کی جنگی حکمتِ عملی اور اِس دفاعی جنگ کے مقدمات:

جب امام نفس زکیہؒ کو عیسیٰ بن موسیٰ کے لشکر کے متعلق اطلاع ملی کہ وہ مدینہ طیبہ کے قریب پہنچنے والا ہے تو آپؒ نے اپنے ساتھیوں سے جنگ کی حکمتِ عملی کے متعلق مشورہ کیا کہ یہاں مدینہ شہر کے اندر رہا جائے جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ عیسیٰ بن موسیٰ یہاں پہنچ کر شہر کا محاصرہ کرے گا (اور ہم یہاں اندر سے اس کے حملوں کا جواب دیں گے) یا اپنے ساتھیوں سمیت باہر نکل کر ان عراقیوں سے مقابلہ کیا جائے؟ آراء میں اختلاف ہوا کہ بعض نے پہلی صورت مناسب سمجھی، بعض نے دوسری۔ بالآخر پہلی صورت پر اتفاقِ رائے ہوا کہ باہر نکل کر لڑنے کے بجائے یہیں شہر کے اندر سے ہی مقابلہ کیا جائے، پھر اس رائے پر بھی اتفاق ہوگیا کہ مدینہ کے اردگرد خندق کھودی جائے جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جنگِ خندق کے موقع پر کھودی تھی، چنانچہ امام نفس زکیہؒ نے بھی ان آراء سے مکمل اتفاق کیا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اقتداء میں اپنے ساتھیوں کے ساتھ مل کر بنفسِ نفیس خندق کھودنے میں شریک ہوگئے۔ یہ خندق عین اسی جگہ کھودی گئی جہاں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کھودی تھی۔ کھدائی کے دوران رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کھودی ہوئی خندق کی ایک اینٹ سامنے آگئی، اس کو دیکھ کر سب کے چہروں پر خوشی کی لہر دوڑ گئی، زور سے ''اللہ اکبر'' کا نعرہ بلند کیا، اور آپؒ کو نصرتِ الٰہی کی خوشخبری دیتے ہوئے کہنے لگے: هٰذَا خَنْدَقُ جَدِّكَ رَسُوْلِ اللّٰهِ ''یہ آپ کے نانا صلی اللہ علیہ وسلم کی خندق ہے''۔ اس وقت آپؒ بھی وہاں موجود تھے اور سفید قباء اوڑھ رکھی تھی جس کے درمیان میں پٹکا باندھا ہوا تھا۔

جب عیسیٰ بن موسیٰ نے مدینہ کے قریب آکر ''اَعْوَص'' (مدینہ کے مشرق میں چند ہی میل کے فاصلے پر واقع ایک مقام تھا،[1] جہاں آج کل (۱۴۰۸ھ میں) مدینہ کا ایئرپورٹ ہے،[2]) میں پڑاؤ ڈالا اور آپؒ کو اس پڑاؤ کی اطلاع

---

(۱) معجم البلدان: ۱/۲۲۳، ومراصد الاطلاع علی اسماء الامکنة والبقاع: ۱/۹۶

(۲) المعالم الأثیرة في السنة والسیرة ص: ۳۱، ومعجم المعالم الجغرافیة في السیرة النبویة ص: ۳۱

ہوئی تو آپؒ منبر پر تشریف لائے اور لوگوں میں وعظ فرمایا جس میں جہاد پر ابھارا، منجملہ اور باتوں کے آپؒ نے یہ بھی فرمایا: ''میں اپنی بیعت کے سلسلہ میں تم لوگوں پر جبر وزبردستی نہیں کرتا بلکہ تمہیں آزادی دیتا ہوں، لہٰذا جو اس بیعت پر برقرار رہنا چاہے، وہ برقرار رہے اور جو اس کو چھوڑنا چاہے تو چھوڑ سکتا ہے۔'' آپؒ کے اس جملے پر اکثر لوگ آپؒ کو چھوڑ کر چلے گئے اور ایک مختصر سی جماعت آپؒ کے ساتھ باقی رہ گئی۔

عباسی لشکر کی جنگی حکمتِ عملی:

اُدھر سے عیسیٰ بن موسیٰ نے آگے بڑھ کر مدینہ سے صرف ایک میل کی مسافت پر پڑاؤ ڈال لیا، مگر پھر ایک جنگی حکمتِ عملی کے تحت پیچھے ہٹ کر چار میل کی مسافت پر مقامِ ''جُرف'' میں پڑاؤ ڈالا، اور یہ ۱۲/رمضان المبارک، ۱۴۵ھ بروز ہفتہ کی صبح تھی۔ اس دوران عیسیٰ بن موسیٰ نے پانچ سو گھڑسواروں کا ایک دستہ، ''ذوالحُلَیفہ'' کے پاس، مکہ جانے والے راستہ پر متعین کر دیا اور انہیں ہدایات دیتے ہوئے کہا کہ یہ شخص (یعنی امام نفس زکیہ) اگر بھاگا تو مکہ کے سوا اس کی کہیں جائے پناہ نہیں ہے لہٰذا اس کے مکہ جانے کے سامنے تم آڑ بن جانا۔ اس کے بعد اُس نے آپؒ کے پاس قاصد بھیج کر یہ پیغام دیا: ''امیر المومنین خلیفہ منصور عباسی کی اطاعت پر آجاؤ۔ انہوں نے (یعنی خلیفہ نے) تمہیں اور تمہارے اہلِ خانہ کو امان دی ہے اگر تم اس کی اطاعت قبول کر لو۔'' آپؒ نے اس کے جواب میں اپنے قاصد کے ہاتھ عیسیٰ بن موسیٰ کو یہ پیغام بھیجا: ''میں تمہیں کتاب اللہ، سنتِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور اطاعتِ الٰہی کی طرف دعوت دیتا ہوں، اور اُس کی پکڑ اور عذاب سے تمہیں ڈراتا ہوں۔ ربِ ذوالجلال کی قسم! (اللہ کی بنیاد پر کیے جانے والے اپنے) اس فیصلہ سے میں کسی صورت پیچھے ہٹنے والا نہیں ہوں یہاں تک کہ میں اسی حال میں اپنے اللہ سے جا ملوں، اور تُو اس بات سے بچ کہ تجھے وہ آدمی (اس سے مراد خود نفس زکیہ ہیں) قتل کرے جو تجھے اللہ کی طرف دعوت دے رہا ہے کہ اس صورت میں تُو بہت بُرا مقتول قرار پائے گا، یا پھر تُو اُسے قتل کرے تو یہ تیرے نامہ اعمال میں ایک عظیم جرم وسنگین گناہ ہوگا اور تُو ایک ایسے شخص کا قاتل ٹھہرے گا جس نے تجھے اللہ اور رسول کی اطاعت کی دعوت دی تھی۔'' آپؒ کا یہ پیغام جب عیسیٰ کے پاس پہنچا تو اس نے جواب میں کہلا بھیجا: اب ہمارے درمیان جنگ ہی ہوگی۔

الغرض تین دن تک قاصد ایک دوسرے کے پاس اس طرح پیغامات لاتے رہے اور عیسیٰ نے ان تین دنوں کے دوران ہر روز پہاڑی پر چڑھ کر اہلِ مدینہ میں اعلان کیا جس میں انہیں جنگ سے کنارہ کش رہنے اور اپنی طرف سے

انہیں امن دینے کا کہا اور یہ بھی کہا کہ ہمارا مطلوب صرف "محمد" (یعنی امام نفس زکیہ) ہے تاکہ ہم اسے امیر المومنین کے پاس لے جائیں۔ مگر لوگوں نے اُس کا امن قبول کرنے کے بجائے اُسے سخت جوابات دیے اور یہ بھی کہا: "هٰذَا ابْنُ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَعَنَا وَنَحْنُ مَعَهٗ، وَنُقَاتِلُ دُوْنَهٗ." (ہمارے ساتھ رسول اللہ ﷺ کا صاحبزادہ ہے اور ہم اس کے ساتھ ہیں۔ ہم اس کی حفاظت میں جنگ کریں گے۔)

جب تیسرا دن آیا تو عیسیٰ بن موسیٰ ایسے گھڑسواروں، پیادوں، ہتھیاروں اور نیزوں کے ساتھ اُن کے پاس آیا کہ اِن جیسے پہلے کسی نے دیکھے نہیں تھے۔ اُس نے پکار کر کہا: اے محمد! مجھے امیر المومنین کا حکم ہے کہ میں اس وقت تک تم سے جنگ نہ کروں جب تک میں تمہیں اُن کی اطاعت کی طرف دعوت نہ دے لوں، لہٰذا اگر تم اس کی اطاعت کر لو تو وہ تمہیں امن دے گا، تمہارا قرض ادا کر دے گا، بہت سارا مال اور زمینیں تمہارے نام کرا دے گا اور تمہیں یہ کچھ دے گا اور یہ کچھ دے گا۔۔۔ اور اس کے برعکس اگر تم اس کی اطاعت پر نہ آئے تو میں تمہارے ساتھ جنگ کروں گا کہ میں تمہیں کئی بار دعوت دے چکا ہوں۔

امام نفس زکیہؒ نے جواب میں کہا:

یہ پیش کشیں چھوڑو، واللہ! اگر تمہیں معلوم ہوتا کہ کوئی خوف مجھے تم سے پھیر نہیں سکتا اور کوئی لالچ مجھے تمہارے قریب نہیں کر سکتا تو تم یہ پیش کشیں کبھی بھی نہ کرتے۔ اور (آپؒ کو چونکہ اس کے وعدۂ امن پر اطمینان نہیں تھا جیسا کہ پہلے مفصل گزرا، اس لیے آپؒ نے اس کے آخری جملے کے جواب میں) کہا: (میں جنگ کے لیے تیار ہوں) میرے پاس تمہارے لیے جنگ کے سوا کچھ نہیں۔

جنگ چھڑنا:

اس کے بعد اسی وقت جانبین سے جنگ چھڑ گئی۔ عیسیٰ کا لشکر چار ہزار سے زیادہ تھا اور محمد بن عبداللہ (امام نفس زکیہ) کے لشکر کی وہی تعداد تھی جو غزوۂ بدر کے دن سیدنا محمد بن عبداللہ (رسول اللہ ﷺ) کے لشکر کی تھی۔ جانبین سے نہایت سخت لڑائی کا مظاہرہ ہوا۔ امام نفس زکیہ گھوڑے سے اتر کر زمین پر پیدل چلنے لگے، اور نہایت جم کر لڑے حتیٰ کہ اکیلے انہوں نے دشمن کے ستر بہادروں کو قتل کیا۔

اُن عراقی فوجیوں نے گھیراؤ کر کے نفسِ زکیہ کے ساتھیوں کے ایک دستے کو قتل کر دیا اور جو خندق انہوں نے کھودی تھی اُس کی طرف پیش قدمی کرتے ہوئے دھاوا بول دیا اور خندق عبور کر گئے کہ دراصل ان کے پاس خندق کی چوڑائی کے بقدر بنے ہوئے دروازے تھے جنہیں خندق کے اوپر ڈال دیا اور بعض نے کہا ہے کہ اونٹوں کے کجاووں اور بوجھوں سے خندق پاٹ کر اوپر سے گزر گئے تھے، واللہ اعلم۔

دورانِ جنگ، ظہر سے پہلے آپؒ ذرا پیچھے گئے، دارِ مروان میں جا کر غسل کیا، پھر ''حنوط'' خوشبو لگائی جو میت کے کفن اور بدن پر لگائی جاتی ہے، گویا شہادت سے پہلے رب سے ملاقات کی تیاری کی، پھر واپس میدانِ جنگ میں آ گئے۔ اس وقت عبداللہ بن جعفر نے آپؒ سے عرض کی: میرے ماں باپ آپ پر قربان ہوں، جو صورتِ حال سامنے نظر آ رہی ہے بظاہر آپؒ میں اس کے مقابلے کی طاقت نہیں ہے، لہٰذا آپؒ یہاں سے ابھی مکہ چلے جائیں اور وہاں اپنے نائب ''حسن بن معاویہ'' کے ساتھ مل جائیں کیونکہ وہاں پر آپ کا ساتھ دینے والے بہت سارے لوگ موجود ہیں۔ آپؒ نے فرمایا: اگر میں چلا گیا تو یہ اہلِ مدینہ قتل ہو جائیں گے، واللہ! میں میدانِ جنگ چھوڑ کر کہیں نہیں بھاگوں گا یہاں تک کہ مقابلہ کرتے ہوئے، مَیں اِن کو قتل کر دوں یا پھر میں خود قتل کر دیا جاؤں۔ ہاں! تمہیں میری طرف سے اجازت ہے، جہاں جانا چاہو جا سکتے ہو۔

اسی طرح ابنِ خُضَیر نے بھی آپؒ کو اس جیسا مشورہ دیتے ہوئے کہا کہ آپ بصرہ یا کہیں اور چلے جائیں۔ مگر آپؒ نے اِن کو بھی اپنے نہ جانے، اور خود ان کو چلے جانے کی اجازت دے دی۔ ابن خُضَیر نے کہا: بھلا آپؒ کو چھوڑ کر ہم کہاں جا سکتے ہیں یعنی ہم آخر لمحے تک آپؒ کا ساتھ دیں گے، چنانچہ پھر آپؒ کی طرف سے لڑتے ہوئے جامِ شہادت نوش فرمایا۔ شہید ہونے تک بے مثل بہادری سے لڑے اور آپؒ کا ساتھ دینے کا حق ادا کر دیا، کہ جا کر دشمن کی صفوں میں گھس گئے، اور دلیرانہ آگے بڑھتے رہے، حتیٰ کہ دشمن کی فوج کے خراسانیوں کے متعلق آتا ہے کہ وہ جب ان کو آتا ہوا دیکھتے تو اپنی فارسی زبان میں پکار پکار کر کہتے: ''خُضَیر آمد، خُضَیر آمد'' اور گھبرا کر اِدھر اُدھر بھاگ جاتے۔

بہر حال اسی دوران ایک شخص نے آپؒ کی پشت پہ ضرب لگائی جو گوشت کے اندر اتر گئی، مگر اس کے باوجود آپؒ کے عزم واستقلال میں ذرہ بھر فرق نہ آ سکا چنانچہ آپؒ اسی وقت اپنے ساتھیوں کے پاس آئے، اُس حصۂ بدن کو ایک کپڑے سے کس کر باندھا اور پھر میدان میں کود گئے۔ اب پھر کسی نے آنکھ پر اس زور سے ضرب لگائی کہ تلوار اندر

تک اتر گئی اور آپ زخموں کی تاب نہ لاتے ہوئے گر گئے۔ یہ دیکھ کر وہ جلدی سے آگے بڑھے اور آپ کو قتل کر کے سر کاٹ لیا۔ اُنہی کے ایک آدمی کا بیان ہے کہ جب ہم اس کا سر کاٹ کر لا رہے تھے، تو اُس پر اس قدر زخم تھے کہ گویا وہ ''سر'' نہیں بلکہ ٹکڑے ٹکڑے کیا ہوا کوئی بینگن ہے کہ سر کی کوئی جگہ زخم اور کٹ سے محفوظ نہیں تھی حتی کہ ہمارے لیے اس کو سنبھالنا بھی مشکل ہو رہا تھا۔

اِن کی شہادت سے قبل، میدانِ جنگ میں، امام نفس زکیہؒ نے اِن سے پوچھا تھا: ''دِیوان'' (وہ رجسٹر جس میں آپؒ کو حمایتی خطوط لکھنے والوں اور آپؒ کے ہاتھ پر خلافت کی بیعت کرنے والوں کے نام درج تھے [1]) جلا دیا ہے؟ جواب دیا: جی ہاں! مجھے اندیشہ ہوا تھا کہ (ہماری شکست کی صورت میں) اس میں مندرج لوگوں کو کہیں تکلیف نہ پہنچے۔ آپؒ نے فرمایا: بالکل ٹھیک کیا ہے۔

جنگ کے آخری مراحل:

الغرض صبح سے چھڑی ہوئی یہ جنگ مسلسل چل رہی تھی یہاں تک کہ عصر کا وقت بھی ہو گیا، اب دن ڈھل رہا تھا اور آپؒ کے ساتھی بھی کم بچ گئے تھے۔ آپؒ نے عصر کی نماز سے فارغ ہو کر اپنی نیام توڑ دی اور اپنے گھوڑے کی کونچیں بھی کاٹ ڈالیں، آپؒ کے ساتھیوں نے بھی بالکل اسی طرح کیا۔ اِس موقع پر آپؒ نے اپنے ساتھیوں کو اجازت بھی دی کہ تم میں سے جو جانا چاہے جا سکتا ہے، اور اِس وقت جنگ بہت تیز ہو گئی، مگر یہ سب حضرات آپؒ کے ہمراہ پہلے سے زیادہ جوش و خروش کے ساتھ جم کر لڑنے لگے۔ غیر معمولی جوش و جذبے سے سرشار ان حضرات نے جب آگے بڑھ کر دھاوا بولا، جبکہ انہوں نے اپنی نیامیں پہلے ہی توڑ پھینکی تھیں اور گھوڑوں کی کونچیں بھی کاٹ چکے تھے، تو یہ حملہ ایسا سخت اور ہیبتناک ثابت ہوا کہ عباسی فوج کے ایک دفعہ تو اوسان خطا ہو گئے جس میں ان کو ایک دو بار پسپا بھی ہونا پڑا، بہر حال یہ مقابلہ اپنی شدت کے ساتھ آمنے سامنے جاری تھا کہ اسی دوران اُن کے کچھ فوجی قبیلہ بنو غفار کے مکانوں کی جانب سے داخل ہو کر آپؒ کے اور آپؒ کے ساتھیوں کے پیچھے سے بھی پہنچ گئے (حالانکہ آپؒ کو بنو غِفار سے قطعاً

---

[1] تذکرۃ الخواص من الأمۃ، ص: ۲۰۲

فائدہ: بعض روایات کے مطابق ''دیوان'' جلانے کا یہ دانشورانہ فیصلہ اور اس پر عمل درآمد، خود امام نفس زکیہؒ نے ہی کیا تھا۔ ملاحظہ ہو: الوافی بالوفیات: ۳/۳۴۳، وتذکرۃ الخواص من الامۃ، ص: ۲۰۲

یہ توقع نہیں تھی کہ وہ اپنے محلے میں سے دشمنوں کو آپؒ کے خلاف راستہ دے دیں گے [1]، بالآخر عراقی غالب آ گئے اور انہوں نے "سَلْع" (مدینہ کی مشہور پہاڑی جو بازارِ مدینہ کے پاس واقع تھی، [2]) پر اپنا "سیاہ جھنڈا" لہرا دیا پھر آگے بڑھتے ہوئے مدینہ کے بالکل قریب پہنچ گئے حتی کہ مدینہ میں داخل ہو گئے اور مسجد نبوی کے اوپر اپنا "سیاہ جھنڈا" گاڑ دیا۔

امام نفسِ زکیہؒ کی دلیرانہ شہادت:

آپؒ کے ساتھیوں نے جب یہ منظر دیکھا تو پکار اٹھے: أُخِذَتِ الْمَدِينَةُ "مدینہ چھن گیا" اور بہت سارے میدان چھوڑ گئے۔ آپؒ صرف چند ساتھیوں کے ساتھ میدان میں باقی تھے اور آخر پھر آپؒ اکیلے ہی رہ گئے، کوئی آپؒ کے ساتھ نہیں بچا تھا۔ آپؒ کے ہاتھ میں تیز تلوار تھی، جس سے آپؒ اپنی طرف ہر بڑھنے والے شخص پر ضربِ کاری لگاتے اور جو بھی آپؒ کے مقابل اٹھتا اُسے ابدی نیند سلا دیتے، یہاں تک کہ آپؒ نے اکیلے ہونے کے باوجود کثیر تعداد میں عراقی فوجیوں کو اپنے سامنے ڈھیر کر دیا۔

مؤرخین نے اس موقع پر آپؒ کی بہادری و شمشیر زنی کی مہارت کی تعریف کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ابن خضیر کے شہید ہو جانے کے بعد جب آپؒ دشمنوں کا دلیرانہ مقابلہ کر رہے تھے تو آپؒ کی تلوار غیر معمولی تیزی سے چل رہی تھی، آپؒ اُس وقت بالکل حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کی بہادری کا نقشہ پیش کر رہے تھے یعنی جیسے حضرت حمزہؓ اٹھ کر آ گئے ہوں اور میدانِ کارزار میں اپنی بہادری و تیغ زنی کے جوہر دکھلا رہے ہوں۔ بہرحال آپؒ اسی طرح مصروفِ قتال تھے کہ اتنے میں دشمنوں کا ایک پورا جتھا اکٹھے ہو کر آپؒ پر چڑھ آیا جس میں سے ایک بدبخت شخص نے آگے بڑھ کر آپؒ کے دائیں کان کی لو کے نیچے تلوار ماری جس سے آپؒ گھٹنوں کے بل زمین پر گر گئے اور اپنا دفاع کرتے ہوئے کہہ رہے تھے: وَيْحَكُمْ! اِبْنُ نَبِيِّكُمْ مَجْرُوحٌ مَظْلُومٌ (تم ہلاک ہو جاؤ، تمہارے نبی کا بیٹا مجروح و مظلوم ہے)۔

حُمید بن قحطبہ لوگوں کو کہنے لگا: تمہارا ناس ہو! اس کو چھوڑ دو، قتل نہ کرو، چونکہ وہ لشکر کے اگلے حصے کا امیر تھا اس

---

(۱) تاریخ اسلام: ۲/ ۳۴۱

(۲) معجم البلدان: ۳/ ۲۳۶، مع الأماكن، أو ما اتفق لفظه و افترق مسماه من الأمكنة ص: ۵۴۴

لیے لوگ اس کے کہنے پر پیچھے ہٹ گئے مگر وہ بدبخت خود آگے بڑھا اور آپؒ کا سر مبارک کاٹ لیا۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔ پھر اُسے عیسیٰ بن موسیٰ کے پاس لے جا کر اس کے سامنے رکھ دیا، اور بہت زیادہ خون آلود ہونے کی وجہ سے آپؒ کا چہرہ صحیح پہچانا بھی نہیں جا رہا تھا۔

آپؒ کی یہ شہادت بعد از عصر، بروز پیر، ۱۴؍رمضان المبارک، ۱۴۵ھ کو مدینہ طیبہ میں ''اَحجارُ الزّیت'' (مسجدِ نبوی کے غَرب میں واقع وہ میدان جس میں اہلِ مدینہ نمازِ استسقاء پڑھا کرتے تھے اور وہ شہرِ مدینہ سے بالکل متصل تھا[1]) کے پاس ہوئی۔

آپؒ اور آپؒ کے شہید ساتھیوں کی نعشوں کا حال:

اس عظیم ہستی سَلامُ اللہ وَ رَحمۃُ علیہ، کے قتل سے فارغ ہوتے ہی عیسیٰ بن موسیٰ نے اس قتل کی خوشخبری سنانے کے لیے قاسم بن حسن کو منصور کی طرف روانہ کر دیا اور محمد بن ابی الکرام کو آپؒ کا سر مبارک دے کر منصور کے پاس بھیج دیا۔ آپؒ کے باقی جسم کے متعلق آپؒ کی بہن (زینب) اور بیٹی (فاطمہ) نے عیسیٰ سے درخواست کی کہ تم اس شخص کو قتل کر کے اپنی ضرورت پوری کر چکے ہو، لہٰذا اگر تمہاری طرف سے اجازت ہو تو ہم ان کی تدفین کر دیں۔ عیسیٰ نے اجازت دے دی چنانچہ انہوں نے آپؒ کے بدن مبارک کو جنت البقیع میں دفن کروا دیا، البتہ آپؒ کے شہید ساتھیوں کے اجسام کے متعلق عیسیٰ بن موسیٰ نے بہت سنگدلی کا مظاہرہ کیا اور ان کی لاشوں کو مدینہ سے باہر لا کر دو قطاروں میں تین دن تک سولی پر لٹکائے رکھا، اس کے بعد انہیں سَلع پہاڑی کے قریب یہودیوں کے قبرستان پر پھینک دیا اور آخر میں پھر انہیں وہاں خندق میں ڈلوا دیا۔

امام نفس زکیہ کا سر مبارک جب منصور کے پاس پہنچا تو اس نے پہلے اسے اپنے سامنے رکھ کر دیکھا پھر اس کو مختلف علاقوں میں گھمانے کا حکم نامہ جاری کر دیا چنانچہ تعمیلِ حکم میں اسے ایک سفید طشتری میں رکھ کر پہلے کوفہ پھر مختلف صوبوں اور شہروں میں گھمایا گیا۔[2]

---

(۱) معجم البلدان: ۱/۱۰۹، مع معجم ما استعجم للبکری: ۲/۲۲۶، والمعالم الأثیرة فی السنة والسیرة ص: ۲۰

(۲) ینظر -بجمع الروایات والتلخیص- والبدایة والنهایة ط الفکر: ۱۰/۸۷، مع ط هجر: ۱۳/۳۶۴، مع الکامل فی التاریخ: ۵/۱۳۰، ۱۲۱، وتاریخ الطبری: ۷/۶۰۱، ۵۷۷، وتاریخ الاسلام للذهبی: ۹/۳۱-۲۶، والمنتظم لابن الجوزی: ۸/۶۸-۶۶

آپؒ کی مدتِ خلافت اور عمرِ عزیز:

اس طرح یکم رجب کو شروع ہوکر چودہ رمضان پر اختتام پذیر ہونے والی آپؒ کی خلافت، دو ماہ اور چودہ دن قائم رہی۔ اور بوقتِ شہادت آپؒ کی عمر مبارک کیا تھی؟ اس میں کئی اقوال ہیں،[1] متعدد اقوال اس پر متفق ہیں کہ آپؒ نے ۴۵ برس کی عمر پائی۔[2]

منصور کا آپؒ کے معاونین کو قتل کرنا:

امام نفس زکیہ سلامُ اللہ و رحمۃُ علیہ، کے قتل سے فارغ ہوکر، منصور نے اُن لوگوں کو تلاش کرایا جنہوں نے آپؒ کے خروج کے بعد آپؒ کا ساتھ دیا تھا، اور اُن میں سے اکثر کو قتل کردیا،[3] اور بعض کو تو بہت ہی زیادہ بے دردی سے قتل کیا جیسے ''سُدَیف بن اسماعیل'' کے بارے میں آتا ہے کہ منصور نے خلیفہ بننے کے بعد ایک مرتبہ اِن کو اپنی طرف سے ایک ہزار دینار (مساوی تقریباً ایک کروڑ ۸۷ لاکھ ۵۰ ہزار روپے) بطورِ ہبہ دیے تھے۔ اِنہوں نے امام نفس زکیہؒ کے تعاون کے طور پر یہ خطیر رقم اُن کو دے دی تھی، پھر جب آپؒ شہید ہوگئے تو یہ بصرہ جاکر آپؒ کے بھائی ''ابراہیم'' کے ساتھ مل گئے، حتی کہ جب وہ بھی شہید ہوگئے تو یہ مدینہ میں آگئے اور چھپ کر رہنے لگے، پھر انہوں نے مدینہ کے گورنر ''عبد الصمد بن علی'' سے اپنے لیے امان طلب کی۔ اُس نے امان دے دی اور قسم کھاکر یقین دہانی بھی کرائی کہ وہ اِنہیں کبھی مدینہ سے نہیں نکالے گا۔ اس کے بعد منصور ایک دفعہ مدینہ آیا تو اُسے کسی نے بطورِ شکایت کہا کہ یہ سُدَیف تو برسرِ عام مدینہ میں چلتا پھرتا ہے، چنانچہ منصور نے اُنہیں طلب کرلیا، اور عبد الصمد پر اُس کے اس عمل کی وجہ سے منصور بہت غصے ہوا اور اس کی اچھی خاصی گرفت کی، پھر جب سُدَیف کو پکڑ کر منصور کے سامنے لایا گیا تو منصور نے اُس کو بوری میں بند کرواکے اوپر سے بوری سِلوا دی، پھر بوری کے اوپر سے اُن کو لاٹھیوں سے اتنا مارا گیا کہ ان کی سب ہڈیاں تک ٹوٹ گئیں اور ابھی جبکہ اُن میں جان کی رمق باقی تھی، اُنہیں اسی زندہ حالت میں ایک کنویں کے اندر

---

(۱) مثلاً: ۴۵ سال (کما سیاتي تخریجه)، ۵۲ سال کما تری في أحداث التاریخ الإسلامي – تحت أحداث سن ۱۴۵ ھ، والأعلام للزرکلي ۶/ ۲۲۰ اور سال (کماتری في الطبقات الکبری: ۵/ ۴۴۰ والوافي بالوفیات: ۳/ ۲۴۲ و [تاریخ الإسلام: ۹/ ۳۱

(۲) ینظر: البدایة والنهایة ط هجر: ۱۳/ ۳۸۲، والجرح والتعدیل لابن أبي حاتم: ۷/ ۲۹۵، تهذیب الکمال في أسماء الرجال: ۲۵/ ۴۷۰، وتذکرة الخواص من الأمة، ص: ۲۰۳، والتحفة اللطیفة في تاریخ المدینة الشریفة: ۲/ ۴۹۲

(۳) المنتظم في تاریخ الملوک والأمم: ۸/ ۶۸

پھینک دیا یہاں تک کہ وہیں اندر ہی انتقال کر گئے۔ [1]

انتباہ: منصور کے مقابلہ میں امام نفس زکیہ حق پر تھے:

منصور نے امام نفس زکیہؒ کے ساتھ جو مقابلہ کیا (جس میں اُس نے پہلے خطوط لکھے پھر جنگ کی) اس میں امت کے جلیل القدر علماء وفقہاء کے نزدیک منصور غلط تھا اور امام نفس زکیہ حق پر تھے۔ [2]

امام ابوحنیفہؒ وامام مالکؒ کی تائیدات وفتاویٰ:

جب امام نفس زکیہؒ نے خروج کیا تو امام ابوحنیفہؒ اور امام مالکؒ جیسے ائمۂ امت بھی آپؒ کی تائید اور حمایت میں دلائل دیا کرتے اور یہ مسئلہ بیان کیا کرتے کہ منصور کی خلافت کی بنسبت، آپؒ کی امامت وخلافت صحیح ہے کہ آپؒ کے ہاتھ پر بیعت پہلے منعقد ہوئی تھی (اور خود منصور بھی آپؒ کے ہاتھ پر بیعت کر چکا تھا بلکہ دو مرتبہ بیعت کر چکا تھا، ایک مرتبہ مدینہ میں اور دوسری بار مکہ میں [3])، اور یہ بیعت بھی آپؒ کے اُس فضل وکمال اور اُن عالی اوصاف کی بنیاد پر ہوئی تھی جن کی بدولت آپؒ امامت وخلافت کا بجا طور پر استحقاق رکھتے تھے، جیسا کہ شروع میں گزرا۔ اور امام ابوحنیفہؒ آپؒ کے فضل وکمال کو برملا بیان کیا کرتے، آپؒ کے برحق ہونے پر کُھل کر دلائل دیتے، [4] اور جب بھی آپؒ کے سامنے امام نفس زکیہؒ کا تذکرہ ہوتا تو بے ساختہ آپؒ کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو جاتے۔ [5]

امام نفس زکیہؒ کی طرح جب اُن کے بھائی حضرت ابراہیم بن عبداللہ نے بصرہ میں منصور کے خلاف خروج کیا تو امام ابوحنیفہؒ نے اُن کے اس خروج کی تائید وحمایت میں کئی فتوے دیے حتیٰ کہ ایک فتوے میں حضرت ابراہیم بن عبداللہ کی حمایت میں جہاد کرنے کو پچاس نفلی حجوں سے بہتر وافضل قرار دیا۔ الغرض آپؒ نے، وقت کا دینی فریضہ سمجھتے ہوئے، لوگوں کو اُن کی مدد کرنے اور ان کا ساتھ دینے پر خوب ابھارا۔ [6]

---

(۱) مختصر تاریخ دمشق: ۹/۲۱۳

(۲) ینظر: شذرات الذھب فی اخبار من ذھب: ۲/۲۰۱، مع ماسیاتی من التخریجات

(۳) مقاتل الطالبین ص: ۲۵۹، وکذا ینظر فی سیر اعلام النبلاء: ۶/۲۱۰، مقرونا الی تاریخ ابن خلدون: ۴/۶

(۴) الاستقصاء لأخبار دُوَل المغرب الأقصی: ۱/۲۰۵، تاریخ ابن خلدون: ۳/۶، وسمط النجوم العوالي في أنباء الأوائل والتوالي: ۴/۱۶۸

(۵) امام اعظم ابو حنیفہ شہید اہل بیت، ص: ۱۴۷

(۶) راجع لہ: امام اعظم ابو حنیفہ شہید اہل بیت، ص: ۱۴۷-۱۴۹

آپؒ کے انہی حمایتی فتووں اور تائیدی ارشادات کی بدولت منصور کی طرف سے آپؒ کو مختلف و متعدد اذیتوں کا سامنا کرنا پڑا، حتی کہ منصور نے آپؒ پر پہلے عمداً عہدۂ قضا پیش کیا، جبکہ اُس کو معلوم تھا کہ وہ قبول نہیں کریں گے، پھر آپؒ کی طرف سے اسی عدمِ قبول کو ظاہری سبب بنا کر، دراصل انہی حضرات (امام نفس زکیہ و ابراہیم بن عبداللہ) کی حمایت کی سزا میں آپؒ پر پہلے کوڑے برسائے پھر جیل میں ڈلوا دیا، آخر آپؒ وہیں انتقال کر گئے۔ [۲]

امام ابوحنیفہؒ کی طرح امام مالکؒ نے بھی امام نفس زکیہؒ کی تائید وحمایت میں کھل کر فتوی دیا، چنانچہ لکھا ہے کہ لوگوں نے آپؒ سے امام نفس زکیہؒ کا ساتھ دینے اور ان کی حمایت کرنے کے متعلق مسئلہ دریافت کیا اور ساتھ بطورِ دلیل یہ بھی عرض کیا کہ ہماری گردنوں میں منصور کی بیعت پہلے سے موجود ہے، تو اُس بیعت کے ہوتے ہوئے اِن کے ہاتھ پر اب نئی بیعت کرنے کا کیا حکم ہے؟ آپؒ نے بہت واضح الفاظ میں مدلل جواب دیتے ہوئے اُن کے ہاتھ پر بیعت کرنے کا فتوی دیا اور یہ بھی فرمایا: إِنَّمَا كُنْتُمْ مُكْرَهِينَ وَلَيْسَ لِمُكْرَهٍ بَيْعَةٌ "منصور کی بیعت کے وقت تم مجبور اور بے بس تھے (کہ تم سے وہ بیعت زبردستی اور جبراً لی گئی تھی) اور مسئلہ یہ ہے کہ مجبور آدمی کی کوئی بیعت نہیں ہوتی۔" آپؒ کے اس فتوے پر لوگوں نے بڑھ چڑھ کر امام نفس زکیہؒ کا ساتھ دیا اور اُن کے ہاتھ پر بیعت کی۔ امام مالکؒ چونکہ مدینہ طیبہ میں ہی رہتے تھے اور وہیں فتوی دیا تھا اس لیے بعض حکمتوں کے پیشِ نظر آپؒ نے گھر سے نکلنا ترک کر دیا تھا۔ [۳]

آپؒ کے اس معتبر و مؤثر فتویٰ سے چونکہ وقت کی ظالم عباسی حکومت کو کافی نقصان پہنچا، اس لیے اس فتوی کی سزا میں آپؒ کو سخت تکالیف اور مظالم کا سامنا کرنا پڑا۔ عباسی حکومت کی طرف سے آپؒ جیسی مبارک و عظیم ہستی پر کوڑے برسائے گئے، سلیمان بن علی عباسی نے آپؒ کو ستر کوڑے لگوائے، اور جعفر بن سلیمان عباسی نے تو آپؒ کی توہین و سزا کی حد کر دی کہ اُس نے اپنے دربار میں بلوا کر آپؒ کے کپڑے اتروا دیے، پھر آپؒ کو لمبا لٹا کر کوڑے لگوائے اور اس دوران بازو بھی زمین پر لمبے کرا دیے، اتنے کوڑے برسائے گئے کہ آپؒ کے دونوں کندھے تک نکل گئے۔ [۴]

---

(۱) تاریخ ابن خلدون: ۴/۶، وسمط النجوم العوالي في أنباء الأوائل والتوالي: ۴/۱۶۸

(۲) ہذا ملخص ما في امام اعظم ابو حنیفہ شہید اہل بیت، ص: ۱۲۲-۱۵۳، مفصلاً محققاً

(۳) راجع: البداية والنهاية ط هجر: ۱۳/۳۵۷ مع تاريخ الطبري ۷/۵۶۰ والمنتظم في تاريخ الملوك والأمم: ۹/۴۵ وتاريخ الإسلام: ۹/۲۳ وتذكرة الخواص، ص: ۲۰۰

(۴) المنتظم في تاريخ الملوك والأمم: ۸/۱۰۶، و ۹/۴۴

دیگر علماء وفقہاء کی تائیدات وفتاویٰ:

مدینہ طیبہ کے مفتی وعابد "امام محمد بن عَجلان" جوکہ "حضرت حسن بصریؒ" کے پایہ کے عالم وفقیہ شمار ہوتے تھے وہ بھی امام نفس زکیہؒ کی تائید وحمایت کرتے تھے۔ [1]

مذکورہ ابن عجلان سمیت عبدالحمید بن جعفر وغیرہ کئی اور علماء نے بھی نفس زکیہؒ اور ان کے بھائی ابراہیم کی بیعت کے لیے فتوے دیے تھے، اوران سب علماء کو بھی سزائیں دی گئیں۔ [2]

اسی طرح علامہ ابن کثیرؒ کی تحریروں کے ضمن میں اس کی وضاحت ملتی ہے کہ اُن کے نزدیک بھی منصور، ظالم اور ناحق خلیفہ تھا اور اس کے بالمقابل امام نفس زکیہ حق پر تھے۔ [3]

آپؒ کا ساتھ دینے والے علماء، اور مفتیان ومحدثین:

جن علماء، مفتیان اور محدثین نے امام نفس زکیہؒ کے خروج میں اُن کی حمایت کی اور ساتھ دیا ان میں سے بعض کے اسماء گرامی نیچے ذکر کیے جارہے ہیں:

امام مالک بن انسؒ، امام حسین بن زید بن علی زین العابدینؒ، امام عیسیٰ بن زید بن علی زین العابدینؒ، امام موسیٰ بن جعفر بن محمد بن علی زین العابدینؒ، امام عبداللہ بن جعفر بن محمد بن علی زین العابدینؒ، حسن بن معاویہ بن عبداللہ بن جعفر بن ابی طالب، یزید بن معاویہ بن عبداللہ، صالح بن معاویہ بن عبداللہ، علی بن جعفر بن اسحاق، منذر بن محمد بن منذر بن زبیر (یہ فقیہ ومحدث تھے، اور حضرات اہل بیت کے شیخ حدیث تھے)، یزید بن ہُرمُز، عبداللہ بن یزید بن ہُرمُز، عبدالحمید بن جعفر، محمد بن عَجلان (فقیہ اہل مدینہ ومحدث)، عبدالعزیز بن مطّلب مخزومی، عبداللہ بن جعفر بن عبدالرحمن بن مِسْوَر بن مَخْرمہ (یہ بیک وقت مفتی اور محدث تھے اور قاضیِ وقت بننے کے لائق تھے)، عثمان بن محمد بن خالد بن زبیر، عبدالعزیز بن محمد

---

(1) کاریخ الاسلام: ۹/ ۲۲، مع تهذيب الكمال في أسماء الرجال: ۲۵/ ۲۶۹، ومقاتل الطالبين، ص: ۲۴۸

(2) کاریخ اسلام: ۲/ ۳۳۷

(3) حيث أتى بجمل متنوعة يترشح منها ما قلنا، في غضون سرد المبحث الذي نحن فيه، بمواضع مختلفة من "البداية والنهاية". فاليك بعضها: (أ) فعلى المنصور ما يستحقه من عذاب الله ولعنته. (ب) لا جزاه الله خيرا (ج) وجَدَّ في طلب إبراهيم ومحمد جدًّا... ولا يشعر بهما من ينم عليهما ولله الحمد

دَراوَردِی، مصعب بن ثابت بن عبداللہ بن زبیر، عبداللہ بن مصعب، ابوبکر بن ابی سَبرہ (فقیہ وشیخِ واقدی)، عبداللہ بن عامر اسلمی (محدث، تلمیذِ زُہری وشیخِ وکیعؒ)، عبداللہ بن عطاء (محدث وشیخِ مالکؒ)، عثمان بن محمد بن خالد، ضحاک بن عثمانؒ، عبدالواحد بن ابی عون دَوسی، عبداللہ بن عمر بن عمری، ابوبکر بن عمر، عبیداللہ بن عمر، ہشام بن عروہ، ابوخالد واسطی، قاسم بن مسلم سلمی، عثمان بن عبیداللہ بن عبداللہ بن عمر بن خطاب وغیرہ۔[1]

(۱) ینظر: ریحان عترت، ص: ۱۰۶، مع مقاتل الطالبین، ص: ۲۴۴، ومابعدھا والکامل فی التاریخ ۱۲۸/۵

فضائل وخصائص

اللہ تعالیٰ نے آپؒ کو جن فضائل وخصائص، اوصاف ومناقب اور عمدہ عادات واعزازات سے سرفراز فرمایا تھا ان میں سے جو جو چیزیں مختلف کتبِ سیرت وتاریخ میں درج ہوسکی ہیں، ذیل میں صرف انہی کو تحریر کیا جاتا ہے:

۱۔ آپؒ بہت زیادہ روزے رکھتے اور اسی طرح کثرت سے نماز میں مشغول رہتے۔[1]

۲۔ جہاں اللہ تعالیٰ نے آپؒ کو علم کی بلندیاں نصیب فرمائی تھیں وہاں روحانیت میں بھی آپؒ کو اعلیٰ مقام پر فائز فرمایا تھا، اسی طرح بدنی قوت وطاقت اور قلبی شجاعت وہمت میں بھی دوسرے لوگوں پر فائق تھے۔[2]

۳۔ آپؒ خلوت پسند تھے اور شہر سے دور رہ کر اپنا وقت گزارتے، حتیٰ کہ بادشاہِ وقت کے دربار میں بھی آنا جانا نہ رکھتے۔[3]

۴۔ آپؒ کو لوگوں میں اونچا مقام حاصل تھا اور بڑے آدمی شمار ہوتے تھے۔ اسی طرح آپؒ عالی ہمت، اور عظیم غلبہ آور شخصیت تھے۔[4]

۵۔ آپؒ محتاط ودور اندیش شخص، اور مستقل مزاج انسان تھے۔[5]

۶۔ آپؒ آلِ ابوطالب کے عظیم فرد اور معزز شخصیت تھے، اس کے علاوہ ایک جلیل القدر عالم بھی تھے، نیز شجاعت، فہم وفراست اور سخاوت سے آپؒ کا دامن لبریز تھا۔[6]

۷۔ لوگ آپؒ سے بے پناہ اور ٹوٹ کر محبت کرتے تھے، آپؒ عظیم فضل وکمال کا مجموعہ تھے اور آپؒ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ، کئی اعتبار سے مشابہت کی سعادت حاصل تھی مثلاً: آپؒ کا نام اور آپؒ کے والد کا نام، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اسم گرامی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے والد ماجد کے اسم گرامی کے موافق تھا، اسی طرح آپؒ اپنے اخلاق وعادات میں بھی

---

(۱) المختصر في أخبار البشر: ۲/۳، والكامل في التاريخ: ۵/۱۲۹

(۲) الوافي بالوفيات: ۳/۲۴۲

(۳) تهذيب التهذيب: ۹/۲۵۲، مع الطبقات الكبرى: ۵/۴۳۸

(۴) البداية والنهاية طهجر: ۱۳/۳۸۲

(۵) تاريخ الطبري= تاريخ الرسل والملوك، وصِلَة تاريخ الطبري: ۷/۵۷۷

(۶) الأعلام للزركلي: ۶/۲۲۰، وأحداث التاريخ الإسلامي — تحت أحداث سنة: ۱۴۵ھ

حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے بہت مشابہت رکھتے تھے۔[1] نیز جنگ کے دوران آپؒ کے ساتھیوں کی تعداد بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے جنگِ بدر کے ساتھیوں کے بقدر تھی جیسا کہ پہلے گزرا۔

۸۔ آپؒ بہت طاقتور اور بہادر انسان تھے۔[2]

طاقتور اتنے تھے کہ ایک مرتبہ آپؒ کے والد کا اونٹ بھاگ گیا، اسے پکڑنے کے لیے سب لوگ اس کے پیچھے دوڑے لیکن آپؒ کے سوا کوئی اس کو نہیں مل سکا، آپؒ کا ہاتھ اس کی دم پر پڑ گیا چنانچہ آپؒ نے اسے دم سے پکڑ کر اپنی طرف پیچھے کھینچنا شروع کر دیا اور وہ اونٹ آگے کی طرف زور لگا رہا تھا، اونٹ کے زور لگانے کے باوجود وہ دم آپؒ کے ہاتھ سے نہ چھوٹ سکی حتی کہ دم ٹوٹ گئی اور آپؒ وہ دم لے کر واپس آ گئے۔[3]

بہادر اتنے تھے کہ آپؒ کو جنگ میں حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کے مشابہ قرار دیا جاتا تھا۔[4]

۹۔ آپؒ کی ایک خصوصیت یہ بھی ذکر کی گئی ہے کہ آپؒ کی والدہ، نانی اور اسی طرح اوپر تک، کہیں بھی کوئی باندی نہیں ہے بلکہ سب معزز قریشی خواتین تھیں۔ اسی لیے آپؒ کو ''صریحِ قریش'' (یعنی خالص قریشی نوجوان) کے معزز و منفرد خطاب سے یاد کیا جاتا تھا۔[5]

۱۰۔ آپؒ کو صحابۂ کرام، خصوصاً خلفاء راشدین کے ساتھ نہایت عقیدت تھی اور اس عقیدت کا عمومی اظہار فرمایا کرتے، چنانچہ حضرت جُندُب اَسدی بیان کرتے ہیں کہ کوفہ اور جزیرہ کے کچھ لوگ آپؒ کے پاس آئے اور حضرت ابوبکرؓ و حضرت عمرؓ کے متعلق آپؒ سے دریافت کیا۔ اُن کی بات سن کر آپؒ میری طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا: انظُرْ إلَى أهلِ بِلادِكَ يَسألُونِي عَن أبي بَكرٍ وَعُمرَ، لَهُما عِندِي أَفضَلُ مِن عَلِيٍّ ''اپنے اہلِ علاقہ کو دیکھو، یہ مجھ سے حضرت ابوبکر و عمر کے متعلق دریافت کرتے ہیں۔ میرے نزدیک وہ دونوں حضرات، حضرت علیؓ سے افضل ہیں''۔[6]

---

(۱) شذرات الذهب في أخبار من ذهب: ۲/ ۲۰۱، باختصار

(۲) الكامل في التاريخ: ۵/ ۱۲۹

(۳) الوافي بالوفيات: ۳/ ۲۴۲

(۴) الأعلام للزركلي: ۶/ ۲۲۰

(۵) الإفادة في تاريخ الأئمة السادة، ص: ۲۸، والاعلام للزركلي: ۶/ ۲۲۰

(۶) الصواعق المحرقة: ۱/ ۱۶۴

۱۱۔　آپؒ کے عمدہ اوصاف میں سے ایک یہ بھی ہے کہ آپؒ اداءِ قرض کے سلسلہ میں عام لوگوں کی طرح غفلت سے کام لینے کے بجائے اس کی ادائیگی کے متعلق فکرمند رہتے تھے حتیٰ کہ اپنی موت کے وقت بھی اپنے ایک قرض کی ادائیگی کے متعلق نہایت فکرمند تھے جیسا کہ درج ذیل واقعہ سے معلوم ہوتا ہے:

منصور عباسی کے لشکر کے ساتھ جب آپؒ مصروفِ جنگ تھے اس وقت آپؒ کے پاس حضور ﷺ کی معروف تلوار ''ذوالفقار'' تھی (جو آپ ﷺ نے حضرت علیؓ کو دی تھی اور پھر وہاں سے امام نفس زکیہؒ تک پہنچی تھی[1])۔ جنگ میں آپؒ نے جب اپنی شہادت کو قریب محسوس کیا تو آپؒ نے وہ تلوار اُس تاجر کو دے دی جو اُس وقت آپؒ کے ساتھ تھا اور آپؒ اُس کے چار سو دینار کے مقروض تھے۔ آپؒ نے اُسے فرمایا: یہ تلوار لے لو کیونکہ آلِ ابی طالب میں سے ضرور کوئی شخص اِس کے بدلے میں تمہیں تمہارا حق دے دے گا۔ پھر وہ تلوار اس تاجر کے پاس رہی یہاں تک کہ جعفر بن سلیمان مدینہ کا گورنر مقرر ہوا، اُسے اِس ماجرا کی اطلاع ملی تو اُس نے تاجر کو بلوایا اور تلوار لے کر اسے چار سو دینار دے دیے۔[2]

---

(۱) مرآۃ الجنان وعبرۃ الیقظان: ۱/۳۱۰

(۲) وفیات الأعیان: ۶/۳۳۰، مع تاریخ الطبری: ۷/۵۹۶، تاریخ الاسلام: ۹/۳۰

۴۔ حضرت امام مہدی سَلامُ اللّٰہ وَ رِضْوانُہٗ علیہ

(محمد بن عبداللہ)

تمہیدی بات:

حضرت امام حسن سَلامُ اللّٰہ وَ رِضْوانُہٗ علیہ، کی نسلِ مبارک میں پیدا ہونے والے ائمہ اہلِ بیت میں سے سب سے آخری امام "حضرت امام مہدیؓ" ہوں گے جن کا آخر زمانہ میں آنا، اہلِ بیت میں سے ہونا اور امام ہونا صحیح احادیث سے ثابت ہے نیز اُن کا امام حسنؓ کی اولاد میں سے ہونا بھی پایۂ ثبوت کو پہنچا ہوا ہے جیسا کہ عنقریب آرہا ہے، اسی طرح حدیث میں یہ بھی وضاحت کے ساتھ موجود ہے کہ ان کا نام، حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نام اور ان کے والد کا نام، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے والد کے نام کے موافق ہوگا (یعنی اُن کے والد ماجد کا نام "عبداللہ" ہوگا)، تفصیل آئندہ آرہی ہے۔

امام مہدی سَلامُ اللّٰہ وَ رِضْوانُہٗ علیہ، کے آخر زمانہ میں تشریف لانے کے متعلق اس قدر احادیث وارد ہوئی ہیں کہ اُن کی تشریف آوری ایک نہایت ہی یقینی امر ہے بلکہ جزوِ ایمان ہے۔[1] آخر زمانہ میں آنے کا مطلب یہ ہے کہ وہ نسلِ انسانی کی عمومی ترتیب کے مطابق آخر زمانہ میں پیدا ہوں گے اور پھر زندگی گزاریں گے (یعنی یہ مطلب نہیں ہے کہ وہ پیدا ہوچکے ہیں اور خلافِ فطرت اتنی لمبی مدت تک کہیں پوشیدہ ہیں پھر آخر زمانہ میں باہر نکل کر ظاہر ہوجائیں گے)۔[2]

زندگی کی منازل طے کرتے ہوئے جب اُن کی عمر چالیس برس ہوچکی ہوگی تو بیت اللہ شریف کے پاس حجرِ اسود اور مقامِ ابراہیم کے درمیان، لوگ ان کے ہاتھ پر بیعتِ خلافت کریں گے۔ اس کے بعد تقریباً نو سال زندہ رہیں گے پھر انتقال فرماجائیں گے، جیسا کہ ان سب امور کی وضاحت نیچے اپنے مقام پر آرہی ہے۔

---

(۱) لوامع الأنوار البهية = شرح العقيدية السفارينية: ۲/۸۴، وبذل المجهود: ۵/۱۰۱، ومناقب الشافعی للابری، ص: ۹۵، والمنار المنيف، ص: ۱۴۲

(۲) الاتحاف بحب الأشراف، ص: ۳۷۸، والمهدی المنتظر فی ضوء الاحاديث والآثار الصحيحة، ص: ۲۰

ظہورِ مہدیؓ کی پیش گوئیاں:

حضرت امام مہدی سَلامُ اللہِ وَرِضوانُہٗ علیہ کی پیش گوئی متعدد احادیث میں منقول ہے، اختصار کی وجہ سے ذیل میں صرف چند احادیث درج کی جاتی ہیں:

(۱) رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: میں تمہیں ''مہدی'' کی بشارت دیتا ہوں، وہ اُس وقت بھیجے جائیں گے جب کہ لوگوں میں بہت اختلاف ہوگا اور بڑے زلزلے آرہے ہوں گے۔ وہ آکر زمین کو عدل وانصاف سے بھر دیں گے جیسا کہ وہ ان کی آمد سے قبل ظلم وستم سے بھر چکی ہوگی۔[1]

(۲) ام المؤمنین حضرت ام سلمہؓ کہتی ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو حضرت مہدیؓ کا ذکر کرتے ہوئے سنا، آپ ﷺ فرمارہے تھے کہ ''مہدی'' حق ہے (یعنی اُن کا ظہور برحق ہے) اور وہ حضرت فاطمہؓ کی اولاد سے ہوگا۔[2]

(۳) آپ ﷺ نے فرمایا: میری امت کے آخر میں ایک شخص ''مہدی'' ظاہر ہوگا، اس کے دَور میں اللہ تعالیٰ خوب بارشیں عطا فرمائے گا، زمین بھی خوب پیداوار دے گی، وہ اموال کو (انصاف کے ساتھ) برابر تقسیم کرے گا، مویشیوں کی کثرت ہوجائے گی اور اس امت کو بہت (عزت و) عظمت حاصل ہوگی۔ وہ (تقریباً) سات، آٹھ سال رہے گا۔[3]

فائدہ: ذیل میں امام مہدیؓ سے متعلقہ جو مضامین پیش کیے جائیں گے ان میں سے بھی کئی مضامین کے اندر ضمناً آپؓ کے ظہور کی پیش گوئی منقول ہوگی۔

امام مہدیؓ کی اتباع کا حکم:

رسول اللہ ﷺ نے ایک طویل حدیث میں، آخر زمانہ میں پیش آنے والے فتنوں سے آگاہ کرتے ہوئے، فرمایا: پھر مسلسل فتنے ظاہر ہوں گے یہاں تک کہ میرے اہل بیت میں سے ایک شخص کا ظہور ہوگا، جس کو ''مہدی'' کہا جائے گا۔ اگر تم اُسے پالو تو اُس کی اتباع کرنا اور راہِ راست والے لوگوں میں شامل ہونا (یعنی اُن کی مخالفت کرکے

---

(۱) مجمع الزوائد ومنبع الفوائد: ۷/۳۱۳، ومسند احمد: ۱۷/۴۲۶۔

(۲) المستدرک للحاکم: ۴/۶۰۰

(۳) المستدرک علی الصحیحین للحاکم: ۴/۶۰۱

گمراہ لوگوں میں شامل نہ ہوتا)۔ [1]

اور ایک دفعہ آخر زمانے کی ایک جنگ کا تذکرہ کرتے ہوئے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ پھر خلیفۃ اللہ مہدی آئے گا جب تم اس کی آمد کے متعلق سنو تو اس کے پاس حاضری دو اور اس کے ہاتھ پر بیعت کرو اگرچہ تمہیں برف پر گھسٹ کر جانا پڑے۔ [2]

اسی طرح ایک روایت میں حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ امام مہدیؒ کے نہ چاہنے کے باوجود اُن کے دست پر بیعت کی جائے گی، لہٰذا اگر تم انہیں پالو تو ان کے ہاتھ پر بیعت کرلینا۔ [3]

نام ونسب:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''مہدی'' مجھ میں سے ہوگا، [4] (یعنی میری نسل میں سے ہوگا)۔ [5] دوسری حدیث میں وضاحت کرتے ہوئے فرمایا: ''مہدی'' میری نسل میں سے، فاطمہ کی اولاد میں سے ہوگا۔ [6] اور ایک مرتبہ ارشاد فرمایا: اگر دنیا ختم ہونے میں سے صرف ایک دن بھی باقی رہ جائے تو اللہ تعالیٰ اس دن کو لمبا کردے گا یہاں تک کہ میری نسل میں سے یا فرمایا: میرے اہل بیت میں سے ایک شخص کو بھیجے گا جس کا نام میرے نام کے موافق اور جس کے والد کا نام میرے والد کے نام کے موافق ہوگا۔ [7]

چناں چہ مذکور ہے کہ آپ سَلامُ اللہِ وَرِضوانُہ علیہ، کا نام ''محمد'' اور والد کا نام ''عبداللہ'' ہوگا۔ [8] بعض روایات کے مطابق ''احمد بن عبداللہ'' ہوگا کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا نام ''احمد'' بھی تھا۔ [9] والدہ ماجدہ کا نام اگرچہ بعض علماء نے ''آمنہ'' لکھا

---

(١) المعجم الكبير للطبراني: ٥١/١٨، والعَرف الوَردي في أخبار المهدي: ٨٠/٢

(٢) الأربعون لأبي نعيم، ص: ٢١، ومسند الروياني: ٤١٧/١، والمستدرك للحاكم: ٥١٠/٤، وسنن ابن ماجه: ١٣٦٧/٢، واللفظ لاول الذكر

(٣) الفتن لنعيم بن حماد: ٣٤٢/١، والسنن الواردة في الفتن للداني: ١٠٤٤/٥

(٤) سنن أبي داود، رقم الحديث: ٤٢٨٥

(٥) المشرب الوردي في مذهب المهدي، -مخطوط- لوحة: ٧

(٦) سنن أبي داود، رقم الحديث: ٤٢٨٤، مع مرقاة المفاتيح: ٣٤٣٩/٨، والقاموس المحيط، ص: ٤٣٦

(٧) سنن أبي داود، رقم الحديث: ٤٢٨٢

(٨) بذل المجهود: ١٠١/٥، والاذاعة، ص: ١٨٤، والبرهان في علامات مهدي آخر الزمان، ص: ٤٢ وفرائد فوائد الفكر، ص: ٢٤٠، ٢٣٨

(٩) الإشاعة لأشراط الساعة، ص: ١٧٦، وفرائد فوائد الفكر ص: ٢٤٠

ہے،[1] مگر علامہ بَرزَنجی ؒ فرماتے ہیں کہ تحقیق وتلاش کے باوجود مجھے والدہ کا نام کہیں نہیں مل سکا، واللہ اعلم۔[2]

آپ ؓ کی کنیت ''ابوعبداللہ'' ہوگی[3] اور ''مہدی'' (اللہ کی طرف سے ہدایت یافتہ)، اور ''جابِر'' (ظالموں ودشمنوں پر غالب) القاب ہوں گے، البتہ ''مہدی'' لقب زیادہ مشہور ہوگا۔[4] آپ ؓ نسب کے اعتبار سے، اولادِ فاطمہ ؓ میں سے؛[5] حضرت امام حسن ؓ کی اولاد میں سے ہوں گے؛[6] چناں چہ آپ ؓ والد کی طرف سے حَسَنی البتہ والدہ کی طرف سے حُسَینی ہوں گے،[7] یعنی آپ ؓ کو حضرت حسن ؓ اور حضرت حسین ؓ میں سے ہر ایک کی اولاد میں سے ہونے کا شرف حاصل ہوگا۔ اسی لیے آپ ؓ کو ''نجیب الطرفین'' (والد اور والدہ دونوں کی طرف سے عالی نسب) کہا جاتا ہے۔[8]

جائے ولادت ووطن:

سیدنا حضرت علی ؓ سے منقول ہے کہ مدینہ طیبہ میں اُن کی پیدائش و پرورش ہوگی، مکہ مکرمہ میں ان کی بیعت وخلافت ہوگی، اور بیت المقدس ان کی ہجرت گاہ ہوگی۔[9]

حلیہ مبارک:

آپ ؓ نہایت حسین وجمیل ہوں گے، قد مبارک درمیانہ اور جسم ہلکا پھلکا ہوگا، چہرہ روشن ستارے کی طرح چمکدار اور سرخی مائل ہوگا، دائیں رخسار پر سیاہ تل کا نشان ہوگا، پیشانی مبارک کشادہ اور ناک بلندی مائل ہوگی، دونوں ابروؤں

---

(۱) آثارِ قیامت، ص: ۲۰، وترجمان السنة: ۳/۳۳٦

(۲) الإشاعة لأشراط الساعة: مخطوط: لوحة: ۱۷ (الوجهة اليسرى)، مطبوع: ص: ۱۸۸

(۳) العرف الوردي في أخبار المهدي –ضمن الحاوي للفتاوي: ۲/۷٦، والإشاعة لأشراط الساعة، ص: ۱۷۷

(۴) والإشاعة لأشراط الساعة، ص: ۱۷۷، والمهدی المنتظر للبستوی، ص: ۲۸

(۵) لوامع الأنوار البهية: ۲/۷۲، والعرف الوردی فی اخبار المهدی: ۲/۱۰۳

(٦) النبراس، ص: ۳۱٦ والبداية والنهاية: ۱۹/۲۱ والإذاعة، ص: ۱۸۳ والبرهان، ص: ۳۲ والمشرب الوردي، لوحة: ۲، وإسعاف الراغبين، ص: ۱۳۵ والصواعق المحرقة: ۲/۴۸۰ وحقوق آل البيت بين السنة والبدعة، ص: ۵۳

(۷) النبراس، ص: ۳۱٦ والمشرب الوردي، لوحة: ۲ ومظاهر حق: ۵/۳۷

(۸) آپ کے مسائل اوران کا حل: ۳۷۰/۱، واسلام میں امام مہدی کا تصور، ص: ۷۰

(۹) لوامع الأنوار البهية: ۲/۸۱، والاشاعة لاشراط الساعة، ص: ۱۷۸، والقول المختصر، ص: ۵۱، ۵۰، آپ کے مسائل اوران کا حل: ۳۷۲/۱، وعقائد اهل السنة والجماعة، ص: ۱۱۸،

باہم جدا اور باریک وقوس نما ہوں گی، آنکھیں قدرتی طور پر سُرمگیں ہوں گی (یعنی بغیر سرمہ لگائے بھی ایسے معلوم ہوگا جیسے سرمہ لگا رکھا ہو)، سامنے والے دانت انتہائی سفید اور ایک دوسرے سے کچھ فاصلے پر ہوں گے (بالکل ملے ہوئے نہیں ہوں گے)، ڈاڑھی مبارک گھنی ہوگی، اور سر کی زلفیں کندھوں کو چھو رہی ہوں گی۔[1]

بیعتِ خلافت اور جہاد:

آخر زمانہ میں ایک خلیفہ کی وفات پر اختلاف ہوگا کہ اب کس کو خلیفہ بنایا جائے۔ امام مہدیؓ اُس وقت مدینہ طیبہ میں ہوں گے۔ یہ صورتِ حال دیکھ کر امام مہدیؓ اس خیال سے کہ لوگ کہیں مجھے نہ اپنا امام وخلیفہ بنالیں، مدینہ طیبہ سے مکہ مکرمہ چلے جائیں گے۔ وہاں کچھ لوگ انہیں پہچان کر کہ یہی امام مہدیؓ ہیں، ان کو مجبور کر کے بیت اللہ شریف کے پاس حجرِ اسود اور مقامِ ابراہیم کے درمیان ان کے ہاتھ پر بیعت کرلیں گے (جب کہ ان کی عمر اُس وقت تقریباً چالیس برس ہوگی۔[2]) پھر بعد میں ملکِ شام کے اولیاء وابدال اور عراق کی جماعتیں بھی آ آ کر ان سے بیعت کریں گی۔[3] اور مختلف اطراف وممالک کے علماء بھی امام مہدیؓ کی تلاش میں مکہ مکرمہ پہنچیں گے اور آپؓ کے ہاتھ پر بیعت کریں گے۔[4]

امام مہدیؓ کا ظہور جس میں ان کے ہاتھ پر حجرِ اسود اور مقامِ ابراہیم کے درمیان بیعت کی جائے گی (جیسا کہ ابھی گزرا) عشاء کے وقت ہوگا، عشاء کی نماز پڑھ کر مقامِ ابراہیم کے پاس آئیں گے، دو رکعات نفل ادا کریں گے، پھر اُن کیلئے منبر لایا جائے گا۔ اُس پر جلوہ افروز ہو کر لوگوں میں بآوازِ بلند، یہ تقریر کریں گے:

أُذَكِّرُكُمُ اللهَ أَيُّهَا النَّاسُ، وَمَقَامَكُمْ بَيْنَ يَدَيْ رَبِّكُمْ، فَقَدِ اتَّخَذَ الْحُجَّةَ، وَبَعَثَ الْأَنْبِيَاءَ، وَأَنْزَلَ الْكِتَابَ، وَأَمَرَكُمْ أَنْ لَا تُشْرِكُوا بِهِ شَيْئًا، وَأَنْ تُحَافِظُوا عَلَى طَاعَتِهِ وَطَاعَةِ رَسُولِهِ، وَأَنْ تُحْيُوا مَا أَحْيَا

---

(1) ينظر مجموعة مابلي: سنن أبي داود: ۱۰۷/۴، والمعجم الكبير للطبراني: ۱۰۱/۸ والأربعون لأبي نعيم، ص: ۱۰، ۱۲، والقول المختصر في علامات المهدي المنتظر، ص: ۵۱، ولوامع الأنوار البهية: ۷۳، ۷۳/۲، وفرائد فوائد الفكر، ص: ۲۲۰ والإشاعة لأشراط الساعة، ص: ۱۷۸

(2) لوامع الأنوار البهية: ۸۶/۲، مع ۷۴، مع آثار قیامت، ص: ۴۰، وكذا يستفاد من المعجم الكبير للطبراني: ۱۰۱/۸

(3) المعجم الأوسط: ۳۵/۲، مع سنن ابی داود: ۱۰۷/۴، وكذا استفيد لتسهيله وتوضيحه من الخليفة المهدي في الأحاديث الصحيحة، ص: ۴۳، مع ترجمان السنة: ۳۵۹/۴، والتعليق عليها

(4) الفتن لنعيم بن حماد: ۳۴۶/۱، ولوامع الأنوار البهية: ۸۱/۲، والإشاعة لأشراط الساعة، ص: ۱۸۸، وفرائد فوائد الفكر، ص: ۲۷۷

الْقُرْآنَ، وَتُمِيتُوا مَا أَمَاتَ، وَتَكُونُوا أَعْوَانًا عَلَى الْهُدَى، وَوُزَرَاءَ عَلَى التَّقْوَى، فَإِنَّ الدُّنْيَا قَدْ دَنَا فَنَاؤُهَا وَزَوَالُهَا، وَأَذِنَتْ بِالْوَدَاعِ، فَإِنِّي أَدْعُوكُمْ إِلَى اللهِ، وَإِلَى رَسُولِهِ، وَالْعَمَلِ بِكِتَابِهِ، وَإِمَاتَةِ الْبَاطِلِ، وَإِحْيَاءِ سُنَّتِهِ.

''اے لوگو! اللہ کو یاد رکھو اور اِس بات کو کہ تم نے ایک دن اپنے رب کے سامنے کھڑا ہونا ہے۔ سنو، اللہ تعالیٰ حجت پوری کر چکا ہے، اُس نے انبیاء کرام کو مبعوث کیا، کتابیں نازل کیں اور تمہیں اِس بات کا حکم دیا کہ اُس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراؤ، اُس کی اور اُس کے رسول کی اطاعت کے پابند رہو، قرآن مجید نے جن چیزوں کو زندہ کیا ہے انہیں زندہ کرو اور جن چیزوں کو مٹایا اور ختم کیا ہے تم بھی انہیں ترک کردو، نیکی اور تقویٰ کے کاموں میں ایک دوسرے کے معاون و مددگار بن جاؤ، کہ دنیا کے نیست و نابود ہونے کا وقت قریب آ گیا ہے اور یہ ہمیں اپنے رخصت ہونے کی اطلاع دے رہی ہے۔ میں تمہیں اللہ و رسول کی طرف بلاتا ہوں اور کتاب اللہ پر عمل کرنے، باطل کو مٹانے اور سنت کو زندہ کرنے کی طرف دعوت دیتا ہوں۔''[1]

ابتداء میں جو لوگ آپ کی حمایت میں آپ کے ساتھ ہوں گے وہ اگرچہ مختلف علاقوں سے جمع ہوئے ہوں گے تاہم وہ کچھ زیادہ افراد نہیں ہوں گے بلکہ اُن کی تعداد اُتنی ہی ہوگی جتنی غزوۂ بدر کے مسلمانوں کی تھی (یعنی تقریباً ۳۱۳)۔ یہ لوگ رات کے عبادت گزار اور دن کے شاہسوار ہوں گے۔[2] اور پھر آہستہ آہستہ ان خوش قسمت حمایتیوں کی تعداد بڑھتی بڑھتی بہت زیادہ ہو جائے گی۔[3]

امام مہدی مکہ معظمہ میں ہی ہوں گے کہ ملکِ شام سے ایک فوج اُن سے جنگ کیلیے روانہ ہوگی، وہ فوج ابھی مکہ مکرمہ و مدینہ منورہ کے درمیان (مقامِ ''بَیداء'' پر) پہنچی ہوگی کہ اُسے دھنسا دیا جائے گا۔ پھر شام کا ایک قریشی شخص (یعنی ''سُفیانی''[4]) اٹھے گا، جس کے ننھیال قبیلہ ''کَلب'' کے ہوں گے، وہ امام مہدی کے خلاف ایک لشکر بھیجے گا۔ وہ

---

(۱) الفتن لنعیم بن حماد: ۳۴۵/۱، والعرف الوردی للسیوطی: ۸۵/۲، وعقد الدرر فی اخبار المنتظر، ص: ۲۱۷، مع الاشاعة للبرزنجي، ص: ۱۸۹

(۲) المستدرک للحاکم: ۸۶۵۹، مع الفتن لنعیم بن حماد: ۳۴۵/۱، وعقد الدرر فی اخبار المنتظر، ص: ۲۱۷، ومثله فی الاشاعة لاشراط الساعة، ص: ۱۹۲

(۳) المهدي لعادل زكي، ص: ۹۷، وقد استفاده من ''المستدرک للحاکم: ۸۶۵۸، والاشاعة لاشراط الساعة، ص: ۱۹۲

(۴) سفیانی: یہ حضرت ابوسفیان کی اولاد میں سے ایک شخص ہوگا، الاشاعة، ص: ۱۸۵، اور اس کا نام عُروَہ بن محمد ہوگا، فرائد فوائد الفکر، ص: ۳۰۵، والتذکرة باحوال الموتی وأمور الآخرة ص: ۱۱۹۴، بعض نے کہا ہے کہ عبداللہ نام ہوگا: الفتن لنعیم بن حماد: ۲۸۱/۱

لشکر شکست کھائے گا اور امام مہدیؓ اُس پر غالب آئیں گے۔ [1]

اس کے بعد امام مہدیؓ تقریباً مسلسل جہاد میں مصروف رہیں گے چناں چہ حلب کے قریب ''اَعماق'' یا ''دابق'' نامی مقام پر روم کے عیسائی، مسلمانوں کے خلاف جمع ہوں گے۔ اِس پر امام مہدیؓ اُن رومیوں سے جہاد کیلئے لشکر کشی کریں گے اور اُن کے ساتھ خون ریز جنگ ہوگی جس میں بہت سارے مسلمان درجۂ شہادت سے سرفراز ہوں گے، اِن خوش بخت شہیدوں کو حضور ﷺ نے ''اَفضل الشہداء'' فرمایا ہے۔ بالآخر مسلمانوں کو فتح ہوگی، اور ''قُسطنطینیہ'' (جواُن رومیوں کا بڑا شہر ہوگا) کو فتح کر کے اس میں داخل ہوجائیں گے۔ [2]

حیاتِ مہدیؓ میں ظہورِ دجال اور نزولِ عیسیٰؑ:

فتحِ قُسطنطینیہ کے بعد جب کہ وہ مسلمان آپس میں مالِ غنیمت تقسیم کر رہے ہوں گے، اور اپنی تلواریں زیتون کے درخت پر لٹکا رکھی ہوں گی کہ شیطان آواز دے گا کہ پیچھے تمہارے گھروں میں ''دجال'' آ چکا ہے، یہ خبر سن کر مسلمان وہاں سے چل پڑیں گے حالانکہ یہ خبر جھوٹی ہوگی۔ اور جب یہ مسلمان ملکِ شام پہنچیں گے تو اس وقت واقعی دجال نکل آیا ہوگا۔ (مسلمان ملکِ شام میں داخل ہوکر 'بیت المقدِس' پہنچیں گے، [3] اور وہ بد بخت بھی، زمین کے مختلف حصوں کا چکر لگاتا ہوا، وہیں ملکِ شام میں مقامِ لُدّ کے پاس پہنچ چکا ہوگا۔ [4])۔ مسلمان دجال کے خلاف جنگ کی تیاریوں میں مصروف ہوں گے اور ایک دن فجر کی نماز ادا کرنے کیلیے صفیں سیدھی کر رہے ہوں گے، جب مؤذن اقامت کہہ چکے گا اور امام مہدیؓ نماز پڑھانے کیلیے مصلّٰی پر جا چکے ہوں گے کہ اچانک سیدنا حضرت عیسیٰ علیہ السلام آسمان سے اترتے ہوئے نظر آئیں گے۔ امام مہدیؓ آپ علیہ السلام کو دیکھ کر اُلٹے پاؤں پیچھے ہٹیں گے تا کہ عیسیٰؑ آگے تشریف لائیں اور نماز پڑھائیں۔

حضرت عیسیٰؑ اُن کے کندھوں کے درمیان ہاتھ رکھ کر فرمائیں گے: تَقَدَّمْ فَصَلِّ، فَإِنَّهَا لَكَ أُقِيمَتْ ''آپ ہی

---

(۱) المعجم الأوسط: ۳۵/۲، مع سنن ابی داود: ۱۰۷/۴، وكذا استفيد لتسهيله وتوضيحه من الخليفة المهدي في الأحاديث الصحيحة، ص: ۲۸ و ۴۳، مع ترجمان السنة: ۳۵۹/۴

(۲) ينظر مجموعة ما يلي: [صحيح مسلم: ۲۲۲۱/۴، والمتفق والمفترق: ۲۰۶/۱، وترجمان السنة: ۳۷۳/۴، ومرقاة المفاتيح: ۳۴۱۲-۱۳/۸

(۳) مرقاة المفاتيح شرح مشكاة المصابيح: ۳۴۱۳/۸

(۴) التصريح بما تواتر في نزول المسيح ص: ۱۹۶

آگے بڑھیے اور نماز پڑھائیے کیونکہ یہ اقامت تمہارے لیے کہی گئی ہے" [دوسری روایت میں ہے کہ حضرت عیسیٰؑ اُن سے فرمائیں گے: اِس وقت میں امامت نہیں کراؤں گا، تم میں سے بعض لوگ دوسرے بعض لوگوں پر امیر (وامام) ہیں، (لہٰذا تم بھی نماز پڑھا سکتے ہو، اس لیے تم ہی پڑھاؤ)، اللہ نے (امامت کی) یہ عزت اس امت کو بخشی ہے۔ [1]] بہرحال حضرت عیسیٰؑ کے کہنے پر امام مہدیؓ آگے بڑھیں گے اور نماز پڑھائیں گے۔ نماز سے فارغ ہونے کے بعد عیسیٰؑ فرمائیں گے: دروازہ کھولو، دروازہ کھولا جائے گا، اُس کی پرلی جانب دجال ہوگا جس کے ساتھ ستر ہزار مسلح یہودی ہوں گے۔ جب عیسیٰ علیہ السلام کی نظر اس پر پڑے گی تو وہ ایسے پگھلنے لگے گا جیسے نمک پانی میں پگھلتا ہے، پھر وہ بھاگنے لگے گا۔ آپ علیہ السلام فرمائیں گے: إِنَّ لِي فِيكَ ضَرْبَةً، لَنْ تَسْبِقَنِي بِهَا "میری ایک ضرب تیرے اوپر مقدر ہو چکی ہے جس سے تُو نہیں بھاگ سکتا"۔ پھر مقامِ "لُدّ" (جو بیت المقدس کے قریب واقع ہے، [2]) کے مشرقی دروازے کے پاس جا کر اُس کو نیزے سے قتل کر دیں گے اور پھر حضرت عیسیٰؑ، نیزے پر لگا ہوا اُس کا خون، برسرِ عام سب کو دکھلائیں گے۔ اور یہودیوں کو کھلی شکست ہوگی اور ایک ایک یہودی کو قتل کر دیا جائے گا۔ [3]

واضح رہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حکم فرمانے کی بنا پر، یہ نماز (یعنی فجر کی نماز) تو امام مہدیؓ پڑھائیں گے، اس کے بعد حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہی امامت کیا کریں گے۔ بلکہ امام مہدیؓ اس نماز کے بعد تمام امور کا نظام حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو سپرد کر دیں گے چناں چہ پھر نمازوں کی امامت سمیت دیگر امور کا انتظام بھی حضرت عیسیٰ کے ہاتھ میں آجائے گا اور امام مہدیؓ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ساتھ مل کر اِن دینی خدمات میں اُن کا تعاون کریں گے۔ [4]

---

(۱) صحیح مسلم ۱/۱۳۷، مع المنار المنيف في الصحيح والضعيف ص:۱۴۷، وعلامات قیامت اور نزول مسیح، ص:۱۳۳، وآثار قیامت، ص:۳۱

(۲) معجم البلدان:۵/۱۵، والإشاعة لأشراط الساعة، ص:۲۵۵

(۳) ینظر مجموعة ما یلي: صحیح مسلم:۲/۲۲۲۱، وتکملة فتح الملهم:۲۹۸/۶، ومرقاة المفاتیح:۸/۳۴۱۳، وسنن ابن ماجة: ۲/۱۳۵۹ بإسناد حسن وتحقیقه في المهدي لعادل زکي، ص:۹۳، والعَرف الوردي:۲/۱۰۰، وعقد الدرر ص:۲۹۳، والمواهب الغالية:۱/۱۸۸

(۴) البرهان في علامات مهدي آخر الزمان، ص:۹۱ بسند صحیح، مع المشرب الوردي في ملحب المهدي، لوحة:۹، وفرائد فوائد الفکر ص:۳۳۲، ۳۳۳، ولوامع الأنوار البهية:۲/۸۵

وفات:

اس کے بعد امام مہدی سَلامُ اللہ وَ رِضْوانُہٗ علیہ، دو سال حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ساتھ رہیں گے، جب کہ آپ سَلامُ اللہ وَ رِضْوانُہٗ علیہ کی خلافت سات برس رہی، اور ظہور چالیس برس کی عمر میں ہوا تھا، اس طرح آپ سَلامُ اللہ وَ رِضْوانُہٗ علیہ انچاس (۴۹) سال کی عمر پا کر، حضرت عیسیٰؑ کی معیت میں، بیت المَقدِس پہنچ کر، اپنی طبعی موت سے انتقال فرما جائیں گے۔ حضرت عیسیٰؑ اور دیگر مسلمان آپؓ کی نمازِ جنازہ پڑھیں گے، اس کے بعد وہیں بیت المَقدِس میں آپ سَلامُ اللہ وَ رِضْوانُہٗ علیہ کو دفن کر دیا جائے گا۔ [1]

امام مہدیؓ کے انتقال کے بعد حضرت عیسیٰؑ کئی برس باحیات رہیں گے، ایک عادلانہ ومنصفانہ حکومت قائم کر دیں گے، رسول اللہ ﷺ کی شریعت کے مطابق نظام چلائیں گے اور اپنے نزول کے چالیس برس بعد انتقال فرما جائیں گے۔ مسلمان ان کی نمازِ جنازہ ادا کریں گے اور اُن کو حضور ﷺ اور حضرت ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما کے ساتھ دفن کیا جائے گا۔ [2]

---

(1) ینظر مایلي: الصواعق المحرقة: ۴۷۴/۲، وإسعاف الراغبین، ص: ۱۴۰، والبرهان في علامات مهدي آخر الزمان، ص: ۹۸ بسند صحیح وفرائد فوائد الفکر، ص: ۳۳۳، وشرح العقیدة السفارینیة: ۸۵/۲، وآپ کے مسائل اور ان کا حل: ۳۷۲/۱

(2) ینظر: مسند احمد: ۱۵/۴۱ مع إسعاف الراغبین، ص: ۱۴۷، والمستدرک للحاکم: ۶۵۱/۲، والتصریح بما تواتر في نزول المسیح، ص: ۱۸۱/۲۴۱

فضائل وخصائص

اُس ہستی کی شان کا کیا کہنا جن کو، امام الانبیاء محمد مصطفیٰ ﷺ اپنا کہیں، اور جن کے فضائل خود اپنی زبانِ اطہر سے بیان فرمائیں اور لوگوں کو اُن کی تابعداری کا حکم دیں۔ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''مہدی'' مجھ میں سے ہوگا، اُس کی پیشانی کشادہ اور ناک بلندی مائل ہوگی۔ وہ زمین کو عدل وانصاف سے بھر دے گا جیسا کہ وہ پہلے ظلم وستم سے بھر چکی ہوگی۔ [1]

آپ ﷺ نے فرمایا: مہدی ہم اہلِ بیت میں سے ہوگا، اللہ تعالیٰ ایک ہی شب میں اس کو صلاح عطا فرما دیں گے۔ [2] (یعنی ایک ہی رات میں اُن کو امورِ خلافت وغیرہ سجھا دیں گے اور نیکی وتقوی ان میں کوٹ کوٹ کر بھر دیں گے۔ [3] اور اپنی خاص توفیق سے ایک ہی رات میں اُن کو ولایت کے اُس بلند مقام پر پہنچا دیں گے جہاں وہ پہلے نہیں تھے۔ [4])

آپ ﷺ نے فرمایا: تم لوگوں کا (اُس وقت خوشی سے [5]) کیا حال ہوگا جب تم میں عیسیٰ بن مریم علیہ السلام (آسمان سے) اتریں گے اور اُس وقت تمہارا امام وہ شخص (یعنی امام مہدی [6]) ہوگا جو خود تم میں سے ہوگا۔ [7]

آپ ﷺ نے فرمایا: وہ (یعنی مہدی ؒ) میری اولاد میں سے ہی ایک شخص ہوگا جو میری سنت کی روشنی میں جہاد کرے گا جیسے میں نے وحی کی روشنی میں جہاد کیا ہے۔ [8]

حضور ﷺ نے حضرت حذیفہؓ سے فرمایا: حذیفہ! اگر دنیا کے ختم ہونے میں سے صرف ایک دن بھی باقی رہ جائے

---

(1) سنن ابي داود: ۴/۱۰۷

(2) سنن ابن ماجه: ۲/۱۳۶۷، ومسند أبي يعلى الموصلي: ۱/۳۵۹، والسنن الواردة في الفتن للداني: ۵/۱۰۵۹

(3) المهدي لعادل زكي، ص: ۷۰، ۷۱، والنهاية في الفتن والملاحم: ۱/۵۵، والاحتجاج بالأثر ص: ۲۶۳

(4) الخليفة المهدي في الأحاديث الصحيحة، ص: ۴۵

(5) الخليفة المهدي في الأحاديث الصحيحة، ص: ۴۵، وفتح الملهم: ۱/۳۰۲

(6) ترجمان السنة: ۴/۳۶۸، ۳۶۹

(7) صحيح البخاري: ۴/۱۶۸، وصحيح مسلم: ۱/۱۳۶

(8) الفتن لنعيم بن حماد: ۱/۳۷۱، وعقد الدرر في أخبار المنتظر، ص: ۷۱

تو اللہ تعالیٰ اُس دن کو لمبا کردے گا یہاں تک کہ میرے اہلِ بیت میں سے ایک شخص حاکم ہوکر رہے گا، (وہ خوب جہاد کرے گا چناں چہ) اُس کے ہاتھوں کئی جنگیں ہوں گی، اور اسلام کو غلبہ حاصل ہوگا۔[1]

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا: امام مہدی رضی اللہ عنہ کے ذریعہ اللہ تعالیٰ اِس امت کے دُکھ درد ٹالے گا اور اُن کے عدل کی برکت سے ہر ظلم کو مٹادے گا۔[2]

علماء نے لکھا ہے کہ آپ رضی اللہ عنہ ایک امامِ برحق اور خلیفہ راشد ہوں گے، بلکہ اپنے زمانۂ خلافت میں سب سے زیادہ صالح و متقی اور سب سے بڑے عالمِ دین ہوں گے، جس سے آپ رضی اللہ عنہ کی عظمت کے کمال، عزت و شرافت کی بلندی اور مقام و حیثیت کی رفعت کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔[3]

نبوی اخلاق:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اگر دنیا کے خاتمہ میں صرف ایک ہی دن باقی رہ جائے تو بھی اللہ تعالیٰ ایک ایسے شخص کو کھڑا کرے گا جس کا نام میرے نام جیسا ہوگا اور اخلاق میرے اخلاق جیسے ہوں گے، اُس کی کنیت "ابو عبداللہ" ہوگی۔[4]

آپ رضی اللہ عنہ کے حُسنِ خُلق کی ایک علامت یہ بھی لکھی ہے کہ آپ رضی اللہ عنہ غریب و مسکین لوگوں کے ساتھ بہت نرمی و مہربانی سے پیش آنے والے ہوں گے۔[5]

سخاوت:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میری امت کے آخر میں ایک خلیفہ ہوگا جو لوگوں کو، لپ بھر بھر کا مال دے گا اور شمار بھی نہیں کرے گا۔[6]

---

(۱) الأربعون لأبي نعيم، ص: ۱۷

(۲) لوامع الأنوار البهية: ۲/ ۷۳

(۳) النهاية في الفتن والملاحم: ۱/ ۳۹ مع المشرب الوردي في مذهب المهدي، لوحة: ۳

(۴) الأربعون لأبي نعيم، ص: ۱۵، والعَرف الوَردي في أخبار المهدي: ۲/ ۷۶ وبمعناه عن عليؓ في عقد الدرر في أخبار المنتظر، ص: ۸۲، وعقيدة أهل السنة والأثر في المهدي المنتظر، ص: ۱۴۱ رواية عن أبي داود وغيره.

(۵) الفتن لنعيم بن حماد: ۱/ ۳۵۶، والعَرف الوَردي في أخبار المهدي: ۲/ ۹۰

(۶) صحيح مسلم: ۴/ ۲۲۳۴

لپ بھر بھر کر دینے سے اس طرف اشارہ ہے کہ امام مہدیؒ کے زمانہ میں بہت فتوحات ہوں گی جس سے اموال کی کثرت ہوگی اور آپؒ بخل کرنے کے بجائے، اپنی سخاوتِ نفس کی بدولت، لوگوں میں وہ اموال بلاحساب وشمار تقسیم کریں گے۔ [1]

آپ ﷺ نے امام مہدیؒ کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا کہ اُس کے پاس ایک شخص آ کر کہے گا: اے مہدی! مجھے کچھ دیجیے، مجھے کچھ دیجیے۔ چناں چہ امام مہدیؒ دونوں ہاتھوں سے بھر بھر اُس کے کپڑے میں اتنا ڈال دیں گے جتنا وہ اٹھا سکے اور لے جا سکے (یعنی ایک انسان جتنا اٹھا سکتا ہے اتنا اُس کو دیں گے)۔ [2]

ایک مرتبہ حضور ﷺ نے امام مہدیؒ کے عدل وانصاف کا ذکر کرنے کے بعد اُن کی سخاوت بیان کرتے ہوئے فرمایا: وہ اپنے مُنادی کو حکم دے گا کہ وہ عام اعلان کرکے پوچھے کہ کس کو مال کی ضرورت ہے؟ اس اعلان پر لوگوں میں سے صرف ایک شخص کھڑا ہوگا اور کہے گا کہ ہاں! مجھے ضرورت ہے۔ امام مہدیؒ اُس سے فرمائیں گے: خازن (مال کے منتظم) کے پاس جاؤ اور اسے کہو کہ مہدی نے مجھے مال دینے کا تمھیں حکم دیا ہے۔ (جب یہ خازن کے پاس جا کر یہ پیغام دے گا) تو وہ اِس سے کہے گا کہ اٹھا لو۔ یہ (حسبِ خواہش) اٹھائے گا یہاں تک کہ جب دامن بھر لے گا اور خزانے سے باہر لائے گا تو اِسے (اپنے اس عمل پر) ندامت ہوگی اور (دل میں) کہے گا کہ کیا اُمتِ محمدیہ کا سب سے لالچی وحریص میں ہی ہوں، یا یوں کہے گا کہ کیا میرے ہی لیے وہ چیز ناکافی ہے جو دوسروں کیلیے کافی ووافی ہے؟ اس ندامت پر وہ مال واپس کرے گا مگر اس سے یہ مال قبول نہیں کیا جائے گا اور اسے کہا جائے گا (یعنی امام مہدیؒ اس سے کہیں گے [3]): إِنَّا لَا نَأْخُذُ شَيْئًا أَعْطَيْنَاهُ ''ہم دے کر واپس نہیں لیا کرتے''۔ [4]

آپ ﷺ نے فرمایا: تمہارے خلفاء میں سے ایک خلیفہ ہوگا جو گنے بغیر مال بھر بھر کر دے گا۔ اُس کے پاس ایک شخص آ کر مال کا سوال کرے گا۔ وہ اسے کہے گا: جاؤ، لے لو۔ وہ آدمی اپنا کپڑا زمین پر پھیلا کر رکھے گا اور اس میں مال ڈالتا رہے گا اس وقت حضور ﷺ نے اپنے اوپر ایک موٹی چادر اوڑھ رکھی تھی، آپ ﷺ نے اُس شخص کا حال

---

(۱) شرح النووي علی مسلم: ۱۸/ ۳۹، ۴۰

(۲) سنن الترمذي: ۴/ ۵۰۶

(۳) السنن للداني: ۵، ۶۴۰ ا بإسناد صحيح كما في المهدي المنتظر، ص: ۲۲۷

(۴) مجمع الزوائد ومنبع الفوائد: ۷/ ۳۱۳ مع مسند أحمد: ۱۷/ ۴۲۷

بیان کرتے ہوئے وہ چادر زمین پر پھیلا دی پھر اس کے چاروں کونے پکڑ کر اپنی طرف اکٹھے کرلیے اور فرمایا: پھر وہ چادر اٹھائے گا اور چلا جائے گا۔[1]

آپؒ کے زمانہ میں برکات کا ظہور:

امام مہدیؒ کے متعلق احادیث میں آتا ہے کہ وہ زمین کو عدل وانصاف سے بھر دیں گے جس طرح پہلے وہ ظلم وستم سے بھر چکی ہوگی،[2] اور اُن کا انصاف سب لوگوں کو عام ہوگا،[3] (یعنی اُن کے زمانہ میں عدل وانصاف کا دَور دَورہ ہوگا)۔

امتِ محمدیہ جتنی اُن کے زمانے میں خوشحال ہوگی اتنی وہ کبھی خوشحال نہیں رہی ہوگی، آسمان خوب بارش برسائے گا، زمین پیداوار میں سے کچھ روک کر نہیں رکھے گی (یعنی خوب پیداوار دے گی)،[4] ان کے دَور میں مال کے انبار لگ جائیں گے، حتیٰ کہ ایک شخص کھڑا ہو کر کہے گا: اے مہدی! مجھے کچھ دیجیے۔ وہ فرمائیں گے: "خُذْہُ" (جاؤ، جتنا اٹھانا ہے) اُٹھالو"،[5] لوگوں کے دل استغناء وبے نیازی سے پُر ہوں گے،[6] مویشیوں کی کثرت ہوجائے گی، امت عزت وعظمت کے اعلیٰ مقام پر فائز ہوگی،[7] اور اسلام کا بول بالا ہوگا، غرض تمام روئے زمین پر اسلام ہی اسلام پھیل جائے گا۔[8]

مختلف روایات کے پیشِ نظر علماء نے لکھا ہے کہ امام مہدیؒ کے زمانہ میں پھلوں کی بہتات ہوگی، پیداوار کی کثرت ہوگی، مال کی فراوانی ہوگی، قوت وحکومت اور مسلمانوں کی شان وشوکت عام ہوگی، دینِ اسلام کو غلبہ ہوگا، دشمن ذلیل ومقہور ہوگا، علاقے پُر امن ہوں گے، دینی احکام کا نظم ونسق عروج پر ہوگا اور رزق عام وتام ہوگا۔[9]

---

(۱) مسند أحمد: ۱۸/ ۴۲۳

(۲) سنن أبي داود: ۴/ ۱۰۷

(۳) مجمع الزوائد ومنبع الفوائد: ۷/ ۳۱۳

(۴) المعجم الأوسط: ۵/ ۳۱۱ مع مصنف ابن أبي شيبة: ۷/ ۵۱۳، ۵۱۴

(۵) المعجم الأوسط: ۵/ ۳۱۱، والعرف الوردي في أخبار المهدي: ۲/ ۷۵

(۶) مجمع الزوائد ومنبع الفوائد: ۷/ ۳۱۳

(۷) المستدرك على الصحيحين للحاكم: ۴/ ۶۰۱

(۸) سنن أبي داود: ۴/ ۱۰۷ مع ترجمان السنة، ص: ۳۶۰

(۹) البداية والنهاية ط هجر: ۱۹/ ۶۴ بتصرف وتسهيل.

فصلِ سوم

یہ فصل درج ذیل دو مباحث پر مشتمل ہے:

۱۔ حضرت امام حسین سلامُ اللہ وَ رِضوانُہ علیہ کی سیرت و مناقب

۲۔ امام حسینؓ کے ائمہ صاحبزادگان سلامُ اللہ وَ رِضوانُہ علیہم کی سیرت و مناقب

۱۔ حضرت امام حسین سلامُ اللہ وَ رِضوانُہ علیہ

نام و نسب:

آپ سلامُ اللہ وَ رِضوانُہ علیہ کا نام "حُسَین" (سین کی شد کے بغیر) ہے۔ آپؓ امیر المومنین حضرت علیؓ بن ابی طالب اور سیدۃ النساء حضرت فاطمۃ الزہراءؓ کے دوسرے صاحبزادے، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ام المومنین حضرت خدیجہؓ کے پیارے نواسے ہیں۔ آپؓ کی مشہور کنیت "ابو عبداللہ" ہے، نسب کے اعتبار سے قریشی اور ہاشمی ہیں۔[1]

آپؓ کا نام "حُسَین" خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے رکھا۔ آپؓ سے پہلے یہ کسی کا نام نہیں تھا، بلکہ اللہ تعالیٰ نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے "حسن" اور "حسین" نام رکھنے تک یہ دونوں نام لوگوں سے پہلے مخفی رکھے۔[2] آپؓ ''ریحانۃ النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم'' (حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پھول)[3] اور ''سبط رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم'' (نواسۂ رسول)[4] کے معزز القابات سے مشہور ہیں۔

ولادتِ باسعادت اور متعلقہ امور:

آپؓ اپنے بھائی حضرت حسنؓ سے تقریباً ایک برس چھوٹے تھے، آپؓ کی پیدائش ۵ شعبان المعظم سن ۴ھ میں

---

(۱) البدایۃ والنہایۃ ط هجر: ۱۱/۴۷۳

(۲) أسد الغابۃ ط العلمیۃ: ۲/۱۳

(۳) أسد الغابۃ ط العلمیۃ: ۲/۲۴

(۴) سیر أعلام النبلاء ط الرسالۃ: ۳/۲۸۰

مدینہ طیبہ میں ہوئی۔ [1] جب آپؓ پیدا ہوئے تو حضور ﷺ نے آپؓ کے (دائیں) کان میں اذان دی، [2] اور بائیں کان میں اقامت کہی۔ [3] اور اپنے مبارک لعابِ دہن سے آپؓ کے منہ میں گھٹی ڈالی اور آپؓ کیلیے دعا کی۔ [4]

ولادت کے ساتویں دن آپؓ کا عقیقہ کیا گیا جس میں حضرت فاطمہؓ نے رسول اللہ ﷺ کے حکم سے آپؓ کے سر کے بال مونڈ کران کے وزن کے برابر چاندی صدقہ کی، اور حضور ﷺ نے دو بکریاں ذبح کیں۔ ایک روایت میں ہے کہ ایک بکری ذبح کی (اس سے معلوم ہوا کہ اگر کوئی شخص لڑکے کی پیدائش پر صرف ایک بکری ذبح کرنے کی طاقت رکھتا ہو تو اس سے بھی عقیقہ کی سنت ادا ہو جائے گی اگرچہ دو بکریاں یا بکرے کرنا بہتر ہے)۔ اور اسی ساتویں دن آپؓ کا ختنہ کیا گیا اور نام رکھا گیا۔ حضرت علیؓ نے حضرت حسنؓ کی طرح ان کا نام بھی "حرب" تجویز کیا تھا مگر آپ ﷺ نے تبدیل کر کے "حسین" رکھ دیا۔ [5]

حلیہ مبارک:

آپؓ کا درمیانہ قد تھا، نہ بہت لمبا اور نہ ہی بہت کوتاہ۔ پیشانی کشادہ، ڈاڑھی گھنی اور سینہ مبارک فراخ تھا۔ دونوں کندھے اعتدال کے ساتھ بڑے اور ہڈیاں بڑی و مضبوط تھیں۔ ہتھیلیاں، اور قدموں کے تلوے قدرے کشادہ تھے۔ بال گھنگھریالے، اور بدن خوب گٹھا ہوا اور سرخی مائل سفید تھا۔ ڈاڑھی مبارک پر "وسمہ" کا خضاب لگاتے تھے [6]

["وسمہ" ایک بوٹی ہے جس کے پتوں سے بالوں کو سیاہ (یا بقولِ بعض سیاہی مائل [7]) خضاب کیا جاتا ہے۔ [8]]۔

---

(1) معرفة الصحابة لأبي نعيم: ٢/٦٦٢، والاستيعاب في معرفة الأصحاب: ١/٣٩٢

(2) المستدرك للحاكم: ٣/١٩٧، ومعرفة الصحابة لأبي نعيم: ٢/٦٦١

(3) الإمام الحسين للجزائري، ص: ٢٢، وذخائر العقبى في مناقب ذوي القربى ص: ١٢٠

(4) البداية والنهاية طهجر: ١١/٤٧٣

(5) ينظر: ذخائر العقبى ص: ١١٨، ١١٩ مع المستدرك للحاكم: ٣/١٩٧

(6) عمدة القاري: ١٦/٢٤١، وكذا اختاره ابن حجر في موضع من فتح الباري لابن حجر: ٧/٩٦، بينما ذهب في موضع آخر منه: ١/٢٠٥ إلى أنه نبت يخضب بورقه الشعر أسود كماسياني.

(7) النهاية في غريب الحديث والأثر: ٥/١٨٥، ولسان العرب: ١٢/٦٣٧، ومجمع بحار الأنوار: ٥/٥٣، وفتح الباري لابن حجر: ١/٢٠٥

فائدہ: اگر کوئی شوہر اپنی بیوی کو خوش کرنے کے لیے اس کے سامنے تزئین و آرائش کے طور پر سیاہ خضاب استعمال کرے تو بعض سلف و اکابر حضرات کے نزدیک یہ جائز ہے جیسے حضرت عثمان غنیؓ، حضرات حسنین کریمینؓ، حضرت عقبہ بن عامرؓ، اور امام ابو یوسفؒ و امام ابن سیرینؒ وغیرہ۔ (قاموس الفقہ: ٣/٣٤٠)

آپ ؓ خوبصورت بدن کے ساتھ ساتھ خوبصورت آواز کے بھی مالک تھے۔اور آپ ؓ کی آواز میں جہاں سوز وترنم تھا وہاں گرج بھی تھی۔ [1] آپ ؓ کی مبارک زلفیں، عمامہ کے نیچے سے ظاہر ہوتی تھیں۔ [2]

حضرت حسین ؓ رنگ وقامت اور تخلیقِ اعضاء میں سینہ سے لے کر پاؤں تک (یعنی اپنے نیچے والے نصف بدن میں) حضور ﷺ کے مشابہ تھے۔ [3] یعنی یوں کہہ سکتے ہیں کہ حضرت حسن ؓ کا چہرہ رسول اللہ ﷺ کے چہرۂ انور کے مشابہ اور حضرت امام حسین ؓ کا جسم آپ ﷺ کے جسمِ اطہر کے مشابہ تھا۔ [4]

پرورش وتربیت:

سیدنا حضرت امام حسین ؓ کی پرورش مدینہ طیبہ کے پاکیزہ ترین معاشرے میں ہوئی جہاں آپ ؓ کو رسول اللہ ﷺ سے تربیت اور اُن کی شفقت ومحبت میں سے وافر حصہ ملا (کہ کبھی آپ ﷺ کی پیٹھ پر سوار ہوئے تو کبھی آپ ﷺ کے دوشِ مبارک پر سواری کی جیسا کہ کئی احادیث اس پر شاہد ہیں-) اور جہاں اُن مقدس ہستیوں کی صحبت نصیب ہوئی جو انبیاء کرام کے بعد کائنات کے افضل ترین انسان تھے۔ چناں چہ آپ ؓ ایمان وتقویٰ اور قرآن وسنت کے روحانی ماحول میں پروان چڑھے، اور مسجد النبی ﷺ میں نبوی تعلیم وتربیت کے قائم ہونے والے ماحول کا اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کیا اور اس سے فیضیاب ہوئے۔ اس کے ساتھ ساتھ گھر کی زندگی میں نبی کریم ﷺ کی صاحبزادی، خواتینِ جنت کی سردار حضرت فاطمۃ الزہراء ؓ کی تربیت بھری گود اور حضور ﷺ کے جلیل القدر صحابی امیر المومنین سیدنا علی المرتضیٰ ؓ کا سایۂ عاطفت نصیب ہوا۔ اور خود رسول اللہ ﷺ کے تمام گھروں میں آمدورفت وفیض یابی کے مواقع میسر آئے۔ اس طرح آپ ؓ چشمۂ نبوت سے خوب سیراب ہوئے اور بالآخر تربیت وسعادت کے اعلیٰ مقام پر فائز ہو کر ''نوجوانانِ جنت کے سردار'' ٹھہرے۔ [5]

---

(۱) الإمام الحسين للجزائري، ص: ۲٦

(۲) المعجم الكبير للطبراني: ۳/۱۰۰، وسير أعلام النبلاء: ۳/۲۹۱

(۳) سير أعلام النبلاء: ۳/۲۸۰ مع معرفة الصحابة لأبي نعيم: ۲/٦٦۲

(۴) البداية والنهاية طهجر: ۱۱/۴۷۴

(۵) مستفاد من الإمام الحسين، ص: ۳۴، مع إضافة يسيرة.

حضرت حسینؓ، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانہ میں

حضرت حسینؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا بہت کم زمانہ پایا مگر اس کم عمری کے باوجود آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی صحبت سے بہت فیضیاب ہوئے۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی آخر عمر تک آپؓ ان کی صحبت میں رہے [1]، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مختلف کیفیات وحالات میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی صحبت اٹھائی۔

کبھی آپؓ کو، حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور جبریل علیہ السلام کی ہم نشینی کا شرف حاصل ہورہا ہے، [2] کبھی آپؓ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی گود میں ہیں، [3] کبھی ان کے ساتھ منبرِ رسول پر بیٹھے ہیں، [4] اور کبھی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ مدینہ کی گلیوں میں معصومانہ اداؤں میں مشغول ہیں۔ [5] کبھی ان کو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے قدموں پر کھڑا کر رکھا ہے [6] تو کبھی کندھوں پر اٹھا رکھا ہے۔ [7] کبھی وہ سفر میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ ہیں [8] تو کبھی مسجد میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ہمراہ۔ [9] کبھی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اُن پر دَم کررہے ہیں [10] تو کبھی اُن کو بلوایا جارہا ہے۔ [11] کبھی ان کو اپنی چادر کے اندر لپیٹ رکھا ہے [12] تو کبھی سینے سے چمٹایا ہوا ہے۔ [13] کبھی ان کو اپنے ساتھ خچر پر بٹھا رکھا ہے [14] تو

---

(۱) ينظر: البداية والنهاية ط هجر: ۱۱/۴۷۶

(۲) سير أعلام النبلاء ط الرسالة: ۳/۲۸۹ وإسناده حسن

(۳) مسند أبي يعلى الموصلي: ۹/۲۵۰

(۴) سنن أبي داود: ۱/۲۹۰، وسنن النسائي: ۳/۱۰۸

(۵) سنن ابن ماجه: ۱/۵۱

(۶) فضائل الصحابة لأحمد بن حنبل: ۲/۷۸۷

(۷) مسند أحمد ط الرسالة: ۱۵/۴۲۰

(۸) مجمع الزوائد ومنبع الفوائد: ۹/۱۸۰

(۹) مسند أحمد ط الرسالة: ۱۶/۳۸۷

(۱۰) سنن أبي داود: ۴/۲۳۵، ومسند أحمد: ۳/۲۰

(۱۱) سنن الترمذي: ۵/۶۵۸، والمستدرك للحاكم: ۳/۱۹۶

(۱۲) سنن الترمذي ت شاكر: ۵/۶۵۶

(۱۳) مسند أحمد: ۲۹/۱۰۳، ومجمع الزوائد: ۹/۱۸۰

(۱۴) صحيح مسلم: ۴/۱۸۸۳

کبھی خود اپنی پیٹھ پر سوار کر رکھا ہے۔[1] کبھی کھجوروں کے موسم میں وہ آپ ﷺ کے سامنے کھیل رہے ہیں اور آپ ان کو صدقہ کی کھجور کھانے سے روک رہے ہیں،[2] اور کبھی ان کو بچپن میں ہی بیعت فرما رہے ہیں[3] (حالانکہ آپ ﷺ کا معمول بچوں کو بیعت فرمانے کا نہیں تھا)۔ الغرض چھوٹی عمر کے باوجود آپ ﷺ کی اس قدر محبت اٹھانا حضرات حسنین رضی اللہ عنہما کا ہی امتیاز و اعزاز تھا۔

واضح رہے کہ مذکورہ تمام امور، مختلف روایات واحادیث سے ثابت شدہ ہیں۔

---

(۱) مجمع الزوائد: ۹/۱۸۲، ومسند أبي يعلى: ۹/۲۵۰

(۲) صحيح البخاري: ۲/۱۲۷

(۳) البداية والنهاية ط هجر: ۱۱/۵۹۰

حضرت حسینؓ، خلفاءِ راشدینؓ کے زمانہ میں

عہدِ صدیقی:

خلیفۂ اول حضرت ابوبکر صدیقؓ کے زمانہ میں حضرت حسینؓ ابھی بچے تھے، مگر اس کے باوجود حضرت ابوبکرؓ ان کا بہت احترام و تعظیم کرتے تھے۔[1] چناں چہ خلافت کے صدیقی دور میں، جب حضرت خالد بن ولیدؓ کی قیادت میں ''حیرہ'' کا علاقہ فتح ہوا تو حضرت خالد بن ولیدؓ نے وہاں سے حضرت صدیقِ اکبرؓ کی خدمت میں بہت سا مال بھیجا اس میں طیلسان کی (خاص قسم کی) چادر اور ایک ہزار درہم بھی بھیجے۔ جب وہ مال یہاں پہنچا تو حضرت ابوبکر صدیقؓ نے وہ خصوصی چادر حضرت امام حسینؓ کو ہبہ کردی۔[2]

عہدِ فاروقی:

خلیفۂ ثانی حضرت عمر فاروقؓ بھی آپؓ کی کم سنی کے باوجود آپؓ سے حد درجہ محبت اور آپؓ کا بہت احترام کرتے تھے۔[3]

ایک مرتبہ حضرت عمرؓ نے حضرت حسینؓ سے کہا: پیارے بیٹے! کیا ہی اچھا ہو اگر آپ ہمارے پاس آتے جاتے رہا کریں۔ حضرت حسینؓ فرماتے ہیں: چناں چہ ایک دن میں حضرت عمرؓ کے پاس آیا اور وہ حضرت معاویہؓ کے پاس تنہائی میں بیٹھے تھے۔ (اس وقت اندر جانے کیلیے) حضرت عمرؓ کے صاحبزادے حضرت عبداللہؓ بھی دروازے پر موجود تھے چناں چہ (اجازت نہ ملنے کی وجہ سے) وہ واپس چلے گئے اور ان کو دیکھ کر میں بھی واپس چلا گیا۔

پھر بعد میں حضرت عمرؓ سے ملاقات ہوئی تو انہوں نے فرمایا: میں نے کب سے آپ کو دیکھا ہی نہیں (یعنی آپ ہمارے پاس آتے ہی نہیں؟)۔ میں نے کہا: امیر المومنین! میں آیا تھا، آپ اس وقت حضرت معاویہؓ کے ساتھ تنہائی

---

(۱) البدایة والنهایة طهجر: ۱۱/۴۷۶

(۲) فتوح البلدان ص: ۲۴۲

(۳) البدایة والنهایة طهجر: ۱۱/۴۷۶

میں بیٹھے ہوئے تھے۔آپ کے صاحبزادے بھی دروازے پر موجود تھے چناں چہ (اجازت نہ ملنے کی وجہ سے) وہ واپس چلے گئے اور ان کو دیکھ کر میں بھی واپس چلا گیا تھا۔اس پر حضرت عمرؓ نے فرمایا: أَنتَ أَحَقُّ بِالإِذْنِ مِن ابنِ عُمَرَ، فَإِنَّمَا أَنْبَتَ مَا تَرىٰ في رُؤُوسِنا اللهُ ثُمَّ أَنتُم ''آپ تو ابن عمرؓ سے اجازت کے زیادہ حق دار ہیں۔اور ہمارے سروں پر جو عزت آپ دیکھ رہے ہیں، اول تو یہ اللہ نے ہمیں عطا کی ہے اور پھر یہ عزت آپ حضرات کے سبب سے ہے''۔[1]

ملاحظہ:

عہدِ فاروقی میں آپؓ کی حیاتِ طیبہ کے واقعات میں سے، کچھ حضرت حسنؓ کی سیرت اور کچھ بابِ اول کی فصلِ سوم کے تحت پیچھے گزر چکے ہیں وہاں ملاحظہ فرمالیے جائیں۔

عہدِ عثمانی:

حضرت عثمانؓ کا زمانہ خلافت گیارہ سال سے زائد مدت پر محیط رہا۔ان کے زمانہ میں حضرت حسین سلامُ اللہ وَرِضوانُہ علیہ، جوان مرد تھے اور اپنی عملی زندگی میں داخل ہو چکے تھے۔انہوں نے دنیوی صاحبزادوں کی طرح گھروں میں رہ کر ناز ونعمت والی زندگی اپنانے کے بجائے اشاعتِ دین والی مجاہدانہ زندگی اختیار کی اور کئی جہاد کیے، جن کا تذکرہ پیچھے حضرت حسنؓ کی سیرت کے تحت گزر چکا ہے، وہاں ضرور ملاحظہ فرمالیا جائے۔

علاوہ ازیں، دورِ عثمانی (رجب ۲۶ھ) میں عمرہ کی ادائیگی کیلیے ایک مرتبہ حضرت عثمانؓ اور حضرت حسینؓ آپس میں رفیقِ سفر بھی رہے اور حضرت عبداللہ بن جعفرؓ بھی اس سفر میں ساتھ تھے۔دورانِ سفر ''السقیا'' نامی مقام پر پہنچ کر حضرت حسینؓ بیمار ہو گئے۔تو حضرت عثمانؓ نے حضرت عبداللہ بن جعفرؓ کو وہیں حضرت حسینؓ کے پاس تیمارداری کیلیے ٹھہرا دیا اور ساتھ ہی حضرت علیؓ کو اس بات کی اطلاع دینے کیلیے ایک قاصد مدینہ طیبہ روانہ کر دیا۔بہر حال حضرت حسینؓ کی تیمارداری کا یہ انتظام کر کے حضرت عثمانؓ عمرہ کی ادائیگی کیلیے مکہ مکرمہ روانہ ہو گئے۔پیچھے سے حضرت علیؓ بھی بنو ہاشم کے کچھ لوگ ساتھ لے کر ''السقیا'' مقام پر پہنچ گئے۔چونکہ حضرت حسینؓ نے عمرہ کا احرام باندھ رکھا تھا (اور اب وہ معذوری کی وجہ سے عمرہ کی ادائیگی سے عاجز تھے) اس لیے حضرت علیؓ نے وہاں پہنچ

---

(۱) تاریخ دمشق لابن عساکر: ۱۷۶/۱۴، والإصابۃ: ۶۹/۲ بسند حسن

کر سب سے پہلے بطورِ دَم جانور ذبح کیا پھر حضرت حسینؓ کے سر کے بال منڈوائے تا کہ ان کا احرام ختم ہو جائے۔ اس کے بعد حضرت علیؓ ان کی تیمارداری میں مشغول ہو گئے۔

ادھر سے حضرت عثمانؓ بھی عمرہ کے بعد وہاں حضرت حسینؓ اور حضرت علیؓ کے پاس پہنچ گئے اور آ کر حضرت علیؓ سے کہا کہ آپ کی تشریف آوری تک میں یہیں حضرت حسینؓ کے پاس تیمارداری کیلیے ٹھہرنا چاہتا تھا مگر حضرت حسینؓ نے مجھے قسم دے کر کہا کہ آپ باقی قافلہ لے کر عمرہ کیلیے چلے جائیں (اس لیے میں چلا گیا اور عمرہ سے فارغ ہو کے پھر یہاں واپس آ گیا ہوں)۔[1]

حضرت عثمانؓ کے اخیر زمانہ میں حضرت حسینؓ کی عمر مبارک تیس سال سے کچھ اوپر ہو چکی تھی۔ حضرت عثمانؓ کی شہادت سے کچھ مدت قبل باغیوں (شر پسند لوگوں) نے آپؓ کے گھر کا محاصرہ (گھیراؤ) کر لیا تھا اور نعوذ باللہ آپؓ کے قتل کے درپے ہو گئے تھے۔ اس مشکل گھڑی میں حضرت حسنؓ وحسینؓ اور دیگر کئی حضرات اسلحہ کے ساتھ تیار ہو کر حضرت عثمانؓ کی حفاظت کیلیے ان کے گھر پہنچے، مگر حضرت عثمانؓ کو اپنی وجہ سے مدینۃ الرسول ﷺ میں خون بہانا کسی طرح گوارا نہ تھا اس لیے انہوں نے دفاعی کارروائی کیلیے آنے والے ان حضرات کو تاکید سے فرمایا کہ میں آپ لوگوں کو قسم دے کر کہتا ہوں کہ آپ لوگ اسلحہ رکھ دو اور اپنے اپنے گھروں کو واپس چلے جاؤ اور وہیں بیٹھ جاؤ یعنی میری وجہ سے آپ لوگ یہاں میرے گھر کے پاس نہ ٹھہرو۔

ان شریر لوگوں کا یہ گھیراؤ ماہِ ذی القعدہ (۳۵ھ) کے آخر سے اٹھارہ ذی الحجہ، جمعہ کے دن، تک جاری رہا۔ اگرچہ حضرت عثمانؓ نے ان مذکورہ حضرات کو روک دیا تھا مگر حضرت حسن وحسینؓ سمیت کئی حضرات اپنی طرف سے ان کی حفاظت کیلیے ان کے گھر کے پاس موجود رہے لیکن وہ بدبخت باغی گھر کی دیواریں پھلانگ کر اندر گھس آئے اور آپؓ کو شہید کر دیا۔ اور اسی جمعہ کے روز (عصر کے بعد) آپؓ نے جامِ شہادت نوش فرمایا۔[2]

---

(۱) الثقات لابن حبان: ۲/ ۲۳۶

(۲) ینظر: تاریخ الإسلام للذہبی: ۳/ ۴۵۳ مع البدایة والنہایة: ۱۰/ ۲۹۸ ومابعدھا۔

عہدِ مرتضوی:

حضرت علی المرتضیٰؓ کے ''امیر المومنین'' مقرر ہونے کے وقت حضرت حسینؓ کی عمر اکتیس برس اور سیدنا علیؓ کی شہادت کے وقت عمر عزیز چھتیس سال ہو چکی تھی۔ خلیفہ بننے کے بعد جب حضرت علیؓ مدینہ منورہ سے کوفہ آ گئے (اور یہیں کوفہ میں ہی دار الخلافہ قائم کر لیا اور پھر یہیں رہنے لگے) تو حضرت حسینؓ بھی، جو کہ اب تک مدینہ طیبہ میں رہائش پذیر تھے، ان کے ساتھ ہی کوفہ آ گئے۔ ان پانچ برس میں حضرت حسینؓ، امیر المومنین سیدنا علیؓ کے ساتھ رہے اور اس مدت کے دوران حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو جن جنگوں کا سامنا کرنا پڑا ان میں حضرات حسنینؓ (اور خاص کر حضرت حسینؓ) بھی اپنے والد کے ساتھ شریک رہے۔

چناں چہ ''جنگ جمل'' (جو ۳۶ھ میں پیش آئی) اور اس کے بعد پھر ''جنگِ صفین'' میں بھی حضرت حسینؓ اپنے والد کے ہمراہ ان جنگوں میں شریک رہے (اور جنگ ختم ہو جانے کے بعد جب ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہؓ نے واپس مکہ مکرمہ جانے کا ارادہ کیا تو حضرت حسنؓ و حسینؓ، آپؓ کو احترام و اعزاز کے ساتھ رخصت کرنے کیلیے، آپؓ کے ساتھ گئے)۔

جنگ جمل و صفین کے بعد ایک اور جنگ اس زمانہ کے ''خوارج'' کے ساتھ پیش آئی تھی، اس جنگ میں بھی حضرت حسینؓ شریک تھے۔[1]

حضرت حسینؓ، حضرت علیؓ کی حیات بھر آپؓ کے ساتھ رہے۔ سیدنا علیؓ نے اپنی آخر عمر میں حضرت حسنؓ اور حضرت حسینؓ کو کئی نصیحت آموز وصیتیں کیں، بالخصوص تقویٰ، نماز اور روزہ وغیرہ کی وصیت کی۔ پھر جب آپؓ کو وہیں ''کوفہ'' میں شہید کر دیا گیا تو آپؓ کی تجہیز و تکفین کا انتظام بھی حضرت حسن و حسین سلامُ اللہ وَرِضوانُہٗ علیہما نے کیا (اور عبد اللہ بن جعفرؓ- جو حضرت علیؓ کے بھتیجے تھے- بھی ساتھ تھے)۔ پھر حضرت حسنؓ نے جنازہ پڑھایا۔[2]

---

(۱) الإصابة في تمييز الصحابة: ۲/ ۶۹ مع البداية والنهاية: ۱۰/ ۲۷۲، ۲۷۳، ۲۷۴، ۲۷۶

(۲) البداية والنهاية: ۱۱/ ۱۵، ۱۷ مع الإصابة في تمييز الصحابة: ۲/ ۶۹

حضرت حسینؓ، خلافتِ راشدہ کے بعد کے زمانہ میں

حضرت علیؓ کی شہادت کے بعد لوگوں نے چند روز میں ہی (رمضان ۴۰ھ میں) حضرت حسنؓ کے ہاتھ پر بیعتِ خلافت کر لی۔ حضرت حسنؓ صلح پسند انسان تھے چناں چہ انہوں نے پھر کچھ ماہ بعد (ربیع الاول سنہ ۴۱ھ میں) حضرت معاویہؓ سے صلح کر کے ان کے ہاتھ پر بیعت کر لی۔[1] اور حضرت حسینؓ نے بھی بیعت کر لی۔[2]

بہر حال حضرت حسنؓ جب تک اپنے دور خلافت کے دوران کوفہ میں رہے حضرت حسینؓ بھی ان کے ساتھ ہی رہے پھر جس وقت صلح ہوگئی (اور حضرت امیر معاویہؓ نے کوفہ سمیت تمام اسلامی شہروں کو سنبھالنا شروع فرمادیا) تو حضرت حسنؓ اور حضرت حسینؓ کوفہ کی رہائش چھوڑ کر واپس مدینہ طیبہ آ گئے۔[3] جب مدینہ منورہ آئے اس وقت حضرت حسن کی عمر اڑتیس (۳۸) جبکہ حضرت حسینؓ کی عمر سینتیس (۳۷) برس تھی۔ مدینہ طیبہ پہنچ کر ان حضرات نے پھر یہیں رہنا شروع فرمادیا۔

اس قیام کے دوران حضرات حسنین کریمینؓ، حضرت معاویہؓ کے پاس آتے جاتے رہتے تھے۔ اور حضرت معاویہؓ ان کا بہت احترام واکرام فرماتے اور تحائف وہدایا دیتے تھے، بعض دفعہ تو اکٹھے دو دو لاکھ درہم دے کر بھی ان کی خدمت فرماتے تھے۔ حضرت حسنؓ کے انتقال کے بعد بھی حضرت حسینؓ، حضرت معاویہؓ کے پاس تشریف لاتے رہے اور حضرت معاویہؓ اُن کا بہت اعزاز واکرام کرتے اور انہیں تحائف وہدایا دیتے۔[4]

اس کے ساتھ ساتھ حضرت حسنؓ اور حضرت حسینؓ کا آپس میں بھی بہت پیار ومحبت تھا، ان دونوں بھائیوں نے اکٹھے حج کیا۔ راستے میں انہیں بھوک پیاس نے ستایا تو وہاں ایک بڑھیا نے اپنی بکری ذبح کر کے ان کی ضیافت کی۔ یہ دونوں بھائی حج کر کے واپس آ گئے۔ پھر کسی موقع پر وہی بڑھیا مدینہ میں آئی تو حضرت حسنؓ نے ایک ہزار بکری اور ایک ہزار دینار سے اس کی خدمت کی۔ پھر وہ حضرت حسینؓ کے پاس آئی تو انہوں نے بھی اپنے بھائی حسنؓ کی دی

---

(۱) تقدم تخریجہ ضمن سیرۃ سیدنا حسن رضی اللہ عنہ

(۲) ینظر: الأخبار الطوال ص: ۲۲۴، وفوائد نافعہ، ص: ۲۰۶

(۳) الإصابۃ في تمییز الصحابۃ: ۲/۷۹، والبدایۃ والنہایۃ ط ہجر: ۱۱/۱۴۱

(۴) البدایۃ والنہایۃ ط ہجر: ۱۱/۴۷۶، وتاریخ دمشق لابن عساکر: ۱۴/۱۱۳

ہوئی مقدار کے برابر اس کو مال دیا۔[1]

اور ان دونوں بھائیوں کا ایک دوسرے کے ساتھ گہرا بلکہ عقیدتمندانہ تعلق تھا، حتی کہ ایک موقع پر حضرت حسنؓ نے حضرت حسینؓ سے کہا: میری خواہش ہے کہ آپ کی جرأت وہمت کا کوئی ذرہ مجھے بھی نصیب ہوجاتا۔ اور حضرت حسینؓ نے حضرت حسنؓ سے کہا: میری خواہش ہے کہ آپ کی فصاحت وبلاغت اور آپ کے قادر الکلام ہونے کا کوئی حصہ مجھے بھی حاصل ہوجاتا۔[2]

بہرحال حضرات حسنینؓ کے کوفہ سے مدینہ طیبہ منتقل ہوجانے کے بعد، حضرت حسنؓ تو پھر زندگی بھر یہیں مدینہ میں رہے۔ بالآخر چھیالیس سال کی عمر پاکر ۴۹ھ میں انتقال فرمایا اور جنت البقیع میں دفن ہوئے۔[3] اور حضرت حسینؓ بھی حضرت معاویہؓ کے دَور تک یہیں مدینہ طیبہ میں رہے،[4] اور اپنے اس قیام کے دوران جہاد میں شرکت فرماتے رہے۔ چنانچہ حضرت معاویہؓ کے دَور میں ۵۱ھ میں (جب کہ حضرت حسینؓ کی عمر سینتالیس برس تھی) آپؓ نے جہادِ قسطنطنیہ میں شرکت کی۔

اور حضرت امیر معاویہؓ نے اپنی حیاتِ طیبہ میں ہی نہایت دیانتداری اور نیک نیتی کی بنیاد پر اپنے بیٹے "یزید" کو اپنا ولی عہد مقرر فرمادیا تھا اور اپنی وفات سے پہلے آپؓ نے یزید کو کچھ وصیتیں فرمائیں، ان میں ایک یہ بھی تھی:

لَنْ يَتْرُكَهُ (أي الحسين) أَهْلُ الْعِرَاقِ حَتّٰى يُخْرِجُوهُ، فَإِنْ خَرَجَ وَظَفِرْتَ بِهٖ فَاصْفَحْ عَنْهُ، فَإِنَّ لَهٗ رَحِمًا مَاسَّةً وَحَقًّا عَظِيمًا وَقَرَابَةً مِنْ مُحَمَّدٍ - صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ[5]

"میرے خیال میں اہلِ عراق، حضرت حسینؓ کو تمہارے مقابلے میں ضرور لائیں گے، اگر ایسا ہو اور تمہیں اُن پر غلبہ حاصل ہوجائے تو ان سے درگزر کرنا کہ ان کی ہم سے قریبی رشتہ داری ہے اور ان کی رسول اللہ ﷺ سے بھی انتہائی قربت ورشتہ داری ہے، اس نسبت سے ہم سب پر ان کا بڑا حق

---

(۱) إحياء علوم الدين: ۲۴۹/۳

(۲) سير أعلام النبلاء ط الرسالة: ۲۸۷/۳

(۳) تقدم تخريجه ضمن سيرة سيدنا حسن رضي الله عنه

(۴) الإصابة في تمييز الصحابة: ۶۹/۲

(۵) الكامل في التاريخ لابن الأثير: ۱۲۰/۳، وكذا في البداية والنهاية ط الفكر: ۱۱۵/۸، وتاريخ الطبري: ۳۲۳/۵

ہے (لہٰذا ان کی اس مقدس نسبت اور عظیم حق کا خیال رکھنا)"۔

مگر حضرت معاویہؓ کی اس محبت بھری وصیت کا یزید نے ذرا بھر بھی خیال نہ کیا اور بالآخر اسی کے ظلم و زیادتی کے نتیجہ میں کربلاء کا دلدوز واقعہ پیش آیا، جس کی تفصیل آرہی ہے۔

بہرحال رجب ۶۰ھ میں حضرت معاویہؓ کا انتقال ہوگیا اور یزید نے اپنے ہاتھ پر بیعت لینا شروع کردی مگر حضرت حسینؓ ان کے ہاتھ پر بیعت کیے بغیر، اپنے اہل وعیال سمیت مدینہ طیبہ سے مکہ مکرمہ چلے گئے۔[1] اس وقت آپؓ کی عمر مبارک کے ۵۶ برس اپنی تکمیل کو پہنچ رہے تھے۔

---

(۱) البدایۃ والنہایۃ طھجر: ۱۱/۴۷۷

''سانحۂ کربلا'' اور اس کا پس منظر

حضرت امام حسینؓ نے اپنے اہلِ خانہ کے ہمراہ مکہ مکرمہ پہنچ کر وہیں رہنا شروع فرما دیا۔ ادھر جب اہلِ کوفہ کو حضرت معاویہؓ کی وفات کی خبر ملی اور یہ کہ حضرت حسینؓ اور بعض دیگر حضرات نے بیعت یزید سے انکار کر دیا تو ان لوگوں نے یکے بعد دیگرے آپؓ کو کئی خطوط لکھے کہ ہم بھی یزید کے ہاتھ پر بیعت کرنے پر تیار نہیں۔ آپؓ فوراً کوفہ آ جایئے ہم سب آپ کے ہاتھ پر بیعت کریں گے۔ اس طرح کئی خطوط جمع ہو گئے اور بعض لوگ تو وہاں سے وفد کی شکل میں بھی آپؓ کے پاس مکہ آئے اور کوفہ آنے کی دعوت دی مگر آپؓ نے اپنی حکمت و دانشمندی سے یہ کیا کہ بجائے خود جانے کے، اول حالات کی تحقیق کیلیے اپنے چچازاد بھائی حضرت مسلم بن عقیل کو کوفہ روانہ کیا۔ وہ کوفہ پہنچ کر ''مختار بن ابی عُبید ثقفی'' کے گھر پر مقیم ہوئے۔ یہاں کے لوگوں کی آپ کے پاس آمد و رفت شروع ہو گئی اور آپ نے دیکھا کہ یہاں کے مسلمان یزید کی بیعت سے متنفر اور حضرت امام حسینؓ کی بیعت کیلیے بے چین ہیں، چناں چہ آپ نے امام حسینؓ کیلیے بیعتِ خلافت شروع کر دی۔ چند روز میں صرف کوفہ سے اٹھارہ ہزار مسلمانوں نے امام حسینؓ کیلیے بیعت کر لی۔ اور یہ سلسلہ روز بروز بڑھتا جا رہا تھا۔

یہ صورت حال دیکھ کر مسلم بن عقیل کو اطمینان ہو گیا کہ حضرت حسینؓ اگر یہاں تشریف لے آئیں تو واقعی ایک صحیح و معیاری خلافت قائم ہو جائے گی اس لیے انہوں نے ہدایت کے موافق حضرت حسینؓ کو خط لکھ کر کوفہ آنے کی دعوت دے دی۔ مگر اللہ کا کرنا ایسا ہوا کہ یہ خط لکھنے کے بعد یہاں (کوفہ میں) حالات یکسر بدلنا شروع ہو گئے۔ یزید کی طرف سے صحابیٔ رسول حضرت نعمان بن بشیرؓ کوفہ کے حاکم تھے اور یہ اہلِ بیت کے معاملہ میں چونکہ ہمدرد اور نرم تھے اس لیے یزید نے ان کو معزول کر کے بصرہ کے گورنر ''عبید اللہ بن زیاد'' کو بصرہ اور کوفہ دونوں کا حاکم بنا دیا اور اس کو خط لکھا کہ فوراً بصرہ سے کوفہ پہنچ کر مسلم بن عقیل کو گرفتار کرے اور قتل کر دے یا کوفہ سے نکال دے۔ جیسے ہی یہ خط ملا تو ''ابن زیاد'' اپنے ساتھ ''مسلم بن عمر باہلی'' اور ''شریک بن اعور'' کو اپنے ہمراہ لے کر کوفہ کی طرف روانہ ہو گیا۔ کوفہ پہنچتے ہی اگلے روز صبح ہی ابن زیاد نے اہلِ کوفہ کو جمع کر کے ایک سخت تقریر کی جس میں اس نے اپنی مخالفت و بغاوت کرنے والوں کو بہت ڈرایا۔ ادھر مسلم بن عقیل جواب تک مختار بن ابی عبید کے گھر مقیم تھے ان کو جب ابن زیاد کی اس

تقریر کا علم ہوا تو وہ مخبری کے ڈر سے ان کا گھر چھوڑ کر "ہانی بن عُروہ" کے گھر آ گئے۔ "شریک بن اعور" جو کہ "ابن زیاد" کے ساتھ بصرہ سے کوفہ آیا تھا مگر اہلِ بیت سے محبت رکھنے کے سبب ابن زیاد سے جدا ہو کر ہانی بن عروہ کا مہمان اور ہمراز ہو گیا تھا یہ بیمار پڑا تو ابن زیاد نے پیغام بھیجا کہ آج شام کو میں شریک بن اعور کی عیادت کیلیے آؤں گا۔ شریک بن اعور نے اس موقع کو غنیمت جان کر مسلم بن عقیل سے کہا: یہ فاسق و فاجر آج شام کو میری عیادت کیلیے آنے والا ہے، جب یہ آ کر بیٹھے تو آپ چپکے سے اس پر حملہ کر کے اسے قتل کر دیں۔ اور یاد رکھنا کہ اس موقع کو ہاتھ سے نہ جانے دینا۔ شام کو ابن زیاد آیا اور کافی دیر بیٹھا رہا مگر مسلم بن عقیل نے اسے قتل نہ کیا۔ جب وہ چلا گیا تو شریک بن اعور نے مسلم بن عقیل سے پوچھا کہ آپ نے کس وجہ سے اُس کو قتل نہیں کیا؟ آپ نے فرمایا: میں اس حدیث شریف کی وجہ سے رک گیا کہ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے: إِنَّ الْإِيمَانَ قَيَّدَ الْفَتْكَ، فَلَا يَفْتِكُ مُؤْمِنٌ بِمُؤْمِنٍ "ایمان حیلہ کے ساتھ اچانک قتل کرنے سے منع کرتا ہے، لہٰذا کسی مومن کے لیے جائز نہیں کہ وہ کسی مومن کو بہانے سے اچانک قتل کر دے"۔ پھر شریک بن اعور اسی بیماری میں تین دن بعد انتقال کر گئے تھے۔

یہاں ایک بات قابلِ ملاحظہ ہے کہ مسلم بن عقیل کو جس شخص (یعنی ابن زیاد) کے ہاتھوں اپنی موت سامنے نظر آ رہی ہے (کہ وہ جب سے آیا ان کو تلاش کروا رہا تھا)، وہ اس طرح ان کے قابو میں ہے کہ بیٹھے بیٹھے اسے ختم کر سکتے ہیں مگر اہلِ حق اور خصوصاً اہلِ بیت کی ان مقدس ہستیوں کی اتباعِ سنت دیکھیے کہ اس وقت بھی ان کا ہاتھ نہیں اٹھتا۔ یہی اہلِ حق کی نشانی ہے کہ وہ اپنے ہر اقدام سے پہلے کتاب وسنت کو دیکھتے ہیں۔ کتاب وسنت سے اگر اس اقدام کی اجازت نہ ملے تو وہ اپنی جان تو قربان کر دیتے ہیں مگر کتاب وسنت کے خلاف کام نہیں کرتے۔

ابن زیاد نے اپنی ایک خاص چالاکی کے ذریعہ یہ معلوم کروا لیا کہ مسلم بن عقیل، ہانی بن عروہ کے گھر میں روپوش ہیں۔ چناں چہ ابن زیاد نے ہانی بن عروہ کو اپنے دربار میں حاضر کرایا اور اس پر بہت تشدد کیا۔ ادھر شہر میں مشہور ہو گیا کہ ہانی بن عروہ قتل کر دیے گئے ہیں۔ جب یہ خبر عمرو بن حجاج کو پہنچی تو وہ قبیلہ مِذحَج کے بہت سے جوانوں کو لے کر موقع پر پہنچے اور ابن زیاد کے مکان کا محاصرہ کر لیا۔ ابن زیاد کے کہنے پر قاضی شریح نے مکان سے باہر آ کر لوگوں کو تسلی دی کہ ہانی کو قتل نہیں کیا گیا، وہ صحیح سالم ہیں۔ اس پر وہ نوجوان واپس چلے گئے۔

ہانی بن عروہ کے متعلق شہادت کی خبر اور اس کے خلاف قبیلہ مِذحَج کے ہنگامہ اور ابن زیاد کے قصر (مکان) کے

محاصرہ کی اطلاع جب مسلم بن عقیلؒ کو ملی تو وہ بھی مقابلہ کیلیے تیار ہو کر نکلے۔ اپنے ساتھیوں کو جمع کیا، چار ہزار آدمی جمع ہو گئے۔ مسلم بن عقیل اور ان کے ساتھیوں نے ابن زیاد کے قصر کا محاصرہ کر لیا۔ ادھر ابن زیاد نے اثر ورسوخ والے لوگوں کو ان محاصرہ کرنے والوں کے پاس بھیج دیا کہ تم جا کر ان لوگوں کو مال وحکومت کا لالچ دے کر یا حکومت سے ڈرا دھمکا کر جس طرح بھی ہو انہیں مسلم سے جدا کر دو، چناں چہ وہ متفرق ہونا شروع ہو گئے یہاں تک کہ مسلم کے ساتھ صرف تیس آدمی رہ گئے۔ بے وفائی اور دھوکا دہی کا یہ منظر دیکھ کر مسلم بن عقیل یہاں سے واپس ابوابِ کندہ کی طرف چلے جب دروازے پر پہنچے تو دیکھا کہ ان کے ساتھ ایک آدمی بھی نہیں رہا تھا۔

اب وہ اکیلے رہ گئے تھے، ان کے ساتھ کوئی ایک شخص بھی نہیں تھا جو کم از کم انہیں کوئی راستہ بتاتا، کوئی تسلی ہی دیتا اور اپنے گھر میں ٹھکانا ہی دے دیتا۔ آپ اکیلے ہی اپنے طور پر بس چلے جا رہے تھے، اندھیرا چھا چکا تھا اور آپ تنِ تنہا کوفہ کے گلی کوچوں میں پریشان پھر رہے تھے کہ اب کدھر جائیں؟ بالآخر ایک گھر کے دروازے پر پہنچ کر دروازہ کھٹکھٹایا۔ ایک عورت باہر نکلی جسے ''طوعہ'' کہا جاتا تھا اور وہ اشعث بن قیس کی باندی تھی۔ مسلم بن عقیل نے اس سے کہا: مجھے پانی پلا دو، اس نے پانی پلایا۔ وہ دوبارہ گھر سے باہر نکلی تو دیکھا کہ آپ وہیں بیٹھے ہیں، اس نے پوچھا: تم نے پانی پی نہیں لیا؟ آپ نے کہا: ہاں! پی لیا ہے۔ اس نے کہا: تو اب اپنے گھر چلے جاؤ۔ آپ خاموش ہو کر بیٹھے رہے۔ اس نے دو تین دفعہ ایسے کہا اور آپ اسی طرح چپ کر کے بیٹھے رہے۔ وہ کہنے لگی: سبحان اللہ! اللہ کے بندے! اللہ تمہارا بھلا کرے، اٹھو، اپنے گھر جاؤ کیونکہ تمہارا اس طرح میرے دروازے پر بیٹھنا درست نہیں ہے اور نہ ہی میں تمہیں اس کی اجازت دیتی ہوں۔ آپ اٹھے اور اسے کہا: اللہ کی بندی! اس شہر میں میرا نہ کوئی گھر ہے اور نہ خاندان، تو کیا تم میرے ساتھ کوئی بھلا اور احسان کر سکتی ہو (کہ مجھ بے یار ومددگار پردیسی کو کوئی ٹھکانہ دے دو)؟ اس نے کہا: کیا مطلب؟ آپ نے کہا: أَنَا مُسْلِمُ بْنُ عَقِيلٍ، كَذَبَنِي هٰؤُلَاءِ الْقَوْمُ وَغَرُّوْنِي ''میں ''مسلم بن عقیل'' ہوں، اِن لوگوں نے مجھے جھٹلایا ہے اور مجھے دھوکا دیا ہے؟'' اس نے حیرت سے پوچھا: ''مسلم بن عقیل'' تم ہو؟ آپ نے جواب دیا: جی ہاں! اس کے بعد اس نے آپ کو گھر میں ٹھکانہ بھی دیا اور بستر اور کھانا بھی دیا۔ ابھی تھوڑی ہی دیر گزری تھی کہ اس کا بیٹا ''بلال'' جو لوگوں کے ساتھ اسی ہنگامہ میں باہر گیا ہوا تھا، واپس آ گیا۔ اس نے دیکھا کہ میری والدہ بار بار کمرے کے اندر آتی جاتی ہے۔ اس نے سبب پوچھا تو عورت نے اُس سے بھی چھپایا، مگر جب اس نے

اصرار کیا تو عورت نے اول اس سے پکا عہد لیا کہ کسی کو بتانا نہیں، پھر مسلم بن عقیل کے بارے میں بتایا کہ انہوں نے اندر پناہ لی ہوئی ہے۔

ادھر جب ابن زیاد نے دیکھا کہ قصر کا محاصرہ ختم ہو گیا ہے اور لوگ مسلم کو چھوڑ گئے ہیں تو اس نے شہر کے مرکزی دروازے پر پہرہ لگا کر مسلم بن عقیل کو ڈھونڈنے کیلئے گھروں کی تلاشی کرانا شروع کرادی۔ آخر اس عورت کے مذکورہ بیٹے "بلال بن اُسید" نے مخبری کر کے مسلم بن عقیل کا پتا بتادیا چناں چہ ابن زیاد نے، انہیں گرفتار کرنے کیلئے، محمد بن اشعث کی سرکردگی میں ستر سپاہیوں کا ایک دستہ بھیج دیا۔

مسلم بن عقیل نے جب ان کی آوازیں سنیں تو تلوار لے کر دروازے پر آگئے، ان سے دو دفعہ مقابلہ کیا اور ان سب کو پیچھے بھگا دیا۔ بالآخر گرفتار کر لیے گئے اور گرفتاری کی حالت میں جب ان کے ساتھ جا رہے تھے تو راستے میں آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ یہ دیکھ کر ان مخالفین میں سے ایک آدمی نے کہا: مسلم! جو لوگ ایسا اقدام کرتے ہیں جو تم نے کیا ہے، وہ جب پکڑے جائیں تو رویا نہیں کرتے؟؟ ابن عقیل نے فرمایا: أَمَا وَاللهِ لَسْتُ أَبْكِي عَلَى نَفْسِي، وَلٰكِنْ أَبْكِي عَلَى الْحُسَيْنِ، وَآلِ الْحُسَيْنِ، إنه قد خرج إليكم اليوم أو أمس مِنْ مَكَّةَ "مجھے اپنے رب کی قسم! میں اپنی جان کیلئے نہیں رو رہا بلکہ میں حضرت حسین رضی اللہ عنہ اور آلِ حسین رضی اللہ عنہ کی جانوں کیلئے رو رہا ہوں، جو (میری تحریر پر) کل یا پھر آج، مکہ مکرمہ سے کوفہ کی طرف روانہ ہو چکے ہوں گے (اور یہاں پہنچ کر تمہارے ہاتھوں اسی بلا میں گرفتار ہوں گے جس میں مَیں گرفتار ہوں)"۔ اس کے بعد مسلم کو ابن زیاد کے پاس پہنچا دیا گیا۔ ابن زیاد نے حکم جاری کر دیا کہ اسے قصرِ اِمارت (یعنی ابن زیاد کے محل) کی اوپر والی منزل پر لے جاؤ اور سر کاٹ کر نیچے پھینک دو۔ سیدنا حضرت مسلم بن عقیل رضی اللہ عنہ اوپر لے جائے گئے وہ تسبیح واستغفار پڑھتے ہوئے اوپر پہنچے اور بدبخت ابن زیاد کے حکم کے موافق ان کو شہید کر کے نیچے ڈال دیا گیا، {إِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ}۔ ان کو قتل کرنے کے بعد ہانی بن عروہ کو بھی بازار میں لے جا کر قتل کر دیا گیا۔

ابن زیاد نے ان دونوں کے سر کاٹ کر یزید کے پاس بھیج دیے۔ یزید نے شکریہ کا خط لکھا اور ساتھ ہی یہ بھی لکھا: مجھے یہ خبر ملی ہے کہ "حسین" عراق کے قریب پہنچ گئے ہیں اس لیے جاسوس اور خفیہ نمائندے سارے شہر میں پھیلا دو اور جس پر ذرا بھی حسین کی تائید کا شبہ ہو اس کو قید کر لو، مگر جو شخص تم سے لڑائی پر اتر آئے اس کے علاوہ اور کسی کو قتل نہ کرو۔

ادھر حضرت امام حسینؓ کے پاس اہل کوفہ کے ڈیڑھ سو خطوط اور بہت سے وفود پہلے پہنچ چکے تھے۔ پھر مسلم بن عقیل نے وہاں کے اٹھارہ ہزار مسلمانوں کی بیعت کی خبر کے ساتھ ان کو کوفہ کیلیے دعوت دے دی تو حضرت حسینؓ نے کوفہ جانے کا عزم کرلیا۔

جب یہ خبر لوگوں میں مشہور ہوئی تو بہت سارے حضرات نے آکر ان کو کوفہ جانے سے روکا۔ ان حضرات کا کہنا تھا کہ اہلِ عراق وکوفہ کے وعدے اور ان کی بیعتیں قابلِ بھروسہ نہیں ہیں۔ یہ لوگ قدیم سے عہد شکن اور بے وفا چلے آ رہے ہیں؛ اس لیے وہاں جانے کا فائدہ شاید حاصل نہ ہوسکے گا۔ لہٰذا آپؓ کو وہاں نہیں جانا چاہیے۔ مگر حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کی رائے جانے کی تھی (ان کا منشا شاید یہ تھا کہ اہلِ عراق حضرت حسینؓ کے اہلِ بیت اور خاص طور پر نواسۂ رسول ہونے کی نسبت سے آپؓ کے ہاتھ پر دل وجان سے بیعت کرلیں گے۔ اس طرح حضرت امام حسینؓ کے ذریعے ایک صحیح اسلامی خلافت کا قیام جلد اور بآسانی وجود میں آجائے گا)۔

خاص طور پر حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے نہایت ہمدردی کے لہجہ میں حضرت حسینؓ کو دو مرتبہ مشورہ دیا کہ آپؓ نہ جائیں، اہلِ کوفہ عہد شکن لوگ ہیں۔ مگر امام حسینؓ اپنے نزدیک وقت کی ایک اہم دینی ضرورت سمجھ کر رضائے الٰہی کیلیے عزم کرچکے تھے۔ مشورہ دینے والوں نے ان کو ممکنہ خطرات سے آگاہ کیا لیکن مقصد کی اہمیت نے ان کو خطرات کا مقابلہ کرنے کیلیے آمادہ کیا اور پیچھے ہٹنے کے بجائے آگے بڑھنے پر اکسایا۔ بالآخر آٹھ ذی الحجہ ۶۰ھ کو آپؓ مکہ مکرمہ سے کوفہ کیلیے روانہ ہوگئے۔

حضرت عبداللہ بن جعفرؓ کو جب آپؓ کی روانگی کا علم ہوا تو انہوں نے اپنے بیٹے کے ہاتھوں حضرت حسینؓ کو خط روانہ کیا جس میں ان کو مکہ واپسی کا مشورہ دیا۔ جب یہ خط حضرت حسینؓ کو پہنچایا گیا تو آپ نے اپنے اس عزمِ کوفہ کو اسی طرح برقرار رکھا اور اپنے اس عزم کی ایک اور وجہ بھی بیان کی کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو خواب میں دیکھا ہے۔ مجھے آپ ﷺ کی طرف سے حکم دیا گیا ہے، میں اس حکم کی بجاآوری کی طرف جارہا ہوں خواہ مجھ پر کچھ بھی گزر جائے۔

بالآخر کسی چیز نے امام حسینؓ کے عزمِ مصمم میں کوئی کمزوری پیدا نہ کی اور وہ کوفہ کیلیے روانہ ہوگئے۔

ابن زیاد جو کوفہ پر اس لیے حاکم مقرر کیا گیا تھا کہ وہ امام حسینؓ کے مقابلہ میں سخت سمجھا گیا تھا اس کو جب حضرت

حسینؓ کی روانگی کی اطلاع ملی تو اس نے اپنی پولیس کے افسر ''حُصَین بن نُمَیر'' کو آگے بھیجا کہ قادسیہ پہنچ کر مقابلہ کے انتظامات مکمل کرے۔

حضرت حسینؓ اور ان کے وفادار ساتھی سفر طے کر رہے تھے اور اُدھر حُصَین بن نُمَیر نے ''حُر بن یزید'' کو ایک ہزار سواروں کی فوج دے کر آپؓ کے مقابلہ کیلیے قادسیہ سے آپؓ کی طرف روانہ کر دیا تھا۔ چناں چہ حُر بن یزید اور اس کا لشکر آ کر حضرت حسینؓ کے مقابلہ میں ٹھہر گئے۔ حُر نے کہا: مجھے آپ سے جنگ کرنے کا حکم نہیں دیا گیا، بلکہ یہ حکم ہے کہ میں آپ سے اس وقت تک جدا نہ ہوں جب تک آپ کو کوفہ نہ پہنچا دوں۔ حُر مع اپنے لشکر کے، حضرت حسینؓ کے ساتھ ساتھ چلتا رہا۔ اسی اثناء میں حضرت حسینؓ نے ایک اہم تقریر کی جو حضرت حسینؓ کے اس سفرِ کوفہ کی غرض واضح کرتی ہے، چناں چہ آپؓ نے حمد و ثناء کے بعد فرمایا:

أَيُهَا النَاسُ إِنَّ رَسُولَ اللهِ - صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ - قَالَ: »مَنْ رَأَى سُلْطَانًا جَائِرًا مُسْتَحِلًّا لِحُرَمِ اللهِ نَاكِثًا لِعَهْدِ اللهِ مُخَالِفًا لِسُنَّةِ رَسُولِ اللهِ - صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ - يَعْمَلُ فِي عِبَادِ اللهِ بِالْإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ فَلَمْ يُغَيِّرْ مَا عَلَيْهِ بِفِعْلٍ وَلَا قَوْلٍ كَانَ حَقًّا عَلَى اللهِ أَنْ يُدْخِلَهُ مُدْخَلَهُ.«

أَلَا وَإِنَّ هٰؤُلَاءِ قَدْ لَزِمُوا طَاعَةَ الشَّيْطَانِ وَتَرَكُوا طَاعَةَ الرَّحْمٰنِ وَأَظْهَرُوا الْفَسَادَ وَعَطَّلُوا الْحُدُودَ وَاسْتَأْثَرُوا بِالْفَيْءِ وَأَحَلُّوا حَرَامَ اللهِ وَحَرَّمُوا حَلَالَهُ....

''اے لوگو! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ جو شخص کسی ایسے ظالم بادشاہ کو دیکھے جو اللہ کے حرام کو حلال سمجھے اور اللہ کے عہد کو توڑ دے، سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت کرے، اللہ کے بندوں کے ساتھ گناہ اور ظلم و عدوان کا معاملہ کرے۔ اور یہ شخص اُس بادشاہ کے ایسے افعال و اعمال دیکھنے کے باوجود کسی قول یا فعل سے اس کی مخالفت نہ کرے تو اللہ تعالیٰ کے ذمہ ہے کہ اس کو بھی اس ظالم بادشاہ کے ساتھ اس کے ٹھکانے (یعنی دوزخ) میں پہنچا دے۔

اور آپ کو یہ بھی معلوم ہے کہ یزید اور اس کے امراء و حکام نے شیطان کی پیروی کو اختیار کر رکھا ہے، رحمٰن کی اطاعت کو چھوڑ رکھا ہے، زمین میں فساد پھیلا دیا ہے، حدودِ الٰہیہ کو معطل کر دیا ہے، اسلامی بیت المال کو اپنی ملکیت سمجھ لیا ہے اور اللہ کے حرام کو حلال اور حلال کو حرام ٹھہرا رکھا ہے۔۔۔۔''۔

اس کے بعد پھر اسی مضمون پر مشتمل قدرے مفصل تقریر کی۔

یہ دونوں لشکر جب مقام "نینوٰی" تک پہنچے تو ابن زیاد کی طرف سے ایک قاصد حُر بن یزید کے پاس اس کا ایک خط لایا جس میں لکھا تھا: "جس وقت تمہیں میرا یہ خط ملے تو حسین پر میدان تنگ کر دو اور ان کو کھلے میدان کے سوا کسی پناہ کی جگہ میں نہ اترنے دو اور ایسے میدان کی طرف لے جاؤ جہاں پانی نہ ہو"۔

پیچھے سے ابن زیاد نے عمر بن سعد کو چار ہزار فوج کے ساتھ مقابلے کیلئے بھیج دیا اور عمر بن سعد کو یہ حکم بھی دیا کہ حسین اور ان کے ساتھیوں پر پانی بالکل بند کر دو۔ یہ واقعہ حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کی شہادت سے تین دن پہلے کا ہے۔

اللہ! اللہ!! ظلم بر ظلم یہ ہوا کہ دریائے فرات کا وہ پانی جو انسانوں اور جانوروں ہر ایک کیلئے جاری تھا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے گھرانے پر بالکل بند کر دیا گیا۔ یہاں تک کہ جب یہ سب حضرات پیاس سے بے تاب ہو گئے تو حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے اپنے بھائی عباس بن علی رضی اللہ عنہ کو تیس سوار اور تیس پیادوں کے ساتھ پانی لانے کیلئے بھیج دیا۔ پانی لانے پر عمر بن سعد کی فوج سے مقابلہ بھی ہوا مگر بالآخر بیس مشکیزے پانی کے بھر لائے۔

اس کے بعد حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی عمر بن سعد سے ملاقات ہوئی تو آپ رضی اللہ عنہ نے ان سے فرمایا کہ ہمارے بارے میں آپ تین صورتوں میں سے کوئی اختیار کر لو:

۱- میں جہاں سے آیا ہوں وہیں واپس چلا جاؤں۔

۲- یا میں یزید کے پاس پہنچ جاؤں اور خود اس سے اپنا معاملہ طے کروں۔

۳- یا مجھے مسلمانوں کی کسی سرحد پر پہنچا دو۔ جو حال وہاں کے عام لوگوں کا ہوگا میں اسی میں بسر کروں گا۔

عمر بن سعد کو یہ شرائط اچھی لگیں۔ اس نے ابن زیاد کو خط لکھا کہ مجھے حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے تین صورتوں کا اختیار دیا ہے اور ظاہر ہے ان میں آپ کا مقصد پورا ہوتا ہے اور امت کی اس میں عافیت و بہتری ہے۔ ابن زیاد بھی یہ تین صورتیں پڑھ کر عمر بن سعد کے اس خط سے متاثر ہوا اور کہا کہ ہم نے اس کو قبول کیا۔ مگر بد بخت "شمر بن ذی الجَوشَن" نے ابن زیاد کو اس سے روکا اور کہا کہ آپ "حسین" کو اس پر مجبور کریں کہ وہ آپ کے پاس آ جائیں، پھر آپ چاہیں سزا دیں، چاہیں معاف کریں۔

ابن زیاد نے شمر کی رائے قبول کر کے عمر بن سعد کو درج ذیل خط لکھا اور یہ خط خود شمر کے ہاتھ ہی عمر بن سعد کو روانہ

کر دیا:

''امابعد! میں نے تمہیں اس لیے نہیں بھیجا کہ تم جنگ سے بچو، یا ان کو مہلت دو، یا ان کی سفارش کرو۔ سنو! اگر حسین اور ان کے ساتھی میرے ہی حکم پر صلح کرنا اور میرے پاس حاضر ہونا چاہتے ہیں تو ان کو صحیح سالم یہاں پہنچادو، ورنہ ان سے جنگ کرو یہاں تک کہ ان کو قتل کر دو۔ مُثلہ کرو (یعنی۔ نعوذ باللہ۔ ان کے ناک، کان، ہاتھ، پاؤں کاٹ دو) کیونکہ وہ اس کے مستحق ہیں اور پھر قتل کے بعد ان کو گھوڑوں کی ٹاپوں سے روند ڈالو۔ اگر تم نے ہمارے اس حکم کی تعمیل کی تو تم کو ایک فرمانبردار کی طرح انعام ملے گا اور اگر اس کی تعمیل نہیں کرتے تو ہمارے لشکر کو فوراً چھوڑ دو اور چارج شمر کے سپرد کر دو۔ والسلام''

شمر یہ خط لے کر جب عمر بن سعد کے پاس پہنچا تو عمر سمجھ گیا کہ شمر کے مشورے سے یہ صورت عمل میں آئی ہے کہ میرا مشورہ رد کر دیا گیا۔ عمر نے شمر سے کہا کہ تم نے بڑا ظلم کیا کہ مسلمان متفق ہو رہے تھے، اس کو ختم کر کے قتل وقتال کا بازار گرم کر دیا۔ بہر حال حضرت حسین ؓ کو یہ پیغام پہنچایا گیا کہ تم ابن زیاد کے پاس حاضر ہو جاؤ (پھر وہ جو چاہے تمہارے ساتھ کرے)۔ ابن زیاد کے پاس حاضر ہونا چونکہ آپ ؓ کے اوپر شرعاً لازم بھی نہیں بنتا تھا، لہٰذا آپ ؓ نے یہ پیغام قبول کرنے سے انکار فرمادیا کہ اس ذلت سے تو موت بہتر ہے۔

شمر بن ذی الجوشن اس محاذ پر محرم کی نویں تاریخ کو پہنچا۔ حضرت حسین ؓ اس وقت اپنے خیمے کے سامنے بیٹھے ہوئے تھے اسی حالت میں کچھ اونگھ آ کر آنکھ بند ہوگئی اور پھر ایک آواز کے ساتھ بیدار ہو گئے۔ آپ ؓ کی ہمشیرہ ''زینب'' نے یہ آواز سنی تو دوڑی آئیں اور وجہ پوچھی۔ فرمایا: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں دیکھا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے فرمایا: اِنَّکَ تَرُوحُ اِلَیْنَا ''آج شام کو تم ہمارے پاس آنے والے ہو''۔ حضرت زینب یہ سن کر رو پڑیں، آپ ؓ نے انہیں تسلی دی۔ اسی حالت میں شمر کا لشکر لڑنے کیلیے سامنے آ گیا۔ آپ ؓ کے بھائی عباس ؓ آگے بڑھے اور اُس مقابل گروہ سے گفتگو ہوئی۔ اُس نے اِسی وقت بلا مہلت جنگ کا اعلان سنایا۔ حضرت عباس ؓ نے آ کر حضرت حسین ؓ کو اطلاع دی۔ حضرت حسین ؓ نے فرمایا: ان سے کہو کہ آج کی رات جنگ ملتوی کر دو تاکہ آج رات میں وصیت اور نماز و دعاء اور استغفار کر سکوں۔ شمر اور عمر بن سعد نے اور لوگوں سے مشورہ کرنے کے بعد مہلت دے دی اور واپس

ہو گئے۔

حضرت امام حسینؓ نے اپنے اہلِ بیت اور ساتھیوں کو جمع کر کے ایک لمبی تقریر کی جس میں یہ بھی فرمایا: میں سمجھتا ہوں کہ کل ہمارا آخری دن ہے۔ میں آپ سب کو خوشی سے اجازت دیتا ہوں کہ سب اس رات کی تاریکی میں متفرق ہو جاؤ اور جہاں پناہ ملے چلے جاؤ، کیوں کہ دشمن صرف میرا طلبگار ہے۔

تقریر کے آخر میں آپؓ کی ہمشیرہ حضرت زینبؓ[1] بے قرار ہو کر رونے لگیں تو آپؓ نے تسلی دی اور یہ وصیت فرمائی:

''میری بہن! میں تمہیں اللہ کی قسم دیتا ہوں کہ میری شہادت پر تم کپڑے نہ پھاڑنا، سینہ کوبی (سینہ پیٹنا) وغیرہ ہرگز نہ کرنا اور آواز سے رونے چلّانے سے بچنا''۔

یہ وصیت فرما کر باہر آ گئے اور اپنے ساتھیوں کو جمع کر کے تمام رات تہجد اور دعاء واستغفار میں مشغول رہے۔ یہ عاشوراء یعنی دس محرم کی رات تھی۔ اگلے دن دس محرم بروز جمعہ صبح کی نماز سے فارغ ہوتے ہی عمر بن سعد لشکر لے کر سامنے آ گیا۔ حضرت حسینؓ کے ساتھ اس وقت کل بہتر (۷۲) ساتھی تھے: بتیس (۳۲) سوار اور چالیس (۴۰) پیدل۔ آپؓ نے بھی مقابلہ کیلیے اپنے ساتھیوں کی صف بندی فرمائی۔ اسی دوران ابن زیاد کے لشکر میں سے حُر بن یزید (جو سب سے پہلے ایک ہزار کا لشکر لے کر مقابلہ کیلیے آئے تھے) اپنا گھوڑا دوڑا کر حضرت حسینؓ کے لشکر میں آ کر مل گئے اور بالآخر حضرت حسینؓ کے لشکر کی طرف سے ہی لڑتے ہوئے شہید ہوئے اور آخر وقت میں اپنی آخرت سنوار گئے۔

حضرت حسینؓ نے جنگ سے پہلے دشمن کی فوج کو مخاطب کر کے ایک دردانگیز اور دلوں کو ہلا دینے والی تقریر کی جس کی ابتدائی چند اہم باتیں درج ذیل ہیں:

''اے لوگو! تم میرا نسب دیکھو، میں کون ہوں؟۔ پھر اپنے دلوں میں نگاہ ڈالو: کیا تمہارے لیے جائز ہے کہ تم مجھے قتل کرو اور میری عزت پر ہاتھ ڈالو؟۔ کیا میں تمہارے نبی ﷺ کی صاحبزادی سلام اللہ ورضوانہٗ علیہا کا بیٹا نہیں ہوں؟۔ کیا یہ مشہور حدیث تمہیں معلوم نہیں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے مجھے

---

(۱) فائدہ: حضرت زینبؓ کی عمومی سیرت طیبہ نیز واقعہ کربلا سے متعلقہ ان کے احوال خاصہ کا مطالعہ کرنے کے لیے ملاحظہ ہو: بنات الصحابة، ص: ۱۷۱ ومابعدها

اور میرے بھائی حسنؓ کو جنت کے نوجوانوں کا سردار فرمایا ہے؟۔"

اس کے بعد آپؓ کے ساتھی حضرت زُہیر بن قَینؓ کھڑے ہوئے اور ان لوگوں کو نصیحت کی کہ آلِ رسول کے خون سے باز آجاؤ۔ آخر میں حضرت زُہیرؓ نے یہ بھی کہا کہ ظالمو! اب بھی ہوش میں آجاؤ۔ فاطمہ سَلامُ اللہِ وَرِضْوانُہُ علیہا کا بیٹا، سُمیّہ کے بیٹے (ابن زیاد) سے زیادہ محبت واکرام کا مستحق ہے۔

جب گفتگو طویل ہونے لگی تو بدبخت شِمر نے پہلا تیر ان پر چلا دیا اور اس کے بعد تیراندازی کا سلسلہ شروع ہوگیا، پھر گھمسان کی جنگ ہوئی۔ آخر ظہر کی نماز کا وقت ہوگیا اور اس وقت تک حضرت حسینؓ کے اکثر ساتھی شہید ہو چکے تھے۔ حضرت امام حسینؓ نے فرمایا: مُرُوهُمْ فَلْيَكُفُّوا عَنِ الْقِتَالِ حَتَّى نُصَلِّيَ "ان سے کہو کہ جنگ ملتوی کرو یہاں تک کہ ہم نماز پڑھ لیں"۔ اس پر مخالف فوج کے ایک آدمی نے کہا: تمہاری نماز تو قبول ہی نہیں ہے۔ جواب میں حضرت حبیب بن مُظَہِّر نے فرمایا: افسوس ہے!! کیا تمہاری نماز قبول ہوگی اور آلِ رسول کی قبول نہیں ہوگی؟۔ جب ان لوگوں نے حضرت حسینؓ کو نماز پڑھنے کی اجازت نہ دی تو آپؓ نے اپنے چند ساتھیوں کے ساتھ صلوۃ الخوف کے مطابق ظہر کی نماز ادا فرمائی۔ نماز کے بعد پھر اسی طرح جنگ چلتی رہی۔ اس میں حضرت حسینؓ کے بڑے صاحبزادے حضرت علی اکبرؓ یہ شعر پڑھتے ہوئے آگے بڑھے:

أَنَا عَلِيُّ بْنُ الْحُسَيْنِ بْنِ عَلِي ... نَحْنُ وَرَبِّ الْبَيْتِ أَوْلَى بِالنَّبِي

(میں علی ہوں، حسین بن علی کا بیٹا ہوں ...... ربِ کعبہ کی قسم! ہم رسول اللہ ﷺ سے قریب تر ہیں)۔

کم بخت "مُرّہ بن مُنقِذ" نے ان کو نیزہ مار کر گرادیا۔ پھر کچھ اور بدبخت آگے بڑھے اور ان کی لاش کے ٹکڑے کردیے۔ حضرت حسینؓ سامنے آئے اور کہا: میرے بیٹے! اللہ تعالیٰ اس قوم کو برباد کرے جس نے تجھے قتل کیا ہے۔ یہ لوگ اللہ پر اور اس کے رسول ﷺ کے حرم پر کتنے جرأتمند ہو رہے ہیں!! اس کے بعد ان کی لاش اٹھا کر خیمے کے پاس پہنچادی گئی۔

اور قبیلۂ اَزد کے عمرو بن سعد بن نُفَیل نے حضرت قاسم بن حسنؓ کے سر پر تلوار ماری، وہ گرے اور ان کے منہ سے نکلا: یا عَمّاہ (اے چچا جان)! تو حضرت حسینؓ نے دوڑ کر ان کو سنبھالا اور عمرو اَزدِی پر تلوار سے حملہ کیا، کہنی سے اسکا ہاتھ کٹ گیا۔ حضرت حسینؓ اپنے اس بھتیجے قاسم کی لاش کو اپنے کندھے پر اٹھا کر لائے اور اپنے بیٹے اور

دوسرے اہلِ بیت کے برابر لٹا دیا۔ اب حضرت حسین ؓ تقریباً تنہا اور بے یارومددگار رہ گئے لیکن ان کی طرف بڑھنے کی کسی کو ہمت نہیں ہوئی۔ اس طرح بہت دیر تک یہی کیفیت رہی کہ جو شخص آپ ؓ کی طرف بڑھتا اسی طرح لوٹ جاتا اور حضرت امام حسین ؓ کے قتل اور اس کے گناہ کو اپنے سر لینا نہ چاہتا تھا۔ یہاں تک کہ قبیلہ ''کِندہ'' کا ایک بدبخت ''مالک بن نُسیر'' آگے بڑھا اور حضرت حسین ؓ کے سر پر تلوار سے حملہ کیا جس سے آپ ؓ کا سر مبارک شدید زخمی ہو گیا اور ٹوپی خون سے بھر گئی۔ اب حضرت حسین ؓ تھک چکے تھے، اپنے خیمے کے دروازے پر تشریف لائے اور اپنے چھوٹے صاحبزادے ''عبداللہ'' کو بلایا اور اپنی گود میں بٹھا لیا۔ پھر ان کو اپنے قریب کر کے چومنے لگے جیسے کوئی الوداع کرتے وقت حسرت کے ساتھ چومتا ہے۔ اتنے میں قبیلہ بنی اسد کے ایک شخص ''ابن مُوقِدِ النار'' نے اس معصوم بچے کو ایک تیر مارا جس نے انہیں ذبح کر ڈالا اور وہ شہید ہو گئے۔ حضرت حسین ؓ نے ان کا خون اپنے ہاتھوں میں لیا اور اسے آسمان کی جانب انڈیل دیا اور عرض کی: اے میرے رب! تو ہی ان ظالموں سے ہمارا بدلہ لے لے۔

اس وقت حضرت حسین ؓ کی پیاس حد کو پہنچ چکی تھی۔ آپ ؓ پانی پینے کیلیے دریائے فرات کی طرف بڑھے تو وہ ظالم اس میں بھی رکاوٹ بنے۔ جب آپ ؓ دریا کے قریب ہو گئے تو ''حُصین بن نُمیر'' نے آپ ؓ کے منہ پر نشانہ کر کے تیر مارا جو سیدھا آپ ؓ کو آ لگا۔ اور..... ہائے افسوس!!! اس مبارک منہ سے خون جاری ہو گیا جس کو اللہ کے نبی ﷺ چوما کرتے تھے۔

اس کے بعد شمر دس آدمی ساتھ لے کر حضرت حسین ؓ کی طرف بڑھا (کہ عمر بن سعد نے شمر کو لشکر کے بائیں حصے کا امیر مقرر کر رکھا تھا)۔ آپ ؓ کی جب اس پر نظر پڑی تو فرمایا: اللہ اور اس کے رسول ﷺ سچ فرماتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تھا: كَأَنِّي أَنْظُرُ إِلىٰ كَلْبٍ أَبْقَعَ يَلِغُ فِي دِمَاءِ أَهْلِ بَيْتِي ''گویا میں ایک دھبے دار جسم والے کتے کو دیکھ رہا ہوں کہ وہ میرے اہلِ بیت کا خون پی رہا ہے''۔ (بدبخت شمر کو برص کی بیماری تھی جس سے جسم پر سفید دھبے بن جاتے ہیں)۔

حضرت حسین ؓ شدید پیاس اور اپنے زخموں کے باوجود ان کا دلیرانہ مقابلہ کر رہے تھے اور جس طرف بڑھتے تو یہ لوگ ایسے بھاگتے نظر آتے تھے جیسے شیر کے سامنے بکریاں بھاگتی ہیں۔ اہلِ تاریخ نے کہا ہے کہ یہ ایک بے مثل واقعہ ہے کہ جس شخص کی اولاد اور اہلِ خانہ قتل کر دیے گئے ہوں، خود اس کو شدید زخم لگے ہوں اور وہ شدتِ پیاس کے

باوجود پانی کے ایک ایک قطرے سے محروم ہو اور وہ اس حالت میں اس طرح ثابت قدمی سے مقابلہ کر رہا ہے کہ جس طرف رخ کرتا ہے مسلح سپاہی بھیڑ بکریوں کی طرح بھاگنے لگتے ہیں۔

شمر نے جب یہ دیکھا کہ حضرت حسینؓ کو قتل کرنے سے ہر شخص بچنا چاہتا ہے تو آواز دی کہ سب مل کر اکٹھے حملہ کرو۔ اس پر بہت سے بدنصیب آگے بڑھے، نیزوں اور تلواروں سے ایک دم اکٹھے حملہ کیا۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس صاحبزادے اور اس وقت کی روئے زمین کی سب سے عظیم ہستی نے ظالموں کا دلیرانہ مقابلہ کرتے ہوئے حق کی خاطر جان دے دی اور شہید ہوگئے۔ إِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُوْن۔

شمر نے خولی بن یزید سے کہا کہ ان کا سر کاٹ لو، وہ آگے بڑھا مگر ہاتھ کانپ گئے۔ پھر بدبخت سنان بن انس نے یہ کام انجام دیا اور سر مبارک کاٹ کر بدن سے الگ کر دیا۔

بدبخت ابن زیاد کا حکم تھا کہ قتل کے بعد لاش کو گھوڑوں کی ٹاپوں سے روندا جائے۔ عمر بن سعد نے چند سواروں کو حکم دیا انہوں نے یہ بھی کر ڈالا۔

اس طرح بروز جمعہ آنے والی قیامت سے پہلے ہی سنہ ۶۱ھ دس محرم کو بروزِ جمعہ قیامتِ صغریٰ قائم ہوگئی۔ رضی اللہ عنہ وأرضاہ ورزقنا حبہ وحب من والاہ۔

جب دیکھا گیا تو حضرت حسینؓ کی لاش پر تینتیس (۳۳) زخم نیزوں کے اور چونتیس (۳۴) زخم تلواروں کے تھے۔ تیروں کے زخم ان کے علاوہ تھے۔

حضرت حسینؓ اور عام اہلِ بیت کے قتل سے فارغ ہوکر یہ ظالم لوگ آپؓ کے چھوٹے صاحبزادے ''علی اصغر'' (جنہوں نے بعد میں زین العابدین کے نام سے شہرت پائی) کی طرف متوجہ ہوئے، شمر نے ان کو بھی قتل کرنا چاہا۔ تو انہی کے ایک آدمی (حُمید بن مسلم) نے کہا: سبحان اللہ! کیا ہم ایسے نوعمر لڑکے کو قتل کریں گے جو مریض بھی ہے اور جنگ میں اس نے حصہ بھی نہیں لیا۔ شمر نے چھوڑ دیا۔ عمر بن سعد آگے آیا اور کہا کہ نہ کوئی ان عورتوں کے خیموں کے پاس جائے اور نہ اس مریض کو کچھ کہے۔

جنگ کے اختتام پر مقتولین کی تعداد شمار کی گئی تو حضرت حسینؓ کے ساتھیوں میں بہتر (۷۲) حضرات شہادت سے سرفراز ہوئے۔ وہیں کربلاء کے قریب ہی قبیلہ بنو اسد کی ''غاضِرِیَہ'' نامی ایک بستی تھی، وہاں کے لوگوں نے آ کر

حضرت حسینؓ اور ان کے ساتھیوں کو ایک روز بعد دفن کیا (چناں چہ حضرت حسینؓ کا بدنِ مبارک وہیں میدانِ کربلاء کے اندر ہی مدفون ہے،)۔[1]

اور عمر بن سعد کے لشکر کے اٹھاسی سپاہی مارے گئے۔ عمر بن سعد نے خود ان کی نماز جنازہ پڑھا کر انہیں دفن کروا دیا۔ خَولی بن یزید اور حُمید بن مسلم ان حضرات کے سر لے کر کوفہ روانہ ہوئے اور ابن زیاد کے سامنے پیش کیے۔ ابن زیاد نے لوگوں کو جمع کر کے سب سروں کو سامنے رکھا اور ایک چھڑی سے سیدنا امام حسینؓ کے منہ مبارک کو چھونے لگا۔ یہ منظر دیکھ کر وہاں موجود صحابیٔ رسول حضرت زید بن ارقمؓ سے رہا نہ گیا، وہ بول اٹھے کہ چھڑی ان متبرک ہونٹوں کے اوپر سے ہٹا لے۔ قسم ہے اس ذات کی جس کے سوا کوئی معبود نہیں! میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا ہے کہ وہ ان ہونٹوں کو بوسہ دیتے تھے۔ اور یہ کہہ کر رو پڑے۔ ابن زیاد نے کہا کہ اگر تم بوڑھے نہ ہوتے تو میں تمہاری بھی گردن اڑا دیتا۔

ابن زیاد کی بدبختی نے اسی پر بس نہیں کیا بلکہ حکم دیا کہ حضرت حسینؓ کے سر کو ایک لکڑی پر رکھ کر کوفہ کے بازاروں اور گلی کوچوں میں گھمایا جائے کہ سب لوگ دیکھ لیں۔ اس کے بعد اس مبارک سر اور دوسرے ساتھیوں کے سروں کو یزید کے پاس ملکِ شام بھجوا دیا اور اسی کے ساتھ عورتوں اور بچوں کو (جنہیں عمر بن سعد میدانِ کربلاء سے کوفہ ساتھ لے آیا تھا) بھی روانہ کیا۔

حضرت حسینؓ کا سر مبارک جس وقت یزید کے سامنے رکھا گیا تو یزید کے ہاتھ میں چھڑی تھی، وہ اس چھڑی کو آپؓ کے دانتوں پر لگانے لگا۔ حضرت ابو برزہ اسلمیؓ وہاں موجود تھے۔ انہوں نے کہا: اے یزید! تو اپنی چھڑی حضرت حسینؓ کے دانتوں پر لگاتا ہے اور میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا ہے کہ ان کو بوسہ دیتے تھے۔ اے یزید! قیامت کے روز تُو آئے گا تو تیری شفاعت ابن زیاد ہی کرے گا اور سیدنا حسینؓ آئیں گے تو ان کے شفیع حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم ہوں گے۔ یہ کہہ کر ابو برزہؓ مجلس سے باہر چلے گئے۔

یزید نے اس کے بعد اہلِ بیت کی ان مقدس خواتین کو گھر میں اپنی عورتوں کے پاس بھیج دیا اور حکم دیا کہ ''علی اصغر'' کو اور ان عورتوں کو مستقل مکان میں رکھا جائے۔ پھر کچھ روز بعد یزید نے ان اہلِ بیت اطہار کو بحفاظت واپس مدینہ

---

(۱) مکان راس الحسین، ص: ۳۵

منورہ بھجوادیا۔

حضرت حسین رضی اللہ عنہ اوران کے ساتھیوں کے قتل کی خبریں مدینہ میں پہنچیں تو مدینہ میں کہرام تھا، مدینہ کے درودیوار رو رہے تھے۔اورجب خاندان اہلِ بیت کی یہ باقی ہستیاں مدینہ طیبہ پہنچیں تو مدینہ والوں کے زخم ازسرِنوتازہ ہوگئے۔

اورحضرت حسین رضی اللہ عنہ کے سرمبارک کوبھی یزید نے مدینہ منورہ میں اپنے مقرر کردہ گورنرعمروبن سعید کے پاس بھجوادیا تھا،اُس نے سرمبارک کوحضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے پہلو میں جنت البقیع میں دفن کردیا تھا۔[1]

---

(۱) یہاں یہ واقعہ،تاریخ کی مستندومشہورکتاب ''البدایۃ والنہایۃ'' کے عنوان (قصۃ الحسین بن علي رضي اللہ عنھما وسبب خروجہ الخ: ۱۱/۴۷۳ ومابعدھا) اورمفتیٔ اعظم مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ کی اس سلسلہ میں اردوزبان میں معروف ومعتبرتالیف ''اسوۂ حسینی یعنی شہید کربلا'' سے مختصر کرکے لکھا گیا ہے (کیونکہ ہم نے اپنی اس تالیف میں اختصارکوپیش نظررکھا ہے)،البتہ بعض مواضع پرابن اثیرکی [الکامل فی التاریخ: ۳/۱۳۲ ومابعدھا] نیزتاریخ الطبري: ۱۱/۶۳۰ سے بھی استفادہ کیا گیا ہے۔لہٰذا اگرکوئی صاحبِ ذوق واقعۂ کربلا کی تفصیلات کا خواہشمند ہوتووہ مذکورہ کتب (بالخصوص البدایۃ والنہایۃ) کا مطالعہ کرلے۔

شہدائے کربلاء کے نام

کربلا میں شہید ہونے والے بہتر (۷۲) حضرات کے اسماء گرامی:

میدان کربلا میں اہل بیتؓ کے علاوہ، حضرت امام حسینؓ کے ساتھیوں میں سے بہتر (۷۲) حضرات مرتبۂ شہادت سے سرفراز ہوئے اوران کو قبیلہ بنواسد کے مقامی لوگوں نے شہادت کے اگلے دن دفن کیا تھا۔[1]

یہ بہتر حضرات درج ذیل ہیں:

۱۔ زہیر بن حسان محمدی، ۲۔ سعد بن حنظلہ تمیمی، ۳۔ بریر بن حفیر ہمدانی، ۴۔ وہب بن عبداللہ کلبی، ۵۔ عمرو بن خالد صیداوی، ۶۔ خالد بن عمرو مکی، ۷۔ عبداللہ بن عمرو کلبی، ۸۔ عمرو بن عبداللہ صائدی، ۹۔ حماد بن انس محمدی، ۱۰۔ وقاص بن مالک احمدی، ۱۱۔ شریح بن عبید مکی، ۱۲۔ مسلم بن عوسجہ اسدی، ۱۳۔ ہلال بن نافع بجلی، ۱۴۔ مرّہ بن ابی مرہ غِفاری، ۱۵۔ قیس بن منبہ مدنی، ۱۶۔ ہاشم بن عتبہ مکی، ۱۷۔ بشیر بن عمرو حضرمی، ۱۸۔ عیم بن عجلان انصاری، ۱۹۔ زہیر بن قیس بجلی، ۲۰۔ انس بن کاہد اسدی، ۲۱۔ حبیب بن مُظاہر/مُطَہّر اسدی، ۲۲۔ قیس بن ربیع انصاری، ۲۳۔ عبداللہ بن عروہ بن حراق غفاری، ۲۴۔ عبدالرحمن بن عروہ بن حراق غفاری، ۲۵۔ حُر (حضرت ابوذر غفاری کے آزاد کردہ غلام)، ۲۶۔ شیث بن عبداللہ، ۲۷۔ قاسط بن زہیر ثعلبی، ۲۸۔ کردوس بن زہیر ثعلبی، ۲۹۔ کنانہ بن عتیق انصاری، ۳۰۔ ضرغامہ بن مالک نخعی، ۳۱۔ جویر بن مالک انصاری، ۳۲۔ عمر بن ضبیعہ ضبیعی، ۳۳۔ زید بن مشبت قیسی، ۳۴۔ عبداللہ بن مشبت قیسی، ۳۵۔ عامر بن مسلم انصاری، ۳۶۔ عبداللہ (/عبیداللہ) بن مشبت قیسی، ۳۷۔ قعنب بن عمرو نمری، ۳۸۔ سالم (حضرت عامر بن مسلم کے آزاد کردہ غلام)، ۳۹۔ سیف بن مالک انصاری، ۴۰۔ زہیر بن بشیر جعفی، ۴۱۔ بدر بن معقل جعفی، ۴۲۔ حجاج بن مسروق (حضرت امام حسینؓ کے لشکر کے موذن)، ۴۳۔ مسعود بن حجاج انصاری، ۴۴۔ مُجَمِّع بن عبداللہ عائِذی، ۴۵۔ عمار بن حسان مدنی، ۴۶۔ حسان بن حارث سلیمانی اسدی، ۴۷۔ جُندَب بن حجر خولانی، ۴۸۔ یزید بن زیاد مظاہر کندی، ۴۹۔ طاہر (دین الحق خزاعی کے آزاد کردہ غلام)، ۵۰۔ جبلہ بن علی شیبانی، ۵۱۔ اسلم بن کثیر اعرج ازدی، ۵۲۔ زہیر بن سلیم ازدی، ۵۳۔ قاسم

---

(۱) البدایۃ والنہایۃ: ۱۱/۵۵۰

بن حبیب ازدی، ۵۴۔عمرو بن جندب حضرمی، ۵۵۔ ابو تمامہ انصاری، ۵۶۔ سلیمان (حضرت امام حسینؓ کے آزاد کردہ غلام)، ۵۷۔ قلب (حضرت امام حسینؓ کے آزاد کردہ غلام)، ۵۸۔ عروہ (حر بن یزید بن ریاح کے آزاد کردہ غلام)، ۵۹۔ مصعب (حُر ریاحی کے بھائی)، ۶۰۔ لی بن حر بن یزید، ۶۱۔ حر بن یزید ریاحی، ۶۲۔ عد بن عبد اللہ الطبعی، ۶۳۔ شوذب (شاکر انصاری کے آزاد کردہ غلام)، ۶۴۔ شیب بن حارث انصاری، ۶۵۔ مالک بن سریع انصاری، ۶۶۔ محمد بن انس انصاری، ۶۷۔ مقداد انصاری، ۶۸۔ مرو بن عبد اللہ صائدی، ۶۹۔ حنظلہ بن اسعد شیبانی، ۷۰۔ عبد اللہ بن عبد اللہ، ۷۱۔ عمار بن ابی سلامہ انصاری، ۷۲۔ عائس بن حبیب شاکری۔[1]

کربلا میں شہید ہونے والے حضرات اہلِ بیتؓ کے اسماء گرامی:

میدان کربلا میں سیدنا حضرت امام حسینؓ کے ساتھ، اہل بیتؓ کے مزید بیس (۲۰) حضرات شہید ہوئے، اس طرح کل یہ اکیس (۲۱) شہداء ہوگئے۔ چناں چہ ذیل میں ان اکیس شہداء اہلِ بیت سلامُ اللہ وَرِضوانُہٗ علیہم کے اسماء گرامی درج کیے جاتے ہیں:

۱۔ حضرت امام حسین بن علی بن ابی طالب سلامُ اللہ وَرِضوانُہٗ علیہ

۲۔ حضرت محمد بن علی بن ابی طالب (یہ حضرت امام حسینؓ کے علاتی - یعنی باپ شریک - بھائی تھے)

۳۔ حضرت عثمان بن علی بن ابی طالب (یہ حضرت امام حسینؓ کے علاتی - یعنی باپ شریک - بھائی تھے)

۴۔ حضرت عبد اللہ بن علی بن ابی طالب (یہ حضرت امام حسینؓ کے علاتی - یعنی باپ شریک - بھائی تھے)

۵۔ حضرت جعفر بن علی بن ابی طالب (یہ حضرت امام حسینؓ کے علاتی - یعنی باپ شریک - بھائی تھے)

۶۔ حضرت عباس بن علی بن ابی طالب (یہ حضرت امام حسینؓ کے علاتی - یعنی باپ شریک بھائی، اور لشکر کے علمبردار تھے)

۷۔ حضرت عبد اللہ بن عقیل بن ابی طالب

۸۔ حضرت عبد الرحمن بن عقیل بن ابی طالب

---

(۱) مرج البحرين في ذكر شهادة الحسنين، ص: ۳۱۹، وتذکرہ محبوب کبریا صلی اللہ علیہ وسلم وسیدنا حسین رضی اللہ عنہ ص: ۱۶۶

۹۔ حضرت جعفر بن عقیل بن ابی طالب

۱۰۔ حضرت ابوبکر بن حسنؓ بن علی بن ابی طالب (یہ حضرت امام حسنؓ کے صاحبزادے اور حضرت امام حسینؓ کے بھتیجے تھے)

۱۱۔ حضرت عمرو بن حسنؓ بن علی بن ابی طالب (یہ حضرت امام حسنؓ کے صاحبزادے تھے)

۱۲۔ حضرت عبداللہ بن حسنؓ بن علی بن ابی طالب (یہ حضرت امام حسنؓ کے صاحبزادے تھے)

۱۳۔ حضرت قاسم بن حسنؓ بن علی بن ابی طالب (یہ حضرت امام حسنؓ کے صاحبزادے تھے)

۱۴۔ حضرت علی بن حسینؓ بن علی بن ابی طالب (یہ حضرت امام حسینؓ کے بڑے بیٹے تھے جو "علی اکبر" کے نام سے معروف تھے)

۱۵۔ حضرت عبداللہ[1] بن حسینؓ بن علی بن ابی طالب

۱۶۔ حضرت محمد بن عبداللہ بن جعفر طیار بن ابی طالب (یہ حضرت زینب کے صاحبزادے اور حضرت امام حسینؓ کے سگے بھانجے تھے)

۱۷۔ حضرت عون بن عبداللہ بن جعفر طیار بن ابی طالب (یہ حضرت زینب کے صاحبزادے اور حضرت امام حسینؓ کے سگے بھانجے تھے)

۱۸۔ حضرت عبداللہ بن مسلم بن عقیل بن ابی طالب

۱۹۔ حضرت محمد بن سعد بن عقیل بن ابی طالب

۲۰۔ فیروز (یہ حضرت امام حسینؓ کے غلام تھے)

۲۱۔ سعد (یہ حضرت علی المرتضیٰ کرم اللہ وجہہ کے غلام تھے)۔[2]

---

(۱) یہاں اصل کتاب میں عبداللہ کے بجائے علی اصغر درج تھا جو کہ سہو کاتب یا تسامح بشری ہے کیونکہ علی اصغر، کربلاء میں شہید نہیں ہوئے تھے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ حضرت امام حسینؓ کے چار بیٹے تھے: علی اصغر، علی اکبر، عبداللہ اور جعفر۔ ان چار صاحبزادوں میں سے علی اکبر اور عبداللہ کربلاء میں شہید ہو گئے تھے، حضرت علی اصغر اگرچہ جہادِ کربلاء کے وقت وہاں موجود تھے اور نوجوان تھے لیکن اس وقت چونکہ یہ مریض تھے، اور جنگ میں شریک نہیں ہو سکے تھے، اس لیے یہ باحیات رہے تھے) اور بعد میں امام زین العابدینؒ کے نام سے معروف و مشہور ہوئے (اور حضرت جعفر تو بالکل بچپن میں ہی انتقال کر گئے تھے۔
انظر له: النبراس، ص: ۳۱۳، وصفة الصفوة: ۱/۳۵۳

(۲) مرج البحرین فی ذکر شهادة الحسنین، ص: ۳۲۴، واضح رہے کہ کتب تاریخ میں شہداء اہل بیت کے اسماء اور عدد کے سلسلہ میں مذکورہ بالا قول کے علاوہ اور بھی اقوال مذکور ہیں۔

واقعۂ شہادت سے متعلقہ چند اہم باتیں

حضرت حسینؓ نے کس مقصد کیلیے قربانی دی:

حضرت امام حسینؓ ایک عظیم مقصد کی انجام دہی کیلیے بے چین ہوکر مدینہ سے مکہ اور پھر مکہ سے کوفہ جانے کیلیے مجبور تھے، اور جس کیلیے اپنے سامنے اپنی اولاد اور اپنے اہلِ بیت کو قربان کر کے خود راہِ حق میں قربان ہوگئے۔ واقعۂ شہادت کا تفصیلی مطالعہ کرنے کے بعد واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ اس تمام تر سفر سے آپؓ کا مقصد یہ تھا:

۱۔ کتاب وسنت کے قانون کو صحیح طور پر رواج دینا

۲۔ اسلام کے نظامِ عدل کو از سرِ نو قائم کرنا

۳۔ اسلام میں خلافتِ نبوت کے بجائے ملوکیت وآمریت کی بدعت کے مقابلہ میں مسلسل جہاد کرنا

۴۔ حق کے مقابلہ میں زور وزر کی نمائشوں سے مرعوب نہ ہونا

۵۔ حق کیلیے اپنی جان ومال اور اولاد، سب کچھ قربان کر دینا

۶۔ راہِ حق میں پیش آنے والے خوف وہراس اور مصیبت ومشقت سے نہ گھبرانا، ہر وقت اللہ تعالی کو یاد رکھنا، اسی پر توکل کرنا اور ہر حال میں اللہ پاک کا شکر ادا کرنا۔[1]

حضرت حسینؓ کی سیرت طیبہ کے مطالعہ کے بعد کیا کسی مسلمان کو یہ شبہ ہوسکتا ہے کہ کربلاء میں آپؓ کا یہ جہاد اور حیرت انگیز قربانی اپنی حکومت واقتدار کیلیے تھی؟۔ بڑے ظالم ہیں وہ لوگ جو اس مقدس ہستی کی عظیم الشان قربانی کو اُن کی وضاحتوں کے باوجود بعض دنیوی عزت واقتدار کی خاطر قرار دیتے ہیں۔ حقیقت وہی ہے جو ابھی اوپر گزری کہ آپؓ کا یہ سارا جہاد صرف مندرجہ بالا مقصد کیلیے ہی تھا۔[2]

---

(۱) ینظر: شہید کربلاء، ص:۷

(۲) ینظر: شہید کربلاء، ص: ۱۱۹

شہادتِ حسینؓ کی پیش گوئی:

حضرت علیؓ بیان کرتے ہیں: میں ایک دن نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر ہوا اور دیکھا کہ آپ رو رہے ہیں۔ میں نے کہا: اللہ کے نبی! کسی نے آپ کو ناراض کیا ہے؟ یہ آپ کی آنکھوں سے آنسو کیسے جاری ہیں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بَلْ قَامَ مِنْ عِنْدِيْ جِبْرِيلُ -عَلَيْهِ السَّلَامُ- قَبْلُ، فَحَدَّثَنِي أَنَّ الْحُسَيْنَ يُقْتَلُ بِشَطِّ الْفُرَاتِ "نہیں (مجھے کسی نے کچھ نہیں کہا ہے)، بات یہ ہے کہ جبریلؑ ابھی میرے پاس سے اٹھ کر گئے ہیں، انہوں نے مجھے بتایا ہے کہ حضرت حسینؓ کو دریائے فرات کے کنارے شہید کیا جائے گا"۔ اور پھر جبریلؑ نے مجھے یہ بھی کہا کہ اگر آپ چاہیں تو میں آپ کو اس سرزمین کی مٹی سونگھا دوں؟ میں نے کہا: ہاں! انہوں نے ایک ہاتھ پھیلایا اور مٹی کی ایک مٹھی میرے سامنے کردی۔ اسے دیکھ کر میں ضبط نہ کرسکا اور میری آنکھوں سے آنسو بہہ پڑے۔[1]

ایک روایت میں ہے کہ جبریلؑ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا: آپ کی امت انہیں "کربلاء" نامی زمین میں قتل کرے گی۔ پھر جب شہادت سے قبل حضرت امام حسینؓ کا مظلومانہ حالت میں چاروں طرف سے گھیراؤ کرلیا گیا تھا تو آپ سَلَامُ اللهِ وَرِضْوَانُهُ عليه نے اس وقت پوچھا تھا: اس سرزمین کا نام کیا ہے؟ جواب ملا: "کربلاء"۔ آپؓ نے فرمایا: ہاں! اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے سچ فرمایا تھا، واقعی یہ "کرب" اور "بلاء" (یعنی دکھ اور آزمائش) والی سرزمین ہے۔[2]

قتلِ حسینؓ پر رونما پذیر چند عجیب واقعات:

(۱) حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں: میں نے خواب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا کہ دوپہر کا وقت ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم پراگندہ بال ہیں اور جسم گرد آلود ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک شیشی ہے جس میں خون ہے جو آپؐ نے اکٹھا کر رکھا ہے۔ میں نے پوچھا: یا رسول اللہ! یہ کیا ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: هَذَا دَمُ الْحُسَيْنِ وَأَصْحَابِهِ، لَمْ أَزَلْ أَلْتَقِطُهُ مُنْذُ الْيَوْمِ "یہ حسینؓ اور اس کے ساتھیوں کا خون ہے، میں آج اسے اکٹھا کر رہا ہوں (اور پھر اللہ کی بارگاہ میں پیش کروں گا)۔ بعد میں جب حضرت حسینؓ کے قتل کی اطلاع ملی تو ٹھیک اُسی دن آپؓ کو شہید کیا گیا تھا۔[3]

---

(۱) مجمع الزوائد: ۹/۱۸۷، رقم: ۱۵۱۱۲، ومثله في فضائل الصحابة: ۲/۷۸۲، رقم: ۱۳۹۱

(۲) مجمع الزوائد: ۹/۱۸۹، ومثله في فضائل الصحابة لأحمد بن حنبل: ۲/۷۷۰

(۳) مجمع الزوائد ومنبع الفوائد: ۹/۱۹۳، مع مسند أحمد: ۴/۳۳۷، ومثله في دلائل النبوة للبيهقي: ۶/۴۷۱

(۲) امام زُہریؒ کا بیان ہے: جس دن حضرت حسینؓ کو شہید کیا گیا اُس دن ملکِ شام میں جو پتھر بھی اٹھایا جاتا اُس کے نیچے خون لگا ہوتا تھا۔[۱]

(۳) حضرت ابوقَبیل کہتے ہیں: جس وقت حضرت حسینؓ کو شہید کیا گیا تو ہم نے دیکھا کہ سورج کی روشنی بالکل غائب ہوگئی اور اندھیرا چھا گیا یہاں تک کہ دن کو ہی آسمان پر ستارے نظر آنے لگے۔[۲]

(۴) حضرت امام حسینؓ کی شہادت کا اثر فضا پر بھی ہوا چناں چہ ابن اثیرؒ نے لکھا ہے کہ آپؓ کی شہادت کے بعد دو تین ماہ تک یہ کیفیت رہی کہ سورج طلوع ہونے کے بعد جب دیواروں پر اس کی دھوپ پڑتی تو وہ اس قدر سرخ ہوتی تھی جیسے ان دیواروں کی خون سے لپائی کردی گئی ہو۔[۳] اور بعض روایات میں ہے کہ کئی روز تک سورج کی یہی کیفیت عصر کے بعد بھی رہی۔[۴]

(۵) حضرت ذُوَید جُعفی کے والد بیان کرتے ہیں: حضرت حسینؓ کو شہید کرنے کے بعد ان کے لشکر میں سے ایک اونٹ چھین لیا گیا۔ ذبح کر کے جب اسے پکایا تو گوشت کے بجائے زَرے خون کے لوتھڑے تھے، پھر لوگوں نے اسے پھینک دیا۔[۵]

قاتلانِ حسینؓ کا انجامِ بد:

امام زُہری فرماتے ہیں کہ جو لوگ قتلِ حسینؓ میں شریک تھے ان میں سے ایک بھی نہیں بچا جس کو آخرت سے پہلے دنیا میں سزا نہ ملی ہو: کوئی قتل ہوا، کسی کا چہرہ کالا سیاہ ہوگیا، کسی کی شکل مسخ ہوگئی وغیرہ وغیرہ۔[۶]

(۱) ابن زیاد جس نے حضرت حسینؓ کے سر اور ہونٹوں پر چھڑی مار کر ان کی توہین کرنے کی کوشش کی تھی، اللہ تعالیٰ نے اس سے اس طرح بدلہ لیا کہ چند ہی سال بعد ابراہیم بن اَشتَر کے ہاتھوں وہ قتل ہوا۔ مختار بن ابی عبید ثقفی

---

(۱) مجمع الزوائد ومنبع الفوائد: ۱۹۶/۹، وقال الهيثمي: رجاله رجال الصحيح

(۲) المرجع السابق: ۱۹۷/۹، وقال الهيثمي: إسناده حسن

(۳) الكامل في التاريخ: ۱۹۳/۳

(۴) مجمع الزوائد ومنبع الفوائد: ۱۹۷/۹

(۵) مجمع الزوائد ومنبع الفوائد: ۱۹۶/۹

(۶) شهيدِ كربلاء، ص: ۱۰۸

نے اسے ابن زیاد کے ساتھ جنگ کرنے کیلیے بھیجا تھا۔ جب ابن زیاد قتل ہوگیا تو اس کا سر اور اس کے ساتھیوں کے سر لائے گئے اور مختار کے سامنے ڈال دیے گئے۔ ایک پتلا سانپ آیا جوان سروں کے درمیان گھوما اور چھانٹ کر ابن زیاد کے منہ میں گھسا اور اس کے ناک کے نتھنوں سے نکلا، پھر ناک کے نتھنوں میں گھسا اور منہ سے نکلا۔ اور وہ یہی کرتا رہا کہ ان سب سروں میں سے صرف ابن زیاد کے سر میں گھستا اور منہ سے نکلتا۔ پھر مختار نے ابن زیاد اور اس کے ساتھیوں کے سروں کو محمد بن حنفیہ (یا عبداللہ بن زبیر) کے پاس بھیجا تو ان سروں کو مکہ میں لٹکا دیا گیا اور ابن اَشتَر نے ابن زیاد کی لاش اور اس کے ساتھیوں کی لاشوں کو آگ میں جلا دیا۔[1]

(۲) ابن جوزی نے نقل کیا ہے کہ جس شخص نے حضرت حسینؓ کے سر مبارک کو اپنے گھوڑے کی گردن میں لٹکایا تھا، اس کے بعد اسے دیکھا گیا کہ اس کا منہ کالا تارکول ہوگیا۔ لوگوں نے پوچھا کہ تم تو سارے عرب میں خوبصورت آدمی تھے، تمہیں کیا ہوا؟ اس نے بتایا کہ جس دن سے میں نے یہ سر گھوڑے کی گردن میں لٹکایا، جب ذرا سوتا ہوں دو آدمی میرے بازو پکڑتے ہیں اور مجھے ایک دہکتی ہوئی آگ پر لے جاتے ہیں اور اس میں ڈال دیتے ہیں جو مجھے جھلسا کے رکھ دیتی ہے۔ پھر وہ اسی حالت میں چند روز بعد مر گیا۔[2]

(۳) حضرت حسینؓ کو جنگ کے آخر میں جب شدید پیاس لگی تھی اس وقت جس آدمی نے آپؓ کو تیر مارا تھا اور پانی نہیں پینے دیا تھا، اس شخص پر اللہ تعالی نے سخت قسم کی پیاس کو مسلط کر دیا، کسی طرح اس کی پیاس نہیں بجھتی تھی۔ اس کے پاس ٹھنڈے میٹھے مشروبات، اور دودھ سے لبریز بڑے بڑے پیالے لائے جاتے، مگر وہ یہ سب کچھ پی کر بھی کہتا: اِسْقُونِي اِسْقُونِي قَتَلَنِي الظَّمَأُ "مجھے کچھ پینے کو دو! مجھے کچھ پینے کو دو! پیاس نے مجھے ہلاک کر ڈالا ہے"۔ اسی طرح وہ پیاس پیاس کرتا رہا یہاں تک کہ اس کا پیٹ پھٹ گیا جیسے اونٹ کا پیٹ پھٹتا ہے اور وہ مر گیا۔[3]

(۴) قاتلانِ حسینؓ پر طرح طرح کی زمینی و آسمانی آفتوں کا ایک سلسلہ تو تھا ہی، واقعۂ شہادت سے پانچ ہی سال بعد ۶۶ھ میں مختار ثقفی کو کوفہ اور عراق پر غلبہ حاصل ہوگیا۔ اس نے قاتلانِ حسینؓ کو سزا دینے کیلیے ان کی

---

(۱) شہید کربلاء اور یزید، ص: ۱۳۲ نقلاً عن عمدة القاري: ۱۶/۲۴۱، و مثله عند الترمذي: ۵/۶۶۰

(۲) شہید کربلاء، ص: ۱۰۹

(۳) الکامل في التاريخ: ۳/۱۸۱، و تاريخ الطبري: ۵/۴۵۰

تلاش اور گرفتاریاں شروع کیں:

عمرو بن حجاج ڈر کر پیاس اور گرمی میں بھاگا، پیاس کی وجہ سے بیہوش ہو کر گر پڑا، بالآخر اسے ذبح کر دیا گیا۔

شِمر بن ذی الجوشن جو حضرت حسینؓ کے بارے میں سب سے زیادہ سخت اور بد بخت تھا، اس کو قتل کر کے لاش کتوں کے سامنے ڈال دی گئی۔

مالک بن بشیر نے حضرت حسینؓ کی ٹوپی اٹھائی تھی، اس کے دونوں ہاتھ دونوں پاؤں کاٹ کر میدان میں ڈال دیا، تڑپ تڑپ کر مر گیا۔

عثمان بن خالد اور بشر بن سُمیط عبدالرحمن بن عقیلؓ کے قتل میں شریک تھے، ان کو پہلے قتل کیا گیا پھر جلا دیا گیا۔

عمر بن سعد (جو حضرت امام حسینؓ کے مقابلہ میں لشکر کی کمان کر رہا تھا) کو قتل کر کے اس کا سر تن سے جدا کر دیا گیا اور پھر اس کے لڑکے حفص کو بھی قتل کر دیا گیا۔

خَولی بن یزید جو امام حسینؓ کا سر مبارک کوفہ لے گیا تھا، اس کو قتل کر کے آگ سے جلا دیا گیا تھا۔

حکیم بن طُفیل جس نے حضرت حسینؓ کو تیر مارا تھا، اس کا بدن تیروں سے چھلنی کر دیا گیا، اسی میں ہلاک ہوا۔

زید بن رُقاد نے حضرت حسینؓ کے بھتیجے مسلم بن عقیلؓ کے صاحبزادے عبداللہ کو تیر مارا تھا، اس کو گرفتار کر کے پہلے اس پر تیر اور پتھر برسائے گئے پھر زندہ جلا دیا گیا۔

قاتلانِ حسینؓ کا یہ عبرتناک انجام معلوم کر کے بے ساختہ یہ آیت زبان پہ آتی ہے: { كَذٰلِكَ الْعَذَابُ وَلَعَذَابُ الْاٰخِرَةِ اَكْبَرُ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ } (القلم: ۳۳) یعنی عذاب ایسا ہی ہوتا ہے اور آخرت کا عذاب اس سے کہیں بڑا ہے، کاش وہ سمجھ لیتے)۔

شہادتِ حسینؓ کے بعد یزید کو بھی ایک دن چین نصیب نہ ہوا۔ تمام اسلامی ممالک میں خونِ شہداء کا مطالبہ اور بغاوتیں شروع ہو گئیں۔ اس کے بعد اس کی زندگی دو سال آٹھ ماہ اور ایک روایت میں تین سال آٹھ ماہ سے زائد نہیں رہی۔ دنیا میں بھی اللہ تعالیٰ نے اس کو ذلیل کیا اور اسی ذلت کے ساتھ ہلاک ہو گیا۔[1]

---

(۱) مستفاد من شهيد كربلاء، ص: ۱۱۱، و الكامل في التاريخ: ۳/۱۱۳ وما بعدها، والبداية والنهاية: ۱۲/۱۵ و ما بعدها في ذيل العنوان: "تتبع المختار لقتلة الحسين"

میدانِ کربلا اور حضرت امام حسین شہید رضی اللہ عنہ کو

خراجِ عقیدت

اے کربلا کی خاک اس احسان کو نہ بھول
تڑپی ہے تجھ پہ لاشِ جگر گوشۂ بتول

اسلام کے لہو سے تری پیاس بجھ گئی
سیراب کر گیا تجھے خونِ رگِ رسول ﷺ

کرتی رہے گی پیش شہادت حسین کی
آزادیٔ حیات کا یہ سرمدی اصول

چڑھ جائے کٹ کے سر ترا نیزے کی نوک پر
لیکن یزیدیوں کی اطاعت نہ کر قبول [1]

(1) کلام مولانا ظفر علی خان رحمہ اللہ، از شہادت حسین، ص: ۳۵۸

ازواج واولاد

ازواج:

مؤرخین نے حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کی درج ذیل ازواج (بیویاں) ذکر کی ہیں:

۱-لیلیٰ بنت ابی مرہ بن عروہ بن مسعود ثقفی (بعض مؤرخین نے انہیں "آمنہ" کے نام سے ذکر کیا ہے)

۲-ام ولد (یہ علی اصغر کی والدہ ہیں)

۳-رَباب بنت امرئ القیس بن عدی (یہ "سُکَینہ" اور "عبداللہ" کی والدہ ہیں۔[1])

۴-ام اسحاق بنت طلحہ بن عبید اللہ

صاحبزادے:

حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کے چار صاحبزادے تھے اور یہ سب، مختلف ماؤں سے تھے:

۱-علی اکبر (یہ شہیدِ کربلا ہیں، ان سے آگے نسل نہیں چلی)

۲-علی اصغر (جو امام زین العابدین کے نام سے مشہور ہوئے، اور انہی سے آگے نسل چلی)

۳-جعفر (ان کی آگے نسل نہیں چلی)

۴-عبداللہ (یہ بھی شہیدِ کربلا ہیں، مگر شہادت کے وقت یہ ابھی کم سِن تھے)

صاحبزادیاں:

۱- سُکَینہ (یہ لفظ سین کے پیش اور کاف کی زبر کے ساتھ ہے۔ ان کا اصلی نام "آمنہ" یا "امینہ" تھا، اور سُکَینہ لقب تھا۔ اکثر لوگ اِن کا اصلی نام بھول گئے اور نام کے بجائے انہیں لقب سے یاد رکھا اور پھر اسی سے وہ مشہور ہوئیں۔[2])

۲- فاطمہ۔[3]

([1]) بنات الصحابة، ص: ۳۱۱

([2]) بنات الصحابة—مع التحشية- ص: ۳۱۲، ۳۱۱، ومن أراد الاستزادة من سيرتها الميمونة فليطالع نفس المرجع، ص: ۳۰۸، ۳۹۸

([3]) فوائد نافعه، ص: ۲۷۲، مع العاظ الحنفاء بأخبار الأئمة الفاطميين الخلفاء: ۱۳/۱

فضائل وخصائص

حضرت امام حسنؓ وحسینؓ کے مشترکہ فضائل وخصائص:

ان دونوں حضراتؓ کے مشترکہ فضائل، پیچھے حضرت امام حسنؓ کی سیرت میں گزر چکے ہیں۔ وہاں ملاحظہ کرلیے جائیں۔

حضرت امام حسینؓ سے متعلقہ فضائل:

(۱) ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کھانے کی دعوت پر تشریف لے جارہے تھے، صحابہ کرامؓ بھی ساتھ تھے۔ گلی میں دیکھا کہ حضرت حسینؓ کھیل رہے ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صحابہ سے آگے نکل کر حضرت حسینؓ کی طرف دونوں ہاتھ پھیلا دیے۔ حضرت حسینؓ کبھی اِدھر بھاگتے اور کبھی اُدھر بھاگ جاتے اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی ان کو ہنسا رہے تھے (جیسے آدمی پیار میں بچے کو ادھر ادھر بھاگنے دیتا ہے اور پکڑتا نہیں)، آخر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کو پکڑ لیا اور اپنا ایک ہاتھ ان کی ٹھوڑی کے نیچے اور دوسرا ہاتھ گدی کے پاس سر کا جو کنارہ ہوتا ہے وہاں رکھ کر ان کا بوسہ لے لیا اور فرمایا: حُسَيْنٌ مِنِّي، وَأَنَا مِنْ حُسَيْنٍ، أَحَبَّ اللهُ مَنْ أَحَبَّ حُسَيْنًا، حُسَيْنٌ سِبْطٌ مِنَ الْأَسْبَاطِ "حسین مجھ سے ہے اور میں حسین سے ہوں (یعنی حسین کا مجھ سے گہرا تعلق ہے)۔ اللہ اُس سے محبت کرے جو حسین سے محبت کرے۔ حسین (میرا خاص) نواسہ ہے"۔[1]

(۲) آپؓ سینہ مبارک سے لے کر پاؤں تک (یعنی نیچے والے نصف حصۂ بدن میں)، حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مشابہ تھے۔[2] اور باقی بدن میں یعنی سر سے لے کر سینہ تک اپنے والد حضرت علیؓ کے مشابہ تھے، اور حضرت حسنؓ کی مشابہت اس کے برعکس تھی یعنی وہ اوپر والے حصۂ بدن میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اور نیچے والے بدن میں حضرت علیؓ کے مشابہ تھے، جیسا کہ پیچھے گزرا۔ اسی مناسبت سے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرمایا کرتے تھے کہ "حسن مجھ سے ہے اور حسین، علی سے ہے" یعنی حسن میرے مشابہ ہے اور حسین، علی کے مشابہ ہے۔[3]

---

(۱) سنن ابن ماجه: ۱/۵۱

(۲) سنن الترمذي ت شاكر: ۵/۶۶۰

(۳) ينظر: سنن أبي داود: ۴/۶۸، ومسند أحمد: ۲۸/۴۲۶

(۳) جب عبید اللہ بن زیاد کے پاس حضرت امام حسینؓ کا سر مبارک لایا گیا، تو وہ بد بخت آپؓ کے سر کو ایک "طشت" میں رکھ کر اسے چھڑی سے کریدنے لگا اور آپؓ کے حُسن و جمال کے بارے میں کوئی نازیبا بات بھی کہی۔ مشہور صحابی حضرت انسؓ وہاں موجود تھے انہوں نے جرأت کر کے اس سے کہا: "یہ تو حضور ﷺ کے بہت مشابہ تھے"۔ اس وقت حضرت امام حسینؓ کے بالوں میں "وسمہ" کا خضاب لگا ہوا تھا۔[1]

ف: "وسمہ" سیاہی مائل ایک پودا ہوتا ہے جس سے بالوں کو خضاب کیا جاتا ہے۔[2]

(۴) حضرت ابو ہریرہؓ بیان کرتے ہیں: حضور ﷺ مسجد میں تشریف فرما تھے اور "حَبْوہ"[3] باندھ رکھا تھا۔ آپ ﷺ نے مجھے فرمایا: "ننھے منے بچے کو ذرا میرے پاس بلاؤ"۔ اتنے میں حضرت حسینؓ سامنے سے دوڑتے ہوئے آئے اور آ کر آپ کی گود میں گر گئے۔ پھر اپنا ہاتھ آپ ﷺ کی ڈاڑھی مبارک میں ڈالنا شروع کر دیا اور آپ ﷺ حضرت حسینؓ کا منہ کھولتے اور اپنا منہ ان کے منہ میں دیتے اور فرماتے: اَللّٰهُمَّ إِنِّي أُحِبُّهُ فَأَحِبَّهُ "اے اللہ! میں اس سے محبت کرتا ہوں، تُو بھی اس سے محبت فرما"۔[4]

(۵) حضرت ابو ہریرہؓ فرماتے ہیں: میں نے رسول اللہ ﷺ کو دیکھا کہ آپ نے حضرت حسینؓ کو اٹھا رکھا تھا اور فرما رہے تھے: اے اللہ! میں اس سے محبت کرتا ہوں، تُو بھی اس سے محبت فرما۔[5]

(۶) حضور ﷺ نے حضرت امام حسینؓ کے بارے میں فرمایا: مَنْ أَحَبَّ هٰذَا فَقَدْ أَحَبَّنِي "جس نے اس سے محبت کی اس نے مجھ سے محبت کی"۔[6]

(۷) آپ ﷺ نے فرمایا: جس شخص کو اس بات سے خوشی ہو کہ وہ کسی جنتی مرد کو دیکھے تو اسے چاہیے کہ وہ حسین

---

(۱) صحيح البخاري: ۲۶/۵

(۲) تعليق مصطفى البغا على صحيح البخاري: ۲۶/۵

(۳) "حَبْوہ" باندھنا: یہ عرب لوگوں کے ہاں بیٹھنے کا ایک خاص طریقہ ہے جس میں آدمی زمین پر بیٹھ کر اپنی دونوں رانوں سے پنڈلیاں ملا کر گھٹنے کھڑے کر لیتا ہے اور ان پنڈلیوں کے گرد اپنے دونوں ہاتھ باندھ لیتا ہے یا پھر ہاتھ باندھنے کے بجائے کمر اور پنڈلیوں کے گرد کوئی کپڑا باندھ لیتا ہے۔

(۴) المستدرك على الصحيحين للحاكم: ۱۹۶/۳

(۵) المرجع السابق: ۱۹۵/۳

(۶) مجمع الزوائد ومنبع الفوائد: ۱۸۶/۹

بن علیؓ کو دیکھ لے۔ [1]

(۸) حضرت ابراہیم نخعیؒ فرماتے ہیں: اگر میں (بالفرض) ان لوگوں میں ہوتا جنھوں نے حضرت امام حسینؓ کو شہید کیا، پھر مجھے بخش کر جنت میں بھیج بھی دیا جاتا تو بھی مجھے اس بات سے شرم آتی کہ میں (وہاں) آپ ﷺ کے پاس سے گزروں اور آپ مجھے دیکھ رہے ہوں۔ [2]

(۹) حضور ﷺ حضرت عائشہؓ کے گھر سے باہر تشریف لاتے ہوئے حضرت فاطمہؓ کے گھر کے پاس سے گزرے تو آپ ﷺ کو اندر سے حضرت حسینؓ کے رونے کی آواز سنائی دی۔ آپؐ نے حضرت فاطمہؓ سے فرمایا: أَلَمْ تَعْلَمِي أَنَّ بُكَاءَهُ يُؤْذِينِي؟ ''تمہیں معلوم نہیں کہ حسین کے رونے سے مجھے تکلیف ہوتی ہے''۔ [3]

(۱۰) رسول اللہ ﷺ بعض دفعہ حضرت حسینؓ کو اپنے سینے سے چمٹا لیتے، ان کو چومتے اور پھر ان کو پیار سے سونگھتے (جیسے کوئی پھول کو سونگھتا ہے)۔ [4]

---

(۱) مسند أبي يعلى الموصلي: ۳/۳۹۷

(۲) مجمع الزوائد ومنبع الفوائد: ۹/۱۹۵

(۳) مجمع الزوائد ومنبع الفوائد: ۹/۲۰۱

(۴) فضائل الصحابة لأحمد بن حنبل: ۲/۷۶۹

۲۔ امام حسینؓ کے ائمہ صاحبزادگان

سلامُ اللہ و رحمۃُ علیہم

اس مبحث میں امام حسینؓ کی نسلِ مبارک میں سے درج ذیل ائمہ حضرات کی سیرت و مناقب کو ذکر کیا جائے گا:

۱۔ امام زین العابدین سلامُ اللہ و رحمۃُ علیہ

۲۔ امام باقر سلامُ اللہ و رحمۃُ علیہ

۳۔ امام زید شہید سلامُ اللہ و رحمۃُ علیہ

۴۔ امام جعفر صادق سلامُ اللہ و رحمۃُ علیہ

۵۔ امام اسماعیل سلامُ اللہ و رحمۃُ علیہ

۶۔ امام موسیٰ کاظم سلامُ اللہ و رحمۃُ علیہ

۷۔ امام علی رضا سلامُ اللہ و رحمۃُ علیہ

۸۔ امام محمد تقی سلامُ اللہ و رحمۃُ علیہ

۹۔ امام علی نقی سلامُ اللہ و رحمۃُ علیہ

۱۰۔ امام حسن عسکری سلامُ اللہ و رحمۃُ علیہ

(۱) حضرت امام زین العابدین سلامُ اللہ وَ رَحمۃُ علیہ

(علی بن حسینؓ)

نام ونسب:

آپ سلامُ اللہ وَ رَحمۃُ علیہ، کا نام ''علی'' اور کنیت ''ابوالحسن'' تھی۔ ''زین العابدین'' اور ''سجاد'' آپؒ کے مشہور القاب تھے (آپؒ کی کثرتِ عبادت اور کثرتِ سجود سے آپؒ کو یہ لقب ملے تھے [۱])۔ آپؒ نسب کے لحاظ سے قریشی اور ہاشمی تھے۔

آپؒ حضرت امام حسینؓ کے چھوٹے صاحبزادے، اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ اور حضرت فاطمۃ الزہراءؓ کے پوتے تھے۔ میدانِ کربلاء میں جب گلدستۂ اہلِ بیتؓ کو اجاڑ دیا گیا تو آپؒ ہی اس گلدستہ کے واحد پھول تھے جو باقی رہ گئے اور پھر آپؒ سے ہی حضرت امام حسینؓ کی آگے نسل چلی۔ آپؒ کی والدہ باندی اور عجمی خاتون تھیں، ان کا نام ''غزالہ'' یا ''سلامہ'' تھا۔ [۲] آپؒ کے ایک دوسرے بھائی کا نام بھی ''علی'' تھا جو عمر میں آپؒ سے بڑے تھے اور کربلاء میں شہید ہوگئے تھے۔ اور آپؒ کا نام بھی چونکہ ''علی'' تھا، اس لیے ان دونوں ناموں میں فرق کرنے کیلیے اُن شہید بھائی کو ''علی اکبر'' اور آپؒ کو ''علی اصغر'' کہا جاتا ہے۔ [۳]

ولادتِ باسعادت:

آپ سلامُ اللہ وَ رَحمۃُ علیہ، ۵ شعبان، بروز جمعرات ۳۸ھ میں مدینہ طیبہ میں پیدا ہوئے۔ یعنی آپؒ اپنے دادا حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے دورِ خلافت میں اُن کی شہادت سے دو سال قبل پیدا ہوئے۔ [۴]

---

(۱) النبراس، ص: ۱۳۳ مع إسعاف الراغبين في سيرة المصطفى وفضائل أهل بيته الطاهرين ص: ۲۱۲، والإمام زيد بن علي ص: ۳۶

(۲) ينظر: البداية والنهاية: ۲۸۰/۱۲، ۲۸۱، وسير أعلام النبلاء: ۳۸۶/۴، وتاريخ الخميس: ۲۸۶/۲، ومروج الذهب: ۱۳۳/۳

(۳) الأعلام للزركلي: ۲۷۷/۴، وسير أعلام النبلاء: ۳۸۷/۴، وصفة الصفوة: ۳۵۳/۱

(۴) نور الأبصار في مناقب آل بيت النبي المختار، ص: ۱۹۱، وإسعاف الراغبين في سيرة المصطفى وفضائل أهل بيته الطاهرين ص: ۲۱۶

حلیہ مبارک:

آپؒ نہایت خوبصورت تھے، لوگوں کے بیچ میں آپؒ کا حسن و جمال بالکل نمایاں تھا۔[1] سر پر زلفیں تھیں جو کندھوں تک لٹکی رہتی تھیں اور مانگ نکلی ہوتی تھی۔[2] بالوں کو سیاہ اور سرخ خضاب کیا کرتے تھے۔[3]

لباس:

آپؒ خوبصورت لباس اور اعلیٰ قسم کی خوشبو استعمال فرماتے تھے حتیٰ کہ آپؒ کے بدن سے منفرد عمدہ خوشبو پھوٹتی تھی۔[4] آپؒ سفید عمامہ باندھتے اور کمر پر اس کا شملہ چھوڑ دیتے۔[5] عمدہ قسم کی اون کی چادر اور جبہ استعمال فرماتے تھے۔ اور ایک زرد چادر تھی جسے جمعہ کے دن زیب تن فرماتے۔[6]

آپؒ کا لباس عمدہ اور قیمتی ہوا کرتا تھا۔ سردیوں میں پچاس دینار (مساوی آٹھ لاکھ روپے) کی اونی چادر پہنتے۔ جب گرمیاں آتیں تو وہ چادر کسی غریب کو دے دیتے یا پھر اس چادر کو بیچ کر اس کی قیمت اسے دے دیتے۔ گرمیوں میں خاص نوع کے سرخ مصری کپڑے پہنتے تھے۔ اور یہ آیت تلاوت فرمایا کرتے تھے: {قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِينَةَ اللَّهِ الَّتِي أَخْرَجَ لِعِبَادِهِ} (الأعراف: ۳۲) کہو کہ: ''آخر کون ہے جس نے زینت کے اُس سامان کو حرام قرار دیا ہو جو اللہ نے اپنے بندوں کیلیے پیدا کیا ہے؟''۔[7]

سفید ٹوپی استعمال فرماتے جو سر مبارک کے ساتھ لگی ہوتی تھی، اور ایسا جوتا پہنتے جو آگے سے گول ہوتا تھا۔[8]

---

(۱) البداية والنهاية: ۱۲/۲۹۱ مع طبقات الشافعية الكبرى للسبكي: ۱/۲۹۱

(۲) الطبقات الكبرى ط العلمية: ۵/۱۶۸

(۳) الطبقات الكبرى ط العلمية: ۵/۱۶۷

(۴) البداية والنهاية: ۱۲/۲۹۱، وطبقات الشافعية للسبكي: ۱/۲۹۱

(۵) البداية والنهاية ط هجر: ۱۲/۲۸۱، وسير أعلام النبلاء ط الرسالة: ۴/۳۹۷

(۶) سير أعلام النبلاء ط الرسالة: ۴/۳۹۷

(۷) تفسير القرطبي: ۷/۱۹۵، ۱۹۶

(۸) الطبقات الكبرى ط العلمية: ۵/۱۶۷، ۱۶۸

اولاد:

آپؒ کے دس صاحبزادے اور چار صاحبزادیاں تھیں:

صاحبزادے:

۱۔محمد (یہ وہی "محمد بن علی" ہیں جو "امام باقر" کے لقب سے مشہور ہیں)، ۲-زید، ۳-عمر، ۴-عبداللہ، ۵-حسن، ۶-حسین، ۷-حسین الاصغر، ۸-عبدالرحمن ۹-سلیمان، ۱۰-علی (اور یہ سب سے چھوٹے تھے)۔

صاحبزادیاں:

۱-خدیجہ، ۲-فاطمہ، ۳-عُلَیَّہ، ۴-ام کلثوم۔[1]

سانحۂ کربلاء میں آپؒ کی شرکت:

دیگر اہلِ بیت کے ساتھ میدانِ کربلا میں آپؒ بھی موجود تھے مگر آپؒ بہت بیمار تھے، اس قدر شدید بخار تھا کہ بستر پر ہی لیٹے رہے اور جنگ میں شرکت نہیں کر سکے۔[2] اس وقت آپؒ نوجوان تھے اور تئیس (۲۳) برس عمر تھی لیکن شدتِ مرض کی وجہ سے آپؒ چونکہ جنگ میں شریک نہیں ہو سکے تھے اس لیے ان دشمنوں نے آپؒ کو چھوڑ دیا تھا اور شہید نہیں کیا تھا، اگرچہ بدبخت شِمر نے آپؒ کو بھی قتل کرنے کا ارادہ کیا تھا مگر اُس کے ہی ساتھیوں نے اُسے شرم دلائی کہ بیمار اور کمزور کو قتل کرتے ہو؟ تو وہ باز آ گیا۔ بعض کہتے ہیں: "آپؒ اُس وقت کم سن بچے تھے اس لیے آپؒ کو چھوڑ دیا گیا"۔ لیکن یہ بات درست نہیں ہے۔[3]

اس کے علاوہ، یہ بات ایک معجزۂ ربانیہ سے کم نہیں ہے کہ حضرت امام حسینؓ اور ان کی نسل کو دشمن نے اپنے لحاظ سے صفحۂ ہستی سے مٹا دیا تھا اور اس عظیم نسل میں سے تنِ تنہا صرف آپؒ ہی بچ گئے تھے اور اللہ تعالیٰ نے انہی اکیلے فرد کے ذریعے حضرت امام حسینؓ کی نسل کو پوری روئے زمین پر قیامت تک کیلیے پھیلا دیا اور اپنی رحمت سے اس قدر

---

(۱) نور الأبصار فی مناقب آل بیت النبي المختار، ص: ۱۹۵

(۲) سیر أعلام النبلاء: ۳۸۶/۴، وتاریخ الطبري: ۶۳۰/۱۱

(۳) ینظر: تاریخ الطبري: ۶۳۰/۱۱ مع نور الأبصار، ص: ۱۹۱ و صفة الصفوة: ۳۵۳/۱

پھیلایا کہ اب سادات کی ان عظیم ہستیوں کے مبارک وجود سے شاید ہی کوئی اسلامی خطہ محروم ہو اور ان نیک بخت حضرات کا اب شمار بھی دشوار ہے۔ [1]

کربلاء سے مدینہ طیبہ کی طرف واپسی کا سفر:

ان حضرات اہلِ بیت کو کربلاء سے کوفہ لایا گیا اور ابن زیاد کے سامنے پیش کیا گیا۔ ابن زیاد نے جب حضرت علی بن حسینؓ کو دیکھا تو ان سے پوچھا: تیرا نام کیا ہے؟ آپؒ نے بتایا: علی بن حسین۔ اس نے کہا: کیا اللہ نے علی بن حسین کو قتل نہیں کر دیا؟ آپؒ خاموش رہے۔ اس نے کہا: بولتے کیوں نہیں ہو؟ آپؒ نے فرمایا: میرا ایک بھائی تھا اس کا نام بھی ''علی'' تھا، لوگوں نے انہیں قتل کیا ہے۔ ابن زیاد کہنے لگا: اسے اللہ نے قتل کیا ہے۔ آپؒ خاموش رہے۔ اس نے کہا: اب بولتے کیوں نہیں ہو؟ آپؒ نے جواب میں یہ دو آیتیں تلاوت فرمائیں:

{اللَّهُ يَتَوَفَّى الْأَنْفُسَ حِينَ مَوْتِهَا} (سورۃ الزمر: ۴۲) یعنی اللہ کسی جان کو اسی وقت ہی قبض کرتا ہے جب اس کی موت کا وقت آ جاتا ہے)، {وَمَا كَانَ لِنَفْسٍ أَنْ تَمُوتَ إِلَّا بِإِذْنِ اللَّهِ} (سورۃ آل عمران: ۱۴۵) یعنی یہ کسی بھی شخص کے اختیار میں نہیں ہے کہ اسے اللہ کے حکم کے بغیر موت آ جائے)۔ اس پر وہ بگڑ گیا اور کہنے لگا: واللہ! تو بھی انہی میں سے ہے اور آپؒ کے قتل کا حکم جاری کر دیا۔

اس پر آپؒ نے کہا: پھر ان مستورات کو کن کے سپرد کرو گے؟ ابن زیاد کا یہ جابرانہ حکم سن کر حضرت امام حسینؓ کی بہن اور آپؒ کی پھوپھی حضرت زینبؓ بے تاب ہو کر حضرت علی بن حسینؒ سے چمٹ گئیں اور بولیں: ابن زیاد! کیا ہم آلِ رسول کے خونوں سے تمہارا جی نہیں بھرا؟؟ میں تمہیں اللہ کا واسطہ دے کر کہتی ہوں کہ اگر تو نے ان کو قتل کرنے کا ارادہ کر ہی لیا ہے تو پھر مجھے بھی ان کے ساتھ ہی قتل کر دے۔ حضرت علی بن حسینؒ نے اپنی ان مقدس مستورات کی حفاظت کے سلسلہ میں ابن زیاد سے کہا: ابن زیاد! اگر تمہارا اور ان مستورات میں کوئی رشتہ ناتا ہے تو کم از کم ان کے ساتھ کوئی متقی و نیک سیرت انسان بھیج دو (جو انہیں بحفاظت واپس وطن (مدینہ منورہ) پہنچا دے)۔ اس پر اس نے کہا: چلو پھر اسی لڑکے (یعنی حضرت علی بن حسینؒ) کو ان عورتوں کے ساتھ جانے دو اور آپؒ کو قتل نہ کیا۔ [2]

---

(۱) ينظر: الجوهر الشفاف في أنساب السادة الأشراف: ۱/۱۳۷

(۲) الكامل في التاريخ: ۳/۱۸۶، والطبقات الكبرى: ۵/۱۶۳، وتاريخ الطبري: ۵/۴۵۸

پھر ابن زیاد نے حضرت علی بن حسینؒ سمیت اہلِ بیت کی ان مستورات کو یہاں ''کوفہ'' سے، یزید کے پاس ''شام'' بھجوا دیا۔ جب یہ حضرات قیدیوں کی حیثیت سے یزید کے پاس پیش کیے گئے تو اس مجلس میں ایک بدبخت شامی اٹھا اور کہنے لگا: یہ قیدی ہمارے لیے حلال ہیں یعنی نعوذ باللہ یہ عورتیں اب ہمارے لیے حلال ہیں، ہم ان کو اپنی باندیاں بنا کے رکھیں گے۔

اس پر حضرت علی بن حسینؒ نے برجستہ فرمایا: تو جھوٹ بول رہا ہے۔ یہ اس وقت تک نہیں ہو سکتا جب تک تو ہماری ملت اور ہمارے مذہب (اسلام) سے نہ نکل جائے (کیونکہ کسی مسلمان کیلیے مسلمان قیدی عورت حلال نہیں ہوا کرتی)۔ پھر یزید نے اس شامی کو بٹھا دیا۔[1]

یہ حضرات کچھ دن وہیں یزید کے پاس رہے۔ اس دوران یزید جب بھی صبح یا شام کا کھانا کھاتا تو حضرت علی بن حسینؒ اور ان کے چچا زاد بھائی حضرت عمرو بن حسن کو بھی ساتھ شریک کرتا۔ حضرت علی بن حسینؒ تو نوجوان تھے مگر حضرت عمرو بن حسن چھوٹے بچے تھے۔ ایک دن یزید نے حضرت عمرو سے کہا: کیا تم میرے اس بیٹے خالد بن یزید سے مقابلہ کر سکتے ہو؟ انہوں نے کہا: ہاں کر سکتا ہوں۔ ایک چھری مجھے دو اور ایک اُسے، تاکہ ہم آپس میں مقابلہ کر سکیں۔

اس پر یزید نے اپنے بیٹے خالد کو پکڑ کر اپنے ساتھ چمٹا لیا اور حضرت عمرو سے کہنے لگا: شِنْشِنَةٌ أَعْرِفُهَا مِنْ أَخْزَم، هَلْ تَلِدُ الْحَيَّةُ إِلَّا حَيَّةً؟ ''تُو بھی اپنے باپ کی طرح ڈسنے والا ہے، اور آخر سانپ سے سانپ ہی پیدا ہوتا ہے''۔[2]

چند روز بعد یزید نے حضرت علی بن حسینؒ سے کہا: اگر تم ہمارے پاس رہنا چاہو تو یہاں رہو۔ ہم تمہارے ساتھ صلہ رحمی کریں گے، تمہارے حقوق کا خیال رکھیں گے۔ اور اگر تم واپس اپنے وطن (مدینہ طیبہ) جانا چاہو تو میں تم لوگوں کو بھجوا دیتا ہوں اور تمہارے ساتھ اچھا معاملہ کرتا رہوں گا۔ آپؒ نے کہا: نہیں! ہمیں ہمارے وطن واپس پہنچا دیجئے۔

چناں چہ یزید نے ان کو مدینہ منورہ بھجوا دیا اور ان کے ساتھ بہتر سلوک اور اچھا معاملہ کیا۔[3]

---

(۱) الطبقات الکبری: ۵/۱۶۳

(۲) البدایۃ والنہایۃ طہجر: ۱۱/۵۶۳ مع تاریخ الطبری: ۵/۳۶۲

(۳) الطبقات الکبری: ۵/۱۶۳، ۱۶۴

پھر جب یزید ان حضرات کو مدینہ طیبہ بھجوانے لگا تو حضرت نعمان بن بشیرؓ سے کہا: علی بن حسین سمیت ان سب حضرات کیلیے ان کی شایانِ شان ضروریاتِ سفر کا بندوبست کرو، اور یہاں کا کوئی امانتدار اور نیک صالح آدمی ان کے ساتھ بھیجو جس کے ساتھ فوج کا ایک حفاظتی دستہ بھی ہو، جو ان کو بحفاظت مدینہ پہنچا آئے۔ [1]

جب ان کو رخصت کرنے کا وقت آیا تو یزید نے حضرت علی بن حسینؒ کو بلا کر کہا:

اللہ بُرا کرے ابن مرجانہ (ابن زیاد) کا۔ واللہ! اس کی جگہ اگر میں حضرت حسینؓ کے پاس موجود ہوتا تو وہ مجھ سے جس بات کا بھی مطالبہ کرتے تو میں ان کو دے دیتا اور جہاں تک مجھ سے ہو سکتا میں ان کی جان کی حفاظت کرتا اگرچہ اس کیلیے میری بعض اولاد ہی قربان ہو جاتی، لیکن اللہ کی تقدیر تمہارے سامنے ہے۔

اس کے بعد یزید نے ان کو سامانِ سفر اور بہت زیادہ مال دیا اور ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ آئندہ تمہیں جس چیز کی بھی ضرورت ہو مجھے لکھ بھیجنا۔ اس کے علاوہ ان کو کپڑے بھی دیے اور جو آدمی ساتھ جا رہا تھا اس کو بھی حکم دیا کہ ان کا خیال رکھنا۔ [2]

تنبیہ:

یزید کی یہ ندامت وشرمندگی اور بقیہ اہلِ بیت کے ساتھ بظاہر اکرام کا معاملہ اپنی بدنامی کا داغ مٹانے کیلیے تھا (جیسا کہ ایک موقع پر وہ پہلے کہہ چکا تھا کہ ابن مرجانہ نے قتلِ حسین سے لوگوں کے دلوں میں میری نفرت کا بیج بو دیا ہے)، یا حقیقت میں کچھ اللہ کا خوف اور آخرت کا خیال آ گیا تھا، یہ تو علیم وخبیر ہی جانتا ہے مگر یزید کے اعمال اور کارنامے اس کے بعد بھی سیاہ کاریوں ہی سے لبریز ہیں۔ مرتے مرتے بھی مکہ مکرمہ پر چڑھائی کیلیے لشکر بھیجے ہیں، اسی حال میں مرا ہے۔ [3] بہرحال اس نے مدینہ منورہ اور مکہ مکرمہ دونوں کی حرمت وتقدس کو پامال کیا تھا۔ اس نے مسلم بن عقبہ کو ایک بھاری بھر لشکر دے کر مدینہ پر حملہ کروایا تھا جس میں اس نے اپنے حکم نامہ سے تین دن کے لیے پورا مدینہ نعوذ باللہ، اپنے اس شامی لشکر کے لیے حلال کر دیا تھا۔ اس حکم کے نتیجے میں ان شامی فوجیوں نے ایک تو شہرِ

---

(۱) تاريخ الطبري: ۵/ ۴۶۲ مع البداية والنهاية: ۱۱/ ۵۶۳

(۲) البداية والنهاية: ۱۱/ ۵۶۳، وتاريخ الطبري: ۵/ ۴۶۲، والكامل في التاريخ: ۳/ ۱۹۰

(۳) شهيد كربلاء، ص: ۱۰۱

رسول ﷺ میں تین دن تک غیر معمولی قتلِ عام کیا اور بہت سی جلیل القدر ہستیوں سمیت ہزاروں اہلِ مدینہ کو شہید کر ڈالا، دوسرے انہوں نے مدینہ والوں کے اموال پر بہت کثرت سے لوٹ مار کی، تیسرے ان بدبخت فوجیوں نے عورتوں کی عزتوں پر ہاتھ ڈالا اور ان بدبختوں کے زنا سے معاذ اللہ- مدینہ طیبہ کی تقریباً ایک ہزار پاکدامن خواتین حاملہ ہوئیں، الغرض یزید نے اپنے مذکورہ حکم سے، اس شامی لشکر کے ذریعے، مدینہ طیبہ کو شر و فساد سے بھر دیا اور شہرِ رسول ﷺ کی عزت و حرمت کو ناقابلِ تصور حد تک پامال کیا۔[1]

مدینہ میں مستقل قیام:

مدینہ طیبہ پہنچ کر آپؒ نے وہیں مستقل رہائش اختیار فرمائی اور وقت کی سیاسی تحریکوں سے الگ تھلگ ہو کر علمِ دین حاصل کرنے اور اس کی تعلیم دینے میں مشغول ہو گئے اور قرآن و حدیث اور فقہ اسلامی کی تدریس شروع فرما دی چناں چہ امت کے بہت بڑے طبقہ نے آپؒ سے قرآن و سنت کے علم کا فیض حاصل کیا۔

دینی علوم کی تحصیل اور اشاعت و تدریس:

آپ سلام اللہ و رحمۃ علیہ، نے نہایت ذوق و شوق اور محنت و مشقت سے علم حاصل کیا حتیٰ کہ ابن کثیر نے لکھا ہے کہ حضرت علی بن حسینؒ نے ہر وہ راہ جس سے علم حاصل ہوتا ہو، اُس میں پوری جد و جہد صرف کر ڈالی۔[2] آپؒ نے مسجد نبوی میں قائم ہونے والے علمی حلقوں سے خوب فائدہ حاصل کیا جبکہ وہ زمانہ ان علمی حلقوں کے عروج کا زمانہ تھا۔ بہر حال آپؒ نے وقت کے اکابر صحابہ و جلیل القدر تابعین سے علمی فیض حاصل کیا۔[3] چناں چہ جن حضرات سے آپؒ نے احادیث نقل کیں (اور ان کا زمانہ بھی پایا)، ان میں سے درج ذیل حضرات کے نام نمایاں ہیں:

آپؒ کے والد حضرت امام حسینؓ، چچا حضرت امام حسنؓ، مفسر قرآن حضرت عبداللہ بن عباسؓ، حدیث کے سب سے بڑے راوی حضرت ابوہریرہؓ، محدثہ و فقیہۂ امت ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہؓ، حضرت جابرؓ، حضرت سعید بن مسیبؒ وغیرہ وغیرہ۔[4]

---

(1) ينظر: البداية والنهاية ط هجر: ١١/٦١٩، ٦٢٠

(2) موسوعة آل بيت النبي: ٢/٣٠٣

(3) صور من حياة التابعين، ص: ٣٢٢

(4) تاريخ الخميس في أحوال أنفس النفيس: ٢/٢٨٦، وسير أعلام النبلاء: ٤/٣٨٧

اور آپؒ نے علم حاصل کرنے کی طرح علم پھیلانے میں بھی اپنی مکمل صلاحیتیں خرچ کیں، چناں چہ ایک بڑی تعداد آپؒ سے فیض یاب ہوئی۔ جن اشخاص نے آپؒ سے علمی فیض حاصل کیا، ان کی ایک لمبی فہرست ہے، تاہم آپؒ سے احادیث نقل کرنے والے چند اہم حضرات کے نام یہ ہیں:

امام زہریؒ، عمرو بن دینار، یحیٰ بن سعید، علی بن جُدعان، طاؤس وغیرہ وغیرہ۔[1]

آپؒ نے تفسیر، حدیث اور فقہ؛ الغرض تمام بنیادی دینی علوم کی اشاعت کی خدمت سرانجام دی۔

جہاں تک خدمتِ تفسیر کا تعلق ہے تو آپؒ کے بارے میں علماء نے لکھا ہے کہ آپؒ ایک ماہر و پختہ کار مفسرِ قرآن ہیں۔ آیت کا جو مطلب اور تفسیر آپؒ بیان فرماتے ہیں محقق مفسرین وعلماء کے ہاں وہ مستند اور بہترین تفسیر شمار ہوتی ہے۔ اور امام زہریؒ اور امام ابن عربیؒ جیسے بڑے مشائخ کو اسی مطلب وتفسیر پر اطمینان ہوتا ہے۔[2]

علمِ حدیث کے حاصل کرنے میں شاگردوں کا آپؒ کی طرف اتنا رجوع ہوا کہ آپؒ کو "قابلِ اعتماد" اور "کثیر الحدیث" (یعنی بہت زیادہ حدیثیں بیان کرنے والا) عالمِ دین قرار دیا گیا۔[3]

اور علمِ فقہ میں آپؒ نے وہ بلند مقام حاصل کیا کہ وقت کے امام آپؒ کی فقہی دسترس کے صرف قائل ہی نہیں بلکہ آپؒ کو اپنے زمانہ کے تمام فقہاء سے افضل سمجھتے تھے، جیسا کہ امام زہریؒ فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت علی بن حسینؒ سے بڑا کوئی فقیہ نہیں دیکھا۔[4] اور آپؒ کا شمار "فقہاءِ حفاظ" اور "مدینہ کے بڑے مفتیانِ کرام" میں ہوتا تھا۔[5]

بہرحال آپؒ نے بہت فضل وکمال پایا، چناں چہ امام زہریؒ ہی کا بیان ہے کہ میں نے کوئی قریشی حضرت علی بن حسینؒ سے افضل نہیں دیکھا۔[6]

---

(1) سیر أعلام النبلاء: ۳۸۷/۴

(2) مستفاد من: تفسیر القرطبي: ۱۹۰/۱۴، ۱۹۱، وینظر لتفصیل هذا المقام: علماء أهل البیت في عصر التابعین، ص: ۲۵۰، ۲۶۰

(3) الطبقات الکبریٰ ط العلمیة: ۱۷۲/۵

(4) تذکرة الحفاظ للذهبي: ۶۰/۱، والمنتظم في تاریخ الملوک والأمم: ۳۳۰/۶

(5) أحداث التاریخ الإسلامي: ۲۳۲/۱ مع إعلام الموقعین عن رب العالمین: ۱۹/۱

(6) سیر أعلام النبلاء: ۳۸۷/۴، والبدایة والنهایة: ۴۸۱/۱۲

سفرِ حج اور آپ کی عزت واحترام:

ایک دفعہ آپؒ حج کیلیے تشریف لے گئے۔ اتفاق سے اسی سال ہشام بن عبدالملک بھی ''شام'' کے بڑے بڑے لوگوں کے ساتھ حج کیلیے گیا ہوا تھا۔ اس وقت یہ ولی عہد تھا یعنی ابھی بادشاہ نہیں بنا تھا۔ ہشام بن عبدالملک طواف کرنے کے بعد حجرِ اسود کو بوسہ دینے کیلیے بڑھا، لیکن ہجوم اتنا تھا کہ انتہائی کوشش کے باوجود نہ پہنچ سکا، مجبور ہو کر بوسہ دیے بغیر پیچھے ہٹ آیا اور پاس ہی اس کیلیے ایک کرسی بچھا دی گئی جس پر وہ بیٹھ کر طواف کا نظارہ کرنے لگا۔

اسی دوران امام زین العابدینؒ آئے اور طواف کر کے حجرِ اسود کی طرف بڑھے۔ انہیں دیکھ کر ان کے احترام میں لوگ پیچھے ہٹ گئے اور ہجوم بالکل چھٹ گیا اور انہوں نے نہایت آسانی کے ساتھ حجرِ اسود کا بوسہ دیا۔

یہ منظر دیکھ کر ایک شامی آدمی نے ہشام سے پوچھا کہ یہ کون شخص ہے جس کی لوگوں کے دلوں میں اتنی محبت وعزت ہے؟ ہشام آپؒ کو جانتا تھا لیکن اس کے باوجود اس نے لاعلمی کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ میں نہیں پہچانتا۔ مشہور شاعر ''فرزدق'' بھی وہاں موجود تھا۔ اس عمداً لاعلمی کے اظہار کو دیکھ کر، اہلِ بیت سے اُس کی محبت جوش میں آگئی اور اس نے کہا: میں ان کو جانتا ہوں۔ شامی نے پوچھا: کون ہیں؟ فرزدق نے اسی وقت اہلِ بیت کی اس بزرگ ہستی کی شان میں عشق ومحبت سے لبریز ایک خوبصورت قصیدہ کہہ دیا۔ یہ قصیدہ بہت طویل ہے اور تاریخ کی متعدد کتابوں میں موجود ہے، ذیل میں اس کے صرف چند اشعار ذکر کیے جاتے ہیں:

هَـذَا ابْنُ خَيْرِ عِبَـادِ اللهِ كُلِّهِمُ ... هَـذَا التَّقِيُّ النَّقِيُّ الطَّـاهِرُ الْعَلَمُ

هَـذَا الَّذِي تَعْرِفُ الْبَطْحَـاءُ وَطْأَتَهُ ... وَالْبَيْتُ يَعْرِفُـهُ وَالْحِلُّ وَالْحَرَمُ

يَكَادُ يُمْسِكُهُ عِرْفَـانَ رَاحَتِـهِ ... رُكْنُ الْحَطِيمِ إِذَا مَا جَـاءَ يَسْتَلِمُ

مَا قَالَ "لَا" قَطُّ إِلَّا فِي تَشَهُّدِهِ ... لَوْ لَا التَّشَهُّدُ كَانَتْ لَاءَهُ "نَعَمُ"

إِذَا رَأَتْهُ قُرَيْشٌ قَـالَ قَائِلُهَـا ... إِلَى مَكَارِمِ هَـذَا يَنْتَهِي الْكَـرَمُ

إِنْ عُدَّ أَهْلُ التُّقَى كَانُوا أَئِمَّتَهُمْ ... أَوْ قِيلَ مَنْ خَيْرُ أَهْلِ الْأَرْضِ قِيلَ هُمُ

هَذَا ابْنُ فَاطِمَـةَ إِنْ كُنْتَ جَـاهِلَهُ ... بِجَدِّهِ أَنْبِيَـاءُ اللهِ قَـدْ خُتِمُوا

فَلَيْسَ قَوْلُكَ " مَنْ هٰذَا؟ " بِضَائِرِهِ ... الْعَرَبُ تَعْرِفُ مَنْ أَنْكَرْتَ وَالْعَجَمُ

يُغْضِي حَيَـــاءً وَيُغْضَى مِنْ مَهَابَتِـــهِ ... فَمَـــا يُكَلَّمُ إِلَّا حِينَ يَبْتَسِمُ

ترجمہ:

۱-یہ اللہ کے بندوں میں سے بہترین کی اولاد ہے۔ یہ متقی، پاک صاف اور سردار ہے۔ ۲-یہ وہ شخص ہے جس کے قدم کو سارا مکہ جانتا ہے، یہ وہ شخص ہے جس کو بیت اللہ جانتا ہے۔ اس کو تو حِل و حرم جانتے ہیں۔ ۳-یہ وہ شخص ہے کہ جب حجرِ اسود کا بوسہ دینے کیلیے اس کے قریب جائے، تو اس کے ہاتھوں کو پہچان کر قریب ہے کہ حجرِ اسود کا کونہ اس کے ہاتھوں کو پکڑ لے۔ ۴-یہ وہ شخص ہے جس نے کبھی ''لا'' نہیں کہا (''لا'' کا مطلب ہے ''نہیں''، یعنی کبھی کسی مانگنے والے کو انکار نہیں کیا)۔ اور سوائے کلمہ طیبہ کے کہ اس میں لا الٰہ میں 'لا' کہنا پڑتا ہے اس کی مجبوری ہے اور یہ ہر التحیات میں پڑھا جاتا ہے اگر یہ مجبوری نہ ہوتی تو اس کی زبان سے 'لا' کبھی نہ نکلتا۔ ۵-جب قبیلہ قریش جو کرم و شرافت میں مشہور قبیلہ ہے اس کو دیکھتا ہے تو کہنے والا بے ساختہ کہہ دیتا ہے کہ اس کے اخلاق پر کرم کی انتہاء ہے یعنی اس سے زیادہ کریم کوئی نہیں۔ ۶-اور جب کہیں اہلِ تقویٰ کا شمار ہونے لگے تو یہی لوگ اس میں بھی مقتدا ہوں گے اور جب یہ پوچھا جائے کہ دنیا کی بہترین ہستیاں کون ہیں؟ تو انہی لوگوں کی طرف انگلیاں اٹھیں گی۔ ۷-اور ہشام! اگر تُو اس کو نہیں جانتا تو سُن! یہ فاطمہ ؓ کی اولاد ہے اور اسی کے نانا (ﷺ) پر نبوت ختم کر دی گئی ہے۔ ۸-تیرا یہ کہنا کہ یہ کون ہے، اس کو عیب نہیں لگاتا۔ جس کے پہچاننے سے تُو نے انکار کر دیا، اس کو عرب جانتا ہے عجم جانتا ہے۔ ۹-یہ وہ شخص ہے جو شرم کی وجہ سے اپنی آنکھ نیچے رکھتا ہے اور ساری دنیا اس کی عظمت اور ہیبت سے آنکھ نیچے رکھتی ہے، کوئی شخص اس وقت تک رعب کی وجہ سے اس کے سامنے بات نہیں کر سکتا جب تک وہ خندہ پیشانی سے پیش نہ آئے۔

یہ قصیدہ سن کر ہشام، فَرَزدق سے بگڑ گیا اور اس کو جیل میں ڈلوا دیا۔ امام زین العابدین نے اس قصیدہ کے انعام کے طور پر فرزدق کو بارہ ہزار درہم عطا فرمائے (جن کی مالیت اس وقت تقریباً چوبیس لاکھ روپے بنتی ہے)۔ فرزدق

نے یہ کہہ کر انعام واپس کر دیا کہ میں نے اللہ ورسول کی خوشنودی کیلیے آلِ رسول کی تعریف کی تھی، انعام کی طمع میں نہیں۔امام زین العابدین نے اس پیغام کے ساتھ پھر اس کے پاس بھجوا دیا کہ ہم اہلِ بیت جب کسی کو کچھ دیتے ہیں تو پھر واپس نہیں لیتے۔ اللہ تعالیٰ تمہاری نیت سے واقف ہے، وہ اس کا اجر علیحدہ دے گا، اللہ تعالیٰ تمہاری اس کاوش کو قبول فرمائے۔ اس پیغام کے بعد تعمیلِ ارشاد میں فرزدق نے وہ انعام لے لیا۔[1]

ایک روایت میں ہے کہ ہشام کے والد عبدالملک بن مروان نے مدح وتعریف سے بھرا ہوا فرزدق کا یہ قصیدہ سنا تو اس نے فرزدق سے کہا: کیا تو رافضی (یعنی شیعہ) ہے؟ فرزدق نے جواباً کہا کہ اگر آلِ رسول سے محبت کا نام ہی رافضیت ہے تو پھر میں رافضی ہی ہوں۔ عبدالملک نے اسے حکماً کہا: تم میری تعریف میں بھی اُسی طرح کے اشعار کہو جس طرح تم نے علی بن حسینؓ کی شان میں کہے ہیں۔ اور بیت المال سے جو تمہیں وظیفہ ملا کرتا ہے وہ میں دگنا کر دوں گا۔

فرزدق نے آلِ بیت کی محبت میں ڈوب کر عجب جواب دیا اور نہایت جرأت سے کہا:

وَتَجِيئُنِي بِأَبٍ مِثْلَ أَبِيهِ، وأُمٍّ بِمِثْلِ أُمِّهِ حَتّى أَقُولَ فِيكَ مِثْلَ مَا قُلْتُهُ فِيهِ. أَتَقُولُ هٰذَا وَلَا تَسْتَحْيِي مِنَ اللّٰهِ عَزَّ وَجَلَّ! مُرْ حَتّى تُسْقِطَ اسْمِي مِنَ الدِّيوَانِ جُمْلَةً.

"عبدالملک! پہلے اُن کے باپ جیسا تُو باپ لے آ اور اُن کی ماں جیسی ماں لے آ، پھر میں اس جیسا قصیدہ تیری شان میں کہوں گا، اور مجھ سے یہ مطالبہ کرتے ہوئے تجھے اللہ سے حیا نہیں آتی۔ میرا نام وظیفہ والے رجسٹر سے مٹانا ہے تو مٹا دے۔" اس پر عبدالملک نے غصہ میں آ کر اس کا وظیفہ ختم کر دیا۔

حضرت علی بن حسینؒ کو جب اس ماجرا کی خبر ملی تو آپؒ نے فرزدق کو بلوا کر ان سے کہا: ابو فراس! (یہ فرزدق کی کنیت ہے)۔ جو کچھ میرے پاس ہے یہ سب لے لو، اور بات یہ ہے کہ یہ سب کچھ دے کر بھی میں نے تمہارا بدلہ نہیں چکایا۔ فرزدق نے کچھ لینے کے بجائے عرض کی: اے رسول اللہ کے صاحبزادے! میں نے آپ کی شان میں یہ قصیدہ مال وانعام کی طمع میں نہیں کہا تھا، اس کا بدلہ میں آپ سے نہیں لینا چاہتا بلکہ اللہ سے میں اس کے بدلہ کی امید رکھتا ہوں۔ اور اللہ کے ہاں سے اس پر جو کچھ ملے گا، وہ عبدالملک کی ساری بادشاہت سے مجھے زیادہ عزیز ہے۔

---

(1) ینظر: شجرة الأشراف، ص: ۲۲۳ أما ترتیب الأبیات فمن "روض الریاحین، الحکایة: ۱ ء وترجمتها إلی الأردیة فمن فضائل حج، ص: ۲۲۲، وهذه القصة قد تداولتها عشرات المصادر علی اختلاف سبلها وأنواعها. إن شئت القصة بتفاصیلها وأبیات القصیدة بأکملها فراجع: البدایة والنهایة طهجر: ۱۲/ ۳۹۲، وتاریخ دمشق لابن عساکر: ۴۱/ ۴۰۰، وجواهر العقدین: ۲/ ۳۳۹

یہ جواب سن کر امام زین العابدینؒ نے فرمایا: ویسے تمہیں وہ کتنا وظیفہ دیا کرتا تھا جو اب اس نے ختم کر دیا ہے؟ انہوں نے کہا: سالانہ بارہ ہزار درہم۔ آپؒ نے چار سال کی مجموعی رقم یعنی اڑتالیس ہزار درہم اسی وقت ان کو دیے اور قبول کرنے پر اصرار کیا، چناں چہ انہوں نے وہ قبول کر لیے۔ [1]

اہلِ مدینہ کی مالی مدد:

مدینہ طیبہ میں بہت سارے ایسے لوگ رہ رہے تھے جنہیں خود یہ معلوم نہ تھا کہ ان کی روزی کا بندوبست کہاں سے ہو رہا ہے۔ جب حضرت علی بن حسینؒ کا انتقال ہوا اور وہ روزی آنا بند ہو گئی تو معلوم ہوا کہ آپؒ کے واسطے سے ان کا یہ نظام چل رہا تھا، وہ بھی اس طرح کہ رات کی تاریکیوں میں آپؒ چپکے سے ان لوگوں کے گھر اشیائے خورد ونوش پہنچاتے تھے۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ آپؒ آٹا اور دیگر ضروری سامان کی بوریاں خود اپنی پیٹھ پر لاد کر مدینہ کے فقراء اور بیوہ خواتین کے گھر پہنچا آتے تھے اور کسی کو اس کا علم تک نہ تھا۔ انتقال کے بعد جب آپؒ کو غسل دیا جا رہا تھا تو غسل دینے والوں نے دیکھا کہ آپؒ کی کمر اور مونڈھوں پر سیاہ نشانات ہیں جو ان بوریوں کو اٹھا اٹھا کر آپؒ کے بدن مبارک پر پڑ گئے تھے۔ اہلِ مدینہ کے تقریباً سو (۱۰۰) گھرانے ایسے نکلے جن کی کفالت آپؒ فرما رہے تھے۔ آپؒ کا ایک فرمان بھی ہے: إِنَّ صَدَقَةَ السِّرِّ تُطْفِئُ غَضَبَ الرَّبِّ ''خفیہ صدقہ اللہ کے غصے کو دور کرتا ہے''۔

ایک دفعہ آپؒ مشہور صحابی اسامہ بن زیدؓ کے صاحبزادے 'محمد' کی عیادت کیلیے تشریف لے گئے۔ عیادت کے دوران اُن کی آنکھوں سے آنسو نکل آئے۔ آپؒ نے اس رونے کی وجہ دریافت فرمائی تو انہوں نے بتایا: دراصل میرے اوپر قرض ہے جو ابھی تک ادا نہیں کر سکا (اور موت کا وقت قریب لگ رہا ہے)۔ آپؒ نے پوچھا: کتنا ہے؟ جواب دیا: پندرہ ہزار دینار (جس کی موجودہ مالیت تقریباً ۲۴ کروڑ روپے بنتی ہے)۔ آپؒ نے فرمایا: آپ فکر نہ کریں، وہ میرے ذمہ ہو گیا میں ادا کر دوں گا۔ [2]

---

(۱) علماء أهل البيت في عصر التابعين، ص: ۲۷۶ الهامش، رقم: ۱ نقلا عن أمالي المرتضى.

(۲) مستفاد من: البداية والنهاية طهجر: ۱۲/ ۳۸۳، وصفة الصفوة: ۱/ ۳۵۵

ارشادات ونصائح

آپ سلام اللہ و رحمۃ علیہ، نے اپنی حیاتِ طیبہ میں مختلف مواقع پر بہت سارے حکیمانہ اقوال، قیمتی ارشادات اور مفید نصائح فرمائیں جو انسان کو عملی زندگی میں بہت کام دیتی ہیں، اسی فائدے کے پیشِ نظر ان میں سے بعض درج ذیل ہیں:

(۱) مجھے تعجب ہے اکڑنے اور اِترانے والے شخص پر جو کل تک ناپاک قطرۂ منی تھا اور پھر کل مردار ہو جائے گا۔ اور مجھے بہت زیادہ تعجب ہے اس شخص پر جو اس فناء ہونے والے گھر کیلیے تو عمل کرتا ہے اور باقی رہنے والے گھر کو چھوڑ دیتا ہے۔[۱]

(۲) جو اللہ تعالیٰ کی تقسیم کردہ روزی پر راضی ہو وہ سب سے مالدار ہے۔[۲]

(۳) اصل پردیس یہ ہے کہ آدمی کے دوست نہ ہوں۔[۳]

(۴) دنیا کے بڑے لوگ سخی اور متقی ہیں، اور آخرت کے بڑے لوگ دیندار حضرات اور علماء کرام ہیں کہ علماء کرام تو انبیاء کے وارث ہیں۔[۴]

(۵) لوگو! اسلامی حدود کے اندر رہتے ہوئے، اللہ کی رضا کیلیے ہمارے ساتھ محبت کرو، کہ تم میں سے بعض لوگوں کی عقیدت ومحبت ہمارے لیے عزت وشرف کے بجائے عار بن گئی ہے۔ اور سنو! ہمیں ہمارے حق سے زیادہ اوپر نہ اٹھاؤ۔[۵]

(۶) کچھ لوگ خوف سے اللہ کی عبادت کرتے ہیں یہ غلاموں کی عبادت ہے، کچھ امید وطمع میں عبادت کرتے ہیں یہ تاجروں کی عبادت ہے اور کچھ خالص شکرِ الٰہی میں عبادت کرتے ہیں یہی ''اَحرار'' (آزاد لوگوں) کی عبادت ہے۔[۶]

---

(۱) ینظر: صفة الصفوة: ۱/۳۵۵، وإسعاف الراغبين للصبان ص: ۲۲۰

(۲) حلية الأولياء وطبقات الأصفياء: ۳/۱۳۵

(۳) صفة الصفوة: ۱/۳۵۴، والبداية والنهاية طهجر: ۱۲/۴۸۵

(۴) البداية والنهاية طهجر: ۱۲/۴۸۷

(۵) ینظر: حلية الأولياء وطبقات الأصفياء: ۳/۱۳۶، ۱۳۷

(۶) صفة الصفوة: ۱/۳۵۴، والبداية والنهاية طهجر: ۱۲/۴۸۵

وفات:

۱۴ ربیع الاول منگل کی شب، ۹۴ھ کو آپؒ نے مدینہ طیبہ میں انتقال فرمایا۔ آپؒ کو اپنے چچا حضرت امام حسنؓ کے پاس جنت البقیع میں دفن کیا گیا۔ [1]

آپؒ نے وصیت فرمائی تھی کہ ان کے انتقال کی خبر کسی کو نہ دی جائے اور ان کو جلدی دفن کر دیا جائے۔ [2]

---

(۱) سیر أعلام النبلاء ط الرسالۃ: ۴/۴۰۰ مع وفیات الأعیان: ۳/۲۶۹

(۲) الطبقات الکبری ط العلمیۃ: ۵/۱۷۱

فضائل وخصائص

علماء نے لکھا ہے کہ آپؒ کے فضائل ومناقب بہت زیادہ ہیں،[1] تاہم آپؒ کے بعض مناقب ذیل میں درج کیے جاتے ہیں:

کثرتِ عبادت:

آپؒ نے اپنے آپ کو اس قدر عبادت میں لگایا کہ ''زین العابدین'' لقب پڑ گیا اور پھر اس عبادت میں بھی لمبے لمبے سجدے کرتے تھے جس سے آپؒ کو ''سجّاد'' کہا جانے لگا۔[2] غیر معمولی عبادت کی وجہ سے پڑنے والا آپؒ کا یہ لقب ''زین العابدین'' اتنا معروف ہوا کہ لوگ آپؒ کے اصلی نام (علی بن حسین) سے زیادہ آپؒ کے لقب (زین العابدین) سے واقف تھے۔[3]

کثرتِ سجود سے آپؒ کے گھٹنے ایسے سخت ہو گئے تھے جیسے اونٹ کے ہوتے ہیں۔ چناں چہ سجدوں کی ان کثرت کے سبب آپؒ کا ایک لقب ''ذُو الثَّفِنات'' (یعنی سخت گھٹنوں والے) بھی مشہور گیا تھا۔[4]

آپؒ کی عبادت کے سلسلہ میں ایک بات بہت ساری معتبر کتابوں میں لکھی ہے اور کافی مشہور ہے کہ آپؒ روزانہ (یعنی دن رات کے چوبیس گھنٹوں میں) ایک ہزار رکعات نفل پڑھا کرتے تھے۔[5] (اور یہ بظاہر آپؒ کی کرامت معلوم ہوتی ہے) اور آپؒ نے اس کو اس طرح نبھایا کہ زندگی بھر آپؒ کا یہ معمول رہا۔[6] اس کے ساتھ ساتھ آپؒ نے پوری زندگی سفر وحضر میں کبھی تہجد کی نماز نہیں چھوڑی۔[7]

حضرت طاؤس کہتے ہیں: میں نے حضرت علی بن حسینؒ کو بیت اللہ شریف کے پاس ''حطیم'' میں حالتِ سجدہ میں

---

(۱) آل رسول اللہ وأولیاؤہ، ص: ۱۸۸

(۲) موسوعۃ آل بیت النبی: ۲/۹۵۳ وغیرہ من کثیر من المصادر.

(۳) صور من حیاۃ التابعین، ص: ۳۴۳

(۴) تہذیب الکمال في أسماء الرجال: ۳۵/۴۲، ووفیات الأعیان: ۳/۲۷۴، ومروج الذہب: ۳/۱۳۳

(۵) البدایۃ والنہایۃ ط ہجر: ۱۲/۴۸۲، وصفۃ الصفوۃ: ۱/۳۵۷، ووفیات الأعیان: ۳/۲۷۴ وغیرہا.

(۶) سیر أعلام النبلاء ط الرسالۃ: ۴/۳۹۲

(۷) صفۃ الصفوۃ: ۱/۳۵۵، والطبقات الکبری للشعراني: ۱/۶۱

دیکھا تو میں نے اپنے جی میں کہا: یہ اہلِ بیت کے نیک صالح آدمی ہیں، مجھے ضرور سننا چاہیے کہ یہ سجدے میں کیا کہہ رہے ہیں۔ لہذا قریب جا کر میں نے کان لگایا تو وہ ان الفاظ سے اللہ تعالیٰ کے آگے آہ وزاری کر رہے تھے: عُبَیْدُکَ بِفِنَائِکَ، مِسْکِیْنُکَ بِفِنَائِکَ، سَائِلُکَ بِفِنَائِکَ، فَقِیْرُکَ بِفِنَائِکَ "اے اللہ! تیرا ادنیٰ سا بندہ تیرے گھر کے صحن میں حاضر ہے، تیرا مسکین و بے چارہ بندہ، تیرے در کا منگتا، اور تیرا فقیر بندہ تیرے در پہ حاضر ہے"۔ حضرت طاؤس کہتے ہیں: ربّ ذوالجلال کی قسم! اس کے بعد میں نے جب کبھی کسی مشکل میں اللہ پاک سے ان الفاظ سے دعا کی تو اللہ نے میری وہ مشکل حل فرما دی۔ [1]

علماء نے لکھا ہے کہ آپؒ "عابد" ہونے کے ساتھ ساتھ ایک "زاہد" (یعنی دنیا سے بے رغبت) انسان تھے۔ [2]

خشیتِ الٰہی اور خوفِ آخرت:

جب وضو کرتے تو آپؒ کا رنگ زرد پڑ جاتا، اسی طرح جب نماز کیلیے کھڑے ہوتے تو جسم پر کپکپی طاری ہو جاتی۔ کسی نے اس کا سبب پوچھا تو فرمایا: کیا تم جانتے نہیں ہو کہ ابھی کس کے سامنے کھڑا ہونے لگا ہوں اور کس سے مناجات (سرگوشی) کا وقت آ گیا ہے۔ [3]

یہ تو آپؒ کے وضو و نماز کا حال تھا۔ جب آپؒ حج کے لیے تشریف لے گئے اور تلبیہ پڑھنے (یعنی لبیک اللھم لبیک کہنے) کا وقت آیا تو جسم کانپ گیا، لبیک نہ کہہ سکے اور فرمایا: مجھے اس بات کا ڈر دامن گیر ہے کہ میں لبیک اللھم لبیک کہوں اور اللہ تعالیٰ آگے سے لا لبیک فرمائے (یعنی تیری لبیک قبول نہیں)۔ لوگوں نے ہمت بندھائی اور کہا کہ تلبیہ کہنا فرض ہے یہ تو بہر صورت کہنا ہوگا۔ چناں چہ آپؒ نے لبیک کہا اور بے ہوش ہو کر سواری سے نیچے گر گئے، اور تقریباً یہی کیفیت حج کے آخر تک برقرار رہی۔ [4]

ایک دفعہ آپؒ سجدے میں تھے اور اسی کمرے کو آگ لگ گئی جس میں آپؒ نماز پڑھ رہے تھے۔ لوگ چلاّتا

---

(۱) صفة الصفوة: ۱/۳۵۷ و مثله في البداية والنهاية ط هجر: ۱۲/۴۸۲

(۲) التبيين في أنساب القرشيين، ص: ۱۰۸

(۳) صفة الصفوة: ۱/۳۵۴، و البداية والنهاية ط هجر: ۱۲/۴۸۲

(۴) البداية والنهاية ط هجر: ۱۲/۴۸۲ مع سير أعلام النبلاء ط الرسالة: ۴/۳۹۲

شروع ہو گئے: اے رسول اللہ کے صاحبزادے! آگ!! آگ!!۔ مگر آپؒ اطمینان کے ساتھ اسی طرح سجدہ میں پڑے رہے اور نماز مکمل کی حتی کہ وہ آگ بھی بجھ گئی۔ بعد میں کسی نے کہا: کس چیز نے آپؒ کو غافل کر دیا تھا؟ فرمایا: أَلْهَتْنِي عَنْهَا النَّارُ الْأُخْرىٰ ''آخرت کی آگ نے اس آگ سے غافل کر رکھا تھا''۔[1]

خوف الٰہی کا یہ عالم تھا کہ جب ذرا تیز ہوا چلتی تو بسا اوقات غش کھا کر گر جاتے (کہ اس ہوا میں کہیں عذابِ الٰہی نہ ہو)۔[2]

تقویٰ و پرہیزگاری:

مشہور تابعی حضرت سعید بن مسیّبؒ کا بیان ہے: میں نے علی بن حسینؒ سے زیادہ متقی شخص نہیں دیکھا۔[3] اور آلِ رسول کی نسبت و نام سے لوگوں سے مال حاصل کرنے میں آپؒ کا اتنا پرہیز اور اسقدر احتیاط تھی کہ آپؒ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے رشتہ داری کی نسبت سے زندگی بھر لوگوں سے کبھی ایک درہم کا بھی فائدہ نہیں اٹھایا۔[4] آپؒ اس درجہ متقی تھے کہ لوگوں میں آپؒ کے تقویٰ، سخاوت اور برداشت کی مثالیں دی جاتی تھیں۔[5]

عجز و تواضع:

آپ سَلامُ اللّٰہِ وَرَحمۃُ علیہ، مجسمۂ تواضع تھے اور چال تو ایسی متواضعانہ تھی کہ چلنے میں دونوں ہاتھ رانوں سے آگے نہ بڑھنے پاتے تھے اور نہ ہی آپؒ کے ہاتھ کے اشاروں میں کوئی تکبر کی بُو ہوتی تھی۔ اور آپؒ اس کو پسند نہیں فرماتے تھے کہ کوئی آدمی آپؒ کی عقیدت میں آپؒ کو وضو کرائے۔[6]

آپؒ لوگوں میں وجیہ اور عظیم شخصیت ہونے کے باوجود ایک عام سے عام بلکہ کالے غلام تک کے پاس جا کر بیٹھ جاتے تھے۔[7]

---

(۱) صفة الصفوة: ۱/۳۵۴، والبداية والنهاية طهجر: ۱۲/۴۸۲

(۲) صفة الصفوة: ۱/۳۵۷، وروض الرياحين، ص: ۸۰

(۳) تذكرة الحفاظ للذهبي: ۱/۶۰، وإسعاف الراغبين للصبّان، ص: ۲۱۸

(۴) البداية والنهاية طهجر: ۱۲/۴۸۷

(۵) أحداث التاريخ الإسلامي بترتيب السنين: ۱/۴۳۲

(۶) صفة الصفوة: ۱/۳۵۴، والطبقات الكبرى للشعراني: ۱/۲۰، ۲۱

(۷) البداية والنهاية: ۱۲/۴۸۵، وحلية الأولياء وطبقات الأصفياء: ۳/۱۳۷

سخاوت:

آپؒ کی سخاوت کا یہ عالَم تھا کہ آپؒ نے زندگی میں دو مرتبہ اپنا سارا مال ہی اللہ تعالیٰ کے راستے میں تقسیم کر دیا تھا۔ اس کے علاوہ رات کو خفیہ طور پر بہت ہی زیادہ صدقہ کرتے تھے اور فرماتے تھے کہ رات کا صدقہ غضبِ الٰہی کو دُور کرتا ہے۔ [1]

آپؒ نے سفرِ حرمین شریفین کا ارادہ کیا تو آپؒ کی ہمشیرہ حضرت سکینہ بنت حسین نے آپؒ کے پاس ایک ہزار درہم کا زادِ راہ بھجوا دیا تا کہ سفر میں کام آسکے۔ راستہ میں ایک مقام پر آپؒ نے وہ سارا سامان غریب لوگوں میں تقسیم فرما دیا۔ [2]

سائل کے آنے پر آپؒ خوش ہوتے، اسے "مرحبا" (خوش آمدید) کہتے اور صدقہ دینے سے پہلے اس فقیر کا بوسہ لیتے پھر اس کو صدقہ دیتے اور اُس سے فرماتے: تم کتنے اچھے آدمی ہو کہ آخرت کی طرف میرا توشہ لے کر جا رہے ہو۔ [3]

بہرحال آپؒ غریبوں و مسکینوں کا بہت خیال رکھتے تھے، ان پر ہمیشہ اپنا مال خرچ کرتے۔ حاجتمندوں کی ضرورتیں پوری کرنا آپؒ کی فطرتِ ثانیہ بن چکا تھا، آپؒ کی یہ ہمدردی و سخاوت اس حد تک پہنچ چکی تھی کہ کسی بھی حاجت مند کو آپؒ خالی نہیں لوٹاتے تھے۔ [4]

امر بالمعروف و نہی عن المنکر:

آپؒ کے نزدیک امر بالمعروف و نہی عن المنکر (یعنی نیکی کا حکم کرنے اور برائی سے روکنے) کی اتنی اہمیت تھی کہ آپؒ نے اس اہم فریضے کو چھوڑنے والے مسلمان کے بارے میں فرمایا کہ اس شخص نے تو گویا قرآن مجید کو ہی اپنی

---

(۱) البداية والنهاية طهجر: ۱۲/۴۸۳

(۲) صفة الصفوة: ۱/۳۵۵

(۳) صفة الصفوة: ۱/۳۵۵ مع حلية الأولياء وطبقات الأصفياء: ۳/۱۳۷

(۴) الإمام زيد بن علي، ص: ۳۶

پیٹھ پیچھے پھینک دیا ہے۔ [1]

خلفائے راشدین سے آپؒ کی عقیدت ومحبت:

ایک آدمی حضرت علی بن حسینؒ کے پاس آیا اور کہا: ابوبکرؓ وعمرؓ کا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاں کیا مقام ومرتبہ تھا۔ آپؒ نے فرمایا: جو اُن کا اس وقت مقام ومرتبہ ہے کہ ان کے پہلو میں آرام فرما ہیں۔ [2] اور حضرت عثمانؓ کے بارے میں آپؒ نے فرمایا کہ واللہ! ان کو ناحق قتل کیا گیا۔ [3]

صحابہؓ کی آپؒ سے عقیدت ومحبت:

حضرت رَزین بن عُبید کہتے ہیں: میں حضرت ابن عباسؓ کے پاس بیٹھا ہوا تھا کہ حضرت علی بن حسین (امام زین العابدین) تشریف لائے۔ ان کو دیکھ کر حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا: محبوب ہستی (حضرت حسینؓ) کے محبوب صاحبزادے کو ''خوش آمدید'' ہو۔ [4]

---

(۱) حلیۃ الأولیاء وطبقات الأصفیاء: ۳/۱۴۰

(۲) غایۃ المقصد فی زوائد المسند: ۳/۳۵۱ مع الاعتقاد للبیھقی ص: ۳۶۲، والبدایۃ والنھایۃ ط ھجر: ۱۲/۴۸۳

(۳) الطبقات الکبری ط العلمیۃ: ۵/۱۶۷

(۴) فضائل الصحابۃ لأحمد بن حنبل: ۲/۷۷۷

اخلاقِ حسنہ

لوگوں کو معاف کرنا:

ایک شخص نے آپؒ کو برا بھلا کہا، مگر آپؒ نے چشم پوشی سے کام لیا اور اس کی باتوں کی طرف کوئی توجہ نہ دی، جیسے گویا آپؒ سن ہی نہ رہے ہوں۔ یہ دیکھ کر اس نے آپؒ سے کہا: إِيَّاكَ أَعْنِي "میں تجھے ہی کہہ رہا ہوں"۔ آپؒ نے جواب دیا: وَعَنْكَ أُغْضِي "میں بھی آپ سے ہی چشم پوشی کر رہا ہوں"۔[1]

اسی طرح ایک اور شخص نے آپؒ کو سخت سست کہا تو آپؒ نے جواب میں بجائے کوئی سخت جملہ کہنے کے اس سے فرمایا: بھائی! بات یہ ہے کہ میرے اور جہنم کے درمیان ایک گھاٹی ہے اگر میں وہ پار کر گیا تو پھر مجھے تمہاری ان باتوں کی کوئی پروا نہیں ہے اور اگر میں اسے عبور نہ کر سکا اور وہیں پھنس گیا تو پھر جو تم کہہ رہے ہو میں اس سے بھی زیادہ کا مستحق ہوں۔ اس کے بعد اس کی طرف متوجہ ہو کر پوچھا: میرے لائق کوئی کام ہو تو میں آپ کے تعاون اور مدد کیلیے تیار ہوں۔ یہ کریمانہ اخلاق دیکھ کر وہ شخص بہت شرمندہ ہوا اور چلا گیا۔[2]

ایک آدمی آپؒ کے پاس آیا اور کہا کہ فلاں شخص نے آپ کو نہایت برا بھلا کہا ہے اور آپؒ کے بارے میں لوگوں کو بہت کچھ غلط کہا ہے۔ آپ ہمارے ساتھ اس کے پاس چلیے۔ آپؒ چل دیے اور ساتھ لے جانے والا آدمی یہ سمجھ رہا تھا کہ اب آپؒ اس سے اپنا بدلہ لیں گے، لیکن آپؒ جب اس کے پاس پہنچے تو اس سے کہا: بھائی! جو کچھ آپ نے میرے بارے میں کہا ہے اگر میں واقعی ایسا ہوں تو میری اللہ سے دعا ہے کہ اللہ مجھے معاف فرمائے اور اگر ایسا نہیں ہوں تو پھر میری دعا ہے کہ اللہ آپ کو معاف فرمائے۔ یہ کہا اور واپس آ گئے۔[3]

آپؒ ایک مرتبہ مسجد سے باہر نکلے تو راستہ میں ایک شخص نے آپؒ کو گالیاں دیں۔ آپؒ کے غلام اور خدام اس کی طرف لپکے مگر آپؒ نے ان سے فرمایا: اس شخص کو چھوڑ دو، کچھ نہ کہو۔ پھر خود اس کے پاس تشریف لے گئے اور فرمایا:

---

(۱) البداية والنهاية طهجر: ۱۲/۴۸۳، والطبقات الكبرى للشعراني: ۶۱/۱

(۲) إسعاف الراغبين للصبان ص: ۲۱۹، وموسوعة آل بيت النبي: ۳۰۱/۲

(۳) صفة الصفوة: ۳۵۴/۱، ونور الأبصار ص: ۱۹۱

مَا سَتَرَهُ اللّٰهُ عَنْکَ مِن عُیُوبِنَا أَکْثَرُ ''ہمارے جو گناہ اور عیب اللہ نے تمہاری نگاہوں سے چھپا رکھے ہیں وہ ان سے کہیں زیادہ ہیں جو تم کہہ رہے ہو''۔ اس کے بعد اس سے کہا: ہمارے لائق کوئی کام ہو تو ہم حاضر ہیں؟ یہ سن کر وہ آدمی تو پانی پانی ہو گیا اور آپؒ نے فی الوقت جو چادر اوڑھ رکھی تھی اسے ہدیہ کے طور پر دے دی اور اس کے علاوہ اس کو ایک ہزار درہم بھی دیے۔ اس ماجرا کے بعد وہ آدمی ایسا آپؒ کا عقیدت مند ہوا کہ آپ سے کہا کرتا تھا: میں گواہی دیتا ہوں کہ آپ پیغمبر کی اولاد میں سے ہیں۔[1]

لوگوں کو معاف کرنے کی مبارک عادت آپؒ میں اس قدر جگہ پکڑ چکی تھی کہ آپؒ جب بھی گھر سے باہر نکلتے تو یہ کہہ کر نکلتے تھے: اے اللہ! آج جو شخص بھی میری عزت کو داغدار کرے میں اس کو ابھی سے معاف کرتا ہوں۔[2]

حِلم (صفتِ برداشت):

ایک مرتبہ آپؒ کی باندی وضو کرانے کیلیے آپؒ کے اوپر پانی انڈیل رہی تھی، اسی اثناء میں اس کے ہاتھ سے اوپر سے لوٹا چھوٹا اور آپؒ کے چہرہ پر آ لگا جس سے چہرہ زخمی ہو گیا۔ اس پر جیسے ہی آپؒ نے اوپر باندی کی طرف سر اٹھایا تو اس نے فوراً کہا: اللہ تعالیٰ قرآن مجید میں فرماتا ہے: {وَالْكَاظِمِينَ الْغَيْظَ}[3] (یعنی متقی بندے غصے کو پی جانے والے ہوتے ہیں)۔ یہ سن کر آپؒ نے فرمایا: میں نے غصہ پی لیا۔ اس نے پھر اسی آیت کا اگلا حصہ پڑھا: {وَالْعَافِينَ عَنِ النَّاسِ} (اور وہ لوگوں کو معاف کرنے والے ہوتے ہیں)۔ آپؒ نے فرمایا: میں نے تمہیں معاف کر دیا۔ اُس نے پھر آیت کا آخری حصہ پڑھا: {وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِينَ} (اور احسان کرنے والوں سے اللہ محبت کرتا ہے)۔ آپؒ نے فرمایا: جا، تُو اللہ کیلیے آزاد ہے۔[4]

تاریخ میں آپؒ کی برداشت کا ایک عجب واقعہ مذکور ہے کہ آپؒ کا ایک غلام لوہے کی بڑی سیخ سے تنور میں کوئی

---

(۱) صفة الصفوة: ۱/۳۵۷ ومثله في البداية والنهاية ط هجر: ۱۲/۴۸۳، وصور من حياة التابعين، ص: ۳۴۶، وروض الرياحين، ص: ۸۱

(۲) البداية والنهاية ط هجر: ۱۲/۴۸۹

(۳) آل عمران: ۱۳۴

(۴) البداية والنهاية: ۱۲/۴۸۸ مع بريقة محمودية في شرح طريقة محمدية وشريعة نبوية في سيرة أحمدية: ۲/۲۲۶، ونهاية الأرب في فنون الأدب: ۲۱/۳۲۶

چیز بھون رہا تھا، وہ سیخ اس کے ہاتھ سے گری اور آپؒ کے چھوٹے بچے کے سر پر اتنے زور سے جا لگی کہ وہ اس سخت ضرب سے فوت ہو گیا۔ یہ منظر دیکھ کر آپؒ جلدی سے اٹھے اور بچے کے پاس پہنچے تو وہ انتقال کر چکا تھا۔ اس پر آپؒ نے اپنے غلام کو ایک لفظ بھی تنبیہ اور ڈانٹ ڈپٹ کا نہیں بولا بلکہ آپؒ نے اسی وقت غلام کو باپ جیسی شفقت دیتے ہوئے کہا: یَا بُنَيَّ! إِنَّکَ لَمْ تَتَعَمَّدْ ''میرے پیارے بیٹے! آپؒ نے یہ جان بوجھ کر تو کیا نہیں (اس لیے کوئی بات نہیں)''۔ پھر کمالِ اخلاق کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس سے فرمایا: ''جاؤ، تم آزاد ہو''۔ اس کے بعد بیٹے کی تجہیز و تکفین میں مشغول ہو گئے۔[1]

نرم مزاجی:

آپؒ سختی سے کوسوں دور، نہایت نرم مزاج انسان تھے۔ اور اس قدر مزاج میں نرمی تھی کہ انسان تو درکنار جانوروں تک کو بھی نہ مارتے تھے۔ چناں چہ لکھا ہے کہ آپؒ اپنے اونٹ پر مدینہ سے مکہ جاتے تھے اور پھر اس پر واپس مدینہ آتے تھے۔ اس پورے سفر میں آپؒ اس کو ایک مرتبہ بھی نہیں مارتے تھے۔[2]

---

(۱) البدایۃ والنہایۃ: ۱۲/ ۳۸۹، وصفۃ الصفوۃ: ۱/ ۳۵۷، وروض الریاحین، ص: ۸۱

(۲) حلیۃ الأولیاء وطبقات الأصفیاء: ۳/ ۱۳۳ مع الطبقات الکبری: ۵/ ۱۶۷

(۲) حضرت امام باقر سلامُ اللہ و رحمۃُ علیہ

(محمد بن علیؒ)

نام ونسب:

آپ سلامُ اللہ و رحمۃُ علیہ، کا نام ''محمد'' اور کنیت (بڑے بیٹے ''جعفر صادق'' کے نام کی نسبت سے [۱]) ''ابو جعفر'' تھی، [۲] جبکہ آپؒ کا لقب ''باقر'' تھا (عربی میں باقر کا معنی ہے: ''وسعت والا''؛ چونکہ آپؒ کا علم بہت وسیع تھا اس لیے آپؒ کو ''باقر'' کے عظیم الشان لقب سے نوازا گیا)۔ [۳]

امام زین العابدینؒ، آپؒ کے والد اور حضرت امام حسنؓ کی صاحبزادی ''حضرت ام عبداللہ'' آپؒ کی والدہ تھیں۔ نسب کے لحاظ سے آپؒ قریشی اور ہاشمی ہیں، [۴] لیکن آپؒ کو تاریخ کا یہ عظیم ترین اعزاز حاصل ہے کہ آپؒ پہلی شخصیت ہیں جن کے نسب میں حضرت امام حسنؓ اور امام حسینؓ دونوں حضرات کا نسب جمع ہے کہ آپؒ ماں کی طرف سے حسنی اور باپ کی طرف سے حسینی ہیں۔ [۵]

ولادتِ باسعادت:

آپؒ ۳ صفر المظفر، بروز منگل، ۵۷ھ میں مدینہ طیبہ میں پیدا ہوئے۔ [۶]

---

(۱) موسوعۃ آل بیت النبی: ۲/ ۴۳۹

(۲) البدایۃ والنھایۃ ط الفکر: ۹/ ۳۰۹

(۳) تاریخ الخمیس: ۲/ ۲۸۶، والقاموس المحیط ص: ۳۵۳

(۴) البدایۃ والنھایۃ ط الفکر: ۹/ ۳۰۹، والطبقات الکبری ط العلمیۃ: ۵/ ۲۴۶

(۵) علماء أھل البیت فی عصر التابعین: ۲۸۹، وآل البیت حول الرسول، ص: ۱۸۲

(۶) وفیات الأعیان: ۴/ ۱۷۴، والشذرات الذھبیۃ ص: ۸۱ مع الفصول المھمۃ ص: ۲۰۰

حلیہ مبارک:

آپؒ کا گندمی رنگ اور درمیانہ قد تھا۔ [1] ڈاڑھی کو خضاب لگاتے تھے۔ [2] اور یہ بھی فرمایا کرتے تھے: ''حِنَاء'' اور ''کَتَم'' ہم اہلِ بیت کا خضاب ہے۔ [3] (حناء تو سرخ مہندی کو کہتے ہیں اور 'کتم' ایک بُوٹی ہے جس کا رنگ تقریباً سیاہ ہوتا ہے، اس کو جب سرخ مہندی کے ساتھ ملا کر خضاب لگایا جاتا ہے تو بالوں کا رنگ سیاہی اور سرخی کے درمیان ہو جاتا ہے۔) [4]

لباس:

آپؒ عمدہ قسم کا لباس استعمال فرماتے تھے۔ آپؒ نے ''خَز'' (جو قیمتی اور خاص قسم کا ایک اونی کپڑا ہوتا ہے) کا جُبہ اور چادر دونوں استعمال فرمائی ہیں۔ بلکہ آپؒ فرمایا کرتے تھے: ہم آلِ محمد ''خَز، عُصفُر (زرد رنگ کی ایک بُوٹی) سے رنگا ہوا کپڑا، گیروی رنگ سے رنگا ہوا کپڑا اور یُمنہ (ایک قسم کی یمنی چادر)'' پہنا کرتے ہیں۔ آپؒ نے سرخ رنگ کی چادر بھی زیبِ تن فرمائی ہے۔ سر مبارک پر عمامہ باندھتے تھے اور اس کا شملہ پیچھے کی جانب چھوڑتے تھے۔ [5]

آپؒ انگوٹھی بھی پہنتے تھے اور اس انگوٹھی پر سورۂ بقرہ کی ایک آیت کا یہ حصہ نقش تھا: {اَلْقُوَّةَ لِلّٰهِ جَمِيْعًا} [البقرة: ۱۵۶] جس کا ترجمہ ہے کہ قوت وطاقت سب اللہ کی ہے، یعنی گویا اللہ کا طاقتور ہونا اور اپنا کمزور و بے بس ہونا ہر وقت اپنی نظروں کے سامنے رکھتے تھے۔ [6]

---

(۱) الفصول المهمة في معرفة أحوال الأئمة لابن الصباغ، ص: ۲۰۰

(۲) علماء أهل البيت في عصر التابعين، ص: ۳۳۹

(۳) الطبقات الكبرى ط العلمية: ۵/۲۴۸

ملحوظہ: یہ بھی آپؒ سے منقول ہے کہ ''وَسمہ'' ہم اہلِ بیت کا خضاب ہے، (ملاحظہ ہو: سیر أعلام النبلاء: ۴/۴۰۸۔ اور ''وسمہ'' ایک درخت کا نام ہے جس کے پتوں سے بالوں کو سیاہ خضاب لگایا جاتا ہے، ملاحظہ ہو: النهاية في غريب الحديث والأثر: ۵/۱۸۵، ومجمع بحار الأنوار: ۵/۵۴، ولسان العرب: ۱۲/۶۳۷۔ مطلب یہ ہے کہ جوانی کی عمر میں خضاب کی ضرورت پیش آنے پر ''وَسمہ'' ورنہ اسی ''حناء اور کتم'' کو استعمال فرمایا کرتے تھے۔

(۴) فتح الباري لابن حجر: ۱/۱۷۸، عمدة القاري: ۱۰/۳۵۵، ومشارق الأنوار على صحاح الآثار: ۱/۳۳۵

(۵) ينظر: الطبقات الكبرى ط العلمية: ۵/۲۴۷

(۶) حلية الأولياء وطبقات الأصفياء: ۳/۱۸۶

اولاد

صاحبزادے:

۱-جعفر، ۲-عبداللہ (ان دونوں کی والدہ ایک تھیں اور وہ حضرت ابوبکر صدیقؓ کی پوتی ''ام فَروہ'' تھیں)۔

۳-ابراہیم (ان کی والدہ ''ام حکیم بنت اُسَید'' تھیں)۔ ۴-علی (ان کی والدہ باندی تھیں)۔

صاحبزادیاں:

۱-زینب، ۲-ام سلمہ (ان دونوں کی والدہ باندی تھیں)۔ [۱]

آپؒ کی اس نیک بخت اولاد میں سے سب سے بڑے بیٹے حضرت جعفرؒ نے بہت فضل وکمال پایا اور امام جعفر صادقؒ کے نام سے مشہور ہوئے۔

علومِ دینیہ کی تحصیل وتدریس اور علمی مقام

علم میں اللہ تعالیٰ نے آپؒ کو بہت بلند مقام عطا فرمایا تھا، اور آپؒ امامِ مجتہد کے مرتبہ پر فائز تھے۔ [۲] آپؒ کا یہ علمی مقام ومرتبہ سب کے ہاں مسلَّم تھا۔ آپؒ وقت کے امام اور صاحبِ فضل وکمال عالم تھے، حتیٰ کہ مدینہ طیبہ کے جلیل القدر فقہاء اور ائمہ میں آپؒ کا شمار ہوتا تھا۔ [۳]

عبداللہ بن عطاء کہتے ہیں: میں نے بڑے بڑے علماء دیکھے کہ جب وہ امام باقرؒ کے پاس آ کر بیٹھتے تو اُن سے علم میں چھوٹے لگتے تھے، حتیٰ کہ میں نے ''حَکَم'' جیسے علامۂ وقت کو بھی دیکھا کہ وہ ان کے سامنے طفلِ مکتب معلوم ہوتے تھے۔ [۴]

لوگوں میں آپؒ کا یہ علمی مقام خود آپؒ کے لقب سے بھی واضح ہے کیونکہ آپؒ کا لقب (باقر) جہاں آپؒ کے علم کی

---

(۱) الطبقات الکبری: ۵/۲۴۶، وصفة الصفوة: ۱/۳۶۱، وتاریخ الخمیس: ۲/۲۸۶

(۲) سیر أعلام النبلاء ط الرسالة: ۴/۴۰۲، ووفیات الأعیان: ۴/۱۷۴

(۳) ینظر: تهذیب الأسماء واللغات: ۱/۸۷

(۴) البدایة والنهایة ط الفکر: ۹/۳۱۱ مع صفة الصفوة: ۱/۳۶۳، وحلیة الأولیاء وطبقات الأصفیاء: ۳/۱۸۶

وسعت بتلاتا ہے (جیسا کہ شروع میں گزرا) وہاں اس علم کی گہرائی کی خبر بھی دیتا ہے، کہ بہت سارے علماء نے لکھا ہے کہ آپؒ کو باقر کا لقب اس وجہ سے ملا کہ آپؒ قرآن وحدیث کی گہرائی تک پہنچ کر شریعت کے احکام نکال لاتے تھے اور مسئلے کی تہ تک پہنچ کر اس کے چھپے ہوئے پہلوؤں کا ادراک کر لیتے تھے۔[1]

جہاں تک علم کی تحصیل وتدریس کا معاملہ ہے تو آپؒ نے حضرت جابر انصاریؓ اور حضرت انس بن مالکؓ جیسے جلیل القدر صحابہ سے علم حاصل کیا،[2] اس کے علاوہ اپنے وقت کے بڑے بڑے تابعین سے علمی استفادہ کیا۔ تاہم جن حضرات سے آپؒ نے احادیث نقل کی ہیں ان میں حضرت عبداللہ بن عمرؓ، آپؒ کے والد امام زین العابدینؒ، اور مشہور محدث تابعی حضرت سعید بن مسیّبؒ کے نام سرفہرست ہیں۔[3]

اسی طرح آپؒ سے بھی بڑے بڑے ائمہ نے احادیث نقل کیں،[4] جیسے امام زہریؒ، امام ربیعۃ الرأی، امام اوزاعی اور آپؒ کے صاحبزادے امام جعفر صادقؒ وغیرہ وغیرہ۔[5] اور امامِ اعظم امام ابوحنیفہؒ نے بھی آپؒ سے احادیث نقل کی ہیں،[6] صرف احادیث ہی نقل نہیں کیں بلکہ آپؒ سے شریعت کے دیگر مسائل کا علم بھی حاصل کیا ہے یعنی امام ابوحنیفہ جیسی عظیم شخصیت آپؒ کے شاگردوں میں شمار ہوتی ہے۔[7]

بہر حال آپؒ نے جہاں حدیثِ رسول کی بہت خدمت کی اور کثرت سے لوگوں تک احادیثِ نبویہ پہنچائیں،[8] وہاں آپؒ فقہ میں بھی ایک ممتاز مقام رکھتے تھے۔ لوگوں کی کثیر تعداد نے آپؒ سے علمِ فقہ حاصل کیا۔ اور آپؒ کا یہ فقہی فیض دُور دُور تک عام ہوا یہاں تک کہ آپؒ "سید فقہاء الحجاز" (یعنی پورے حجازِ مقدس کے فقہاء ومفتیان کے سردار)

---

(۱) البداية والنهاية ط الفكر: ۳۰۹/۹ مع سير أعلام النبلاء ط الرسالة: ۴۰۲/۴، والوافي بالوفيات: ۷۷/۴

(۲) منهاج السنة النبوية: ۵۱/۴

(۳) سير أعلام النبلاء ط الرسالة: ۴۰۱/۴

(۴) البداية والنهاية ط هجر: ۷۲/۱۳

(۵) سير أعلام النبلاء ط الرسالة: ۴۰۱/۴ مع تهذيب الكمال في أسماء الرجال: ۱۳۸/۲۶، ۱۳۹

(۶) تذكرة الحفاظ = طبقات الحفاظ للذهبي: ۱۲۷/۱

(۷) الانتقاء في فضائل الثلاثة الأئمة الفقهاء ص: ۱۲۴

(۸) البداية والنهاية ط الفكر: ۳۰۹/۹

کے خوبصورت لقب سے یاد کیے جانے لگے۔[1]

آپؒ محدث وفقیہ ہونے کے علاوہ مفسر قرآن بھی تھے اور آیات کی بہت عمدہ تفسیر بیان کرتے تھے حتی کہ حضرت مالک بن اعیُن جُہنیؒ (۱۴۸ھ) نے فرمایا ہے کہ آپؒ اپنے زمانے کی واحد ومنفرد ہستی تھیں جن کو علومِ قرآن پر دسترس حاصل تھی۔[2]

الغرض آپؒ سرچشمۂ علم تھے۔ آپؒ کی گفتگو سے علم کے موتی بکھرتے تھے جنہیں چننے کیلیے لوگ مشتاق ہوتے، چناں چہ ابوحیان اندلسیؒ نے اپنی تفسیر میں لکھا ہے کہ جب آپؒ اپنے بھائی حضرت زید بن علیؒ کے ساتھ کسی علمی عنوان پر بات چیت فرماتے تو لوگ دواتیں لے کر جمع ہوجاتے۔ آپؒ دونوں حضرات کی باہمی گفتگو سے جو علمی نکات پھوٹتے وہ لوگ انہیں لکھ کر اپنے پاس محفوظ کرلیا کرتے۔[3]

آپؒ کا علم بہت پختہ تھا۔ عام لوگ تو درکنار، علماء کے سوالات کے بھی آپؒ فی الفور اور تسلی بخش جوابات دیتے تھے۔ اس بات کا اندازہ درج ذیل دو واقعات سے بآسانی کیا جاسکتا ہے:

(۱) ہشام بن عبدالملک اپنے دورِ حکومت میں حج پر گیا، ''حضرت نافع'' (جو حضرت عمر بن خطابؓ کے آزاد کردہ غلام تھے، وہ) بھی ساتھ تھے۔ حضرت نافع نے دیکھا کہ بیت اللہ کے پاس ایک شخص بیٹھا ہے جس کے گرد لوگوں کا مجمع لگا ہے۔ انہوں نے ہشام سے پوچھا کہ یہ کون ہے جس کے گرد ہجوم ہے؟ اس نے کہا: یہ محمد بن علی بن حسین (یعنی امام باقر) ہیں۔

حضرت نافع نے ہشام سے کہا: میں ان کے پاس جا کر کچھ خاص قسم کے سوالات کرتا ہوں۔ ہشام نے کہا: جاؤ، ضرور جاؤ۔ تاکہ اسے جوابات نہ آنے کی صورت میں شرمندگی کا منہ دیکھنا پڑے۔ وہ لوگوں کے مجمع میں آئے اور کہا: اے محمد بن علی! میں نے چاروں آسمانی کتابیں پڑھ رکھی ہیں۔ ان کتابوں میں موجود احکام ومسائل سے میں بخوبی واقف ہوں۔ میں آپ سے کچھ اہم سوالات کرنے آیا ہوں جن کا جواب کوئی نبی دے سکتا ہے یا پھر نبی کی اولاد میں

---

(۱) الرسائل السياسية للجاحظ ص: ۴۵۲

(۲) ينظر: الأعلام للزركلي: ۲۷۱/۶ مع علماء أهل البيت في عصر التابعين، ص: ۳۰۹-۳۰۰

(۳) البحر المحيط في التفسير: ۳۰۵/۹

سے کوئی فرد دے سکتا ہے۔ امام باقرؒ نے اپنا سر مبارک اوپر اٹھایا اور فرمایا: پوچھو، جو پوچھتے ہو۔ اس کے بعد انہوں نے خالص علمی نوعیت کے چند سوالات کیے جن میں سے ہر ہر سوال کا آپؒ نے فوراً مدلل اور صحیح جواب مرحمت فرمایا۔ ادھر ہشام انتظار میں تھا۔ سوالات ختم ہونے پر حضرت نافع ہشام کے پاس آئے تو ہشام نے کہا: سناؤ! کیا ہوا؟ انہوں نے کہا: هُوَ وَاللهِ أَعلَمُ النَّاسِ، وَهُوَ ابنُ رَسُولِ اللهِ حَقًّا ''مجھے رب ذوالجلال کی قسم! وہ اس وقت لوگوں میں سب سے بڑے عالم ہیں۔ اور واقعی وہ رسول اللہ ﷺ کی اولاد میں سے ہیں''۔[1]

(۲) اسی طرح کا ایک واقعہ طاؤس یمانی کے ساتھ بھی پیش آیا جس میں طاؤس نے آپؒ سے انوکھے اور عجیب وغریب قسم کے چودہ سوالات کیے جن کے آپؒ نے برموقع حیران کن جوابات ارشاد فرمائے:

طاؤس: کیا مجھے آپ سے سوال کرنے کی اجازت ہے؟

امام باقر: جی بالکل!! فرمایئے۔

طاؤس: حضرت آدم علیہ السلام کا نام ''آدم'' کس وجہ سے رکھا گیا؟

امام باقر: لفظِ ''آدم'' عربی کے لفظ ''ادیم'' سے بنایا گیا ہے جس کا معنی ہے: چمڑا، یا اوپر والی تہہ۔ چونکہ آدم علیہ السلام کی مٹی نچلی زمین والی تہہ سے اٹھائی گئی تھی اس لیے ان کا نام ''آدم'' رکھا گیا۔

طاؤس: حواء علیہا السلام کا نام ''حواء'' کیوں رکھا گیا؟

امام باقر: لفظِ حواء، عربی لفظ ''حی'' سے بنایا گیا ہے جس کا معنی ہے: ''زندہ''۔ چونکہ حواء علیہا السلام کو ایک زندہ انسان (یعنی آدم علیہ السلام) کی پسلی سے پیدا کیا گیا اس لیے آپ کا نام ''حواء'' رکھا گیا۔

طاؤس: ابلیس (یعنی شیطان) کو ''ابلیس'' کیوں کہا جاتا ہے؟

امام باقر: ''ابلیس'' کا معنی ہے: مایوس ہونے والا۔ چونکہ وہ اللہ تعالیٰ کی رحمت سے مایوس ہے اس لیے اسے ابلیس کہا جاتا ہے۔

طاؤس: جن کو جن کیوں کہا جاتا ہے؟

امام باقر: عربی میں ''جن'' کا معنی ہے: چھپی ہوئی چیز۔ چونکہ جنات لوگوں کو نظر نہیں آتے، اس لیے انہیں جن کہا

---

(۱) آل البیت حول الرسول، ص: ۱۸۵

جاتا ہے۔

طاؤس: وہ کون سا جھوٹ ہے جو سب سے پہلا بولا گیا؟ اور وہ کس نے بولا تھا؟

امام باقر: وہ جھوٹ شیطان نے بولا تھا اور وہ جھوٹ یہ تھا: {أَنَا خَيْرٌ مِنْهُ خَلَقْتَنِي مِنْ نَارٍ وَخَلَقْتَهُ مِنْ طِينٍ} [سورۃ الأعراف:۱۲) ترجمہ: میں آدم سے بہتر ہوں۔ تُو نے مجھے آگ سے پیدا کیا اور اس کو مٹی سے پیدا کیا)۔

طاؤس: اس رسول کے بارے میں بتائیں جس کو اللہ نے بھیجا، مگر وہ رسول نہ جنات میں سے تھا، نہ انسانوں میں سے اور نہ فرشتوں میں سے۔ اور اس رسول کا قرآن مجید میں تذکرہ بھی ہے۔

امام باقر: یہاں لفظِ ''رسول'' سے مراد ہے: کوئی بھی بھیجی جانی والی چیز۔ اور وہ ''کوا'' تھا جس کو اللہ تعالیٰ نے بھیجا تھا تاکہ وہ قابیل کو دکھائے کہ وہ اپنے بھائی ہابیل کو (جس کو اس نے قتل کر دیا تھا) کیسے زمین میں چھپائے۔

طاؤس: وہ کونسی چیز ہے جو بڑھتی بھی ہے اور گھٹتی بھی ہے؟ اور وہ کونسی چیز ہے جو گھٹتی ہے اور بڑھتی نہیں ہے؟ اور وہ کیا ہے جو نہ گھٹتی ہے، نہ بڑھتی ہے؟

امام باقر: جو چیز گھٹتی اور بڑھتی دونوں ہے وہ ''چاند'' ہے۔ جو گھٹتی ہے اور بڑھتی نہیں ہے وہ ''عمر'' ہے، اور جو نہ گھٹتی ہے نہ بڑھتی ہے وہ ''سمندر'' ہے۔

طاؤس: وہ کون لوگ تھے جنہوں نے سچی گواہی دی، مگر تھے وہ جھوٹے؟

امام باقر: وہ منافقین تھے جنہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے آ کر کہا تھا: ہم تو گواہی دیتے ہیں کہ آپ اللہ کے رسول ہیں، اس پر یہ آیت اتری تھی: {إِذَا جَاءَكَ الْمُنَافِقُونَ قَالُوا نَشْهَدُ إِنَّكَ لَرَسُولُ اللَّهِ وَاللَّهُ يَعْلَمُ إِنَّكَ لَرَسُولُهُ وَاللَّهُ يَشْهَدُ إِنَّ الْمُنَافِقِينَ لَكَاذِبُونَ} (سورۃ المنافقون:۱) ترجمہ: جب منافق لوگ تمہارے پاس آتے ہیں تو کہتے ہیں: ''ہم گواہی دیتے ہیں کہ آپ اللہ کے رسول ہیں''۔ اور اللہ جانتا ہے کہ آپ واقعی اس کے رسول ہیں، اور اللہ گواہی دیتا ہے کہ یہ منافق لوگ جھوٹے ہیں۔)

طاؤس: ایسے طائر (پرندے) کے بارے میں بتائیں جو ایک مرتبہ اڑا۔ وہ نہ اس سے پہلے کبھی اڑا اور نہ پھر کبھی اڑے گا؟ اور قرآن مجید میں اس طائر کا تذکرہ بھی آیا ہے۔ بتائیں وہ کیا ہے؟

امام باقر: یہاں ''طائر'' سے مراد ہے: ہر اڑنے والی شئ۔ اور وہ ''طور سیناء'' کا پہاڑ ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے ایک

مرتبہ اڑا کر بنی اسرائیل کے اوپر سائے کی طرح کھڑا کر دیا تھا اور اس پہاڑ میں مختلف قسم کے عذاب رکھ دیے تھے۔ اُسے دیکھ کر انہوں نے تورات کو قبول کر لیا تھا۔ اسی بات کی طرف قرآن مجید کی اس آیت میں اشارہ ہے: {وَإِذْ نَتَقْنَا الْجَبَلَ فَوْقَهُمْ كَأَنَّهُ ظُلَّةٌ وَظَنُّوا أَنَّهُ وَاقِعٌ بِهِمْ} [سورۃ الأعراف:۱۷۱] ترجمہ: اور جب ہم نے پہاڑ کو ان کے اوپر اس طرح اٹھا دیا تھا جیسے وہ کوئی سائبان ہو، اور انہیں یہ گمان ہو گیا تھا کہ وہ ان کے اوپر گرنے ہی والا ہے۔)

طاؤس: اُس کے بارے میں بتائیں جو اپنی قوم کی طرف ''نذیر'' (ڈرانے والا) بن کر آیا تھا لیکن نہ وہ جنات میں سے تھا، نہ انسانوں میں سے اور نہ فرشتوں میں سے۔ اور اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں اس کا تذکرہ بھی کیا ہے۔

امام باقر: وہ چیونٹی تھی جس نے سلیمان علیہ السلام کے لشکر کو آتا دیکھ کر کہا تھا: {يَا أَيُّهَا النَّمْلُ ادْخُلُوا مَسَاكِنَكُمْ لَا يَحْطِمَنَّكُمْ سُلَيْمَانُ وَجُنُودُهُ وَهُمْ لَا يَشْعُرُونَ} [سورۃ النمل:۱۸] ترجمہ: اے چیونٹیو! اپنے اپنے گھروں میں گھس جاؤ، کہیں ایسا نہ ہو کہ سلیمان اور ان کا لشکر تمہیں پیس ڈالے، اور انہیں پتا بھی نہ چلے۔)

طاؤس: وہ کون تھا جس کے خلاف جھوٹ بولا گیا لیکن نہ وہ جنات میں سے تھا، نہ انسانوں میں سے اور نہ فرشتوں میں سے۔ اور اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں اس کا تذکرہ بھی کیا ہے؟

امام باقر: وہ بھیڑیا تھا جس کے خلاف حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائیوں نے جھوٹ بولا تھا کہ اس نے یوسف کو کھا لیا ہے۔

طاؤس: وہ کونسی چیز ہے جس کی تھوڑی مقدار تو حلال ہے مگر زیادہ مقدار حرام ہے اور اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں اس کو ذکر بھی کیا ہے؟

امام باقر: وہ نہرِ طالوت ہے جس کا ذکر قرآن مجید میں اس طرح آیا ہے: {فَلَمَّا فَصَلَ طَالُوتُ بِالْجُنُودِ قَالَ إِنَّ اللَّهَ مُبْتَلِيكُمْ بِنَهَرٍ فَمَنْ شَرِبَ مِنْهُ فَلَيْسَ مِنِّي وَمَنْ لَمْ يَطْعَمْهُ فَإِنَّهُ مِنِّي إِلَّا مَنِ اغْتَرَفَ غُرْفَةً بِيَدِهِ} [البقرۃ:۲۴۹] ترجمہ: چناں چہ جب طالوت لشکر کے ساتھ روانہ ہوا تو اس نے (لشکر والوں سے) کہا کہ: ''اللہ تعالیٰ ایک دریا کے ذریعہ تمہارا امتحان لینے والا ہے۔ جو شخص اس دریا سے پانی پیئے گا وہ میرا آدمی نہیں ہوگا، اور جو اسے نہیں چکھے گا وہ میرا آدمی ہوگا، ہاں اگر کوئی اپنے ہاتھ سے ایک چلو بھر یعنی تھوڑا سا پانی لے لے (تو اس کی اجازت ہے)۔]

طاؤس: وہ کونسی صلاۃ (نماز) ہے جو فرض ہے اور بغیر وضو ادا ہو جاتی ہے؟ اور وہ کونسا روزہ ہے جس میں کھانا پینا منع نہیں ہے؟

امام باقر: یہاں "صلاۃ" سے مراد نبیٔ کریم ﷺ پر بھیجا جانے والا صلاۃ وسلام ہے اور وہ بغیر وضو بھیجنا جائز ہے۔ اور روزے سے مریم علیہا السلام کا روزہ مراد ہے جس کا ذکر قرآن مجید کی اس آیت میں ہے: {إِنِّي نَذَرْتُ لِلرَّحْمَٰنِ صَوْمًا فَلَنْ أُكَلِّمَ الْيَوْمَ إِنسِيًّا} [مریم:۲۶] ترجمہ: آج میں نے رحمن یعنی اللہ کیلیے ایک روزے کی منت مانی ہے، اس لیے میں کسی بھی انسان سے بات نہیں کروں گی۔ (دراصل حضرت مریم علیہا السلام کے زمانے کی شریعت میں چپ رہنے کا روزہ جائز تھا، جس میں کھانے پینے کی اجازت ہوتی تھی البتہ بات چیت کرنا منع ہوتا تھا۔ ہماری شریعتِ محمدیہ میں اب اس طرح کا روزہ رکھنا جائز نہیں ہے)]۔[1]

آپؒ کے وسعتِ علم کی ایک علامت یہ بھی تھی کہ آپؒ الفاظ کے مطالب ومعانی کی پوری حقیقت تک سے واقفیت رکھتے تھے۔ جس کا ہلکا سا نمونہ اس واقعہ سے بھی ظاہر ہوتا ہے:

آپؒ کے صاحبزادے امام جعفر صادقؒ بیان کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ میرے والد صاحب (یعنی امام باقرؒ) کا خچر گم ہو گیا۔ آپؒ نے کہا: اگر اللہ تعالی نے مجھے وہ واپس دے دیا تو میں اللہ پاک کی ایسی تعریفیں کروں گا جو اللہ کو پسند آئیں گی۔ ابھی تھوڑی دیر ہی گزری تھی کہ وہ خچر اپنی زین ولگام سمیت سامنے آن کھڑا ہوا، اس میں سے کوئی چیز بھی گم نہیں ہوئی تھی۔ آپؒ اٹھ کر اس پر سوار ہوئے۔ جب اس پر بیٹھ گئے اور اپنے کپڑے سمیٹ لیے تو آسمان کی طرف سر اٹھایا اور کہا: الحمدُ للہ، اس کے علاوہ ایک لفظ بھی نہیں کہا۔ ان سے کہا گیا کہ آپؒ نے تو صرف ایک ہی لفظ کہا ہے الحمدُ للہ، اور کوئی تعریف بھی نہیں کی؟ اس پر آپؒ نے فرمایا: کیا میں نے کچھ چھوڑا بھی ہے؟ میں نے اس ایک لفظ میں ہی ہمہ قسمی تعریف اللہ کی پاک ذات کیلیے خاص کر دی ہے۔ کہ لفظِ الحمد تمام تعریفوں کو شامل ہے۔[2]

---

(۱) آل البیت حول الرسول، ص: ۱۸۷

(۲) البدایۃ والنہایۃ ط الفکر: ۹/ ۳۱۱ مع صفۃ الصفوۃ: ۱/ ۳۶۳

ہشام کا آپؒ کو جیل میں قید کرنا:

حضرت امام باقر سَلامُ اللہِ وَ رَحمۃُ علیہ، کے فضل وکمال اور نیک نامی کی شہرت جب عام ہوگئی تو ہشام بن عبدالملک نے حسد وبغض کی وجہ سے آپؒ کو گرفتار کر کے جیل میں قید کردیا۔ جب آپؒ جیل پہنچے تو کچھ ہی عرصہ میں آپؒ کے ساتھ موجود دوسرے قیدی آپؒ کے اخلاق اور علم وکمال کی وجہ سے آپؒ کے قریب ہونا شروع ہوگئے اور آپؒ سے مختلف علوم وآداب سیکھنے لگے۔ یہ منظر دیکھ کر جیل کے نگران نے ہشام کو ساری صورتِ حال سے آگاہ کیا کہ جیل کے اندر بھی اسکی مقبولیت ہونے لگی ہے اور لوگ اس سے علوم حاصل کرنا شروع ہوگئے ہیں۔ ہشام نے حکم دیا کہ اسے جیل سے نکال کر واپس اپنے وطن (مدینہ) بھیج دیا جائے۔

ہشام نے اِدھر حضرت امام باقرؒ کو حکم جاری کردیا کہ دمشق چھوڑ کے چلے جاؤ اور اُدھر دمشق سے مدینہ جانے والے راستوں کے بازاروں میں اپنا یہ حکم نامہ بھجوادیا کہ ''محمد بن علی'' (یعنی امام باقرؒ) کو کوئی شخص کھانے پینے وغیرہ کی کوئی چیز نہ بیچے حتی کہ اس کے وہاں سے گزرنے کے دوران کوئی شخص دکان بھی کھلی نہ رکھے تاکہ (نعوذ باللہ) یہ بھوکا مرجائے۔

آپؒ کا قافلہ چلتا رہا یہاں تک کہ بھوک وپیاس نے بے تاب کردیا۔ اسی دوران یہ مبارک قافلہ ایک شہر میں داخل ہوا۔ آپؒ کے قافلہ کی اطلاع پاتے ہی اہلِ شہر نے حکمِ شاہی کے موافق اپنی دکانیں بند کردیں۔ جب یہ صورتِ حال دیکھی تو آپؒ قریب ہی ایک پہاڑ پر چڑھ گئے اور اونچی آواز میں وہاں کے لوگوں کو مخاطب کر کے کہا: اے اپنی جانوں پر ظلم کرنے والے باشندو! میں ''بَقِیَّۃُ اللّٰہ'' ہوں، (یعنی اللہ کی طرف سے، اہلِ بیت میں سے بچا ہوا اُس کا بندہ ہوں)، اور اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: {بَقِیَّتُ اللّٰہِ خَیْرٌ لَّکُمْ إِنْ کُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ} [سورۃ ہود:۸۶] ترجمہ: ''بَقِیَّۃُ اللّٰہ'' (یعنی اللہ کی طرف سے دیے ہوئے مال میں سے، اداءِ حقوق کے بعد بچا ہوا مال) تمہارے لیے بہتر ہے اگر تم ایمان والے ہو۔} [1]

آپؒ نے ابھی اتنی بات ہی کہی تھی کہ اسی شہر کا ایک بوڑھا شخص جلدی سے آیا اور اپنے شہر کے لوگوں کو بلند آواز

---

(۱) مستفاد من معارف القرآن: ۴/۶۵۲

ملحوظہ: حضرت شعیب علیہ السلام نے اپنی قوم کو عذابِ الٰہی سے ڈراتے ہوئے اور مال سے متعلقہ احکامات بتاتے ہوئے یہ بات کہی تھی: بَقِیَّتُ اللّٰہِ خَیْرٌ لَّکُمْ......

میں پکار کر کہا: لوگو! اللہ کی قسم! یہ وہی الفاظ ہیں جن سے حضرت شعیب علیہ السلام نے اپنی قوم کو پکارا تھا (اور اس قوم نے ان کی پکار پر کوئی توجہ نہیں دی تھی جس کے نتیجہ میں ان پر عذابِ الٰہی مسلط کر دیا گیا تھا)۔ واللہ! اگر تم لوگوں نے اس قافلہ والوں کیلیے اپنی دکانیں نہ کھولیں تو اللہ کا عذاب تمہیں اوپر سے اور نیچے سے آ پکڑے گا پھر تم بچ نہ پاؤ گے۔ اس دفعہ میری بات تسلیم کرلو اور میرا کہنا مان لو، بھلا اس کے بعد تم کبھی میری بات نہ ماننا۔ سنو! میں اس وقت تمہارا خیر خواہ ہوں۔

اس بوڑھے کی یہ باتیں سن کر بستی والے گھبرا گئے اور اس کی بات مان لی اور آ کر ان کیلیے دکانیں کھول دیں۔ امام باقرؒ نے اپنی اشیاء ضرورت خریدیں اور آگے چل دیے۔ اس طرح اللہ تعالیٰ نے اپنے نیک بندے کی حاجت روائی کی اور ہشام کے بادشاہ ہونے کے باوجود اس کی تدبیر کو خاک میں ملا دیا۔[1]

سفرِ حج اور آہ و بکاء:

آپ سلامُ اللہ وَ رَحمۃُ علیہ، اپنے غلام ''افلح'' کے ساتھ حج پر تشریف لے گئے۔ جب مسجد حرام میں داخل ہوئے اور بیت اللہ شریف پر نظر پڑی تو اتنا روئے کہ چیخیں نکل گئیں۔ افلح کہتے ہیں: میں نے عرض کی: میرے ماں باپ آپؒ پر قربان ہوں! آپ آواز ذرا آہستہ کریں کہ اس زور دار رونے سے لوگوں کی نظریں آپ پر لگ گئی ہیں۔ آپؒ نے فرمایا: میں کیوں نہ روؤں؟ شاید اس رونے کو دیکھ کر اللہ تعالیٰ میرے اوپر اپنی نظرِ رحمت فرمائے اور میں روزِ محشر کامیاب ہو جاؤں۔

اس کے بعد آپؒ نے طواف کیا اور طواف ختم کر کے مقامِ ابراہیم پر پہنچے، دو نفل ادا کیے اور سجدے میں اتنا روئے کہ جب سر اٹھایا تو سجدے کی جگہ آنسوؤں سے مکمل بھیگ چکی تھی۔[2]

سفرِ دمشق اور آپؒ کی عزت و منزلت:

اللہ تعالیٰ نے آپؒ کو عزتوں سے نوازا تھا۔ جہاں علماء آپؒ کے معتقد تھے وہاں امراء و خلفاء بھی آپؒ کا غایت درجہ احترام کرتے تھے۔ چناں چہ جب عمر بن عبدالعزیزؒ مسلمانوں کے خلیفہ بنے تو انہوں نے امام باقرؒ کے اکرام

---

(۱) آل البیت حول الرسول، ص: ۱۹۲ و ۱۹۳

(۲) صفۃ الصفوۃ: ۱/ ۳۶۳ و روض الریاحین، الحکایۃ: ۷۱

واعزاز میں انہیں مدینہ طیبہ سے اپنے ہاں دمشق آنے کی دعوت دی۔ آپؒ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے پاس جب دمشق پہنچے تو دیکھا کہ وہاں بہت سارے لوگ امیر المومنین عمر بن عبدالعزیزؒ کے پاس اندر جانے کیلیے پہلے سے انتظار میں بیٹھے ہیں۔ آپؒ کی تواضع کی یہ حالت تھی کہ آپؒ بھی وہیں انہی عام لوگوں کے ساتھ مل کر بیٹھ گئے۔

حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کو پتا چلا کہ آپؒ تشریف لا چکے ہیں تو انہوں نے باہر خادم بھیج کر باقی لوگوں میں سے آپؒ کو اندر بلا لیا۔ آپؒ کچھ وقت ان کے پاس ٹھہرے رہے۔ جب روانگی کا ارادہ کیا تو ان سے فرمایا۔ امیر المومنین! مجھے اجازت؟ میں واپس جانا چاہتا ہوں۔ انہوں نے کہا: ابو جعفر! مجھے کچھ نصیحت فرماتے جائیں۔ آپؒ نے فرمایا: أُوصِیکَ بِتَقْوَی اللہِ وَاتَّخِذِ الْکَبِیرَ أَبًا وَالصَّغِیرَ وَلَدًا وَالرَّجُلَ أَخًا ”اللہ کے خوف کو لازم پکڑنا، اور اپنے سے ہر بڑے شخص کو باپ، چھوٹے کو اولاد اور باقی لوگوں کو بھائی کا درجہ دینا۔“ یہ مختصر اور جامع نصیحت سن کر انہوں نے کہا: اللہ آپ کا بھلا کرے، آپ نے تو اس چھوٹے سے جملے میں ہمارے لیے بڑی خیر کو جمع کر دیا ہے۔ اس کے بعد آپؒ باہر تشریف لے آئے، جب اپنی سواری کے پاس پہنچے تو پیچھے سے انہوں نے قاصد کے ذریعہ یہ پیغام بھجوایا کہ آپ تشریف رکھیں، میں آپ کے پاس آرہا ہوں۔ آپؒ نے اسی قاصد کے ہاتھ واپس یہ کہلا بھیجا کہ نہیں، بلکہ میں خود حاضر ہو جاتا ہوں۔ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے قسم دے کر کہا: آپ تشریف رکھیں، میں ابھی حاضر ہوتا ہوں، اور تھوڑی ہی دیر میں وہیں سواری کے پاس آپؒ کی خدمت میں حاضر ہو گئے۔ آپؒ کو گلے لگایا اور روتے رہے، پھر باادب آپؒ کے سامنے بیٹھ گئے، کچھ دیر بعد اٹھے اور آپؒ کی ہر حاجت جو آپؒ نے ان کو بتائی پوری کی اور واپس آ گئے۔ حضرت امام باقرؒ بھی واپسی مدینہ طیبہ روانہ ہو گئے۔ اس کے بعد پھر موت تک ان دونوں حضرات کی ملاقات نہیں ہوئی۔[1]

---

(1) ینظر: تاریخ دمشق لابن عساکر: ۵۴/۲۷۰، ومختصر تاریخ دمشق: ۲۳/۷۷

ارشادات ونصائح

آپ سلامُ اللہ وَ رَحمۃ علیہ، نے اپنی علم ودانش بھری مبارک زندگی میں مختلف مواقع پر ایسی انمول نصیحتیں ارشاد فرمائیں جن پر عمل کرنے سے انسان ٹھوکریں کھانے سے بچ جاتا ہے اور اُسے اپنی زندگی کا صحیح رخ مل جاتا ہے۔ ان نصائح میں سے بعض درج ذیل ہیں:

(۱) آپؒ نے اپنے صاحبزادے حضرت جعفر صادقؒ سے فرمایا: میرے بیٹے! اللہ تعالی نے تین چیزوں کو تین چیزوں میں چھپا رکھا ہے:

اپنی رضا کو اپنی اطاعت میں چھپایا ہے، لہٰذا اطاعت کے چھوٹے سے عمل کو بھی حقیر نہ جاننا، ممکن ہے اللہ کی رضا اسی میں چھپی ہو۔ اپنی ناراضی کو اپنی نافرمانی میں چھپایا ہے، لہذا تھوڑی سی نافرمانی کو بھی ہلکا نہ سمجھنا، ہوسکتا ہے کہ اس کی ناراضی اسی میں ہو۔ اور اپنے ولی بندوں کو انہی لوگوں میں چھپا رکھا ہے، لہذا کسی شخص کو گھٹیا نہ سمجھنا، کیا پتا وہی شخص ولی ہو۔[1]

(۲) اپنے ایک عقیدت مند سے فرمایا: حق پر قائم رہنا، جس چیز سے تجھے کوئی غرض ومقصد نہ ہو اس میں نہ پڑنا، اپنے دشمن سے دور رہنا، دوستوں میں سے بھی صرف امانتدار پر اعتماد کرنا اور امانتدار وہی ہوسکتا ہے جو اللہ سے ڈرتا ہو، فاسق شخص سے دوستی نہ کرنا، بالخصوص اُسے اپنا رازدار نہ بنانا، اور اپنے کاموں کیلیے مشورہ ہمیشہ ان لوگوں سے لینا جن کے دلوں میں اللہ کا خوف ہو۔[2]

(۳) اپنے شاگرد جابر جُعفی سے فرمایا: میں تمہیں پانچ باتوں کی خاص طور پر نصیحت کرتا ہوں: اگر تم پر کوئی ظلم کرے تو تم کسی پر ظلم نہ کرنا، اگر تمہارے ساتھ لوگ خیانت کریں تو تم کسی سے خیانت نہ کرنا، اگر تم سے کوئی جھوٹ بولے تو غصے نہ ہونا، اگر تمہاری کوئی تعریف کرے تو اترانا مت اور اگر برائی بیان کرے تو گھبرانا مت۔[3]

---

(۱) نثر الدر في المحاضرات: ۱/۲۳۵، والتذكرة الحمدونية: ۱/۱۱۰

(۲) آل البيت حول الرسول، ص: ۱۸۹

(۳) آل البيت حول الرسول، ص: ۱۸۹

(۴) ایک شخص سے کہا: میں نے تمہیں کچھ لوگوں میں بیٹھے ہوا دیکھا جنہیں میں پہچانتا نہیں تھا، وہ کون لوگ تھے؟ اس نے کہا: وہ بس میرے بھائی ہی ہیں۔ آپؒ نے پوچھا: کیا ان میں سے کوئی ایسا بھی ہے کہ تم اس کی جیب میں ہاتھ ڈال کر اس کی اجازت کے بغیر اپنی ضرورت کے پیسے نکال لو؟ کہنے لگا: ایسا تو کوئی نہیں ہے۔ آپؒ نے فرمایا: پھر تم بھائی بھی نہیں ہو۔[۱]

(۵) آپؒ کا ایک رشتہ دار بیمار ہوا تو آپؒ کو کافی پریشانی لاحق ہوئی، پھر جب اس کے انتقال کی اطلاع ملی تو آپؒ کی وہ پریشانی جاتی رہی۔ کسی نے اس بارے میں دریافت کیا تو فرمایا: ہم اللہ سے دعا تو اُس چیز کی کیا کرتے ہیں جو ہمیں پسند ہوتی ہے، لیکن جب ہماری پسند کے خلاف اللہ کی تقدیر اور اس کا فیصلہ واقع ہو جاتا ہے تو پھر ہم اللہ کی مخالفت نہیں کرتے اور اس کی پسند کو اپنی پسند پر ترجیح دیتے ہیں۔[۲]

(۶) علم اور علماء کی اہمیت بیان کرتے ہوئے فرمایا: علم حاصل کرو، کہ اس کا سیکھنا جنت ہے، اس کو حاصل کرنے کیلیے کہیں جانا عبادت ہے، اس کا یاد کرنا اللہ کی تسبیح کرنا ہے، اس کی تحقیقات میں بحث کرنا جہاد ہے، اس کا ادب کرنا صدقہ ہے، اس کا اہل پر خرچ کرنا موجبِ ثواب ہے۔ یہ جنت کے راستوں کا نشان ہے، وحشت میں دل بہلانے والا ہے، سفر میں ہم سفر ہے، تنہائی میں ساتھی ہے، خوشی میں رہبر ہے، دکھ میں مددگار ہے، دوستوں کی مجلس میں زینت وعزت بخشنے والا ہے، دشمنوں پر ہتھیار ہے۔

اس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ ایک جماعت (یعنی علماء) کو بلند مرتبہ سے نوازتا ہے جسے خیر کے کاموں میں استعمال فرماتا ہے، یہ وقت کے امام ہوتے ہیں ان کے کاموں کی اتباع کی جاتی ہے اور ان کے نقشِ قدم پر چلا جاتا ہے۔ ہر خشک وتر چیز حتی کہ سمندر کی مچھلیاں اور زہریلے جانور، اور جنگل کے درندے اور چوپائے تک ان کیلیے دعائے مغفرت کرتے ہیں۔[۳]

(۷) فرمایا: پیٹ یا شرمگاہ کی پاکدامنی سے بہتر کوئی عبادت نہیں، دعاء سے زیادہ کوئی شئ اللہ کو محبوب نہیں اور

---

(۱) تفسیر البحر المحیط: ۲/۲۷۱ ومثله في كثير من المآخذ نحو المنتظم والحلية وغيرهما.

(۲) عيون الأخبار للدِّينَوَرِي: ۳/۲۶ ومثله في التذكرة الحمدونية: ۱/۱۱۰

(۳) التذكرة الحمدونية: ۱/۳۹۴

دعاء تو ایسی چیز ہے کہ تقدیر کو بدل دیتی ہے۔ جس بھلائی کا بدلہ بہت جلد مل جاتا ہے وہ لوگوں کے ساتھ حسنِ سلوک ہے اور جس برائی کی سزا بہت جلد مل جاتی ہے وہ ظلم ہے۔

آدمی کے عیب کیلئے یہی باتیں کافی ہیں کہ وہ اپنے عیبوں سے غافل ہو کر دوسروں کے عیب دیکھے، جس چیز کو خود نہیں چھوڑ سکتا لوگوں پر اس کا حکم جاری کرے، اور اپنے ساتھیوں کیلئے بلاوجہ تکلیف کا سبب بنے۔[1]

(۸) فرمایا: اپنے بھائی کے دل میں اپنے بارے میں محبت کا اندازہ اس سے لگالو جتنی تمہارے دل میں اس کی محبت ہے۔[2]

(۹) آپؒ اپنی مجالس میں حضرت عمر بن خطابؓ کا یہ قول ارشاد فرمایا کرتے تھے کہ جب تم کسی عالم وقاری کو دیکھو کہ وہ مالداروں سے تعلق رکھتا ہے تو سمجھ لو کہ وہ دنیادار ہے، اور جب اسے دیکھو کہ بادشاہ کے آس پاس رہتا ہے تو وہ چور ہے (جو اس سے مال بٹورنا چاہتا ہے)۔[3]

(۱۰) فرمایا: انسان کے دل میں جتنا تکبر داخل ہوتا ہے اسی کے بقدر عقل کم ہو جاتی ہے، یعنی تکبر تھوڑا ہو تو تھوڑی عقل اور زیادہ ہو تو زیادہ عقل جاتی رہتی ہے۔

(۱۱) فرمایا: گھٹیا درجے کے لوگوں کا ہتھیار، بدکلامی ہوتی ہے۔

(۱۲) فرمایا: اللہ کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ ابلیس کو ستر عابدوں کی موت سے ایک عالم کی موت زیادہ پسند ہے۔

(۱۳) اپنے صاحبزادے سے فرمایا: بیٹے! سستی اور اکتاہٹ سے بچنا کہ یہ دونوں ہر برائی کی کنجی ہیں، کیونکہ اگر تم سستی سے کام لوگے تو حقوق کی ادائیگی نہ کر پاؤ گے اور اگر اکتاہٹ کا شکار ہوگے تو حق پر نہ جم سکو گے۔[4]

(۱۴) فرمایا: میرا ایک ساتھی تھا، جو میری نظر میں بڑا آدمی تھا۔ دراصل اس کی نظر میں دنیا کی بے وقعتی اور چھوٹے پن نے، میری نظر میں اُسے صاحبِ وقعت اور بڑا بنا دیا تھا۔[5]

---

(۱) صفۃ الصفوۃ: ۱/۳۶۳

(۲) صفۃ الصفوۃ: ۱/۳۶۴، والطبقات الکبری للشعرانی: ۱/۶۲

(۳) البدایۃ والنہایۃ ط الفکر: ۹/۳۱۰

(۴) صفۃ الصفوۃ: ۱/۳۶۲

(۵) صفۃ الصفوۃ: ۱/۳۶۳، وروض الریاحین، ص: ۸۲

(۱۵) فرمایا: ہر چیز کیلیے کوئی نہ کوئی آفت ہوتی ہے، علم کی آفت نِسیان (یعنی اس کا بھول جانا) ہے۔ [1]

وفات:

راجح قول کے مطابق آپؒ نے ۱۱۴ھ میں انتقال فرمایا، [2] جبکہ صفر کے مہینے کی تئیس تاریخ تھی۔ [3] آپؒ کی وصیت تھی کہ کفن اُسی قمیص میں دیا جائے جس میں آپؒ نماز پڑھا کرتے تھے۔ [4] آپؒ کے صاحبزادے امام جعفر صادقؒ ذرا تفصیل سے بیان کرتے ہیں، وہ فرماتے ہیں: میرے والد صاحب نے مجھے وصیت کی تھی کہ میں تین کپڑوں میں ان کو کفن دوں:

ایک وہی قمیص (جس میں نماز پڑھا کرتے تھے)، اُس کے بٹن کاٹ کر اسے ایک چادر کی طرح بنالوں، دوسرے وہ چادر جو آپؒ اوڑھا کرتے تھے، تیسرے یہ کہ میں ایک یمنی چادر خرید کر اُس کو کفن میں شامل کروں، اور یہ اس لیے کہ رسول اللہ ﷺ کو بھی تین کپڑوں میں کفن دیا گیا تھا جس میں ایک یمنی چادر تھی۔ [5]

آپؒ کا انتقال "حُمیمہ" (یہ ملکِ شام میں دمشق کے قریب ایک بستی تھی جس میں بنوامیہ کے زمانہ میں حضرت علی بن عبداللہ بن عباس کی اولاد رہا کرتی تھی [6])، کے مقام پر ہوا تھا (بعض حضرات نے لکھا ہے کہ زہر دیے جانے سے آپؒ کا انتقال ہوا تھا، [7]) آپؒ کو وہاں سے مدینہ طیبہ لاکر جنت البقیع میں اپنے والد ماجد امام زین العابدینؒ اور اُن کے چچا حضرت امام حسنؓ کے پہلو میں دفن کیا گیا۔ [8]

---

(۱) البدایۃ والنہایۃ ط الفکر: ۹/۳۱۰، وحلیۃ الأولیاء وطبقات الأصفیاء: ۳/۱۸۳

(۲) الوافي بالوفیات: ۴/۷۷، وتاریخ دمشق: ۵۴/۲۷۳، وذیل الإسلام: ۱/۱۰۳

(۳) وفیات الأعیان: ۴/۱۷۴

(۴) صفۃ الصفوۃ: ۱/۳۶۴، والمنتظم: ۷/۱۶۲، والطبقات الکبری: ۵/۲۴۸

(۵) الطبقات الکبری ط العلمیۃ: ۵/۲۴۸

(۶) الأماکن ص: ۵۳۶ مع الروض المعطار في خبر الأقطار ص: ۱۹۹، ومعجم البلدان: ۲/۳۴۲

(۷) إسعاف الراغبین في سیرۃ المصطفی وفضائل أھل بیتہ الطاھرین، ص: ۲۲۹

(۸) الوافي بالوفیات: ۴/۷۷، ووفیات الأعیان: ۴/۱۷۴

فضائل وخصائص

ذوقِ عبادت:

آپ سَلامُ اللهِ وَ رَحمۃُ علیہ، نے اُس گھرانے میں پرورش پائی جس کا مشغلہ ہی عبادت تھا۔ چناں چہ آپؒ پر بھی اس عبادت کا اثر بالکل نمایاں تھا۔ آپؒ (دن رات کے چوبیس گھنٹوں میں) روزانہ ڈیڑھ سو رکعات نفل پڑھا کرتے تھے [1]۔ اسی کثرتِ عبادت کا یہ اثر تھا کہ آپؒ کی ناک اور پیشانی مبارک پر سجدے کا نشان پڑ گیا تھا۔ [2]

آپؒ کی عبادت کا ایک واقعہ آپؒ کے صاحبزادے 'جعفر صادقؒ' بیان کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں: میں اپنے والد صاحب کیلیے بستر بچھا کر ان کے آنے کی انتظار کیا کرتا تھا، جب وہ بستر پر تشریف لے آتے اور سو جاتے تو میں پھر اپنے بستر پر چلا جاتا۔ ایک رات انہوں نے آنے میں بہت تاخیر کردی۔ میں ان کی تلاش میں مسجد پہنچا تو دیکھا کہ آپؒ مسجد میں اکیلے مشغولِ عبادت ہیں اور سجدے میں سر رکھ کر یہ دعا کر رہے ہیں: سُبحَانَکَ اللّٰھُمَّ، اَنتَ رَبِّي حَقًّا، سَجَدتُ لَکَ یَا رَبِّ تَعَبُّدًا وَ رِقًّا، اَللّٰھُم اِنَّ عَمَلِي ضَعِیف، فَضَاعِفهُ لِي، اَللّٰھُم قِنِي عَذَابَکَ یَومَ تَبعَثُ عِبَادَکَ وَ تُب عَلَيَّ اِنَّکَ اَنتَ التَوَّابُ الرَّحِیم. ''اے اللہ! تیری ذات پاک ہے، تو میرا سچا رب ہے۔ اے میرے رب! تیری بندگی وغلامی میں، مَیں نے اپنا یہ سر تیرے آگے رکھ دیا ہے۔ اے اللہ! یقیناً میرا عمل کمزور ہے، تُو اسے دوگنا کر دیجئے۔ اے اللہ! جس روز تُو اپنے بندوں کو کھڑا کرے گا اُس دن مجھے اپنے عذاب سے بچا لینا۔ اور میری توبہ بھی قبول فرما لیجیے۔ تُو بلاشبہ توبہ قبول کرنے والا اور رحم کرنے والا ہے''۔ [3]

خوفِ الٰہی:

لَیث بن ابی سُلَیم کہتے ہیں: میں امام باقر سَلامُ اللهِ وَ رَحمۃُ علیہ، کے پاس حاضر خدمت ہوا (خوفِ الٰہی سے ان کی عجب کیفیت تھی)، وہ اپنے گناہوں کو یاد کرتے اور اُدھر لوگ جو اُن کی تعریفیں کرتے ہیں اس کو یاد کرتے اور پھر رونا

---

(1) سیر اعلام النبلاء ط الرسالۃ: ۴/۴۰۳، والوافي بالوفیات: ۴/۷۷

(2) الطبقات الکبری ط العلمیۃ: ۵/۲۴۸

(3) آل البیت حول الرسول، ص: ۱۸۳

شروع کردیتے۔ [1]

آپؒ آدھی رات کو اٹھ کر اللہ کے سامنے آہ وزاری کرتے اور کہتے: أَمَرْتَنِي فَلَمْ أَئْتَمِرْ، وَزَجَرْتَنِي فَلَمْ أَزْدَجِرْ، هٰذَا عَبْدُكَ بَيْنَ يَدَيْكَ وَلَا أَعْتَذِرُ ''اے اللہ! تو نے مجھے حکم دیا میں نے تابعداری نہ کی، تو نے مجھے روکا میں نہ رکا۔ یہ تیرا بندہ تیرے سامنے حاضر ہے، سراپا مجرم ہے اس کے پاس کوئی عذر نہیں (اسے معاف فرمادیجئے)''۔ [2]

آپؒ پر خوف کا اس قدر غلبہ تھا کہ جب کبھی ہنسی آجاتی تو اس کے بعد کہتے: اے اللہ! ناراض نہ ہونا۔ [3] اور آپؒ کے بارے میں آتا ہے کہ آپؒ بہت زیادہ رویا کرتے تھے۔ [4]

دنیا سے بے رغبتی:

جابر جُعفی بیان کرتے ہیں: امام باقرؒ مجھے ایک مرتبہ فرمانے لگے: جابر! میں رنجیدہ ہوں اور میرا دل سخت فکر میں مشغول ہے۔ میں نے کہا: کس وجہ سے آپ رنجیدہ ہیں؟ فرمایا: جابر! جس شخص کا دل صاف اور خالص ہو چکا ہو، وہ جب اپنا سب کچھ اللہ کے دین کے تابع کردیتا ہے تو اللہ تعالی اپنے سوا ہر شئ سے اس کو خالی کردیتا ہے۔ جابر! دنیا کیا ہے، بس یہی یک سواری ہے جس پر سوار ہو کر آئے ہو، یہی کپڑا ہے جس کو پہن رکھا ہے یا یہی بیوی ہے جو مل گئی ہے (بھلا ان میں دل لگانے اور ان کی خاطر فکر مند و پریشان ہونے کی کیا ضرورت ہے)۔

پھر فرمایا: جابر! جو اہلِ ایمان اس دنیا کی طرف مائل نہیں ہوتے، آخرت سے بے خوف نہیں رہتے، دنیا کے فتنے ان کو اللہ کی یاد سے غافل نہیں کرتے، اس جہاں کی زیب وزینت انہیں اللہ کے نور سے اندھا نہیں کرتی؛ وہ صلحاء کی صف میں شامل ہو کر کامیاب ہوجاتے ہیں۔

دراصل بات یہ ہے کہ متقی لوگ دنیا کا بوجھ کم اٹھاتے ہیں اور دینی کاموں میں تمہارے بہت معاون ہوتے ہیں۔ وہ ایسے لوگ ہوتے ہیں کہ اگر تم اللہ کی یاد سے غافل ہو جاؤ تو وہ تمہیں یاد دہانی کراتے ہیں، اگر تم اس کی یاد میں

---

(۱) سیر أعلام النبلاء ط الرسالة: ۴۰۵/۴

(۲) صفة الصفوة: ۳۶۳/۱، وحلية الأولياء وطبقات الأصفياء: ۱۸۶/۳

(۳) صفة الصفوة: ۳۶۳/۱، وحلية الأولياء وطبقات الأصفياء: ۱۸۵/۳

(۴) البداية والنهاية ط الفكر: ۳۰۹/۹

مشغول ہوؤ تو اس میں تمہاری اعانت کرتے ہیں، اللہ کے حق کو کھل کر بولتے ہیں، اس کے احکامات کو بخوبی قائم کرتے ہیں، اپنی محبت کو اللہ کی محبت میں فناء کر دیتے ہیں، ان کے دل اللہ اور اس کی محبت میں مشغول ہوتے ہیں، رب کی اطاعت میں ان کے دل دنیا سے اچاٹ ہوتے ہیں، اور وہ اس بات کو دل سے جانتے ہیں کہ یہی چیز ان کی مقصودِ حیات ہے۔

جابر! دنیا کو ایسے سمجھنا جیسے راستے میں چلتے ہوئے انسان کسی جگہ تھوڑی دیر کیلئے ٹھہر جاتا ہے اور پھر اسے چھوڑ کر آگے چل دیتا ہے، یا اُس مال کی طرح سمجھنا جو خواب میں تو تمہارے پاس تھا لیکن آنکھ کھلی تو تم خالی ہاتھ تھے (لہٰذا اس دنیا سے دھوکا نہ کھانا)۔[1]

سخاوت:

آپؒ اپنے علم وفضل کے ساتھ ساتھ لوگوں میں اپنی سخاوت کی وجہ سے بھی مشہور تھے، اور لوگوں پر آپؒ کی نوازشات واحسانات کا چرچہ تھا۔ عجب بات یہ ہے کہ ایک تو آپؒ خود کثیر العیال تھے اور دوسرے آپؒ کوئی بڑے مالدار انسان نہیں تھے بلکہ ایک متوسط مالی حیثیت کے حامل تھے، لیکن اس سب کے باوجود آپؒ کی سخاوت عوام وخواص سبھی میں جاری تھی۔[2]

آپؒ کی باندی "سلمیٰ" بیان کرتی ہے کہ آپؒ کے کچھ بھائی آپؒ کے پاس آیا کرتے تھے، وہ اس وقت تک آپؒ کے پاس سے نہ جاتے جب تک آپؒ ان کو بہترین کھانا نہ کھلا دیں، اور عمدہ کپڑے اور دراہم نہ دے دیں۔ وہ کہتی ہے: میں اس بارے میں آپؒ سے بات بھی کرتی تھی مگر وہ فرماتے تھے: سلمیٰ! دنیا کی نیکی یہی تو ہے کہ آدمی اپنے بھائیوں اور دوستوں کے ساتھ حُسنِ سلوک کرے۔[3] اور آپؒ کبھی پانچ سو، کبھی چھ سو اور کبھی ہزار درہم تک بھی دے دیتے تھے اور اس بات سے تنگ بھی نہیں ہوتے تھے کہ وہ آپؒ کے پاس آکر بیٹھتے ہیں۔[4]

---

(۱) مستفاد من: حلیۃ الأولیاء: ۳/ ۱۸۲، وصفۃ الصفوۃ: ۱/ ۳۶۲ بتلخیص وتیسیر.

(۲) ینظر: الفصول المھمۃ لابن الصباغ، ص: ۲۰۳

(۳) الفصول المھمۃ لابن الصباغ، ص: ۲۰۳، وصفۃ الصفوۃ: ۱/ ۳۶۴

(۴) الفصول المھمۃ لابن الصباغ، ص: ۲۰۳ مع صفۃ الصفوۃ: ۱/ ۳۶۴

اسود بن کثیر کہتے ہیں: میں نے حضرت امام باقرؒ سے اپنی ضرورت کے بارے میں کچھ عرض کیا اور اپنے بھائیوں کی کسی قدر شکایت بھی کی کہ انہوں نے مجھ سے بے رخی برت لی ہے۔ آپؒ نے فرمایا: بہت برا ہے وہ بھائی جو تمہاری مالداری کے وقت تو تمہارا ساتھ دے اور جب تم غریب ہو جاؤ تو تمہیں چھوڑ دے۔ اس کے بعد آپؒ نے اپنے غلام کو بھیجا، وہ گیا اور ایک تھیلی لے آیا جس میں سات سو درہم تھے۔ آپؒ نے وہ ساری تھیلی انہیں دے کر کہا کہ یہ اپنی ضرورت میں خرچ کرو، جب ختم ہو جائے تو بتا دینا۔ ۱

خدمتِ والدین:

والدین کی خدمت کا یہ عالم تھا کہ آپؒ وقت کے امام اور علامہ ہونے کے باوجود اپنی والدہ کے سر سے خود جوئیں نکالتے تھے۔ ۲

اور جب آپؒ کے والد ماجد حضرت امام زین العابدینؒ نے انتقال فرمایا تو ان کی تجہیز و تکفین وغیرہ کی خدمات سر انجام دینے میں آپؒ بھی شریک رہے۔ ۳

صحابہؓ سے آپؒ کی عقیدت و محبت:

آپؒ کو صحابۂ کرام سے گہری محبت تھی، جیسا کہ آپؒ کے مختلف ارشادات سے ظاہر ہوتا ہے:

ایک دفعہ کسی نے آپؒ سے قرآن مجید کی آیات {إِنَّمَا وَلِيُّكُمُ اللّٰهُ وَرَسُولُهُ وَالَّذِينَ آمَنُوا الَّذِينَ يُقِيمُونَ الصَّلَاةَ وَيُؤْتُونَ الزَّكَاةَ وَهُمْ رَاكِعُونَ * وَمَنْ يَتَوَلَّ اللّٰهَ وَرَسُولَهُ وَالَّذِينَ آمَنُوا فَإِنَّ حِزْبَ اللّٰهِ هُمُ الْغَالِبُونَ} [المائدة:۵۶،۵۵] ترجمہ: (مسلمانو!) تمہارے دوست تو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول اور ایماندار لوگ ہیں جو کہ اس حالت سے نماز کی پابندی رکھتے ہیں اور زکوۃ دیتے ہیں کہ ان کے دلوں میں خشوع ہوتا ہے۔ اور جو شخص اللہ سے دوستی رکھے گا اور اس کے رسول سے، اور ایمان دار لوگوں سے تو (وہ اللہ کے گروہ میں داخل ہو گیا اور) اللہ کا گروہ بے شک غالب ہے۔ ۴} کے بارے میں پوچھا کہ ان آیات میں مذکور "ایماندار لوگ" (جن کی اتنی زیادہ تعریف اور شان

---

(۱) صفة الصفوة: ۳۶۴/۱، والفصول المهمة لابن الصباغ، ص: ۲۰۴

(۲) الطبقات الكبرى ط العلمية: ۲۴۶/۵

(۳) مستفاد من: الطبقات الكبرى ط العلمية: ۱۷۱/۵

(۴) ترجمہ از معارف القرآن (خلاصہ تفسیر) ۱۶۹/۳

بیان کی گئی ہے، ان) سے کون مراد ہیں؟ فرمایا: ان سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم مراد ہیں۔ [1]

ایک مرتبہ فرمایا: حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما ہدایت کے امام و پیشوا تھے۔ [2] اور اسی طرح ایک موقع پر ارشاد فرمایا: جو شخص ان دونوں حضرات (یعنی حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما) کی شان و مرتبے کو نہیں پہچانتا وہ سنتِ نبویہ سے بھی جاہل ہے۔ [3]

صحابہؓ کی آپؒ سے عقیدت ومحبت:

آپؒ فرماتے ہیں کہ ہم لوگ حضرت جابر بن عبداللہ انصاریؓ کے پاس حاضر خدمت ہوئے۔ انہوں نے سب لوگوں سے ان کے بارے میں پوچھا، جب میری باری آئی تو میں نے کہا کہ میں حضرت امام حسینؓ کے صاحبزادے امام زین العابدینؒ کا بیٹا "محمد" ہوں۔ یہ سن کر انہوں نے نہایت پیار کے انداز میں اپنا ہاتھ میرے سر کی طرف بڑھایا (اور دستِ شفقت پھیرا)، اس کے بعد پہلے میرا اوپر والا بٹن کھولا، پھر نیچے والا کھولا اور اپنی ہتھیلی میرے سینہ پر رکھ دی (میں اس وقت نوجوان تھا)، پھر فرمایا: مَرْحَبًا بِکَ، یَا ابْنَ أَخِي! سَلْ عَمَّا شِئْتَ "میرے پیارے بھتیجے! تمہاری اس تشریف آوری پر میری طرف سے تمہیں خوش آمدید ہو۔ اور جو پوچھنا ہے پوچھ لو"۔ اس کے بعد آپؒ نے ان سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حج کی تفصیلات دریافت کیں اور انہوں نے اہتمام کے ساتھ بہت مفصل اور تسلی بخش جواب ارشاد فرمایا۔ [4]

متفرقات:

ذوقِ عبادت، دنیا سے بے رغبتی، خوفِ الٰہی وغیرہ؛ یہ سب آپؒ کے فضل وکمال اور عمدہ اوصاف کی واضح نشانیاں ہیں، جن کا تقریباً تفصیلی بیان، ابھی گزرا ہے۔ تاہم چند دیگر فضائل واوصاف کا مختصر اور اجمالی تذکرہ ذیل میں کیا جاتا ہے:

---

(۱) حلیۃ الأولیاء وطبقات الأصفیاء: ۱۸۵/۳، والبدایۃ والنہایۃ ط الفکر: ۳۱۱/۹

(۲) سیر أعلام النبلاء ط الرسالۃ: ۴۰۲/۴، وتہذیب التہذیب: ۳۵۱/۹

(۳) البدایۃ والنہایۃ ط الفکر: ۳۱۱/۹، وحلیۃ الأولیاء وطبقات الأصفیاء: ۱۸۵/۳

(۴) ینظر: صحیح مسلم: ۸۸۶/۲

(۱) آپ رحمہ اللہ جلیل القدر تابعی تھے۔ اور اس امت کی ممتاز شخصیات میں سے علم وعمل، زہد وعبادت، حسب ونسب اور شرف واعزاز کے لحاظ سے آپ رحمہ اللہ ایک منفرد شخصیت تھے۔ علماء اور متقین کے اعلیٰ طبقہ میں آپ رحمہ اللہ کا شمار ہوتا تھا۔ [۱] آپ رحمہ اللہ وہ ہستی ہیں جن کی ذات کے اندر علم وعمل کے ساتھ ساتھ بیک وقت سرداری اور شان وشوکت، وقار وسنجیدگی اور خلقت کا اعتماد وبھروسہ جمع تھا۔ یہی وہ صفات ہیں جن کے باعث آپ رحمہ اللہ کے بارے میں لکھا ہے کہ آپ رحمہ اللہ امیر المومنین بننے کی صلاحیت رکھتے تھے [۲]۔ آپ رحمہ اللہ اگرچہ امیر المومنین نہیں تھے مگر اپنی گوناگوں اعلیٰ صفات وصلاحیات کی بدولت اپنے زمانہ میں بنو ہاشم کے سردار کہلاتے تھے۔ [۴]

(۲) آپ رحمہ اللہ کی صفات وجلالتِ شان کا ابنِ کثیر رحمہ اللہ نے مختصر لفظوں میں عجب نقشہ کھینچا ہے۔ وہ لکھتے ہیں: آپ رحمہ اللہ ذکر الٰہی کے پابند، خشوع سے لبریز اور صبر کا مجسمہ تھے۔ خاندانِ نبوت کے چشم وچراغ اور بلند وبالا حسب ونسب کے مالک تھے۔ درپیش خطرات سے بخوبی واقف تھے۔ اللہ کے سامنے آہ وزاری آپ رحمہ اللہ کی گھٹی میں تھی اور لڑائی جھگڑوں سے بالکل ہی کنارہ کش تھے۔ [۵]

(۳) امام جعفر صادق رحمہ اللہ فرماتے ہیں: میرے والد (حضرت امام باقر رحمہ اللہ) اپنے زمانہ میں روئے زمین پر موجود امت محمدیہ کے سب سے بہترین لوگوں میں تھے۔ [۶]

(۴) حضرت معاویہ بن عمار ذہبی رحمہ اللہ کہتے ہیں: امام باقر رحمہ اللہ نے قرآنِ مجید کی آیتِ مبارکہ {فَاسْأَلُوْا أَهْلَ الذِّكْرِ إِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ} (النحل: ۴۳) ترجمہ: اگر تمہیں علم نہیں ہے تو "اہلِ علم" سے پوچھ لو) پڑھ کر فرمایا: "ہم اہلِ علم ہیں"۔ [۷]

---

(۱) البداية والنهاية ط هجر: ۱۳/ ۷۲

(۲) منهاج السنة النبوية: ۴/ ۵۰

(۳) سير أعلام النبلاء ط الرسالة: ۴/ ۴۰۲

(۴) تذكرة الحفاظ = طبقات الحفاظ للذهبي: ۱/ ۹۴

(۵) ينظر: البداية والنهاية ط الفكر: ۹/ ۳۰۹ بشيء من تسهيل وتوضيح.

(۶) البداية والنهاية ط هجر: ۱۳/ ۷۳

(۷) الفصول المهمة في معرفة أحوال الأئمة، ص: ۲۰۲، ۲۰۳

(۳) امام زید شہید سلامُ اللہ وَ رحمۃُ علیہ

(زید بن علی بن حسین بن علی کرم اللہ وجہہ)

نام ونسب:

آپ سلامُ اللہ وَ رحمۃُ علیہ، کا نام ''زید'' تھا، آپؒ امام زین العابدینؒ کے صاحبزادے اور امام باقرؒ کے چھوٹے بھائی تھے۔[1] آپؒ کی کنیت ''ابوالحسین'' تھی، [2] اور ''زید شہید'' کے نام سے آپؒ کو یاد کیا جاتا ہے۔ [3] آپؒ نسب کے لحاظ سے قریشی وہاشمی، اور وطن کے اعتبار سے ''مدنی'' تھے۔ [4]

آپؒ کی والدہ ماجدہ کے نام میں اختلاف ہے، چنانچہ اس سلسلہ میں متعدد اقوال منقول ہیں: ''جید''، [5] ''جیدا''، [6] ''جیداء''، [7] ''حیدان'' [8]۔ وہ باندی تھیں اور اُن کا تعلق ''سندھ'' سے تھا۔ [9] دراصل مختار ثقفی نے ان کو تیس ہزار درہم (مساوی تقریبا ۶۳ لاکھ روپے) میں خریدا، پھر انہیں بطور ہدیہ امام زین العابدینؒ کے سپرد کر دیا جن سے امام زیدؒ جیسا پھر نیک بخت لڑکا پیدا ہوا۔ [10]

---

(۱) تهذيب الكمال في أسماء الرجال: ۹۵/۱۰

(۲) الكنى والأسماء للدولابي: ۲/۶۶۴، والتاريخ الكبير للبخاري: ۴۰۳/۳، وبغية الطلب في تاريخ حلب: ۴۰۳۰/۹ و ۴۰۴۶، والمعارف: ۲۱۶/۱، والطبقات لخليفة بن خياط ص: ۴۴۹، ومقاتل الطالبيين، ص: ۱۲۴

(۳) الأعلام للزركلي: ۵۹/۳

(۴) بغية الطلب في تاريخ حلب: ۴۰۲۷/۹، وسير أعلام النبلاء: ۳۸۹/۵، والأعلام للزركلي: ۵۹/۳

(۵) سر السلسلة العلوية، ص: ۵۶

(۶) الإفادة في تاريخ الأئمة السادة، ص ۴۳، والحدائق الوردية: ۲۴۱/۱

(۷) سر السلسلة العلوية، ص: ۳۲، وغاية الاختصار، ص: ۷۰

(۸) المعارف لابن قتيبة: ۲۱۵/۱

(۹) الطبقات الكبرى: ۲۵۰/۵، وسير أعلام النبلاء: ۳۸۹/۵، وتهذيب الكمال في أسماء الرجال: ۹۵/۱۰ ونور الأبصار، ص: ۲۶۵ مع المعارف: ۲۱۶/۱، والإمام زيد بن علي، ص: ۳۴

(۱۰) الإفادة للهاروني، ص: ۴۳ مع الإمام زيد لأبي زهرة، ص: ۲۶ نونور قزيد بن علي، ص: ۲۵

ولادت:

آپؒ کے سنِ ولادت میں اختلاف ہے،[1] تاہم قابلِ اعتماد بات یہی ہے کہ آپؒ ۸۰ ہجری میں پیدا ہوئے؛[2] اور آپؒ کی یہ پیدائش مدینہ منورہ میں ہوئی۔[3]

پرورش وتربیت:

آپ سلامُ اللہ وَ رَحمۃُ علیہ، نے جب مدینہ منورہ کے مقدس شہر میں آنکھ کھولی تو ہر سُو علم وتقویٰ کی فضا عام تھی اور جس گھرانے میں آپؒ نے پرورش پائی وہ تو علمِ نبوت سے سراپا معمور تھا۔ جس والدِ ماجد کی گود میں آپؒ پروان چڑھے وہ عبادت میں عابدوں کے سردار و پیشوا، اَخلاقیات میں رہبر و رہنما اور علم میں سید الفقہاء تھے جیسا کہ ان کی سیرت کے تحت پیچھے گزر چکا ہے، گویا امام زیدؒ نے، اپنے والد ماجد کے سایۂ تربیت میں رہنے کے دوران، بچپن میں ہی علم وتقویٰ اور اَخلاق وروحانیت کے عملی نظارے اُن کی ذات میں مشاہدہ کر لیے تھے جنہوں نے بعد میں آپؒ کی سیرت پر بہت گہرے وُدُور رس اثرات چھوڑے۔

آپؒ کے اِن عابد و زاہد، عالم و فاضل والدِ محترم کا جب انتقال ہوا تو اس وقت آپؒ سنِ بلوغ کو پہنچ چکے تھے، اور علمی وعملی ترقی کی منازل طے کرنے کا دَور شروع ہونے لگا تھا، ایسے وقت میں آپؒ کو اپنے عظیم وفاضل، شفیق ومشفق بڑے بھائی ''امام باقرؒ'' کی کفالت وتربیت میں رہنے کی سعادت نصیب ہوئی، وہ بھی اپنے عظیم والد کے پرُوردہ وتربیت یافتہ ہونے کے سبب زہد وتقویٰ کے اعلیٰ مقام پر فائز تھے۔

ان عظیم ہستیوں کی کفالت وتربیت نے بچپن سے ہی آپؒ میں تقویٰ وخوفِ الٰہی کی وہ روح بھر دی تھی جس کی مثال ملنا مشکل ہے، کہ امام زیدؒ کا خود اپنا بیان ہے، وہ قسم کھا کر فرماتے ہیں: ''جب سے میں نے اتنا شعور سنبھالا کہ اپنے دائیں اور بائیں ہاتھ کا فرق سمجھنے لگا تھا اُس وقت سے میں نے ایک مرتبہ بھی جھوٹ نہیں بولا، اور جب سے مجھے

---

(۱) حيث ذُكرت سنة: ۷۵ھ في الإفادة ص: ۲۳، والحدائق الوردية: ۱/۲۴۲، والروض النضير للسياغي: ۱/۴۹، و ۷۸ھجری في مختصر تاريخ دمشق: ۹/۱۵۱، وبغية الطلب: ۹/۴۰۳۰ و ۷۹ھجری في الأعلام للزركلي: ۳/۵۹

(۲) الإمام زيد لأبي زهرة، ص: ۲۶، وثورة زيد بن علي، ص: ۲۵، وتاريخ المذاهب الإسلامية، ص: ۲۰۵، ۲۰۷

(۳) الإمام زيد بن علي، ص: ۳۶

یہ پتا چلا ہے کہ اللہ تعالیٰ مجھ سے حساب لے گا اُس دن سے میں نے اللہ کی حرام کردہ چیزوں کو ترک کر دیا ہے"۔ [1]

آپؒ کی پیدائش و پرورش تو مدینہ میں ہوئی جیسا کہ اوپر گزرا، بلکہ شروع میں رہائش بھی مدینہ طیبہ میں رہی لیکن آخر میں آپؒ کی زندگی کوفہ میں گزری۔ [2]

حلیہ مبارک ولباس:

اللہ تعالیٰ نے آپؒ کو خوب سیرت کے ساتھ خوب صورت بھی بنایا تھا، چنانچہ لکھا ہے کہ آپؒ کا رنگ گورا تھا، آنکھیں بڑی بڑی اور ابرو دونوں ملے ہوئے تھے، بدن کی بناوٹ مکمل تھی (یعنی کسی عضو میں نقص نہیں تھا)، قد دراز تھا، ڈاڑھی گھنی، سینہ فراخ وکشادہ، اور ناک بلندی مائل تھی۔ سر اور ڈاڑھی کے بال سیاہ تھے البتہ دونوں رخساروں کے اطراف میں کچھ سفید بال آچکے تھے۔ [3]

آپؒ کے لباس میں صرف اتنا مل سکا ہے کہ آپؒ نے سفید چوغہ اور سیاہ عمامہ استعمال فرمایا ہے، [4] اس کے علاوہ آپؒ انگوٹھی بھی پہنتے تھے جس کا نقش تھا: اِصبِر تُؤجَر، أصدُق تَنجُ (صبر کرو اجر پاؤ گے، سچ بولو نجات پاؤ گے)۔ [5]

شادی واولاد:

کسی مؤرخ نے آپؒ کی بیویوں اور باندیوں کے عنوان سے باقاعدہ بحث نہیں کی، البتہ مختلف کتبِ تاریخ کو سامنے رکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ آپؒ کی تین بیویاں تھیں۔ [6]

ایک بیوی "رَیطہ بنت ابی ہاشم" تھی جن سے آپؒ کے مشہور بیٹے "یحییٰ بن زید" پیدا ہوئے جو خراسان میں شہید

---

(۱) الإمام زيد بن علي، ص: ۳۶، ۳۹ مع الإمام زيد لأبي زهرة، ص: ۳۴

(۲) ينظر: الخطط للمقريزي: ۴/۱۷۳ مع معجم المفسرين: ۱/۱۹۸، والأعلام للزركلي: ۳/۵۹

(۳) المصابيح لأبي العباس، ص: ۴۰۴، والروض النضير للسياغي: ۱/۴۹ والإفادة للهاروني، ص: ۲۳، وريحان عترت، ص: ۸۵

(۴) انساب الأشراف للبلاذري: ۳/۲۴۵ مع الروض النضير: ۱/۷۳، والمصابيح لأبي العباس، ص: ۳۹۳

(۵) بغية الطلب في تاريخ حلب: ۹/۴۰۴۱، والمواعظ والاعتبار بذكر الخطط والآثار: ۴/۳۱۸، وكذا ينظر: نور الأبصار، ص: ۲۶۸، ومقاتل الطالبيين ص: ۱۲۹

(۶) الإمام زيد بن علي، ص: ۴۱

ہوئے تھے۔[1] جب آپؒ کوفہ میں قیام پذیر تھے اُس دوران آپؒ نے دو عورتوں سے شادی کی: ایک قبیلہ بنوسلمہ میں، یعقوب بن عبداللہ سلمی کی بیٹی سے اور دوسری قبیلہ اَزد میں، عبداللہ بن ابی العَنبس ازدی کی بیٹی سے۔[2]

ان کے علاوہ آپؒ کی ایک باندی کا تذکرہ بھی ملتا ہے جس سے اللہ تعالیٰ نے آپؒ کو تین بیٹے عطا فرمائے: عیسیٰ، حسین اور محمد۔[3]

چنانچہ آپؒ کی اولاد میں صرف یہی چار صاحبزادے تھے،[4] پھر ان میں سے حضرت یحییٰ نے تو پیچھے اپنی کوئی اولاد نہیں چھوڑی تھی،[5] البتہ باقی تین بیٹوں نے اولاد چھوڑی تھی۔[6]

علم کی تحصیل واشاعت اور علمی مقام ومرتبہ:

آپؒ نے جس ماحول میں آنکھ کھولی، خود اس ماحول میں ہی ہر طرف علم کے چرچے تھے، علم سیکھا سکھایا جارہا تھا، الغرض ایک بھرپور علمی فضا قائم تھی۔ اس ماحول سے ہٹ کر آپؒ کو تو گھرانہ ہی ایسا نصیب ہوا تھا جو علمِ نبوت کا حقیقی جانشین اور قرآن وسنت کا سچا ترجمان تھا۔ آپؒ کے والد امام زین العابدینؒ مفسرِ ماہر، محدثِ معتبر، اور فقیہِ لاثانی و عالمِ ربانی تھے جیسا کہ ان کی سیرت میں اس کی وضاحت ہوچکی ہے، چنانچہ آپؒ نے اپنے اس عظیم والدِ مکرم اور اسی طرح اپنے گھر کے دوسرے عظیم فرد وقابلِ فخر سپوت امام باقرؒ (جن کو باقر کہا ہی اسی لیے جاتا تھا کہ وہ علم کی گہرائیوں تک پہنچی ہوئی علمی شخصیت تھے[7]) سے علمی استفادہ کیا۔

آپؒ نے اپنے طلبِ علم کی ابتداء حفظِ قرآن سے کی، جیسا کہ اُس دَور میں یہی دستور تھا کہ صحابہ وتابعین اپنے بچوں کو شروع عمر میں ہی حفظ کرادیا کرتے تھے، اور پھر زندگی بھر قرآن کریم کے ساتھ آپؒ کا اشتغال رہا۔ قرآن

---

(۱) الطبقات الکبری ط العلمیة: ۵/ ۲۵۰، ونسب قریش ص: ۶۶

(۲) الخطط المقریزیة: ۴/ ۳۲۱ مع الکامل في التاریخ: ۴/ ۲۶۱، وتاریخ الطبري: ۷/ ۱۷۱

(۳) الطبقات الکبری: ۵/ ۲۵۰، ونسب قریش ص: ۶۶، والإفادة في تاریخ الأئمة السادة، ص: ۲۴

(۴) موسوعة آل بیت النبي: ۲/ ۳۸۶، والإفادة في تاریخ الأئمة السادة، ص: ۲۴

(۵) سیر أعلام النبلاء: ۵/ ۳۹۱، والإمام زید بن علي، ص: ۴۱، والمعارف: ۱/ ۲۱۶

(۶) الإفادة في تاریخ الأئمة السادة، ص: ۲۴

(۷) کما مر في سیرة الإمام الباقر، إن شئت فراجعه.

مجید کے بعد آپ علمِ حدیث کی طرف متوجہ ہوئے اور وقت کے عظیم محدث اپنے والدِ محترم سے تحصیلِ حدیث کی ابتداء کی، جس طرح آپؒ نے اپنے والد مکرم سے حدیث کا علم حاصل کیا اسی طرح ان سے علمِ فقہ بھی حاصل کیا کہ آپؒ کے والد محدث ہونے کے ساتھ ساتھ بڑے فقیہ بھی تھے۔ بہر حال آپؒ کے پہلے استاد آپؒ کے والد ہی تھے۔ اُن کے انتقال کے بعد آپؒ نے اپنے بڑے بھائی امام باقرؒ- جو بلاشبہ علم کے امام تھے سے حدیث وفقہ میں استفادہ کیا۔ اس طرح آپؒ کے دوسرے استاد امام باقرؒ ٹھہرے۔ اسی طرح آپؒ کے خاندان میں دوسرے بھی کئی جلیل القدر اصحابِ علم موجود تھے جو آپؒ کی علمی ترقی کا باعث بنے۔

آپؒ نے تحصیلِ علم میں صرف اپنے خاندان پر اکتفاء نہ کیا، اگرچہ یہ حضرات علم وعمل کے امام تھے مگر علم تو ایک ایسا سمندر ہے جس کا کوئی کنارہ نہیں، اس لیے آپؒ نے مدینہ منورہ کے دیگر علماء حضرات سے بھی کسبِ فیض کیا نیز مدینہ کے مشہور سات بڑے علماء جو ''فقہاء سبعہ'' کے لقب سے معروف تھے (یعنی سعید بن مسیب، عروہ بن زبیر، قاسم بن محمد، خارجہ بن زید، ابوبکر بن عبدالرحمن، سلیمان بن یسار، عبیداللہ بن عبداللہ) کا بھی زمانہ پایا، لہٰذا یقیناً اُن سے استفادہ بھی کیا ہوگا۔

پھر آپؒ نے طلبِ علم کے لیے مدینہ میں رہنے پر بھی اکتفاء نہ کیا بلکہ جب آپؒ کو علوم میں پختگی حاصل ہوگئی تو آپؒ مدینہ طیبہ سے باہر نکلے، عراق کی طرف رختِ سفر باندھا اور وہاں اس کے مشہور علمی شہر ''کوفہ'' و ''بصرہ'' کے علماء کے پاس پہنچے، ان سے بھی استفادہ کیا اور علم میں ترقی کرتے کرتے ''طالب علم'' کے مرتبہ سے نکل کر ایک ''مقتدا وپیشوا عالمِ ربانی'' کے مرتبے پر فائز ہوئے۔[1]

آپؒ کو تحصیلِ علم کی ایک دُھن اور لگن تھی، عبداللہ بن عیسیٰ کہتے ہیں کہ میری زید بن علی سے ملاقات ہوئی، میں نے انہیں کچھ احادیث سنائیں۔ انہوں نے (اُسی وقت) وہ حدیثیں اُن تختیوں پر لکھ لیں جو انہوں نے اپنے ساتھ رکھی ہوئی تھیں اور میں نے دیکھا وہ چھوٹی چھوٹی تختیاں تھیں جو لکھائی کے کام آتی ہیں۔[2] بہر حال آپؒ نے نہایت ذوق وشوق اور محنت ولگن سے علوم حاصل کیے جن میں قرآن، حدیث، فقہ، عقائد اور عربی ادب وغیرہ کے علوم سرفہرست

---

(۱) مستفاد من: الإمام زید بن علي، ص: ۳۹، ۴۰، ۴۶، ۵۰ مع الإمام زید لأبي زهرة، ص: ۳۴، ۴۵، ۵۴ و ۹۲، ۱۲۸، ۱۷۳، ۱۷۴ وموسوعة آل بیت النبي: ۲/ ۴۶۶ بتلخیص.

(۲) العلل ومعرفة الرجال لأحمد: ۲/ ۴۱۷

ہیں، اور آپؒ نے یہ علوم محض حاصل ہی نہیں کیے بلکہ ان میں کمال کو پہنچے۔[1]

یہ اسی کمال کا ہی نتیجہ تھا کہ آپؒ کا بلند علمی مقام و مرتبہ سب کے ہاں مسلَّم ٹھہرا اور پھر مورخین و مصنفین نے آپؒ کے اس اعلیٰ علمی مقام کو مختلف الفاظ میں قلمبند کیا، چنانچہ ذیل میں صرف بعض کتب کی عبارات درج کی جاتی ہیں:

۱۔ آپؒ کے بڑے بھائی اور آپؒ کے استاد حضرت امام باقرؒ سے کسی شخص نے آپؒ کے متعلق پوچھا تو انہوں نے جواب میں فرمایا: ''تم نے مجھ سے ایک ایسے آدمی کے متعلق پوچھا ہے جو اپنے سر کے بالوں سے لے کر پاؤں کے ناخنوں تک ایمان اور ''علم'' سے بھرا ہوا ہے۔'' اسی طرح امام باقرؒ کا آپؒ کے متعلق یہ بھی فرمان ہے: ''واللہ! میرے اس بھائی کو ''علمِ لَدُنِّی''[2] عطا کیا گیا ہے، یہ وہ کچھ جانتے ہیں جو ہم نہیں جانتے۔''[3]

۲۔ ابو اسحاق سُبَیعِیؒ کہتے ہیں: ''میں نے زید بن علی سے ملاقات کی ہے، میں نے اُن کے خاندان میں اُن جیسا کوئی شخص نہیں دیکھا، نہ اُن سے بڑا عالم اور نہ اُن سے افضل۔''[4]

۳۔ امام اعمش کہتے ہیں: زید بن علی کے خاندان میں ان کے برابر کوئی فرد نہیں تھا، کم از کم میں نے ان کے خاندان میں ان سے زیادہ صاحبِ مرتبہ، اور ان سے بڑا عالم نہیں دیکھا۔[5]

۴۔ امام زید کے ہم عصر علماء کا اس بات پر اجماع ہے کہ آپؒ مختلف علومِ اسلامیہ کے ماہر اور بڑے پائے کے عالم تھے۔ آپؒ قرآن مجید کے جملہ علوم جیسے علمِ قراءت، علمِ تفسیر اور ناسخ و منسوخ وغیرہ علوم پر مکمل دسترس رکھتے تھے، اسی طرح علم العقائد اور علم الفقہ میں مجتہدانہ شان کے حامل تھے، چنانچہ کوفہ کے بڑے بڑے فقہاء آپؒ سے فیض حاصل کرتے تھے حتی کہ وقت کے امامِ اعظم امام ابو حنیفہؒ نے بھی دو سال آپؒ کی شاگردی اختیار کی۔ اور پھر وہ (یعنی امام ابو حنیفہؒ) خود فرماتے ہیں: ''میں نے جس طرح زید بن علی کو دیکھا ہے اسی طرح ان کے خاندان کو بھی دیکھا ہے، مگر میں نے ان کے زمانہ میں زید بن علی سے بڑا نہ کوئی فقیہ دیکھا ہے اور نہ ہی ان سے بڑا کوئی عالم میری نظر سے گزرا ہے۔۔۔

---

(۱) ینظر: الإمام زید بن علي، ص: ۱۷

(۲) علمِ لَدُنّی: وہ علم جو کسی کو اللہ کی طرف سے براہِ راست بغیر استاد حاصل ہو۔ (فیروز اللغات، ص: ۹۰۲)

(۳) الروض النضیر: ۱/۵۵ و ۱/۶۱ مع الإمام زید بن علي، ص: ۱۷

(۴) الخطط للمقریزي: ۴/۳۱۷

(۵) الخطط للمقریزي: ۴/۳۱۷

حق بات یہ ہے کہ ان کے مقابل کا کوئی آدمی تھا ہی نہیں۔'' اسی طرح علمِ حدیث میں بھی آپؒ اجتہاد کا مقام رکھتے تھے، اور حضرات اہلِ بیت سمیت دیگر حضرات سے بھی احادیث کے راوی تھے (جیسا کہ اس کی کچھ تفصیل آئندہ آئے گی)۔ [1]

۵۔ علماء اہل بیت میں سے حضرت زیدؒ کے سب سے زیادہ شاگرد ہیں۔ [2]

۶۔ آپؒ بیک وقت مفسر، فقیہ، خطیب اور شاعر تھے۔ [3]

۷۔ آپؒ جلیل القدر متقی عالم تھے۔ [4]

اساتذہ وشیوخ:

اللہ کریم نے امام زید سَلامُ اللہِ وَ رَحمۃُ علیہ، کو اپنے وقت کے جلیل القدر اساتذہ وشیوخ عطا فرمائے جن سے آپؒ نے علم حاصل کیا اور ان سے روایاتِ حدیث لیں، حتی کہ آپؒ کو بعض صحابہ کرامؓ سے بھی ملاقات کا شرفِ عظیم حاصل ہوا اور ان سے آپؒ نے بعض احادیث لیں جیسا کہ راجح قول کے مطابق آپؒ کی حضرت ابوطفیل عامر بن واثلہ رضی اللہ عنہ (یہ وہ صحابئ رسول ہیں جن کی، تمام صحابہ میں سے، سب سے آخر میں وفات ہوئی [5]) سے ملاقات ہوئی اور آپؒ نے ان سے بعض احادیث روایت کیں، بہرحال جس طرح آپؒ نے بعض صحابہ سے روایات لیں اسی طرح تابعین کی بھی ایک بڑی جماعت سے روایات لیں اور ان سے علم کا ایک وافر حصہ حاصل کیا، چنانچہ ذیل میں آپؒ کے بعض اساتذہ وشیوخ کے اسماء گرامی درج کیے جا رہے ہیں:

امام زین العابدین، امام باقر، محمد بن اسامہ بن زید، اَبان بن عثمان، عروہ بن زبیر، وغیرہ۔ [6]

---

(۱) ینظر: الإمام زید لأبي زهرة، ص:۷۳، والأعلام للزركلي: ۵۹/۳، والخطط للمقريزي: ۳۱۷/۴، وامام ابو حنیفہ کی سیاسی زندگی، ص:۱۶۵، وتاريخ الكوفة، ص:۳۴۴

(۲) الإمام زید لأبي زهرة، ص:۲۳۷، والإمام زید بن علي، ص:۶۵، وامام اعظم ابو حنیفہ شہید اہلِ بیت، ص:۱۰۱

(۳) معجم المفسرين: ۱۹۸/۱

(۴) سير أعلام النبلاء: ۳۸۹/۵، وتاريخ الإسلام: ۱۰۵/۸

(۵) تدريب الراوي: ۶۹۱/۲، وفتح المغيث: ۱۲۸/۴، وتوجيه النظر: ۲۳/۱، والغاية ص:۲۳۷، والمنهل الروي ص:۱۱۲

(۶) الإمام زید بن علي، ص:۴۴، ۴۶، مع تهذيب التهذيب: ۴۱۹/۳، والكنى والأسماء للمسلم: ۲۵۱/۱

تلامذہ:

ایک بہت بڑی تعداد نے آپؒ سے فیض حاصل کیا جس میں نامور فقہاء ومحدثین کے اسماء بھی ملتے ہیں- جیسا کہ ابھی اوپر بھی بیان ہوا کہ علماء اہلِ بیت میں سے سب سے زیادہ شاگرد آپؒ ہی کے ہیں- تاہم ذیل میں آپؒ کے صرف چیدہ چیدہ تلامذہ کے اسماء ذکر کیے جاتے ہیں:

آپؒ کے صاحبزادے حسین بن زید ومحمد بن زید کے علاوہ، اَجلح بن عبداللہ کندی، آدم بن عبداللہ خَثعمی، اسحاق بن سالم، اسماعیل بن عبدالرحمن سدی، بسام صَیرفی، ابوحمزہ ثابت بن ابی صفیہ ثمالی، خالد بن صفوان، راشد بن سعد کوفی، زبید یامی، زیاد بن منذر ہمدانی، سعید بن خثیم ہلالی، عبدالرحمن بن ابی زناد، ابوخالد عمرو بن خالد واسطی، فضیل بن مرزوق، عبدالرحمٰن بن حارث، ہارون بن سعد عجلی، ہاشم بن برید، منصور بن معتمر، امام جعفر صادق، امام ابوحنیفہ، امام زہری، امام اعمش، امام شعبہ، وغیرہ وغیرہ۔[1]

---

(1) ينظر له: الإمام زيد بن علي، ص: ٦٥، والإمام زيد لأبي زهرة، ص: ٢٣٧ مع تهذيب الكمال للمزي: ١٠/ ٩٦ ومختصر التحفة الاثني عشرية: ١/ ٨، وتاريخ الكوفة: ١/ ٣٤٤، وتهذيب التهذيب: ٣/ ٤١٩، والروض النضير: ١/ ٦١، والكنى والأسماء للمسلم: ١/ ٢٥١

علومِ مختلفہ میں آپؒ کے علمی مقام کی جھلک

علومِ قرآن میں مقام:

علومِ قرآن کی ابتداء تو آپؒ نے چھوٹی عمر میں ہی کر دی تھی کہ ابھی آپؒ بچے تھے کہ مکمل قرآن مجید حفظ کر لیا تھا اور نہایت خوبصورت آواز میں تلاوت کرنے لگے تھے۔

اس کے بعد آپؒ نے باقاعدہ "علمِ قراءت" بھی حاصل کیا، اس میں مہارتِ تامہ پیدا کی اور اس حد تک آپؒ نے "قراءت" میں کمال حاصل کر لیا تھا کہ آپؒ اپنے دَور میں "قراءت" کے سب سے بڑے عالم شمار ہوتے تھے[1]۔ خود امام جعفر صادقؒ کا آپؒ کے متعلق بیان ہے کہ: كَانَ وَاللهِ أَقْرَأَنَا لِكِتَابِ اللهِ (یعنی واللہ! وہ ہم میں سے قرآن کے سب سے بڑے قاری تھے)[2]۔ اسی طرح آپؒ کے بڑے بھائی امام باقرؒ نے ابوخالد واسطی اور ابوحمزہ ثمالی کو آپؒ کے بارے میں بتاتے ہوئے اُن سے مخاطب ہو کر فرمایا: اے ابوخالد اور ابوحمزہ! ایک دفعہ میرے والد صاحب نے میرے بھائی زید کو بلایا اور اُن سے قرآن پڑھوایا، انہوں نے سنا دیا۔ پھر والد صاحب نے ان سے پیچیدہ اور مشکل مشکل سوالات کیے، انہوں نے ماشاء اللہ ان کے بھی جوابات دے دیے، اس پر والد صاحب نے ان کو دعائیں دیں پھر ان کی پیشانی چومی[3]

چنانچہ آپؒ کو اپنے خاندان یعنی اہلِ بیت میں یہ برتری نصیب تھی کہ دوسرے افراد کی بہ نسبت آپؒ کو علمِ قراءت میں خصوصی مہارت و کمال حاصل تھا۔[4]

علومِ قرآن میں سے یہ تو آپؒ کے حفظ و قراءت کے متعلق گفتگو تھی، باقی جہاں تک علمِ تفسیر کا معاملہ ہے تو اس میں بھی آپؒ ایک بڑے درجہ کے مفسر تھے، ہر ہر آیت پر اس کے ہمہ جہتی پہلوؤں اور زاویوں کے لحاظ سے مکمل تفسیری

---

(۱) الإمام زيد بن علي، ص: ۲۷ مع الإمام زيد لأبي زهرة، ص: ۴۵

(۲) سير اعلام النبلاء: ۵/ ۳۹۰، وتهذيب الكمال للمزي: ۱۰/ ۹۷، ومختصر تاريخ دمشق: ۹/ ۱۵۲، وتاريخ الإسلام: ۸/ ۱۰۶، وبغية الطلب في تاريخ حلب: ۹/ ۴۰۲۹، والخطط للمقريزي: ۴/ ۳۱۷

(۳) الإمام زيد بن علي، ص: ۲۷ نقلا عن الروض النضير: ۱/ ۵۴

(۴) الحور العين مع شرحه، ص: ۲۴۰، والإمام زيد بن علي، ص: ۷۳

دسترس و واقفیت حاصل تھی، جیسا کہ خود آپؒ کے ایک موقع پر فرمائے گئے ارشاد سے یہ بالکل واضح ہے، چنانچہ آپؒ نے ایک موقع کی مناسبت سے ارشاد فرمایا تھا: سَلُونِي قَبلَ أَنْ تَفقِدُونِي، فَإِنَّكُم لَنْ تَسأَلُوا مِثْلِي، وَاللهِ! لَا تَسأَلُونِي عَنْ آيَةٍ مِن كِتَابِ اللهِ إِلَّا أَنبَأْتُكُم بِهَا ''مجھ سے جو پوچھنا ہے پوچھ لو اس سے پہلے کہ میں تم سے رخصت ہو جاؤں، کیونکہ تمہیں پھر مجھ جیسا کوئی شخص نہیں ملے گا۔ واللہ! تم مجھ سے کتاب اللہ کی جس آیت کے متعلق بھی پوچھو گے میں بتلاؤں گا۔''[1]

اسی طرح جب آپؒ نے جہاد کا اعلان کیا تھا تو اس موقع پر اہلِ کوفہ کو مخاطب کر کے جو جملے ارشاد فرمائے تھے وہ بھی اس بات کا مکمل پتا دیتے ہیں کہ آپؒ کو علمِ تفسیر کے جملہ علوم کی گہری و کامل فہم حاصل تھی، آپؒ نے فرمایا تھا:

''مجھے میرے رب کی قسم! میں اِس جہاد کے لیے اُس وقت تک نہیں نکلا جب تک میں نے قرآن (مکمل فہم کے ساتھ) نہیں پڑھ لیا، فرائض، سنن اور آداب میں رسوخ نہیں حاصل کر لیا، آیاتِ قرآنیہ کے شانِ نزول کی طرح اِن کے مطلب و مراد کو نہیں جان لیا، اور ان میں ناسخ، منسوخ، مُحکم، مُتشابہ، خاص اور عام (الغرض تفسیر کے تمام علمی مباحث) کو نہیں سمجھ لیا تھا۔''[2]

آپؒ کی یہ مختصر سی گفتگو نہایت جامعیت کے ساتھ اس امر کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ آپؒ کو علومِ قرآن میں غیر معمولی رسوخ و کمال حاصل تھا۔

حضرت عبداللہ بن محمد بن علی، امام زید اور امام باقر کے درمیان علمِ تفسیر کا موازنہ کرتے ہوئے بیان کرتے ہیں: امام زید کو قرآن کا وہ علم حاصل تھا جو امام باقر کو نہیں تھا۔ کسی نے پوچھا: وہ کیسے؟ فرمایا: کیونکہ حضرت زیدؒ کو قرآن کا علم بھی حاصل تھا اور اس کی (منجانب اللہ) خصوصی فہم بھی عطا ہوئی تھی جبکہ حضرت باقرؒ نے تو صرف وہی علم حاصل کر رکھا تھا جو انہوں نے اپنے اساتذہ سے سنا تھا۔[3]

بہر حال اللہ تعالیٰ نے امام زیدؒ کو تفسیرِ قرآن سے بطورِ خاص نوازا تھا، آپؒ کی تفسیرِ قرآن کی چند مثالیں حاضرِ

---

(۱) المصابيح لأبي العباس، ص: ۳۹۴، والروض النضير: ۱/ ۷۳، والإمام زيد بن علي، ص: ۷۳

(۲) الخطط المقريزية: ۴/ ۳۲۳، ومثله في الروض النضير: ۱/ ۷۳

(۳) الروض النضير: ۱/ ۵۲ مع الإمام زيد بن علي، ص: ۷۴

خدمت ہیں:

۱۔ آپؒ نے سورۂ آلِ عمران کی معروف آیت {وَلْتَكُنْ مِنكُمْ أُمَّةٌ يَدْعُونَ إِلَى الْخَيْرِ وَيَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنكَرِ وَأُولَئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ} [یعنی تم میں سے ایک جماعت ایسی ہونی چاہیے جو لوگوں کو بھلائی کی طرف بلائے، نیکی کا حکم کرے اور برائی سے روکے، یہی لوگ ہیں جو فلاح پانے والے ہیں۔] کی تفسیر میں فرمایا: امت کا جو شخص امر بالمعروف ونہی عن المنکر (یعنی نیکی کا حکم کرنا اور برائی سے منع کرنا) چھوڑ دے وہ اِس خیرِ اُمت (یعنی بہترین امت) میں شامل نہیں ہے۔[1]

۲۔ خالد بن صفوان کہتے ہیں کہ میں نے حضرت زید بن علیؒ کو جہاد کے فضائل بیان کرتے ہوئے سنا، آپؒ فرمارہے تھے:

''اے لوگو! جہاد کو لازم پکڑو کیونکہ یہ دین کی بقاء کا ذریعہ ہے، نیز یہ اسلام کا ستون اور ایمان کا مینار ہے۔ اس بات کو اچھی طرح سمجھ لو کہ جن لوگوں نے جب کبھی جہاد کو چھوڑا ہے، ذلت ورسوائی ان کا مقدر ہوئی ہے۔'' اس کے بعد سورۂ فاتحہ پڑھ کر سنائی، جب اس آیت پر پہنچے: اهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ (اے اللہ ہمیں سیدھا راستہ دکھا) تو اس کی تفسیر میں فرمایا: ''صراطِ مستقیم'' سے مراد اللہ کا دین ہے، اور دین کی بلندی اور اس کی بقاء کا دارومدار جہاد پر ہے۔[2]

۳۔ آپؒ نے سورۃ الضحیٰ کی آیت {وَلَسَوْفَ يُعْطِيكَ رَبُّكَ فَتَرْضَى} [یعنی اے پیغمبر! عنقریب آپ کا رب آپ کو اتنا دے گا کہ آپ خوش ہو جائیں گے] کے متعلق فرمایا: بے شک حضور ﷺ کی خوشی کی ایک بات یہ بھی ہے کہ آپ ﷺ کے صاحبزادوں کے اہلِ خانہ جنت میں چلے جائیں۔[3]

۴۔ سورہ آلِ عمران کی آیت {وَسَيَجْزِي اللَّهُ الشَّاكِرِينَ} (یعنی اللہ تعالی اپنے شکر گزار بندوں کو بہت اچھا بدلہ عطا فرمائے گا) کی تفسیر میں لفظِ ''شاکرین'' کی وضاحت کرتے ہوئے فرمایا کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ''امام الشاکرین'' تھے یعنی جن شکر گزار بندوں کو اللہ تعالی اپنے پاس سے اجر وانعامات سے نوازے گا، سیدنا

---

(۱) الروض النضير: ۱/۵۷ وكذا في الإمام زيد بن علي، ص: ۷۵

(۲) الروض النضير: ۱/۵۶، والإمام زيد بن علي، ص: ۷۵

(۳) مختصر تاريخ دمشق: ۹/۱۵۲، وفوات الوفيات: ۲/۳۶

صدیقِ اکبرؓ اُن انعام پانے والوں کے امام ہوں گے [1]، اور ساتھ ہی یہ بھی فرمایا کہ جو شخص حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے بری ہے وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بھی بری ہے۔ [2]

۵۔ آپؒ کے شاگرد آدم بن عبداللہ خثعمیؒ کہتے ہیں کہ میں نے اپنے استاد امام زید بن علیؒ سے سورۃ الواقعہ کی آیات {وَالسَّابِقُونَ السَّابِقُونَ *أُولَئِكَ الْمُقَرَّبُونَ} [یعنی جو سبقت لے جانے والے لوگ ہیں، وہ تو ہیں ہی سبقت لے جانے والے ¤ یہ وہی لوگ ہیں جو اللہ کے خاص مقرب بندے ہیں] کے متعلق پوچھا کہ یہ کون لوگ ہیں؟ آپؒ نے جواب میں فرمایا: حضرت ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما، پھر فرمایا کہ اللہ تعالیٰ مجھے اپنے نانا (ﷺ) کی شفاعت سے محروم رکھے اگر میرے دل میں اِن حضرات کی محبت نہ ہو۔ [3]

اس کے علاوہ اور بھی کئی مثالیں ہیں، [4] مندرجہ بالا مثالیں صرف بطورِ نمونہ ذکر کی گئی ہیں۔ نیز آپؒ کے علومِ قرآن سے واقفیت واستحضار سے متعلق - یہاں اختصار کی وجہ سے - صرف اتنا ذکر کر دینا ذرا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ تاریخ کے مطالعہ سے اس کا بھی ثبوت ملتا ہے کہ قرآن کے مضامین ہر وقت آپؒ کے دماغ میں حاضر رہتے تھے اور ان کے مفاہیم ومطالب پر آپؒ کو عبور حاصل تھا۔ [5]

حدیث میں مقام:

آپؒ کے والد ماجد امام زین العابدینؒ وقت کے ایک بڑے محدث تھے، آپؒ نے ان سے علمِ حدیث میں خوب استفادہ کیا، اسی طرح وقت کے اور بھی کئی اکابر مشائخ سے آپؒ نے پوری محنت کے ساتھ علمِ حدیث حاصل کیا، حتیٰ کہ آپؒ علمِ حدیث میں ایک بلند مقام پر جا فائز ہوئے اور ائمۂ حدیث نے آپؒ کو حدیث کے معاملہ میں معتبر اور امین شخصیت تسلیم کیا۔

پھر ایک وقت آیا کہ آپؒ علمِ حدیث میں امام اور جلیل القدر محدث ٹھہرے کہ آپؒ کو احادیث پر مکمل عبور حاصل

---

(۱) مختصر تاریخ دمشق: ۹/۱۵۲، وفوات الوفيات: ۲/۳۶، وبغية الطلب: ۹/۴۰۴۰

(۲) سير أعلام النبلاء: ۵/۳۹۰، وتاريخ الإسلام: ۸/۱۰۷

(۳) مختصر تاریخ دمشق: ۹/۱۵۲، وفوات الوفيات: ۲/۳۶

(۴) لاحظ لها: الروض النضير: ۱/۵۲، والإمام زيد بن علي، ص: ۷۵

(۵) راجع على سبيل المثال: مختصر تاريخ دمشق: ۹/۱۵۴ مقرونا بالآيتين: ۵۴ و ۵۵ من سورة مريم.

ہو چکا تھا جیسا کہ ایک موقع پر آپؒ نے فرمایا تھا: سَلُوني قَبلَ أَن تفقِدُوني، فإنّكم لَن تَسألُوا مِثلي، وَاللهِ! لا تَسألُوني عَن آيَةٍ مِن كِتابِ اللهِ إلاّ أنبأتُكم بِها وَلا تَسألُوني عَن حَرفٍ مِن سُنّةِ رَسُولِ اللهِ صلى الله عليه وسلم إلاّ أنبأتُكم بِه

''مجھ سے جو پوچھنا ہے پوچھ لو، اس سے پہلے کہ میں تم سے رخصت ہو جاؤں، کیونکہ تمہیں پھر مجھ جیسا کوئی شخص نہیں ملے گا۔ واللہ! تم مجھ سے کتاب اللہ کی جس آیت کے متعلق بھی پوچھو گے میں بتلاؤں گا اور اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جس سنت وحدیث کے بارے میں بھی پوچھو گے میں بتلاؤں گا۔''

آپؒ کی جلالتِ قدر کا اندازہ اس سے بھی واضح طور پر ہوتا ہے کہ شاگردوں کی ایک غیر معمولی تعداد نے آپؒ سے احادیث حاصل کیں جیسا کہ ان میں سے بعض کے اسماء پیچھے ''تلامذہ'' کے عنوان کے تحت گزر چکے ہیں۔ اس کے علاوہ ''مجموع'' کے نام سے، ایک کتابِ حدیث بھی آپؒ کی طرف منسوب ہے جس میں تین سو سے زائد آپؒ کی اپنی روایت کردہ احادیثِ شریفہ مذکور ہیں۔[1]

فقہ میں مقام:

قرآن وحدیث کی طرح آپؒ کو فقہ میں بھی اعلیٰ مقام وکمال حاصل تھا، حتیٰ کہ آپؒ فقہ میں امامِ مجتہد کے مرتبے پر فائز تھے۔ آپؒ نے فقہ میں جو بے مثل کمال پایا، بڑے بڑے فقہاء نے اُس کی گواہی دی ہے، چنانچہ آپؒ کے متعلق حضرت امام جعفر صادقؒ کا بیان ہے: كانَ وَاللهِ أقرَأنا لِكتابِ اللهِ وأفقَهَنا فِي دِينِ الله (واللہ! وہ ہم میں سب سے بڑے قاریٔ قرآن اور سب سے بڑے فقیہِ اسلام تھے)، اسی طرح امام اعظم امام ابوحنیفہؒ کا ان کی علمی شان وفقہی مقام کے متعلق فرمان پیچھے گزر چکا ہے جس میں آپؒ نے فرمایا: مَارَأيتُ فِي زَمانِهِ أفقَهَ مِنه (میں نے ان کے زمانے میں ان سے بڑا کوئی فقیہ نہیں دیکھا) اور امام شعبیؒ نے تو اُن کے ''بے مثل فقیہ'' ہونے کو، لوگوں کے ذہنوں میں بٹھانے کے لیے یہاں تک فرما دیا تھا کہ: مَا وَلَدتِ النِّساءُ أفضَلَ مِن زيدِ بنِ عليٍّ ولا أفقَهَ مِنه (عورتوں نے زید بن علی سے بہتر شخص اور ان سے بڑا فقیہ، جنا ہی نہیں ہے)۔

---

(۱) ينظر: الإمام زيد لأبي زهرة، ص:۳۷ مع الإمام زيد بن علي، ص:۷۳ و۷۶، ۷۸، والمصابيح لأبي العباس، ص:۳۹۴، والروض النضير: ۱/۷۳

آپؒ کی علمِ فقہ میں گہرائی وپختگی اور صحت ووثوق کا اندازہ اس سے بھی کیا جا سکتا ہے کہ متعدد بڑے فقہاء نے آپؒ سے علم حاصل کیا جیسے سلمہ بن کُہیل، یزید بن ابی زیاد، ہارون بن سعد اور ابوحنیفہ نعمان بن ثابت وغیرہ۔ آپؒ کا یہ مقام دراصل آپؒ کی محنت کا صلہ ہے کہ آپؒ نے علومِ فقہ کی تحصیل میں صرف اپنے شہر وعلاقہ اور اپنے خاندان کے علماء ومشائخ پر اکتفا نہیں کیا بلکہ دیگر علاقوں کی بھی خاک چھانی اور وہاں کے فقہاء ومشائخ سے استفادہ کیا۔

یہاں آخر میں ایک مشہور امر کی طرف اشارہ کرنا بھی مناسب معلوم ہوتا ہے کہ امام زیدؒ کی جانب ایک خاص فقہی مسلک بھی منسوب ہے، کہا جاتا ہے کہ اُن کے ایک شاگرد "ابو خالد واسطی" نے "المجموع الفقہی" نامی کتاب میں اسے مدوّن کیا ہے۔ اسی "المجموع الفقہی" کو "مسند الامام زید" بھی کہا جاتا ہے۔[2]

فصاحت وخطابت:

آپؒ جہاں ایک علمی شخصیت تھے جیسا کہ ابھی گزرا، وہاں ایک فصیح وبلیغ اور بے مثل وباکمال خطیب بھی تھے، جیسا کہ خالد بن صفوان کی روایت میں ہے کہ بنو ہاشم میں "زید بن علی" پر فصاحت وخطابت کی بس تھی یعنی بنو ہاشم میں آپؒ سے بڑا نہ کوئی فصیح اور نہ ہی کوئی بڑا خطیب تھا۔[3] ابو اسحاق سَبیعی کہتے ہیں کہ میں نے زید بن علی کو دیکھا تھا مگر مجھے ان کے خاندان میں ان جیسی صاحبِ علم شخصیت نہیں ملی نیز وہ ان میں سب سے زیادہ فصیح اللسان بھی تھے۔[4]

اسی طرح امام ابوحنیفہؒ کا فرمان ہے کہ امام زید بن علی کے زمانے میں اُن سے بڑا فقیہ، اُن سے زیادہ حاضر جواب، اور ان سے زیادہ واضح وصاف گفتگو کرنے والا مجھے کوئی نہیں ملا۔[5] اور علامہ بلاذُری لکھتے ہیں کہ "زید بن علی"

---

(۱) ینظر: الخطط للمَقریزي: ۴/۱۷۳ مع امام اعظم ابو حنیفہ شہید اہلِ بیت، ص: ۹۹، وامام ابو حنیفہ کی سیاسی زندگی، ص: ۱۶۵ والإمام زید بن علي، ص: ۸۰ وبعضہ ممامر سابقا.

ملحوظـــة: وینبغي أن یلاحَظ للکلام حول الکتب المنسوبة إلیه: الإمام زید بن علي، ص: ۸۳ مع ۱۰۹، والإمام زید لأبي زهرة، ص: ۲۳۰، والأعلام للزرکلي: ۳/۵۹

(۲) مسند الإمام زید، ص: ۱۰ و ۱۷

(۳) الإفادة في تاریخ الأئمة السادة، ص: ۲۳

(۴) الخطط للمَقریزي: ۴/۱۷۳، والروض النضیر: ۱/۵۰

(۵) الأعلام للزرکلي: ۳/۵۹، والخطط للمَقریزي: ۴/۱۷۳، والروض النضیر: ۱/۵۰

شیریں بیان وفصیح الکلام خطیب تھے،[1] ان کے علاوہ جاحظ نے بھی آپؒ کو بنو ہاشم کے خطباء میں شمار کیا ہے۔[2]

بہرحال اکابر علما وفقہا کی شہادتوں کے مطابق آپؒ ایک صاحبِ علم بے مثل خطیب تھے جیسا کہ بعض کتب میں آپؒ کی خطابت کی ہلکی سی جھلک بھی پیش کی گئی ہے چنانچہ ''الروض النضیر'' میں درج ہے کہ آپؒ نے ایک دفعہ ''فضائلِ جہاد'' کے موضوع پر بیان فرمایا، اس بیان میں شروع میں جہاد پر ابھارا، پھر قرآن کی ابتداء سے لے کر انتہاء تک جہاد اور مجاہدین کے فضائل میں جتنی آیتیں قرآن میں جہاں جہاں آئی ہیں وہ سب آیات وہیں ایک ہی مجلس میں لوگوں کے سامنے بیان کرڈالیں۔[3] خطابت کی یہ مختصر سی جھلک جہاں آپؒ کے قوتِ حافظہ کی عکاسی کرتی ہے وہاں قرآنی دلائل سے مزیّن علمی خطابت کا بھی شاہکار بن کر سامنے آتی ہے اور اس ضمن میں دیگر خطباءِ امت کو مستند وعلمی خطابت کی دعوت دیتی ہے۔

مدینہ سے کوفہ آمد، اور مظالمِ حکومت:

آگے چلنے سے پہلے یہاں بطورِ تمہید، چند افراد کا تعارف کرانا ضروری معلوم ہورہا ہے:

امام زید بن علی سَلامُ اللهِ وَرَحمۃُ علیہ، کا وطن مدینہ طیبہ تھا جیسا کہ شروع میں گزرا اور آپؒ یہیں رہتے تھے۔

وقت کا بادشاہ ''ہشام بن عبدالملک'' تھا جس کا تعلق بنو امیہ سے تھا، یہ ملکِ شام کے مشہور شہر اور دار الخلافہ ''دمشق'' میں رہتا تھا۔ اِس نے ۱۰۵ھ میں ''خالد بن عبداللہ قَسرِی'' کو کوفہ اور بصرہ کا والی بنایا تھا، پھر ۱۲۰ھ میں اسے معزول کرکے ''یوسف بن عمر ثَقَفی'' کو ریاستِ عراق کا والی بنادیا تھا جو کہ کوفہ کے قریب ''حِیرہ'' شہر میں رہتا تھا (اور یہ شہر، اُس وقت کوفہ سے صرف تین میل کی مسافت پر واقع تھا، اگرچہ اب اِس شہر کا نام ونشان بھی باقی نہیں رہا[4])۔ کوفہ جو عراق کا مرکزی ومشہور شہر تھا اور اِس والیٔ عراق ''یوسف بن عمر'' کے ماتحت شمار ہوتا تھا، اس شہر کا گورنر ''حَکَم بن صَلت'' تھا جو اِسی ''یوسف بن عمر'' کی زیرِ نگرانی اور اس کے حکم سے کام کرتا تھا۔[5]

---

(۱) أنساب الأشراف: ۳/۲۲۹

(۲) الأعلام للزركلي: ۳/۵۹. وانظر أيضا: البيان والتبيين: ۱/۲۵۳

(۳) راجع: الروض النضير: ۱/۵۲. والإمام زيد بن علي، ص: ۷۵

(۴) معجم البلدان: ۲/۳۲۸ مع آثار البلاد وأخبار العباد، ص: ۳۵۹

(۵) راجع له: الأعلام للزركلي: ۸/۸۲ و ۲/۲۹۷ و ۸/۲۳۳ و ۳/۵۹ مع المنتظم لابن الجوزي: ۷/۲۰۹، وأنساب الأشراف: ۳/۲۵۰، وثورة زيد بن علي، ص: ۵۷، والخطط المقريزية: ۴/۳۲۱، ۳۲۲

اس تمہید کے بعد اب آگے چلتے ہیں:

خالد قسری نے اپنے معزول ہونے کے بعد، والیٔ عراق یوسف ثقفی کے پاس امام زیدؒ پر الزام لگایا کہ میں نے اس کے پاس بہت سا مال امانت رکھوایا تھا (لہذا وہ مال اب اس سے وصول کرلو)۔ یوسف ثقفی نے عراق سے ہشام کو خط لکھا اور اس ساری صورتِ حال سے آگاہ کیا (کہ زید بن علی نے بہت سا مال دبا رکھا ہے، چنانچہ اس سے وہ وصول کیا جائے)۔ ہشام کا سلوک ورویہ امام زید بن علیؒ کے ساتھ اچھا نہیں تھا جس کا نظارہ انشاء اللہ اسی مضمون میں ہوتا رہے گا ، بہرحال ہشام نے خط پہنچتے پر گورنرِ مدینہ کو خط لکھ ڈالا کہ زید بن علی کو مدینہ سے یہاں میرے پاس بھیجو۔ گورنرِ مدینہ نے آپؒ کو طلب کر کے کہا: مجھے معلوم ہے کہ آپؒ اس معاملہ میں بے قصور ہیں، مگر بادشاہ ''ہشام بن عبدالملک'' کا حکم ہے اس لیے آپؒ کو بہر صورت وہاں پیش ہونا پڑے گا، اِس کے بعد اُس نے آپؒ کو ہشام کے پاس دمشق بھجوا دیا۔ ہشام نے آپؒ سے پوچھ گچھ کی، آپؒ نے فرمایا: واللہ! میرے پاس اُس کی کوئی امانت نہیں ہے۔ کافی جرح وسوال کے بعد ہشام نے آپؒ کی بات تسلیم کرلی اور آپؒ کی صداقت چونکہ بالکل واضح و بے غبار تھی اس لیے ہشام خود اعتراف کرتے ہوئے آپؒ سے مخاطب ہوا: آپ میرے نزدیک ''نصرانیہ کے لڑکے (یعنی خالد قسری)'' سے زیادہ سچے ہیں۔

اس کے بعد ہشام نے آپؒ کو واپس مدینہ بھیجنے کے بجائے یوسف ثقفی کے پاس بھجوا دیا، چنانچہ آپؒ اُس کے پاس عراق پہنچا دیے گئے۔ اُس کو بھی معاملہ کی تحقیق سے جب معلوم ہوگیا کہ آپ سچے ہیں اور خالد جھوٹا ہے تو اس نے آپ کو چھوڑ دیا۔

اس کے بعد امام زیدؒ پھر وہیں کوفہ میں ٹھہر گئے۔ اس طرح تقدیر آپؒ کو مدینہ طیبہ سے کوفہ میں لے آئی جہاں مالکِ تقدیر نے آپؒ سے ظلم وستم کے خلاف جہاد کا کام لینا تھا۔

کوفہ میں قیام کے دوران آپؒ نے صاف محسوس کیا کہ مسلمان، وقت کی جابر حکومت کے لگائے ہوئے زخموں میں

---

(۱) ملخص من تاريخ الطبري: ۷/ ۱۶۰ وما بعدها، مع ريحان عترت، ص: ۸۹، ۹۱ وكذا ينظر: ثورة زيد بن علي، ص: ۵۷، ۵۹؛ بيد أن المشخوص فيه من مكة دون المدينة، والظاهر أنه تسامح إذ كان يسكن بالمدينة دون مكة فضلا عن أن بعض المصادر التاريخية — نحو: مختصر تاريخ دمشق: ۹/ ۱۵۷ — يؤيد رواية المدينة أيضا.

تڑپ رہے ہیں اور ظلم وستم کی تاریکیوں میں بھٹک رہے ہیں۔ اموی حکمرانوں کے اِن مظالم اور مظلوم مسلمانوں کی محبت و ہمدردی میں ان کی کسمپرسی پر آپؒ کا دل کڑھتا تھا اور شدت سے آپؒ اس کی خواہش رکھتے تھے کہ امت کی موجودہ صورتِ حال کسی طرح درست ہوجائے، ظلم وجور کا یہ دور دورہ ختم ہو اور قرآن وسنت کی تعلیمات زندہ ہوں، چاہے اس کے لیے مجھے کتنی ہی قربانی کیوں نہ دینی پڑے۔[1]

بہرحال آپؒ کا قیام وہیں کوفہ میں ہی تھا لیکن آپؒ چونکہ عمدہ صفات اور فضل وکمال کا مجموعہ تھے اور پراثر دعوتِ حق آپؒ کا امتیازی وصف تھا (نیز اللہ تعالیٰ نے امت کے درد، کڑھن اور ہمدردیٔ مظلومین جیسے قائدانہ اوصاف سے بھی آپؒ کو خوب نوازا تھا جیسا کہ ابھی اوپر گزرا) اس لیے ہشام کو آپؒ سے خطرہ ہوا کہ کہیں لوگ آپؒ کے ساتھ ہوکر اُس کے خلاف (یعنی ہشام کی ظالمانہ حکومت کے خلاف) نہ ہوجائیں تو اس نے والیٔ عراق "یوسف" کو خط لکھا کہ زید بن علی کو یہاں کوفہ سے نکال دو اور اس کو وہیں واپس مدینہ بھیج دو۔ چنانچہ اس شاہی حکم کی تعمیل میں یوسف نے آپؒ کو کوفہ چھوڑنے پر مجبور کردیا اور آپؒ کوفہ سے رختِ سفر باندھ کر مدینہ کی جانب واپس روانہ ہوگئے۔

آپؒ ابھی کوفہ سے باہر، قریب ہی مقامِ "عُذَیب" (اور بعض روایات کے موافق مقامِ "قادسیہ"[2]) پر پہنچے تھے کہ شیعہ حضرات جو اہلِ بیت سے محبت کا اظہار کرتے تھے پیچھے سے آپؒ کے پاس جا پہنچے اور آپؒ سے کہا: حضرت! آپؒ کہاں جارہے ہیں، آپؒ واپس تشریف لائیں اور ظلم وستم کے خلاف "حق" کی آواز اٹھائیں (یعنی کیا یہ مسلمان اس جابر حکومت کی ظلم وستم کی چکی میں ایسے ہی پستے رہیں گے اور اس کے خلاف آوازِ حق اٹھانے والا کوئی نہ ہوگا؟)، ہمیں پوری امید ہے کہ اللہ تعالیٰ آپؒ کی مدد فرمائے گا اور آپؒ کے ہاتھوں اس (ظالم) اموی حکومت کا خاتمہ فرمائے گا۔ لوگ آپؒ کی قیادت پر متفق ومجتمع ہیں اور اہلِ کوفہ کے ایک لاکھ افراد اپنی تلواروں کے ساتھ آپؒ کے ہمراہ ہیں جو آپؒ کی حمایت میں، لڑنے کو پوری طرح کمربستہ ہیں، ہم آپ کو اللہ کا واسطہ دیتے ہیں کہ آپؒ ہمارے ساتھ واپس کوفہ چلیں۔ اس کے علاوہ انہوں نے بڑی پکی پکی قسمیں کھائیں کہ ہم ہر حال میں آپؒ کا ساتھ دیں گے، اور مسلسل آپؒ کی واپسی پر اصرار کرتے رہے، بالآخر آپؒ کو اپنے ساتھ کوفہ واپس لے آئے۔[3]

---

(۱) منظر: امام ابوحنیفہ کی سیاسی زندگی، ص: ۱۷۰ مع الإمام زید بن علي، ص: ۱۱۸ و ۱۲۰، ۱۲۱

(۲) المنتظم لابن الجوزي: ۲۰۹/۷ مع تجارب الأمم وتعاقب الهمم: ۱۳۳/۳، وتاريخ الطبري: ۱۶۷/۷

(۳) مستفاد مما يلي بتلخيص وتسهيل: شذرات الذهب: ۹۲/۲ والمنتظم لابن الجوزي: ۲۰۹/۷، وانساب الأشراف: ۲۳۶/۳، وتذكرة الخواص، ص: ۳۰۰، والكامل في التاريخ: ۲۶۰/۴

فریضۂ امر بالمعروف ونہی عن المنکر کی انجام دہی:

آپؒ نے کوفہ میں قیام کے دوران، حکومتِ وقت کے بڑھتے ہوئے ظلم پر خاموشی اختیار کرنے کے بجائے، دعوتِ حق کو اختیار کیا، اور فریضۂ امر بالمعروف ونہی عن المنکر کی ادائیگی کا عزم کرلیا۔

چنانچہ آپؒ نے وقت کے بادشاہ ہشام کو بھی کئی بار امر بالمعروف ونہی عن المنکر کیا، ایک مرتبہ تو اسے امر بالمعروف کرتے ہوئے، صاف لفظوں میں کہا تھا: اِتَّقِ اللہَ (''اللہ سے ڈر'' یعنی اے ہشام! یہ ظلم وستم اور پامالیٔ حقوق وغیرہ کی غیر شرعی روش ترک کردے اور شرعی احکام کی روشنی میں عدل وانصاف اور ادائیگیٔ حقوق سے کام لے)، لیکن امام زیدؒ نے جب دیکھا کہ ہشام کو نصیحت کرنا کوئی فائدہ مند ثابت نہیں ہورہا، وہ امر بالمعروف کے باوجود اپنی فاسقانہ وظالمانہ طرز پر اڑا ہوا ہے اور اپنے مظالم سے باز نہیں آرہا، بیچارے کمزور لوگوں پر ان کے مسلمان ہوجانے کے باوجود جزیہ کی ادائیگی ضروری قرار دے رکھی ہے، اصحابِ حقوق کو ان کے حق ادا نہیں کررہا بلکہ حاجتمندوں کی حاجات وشکایات سننے کے لیے بھی تیار نہیں، اس سے بڑھ کر وہ کسی سے نصیحت کی بات سننے پر بھی آمادہ نہیں بلکہ نصیحت سننے پر الٹا آگ بگولہ ہوجاتا ہے، کھلم کھلا شریعت کی خلاف ورزیوں پر اترا ہوا ہے اور اس نے زمین کو ظلم وستم سے بھر دیا ہے تو آپؒ سے اپنے نانا صلی اللہ علیہ وسلم کا مٹتا ہوا دین دیکھا نہ جاتا تھا چنانچہ ظلم وناانصافی اور منکرات وفواحش پر مبنی یہ ساری بگڑی ہوئی صورتِ حال دیکھ کر آپؒ کی دینی حمیت وکڑھن حرکت میں آئی اور ان کے ازالہ کے لیے آپؒ نے کمر کس لی اور فریضۂ امر بالمعروف کے پیشِ نظر وقت کے بادشاہ کے خلاف اٹھ کھڑا ہونے کا عزم کرلیا۔[1]

اور اس فریضہ کو ادا کرنے اور دعوتِ حق دینے کے لیے آپؒ، وقت کے جابر بادشاہ کے مظالم کو بھی خاطر میں نہ لائے اور جان کی پروا کیے بغیر آپؒ نے کلمۂ حق کہنے کا حکم ادا کیا، اگرچہ اس کے لیے آپؒ کو اپنی جان کا بھی نذرانہ پیش کرنا پڑا اور آپؒ نے درج ذیل دو حدیثوں پر حقیقی معنی میں عمل کرکے دکھلا دیا:

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ظالم بادشاہ کے سامنے کلمۂ حق کہنا افضل جہاد ہے،[2] اور دوسری حدیث میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد مبارک ہے: شہداء کے سردار حضرت حمزہ بن عبدالمطلب رضی اللہ عنہ ہیں اور وہ شخص بھی شہیدوں کا سردار ہوگا جو

---

(۱) ينظر: الإمام زيد لأبي زهرة، ص: ۲۲۴ مع الإمام زيد بن علي، ص: ۱۲۰، ۱۸۸، ۱۸۹ وشجرة الأشراف، ص: ۲۸۰

(۲) مسند ابن الجعد ص: ۴۸۰، ومسند أحمد: ۲۲۸/۱۷، وسنن النسائي: ۱۶۱/۷

ظالم حاکم کے سامنے کھڑا ہوا اور اسے امر بالمعروف ونہی عن المنکر کرے، اس پر وہ حاکم اسے قتل کردے۔ [1]

بالآخر اسی فریضۂ امر بالمعروف کی بجا آوری کے نتیجے میں آپؒ نے شہادت کو سینے سے لگایا اور شہادت سے قبل آپؒ نے میدانِ کارزار میں اپنے ہاتھ آسمان کی طرف اٹھا کر کہا: اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِي أَكْمَلَ لِي دِينِي، وَ اللهِ إِنِّي كُنْتُ أَسْتَحِيِي مِنْ رَسُولِ اللهِ- صلى الله عليه و آله وسلم- أَنْ أَرِدَ عَلَيهِ الْحَوْضَ غَدًا، وَلَمْ آمُرْ فِي أُمَّتِهِ بِمَعْرُوفٍ، وَلَمْ أَنْهَ عَنْ مُنْكَرٍ ''شکر ہے اس اللہ کا جس نے میرے لیے میرے دین کو مکمل کردیا (کہ اِس زمانے میں دین کا مجھ سے جو مطالبہ تھا وہ میں نے اس ذات کی توفیق سے پورا کردیا)۔ واللہ! میں رسول اللہ ﷺ سے اس بات پر سخت شرمندہ رہتا تھا کہ (ان حالات میں) آپ کی امت میں امر بالمعروف ونہی عن المنکر کا فریضہ سرانجام دیے بغیر کل آپ کے پاس حوضِ کوثر پر حاضر ہوں''۔ [2]

ظلم کے خلاف جہاد پر بیعت لینا اور اس کے اسباب:

جب اموی حکومت کے مظالم، اس کے ہاتھوں آلِ رسول اور ان کے متبعین کے خون کی ارزانی، کمزوروں کے ساتھ ناانصافی، احکامِ شرع سے روگردانی، اور کئی اعتبارات سے بے راہ روی حد سے تجاوز کرگئی تو آپؒ نے کوفہ میں اس ظالم حکومت کے خلاف جہاد پر بیعت لینا شروع فرمادی تاکہ مذکورہ بالا منکرات کا ازالہ ہو اور قرآن وسنت کی بالادستی ہو جس کی روشنی میں ایک صحیح اسلامی شورائی اور عدل وانصاف پر مبنی نظامِ حکومت قائم ہو جس سے انسانیت ظلم وستم کی چکی سے نکل کر سکھ کا سانس لے اور قرآن وسنت کے سائے تلے ایک نیا معاشرہ تشکیل ہو۔ بہرحال یہ تھے وہ اسباب جن کی بناء پر آپؒ نے فریضۂ امر بالمعروف کی ادائیگی کے طور پر لوگوں سے بیعت لینے کا آغاز کیا۔ [3]

یہ بیعت درج ذیل امور کے لیے ہوتی تھی اور یہی امور آپؒ کے جہاد کا ہدف تھے:

کتاب اللہ اور سنتِ رسول کو اساس قرار دینا، ظالموں سے جہاد کرنا، کمزوروں کی مدد کرنا، محروم لوگوں کو ان کا حق دینا، مالِ غنیمت کو انصاف کے ساتھ تقسیم کرنا، مظالم کا خاتمہ کرنا، اہلِ بیت کے دشمنوں کے مقابلہ میں اِن کی مدد ونصرت کرنا۔

---

(۱) المستدرك للحاكم: ۲۱۵/۳، وأحكام القرآن للجصاص: ۴۳/۲، ومسند أبي حنيفة ص: ۱۸۷، والمعجم الأوسط: ۲۳۸/۴

(۲) الروض النضير: ۷۳/۱، والإمام زيد بن علي، ص: ۱۹۰، والفخري في الآداب السلطانية والدول الإسلامية، ص: ۱۳۲

(۳) ينظر: الإمام زيد بن علي، ص: ۱۲۰ مع شجرة الأشراف، ص: ۲۸۱، ۲۸۸ بتصرف.

البتہ آپؒ کا بیعت لینے کا طریقہ اور اس کے الفاظ یہ ہوتے تھے:

آپؒ اس بیعت کرنے والے شخص سے فرماتے تھے کہ: ''میں تمہیں قرآن وسنت کی طرف دعوت دیتا ہوں، اور اس بات کی طرف بلاتا ہوں کہ ظالموں سے جہاد کرنا ہوگا، کمزوروں کی مدد کرنی ہوگی، محروم لوگوں کو ان کا حق دیا جائے گا، مالِ غنیمت کو انصاف کے مطابق تقسیم کیا جائے گا، ظلم وستم کا خاتمہ کرنا ہوگا، گھرانۂ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے دشمنوں کے مقابلہ میں ان آلِ رسول کی نصرت کرنی ہوگی۔'' کیا تم ان امور پر بیعت کرتے ہو؟ جب وہ کہتا: جی ہاں! میں ان امور پر بیعت کرنے کے لیے تیار ہوں تو آپؒ اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے پھر فرماتے: اب تمہارا یہ اللہ اور اس کے رسول کے ساتھ عہد وپیمان ہوگیا کہ تم میری اس بیعت کو ضرور نبھاؤ گے، میرے دشمنوں سے جہاد کرو گے اور تنگی وسہولت میں نیز ہماری موجودگی وغیر موجودگی میں ہمارے مخلص وخیر خواہ بن کر رہو گے۔ جب وہ کہتا: جی ہاں! ایسا ہی کروں گا تو آپؒ اپنا دستِ مبارک اس کے ہاتھ پر پھیرتے اور پھر فرماتے: **اَللّٰهُمَّ اشْهَدْ** (اے اللہ! تو گواہ رہنا)۔[1]

اس طرح مخفی طور پر آپؒ ایک سال تک وہاں کوفہ میں لوگوں سے بیعت لیتے رہے، اور تقریباً ایک یا دو ماہ بصرہ میں بھی گزارے اور لوگوں سے مذکورہ بالا بیعت لی،[2] اس کے علاوہ دیگر علاقوں کے لوگ بھی آپؒ کی اس دعوتِ حق پر بیعت کے لیے آتے رہے کیونکہ آپؒ کے علاوہ آپؒ کے کارکنان بھی لوگوں کو اس بیعتِ حق کی دعوت دینے میں مشغول رہے جن میں منصور بن معتمر اور یزید بن ابی زیاد کے نام سرفہرست ہیں کہ وہ بڑی تگ ودو اور ہمت ومحنت کے ساتھ لوگوں میں جا جا کر انہیں اس بیعت کی طرف بلاتے رہے۔ اس طرح ایک، سوا ایک سال کے اندر تقریباً چالیس ہزار کی غیر معمولی وبھاری جمعیت، آپؒ کے ہاتھ پر بیعت ہوچکی تھی جن میں سے پندرہ ہزار تو خود اہلِ کوفہ تھے اور باقی دیگر شہروں وعلاقوں کے لوگ تھے۔[3]

---

(۱) المنتظم لابن الجوزي: ۲۱۱/۷ مع الأعلام للزركلي: ۵۹/۳، وأنساب الأشراف: ۲۳۸/۳، والكامل لابن الأثير: ۲۵۹/۴

(۲) شذرات الذهب في أخبار من ذهب: ۹۲/۲ مع تاريخ الطبري: ۱۷۱/۷

(۳) مستفاد من: المنتظم في تاريخ الملوك والأمم: ۲۱۰/۷، والروض النضير: ۵۵/۱، ومقاتل الطالبين ص: ۱۳۲ و ۱۴۰، والمصابيح لأبي العباس، ص: ۳۸۹، والإمام زيد بن علي، ص: ۱۲۹، والإمام زيد لأبي زهرة، ص: ۲۰، والأعلام للزركلي: ۵۹/۳ والبداية والنهاية طهجر: ۹۹/۱۳

آپؒ کے حق پر ہونے کی ایک بڑی دلیل یہ بھی تھی کہ ان بیعت کرنے والوں میں صرف عوام ہی نہیں بلکہ صلحاء، اتقیاء، قراء، علماء، فقہاء، اور محدثین بھی ان میں شامل تھے۔ [1] نیز آپؒ کو اپنے اس عملِ جہاد و بیعت کے حق ہونے پر فتوی کے لحاظ سے بھی امام ابوحنیفہ جیسی شخصیتوں کی تائیدات حاصل تھیں جیسا کہ عنقریب اس کا تذکرہ آئے گا۔

بہرحال جن جلیل القدر و عظیم المرتبت مشائخِ وقت و اہم شخصیات نے آپؒ کے ہاتھ پر بیعت کی ان میں سے بعض کے اسماء گرامی درج ذیل ہیں:

سلمہ بن کُہَیل، محمد بن عبدالرحمن بن ابی لیلیٰ، ابن شُبْرُمہ، مِسعَر بن کِدام، یزید بن ابی زیاد، ابو ہاشم یحییٰ بن دینار رُتانی، منصور بن معتمِر، نَصر بن خُزیمہ عَبسی، معاویہ بن اسحاق انصاری، حجیہ بن اجلح کندی، ہلال بن خباب، قاضیِ "مدائن"، وغیرہ وغیرہ۔ [2]

(۱) راجع: وفيات الأعيان: ۲/۱۱۰، مع الإمام زيد بن علي، ص: ۱۲۹، والإمام زيد لأبي زهرة، ص: ۷۵، وتاريخ الكوفة، ص: ۳۵۱

(۲) تاريخ الطبري: ۷/۱۶۷، مع شذرات الذهب: ۲/۹۲، وتاريخ ابن خلدون: ۳/۱۲۳، والإفادة للهاروني، ص: ۲۳

وينظر للاستزادة: مقاتل الطالبيين ص: ۱۳۰، والمصابيح لأبي العباس، ص: ۳۰۰، وتاريخ الكوفة، ص: ۳۵۲

تائیداتِ فقہاء و مشائخ

تائیدِ امام ابوحنیفہؒ:

فقیہِ اعظم امام ابوحنیفہؒ کی حضرت امام زیدؒ سے ملاقات بھی ہوئی،[1] اس کے علاوہ آپؒ اور امام زید کے درمیان قاصد کے ذریعے سے بھی رابطے رہے (جیسے مثلاً ایک قاصد کا نام فُضَیل بن زبیر تھا)، اس طرح مسلسل رابطوں کے ذریعے آپؒ اُن کی تحریکی کاوشوں سے آگاہ رہے، ان کو اپنے مشورے پہنچائے،[2] اور اس تحریک کی باقاعدہ خیر خبر بھی رکھی کہ ایک دفعہ حضرت زیدؒ کا قاصد آپؒ کے پاس آیا- جب کہ آپؒ امام زیدؒ کے غمِ فرقت میں نڈھال تھے- تو آپؒ نے اس قاصد سے حضرت زیدؒ کے پاس آمد و رفت رکھنے والے فقہاء کے نام پوچھے کہ کن کن کا آپؒ کے پاس آنا جانا زیادہ ہے؟[3]

بہر حال آپؒ دل سے اہلِ بیت سے محبت رکھتے تھے اور اندر کی گہرائیوں سے امام زیدؒ کے حامی، مؤید اور معاون تھے جیسا کہ محمد بن جعفر صادق کا بیان ہے: ''اللہ ابوحنیفہؒ پر اپنی رحمتیں نازل فرمائے، یقیناً ان کو ہم اہلِ بیت سے سچی محبت تھی جیسا کہ اُن کی طرف سے امام زیدؒ کی حمایت و معاونت سے اس محبت کا واضح ثبوت ملتا ہے۔''[4]

تاہم جن فتاویٰ جات کے ذریعے آپؒ نے امام زیدؒ کی حمایت و تائید کی ان میں سے دو فتووں کے الفاظ ذیل میں درج کیے جاتے ہیں:

(۱) خُرُوجُه يُضَاهِي خُرُوجَ رَسُولِ اللهِ يَومَ بَدْرٍ ''حضرت زیدؒ کا جہاد کے لیے نکلنا، رسول اللہ ﷺ کے جہادِ بدر کے لیے نکلنے کے مشابہ ہے''۔[5]

---

(۱) الإمام زيد لأبي زهرة، ص: ۲۳۸

(۲) ينظر: امام اعظم ابو حنيفه شهيد اهل بيت، ص: ۱۲۳، والروض النضير: ۱/ ۵۵

(۳) انساب الأشراف للبلاذري: ۳/ ۲۳۹، مع امام اعظم ابو حنيفه شهيد اهل بيت، ص: ۱۲۴، والروض النضير: ۱/ ۵۵

(۴) مقاتل الطالبين، ص: ۱۴۰

(۵) مناقب ابي حنيفة للموفق، ص: ۲۶۰، ومناقب أبي حنيفة للكردري، ص: ۲۵۵

فائدہ: اس مشابہت کا ایک مطلب تو یہ ہے کہ حضرت زیدؒ کا جہاد جو انہوں نے امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے لیے شروع کیا اس کی قدر و قیمت (بقیہ اگلے صفحہ پر)

(۲) انه إمَام حَقّ ''حضرت زیدؒ امامِ برحق ہیں'' (اور اسی فتوے میں آپؒ نے اپنے ایک عذر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ اگر وہ عذر نہ ہوتا تو میں بھی آپؒ کے ساتھ جہاد میں شرکت کرتا اور آپؒ کی حمایت میں آپؒ کے مخالفین سے جنگ کرتا)۔[۱]

ان صریح وواضح تائیدات کے علاوہ آپؒ نے ان کی خوب مالی مدد بھی کی تاکہ ان کو اپنے دشمن کے خلاف تقویت ملے اور مال کی کمی کی وجہ سے ان کی تحریک، دشمن کے مقابلہ میں شکست سے دوچار نہ ہو۔[۲] اس لیے گاہے بگاہے آپؒ ان کو مالی کمک پہنچاتے رہے چنانچہ ایک مرتبہ آپؒ نے ان کو تیس ہزار درہم (مساوی ۶۳ لاکھ روپے یعنی نصف کروڑ سے زائد) کی رقم بھجوائی اور ساتھ لوگوں کو بھی ان کی نصرت وحمایت پر ابھارا،[۳] اس کے علاوہ ایک دفعہ دس ہزار درہم (مساوی ۲۱ لاکھ روپے) بھیجنے کی روایت بھی ملتی ہے۔[۴]

یہ تو وہ روایات ہیں جو کتب میں درج ہوسکی ہیں ورنہ اللہ ہی جانے کہ کتنی مالی مدد کی ہوگی، اسی لیے امام یحیی ہارونی سے، کسی خاص لگی بندھی رقم کے تذکرہ کے بجائے، یہ عبارت منقول ہے کہ ''امام ابوحنیفہؒ نے بہت زیادہ مال کے ذریعے امام زیدؒ کا تعاون کیا۔''[۵] اسی طرح ایک اور روایت بھی ملتی ہے جس سے بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ آپؒ نے سامان واموال کی غیر معمولی اور غیر متوقع مقدار کے ذریعے امام زیدؒ کا تعاون کیا، چنانچہ ابوالفرج اصبہانی نقل کرتے ہیں کہ امام ابوحنیفہؒ نے امام زیدؒ کے قاصد ''فُضَیل بن زبیر'' سے کہا: حضرت زیدؒ کو میرا یہ پیغام دینا کہ: ''آپ کے

اور درجہ وشان اس بات میں غزوۂ بدر کی طرح ہے کہ وہاں بھی اہلِ حق بے سروسامان تھے اور یہاں بھی حضرت زیدؒ اور ان کے ساتھی اہلِ حق ہیں اور دشمن کے مقابلہ میں بے سروسامان ہیں (امام اعظم ابوحنیفہ شہید اہلِ بیت، ص:۷۰ ۱۲ مع تصرف یسیر) اور دوسرا مطلب یہ ہے کہ: قریش کے مقابلہ میں آنحضرت ﷺ کا صف آرا ہوجانا جیسے ایک واضح وغیر مشتبہ فیصلہ تھا اسی طرح گو اس وقت مقابلہ میں بجائے کافروں کے وہ لوگ ہیں جو اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہیں لیکن اپنے طریقۂ عمل سے بنی امیہ کی حکومت جن نتائج تک پہنچ چکی ہے ان کو دیکھتے ہوئے اس حکومت کے الٹ دینے کی کوشش بالکل ایمان واسلام کا تقاضا ہے گویا امام ابوحنیفہؒ نے اپنے مذکورہ بالا الفاظ سے حضرت زیدؒ کے جہاد کو شرعاً درست وصحیح قرار دیا ہے۔ (امام ابو حنیفہ کی سیاسی زندگی، ص: ۱۷۶)

(۱) مناقب أبي حنيفة للموفق، ص: ۲۶۰، ومناقب أبي حنيفة للكردري، ص: ۲۵۵

(۲) مناقب أبي حنيفة للموفق، ص: ۲۶۰

(۳) شذرات الذهب في أخبار من ذهب: ۹۲/۲

(۴) مناقب أبي حنيفة للموفق، ص: ۲۶۰، ومناقب أبي حنيفة للكردري، ص: ۲۵۵

(۵) الإفادة في تاريخ الأئمة السادة، ص: ۲۳

دشمن کے خلاف، آپ کو جہاد میں تقویت پہنچانے کے لیے میرے پاس آپ کی خاطر اسبابِ تعاون موجود ہیں۔ بس آپ اِن سے، اپنے اور اپنے ساتھیوں کے لیے گھوڑوں اور ہتھیاروں کا بندوبست فرمائیں۔''[1]

البتہ آپؒ بنفسِ نفیس اس جہاد میں شریک نہیں ہو سکے تھے کیونکہ ایامِ جہاد میں آپؒ بیمار تھے اور اس بیماری کا وقتاً فوقتاً دورہ پڑتا تھا،[2] آپؒ کی عدمِ شرکت کی ایک واضح وجہ تو یہی تھی تاہم اس کے علاوہ اور بھی کئی شرعی اعذار تھے جن کی بناء پر آپؒ کی شرکت نہیں ہوسکی تھی،[3] مثلاً جب آپؒ سے دریافت کیا گیا کہ آپؒ نے خود جہادِ زید کو جہادِ بدر کے مشابہ قرار دیا مگر پھر آپ اس میں شریک نہیں ہوئے تھے اس کی کیا وجہ تھی؟ تو آپؒ نے جواب میں ارشاد فرمایا تھا: میں لوگوں کی اُن امانتوں کی وجہ سے شریک ہونے سے قاصر رہا جو لوگوں نے میرے پاس رکھوائی ہوئی تھیں، میں نے حضرت ابن ابی لیلیٰ سے عرض کیا تھا کہ ان امانتوں کی آپ ذمہ داری لے لیں تاکہ میں جہاد میں شرکت کرسکوں مگر انہوں نے ان امانتوں کو قبول کرنے سے انکار فرما دیا تھا اس لیے ان کے ضائع ہونے کے ڈر سے میں رک گیا تھا کیونکہ میں ان امانتوں کو اس طرح لاوارث اور بے یارومددگار چھوڑ کر دنیا سے نہیں جانا چاہتا تھا۔[4]

ایک اور وجہ بھی کتب میں مذکور ہے جس میں یہ ہے کہ آپؒ نے امام زیدؒ کے ایک قاصد کے ہاتھ ان کے نام یہ پیغام بھیجا تھا کہ اگر مجھے یقین ہوتا کہ یہ بیعت کرنے والے لوگ بروقت آپ کا ساتھ نہیں چھوڑیں گے اور واقعی آپ کے ساتھ ثابت قدم رہیں گے تو میں آپ کے ساتھ جہاد میں شرکت کرتا اور آپ کی حمایت میں آپؒ کے مخالفین سے جہاد کرتا کیونکہ آپ بلاشک وشبہ امامِ برحق ہیں لیکن مجھے اس بات کا اندیشہ ہے کہ یہ لوگ آپ کا ساتھ چھوڑ دیں گے جیسا کہ یہ عین موقع پر آپ کے جدامجد (حضرت امام حسینؓ) کا ساتھ چھوڑ گئے تھے۔[5] پھر آپؒ جیسے دور اندیش اور صاحبِ بصیرت ہستی کا یہ اندیشہ بالآخر حرف بحرف صحیح ثابت ہوا۔

---

(۱) مقاتل الطالبيين، ص: ۱۴۱

(۲) شذرات الذهب في أخبار من ذهب: ۹۲/۲ مع مناقب أبي حنيفة للموفق، ص: ۲۶۱، و امام ابو حنیفہ کی سیاسی زندگی، ص: ۱۹۰

(۳) امام اعظم ابوحنیفہ شہید اہل بیت، ص: ۱۲۷

(۴) مناقب أبي حنيفة للموفق، ص: ۲۶۰، و مناقب أبي حنيفة للكردري، ص: ۲۵۵

(۵) مناقب أبي حنيفة للموفق، ص: ۲۶۰ مع مناقب أبي حنيفة للكردري، ص: ۲۵۵

بہر حال یہ سارے ہی اعذار آپؒ کو پیش آئے ہوں گے، الہذا تمام اعذار میں نظر کرنے سے پتا چلتا ہے کہ شروع میں ان بیعت کرنے والوں کی بے وفائی وغداری کے اندیشہ کے پیش نظر شرکت کا ارادہ نہیں تھا بعد میں وقت کی ضرورت کو دیکھ کر آپؒ نے شرکتِ جہاد کا پختہ عزم کر لیا تھا مگر عین موقع پر ایک طرف بدنی عارضے (یعنی بیماری) اور دوسری طرف شرعی عذر (یعنی امانتوں کی حفاظت) نے آپؒ کو اس طرح مقید کر دیا تھا کہ آپؒ عزم وارادے اور خواہش وچاہت کے باوجود شرکت نہیں فرما سکے تھے۔[2] اور یہ آپؒ کے اسی پختہ عزم وہمدردیٔ امام زیدؒ ہی کی علامت تھی کہ بعد میں جب کبھی آپؒ کے سامنے امام زیدؒ کی شہادت کا تذکرہ ہوتا تو آپؒ رو پڑتے۔[3]

آپؒ کی عدمِ شرکت کی وجہ سے اگر چہ ایک فرد تو واقعی میدانِ جہاد میں کم پہنچا مگر یہ بات بھی ایک حقیقت ہے کہ آپؒ کی تائیدات وحمایتی فتاویٰ نے امام زیدؒ کی تحریک کو مضبوط کرنے، لوگوں کو آپؒ کے ساتھ میدانِ جہاد میں اتارنے اور آپؒ کے شانہ بشانہ لڑنے میں وہ کام کیا ہوگا جو ایک شخص کی شرکت تو کجا ایک گروہ کی شرکت سے بھی یقیناً زیادہ ہوگا جیسا کہ یہ بات امام ابو حنیفہؒ کے مقامِ فتویٰ کو جاننے والے کسی فردِ ملت پر مخفی نہیں۔

تائیدِ امام جعفر صادقؒ:

امام جعفر صادقؒ کی شخصیت اپنے اعلیٰ مقام اور اپنی بلند علمی شان میں کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ امام زیدؒ کو آپؒ جیسی عظیم ہستی کی تائید بھی حاصل تھی، چنانچہ ایک دفعہ جب کچھ لوگ اکٹھے ہو کر آپؒ کے پاس آئے تھے اور انہوں نے آپؒ کو بتایا کہ امام زیدؒ لوگوں سے ظالم اموی حکومت کے خلاف اپنے ہاتھ پر جہاد کی بیعت لے رہے ہیں تو آپؒ نے انہیں فرمایا تھا: ''تم لوگ اُن کے ہاتھ پر بیعت کر لو، واللہ! وہ ہم میں سب سے زیادہ صاحبِ فضل وکمال شخصیت ہیں اور وہ ہمارے قائد وپیشوا ہیں۔''[4]

---

(۱) مناقب أبي حنيفة للكردري، ص: ۲۵۵

(۲) هذا ما ظهر لنا. وينظر للاستزادة: امام ابو حنیفہ کی سیاسی زندگی، ص: ۱۸۸ وما بعدها.

(۳) مناقب أبي حنيفة للموفق، ص: ۲۶۱، ومناقب أبي حنيفة للكردري، ص: ۲۵۵

(۴) الكامل في التاريخ: ۴/۲۶۷، والخطط المقريزية: ۴/۳۲۲

تائید امام اعمشؒ:

امام اعمشؒ (جو علم قرآن وحدیث، اور عمل صالح وتقویٰ کے امام، اور اپنے وقت کے "شیخ الاسلام" کہلاتے تھے۔[1]) کی تائید بھی آپؒ کو حاصل تھی چنانچہ آپؒ کا فرمان ہے: "اللہ کی قسم! اگر میری آنکھ میں نابینا پن نہ ہوتا تو میں حضرت زیدؒ کے ساتھ جہاد کے لیے ضرور نکل کھڑا ہوتا۔"[2]

تائیدات دیگر مشائخ:

ان مذکورہ ہستیوں کے علاوہ اور بھی کئی بڑے بڑے تابعین فقہاء ومحدثین مثلاً سلمہ بن کہیل، شعبہ بن حجاج اور سفیان ثوری رحمہم اللہ تعالی نے آپؒ سے عقیدت ومحبت کا والہانہ اظہار کرنے کے ساتھ ساتھ آپؒ کی جدوجہد کی تائید وتصویب کی ہے۔[3] حضرت امام سفیان ثوریؒ (جو علم وتقویٰ میں اہل زمانہ کے سردار،[4] امیر المومنین فی الحدیث،[5] امام مجتہد،[6] اور کوفہ کے مشہور واعظ[7] تھے) کو جب آپؒ کی شہادت کی خبر ملی تو فرمایا: "انہوں نے اپنے رب کی خاطر اپنی جان نثار کردی، اپنے خالق کی رضا کیلیے حق کو لے کر کھڑے ہوئے اور اپنے اُن آباء واجداد کے ساتھ جا ملے جنہیں اللہ نے رتبہ شہادت سے سرفراز فرمایا تھا۔"[8]

اس کے علاوہ یہ بھی مذکور ہے کہ اُس وقت کے علماء امام زیدؒ کی جہادی تحریک کو "تحریک علماء وصلحاء" کہتے تھے حتی کہ بعض مؤرخین نے لکھا ہے کہ امام زیدؒ کے ہمراہ جو لوگ میدان جہاد میں قتال کے وقت شریک تھے وہ قراء اور فقہاء وغیرہ تھے۔[9]

---

(1) ینظر: تذکرة الحفاظ للذهبي: ١/١١٦، وسير أعلام النبلاء: ٦/٢٢٦، وتاريخ بغداد: ١٠/٥، والأعلام للزركلي: ٣/١٣٥

(2) الروض النضير: ١/٥٥، وريحان عترت، ص: ٩٤

(3) امام اعظم ابوحنیفہ شہید اہل بیت، ص: ١٢٣

(4) الأعلام للزركلي: ٣/١٠٤

(5) نفس المرجع السابق

(6) وفيات الأعيان: ٢/٣٨٦

(7) الإمام زيد لأبي زهرة، ص: ٧٥

(8) الروض النضير: ١/٥٥، وريحان عترت ص: ٩٤، ٩٥ مع تاريخ الكوفة، ص: ٣٥٣

(9) ينظر: الإمام زيد لأبي زهرة، ص: ٧٤

بہر حال مندرجہ بالا تحریر سے بخوبی معلوم ہوا کہ آپؒ اپنے جہاد میں حق پر تھے اور وقت کے فقہاء ومحدثین کی آپؒ کو واضح تائیدات حاصل تھیں۔

جہاد کے لیے خروج:

بہر حال آپؒ کو جب ایک طرف ان اکابرِ ملت کی واضح تائیدات حاصل ہوگئیں اور دوسری طرف جہاد کے لیے غیر معمولی اَفرادی وجنگی قوت کا بھی انتظام ہوگیا (کہ چالیس ہزار افراد جو اُس زمانے میں بلاشبہ ایک غیر معمولی تعداد شمار ہوتی تھی۔ آپؒ کے ساتھ موت پر بیعت کر چکے تھے اور ساز وسامان اور ہتھیاروں کا بھی خاطر خواہ انتظام ہوگیا جیسا کہ اس سلسلہ میں پیچھے امام ابوحنیفہؒ کے بھی غیر معمولی تعاون کا تذکرہ گزرا ہے) یعنی جب آپؒ کو شرعی تائید اور اسبابی قوت ہر دو چیزیں حاصل ہوگئیں تو آپؒ نے اپنے ساتھیوں کو جہاد کی تیاری کا حکم دے دیا اور اس کے لیے شب بدھ، یکم صفر ۱۲۲ھ کی تعیین بھی کر لی کہ ہم سب اس رات کو ایک صحیح اسلامی حکومت کے قیام کے لیے اکٹھے نکل کھڑے ہوں گے اور اس ہدف کی تحصیل میں اگر وقت کی ظالم دشمن سے جنگ کی نوبت آئی تو اس کے لیے پہلے سے ہی ہم کمربستہ ہوں گے۔[1]

چنانچہ ۱۲۲ھ کے آغاز میں ہی امام زیدؒ کے حکم پر آپؒ کے ساتھی آپؒ کی رفاقت میں کوفہ کے اندر جہاد کی تیاری میں مشغول ہوگئے تھے تاکہ مقررہ وقت پر مکمل تیار ہوکر اکٹھے باہر نکلا جائے، اسی دوران ''سلیمان بن سُراقہ'' نامی شخص جا کر عراق کے گورنر یوسف بن عمرکو۔ جو ''حیرہ'' شہر میں رہتا تھا اس ساری تحریک اور منصوبہ بندی کا راز افشاء کر دیتا ہے۔ اِس پر اُس نے فوراً وہاں سے ایک دستہ آپؒ کی طرف کوفہ روانہ کر دیا کہ وہ آپؒ کو ڈھونڈ کر گرفتار کر کے اس کے پاس لے آئے، مگر وہ دستہ یہاں کوفہ پہنچ کر اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہوسکا۔ یہاں افسوس کی بات یہ ہے کہ جب آپؒ کی بیعت کرنے والوں کو اس سنگین صورتِ حال کا پتا چلا کہ والیٔ عراق کی طرف سے، امام زیدؒ کی گرفتاری کا حکم نامہ آ گیا ہے تو عین اس نازک موقع پر اُن اہلِ کوفہ کی اکثریت نے آپؒ کا ساتھ چھوڑ دیا [کہ اہلِ بیت کے ساتھ اظہارِ محبت کرنے والے شیعہ حضرات، جنہوں نے آپؒ کے ہاتھ پر بیعت کر رکھی تھی، کے چند بڑے لوگ آپؒ کے پاس آ کر کہنے لگے: اللہ آپ پر رحم فرمائے، آپ ابوبکر اور عمر کے بارے میں کیا کہتے ہیں: آپؒ نے فرمایا: اللہ

---

(1) ینظر: تاریخ الطبري: ۷/۱۷۳ و ۱۸۱، والکامل في التاریخ: ۴/۲۵۹ و ۲۶۷، والمنتظم: ۷/۲۱۱ بتصرف یسیر للتسہیل.

تعالیٰ، رسول اللہ ﷺ کے ان دو ساتھیوں پر اپنی رحمتوں کا نزول فرمائے اور درجاتِ مغفرت سے سرفراز فرمائے، میں نے اپنے اہلِ بیت میں سے کسی ایک کو بھی ان سے بیزاری یا براءت کا اظہار کرتے ہوئے کبھی نہیں سنا اور میں بھی ان کے حق میں کلمۂ خیر کے سوا کچھ نہیں کہتا۔ اس کے بعد انہوں نے حضرات شیخین رضی اللہ عنہما (یعنی سیدنا حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اور سیدنا حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ) کے بارے میں اسی طرح اور بھی سوال جواب کیے۔

جب امام زیدؒ نے کسی طرح بھی ان حضرات کی شان میں کوئی نامناسب کلمہ نہ کہا تو وہ آخر میں امام زیدؒ کے سامنے اس بات پر اصرار کرنے لگے کہ آپ ابوبکر وعمر سے بیزاری و براءت کا اظہار کریں ورنہ ہم آپ کا ساتھ چھوڑ دیں گے، مگر آپؒ نے فرمایا: میں ہرگز ایسا نہیں کروں گا، میں تو یہ کہتا ہوں کہ وہ دونوں امامِ عادل تھے اور میں ان دونوں حضرات سے محبت کرتا ہوں نیز ہر اُس شخص سے اپنی براءت کا اظہار کرتا ہوں جو ان دو حضرات سے براءت کا اظہار کرے۔

اِس پر انہوں نے وہ سابقہ بیعت توڑ دی اور آپؒ کو چھوڑ کر چلے گئے۔ آپؒ نے ان کو فرمایا: اِذْهَبُوا فَأَنْتُمُ الرَّافِضَةُ ["جاؤ، تم "رافضہ" (ساتھ چھوڑ دینے والی جماعت) ہو"]، چنانچہ اُسی دن سے ان شیعوں کا نام "رَوافض" اور "رافضہ" (یعنی امامِ اہلِ بیت کا ساتھ چھوڑ دینے والی جماعت) پڑ گیا اور جن شیعوں نے آپؒ کا ساتھ نہ چھوڑا اور حضرت ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما سے براءت کا اظہار بھی نہ کیا ان کا نام "زَیدیہ" (یعنی امامِ اہلِ بیت حضرت زیدؒ کا ساتھ دینے والی جماعت) پڑ گیا۔ اس طرح ان سردار روافض اور ان کے متبعین کا امام زیدؒ کا ساتھ چھوڑنے کی وجہ سے آپؒ کے ہاتھ پر باقی ماندہ بیعت کرنے والوں کی تعداد بہت کم رہ گئی کیونکہ ان روافض کی بڑی تعداد نے آپؒ کے ہاتھ پر بیعت کر رکھی تھی۔[1]

اِدھر سے یہ لوگ عین موقع پر آپؒ کا ساتھ چھوڑ کر چلے گئے اور اُدھر سے گورنر کوفہ "حَکَم بن صَلت" نے یوسف بن عمر کے حکم کے مطابق، اس خیال سے کہ لوگ کہیں زید بن علی کی حمایت میں اس کے ساتھ نہ نکل پڑیں، لوگوں میں عمومی حکم نامہ جاری کر دیا کہ سب لوگ کوفہ کی جامع مسجد میں جمع ہو جائیں، پھر دھڑا دھڑ لوگوں کو جامع مسجد میں جمع کرنا

---

(١) استفيد هذا المقال خاصة مما يلي -- بجمع الروايات وتلخيصها - البداية والنهاية ط هجر: ١٣/ ١٠٦، وتاريخ ابن خلدون: ٣/ ١٢٤ والصواعق المحرقة: ٢/ ٨٤٣، وموسوعة آل بيت النبي: ٢/ ٤٨١، وسير أعلام النبلاء: ٥/ ٣٩٠، ومختصر تاريخ دمشق: ١٥٣، ١٥٦، ٩/ ١٥٧، وتهذيب الكمال: ١٠/ ٩٧، وتاريخ الإسلام: ٨/ ١٠٦، والروض النضير: ١/ ٧٥، ٧٦، وتاريخ الطبري: ٧/ ١٨١، وتاريخ ابن الجوزي: ٧/ ٢١١

شروع کر دیا، شہر کے تجارتی راستے اور دروازے بند کر دیے گئے (تاکہ باہر کے لوگ ان کے ساتھ شریک نہ ہو سکیں) اور لوگوں کو حضرت زید کا ساتھ دینے سے روک دیا، اور ساتھ ہی حضرت زیدؒ کی تلاش بھی شروع کر دی۔ امام زیدؒ اس وقت وہیں کوفہ میں معاویہ بن اسحاق انصاری کے گھر میں تھے، چنانچہ آپؒ نے اسی رات ان کے گھر سے نکل کر خروج کا اعلان کر دیا اور کھل کر باہر آ گئے اس رات نہایت شدید سردی تھی، یہ بدھ کی رات تھی، صفر (۱۲۲ھ) کی پہلی کا چاند بھی نکل چکا تھا اور لوگوں کو اسی گزشتہ دن ہی یعنی محرم کی آخری تاریخ، بروز منگل، مسجد میں اکٹھا کرنا شروع کر دیا گیا تھا جو آپؒ کے طے کردہ وقتِ خروج سے ایک دن پہلے بنتا ہے کیونکہ آپؒ نے بھی اسی شب یکم صفر یعنی اسی بدھ والی رات کو ہی خروج کے لیے متعین کیا تھا اور اپنے بیعت کرنے والے ہمراہیوں کو خاص علامتی بول "یَا مَنصُور! یَا مَنصُور!" کی آوازیں لگا کر بلانا شروع کر دیا اور لکڑیوں میں آگ جلا جلا کر کوفہ کی گلی کوچوں میں اپنے ہمراہیوں کو اکٹھا کرتے رہے، جب ایک لکڑی کو آگ کھا جاتی تو دوسری لکڑی جلا لیتے الغرض رات بھر اسی طرح اپنے ساتھیوں کو اسی وعدۂ بیعت کی تکمیل کی خاطر جمع کرنے میں صَرف ہوئی۔

معرکہ آرائی:

گورنرِ کوفہ حَکم بن صَلت نے جب لوگوں کو مسجد میں بند کر دیا اور ادھر امام زیدؒ اپنے چند ساتھیوں کے ہمراہ باقی بیعت کرنے والے لوگوں کو جمع فرمانے میں مشغول تھے تو اُس نے والئ عراق یوسف بن عمر کو ہنگامی بنیادوں پر قاصد بھیج کر واقعۂ مذکورہ کی اطلاع پہنچا دی، چنانچہ یوسف نے فوری طور پر واقعہ کی تحقیق کر کے اُسی وقت ریّان بن سَلمہ اَراشی کی قیادت میں، دو ہزار گھڑسوار اور تین سو پیدل جنگجوؤں پر مشتمل شامی فوج اسلحہ سمیت امامِ عالی مقام کے مقابلہ کے لیے حیرہ سے کوفہ بھیج دی (چونکہ حیرہ، کوفہ سے صرف تین ہی میل کی مسافت پر واقع تھا اس لیے یوسف کو اطلاع پہنچنا اور جواب میں فوری لشکر بھیجنا بہت جلد عمل میں آ گیا)۔

اِدھر رات بھر، نہایت مشقت کے ساتھ، بیعت کنندوں کو جمع کرنے کے بعد جب صبح ہوئی تو آپؒ نے عجب صورت دیکھی کہ اُن ہزاروں بیعت کرنے والے جاں نثاروں میں سے صرف دو سو اٹھارہ آدمی آپؒ کے ساتھ تھے۔ یہ دیکھ کر آپؒ نے کہا: سبحان اللہ! باقی بیعت کرنے والے لوگ کہاں ہیں؟ (کیا وہ اس شدید سردی کی وجہ سے پیچھے ہٹ گئے

ہیں اور ہمارے ساتھ باہر نہیں نکلے؟[۱]) بتایا گیا کہ اُن کو مسجد کے اندر روک لیا گیا ہے۔ آپؒ نے فرمایا: وَاللّٰہِ مَا ھٰذَا بِعُذْرٍ لِمَنْ بَایَعْنَا ”اللہ کی قسم! یہ اُن لوگوں کے لیے کوئی عذر نہیں ہے جنہوں نے میرے ہاتھ پر بیعت کی تھی، (بس ویسے ہی وہ میرا ساتھ چھوڑ گئے ہیں)“۔

خیر! آپؒ اسی مٹھی بھر جماعت کو ساتھ لے کر، جامع مسجد کا رخ کرتے ہوئے، ہمت کے ساتھ آگے بڑھے۔ اسی دوران آپؒ کے ساتھی نصر بن خُزیمہ عَبسی نے ایک آواز سنی، وہ چند ساتھیوں کو ساتھ لیے اس کی طرف متوجہ ہوگئے تو دیکھا کہ عُمر و بن عبدالرحمن۔ جو حکم بن صلت کا پولیس افسر تھا۔ گھڑسواروں کی جماعت میں سامنے آرہا تھا۔ اس سے مقابلہ ہوا، نصر عبسی نے اپنے ساتھیوں کے ساتھ مل کر اس پر حملہ کیا جس کے نتیجہ میں عمر وقتل ہوگیا اور اس کے ساتھی پیٹھ پھیر کر بھاگ گئے۔

امام زیدؒ آگے چلتے رہے، جب آپؒ ”جُبَّانۃ سالم“ سے ہوکر ”جبانۃ الصائدین“ پر پہنچے تو اُس شامی لشکر کے پانچ سو فوجیوں سے آمنا سامنا ہوا، آپؒ اور آپؒ کے ساتھیوں نے نصف ہزار کے اُس لشکر کو مار بھگایا، اُس دن امام زیدؒ سیاہ رنگ کے غیر عربی گھوڑے پر سوار تھے۔ اس کے بعد آپؒ انس بن عَمر و ازدی کے گھر کی طرف آئے، اس نے بھی آپؒ کے ہاتھ پر بیعت کی تھی، وہ اپنے گھر میں تھا۔ اس کو گھر کے باہر سے آواز دی گئی، مگر وہ نہ نکلا۔ پھر امام زیدؒ نے خود اسے آواز دی اور کہا: انس! اللہ تم پر رحم کرے، آؤ ہمارے ساتھ چلو، مگر وہ آپؒ کے پکارنے پر بھی باہر نہ نکلا۔ اس پر امام زیدؒ نے فرمایا: کونسی چیز تمہیں پیچھے ہٹا رہی ہے، تم نے تو مجھ سے واقعی وہی (میرے دادائے محترم امامِ حسینؓ جیسا[۲]) معاملہ کیا ہے۔ اللہ ہی تم سے حساب لے گا (کہ تم اپنی بیعت اور وعدوں سے پھر گئے ہو)۔ اس کے بعد آپؒ ”کُناسہ“ پر آئے تو وہاں شامیوں کا ایک جتھا موجود تھا ان سے مقابلہ ہوا۔ آپؒ نے انہیں بھی شکست دی اور آگے بڑھ گئے اور سامنے یوسف بن عمر دو سو فوجیوں کے جھرمٹ میں، آپؒ کو دیکھ رہا تھا۔ وہ اس طرح آپؒ کے قابو میں تھا کہ اگر آپؒ چاہتے تو اسے موت کے گھاٹ اتار سکتے تھے۔ اور اُدھر رَیّان اَراشی، شامیوں کے لشکر کو ساتھ لیے، کوفہ شہر کے اندر امام زیدؒ کے پیچھے پھر رہا تھا۔

آپؒ وہاں سے دائیں جانب ”مصلیٰ خالد“ کی طرف مڑے اور کوفہ شہر میں داخل ہو گئے جبکہ آپؒ کے بعض ساتھیوں نے ”جُبانۃ مخنف“ کا رخ کیا اور شامیوں سے مقابلہ ہوا۔ اس مقابلہ میں شامیوں نے ان کا ایک مجاہد گرفتار کر لیا اور اُسے یوسف کے پاس لے گئے، جسے اُس نے قتل کرا دیا۔

---

(۱) إنما ذكره البلاذري في أنساب الأشراف: ۳/ ۲۴۳

(۲) ينظر: الفتوح لابن أعثم: ۸/ ۲۹۱، والإمام زيد لأبي زهرة، ص: ۷۷، وتجارب الأمم: ۳/ ۱۴۳، وتاريخ ابن خلدون: ۳/ ۱۲۳

اِدھر آپؒ کے ساتھی شہید ہو رہے تھے اور اُدھر اہلِ کوفہ بھی اپنی بیعت سے پیچھے ہٹ گئے تھے اور آپؒ کی نصرت وتعاون سے ہاتھ کھینچ لیا تھا۔ جب آپؒ نے ان اہلِ کوفہ کی یہ دست برداری اور عہد شکنی دیکھی تو فرمایا: قَدْ فَعَلُوْهَا، حَسْبِيَ اللّٰهُ ''انہوں نے واقعی میرے ساتھ امام حسینؓ والا معاملہ کیا ہے، بس مجھے میرا اللہ کافی ہے''۔ اس کے بعد مقابلہ میں آنے والے جتھوں کو شکست دیتے ہوئے آگے بڑھتے رہے، کہ اسی پیش قدمی کے دوران عبید اللہ کندی کے جتھے سے بھی مقابلہ ہوا اور اُسے شکست دی، بالآخر آپؒ اسی جامع مسجد کے دروازے پر پہنچ ہی گئے جس میں آپؒ کے ہاتھ پر بیعت کرنے والوں کی کثیر تعداد موجود تھی۔ وہاں پہنچ کر آپؒ کے ساتھیوں نے اپنے جھنڈے دروازے کے اوپر سے اندر پھینکے اور انہیں آواز دی: ''اے اہلِ مسجد! ذلت سے عزت کی طرف باہر آؤ، دین ودنیا کی کامیابی کی طرف نکلو کیونکہ اس وقت تم جس حالت میں ہو اس میں نہ دین ہے، نہ دنیا۔'' اور امام زیدؒ نے بھی انہیں آواز دے کر کہا: ''مجھے رب ذوالجلال کی قسم! میں نے اس وقت تک خروج کا فیصلہ نہیں کیا جب تک میں نے پورا قرآن مجید نہیں پڑھ کر دیکھ لیا، اور اسی طرح میں نے پہلے اِن امور کو مکمل فہم ورسوخ کے ساتھ سمجھا پھر خروج کیا، یعنی: فرائض، سنن اور آداب، آیات کا شانِ نزول اور ان کا مطلب ومراد، ناسخ ومنسوخ، محکم ومتشابہ، خاص وعام اور دین کی ہر وہ بات جو اس امت کے لیے دین کے معاملہ میں ضروری ہے اور اس کے سمجھے بغیر اس کا دینی علم مکمل نہیں ہوتا۔

اور سنو: میں اِس وقت اپنے اس معاملۂ جہاد میں ایک غیر مشتبہ اور بالکل واضح راہ پر گامزن ہوں (اور قرآن وسنت کی روشنی میں پورے اطمینانِ قلب اور انشراحِ صدر کے ساتھ تمہارے سامنے موجود ہوں اور تمہیں اس جہاد کی طرف دعوت دے رہا ہوں)۔'' مگر شامیوں نے مسجد کے اوپر سے ان حضرات کو پتھر مارنے شروع کر دیے اور مسجد میں موجود اِن بیعت کرنے والوں نے بھی سرد مہری کا مظاہرہ کیا اور کسی قسم کے تعاون کے لیے کوئی پیش رفت نہ کی۔ امام زیدؒ اِن کے عدمِ تعاون اور اس قدر عہد شکنی کو دیکھ کر اپنی اسی مختصری جماعت کو ساتھ لیے واپس ہو گئے۔

اس کے بعد اہلِ کوفہ کے کچھ افراد آ کر آپؒ کے ساتھ مل گئے اور آپؒ نے ''دار الرزق'' میں پڑاؤ ڈالا۔ وہاں ریان اَراشی لشکر لے کر آ پہنچا، اور حضرت زیدؒ کے ساتھ جنگ ہوئی، امام زیدؒ نے اپنی بہادری سے اس لشکر

کو ناکام کر دیا۔ جب شام ہوئی تو اِس شامی لشکر کے عزم و ہمت کی بھی شام ہو چلی تھی چنانچہ وہ لشکر نہایت مایوس ہو کر لوٹا۔ یہ بدھ والے دن کی شام تھی جو کہ جنگ کا پہلا دن تھا کیونکہ آپؒ نے شب بدھ میں خروج کیا تھا جیسا کہ گزرا۔

اگلے دن۔۔یعنی دوسرے روز۔۔جمعرات کی صبح کو، یوسف بن عمر نے عباس بن سعد مُزَنی کی قیادت میں ایک شامی لشکر روانہ کیا، جو وہیں دار الرزق کے پاس آپؒ کے مقامِ پڑاؤ پر پہنچ گیا۔ امام زیدؒ کی اس لشکر سے جنگ ہوئی اور شدید جنگ ہوئی، جس میں آپؒ کے مجاہد ساتھیوں نے بہادری و جرأت کے عجب جوہر دکھائے اور دلیری و جوانمردی کی مثالیں قائم کیں، چنانچہ اس دوران شامی لشکر کے نائل بن فَروہ عَبْسی نے آپؒ کے ساتھی نَضر بن خُزیمہ پر تلوار سے وار کیا جس سے اُن کی ٹانگ کٹ گئی، اب حیرت کا منظر یہ دیکھنے میں آیا کہ اِس مردِ مجاہد نے، ٹانگ کٹ جانے کے باوجود، اُبھر کر اُس پر ایسا حملہ کیا کہ ایک ہی وار سے اُس کو وہیں زمین پر ڈھیر کر دیا، پھر ابھی تھوڑی ہی دیر گزری تھی کہ حضرت نَضر بھی انتقال کر گئے کیونکہ ٹانگ پر لگنے والی ضرب نہایت شدید تھی، اس کے بعد جنگ کی تیزی اور بڑھ گئی۔ آخر عباس مُزَنی کے اس لشکر کو بھی ریان اَراشی کی طرح منہ کی کھانی پڑی اور شکستِ فاش ہوئی جس میں اُن کے ستر فوجی مارے گئے۔

جب شام قریب ہوئی تو یوسف نے ایک بار پھر لشکر کو از سرِ نو ترتیب دے کر روانہ کیا مگر امام زیدؒ نے اِن پر، اپنے ساتھیوں کے ساتھ مل کر، پُر زور حملہ کیا جس سے ان کے چھکے چھوٹ گئے اور بری طرح پسپا ہونا پڑا، وہ بھاگ رہے تھے اور امام زیدؒ اُن کا پیچھا کر رہے تھے۔

یوسف نے، اس طرح مسلسل شکست کا منہ دیکھنے کے بعد، جب امام زیدؒ کا پلہ بھاری ہوتے دیکھا تو اس نے پھر سے لشکر کو مرتب کیا اور اب کی بار اُس نے بارش کی طرح تیروں کی بوچھاڑ کا حکم دیا، چنانچہ اس کے لیے اس نے سلیمان بن کیسان کلبی کی قیادت میں، پیدل تیرانداز جنگجوؤں کا ایک نیا دستہ بھیجا جس نے دور سے ہی تیروں کی برسات کر دی۔ امام زیدؒ مسلسل بہادری کے جوہر دکھا رہے تھے اور اب رات داخل ہو چکی تھی، اتنے میں ایک تیر آیا جو سیدھا آپؒ کی جبینِ مبارک کی بائیں جانب آ لگا اور دماغ میں پیوست ہو گیا۔ آپؒ کے ساتھی آپؒ کو اٹھا کر ایک گھر میں لے آئے اور فوری علاج کے لیے کسی بستی کے ایک طبیب کو لے آئے جس کا نام "شُقَیر" بتلایا جاتا ہے۔ اس

نے زور سے وہ تیر کھینچا جس سے آپؒ کی بے ساختہ چیخ نکلی اور ساتھ ہی یہ مبارک ومطہر روح پرواز کر گئی۔[1]

ایک روایت میں آتا ہے کہ آپؒ کو یہ تیر، بدبخت ''داود بن سلیمان'' نے مارا تھا جو اُن تیراندازوں کے کمانڈر ''سلیمان بن کیسان کلبی'' کا بیٹا تھا۔[2]

یہاں حیرت کی بات یہ ہے کہ دونوں لشکروں کے تناسب میں زمین وآسمان کا فرق تھا۔ ایک طرف صرف ۲۱۸ مجاہد اور دوسری طرف حکومت کی سرپرستی میں ہزاروں کا مسلح لشکر، مگر پھر بھی معرکہ دو دن مسلسل چلتا رہا اور پیکرِ شجاعت، جبلِ استقامت وقائدِ امت حضرت امام زیدؒ اپنے مٹھی بھر چند مخلص مجاہد ساتھیوں بلکہ فدائیوں کے ساتھ ڈٹے رہے اور مقابلے میں آنے والے دشمن کے ہر جتھے کو بری طرح پسپا کرتے رہے اور وہ دم دبا کر بھاگتے رہے۔ حق بات یہ ہے کہ صحیح اسلامی حکومت کے قیام کے لیے اٹھائی گئی یہ مخلصانہ تحریک ضرور کامیاب ہوتی اگر راز افشاء نہ ہوتا نیز یہ کہ اہلِ کوفہ اور اہلِ مسجد آپؒ کے ساتھ مخلص ہوتے اور جہاد میں حسبِ وعدہ وبیعت آپؒ کا ساتھ دیتے، کیونکہ ان کے لیے اُس حصار کو توڑنا بھی کوئی مشکل کام نہیں تھا جو مسجد کے باہر ان پر لگائی گئی تھی، مگر درحقیقت ان اہلِ کوفہ نے اپنی سابقہ عادت کے موافق عین ضرورت کے وقت ساتھ چھوڑ دیا، اسی لیے آپؒ آخر میں بار بار فرمایا کرتے کہ انہوں نے واقعی میرے ساتھ حضرت امام حسینؓ والا معاملہ کیا ہے (کہ جس طرح اہلِ کوفہ نے اُن کو حمایت ونصرت کے خطوط لکھ کر پھر اُن کے ساتھ عہد شکنی کی تھی اسی طرح اِنہوں نے میرے ساتھ عہد شکنی کی ہے)۔[3]

شہادت وتدفین:

راجح قول کے مطابق آپؒ کی یہ شہادت ۱۲۲ھ میں ہوئی،[4] جبکہ ماہِ صفر المظفر کی دو تاریخ،[5] اور جمعہ کی رات

---

(۱) مستفاد مما يلي — بجمع الروايات وتلخيصها - : البداية والنهاية ط هجر: ۱۳/ ۱۰۶ ومابعدها، والكامل في التاريخ: ۴/ ۲۶۲ ومابعدها، وتاريخ الطبري: ۷/ ۱۸۱ ومابعدها، والخطط المقريزية: ۴/ ۳۲۲ ومابعدها، والمنتظم في تاريخ الملوك والأمم: ۷/ ۲۱۰ ومابعدها، وينظر لزاما: موسوعة آل بيت النبي: ۲/ ۳۸۱، ۳۸۲ أيضا.

(۲) الإفادة في تاريخ الأئمة السادة، ص: ۲۴ مع أنساب الأشراف للبلاذري: ۳/ ۲۵۳

(۳) ينظر: امام اعظم ابوحنیفہ شہید اہل بیت، ص: ۱۲۹ مع موسوعة آل بيت النبي: ۲/ ۳۸۳، وذكز اليومين في: ۲/ ۲۸ منه.

(۴) بغية الطلب في تاريخ حلب: ۹/ ۴۰۴۷ مع الإمام زيد بن علي، ص: ۳۳، والبداية والنهاية ط هجر: ۱۳/ ۱۰۱، والأعلام للزركلي: ۳/ ۵۹

(۵) سير أعلام النبلاء: ۵/ ۳۹۰، والخطط المقريزية: ۴/ ۳۲۳، ونور الأبصار، ص: ۲۶۶

تھی۔ [1] اس وقت آپؒ کی عمرِ مبارک ۴۲ برس تھی۔ [2]

شہادت کے بعد آپؒ کے ساتھی اس بارے میں بہت فکر مند ہوئے کہ آپؒ کے جسدِ اطہر کو چھپا کر کہاں دفن کیا جائے تا کہ دشمن کو آپؒ کی قبر کی اطلاع نہ ہو کیونکہ اُن بدبختوں کی طرف سے آپؒ کی لاش کی بے حرمتی کا قوی اندیشہ تھا۔ اس کے لیے مختلف آراء سامنے آئیں: ایک رائے یہ تھی کہ ان کو زِرہ پہنا کر پانی میں بہا دیا جائے، دوسری یہ تھی کہ ان کا سر مبارک بدن سے جدا کر کے باقی بدن کو مقتولین کے ساتھ رکھ دیا جائے، کہ اس سے بھی دشمن آپؒ کے جسدِ اطہر کو نہیں پہچان پائے گا لیکن آپؒ کے صاحبزادے یحییٰ بن زید نے فرمایا: نہیں، اس طرح نہ کرو کیونکہ اللہ عزوجل کی قسم! کتے میرے والد کی لاش کو نہیں کھائیں گے (جس سے پتا چل جائے گا کہ یہی امام زیدؒ ہیں)۔ تیسری رائے یہ تھی کہ ان کو "عباسیہ" (کوفہ سے باہر ایک بستی [3]) میں دفن کر دیا جائے، اور چوتھی یہ تھی کہ جن گڑھوں سے مٹی نکالی جاتی ہے ان میں سے کسی گڑھے میں دفن کر دیا جائے۔ چنانچہ آخری رائے پر عمل ہوا اور دفن کر کے مٹی کے اوپر پانی بہا دیا گیا تا کہ پتا نہ چلے کہ یہاں کوئی دفن ہوا ہے۔ (جبکہ دیگر متعدد روایات میں ہے کہ آپؒ کو پانی کے بہتے ہوئے نالے میں دفن کیا گیا، وہ اس طرح کہ پانی کو بند باندھ کر روک لیا گیا اور جلدی سے آگے گڑھا کھود کر، انہی کپڑوں میں آپؒ کی تدفین کر دی گئی پھر اس گڑھے کے اوپر مٹی اور گھاس ڈال کر نالے کا پانی جاری کر دیا گیا تا کہ کسی کا اس طرف دھیان ہی نہ جائے کہ انہیں یہاں دفن کیا ہوگا۔ [4])

اگلے دن جمعہ کو، جب صبح ہوئی تو یوسف کے حکم پر "حکم بن صلت" کی زیرِ نگرانی، اس خیال سے کہ آپؒ کو زخمی ہو جانے کی وجہ سے کسی گھر میں چھپا لیا گیا ہے، آپؒ کی تلاش شروع کر دی گئی چنانچہ منتخب شامی لوگ کوفہ والوں کے گھروں میں گھس کر زخمی لوگوں کو ڈھونڈتے رہے، وہ گھر کی عورتوں کو صحن میں اکٹھا کر لیتے اور خود پورے گھر کی تلاشی

---

(۱) ینظر: تاریخ ابن خلدون: ۱۲۵/۳ مع امام اعظم ابو حنیفہ شہید اہل بیت، ص: ۱۲۹

(۲) وفيات الأعيان: ۱۲۲/۵، والطبقات الكبرى: ۲۵۱/۵، وتهذيب الكمال: ۹۸/۱۰، وبغية الطلب: ۴۰۳۰/۹، والمنتظم: ۲۱۹/۷، والمختصر في أخبار البشر: ۲۰۴/۱، ونور الأبصار، ص: ۲۶۲، والخطط المقريزية: ۳۲۳/۴

(۳) مراصد الاطلاع علی اسماء الامکنۃ والبقاع: ۹۱۴/۲

(۴) راجع: تاريخ الطبري: ۱۸۸/۷، والمنتظم في تاريخ الملوك والأمم: ۲۱۲/۷، والإمام زيد لأبي زهرة، ص: ۶۳، مع وفيات الأعيان: ۱۱۰/۶

لیتے تاکہ آپؒ کا پتا چلایا جاسکے۔ آخر امام زیدؒ کے سندھی غلام جو تدفین کے وقت موجود تھا نے حَکَم کو آپؒ کی قبر کا پتا بتلا دیا (بعض روایات میں ہے کہ امام زیدؒ کے بجائے، ایک دھوبی کے غلام نے پتا بتایا تھا، وہ اس طرح کہ جب آپؒ کو رات کی تاریکی میں پانی کے نالے میں دفن کیا جارہا تھا تو اس وقت قریب ہی ایک دھوبی کا غلام یہ سارا منظر دیکھ رہا تھا۔ اس نے جاکر بھاری انعام کے عوض، آپؒ کے جسدِ اطہر کی اطلاع دے دی) [1]۔

اس کے بعد حَکَم نے ایسی بدبختی کا اظہار کیا جس کے سامنے خود ''بدبختی'' بھی شرما گئی۔ اس بدبخت نے قبر اکھڑوائی اور آپؒ کے مقدس جسم مبارک کو باہر نکال کر، سر بدن سے الگ کرا دیا۔ پھر اُس نے وہ ''سر'' یوسف کے پاس حیرہ میں پہنچا دیا، یوسف نے سر کو ہشام بن عبدالملک کے پاس دمشق بھجوا دیا اور اِدھر ''حَکَم بن صلت'' کے ذریعے آپؒ کے باقی بدن کو آپؒ کے تین خاص ساتھیوں یعنی حضرت نَصر بن خُزیمہ عَبسیؒ، معاویہ بن اسحاق انصاریؒ (جن کا تذکرہ پیچھے گزر بھی چکا ہے) اور زیادِ نَہدیؒ کی لاشوں سمیت ''کُناسہ'' (کوفہ کا ایک محلہ ہے [2]) میں لکڑی کے سہارے سولی پر لٹکوا دیا اور ان لاشوں پر پہرے دار مقرر کر دیے تاکہ ان کا کوئی حامی کسی وقت انہیں اتار نہ لے۔ [3]

آپؒ کی تدفین کے بعد آپؒ کے ساتھی پھر جدا ہو گئے کہ اب وہ ہستی بھی باقی نہیں رہی تھی جس کی قیادت وسیادت بلکہ جس کی امامت کے بل بوتے پر جہاد ہو رہا تھا، چنانچہ جس مقصد کے لیے جہاد ہو رہا تھا اب وہ مقصد بھی حاصل نہیں ہوسکتا تھا، اس لیے باقی ماندہ ساتھی بھی چلے گئے۔ [4]

([1]) تاريخ الطبري: ۷/۱۸۸ مع الإفادة في تاريخ الأئمة السادة، ص: ۲۴

([2]) معجم البلدان: ۴/۴۸۱، ومراصد الاطلاع على أسماء الأمكنة والبقاع: ۳/۱۱۸۰

([3]) مستفاد مما يلي: البداية والنهاية ط هجر: ۱۳/۱۰۹، والكامل في التاريخ: ۴/۲۶۹، وتاريخ الطبري: ۷/۱۸۶ وما بعدها، والخطط المقريزية: ۴/۳۲۳، وتاريخ ابن خلدون: ۳/۱۲۵

ملحوظة: وينظر للمزيد من مقتل الإمام زيد: أنساب الأشراف للبلاذري: ۳/۲۵۰ وما بعدها.

([4]) ينظر: البداية والنهاية ط هجر: ۱۳/۱۰۹، وأنساب الأشراف للبلاذري: ۳/۲۵۱، والمنتظم في تاريخ الملوك والأمم: ۷/۲۱۲، والكامل في التاريخ: ۴/۲۶۹، والخطط المقريزية: ۴/۳۲۳

لاش کی بے حرمتی میں بدبختی کی انتہاء:

یوسف بن عمر نے امام زید سلامُ اللہ وَ رَحمۃُ علیہ، کے سر مبارک کو ہشام بن عبدالملک کے پاس ملکِ شام بھجوادیا تھا، ہشام نے بدبختی کی حد کردی کہ اُس نے پہلے اس سر کو دمشق کے مرکزی دروازے پر لٹکائے رکھا، پھر اس نواسۂ رسول ﷺ کے سر مبارک کو خود شہرِ رسول ﷺ کی طرف بھجوا دیا، اور ایک دن رات وہاں مدینہ منورہ میں قبرِ رسول ﷺ کے پاس لٹکائے رکھا، پھر وہاں سے مصر بھجوا دیا اور اُس کی مرکزی جامع مسجد کے دروازے پر لٹکائے رکھا۔ وہاں بعض مصریوں نے چوری چھپے اسے کسی طرح اتار لیا اور دفن کر دیا۔[1]

اس کے علاوہ امام زیدؒ کا سر مبارک جب ہشام کے پاس پہنچا تھا ہشام نے اس پر بھی خوشی منائی تھی کیونکہ جو شخص یہ سر لے کر ہشام کے پاس پہنچا تھا ہشام نے اسے انعام میں دس ہزار درہم (مساوی اکیس لاکھ روپے) دیے تھے،[2] اسی طرح ان لوگوں کو بھی انعامات دیے تھے جو امام زیدؒ کے خاص اور قریبی ساتھیوں کے سر اس کے پاس لائے تھے چنانچہ آپؒ کے ساتھیوں میں سے حضرت نَصر عبسی کے سر لانے والے کو ہشام نے ایک ہزار درہم (مساوی دو لاکھ دس ہزار روپے) اور حضرت معاویہ انصاری کے سر لانے والے کو سات سو درہم (مساوی تقریباً ڈیڑھ لاکھ روپے) سے نوازا تھا۔[3]

یہ تو آپؒ کے سر مبارک کی بے حرمتی کی مختصر سرگزشت تھی، جہاں تک باقی جسدِ اطہر کی بے حرمتی کی داستان ہے تو اس کو لکھنے سے پہلے دل کو تھامنا، آنسوؤں کو ضبط کرنا، قلم سے معذرت کرنا اور بدن کو سہارا دینا پڑتا ہے کہ وہ بدبخت اس پاک جسم کے ساتھ وہ کچھ کر گزرے جو وہم وگمان اور تصور وخیال کی دنیا سے کوسوں دور اور عقل وفہم سے کہیں بالاتر ہے۔

بہر حال اب اُن ظالموں کی اُس ناپاک جرأت وجسارت کی طرف قدرے اشارہ کیا جاتا ہے کہ آپؒ کے سر مبارک کو شام بھجوانے کے بعد آپؒ کے باقی جسدِ اطہر کو الامان والحفیظ۔ بالکل ننگا کر کے کوفہ میں برسرِ عام سولی پر لٹکا دیا گیا پھر سولی پر لٹکانے کا ان کا یہ غصہ کوئی ایک آدھ دن یا چند ہفتوں ومہینوں میں ٹھنڈا نہ ہوا بلکہ ہشام جب تک زندہ رہا اور اس کی حکومت

---

(۱) الأعلام للزركلي: ۵۹/۳، والخطط المقريزية: ۳۲۳/۲، ونور الأبصار للشبلنجي، ص: ۲۶۶

(۲) الخطط المقريزية: ۳۲۳/۲، ونور الأبصار في مناقب آل بيت النبي المختار، ص: ۲۶۶

(۳) أنساب الأشراف للبلاذري: ۲۵۳/۲، مع تاريخ الطبري: ۱۸۸/۷

قائم رہی اس نے آپؒ کو اسی طرح پہرے داروں کی ہر وقت کی کڑی نگرانی میں لٹکائے رکھا، شہادتِ زیدؒ کے تین سال بعد جب ربیع الثانی ۱۲۵ھ میں اس کی موت پر اس کی حکومت ختم ہوئی تو ولید بن یزید بن عبد الملک بادشاہ بنا۔ اس کی حکومت میں بھی یہ مبارک و مطہر بدن اسی طرح بر سرِ عام ۱۲۶ھ تک سولی پر لٹکا رہا۔ آخر تقریبا چار سال کا غیر معمولی طویل عرصہ اس طرح سولی پر گزرنے کے بعد، (جب لوگوں میں مذکورہ سولی کے سبب، اموی حکمران کی مخالفت اور امام زیدؒ اور اہل بیت کی حمایت و محبت کے ابھرتے ہوئے جذبات سامنے آنے لگے تو[1]) اِس ولید بن یزید نے بد نصیبی میں ایک قدم اور آگے بڑھتے ہوئے اپنے والیٔ عراق اُسی یوسف بن عمر کو خط لکھا کہ اس بدن کو سولی سے اتارو اور آگ میں جلا کر راکھ کر دو اور پھر اس راکھ کو ہوا میں اڑا دو چنانچہ بد بختی کا بچا کھچا یہ کام بھی کر دیا گیا۔[2]

تائیدِ الٰہی و زیارتِ محمدی:

خیر! ان اموی حکمرانوں نے تو اپنی قساوت پر اپنے ہاتھوں خود مہریں لگائیں مگر اللہ تعالیٰ نے اِن پاک ہستیوں کی لاج رکھتے ہوئے اُن احمقوں کے ناپاک عزم کو شرمندۂ تعبیر نہ ہونے دیا کہ انہوں نے اگرچہ قساوت و بد بختی کی حدود عبور کر کے آپؒ کے جسدِ اطہر کو بالکل ننگا کر کے لٹکایا تھا مگر جب انہوں نے برہنہ بدن کو سولی پر لٹکایا تو اللہ تعالیٰ نے مکڑی بھیج دی جو اُن کے ستر والے مقام پر جال بُن دیتی تھی، اس طرح رب ذو الجلال نے اُن کا ستر لوگوں کی نظروں سے محفوظ رکھا اور اِن پاک ہستیوں کی لاج میں، اُن کے ناپاک عزم کو خاک میں ملا دیا۔

اس کے ساتھ ہی اس موقع پر امامِ شہید کے برحق ہونے کی ایک عجب تائیدِ الٰہی ظاہر ہوئی، وہ اس طرح کہ ان ظالموں نے جب آپؒ کے بدن کو سولی پر لٹکایا تو چہرے والی طرف کو قبلہ سے ہٹا کر عراق کی جانب کر دیا تھا لیکن جب صبح ہوئی تو آپؒ کا بدن خود بخود گھوم کر قبلہ کی جانب ہو چکا تھا، مزید مقامِ حیرت یہ ہے کہ وہ بار بار آپؒ کو قبلہ کی طرف سے پھیر کر عراق کی جانب کر دیا کرتے تھے اور اگلی صبح آپؒ کا چہرے والا حصۂ بدن- گویا آپؒ کا چہرۂ انور-

---

(۱) استفیدَ هذا المقالُ مما یترشح من مختصر تاریخ دمشق: ۱۵۶/۹، وبغیة الطلب فی تاریخ حلب: ۴۰۳۴/۹، وفوات الوفیات: ۳۷/۲، إلا أنه ذُكِر فيها أن هشاما أمر بإحراقه ولكن كثرة الروايات و دراستها في ضوء التاريخ تدلان على أن الآمر بالإحراق هو الوليد دون هشام.

(۲) ینظر: الخطط للمَقريزي: ۳۲۳/۴، ونور الأبصار، ص: ۲۶۶ مع تاريخ الخميس في احوال أنفس النفيس: ۳۲۰/۲ و ۳۲۸/۱، والبداية والنهاية ط هجر: ۱۰۹/۱۳، وسير أعلام النبلاء: ۳۸۹/۵، والصواعق المحرقة: ۴۸۴/۲، وتاريخ إسلام لنجيب آبادي: ۲۵۵/۲، ۲۶۰، ومختصر تاريخ دمشق: ۱۵۹/۹، وتهذيب الكمال: ۹۸/۱۰

پھر قبلہ شریف کی طرف مڑا ہوتا تھا۔[1]

اس کے علاوہ خود امام الانبیاء، حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ نے خواب میں لوگوں کو سخت تنبیہ فرمائی اور شدید ناراضگی کا اظہار فرمایا، چنانچہ جریر بن حازم کا بیان ہے کہ مجھے خواب میں رسول اللہ ﷺ کی زیارت ہوئی، میں دیکھتا ہوں کہ آپ ﷺ نے اُس لکڑی سے ٹیک لگائی رکھی ہے جس پر حضرت زیدؒ کی لاش لٹکی ہوئی ہے اور آپ ﷺ فرما رہے ہیں:

هٰكَذَا تفعلُونَ بِوَلَدِي؟ ''تم لوگ میری اولاد کے ساتھ یہ سلوک کر رہے ہو''؟[2]

اسی طرح کا ایک خواب، سولی پر مقرر اُن پہرے داروں میں سے ایک شخص نے بھی دیکھا، وہ کہتا ہے کہ میں نے خواب میں حضور اقدس ﷺ کو دیکھا، آپ ﷺ حضرت زیدؒ کی سولی والی لکڑی کے پاس کھڑے ہیں اور فرما رہے ہیں: کیا میرے بعد وہ لوگ میری اولاد کے ساتھ یہ سلوک کر رہے ہیں؟ اس کے بعد آپ ﷺ نے حضرت زیدؒ کے بدنِ اطہر کی طرف متوجہ ہو کر اُن کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا: **يَا بُنَيَّ! يَا زَيد! قَتَلُوكَ قَتَلَهُم الله، صَلَبُوكَ صَلَبَهُم الله** ''میرے پیارے بیٹے زید! اِن لوگوں نے آپ کو قتل کیا، انہیں اللہ قتل کرے۔ اِن لوگوں نے آپ کو سولی پر چڑھایا، انہیں اللہ سولی پر چڑھائے۔''[3]

قاتلانِ زید کا انجام بد:

امام زید سلام اللہ وَ رَحمۃُ علیہ، کو شہید کرنے میں جن ظالموں کا ہاتھ تھا اللہ تعالیٰ نے آخرت کے عذاب کے علاوہ دنیا میں بھی ان کو سزا کا مزہ چکھایا، چنانچہ امام زین العابدین کے پوتے حضرت ''عبداللہ بن حسین'' فرماتے ہیں: میں نے دیکھا کہ میرے والد ''حسین بن علی'' یہ دعا کر رہے ہیں: ''اے اللہ! ہشام کی رضامندی سے، امام زیدؒ کو سولی دی گئی۔ تو ہشام سے اُس کی بادشاہت چھین لے، اور یوسف بن عمر نے سنگدلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اُن کو زندہ جلایا تھا، اے اللہ! تُو یوسف پر بھی کسی سنگدل کو مسلط فرما۔ اے اللہ! اگر تیری منشا ہو تو ہشام کو جیتے جی آگ میں جلا ورنہ اس کی موت کے بعد

---

(۱) الصواعق المحرقة: ۲/۴۸۳ و ۱/۱۵۷ مع مختصر تاریخ دمشق: ۹/۱۵۹، وبغية الطلب في تاریخ حلب: ۹/۴۰۵۰، وفوات الوفیات: ۲/۳۷، ونور الأبصار، ص: ۲۶۷ وغیرها.

(۲) تهذيب الكمال: ۱۰/۹۸، ومختصر تاريخ دمشق: ۹/۱۵۹، والصواعق المحرقة: ۲/۴۸۳، وتهذيب التهذيب: ۳/۴۲۰، وبغية الطلب في تاريخ حلب: ۹/۴۰۵۰، وتاريخ الإسلام: ۸/۱۰۶، وسير أعلام النبلاء: ۵/۳۹۰

(۳) مختصر تاريخ دمشق: ۹/۱۵۶ مع بغية الطلب في تاريخ حلب: ۹/۴۰۳۴، وفوات الوفيات: ۲/۳۷

اسے آگ میں جلا۔“

حضرت عبداللہ بن حسین کہتے ہیں: جب حکومت بنوامیہ سے بنوعباس میں منتقل ہوئی تو واللہ! ہشام (کی لاش) کو جلایا جانا میں نے اپنی ان آنکھوں سے دیکھا تھا اور اسی طرح میں نے دیکھا کہ دمشق میں یوسف بن عمر کے ٹکڑے کر دیے گئے اور اس کے اعضاء کو تقسیم کر کے شہر دمشق کے ہر داخلی دروازے پر لٹکا دیا گیا۔

یہ منظر دیکھ کر میں نے والد صاحب سے کہا: ابا جان! لگتا ہے یہ دعا آپ نے لیلۃ القدر میں بھی کی تھی جس کی برکت سے یہ دعا پوری طرح قبول ہوئی۔ فرمانے لگے: نہیں، بیٹا! بلکہ میں نے رجب، شعبان اور رمضان میں (بدھ، جمعرات اور جمعہ کے) تین تین روزے اس طرح رکھے کہ ہر جمعہ والے روزے میں عصر سے لے کر مغرب کی نماز تک میں ان دونوں (ہشام و یوسف) کے لیے یہی دعا کیا کرتا۔[1]

دوسری روایت -جس میں قدرے تفصیل ہے- کے مطابق یوسف بن عمر کا یہ انجام ہوا کہ اس کی ڈاڑھی نوچی گئی اور اس کو تڑپا تڑپا کر مارا گیا، پھر اس کے جسم کے ٹکڑے کر کے ایک ایک حصہ دمشق کے مختلف مقامات میں لٹکایا گیا۔[2]

عمرو بن ہانی سے روایت ہے، وہ کہتے ہیں کہ بنوعباس کے خلیفۂ اول ''ابوالعباس سفاح'' کا زمانہ تھا کہ میں عبداللہ بن علی عباسی کے ساتھ اموی حکمرانوں کی قبروں کی تلاش میں نکلا یہاں تک کہ ہم ہشام بن عبدالملک کی قبر کے پاس پہنچے، اُس کی لاش کو قبر سے باہر نکالا، صرف ناک کا کچھ حصہ ضائع ہوا تھا، باقی سارا بدن ٹھیک تھا (کہا جاتا ہے کہ اس کی لاش کو ایک مخصوص مَسالہ لگا کر دفن کیا گیا تھا[3])۔ عبداللہ عباسی نے اُس کی لاش کو اَسّی کوڑے لگوائے پھر اسے آگ میں جلا دیا، اسی طرح اور بھی کئی ظالم اموی حکمرانوں کی لاشوں کو نکال کر انہیں جلایا۔ اس کو ذکر کرنے کا یہ مطلب نہیں کہ ان عباسیوں کا یہ فعل شرعاً جائز و درست تھا بلکہ اس سے صرف اتنا بتلانا مقصود ہے کہ اللہ تعالیٰ عبرت حاصل کرنے کی خاطر ظالموں پر بھی ظالم مسلط کرتا ہے اور ان اموی حکمرانوں نے،

---

(۱) المواعظ والاعتبار بذکر الخطط والآثار: ۴/۳۲۳

(۲) امام ابوحنیفہ کی سیاسی زندگی، حاشیہ ص: ۱۹۶

(۳) الرجـــاء: قد قرأت هذا المقال خلال المطالعة حول سيرة هذا الإمام الشهيد ولكنني - يا للأسف! - لا أذكر مصدره الآن فالمرجو من ذوي العلم أن يرشدونا إليه.

خاص طور پر اہلِ بیت اطہار کے ساتھ بہت زیادتیاں کیں اور ان پر طرح طرح کے ظلم ڈھائے تھے چنانچہ ان پر بھی پھر اسی طرح کے ظالم لوگ مسلط ہوئے۔ واقعی اللہ نے اپنی کتاب میں سچ فرمایا ہے: {وَكَذَٰلِكَ نُوَلِّي بَعْضَ الظَّالِمِينَ بَعْضًا بِمَا كَانُوا يَكْسِبُونَ} [سورۃ الأنعام:۱۲۹] (مطلب یہ ہے کہ ہم ظالموں کی بداعمالیوں کی وجہ سے اُن پر دوسرے ظالموں کو مسلط کر دیتے ہیں)۔[1]

سعد بن حسن بن قحطبہ سے روایت ہے کہ "کیسان" کی اولاد میں سے جس شخص نے امام زیدؒ کو تیر کے ذریعے قتل کیا تھا، بنوعباس میں سے عبداللہ بن علی نے اسے شام میں پکڑوا کر پہلے قتل کرایا پھر سولی پر لٹکا دیا۔[2]

(۱) ينظر: الإمام زيد لأبي زهرة، ص: ٦٥، ومراد الآية الشريفة من "توضيح القرآن" المسمى بآسان ترجمه قرآن.

(۲) أنساب الأشراف للبلاذري: ۳/۲۵۳

فضائل وخصائص

یہ صاحبزادۂ رسول عجب صفات کے مالک تھے۔ آپؒ کی ذاتی حیثیت پر نظر ڈالی جائے، خواہ اجتماعی پہلو سے آپؒ کو جھانکا جائے، بہر دوصورت آپؒ ایک عظیم انسان اور بے مثل قائد تھے، امامت کا سہرا بلاشبہ آپؒ کے سر پر بالکل بجا سجتا تھا، آپؒ فردِ واحد کی شکل میں مجموعۂ افراد تھے۔

اگر آپؒ دن کے وقت گھڑسوار مجاہد دکھائی دیتے ہیں تو رات کے وقت ایک شب بیدار عابد کا نقشہ پیش کرتے ہیں۔ الغرض آپؒ کی حیاتِ طیبہ جہاں جرأت وشجاعت اور جہاد وقیادت سے عبارت نظر آتی ہے وہاں نماز وتلاوت، عبادت وریاضت، خوف وخشیت، اِخلاص وللّٰہیت، عجز ومسکنت، حلم وبرداشت، عفوومسامحت، رضا وقناعت، سخاوت وموانست، زہد وتقویٰ، ذکر ودعا، آہ وبکا، صبر ووفا اور اخلاق والطاف کا بھی نمونہ بن کر سامنے آتی ہے۔۔۔ بہر حال افعالِ جلوت ہوں خواہ اعمالِ خلوت، آپؒ ہر مقام پر امام ہی امام نظر آتے ہیں۔[1]

آپؒ کو تابعیت کا بھی شرفِ عظیم حاصل تھا، لکھا ہے کہ آپؒ ایک جلیل القدر تابعی تھے اور کئی صحابہ کرامؓ کی زیارت کی تھی۔[2]

اِفادۂ مزید کے لیے آپؒ کے چند اوصاف وخصائل کو ذیل میں قدرے وضاحت کے ساتھ پیش کیا جاتا ہے:

عبادت:

آپؒ عبادت میں اس قدر منہمک رہتے تھے کہ آپؒ کو، اہلِ بیت کا ''راہب'' کہا جاتا تھا،[3] ویسے اصل میں راہب اُس شخص کو کہا جاتا ہے جس کو عبادت کے علاوہ اور کوئی کام نہ ہو۔ اس سے واضح معلوم ہوتا ہے کہ آپؒ انتہا درجہ کی غیر معمولی عبادت گزار ہستی تھیں۔ اسی طرح مدینہ طیبہ میں لوگ آپؒ کو، کثرت سے نماز میں مشغول رہنے کی وجہ

---

(۱) ینظر: نور الأبصار، ص:۲۲۵، ۲۲۶، والإمام زید لأبي زهرة، ص:۴۳، ۴۷و ۶۷ومابعدها، وبغیة الطلب: ۹/۴۰۲۹، وریحان عترت، ص:۸۵، والإمام زید بن علي، ص: ۱۱۱ ومابعدها، وموسوعة آل بیت النبي: ۲/۳۶۶، ۳۷۱، وتاریخ المذاهب الإسلامیة، ص:۲۱۵ ومابعدها بتصرف.

(۲) الصواعق المحرقة: ۲/۳۸۴مع الثقات لابن حبان: ۴/۲۴۹

(۳) نثر الدر في المحاضرات: ۱/۲۳۷

سے، "أسطُوانۃُ المَسجِد" (مسجد کا ستون) کہا کرتے تھے۔ [1] محمد بن فرات کہتے ہیں کہ میں نے حضرت زید بن علی کی زیارت کی اور دیکھا کہ سجدوں کی کثرت سے ان کی پیشانی پر ہلکا سا نشان پڑ چکا تھا۔ [2] بابکی (جن کا نام عبداللہ بن مسلم بن بابک ہے [3]) کا بیان ہے کہ: "میں نے زید بن علی کی صحبت پائی ہے، وہ ساری ساری رات نماز پڑھتے تھے" اور یہی حال روزوں کا تھا کہ ایک دن روزہ رکھتے اور ایک دن ناغہ کرتے۔ [4] الغرض عبادت میں ایک بلند مقام پر فائز تھے جیسا کہ خالد بن صفوان کا قول ہے کہ: بنو ہاشم میں زید بن علی پر، عبادت کی انتہا تھی۔ [5]

تلاوتِ قرآن:

قرآنِ مجید کے ساتھ آپؒ کے شغف کا اندازہ اسی سے لگایا جا سکتا ہے کہ آپؒ کو "حلیف القرآن" (قرآن کا دوست) کہا جاتا تھا، [6] اور قرآن سے دوستی والا آپؒ کا یہ وصف اس قدر معروف و مشہور تھا کہ ابو جارود کا بیان ہے: میں ایک مرتبہ مدینہ طیبہ گیا تو میں نے جب بھی زید بن علی کے متعلق کچھ پوچھا تو مجھے یہ ضرور کہا گیا کہ وہ قرآن دوست شخص ہے۔ [7] آپؒ کی قرآن کے ساتھ دوستی، خود آپؒ کے اپنے بھی ایک فرمان سے ظاہر ہے جس میں آپؒ فرماتے ہیں کہ میں نے قرآن پاک کے ساتھ تیرہ سال اس طرح یکسوئی میں گزارے کہ میں اس کی تلاوت بھی کرتا اور ساتھ ساتھ اس میں غور وفکر بھی کرتا۔ [8]

اسی طرح آپؒ کے متعلق یہ جملہ بھی مذکور ہے: أَنَّ زَيدًا مَاتَوَسَّدَ القُرآنَ مُنذُ احتَلَمَ حَتّٰی قُتِلَ "حضرت زید بن علی نے اپنی بلوغت سے لے کر شہادت تک، کبھی قرآن کو تکیہ نہیں بنایا۔" اور اس کا مطلب یہ لکھا ہے کہ بلوغت کے

---

(۱) سر السلسلة العلوية، ص:۵۷

(۲) الإمام زيد بن علي، ص:۱۱۲، ومقاتل الطالبيين، ص:۱۲۶

(۳) ينظر: مقاتل الطالبيين، ص:۱۲۶

(۴) الروض النضير: ۱/۵۱، ومسند الإمام زيد، ص:۱۰

(۵) الإفادة في تاريخ الأئمة السادة، ص:۳۳، ومثله في نور الأبصار في مناقب آل بيت النبي المختار، ص:۲۶۵

(۶) الخطط المقريزية: ۴/۳۱۷، ونور الأبصار في مناقب آل بيت النبي المختار، ص:۲۶۶

(۷) مقاتل الطالبيين، ص:۱۲۷

(۸) المواعظ والاعتبار بذكر الخطط والآثار: ۴/۳۱۷، والإمام زيد بن علي، ص:۷۲

بعد آپؒ نے کوئی شب ایسی نہیں گزاری جس میں رات کو اٹھ کر تہجد میں قرآن مجید کی تلاوت نہ کی ہو۔[1]

خوفِ الٰہی:

حضرت عمر بن خطابؓ کے پوتے "عاصم بن عبد اللہ" کا بیان ہے کہ میں نے زید بن علی کو اس وقت دیکھا جب وہ نوعمر لڑکے تھے۔ (اُس عمر میں بھی اُن کے خوفِ الٰہی کی یہ کیفیت تھی کہ) اُن کے سامنے اللہ تعالیٰ کا تذکرہ ہوتا تو وہ بسا اوقات بے ہوش کر گر پڑتے اور یہ کیفیت بعض دفعہ تو ایسی شدید اور اس قدر طویل ہوتی کہ لوگ آپس میں کہنے لگ جاتے: "اب وہ ہوش میں نہیں آئیں گے اور اسی حال میں دنیا سے روانہ ہو جائیں گے۔"[2]

ایک مرتبہ سورۂ محمد کی یہ آیت تلاوت کی: {وَإِن تَتَوَلَّوْا يَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ ثُمَّ لَا يَكُونُوا أَمْثَالَكُمْ} [اور اگر تم (احکامِ شرعیہ سے) منہ موڑو گے تو اللہ تعالیٰ تمہاری جگہ دوسری قوم پیدا کر دے گا، پھر وہ لوگ تم جیسے نہیں ہوں گے۔] پھر فرمایا: یہ اللہ عزوجل کی طرف سے نہایت سخت دھمکی ہے، اس کے بعد اُس ذات کے خوف سے اس کے آگے عجز و انکساری کرتے ہوئے عرض کرنے لگے: "اے اللہ! ہمیں اِن منہ موڑنے والے لوگوں میں شامل نہ فرمانا جن (سے ناراض ہو کر ان) کے بدل میں تُو دوسرے لوگ لے آتا ہے"۔[3]

تقویٰ:

لکھا ہے کہ آپؒ انتہائی متقی اور صالح آدمی تھے، اور جلوت ہو یا خلوت ہر وقت اللہ کے دھیان میں رہا کرتے۔[4] اس کی اطاعت میں چاق و چوبند اور نافرمانی سے کوسوں دور تھے جیسا کہ آپؒ کے اپنے فرمان سے یہ بات بالکل واضح ہے۔ سعید بن خثیم سے روایت ہے کہ ایک دفعہ آپؒ نے فرمایا: وَاللهِ مَا كَذَبْتُ كَذْبَةً مُنْذُ عَرَفْتُ يَمِيْنِي مِنْ شِمَالِي وَلَا انْتَهَكْتُ مُحَرَّمًا لِلّٰهِ عَزَّ وَجَلَّ مُنْذُ عَرَفْتُ أَنَّ اللهَ يُؤَاخِذُنِي "واللہ! جب سے میں نے دائیں اور بائیں ہاتھ کا فرق پہچانا ہے (یعنی جب سے شعور سنبھالا ہے) میں نے ایک دفعہ بھی جھوٹ نہیں بولا اور اسی طرح جب

---

(۱) الروض النضير: ۱/۵۱

(۲) المواعظ والاعتبار بذكر الخطط والآثار: ۴/۳۱۸، ومقاتل الطالبين، ص: ۱۲۵

(۳) الخطط للمقريزية: ۴/۳۱۸، ونور الأبصار في مناقب آل بيت النبي المختار، ص: ۲۶۶

(۴) الإمام زيد بن علي، ص: ۱۱۱ مع سير أعلام النبلاء: ۵/۳۸۹

سے مجھے یہ معلوم ہوا ہے کہ اللہ تعالیٰ قیامت کے روز مجھ سے باز پُرس کرے گا اس دن سے میں نے اس کی کسی حرام کردہ چیز کا ارتکاب نہیں کیا۔'' [1] اور یہی اعلیٰ درجہ کا تقویٰ ہے کہ انسان تمام قسم کے گناہوں اور اللہ کی نافرمانیوں کو ترک کردے۔

زُہد (دنیا سے بے رغبتی):

آپؒ کو خاندانِ اہلِ بیت میں جس طرح عبادت میں ممتاز مقام حاصل تھا، اسی طرح آپؒ اُن میں زُہد میں بھی اعلیٰ مرتبے پر فائز تھے، چنانچہ خالد بن صفوان، نے جس طرح آپؒ کی عبادت کا تذکرہ کیا تھا بالکل اسی طرح آپؒ کے کمالِ زہد کا تذکرہ کیا ہے، اور فرمایا ہے: ''بنو ہاشم میں زید بن علی پر زُہد کی انتہاء تھی۔'' [2] اسی طرح ابو اسحاق سُبَیعی آپؒ کے بے مثل مقامِ زُہد کو بیان کرتے ہوئے اپنا مشاہدہ بتاتے ہیں کہ: ''میں نے زید بن علی کو دیکھا ہے، مجھے ان کے خاندان میں اُن جیسا کوئی عالم و فاضل نظر نہیں آیا، بلاشبہ وہ ان میں سب سے بڑے زاہد تھے۔'' [3] اور امام شعبیؒ سے تو یہاں تک منقول ہے کہ: ''واللہ! عورتوں نے زید بن علی سے بڑا زاہد جنا ہی نہیں ہے۔'' [4]

---

(۱) الإمام زيد بن علي، ص: ۱۱۱ مع الروض النضير للسياغي: ۱/۷۴

(۲) الإفادة في تاريخ الأئمة السادة، ص: ۴۳

(۳) المواعظ والاعتبار بذكر الخطط والآثار: ۴/۳۱۷

(۴) نفس المرجع السابق

(۴) حضرت امام جعفر صادق سلامُ اللہ وَ رَحمۃُ علیہ

(جعفر بن محمد)

نام ونسب:

آپ سلامُ اللہ وَ رَحمۃُ علیہ، کا نام ''جعفر'' تھا اور آپؒ حضرت امام باقرؒ کے صاحبزادے تھے۔ آپؒ کی والدہ حضرت ابوبکر صدیق کی پوتی ''اُمّ فروہ'' تھیں۔ آپؒ کی کنیت ''ابوعبداللہ'' اور مشہور لقب ''صادق'' تھا (اور آپؒ کو یہ لقب اس وجہ سے ملا کہ زندگی بھر آپؒ سے کسی نے جھوٹ نہیں سنا)[۱]۔ تاہم اس مشہور لقب کے علاوہ آپؒ کے اور بھی کئی القاب تھے جیسے صابر، فاضل اور طاہر، مگر معروف لقب وہی ''صادق'' ہی تھا جس سے آپؒ نے دنیا میں شہرت پائی۔

یہاں ایک خوبصورت بات یہ ہے کہ آپؒ کو نسب کے لحاظ سے ایک منفرد اعزاز وشرف حاصل ہے، وہ یہ کہ سیدنا ابوبکر صدیقؓ آپؒ کی والدہ کے نانا بھی بنتے ہیں اور دادا بھی، (کیونکہ حضرت ام فروہ کی والدہ کا نام اسماء بنت عبد الرحمن بن ابی بکر الصدیقؓ ہے، اور والد کا نام قاسم بن محمد بن ابی بکر الصدیقؓ ہے)۔ اسی اظہارِ شرف کے طور پر آپؒ فرمایا کرتے تھے: وَلَدَنِی أَبُو بَكْرٍ مَرَّتَيْن) یعنی حضرت ابوبکرؓ نے مجھے دوبار جنا ہے)۔[۲]

ولادت:

آپؒ، ۸ رمضان المبارک [۳]، ۸۰ھ میں مدینہ منورہ میں پیدا ہوئے۔[۴]

---

(۱) الأعلام للزركلي: ۲/۱۲۶

(۲) تاریخ الخمیس: ۲/۲۸۷ مع النجوم الزاهرة فی ملوک مصر والقاهرة: ۲/۸، والوافي بالوفیات: ۱۱/۹۸، وتهذیب الکمال في أسماء الرجال: ۵/۷۳، ۷۵

(۳) فتاوی محمودیہ: ۳/۳۸۱، وأحسن الفتاوی: ۱/۳۶۸، وفتاوی قاسمیہ: ۲/۲۹۲

(۴) الفصول المهمة، ص: ۲۱۲، ونور الأبصار ص: ۱۹۹، والإمام الصادق، ص: ۲۷

حلیہ مبارک:

آپؒ کا اعتدال کے ساتھ درمیانہ قد تھا، نہ بہت لمبا اور نہ بہت چھوٹا۔ چہرہ مبارک سفید سرخی مائل (نہایت خوبصورت) اور چمکدار تھا۔ لکھا ہے کہ چہرہ اس حد تک نورانی اور چمکدار تھا جیسے کوئی چراغ روشنی بکھیر رہا ہو۔ سر کے بال، سیاہ اور قدرے گھنگریالے تھے۔ ناک بلندی مائل تھی۔ پیشانی بالوں سے بالکل صاف تھی جس سے چہرہ اور زیادہ روشن لگتا تھا۔ اور رخسار پر ایک سیاہ تل تھا۔

یہ آپؒ کے دورِ شباب کا حلیہ مبارک ہے، بڑھاپے میں اس پر رونق و وقار اور جلال و ہیبت کا اضافہ ہوگیا تھا۔[1]

لباس:

آپؒ صاف ستھرا اور عمدہ لباس پہنتے تھے، دیکھنے والوں کو اچھی صورت و ہیئت میں نظر آتے تھے۔ خصوصاً جب درسِ حدیث کیلیے تشریف لاتے تو نہایت ہی خوشنما لباس، اور چہرہ، اور سر کے بال وغیرہ سنوار کے آتے اور فرماتے: ''میں اس بات کو ناپسند کرتا ہوں کہ اللہ تعالی نے انسان کو کوئی نعمت دے رکھی ہو اور وہ اس کو ظاہر نہ کرے''۔ پھر فرماتے: اِلْبَسِ الجَمِیلَ، فَإنَّ اللہَ جَمِیلٌ یُحِبُّ الجَمالَ، وَلْیَکُنْ مِنَ الحَلالِ ''خوبصورت لباس پہنا کرو، کیونکہ اللہ تعالی خوبصورت ہے اور خوبصورتی کو پسند کرتا ہے، لیکن اس کا خیال رکھو کہ وہ لباس حلال مال سے ہو''۔[2]

آپؒ اس غرض سے بھی عمدہ لباس زیب تن فرماتے تھے تا کہ ہلکا اور موٹا جھوٹا لباس پہننے کی وجہ سے لوگ آپؒ کو ''زاہد'' (دنیا سے بے رغبت) انسان نہ سمجھیں اور ریا کاری نہ ہو، گویا اپنی صفتِ زُہد (دنیا سے بے رغبتی) کو ریا کاری سے بچانے کیلیے آپؒ عمدہ لباس کا استعمال فرماتے تھے۔[3]

آپؒ انگوٹھی بھی پہنتے تھے اور انگوٹھی پر یہ کلمات نقش تھے: ماشاءَ اللہ، لا قُوَّۃَ إلاَّ باللہ، أستغفِرُ اللہ (گویا اللہ کی طاقت وقدرت اور اپنے گناہگار ہونے کا، ہر وقت دھیان رہتا)۔[4]

---

(۱) الإمام الصادق، ص: ۷۵

(۲) موسوعۃ آل بیت النبی: ۲/۵۱۷

(۳) الإمام الصادق، ص: ۷۷

(۴) نور الأبصار في مناقب آل بیت النبي المختار، ص: ۱۹۹، والفصول المهمة، ص: ۲۱۲

اولاد:

آپؒ کے چھ صاحبزادے اور ایک صاحبزادی تھی، جن کے نام درج ذیل ہیں:

اسماعیل، محمد، علی، عبداللہ، اسحاق، موسیٰ کاظم، اور صاحبزادی کا نام فَروہ تھا۔ [1]

علومِ دینیہ کی تحصیل وتدریس اور علمی مقام:

حضرت امام جعفر صادق سَلامُ اللہِ وَ رَحمۃُ علیہ، نے آنکھ ہی علمی گھرانہ میں کھولی اور مدینہ طیبہ کی اُس مقدس سرزمین پر پرورش پائی جو علم کا گہوارہ اور علماء صحابہ وتابعین کا مسکن تھی۔

چناں چہ آپؒ نے بچپن میں ہی قرآن مجید حفظ کرلیا۔ اس کے بعد حدیث شریف کو حفظ کرنے اور اس کو روایت کرنے کی جانب متوجہ ہوئے، چونکہ آپؒ کا گھرانہ ہی علماء ومحدثین کا گھرانہ تھا اس لیے خود آپؒ کے دادا (حضرت امام زین العابدینؒ جو وقت کے امام اور محدث تھے) نے آپؒ کی علمی تربیت اپنے ذمہ لے لی یہاں تک کہ اُن کا انتقال ہوگیا۔ اُس وقت حضرت جعفرؒ کی عمر چودہ، پندرہ برس تھی مگر اس وقت تک آپؒ اپنے جدامجد سے علم کا بہت بڑا ذخیرہ لے چکے تھے۔ اسی طرح آپؒ نے اپنے نانا حضرت قاسم بن محمدؒ (جو حضرت ابوبکر صدیقؓ کے پوتے تھے) سے علمِ حدیث حاصل کیا۔ [2] اس کے ساتھ ساتھ آپؒ نے اپنے والد ماجد حضرت امام باقرؒ (جن کی علمی شہرت مسلّم تھی) سے بھی بھرپور استفادہ کیا اور علمِ حدیث حاصل کیا۔ بہرحال ان حضرات کے علاوہ آپؒ نے وقت کے اور بھی کئی اکابر مشائخ سے احادیثِ شریفہ روایت کیں جیسے: عطاء بن ابی رباحؒ، نافعؒ (مولیٰ ابن عمرؓ) اور امام زہریؒ، وغیرہ۔ [3]

علمِ حدیث میں اس قدر محنت وطلب سے آپؒ حدیث شریف کے بڑے اساتذہ ومشائخ میں شمار ہونے لگے، [4]

---

(۱) نور الأبصار، ص: ۲۰۲، والفصول المهمة، ص: ۲۱۹، ومطالب السؤول، ص: ۲۸۸

فائدہ: بعض کتب میں آپؒ کی اولاد اس سے کم وبیش لکھی ہے، ملاحظہ ہو: (الملل والنحل: ۱/۱۶۵، وصحاح الأخبار في نسب السادة الفاطمية الأخيار، ص: ۴۴

(۲) موسوعة آل بيت النبي: ۲/۴۹۳ بتغيير يسير

(۳) تهذيب التهذيب: ۲/۱۰۳، وتهذيب الأسماء واللغات: ۱/۱۵۰

(۴) تاريخ الطبري = تاريخ الرسل والملوك، وصلة تاريخ الطبري: ۱۱/۶۵۲

اور لوگ احادیث کیلئے دور دراز سے چل کر آپؒ کے پاس آنے لگے، حتی کہ اُس زمانہ کے عظیم المرتبت ائمہ وفقہاء نے بھی آپؒ سے احادیث روایت کیں جیسے امام مالکؒ، امام ابوحنیفہؒ، سفیان ثوریؒ، سفیان بن عیینہؒ وغیرہ وغیرہ۔[1]

محدث ہونے کے ساتھ ساتھ آپؒ ایک جلیل القدر مفسر بھی تھے اور بعد میں آنے والے مفسرین نے آپؒ کی بیان کردہ تفاسیر سے استفادہ کیا۔[2]

اس کے علاوہ آپؒ فقہ کے بھی ایک بڑے عالم تھے اور ''مثالی فقیہ'' جیسے عظیم الشان لقب سے آپؒ کو نوازا گیا، چنانچہ لوگوں نے جس طرح آپؒ سے علمِ حدیث وتفسیر حاصل کیا اسی طرح آپؒ سے فقہ کا علم بھی سیکھا،[3] حتی کہ امام ابوحنیفہؒ کا شمار بھی آپؒ کے شاگردوں میں ہوتا ہے۔[4] آپؒ کے فقہی مقام کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ ایک دفعہ کسی شخص نے حضرت امام ابوحنیفہؒ سے پوچھا: جن لوگوں سے آپ کی ملاقات ہوئی ہے ان میں آپ کے نزدیک سب سے بڑا فقیہ کون ہے؟ آپؒ نے جواب میں فرمایا: مَارَأیتُ أحَدًا أفْقَهَ مِن جَعفَرِ بنِ مُحَمَّد ''میں نے جعفر بن محمدؒ سے زیادہ کسی کو فقیہ نہیں پایا''۔[5] اسی طرح امام ابوحنیفہؒ یہ بھی فرمایا کرتے تھے: لَولَا السَّنَتَانِ لَهَلَکَ النُّعمَانُ (یعنی اگر میری زندگی میں وہ والے دو سال نہ ہوتے جو میں نے اپنے استاذ امام جعفر صادقؒ کی صحبت میں، اُن سے علم حاصل کرنے کی غرض سے، گزارے تھے تو میں تباہ وبرباد ہو جاتا)۔[6]

ایک موقع پر آپؒ نے اپنے شاگرد امام ابوحنیفہؒ سے فرمایا: مجھے پتا چلا ہے کہ آپ دین میں ''قیاس'' سے کام لیتے ہیں (''قیاس'' اسلامی فقہ کا ایک اصطلاحی لفظ ہے جس کو اِس مقام کی مناسبت سے آسان لفظوں میں یوں بیان کیا جا سکتا ہے کہ اس میں خاص قسم کی صفات والا ایک بڑا عالمِ دین اپنی عقل اور سمجھ کے مطابق شریعت کا مسئلہ بیان کرتا

---

(۱) تهذيب التهذيب: ۲/۱۰۳، والوافي بالوفيات: ۱۱/۹۹، ونور الأبصار، ص: ۱۹۹

(۲) انظر: علماء أهل البيت في عصر التابعين، ص: ۳۲۰ ومابعدها مع تفسير ابن عطية = المحرر الوجيز في تفسير الكتاب العزيز: ۱/۲۰: وتفسير القرطبي: ۱/۱۴۸، ۴/۳۳ و ۱۴۱ و ۳۱۸ وغيرها، وزاد المسير في علم التفسير: ۱/۲۲۲، وحلية الأولياء وطبقات الأصفياء: ۳/۱۹۴

(۳) الرسائل السياسية ص: ۲۵۲ مع أحداث التاريخ الإسلامي: ۱/۹۱۲

(۴) ابو حنيفة — حياته وعصره، لأبي زهرة، ص: ۸۲

(۵) تهذيب الكمال: ۵/۷۹، وابو حنيفه، لأبي زهرة، ص: ۸۱

(۶) مختصر التحفة الاثني عشرية: ۱/۸

ہے)۔ امام ابوحنیفہؒ نے ان سے کہا: میں تو صرف اُس مسئلہ میں قیاس سے کام لیتا ہوں جو مسئلہ قرآن وحدیث میں موجود نہ ہو۔ [1]

حضرت امام جعفرؒ فقہی بصیرت کے حامل دور اندیش عالم تھے اور احکامِ شریعت کے اَسرار و رموز پر گہری نظر تھی۔ ایک مرتبہ کسی نے آپؒ سے پوچھا کہ سود کو حرام قرار دینے کی کیا حکمت ہے؟ آپؒ نے فرمایا: تاکہ لوگ ایک دوسرے کے ساتھ احسان اور تعاون کرنے سے رک نہ جائیں۔ (کیونکہ اگر سود حلال ہوتا تو لوگ آپس میں ہمدردی وتعاون کی بنیاد پر قرضہ دینے کے بجائے، وہ رقم سود پر ادھار دیتے)۔ [2]

آپؒ نے قرآن وحدیث اور فقہ کے علاوہ دیگر وہ تمام علوم حاصل کیے جو اس زمانہ میں رائج تھے [3]۔ بہر حال علمی میدان میں آپؒ کو ایک بلند و بالا مقام حاصل تھا، [4] یہاں تک کہ علماء نے آپؒ کو "شیخ علماء ال أمۃ" (یعنی امتِ مسلمہ کے علماء کا پیشوا اور رہنما) قرار دیا۔ [5] اور آپؒ کو یہ مرتبہ ملا کہ ہر جگہ آپؒ کی علمی شہرت کا ڈنکا بجنے لگا، اور لوگوں نے آپؒ سے اتنے علوم حاصل کیے جنہیں اونٹ اٹھا کر چلتے تھے۔ [6] اور اس قدر لوگ آپؒ کے پاس اپنی علمی پیاس بجھانے کیلیے آئے کہ جب آپؒ کے اِن شاگردوں کی تعداد شمار کی گئی تو اُن کا عدد چار ہزار کو پہنچ چکا تھا۔ [7]

دَہرِیے کو تبلیغ اور اُس کا اسلام قبول کرنا:

ایک دَہرِیہ (جو نعوذ باللہ، "اللہ" کے وجود کا ہی منکر ہوتا ہے) آپؒ کے پاس آیا اور کہا: مجھے "اللہ" پر کوئی دلیل دو۔ آپؒ نے فرمایا: بیٹھو۔ ساتھ ہی ایک بچہ کھڑا تھا جس کے ہاتھ میں انڈا تھا۔ آپؒ نے اس سے فرمایا: بچے! یہ انڈا ذرا مجھے دینا۔ اور آپؒ نے اُس سے انڈا لے کر دَہریے سے کہا:

---

(1) نور الأبصار في مناقب آل النبي المختار، ص: 199

(2) تهذيب الكمال: 5/88، وعدة من المصادر، مع طبقات الصوفية للمناوي: 1/252

(3) الإمام الصادق، ص: 66

(4) الأعلام للزركلي: 2/126، وأحداث التاريخ الإسلامي: 1/916

(5) فضل أهل البيت وحقوقهم، ص: 35، وحقوق آل البيت بين السنة والبدعة، ص: 30

(6) الصواعق المحرقة: 2/586، والفصول المهمة، ص: 211

(7) صحاح الأخبار في نسب السادة الفاطمية الأخيار، ص: 43

دیکھو، یہ ایک محفوظ قلعہ ہے۔ اوپر سے یہ ایک موٹی تہ ہے۔ اس موٹی تہ کے نیچے ایک باریک تہ ہے، اور باریک تہ کے نیچے ایک زردی ہے اور ایک سفیدی۔ اور یہ دونوں (زردی وسفیدی) مائع کی شکل میں ہیں یعنی پانی کی طرح بہنے والی اشیاء ہیں، لیکن زردی، سفیدی کے ساتھ اور سفیدی، زردی کے ساتھ نہیں ملتی بلکہ مائع ہونے کے باوجود یہ دونوں الگ الگ اپنی حالت پر برقرار رہتی ہیں۔ نہ اندر سے باہر کوئی چیز جاتی ہے اور نہ باہر سے اندر کوئی شیئ داخل ہوتی ہے۔ انہی اشیاء سے اس انڈے میں چوزہ پیدا ہوجاتا ہے اور وہ بھی کبھی مذکر اور کبھی مؤنث۔ پھر یہ انڈا پھٹتا ہے اور اس میں سے مختلف رنگوں کے چوزے باہر نکلتے ہیں (کبھی کسی رنگ کا اور کبھی کسی رنگ کا)۔

اب تم بتاؤ کہ تمہارے خیال میں اس سارے نظام کو ٹھیک ٹھیک اور بروقت چلانے والا کوئی ہوگا یا کوئی بھی نہیں ہوگا؟ یہ سن کر اُس دہریے نے کافی دیر تک سر نیچے جھکائے رکھا، سوچ و بچار کے بعد سر اوپر اٹھایا اور کہا: **أشهد أن لا إله إلا الله، وحده لا شريك له، وأشهد أن محمدا عبده ورسوله**، اور پھر کہا: میں اس بات کی گواہی دیتا ہوں کہ آپؒ واقعی خاندانِ نبوت کے فرد ہیں، اور میں آپؒ کے سامنے اپنی گزشتہ زندگی سے توبہ کرتا ہوں۔ [1]

مذہبی اختلافات سے نفرت:

آپؒ کو مسلمانوں کے آپس کے مذہبی اختلافات سے سخت نفرت تھی۔ اس سلسلہ میں آپؒ ان کو سمجھایا بھی کرتے تھے اور فرماتے تھے: مذہبی اختلافات سے بچو کیونکہ اس کا نقصان یہ ہے کہ اس سے دل ہر وقت انہی جھگڑوں میں پھنسا رہتا ہے اور اس کے علاوہ اس سے دلوں میں منافقت بھی پیدا ہوجاتی ہے۔ [2]

سفرِ حج اور تعلق باللہ:

حضرت لیث بن سعدؒ کہتے ہیں کہ میں ۱۱۳ھ میں پیدل حج کو گیا، جب میں مکہ مکرمہ پہنچ گیا تو عصر کی نماز کے وقت جبلِ ابوقُبیس پر چڑھ گیا (جو صفا پہاڑی کے پاس ہے) وہاں میں نے ایک صاحب کو بیٹھے دیکھا کہ وہ

---

(۱) آل البیت حول الرسول، ص: ۲۱۲ بتسھیل

(۲) حلیة الأولیاء: ۱۹۸/۳، وسیر أعلام النبلاء: ۲۶۴/۶، وتذکرة الحفاظ: ۱۲۶/۱

دعائیں مانگ رہے ہیں اور یا رب! یا رب! اتنی مرتبہ کہا کہ دَم گھٹنے لگا، پھر انہوں نے یا رَبّاہ! یا رَبّاہ! اسی طرح کہا کہ دم نکلنے لگا۔ پھر اسی طرح یا اللہ! یا اللہ! کہتے رہے کہ دم گھٹنے لگا پھر اسی طرح یا حَیُّ! یا حَیُّ! لگا تار کہتے رہے، پھر اسی طرح یا رحمٰن! یا رحمٰن!، پھر یا رحیم! یا رحیم! اسی طرح کہا کہ دم گھٹنے لگا، پھر یا اَرحم الراحمین! بھی اسی طرح کہا کہ سات مرتبہ دم گھٹنے لگا۔

اس کے بعد وہ کہنے لگے: اَللّٰهُمَّ إِنِّي أَشْتَهِي مِنْ هٰذَا الْعِنَبِ فَأَطْعِمْنِيهِ وَإِنَّ بُرْدَيَّ قَدْ خَلِقَا "یا اللہ! میرا انگوروں کو جی چاہ رہا ہے، وہ عطا فرما اور میری چادریں بھی پرانی ہوگئیں"۔ لیث کہتے ہیں: اللہ کی قسم! ان کی زبان سے یہ لفظ پورے نکلے بھی نہ تھے کہ میں نے ایک ٹوکری انگوروں سے بھری ہوئی رکھی دیکھی، حالانکہ اس وقت کہیں انگوروں کا نشان بھی نہ تھا، اور دو چادریں رکھی ہوئی دیکھیں۔ انہوں نے انگور کھانے کا ارادہ کیا تو میں نے کہا کہ میں بھی ان میں آپ کا شریک ہوں۔ فرمایا: کیسے؟ میں نے کہا: جب آپ دعا کر رہے تھے تو میں آمین آمین کہہ رہا تھا۔ فرمانے لگے: آؤ کھاؤ، لیکن اس میں سے کچھ ساتھ نہ لے جانا۔ میں آگے بڑھا اور ان کے ساتھ ایسی عجیب چیز کھائی کہ عمر بھر ایسی چیز نہ کھائی تھی۔ وہ عجیب قسم کے انگور تھے کہ ان میں بیج بھی نہ تھا۔ میں نے خوب پیٹ بھر کر کھائے مگر اس ٹوکری میں کچھ کمی نہ ہوئی۔ پھر انہوں نے فرمایا کہ ان دونوں چادروں میں سے جونسی تمہیں پسند ہو لے لو، میں نے کہا کہ چادر کی مجھے ضرورت نہیں ہے۔ پھر فرمانے لگے کہ ذرا سامنے سے ہٹ جاؤ، میں ان کو پہن لوں۔ میں ایک طرف ہوگیا، انہوں نے ایک چادر لنگی کی طرح باندھ لی، دوسری اوڑھ لی اور جو چادریں پہلے سے پہنے ہوئے تھے ان کو ہاتھ میں لے کر پہاڑ سے نیچے اترے۔ میں پیچھے ہولیا، جب وہ صفا و مروہ کے درمیان پہنچے تو ایک سائل نے کہا: رسول اللہ کے صاحبزادے! یہ کپڑا مجھے دے دیجیے، اللہ جل شانہ آپ کو جنت کا جوڑا عطا فرمائے، وہ دونوں چادریں اس کو دے دیں۔

میں نے اس سائل کے قریب جا کر اس سے پوچھا کہ یہ کون ہیں؟ اس نے کہا کہ حضرت امام جعفر صادق ہیں۔ میں پھر ان کے پاس واپس آیا کہ ان سے کچھ نصیحتیں وغیرہ سنوں مگر ان کا کہیں پتا نہ چلا۔[1]

---

(۱) روض الریاحین، الحکایة: ۷۳، وصفة الصفوة: ۱/۳۹۴، والصواعق المحرقة: ۲/۵۸۹ أما ترجمتها إلی الأردیة فهي مستفادة من "فضائل حج: ۲۲۶

ارشادات ونصائح

آپؒ کے اقوال وفرمودات ایک ایسا قیمتی ذخیرہ ہیں جس میں ہر قسم کی نصیحتیں ملتی ہیں۔ان میں کہیں تہذیب اخلاق کا تذکرہ ہے تو کہیں اصولِ زندگی کا بیان، کہیں علم وحکمت کی ترغیب ہے تو کہیں زہد وتقوی کی دعوت، کہیں رزقِ حلال پہ ابھارا ہے تو کہیں اداءِ حقوق پہ روشنی ڈالی ہے۔الغرض نصیحتوں کا ایک خوبصورت گلدستہ ہے جس کے چند پھولوں کا نمونہ پیشِ خدمت ہے:

(۱) ایک آدمی نے آپؒ سے اپنے پڑوسی کی شکایت کی۔آپؒ نے فرمایا: صبر سے کام لو اور کوئی جوابی کارروائی نہ کرو۔اس نے کہا: اس طرح وہ مجھے چھوٹا اور ذلیل شخص سمجھے گا۔آپؒ نے فرمایا: ''ذلیل تو وہ شخص ہوتا ہے جو ظلم کرتا ہے، بلاشبہ ظالم ہی درحقیقت ذلت کا سامنا کرنے والا ہے''۔ [۱]

(۲) چار چیزیں ایسی ہیں جن کا تھوڑا بھی زیادہ ہوتا ہے: آگ، دشمنی، فقر وفاقہ، اور بیماری۔ [۲]

(۳) اللہ تعالی چھ کو چھ کی وجہ سے ہلاک کرتا ہے:

حکمرانوں کو ظلم کی وجہ سے، عربوں کو عصبیت کی وجہ سے، زمینداروں کو تکبر کی وجہ سے، تاجروں کو خیانت کی وجہ سے، دیہات والوں کو دین سے ناواقفیت کی وجہ سے اور علماء کو حسد کی وجہ سے۔ [۳]

(۴) بیٹیاں ''نیکی'' اور بیٹے ''نعمت'' ہیں۔اور ضابطہ یہ ہے کہ نیکیوں پر اجر وانعام دیا جائے گا جبکہ نعمتوں کے بارے میں پوچھ گچھ ہوگی۔ [۴]

(۵) باطن (یعنی انسان کا اندر) جب درست ہو جاتا ہے تو ظاہر طاقتور ہو جاتا ہے۔ [۵]

(۶) بے عمل داعی کی مثال اس تیر انداز کی سی ہے جو بغیر کمان کے تیر پھینکنا چاہتا ہو (ظاہر ہے کہ اس تیر میں قوت

---

(۱) نثر الدر في المحاضرات: ۱/۲۴۲

(۲) نثر الدر في المحاضرات: ۱/۲۴۲، ونور الأبصار، ص: ۲۰۲

(۳) نثر الدر في المحاضرات: ۱/۲۴۵

(۴) نثر الدر في المحاضرات: ۱/۲۴۴، ونور الأبصار، ص: ۲۰۲، والفصول المهمة، ص: ۲۱۷

(۵) نثر الدر في المحاضرات: ۱/۲۴۵

نہیں ہوگی اور مؤثر ثابت نہیں ہوگا)۔[1]

(۷) جب تم خیر کے کسی کام کا ارادہ کرو تو اس میں دیر نہ کرو کیونکہ بعض گھڑیاں ایسی ہوتی ہیں کہ ان میں اللہ تعالی اپنے بندے کو خیر کے کام میں مشغول دیکھتا ہے تو خوش ہو کر فرماتا ہے: اے بندے! میری عزت و میرے جلال کی قسم! میں تجھے ہرگز عذاب نہیں دوں گا۔

اور جب تم برائی کے کسی کام کا ارادہ کرو تو اس کے قریب تک نہ جاؤ کیونکہ بعض گھڑیاں ایسی ہوتی ہیں کہ ان میں اللہ تعالی اپنے بندے کو برائی کے کسی کام میں دیکھتا ہے تو ناراض ہو کر فرماتا ہے کہ اے بندے! میری عزت و میرے جلال کی قسم! میں تجھے کبھی نہیں بخشوں گا۔[2]

(۸) آپؒ نے سفیان ثوریؒ سے فرمایا: نیکی تین چیزوں سے پوری ہوتی ہے: اس کو جلدی کرنے سے، چھوٹا سمجھنے سے اور چھپانے سے۔[3]

(۹) زیادہ ہنسی مذاق سے بچو، کہ اس سے چہرے کی رونق جاتی رہتی ہے۔[4]

(۱۰) کسی کو معاف کر کے پچھتانا مجھے اس سے زیادہ پسندیدہ ہے کہ میں کسی کو سزا دے کر پچھتاؤں۔[5]

(۱۱) کسی نے آپؒ سے پوچھا: کیا وجہ ہے کہ ہم دعا کرتے ہیں مگر ہماری دعا قبول نہیں ہوتی؟ فرمایا: کیونکہ جس سے تم دعا کرتے ہو اُسے تم پہچانتے ہی نہیں۔[6]

(۱۲) جو شخص بغیر خاندانی جتھے کے قوت و عزت اور بغیر بادشاہت کے رعب و ہیبت چاہتا ہو، اسے چاہیے کہ وہ نافرمانی کی ذلت بھری زندگی چھوڑ کر فرمانبرداری کی پُرعزت زندگی شروع کر دے۔[7]

---

(۱) نثر الدر في المحاضرات: ۱/۲۴۶

(۲) آل البیت حول الرسول، ص: ۲۰۸

(۳) حلیة الأولیاء: ۳/۱۹۸ و صفة الصفوة: ۱/۳۹۲، والمنتظم: ۸/۱۱۱

(۴) بهجة المجالس وأنس المجالس: ۲/۵۷۰

(۵) بهجة المجالس وأنس المجالس: ۱/۳۷۰

(۶) طبقات الصوفیة للمناوي: ۱/۲۵۱

(۷) طبقات الصوفیة للمناوي: ۱/۲۵۲، وإسعاف الراغبین للصبان ص: ۲۲۸

(۱۳) جو بُرے آدمی کے ساتھ اٹھتا بیٹھتا ہے وہ خود بھی برائی میں مبتلا ہوجاتا ہے، جو بری جگہوں پر آتا جاتا ہے وہ لوگوں میں متہم (بدنام) ہوجاتا ہے اور جو اپنی زبان پر قابو نہیں پاتا وہ شرمندگی کا سامنا کرتا ہے۔[1]

(۱۴) ایک تاجر (جس کو آپؒ سے بہت لگاؤ تھا اور مالی لحاظ سے بھی بہت خوشحال تھا) آپؒ کے پاس اکثر آتا جاتا رہتا تھا۔ ایک دفعہ وہ کچھ مدت گزرنے کے بعد آیا، اور بہت پریشان تھا، اس کے مالی حالات یکسر تبدیل ہوگئے تھے۔ اس نے اپنی اس زبوں حالی اور تنگدستی کی شکایت کی تو آپؒ نے اسے دو اشعار میں خوبصورت نصیحت کی جو آبِ زر سے لکھنے کے قابل ہے:

فلا تَجزَعْ وإنْ أَعسَرتَ يوماً فقد أيسَرتَ بالزَّمَنِ الطويل

ولا تيأَسْ فإنَّ اليأسَ كُفرٌ لَعَلَّ اللهَ يُغنِي عن قليل

(گھبراؤ نہیں، اگر آج تم غریب ہوگئے ہو تو ایک عرصۂ دراز تک امیر بھی رہے ہو۔ اور اللہ کی رحمت سے مایوس میں نہ پڑو کیونکہ اس کی رحمت سے ناامیدی کفر ہے، کیا بعید ہے کہ اللہ تعالیٰ عنقریب ہی پھر تمہیں مالدار کردے)۔[2]

(۱۵) علماء امانتِ انبیاء کے حاملین ہیں۔ جب تم دیکھو کہ علماء بادشاہوں کی طرف مائل ہورہے ہیں تو ان علماء کو متہم سمجھو۔[3]

(۱۶) جب تم اپنے کسی دوست کے گھر جاؤ تو اس کی طرف سے ہمہ قسمی اکرام قبول کرلینا مگر اس کی خاص نشست گاہ پر نہ بیٹھنا۔[4]

(۱۷) مومن کی شان یہ ہے کہ جب اسے غصہ آتا ہے تو اس کا غصہ اسے "حق" بات سے باہر نہیں نکالتا، جب وہ خوش ہوتا ہے تو اس کی خوشی اسے کسی ناجائز کام پر نہیں ڈالتی، اور جب کسی چیز پر اس کو اختیارات حاصل ہوجاتے ہیں تو وہ اپنے حق سے زیادہ اس میں سے نہیں لیتا۔[5]

---

(۱) طبقات الصوفية للمناوي: ۱/۲۵۲، وإسعاف الراغبين للصبان ص: ۲۲۸

(۲) الفصول المهمة في معرفة أحوال الأئمة، ص: ۲۱۷

(۳) تهذيب الكمال: ۵/۸۸، وحلية الأولياء: ۳/۱۹۴، وسير أعلام النبلاء: ۶/۲۶۲

(۴) نثر الدر في المحاضرات: ۱/۲۴۴

(۵) نثر الدر في المحاضرات: ۱/۲۴۷، ونور الأبصار، ص: ۲۰۲

(۱۸) جس آدمی کو اپنی غلطی چھوٹی نظر آتی ہے اس کو دوسروں کی غلطیاں بڑی نظر آتی ہیں اور جس کو اپنی غلطی بڑی نظر آتی ہے اس کو دوسروں کی غلطیاں چھوٹی نظر آتی ہیں۔[۱]

(۱۹) بُرے لوگوں کے ساتھ دوستی لگانے سے بچنا، کیونکہ ان لوگوں کی مثال اس پتھر کی ہے جس سے پانی نہ بہتا ہو، اس درخت کی ہے جس کے پتے مرجھا چکے ہوں اور اس زمین کی ہے جو بنجر ہو چکی ہو۔[۲]

(۲۰) تقویٰ سے افضل کوئی توشہ نہیں، خاموشی سے بہتر کوئی شیٔ نہیں، جہالت سے زیادہ نقصان دہ کوئی دشمن نہیں، اور جھوٹ سے بڑی کوئی بیماری نہیں۔[۳]

وفات:

آپؒ نے اڑسٹھ (۶۸) سال کی عمر پائی،[۴] اور مدینہ طیبہ میں ۱۵ رجب بروز پیر سنہ ۱۴۸ھ میں انتقال فرمایا۔ (بعض حضرات نے لکھا ہے کہ آپؒ کا انتقال بھی زہر سے ہوا تھا۔[۵] اور بادشاہ "ابوجعفر منصور" نے یہ زہر دلوایا تھا۔[۶]) آپؒ کو آپ کے والد حضرت باقرؒ، دادا حضرت زین العابدینؒ اور ان کے چچا حضرت حسنؓ کے پہلو میں جنت البقیع میں دفن کیا گیا۔ واہ!! کیا کہنے اس جگہ کے شرف و تقدس کے، جہاں اتنی جلیل القدر ہستیاں اکٹھے آرام فرما ہیں۔[۷]

---

(۱) الاتحاف بحب الأشراف، ص: ۴۱۸

(۲) الاتحاف بحب الأشراف، ص: ۴۱۸

(۳) حلیة الأولیاء: ۳/۱۹۶، وتهذیب الکمال في أسماء الرجال: ۵/۹۰

(۴) مطالب السؤول، ص: ۲۸۸، ودول الإسلام للذهبي: ۱/۱۳۸، وأحداث التاریخ الإسلامي: ۱/۹۱۷

(۵) طبقات الصوفیة للمناوي: ۱/۲۵۳، ونور الأبصار، ص: ۲۰۲، وإسعاف الراغبین للصبان، ص: ۲۲۸

(۶) صحاح الأخبار في نسب السادة الفاطمیة الأخیار، ص: ۴۴

(۷) تاریخ الخمیس: ۲/۲۸۷، وصحاح الأخبار، ص: ۴۳، والوافي بالوفیات: ۱۱/۹۹

فضائل وخصائص

کتابیں آپؒ کے فضائل ومناقب اوراعلیٰ اوصاف کے بیان سے بھری ہوئی ہیں جنہیں علماء نے مختلف الفاظ میں اپنے اپنے انداز سے اپنی کتابوں میں ذکر کیا ہے، ان میں سے بعض فضائل واوصاف نیچے درج کیے جارہے ہیں:

(۱) سب لوگ آپؒ کے عالی مرتبہ ہونے کے معترف تھے، اور آپؒ کو اپنا پیشوا اور رہنما جانتے تھے۔[1] بلکہ اپنا جلیل القدر سردار سمجھتے تھے۔ خاندانی شرافت تو آپؒ کو حاصل تھی ہی، اس کے ساتھ ساتھ آپؒ سرچشمہ شجاعت بھی تھے، بہادری اور جوانمردی آپؒ کی گویا شناخت تھی۔ اس کے علاوہ قول کے سچے اور علمِ توحید وغیرہ کے ماہر تھے۔[2]

(۲) آپؒ کے فضائل ومناقب کثیر تعداد میں موجود ہیں۔ آپؒ اس مقام پر فائز تھے کہ اپنے فضل وکمال، علم وشرف اور قائدانہ صفات کی وجہ سے امیر المومنین بننے کی صلاحیت رکھتے تھے، الغرض آپؒ کی زندگی خوبیوں سے مرکب اور اعلیٰ اوصاف کا مجموعہ تھی۔[3] یہی وجہ تھی کہ آپؒ کو "عمود الشرف" (عزت وشرافت کا ستون) کہا جاتا تھا۔[4]

(۳) حضرت عمرو بن مِقدام کا بیان ہے: میں نے جب امام جعفر صادقؒ کو دیکھا تھا تو میں سمجھ گیا تھا کہ یہ خاندانِ نبوت کا چشم وچراغ ہے۔[5]

(۴) آپؒ کے زمانہ میں آپؒ کا کوئی ثانی نہیں تھا۔[6]

(۵) آپؒ بلند پایہ عالم تھے، اس کے ساتھ ساتھ دنیا سے بے رغبتی اور عبادت میں مشغولی آپؒ کے خصوصی اوصاف تھے۔[7]

---

(۱) شرح الشفا للملا علي القاري: ۱/۴۳، وتهذيب الأسماء واللغات: ۱/۱۵۰

(۲) مرآة الجنان وعبرة اليقظان: ۱/۲۳۸

(۳) مستفاد من: تاريخ الإسلام ووفيات المشاهير والأعلام للذهبي بتحقيق العدمري: ۹/۹۳

(۴) الجوهر الشفاف في أنساب السادة الأشراف: ۱/۱۴۰

(۵) تهذيب الكمال: ۵/۷۸، وسير أعلام النبلاء: ۶/۲۵۷، وحلية الأولياء: ۳/۱۹۳

(۶) سير أعلام النبلاء ط الرسالة: ۶/۲۵۷

(۷) وفيات الأعيان: ۱/۳۷۱، والمنتظم: ۸/۱۱۱ مع الأعلام للزركلي: ۲/۱۲۶

(۶) آپؒ جلیل القدر تابعی تھے، بعض صحابہ کرام کی زیارت سے مشرف ہوئے جن میں تقریباً حضرت انس بن مالکؓ اور سہل بن سعدؓ بھی شامل ہیں۔ [1]

(۷) آپؒ نے ایک موقع پر لوگوں سے فرمایا تھا کہ میرے دنیا سے چلے جانے سے پہلے پہلے مجھ سے دینی مسائل معلوم کرلو، کہ میرے بعد تمہیں اس جیسی حدیثیں کوئی نہیں سنائے گا جو میں سنا رہا ہوں۔ [2]

(۸) خلیفہ منصور نے امام جعفر صادقؒ سے ایک مرتبہ کہا: رسول اللہ ﷺ کے معاملہ میں ہم اور تم برابر ہیں (کہ ہم دونوں اُن کی امت میں ہیں اور وہ ہم سب کے نبی ہیں)، تمہیں کونسی کوئی فضیلت حاصل ہے؟ آپؒ نے فرمایا: اگر رسول اللہ ﷺ تم میں سے کسی کو نکاح کا پیغام بھیجیں اور اس سے شادی کرنا چاہیں تو آپ ﷺ کیلیے یہ جائز ہے، جبکہ ہم میں سے کسی کے ساتھ نکاح کرنا آپ ﷺ کیلیے جائز نہیں ہے۔ یہ اس بات کی واضح دلیل ہے کہ ہم حضور ﷺ سے ہیں اور حضور ﷺ ہم میں سے ہیں۔ [3]

(۹) آپؒ کے دل میں عشقِ رسول کی عجب شمع روشن تھی۔ امام مالکؒ بیان کرتے ہیں کہ میں امام جعفرؒ کے پاس جایا کرتا تھا۔ ان کے لبوں پر اکثر مسکراہٹ ہوتی تھی لیکن جب ان کے سامنے آپ ﷺ کا نام مبارک لیا جاتا تو ان کا رنگ زرد پڑ جاتا۔ [4]

(۱۰) آپؒ رسول اللہ ﷺ کی احادیث شریفہ کا بہت ادب اور احترام کرتے تھے، چناں چہ آپؒ نے کبھی کوئی حدیث بے وضو بیان نہیں کی۔ [5]

(۱۱) آپؒ حد درجہ شفیق و مہربان، ہمدرد و غمخوار اور انتہائی نرم مزاج اور شیریں طبیعت کے مالک تھے۔ اس کے علاوہ عابد، زاہد، صابر، شاکر اور عاجز و متواضع شخصیت تھے۔ [6]

---

(۱) الأعلام للزركلي: ۲/۱۲۶ مع سير أعلام النبلاء ط الرسالة: ۶/۲۵۵

(۲) تهذيب الكمال في أسماء الرجال: ۵/۷۹، وسير أعلام النبلاء ط الرسالة: ۶/۲۵۷

(۳) محاضرات الأدباء ومحاورات الشعراء والبلغاء: ۱/۴۱۸

(۴) الشفا بتعريف حقوق المصطفى، للقاضي عياض: ۲/۴۲، والإمام الصادق، ص: ۷۶

(۵) تهذيب التهذيب: ۲/۱۰۵

(۶) الإمام الصادق، ص: ۸۶

(۱۲) آپؒ کی زیارت، آخرت یاد دلاتی تھی، آپؒ کی گفتگو سننے سے دنیا سے بے رغبتی پیدا ہوتی تھی اور آپؒ کی اقتداء جنت کی رہبری کرتی تھی۔ [۱]

اس کے علاوہ آپؒ کی بعض چیدہ چیدہ صفات کا کسی قدر تفصیلی تذکرہ ذیل میں کیا جاتا ہے:

ذوقِ عبادت:

بہت سارے علماء نے آپؒ کا تعارف کراتے وقت آپؒ کو عبادت گزار عالم کے طور پر ذکر کیا ہے، جس کا کچھ نمونہ اوپر گزرا، تاہم امام مالکؒ اپنا ذاتی مشاہدہ بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں: میں ایک عرصۂ دراز تک امام جعفر صادقؒ کے پاس آتا جاتا رہا۔ میں جب بھی ان کے پاس جاتا تو انہیں ان تین اعمال میں سے کسی عمل میں دیکھتا: یا تو وہ نماز میں مشغول ہوتے، یا روزے کی حالت میں ہوتے اور یا قرآن مجید کی تلاوت میں مصروف ہوتے۔ اور آپؒ بے مطلب و بے فائدہ کوئی بات نہیں کرتے تھے۔ بلاشبہ آپؒ ان علماء میں سے تھے جن کی زندگی عبادت سے معمور تھی اور جن کے دل خوفِ الٰہی سے سرشار تھے۔ [۲]

شہنشاہِ حقیقی (اللہ) سے تعلق کی مضبوطی اور دنیوی بادشاہوں سے نہ ڈرنا:

(۱) ''ربیع'' (جو خلیفہ منصور کے دربان تھے [۳]) کہتے ہیں:

مجھے خلیفہ ابو جعفر منصور نے بلوایا اور کہا: جعفر بن محمد کو میری بادشاہت پر اعتراض ہے۔ مجھ پر رب کی مار ہو اگر میں نے اس کو قتل نہ کیا۔ جاؤ، اس کو بلا کے لاؤ۔ چناں چہ میں امام جعفرؒ کے پاس آیا اور کہا کہ آپؒ کو امیر المومنین بلا رہے ہیں۔ انہوں نے وضو کیا اور صاف ستھرے کپڑے پہنے۔ میں ان کو لے کر آیا اور ان کو اندر لانے کی خلیفہ سے اجازت طلب کی۔ خلیفہ نے کہا: لے آؤ اُس کو، مجھ پر رب کی مار ہو اگر میں نے اس کو قتل نہ کیا۔ لیکن جب آپؒ اندر داخل ہوئے اور بادشاہ کی نظر آپؒ پر پڑی تو معاملہ ہی برعکس ہو گیا۔ اس نے اپنی جگہ سے اٹھ کر استقبال کیا اور کہا: مَرْحَباً بِالنَّقِيِّ السَّاحَةِ، البَرِيْءِ مِنَ الدَّغَلِ وَ الخِيَانَةِ، أَخِي وَ ابْنِ عَمِّي. ''خوش آمدید! ایسی شخصیت کو جو گناہوں سے

---

(۱) مطالب السؤول في مناقب آل الرسول، ص: ۲۸۳

(۲) تهذيب التهذيب: ۲/۱۰۴، مع الشفا بتعريف حقوق المصطفى: ۲/۴۲

(۳) تاريخ دمشق لابن عساكر: ۸۶/۱۸

پاک اور فساد و خیانت سے بری ہے اور وہ ہستی جو میرے لیے میرے بھائی و چچازاد بھائی کی طرح ہے"۔ پھر آپؒ کو اپنے ساتھ تخت پر بٹھایا اور پوری توجہ کے ساتھ حال دریافت کیا۔ پھر کہا: اپنی کوئی ضرورت مجھے بتائیں میں اسے پورا کروں گا۔ آپؒ نے اپنی ذاتی کوئی حاجت بیان کرنے کے بجائے اجتماعی ضرورت بتاتے ہوئے فرمایا: مکہ اور مدینہ والوں کو ایک مدت سے وظائف (بادشاہ کی طرف سے مقرر کردہ عطیات) نہیں مل رہے، آپ ان کیلیے وظائف کی ادائیگی جاری کروادیں۔ بادشاہ نے کہا: ٹھیک ہے، میں کروادیتا ہوں۔

اس کے بعد اس نے اپنی باندی سے کہا: وہ تحفہ لے آؤ۔ وہ گئی اور ایک شیشی لے آئی جس میں "غالیہ" (مشک و عنبر وغیرہ سے بنی ہوئی ایک خاص قسم کی شاہی خوشبو) تھی۔ آپؒ نے وہ ہدیہ قبول کیا اور واپس تشریف لے آئے۔

ربیع کہتے ہیں کہ میں آپؒ کے پیچھے ہولیا اور باہر نکل کر میں نے آپؒ سے کہا: اے رسول اللہ ﷺ کے صاحبزادے! جب میں آپؒ کو بادشاہ کے پاس لے کر آیا تھا تو مجھے ذرا برابر بھی آپؒ کے قتل کردیے جانے میں شک نہیں تھا۔ لیکن یہاں آکر جو کچھ ہوا ہے وہ سب آپؒ کے سامنے ہے۔ اور جب آپؒ بادشاہ کے پاس داخل ہو رہے تھے تو میں نے دیکھا کہ آپؒ زیرِ لب کچھ پڑھتے جا رہے تھے، وہ کیا چیز تھی؟

آپؒ نے فرمایا: میں نے یہ دعا پڑھی تھی:

اللَّهُمَّ احرُسني بِعَينِکَ الَّتي لاتَنَامُ، وَاكْنُفني بِرُكنِکَ الَّذي لايُرَامُ، وَاحفَظْني بِقُدرَتِکَ عَلَيَّ، وَلاتُهلِكْني وَأَنتَ رَجَائي، رَبِّ كَمْ مِنْ نعمَةٍ أَنْعَمتَ بِهَا عَلَيَّ قَلَّ لکَ عِندَهَا شُكرِي، وَكَم مِنْ بَلِيَّةٍ ابْتَلَيْتَني بِهَا قَلَّ لَهَا عِندَکَ صَبرِي؟ فَيَا مَنْ قَلَّ عِندَ نِعمَتِهِ شُكرِي، فَلَمْ يَحرِمْني، وَيَا مَنْ قَلَّ عِندَ بَلِيَّتِهِ صَبرِي، فَلَمْ يَخْذُلْني، وَيَا مَنْ رَآني عَلَى المَعَاصِي، فَلَمْ يَفضَحْني، وَيَا ذَا النِّعَمِ الَّتي لاتُحصَى أَبَداً، وَيَا ذَا المَعرُوفِ الَّذي لايَنقَطِعُ أَبَداً، أَعِنّي عَلَى دِيني بِدُنيَا، وَعَلَى آخِرَتي بِتَقوَى، وَاحفَظْني فِيمَا غِبتُ عَنهُ، وَلاتَكِلْني إِلَى نَفسِي فِيمَا حَضَرتُ[1]، يَامَنْ لاتَضُرُّهُ الذُّنُوبُ، وَلاتَنقُصُهُ المَغفِرَةُ، اغْفِرْ لي مَالايَضُرُّکَ، وَأَعْطِني مَالايَنقُصُکَ، يَاوَهَّابُ! أَسأَلُکَ فَرَجاً قَرِيباً، وَصَبراً جَمِيلاً، وَالعَافِيَةَ مِنْ جَمِيعِ البَلايَا، وَشُكرَ العَافِيَةِ.

---

(۱) "حَضَرتُ": أثبتنا هذه الكلمة من تهذيب الكمال: ۵/۹۵، وتاريخ دمشق: ۱۸/۸۷، ومناقب الأسد الغالب ص: ۵۳ وغيرها. أما في سير أعلام النبلاء: ۶/۲۶۶ فهي: "خَطَرتُ" مكان "حَضَرتُ"، لعلها من سهو الكاتب. والله أعلم.

ترجمہ: اے اللہ! اپنی اس آنکھ سے میری نگہبانی فرما جو کبھی سوتی نہیں، اور مجھے اپنی اس طاقت کی آڑ میں لے لے جس کے پاس کوئی پھٹک نہیں سکتا، اور اپنی اس قدرت سے میری حفاظت فرما جو تجھے مجھ پر حاصل ہے، اور مجھے ہلاک نہ فرما، تو ہی میری امید گاہ ہے۔

اے میرے رب! کتنی ہی ایسی نعمتیں ہیں جو تو نے مجھے عطا فرمائیں اور میری طرف سے ان کا شکر کم ہی رہا، اسی طرح کتنی ہی ایسی مصیبتیں اور پریشانیاں ہیں جن سے تو نے مجھے آزمایا اور میرا اُن پر صبر کم ہی رہا۔ اے وہ ذات! جس کی نعمت پر میرا شکر کم رہا پھر بھی اس نے مجھے ان نعمتوں سے محروم نہ فرمایا، اور اے وہ ذات! جس کی آزمائش پر میرا صبر کم ہی رہا پھر بھی اس نے میرا ساتھ نہ چھوڑا، اور اے وہ ذات! جس نے مجھے گناہوں میں دیکھا پھر بھی مجھے رسوا نہ کیا اور میرے عیبوں پہ پردہ ڈالا، اور اے وہ ذات! جو ان نعمتوں والی ہے جو نعمتیں کبھی شمار نہ ہو سکیں، اور اے وہ ذات! جو ایسے احسان والی ہے جو احسان کبھی ختم نہ ہو، (میری التجاء ہے کہ) دنیا کو میرے دین پر مددگار بنا دیجئے، اور تقویٰ کو میری آخرت پر مددگار بنا دیجئے، جو چیزیں میری آنکھوں سے اوجھل ہیں ان کے بارے میں تو میرا محافظ ہو جا، اور جو چیزیں میرے سامنے ہیں ان میں مجھے میرے نفس کے حوالے نہ فرما۔ اے وہ ذات جس کو گناہ نقصان نہیں پہنچاتے اور جس کے پاس مغفرت کی کمی نہیں ہے! مجھے وہ چیز معاف کر دے جو تجھے نقصان نہیں پہنچاتی اور وہ چیز عطا فرما جس کی تیرے پاس کمی نہیں ہے۔ اے بہت عطا کرنے والے! میں تجھ سے فوری کشادگی، صبرِ جمیل، تمام مصیبتوں سے عافیت اور پھر اس عافیت پر توفیقِ شکر مانگتا ہوں)۔[1]

(۲) ایک دفعہ خلیفہ منصور پر مکھی آ کر بیٹھی، اس نے اسے ہٹا دیا، وہ دوبارہ آ کر بیٹھ گئی اس نے پھر ہٹا دیا، یہاں تک کہ مکھی نے اسے تنگ کر دیا۔ اتنے میں امام جعفرؒ اس کے پاس تشریف لے آئے۔ منصور نے آپؒ سے کہا: اے ابو عبداللہ! اللہ تعالیٰ نے مکھی کو کیوں پیدا کیا ہے؟ آپؒ نے بلا کسی خوف و جھجک کے فرمایا: لِیُذِلَّ بِهِ الْجَبَابِرَةَ ”ظالموں کو ذلیل کرنے کیلئے“۔ یہ سن کر منصور چپ ہو کے رہ گیا۔[2]

---

(۱) سیر أعلام النبلاء: ۶/۲۶۶ مع تهذيب الكمال: ۵/۹۵، ومثله في مناقب الأسد الغالب، ص: ۵۳

(۲) حلية الأولياء: ۳/۱۹۸، وصفة الصفوة: ۱/۳۹۲، وتهذيب الكمال: ۵/۹۳ مع حياة الحيوان الكبرى: ۱/۴۹۱، ونور الأبصار، ص: ۲۰۳

(۳) ایک دن منصور نے امام جعفرؒ کی طرف پیغام کہلا بھیجا کہ: تم ہمارے پاس کیوں نہیں آتے جس طرح باقی لوگ ہمارے پاس آتے ہیں؟ آپؒ نے جواب میں فرمایا: ہمارے پاس کوئی ایسی چیز تو ہے نہیں جس پر ہمیں تمہارا ڈر ہو، نہ تمہارے پاس آخرت کی کوئی ایسی چیز ہے جس کے ہم تجھ سے امیدوار ہوں، نہ تم کوئی ایسی نعمت میں ہو کہ جس پر ہم تمہیں مبارک باد دیں، اور نہ ہم اسے کوئی مصیبت سمجھتے ہیں کہ اس پر ہم تمہاری تعزیت کریں، تو پھر کس وجہ سے ہم تمہارے پاس آیا کریں؟ منصور نے اس کے جواب میں کہا: تم ہمارے پاس آیا کرو تا کہ ہمیں کوئی نصیحت کر دیا کرو۔ اس پر آپؒ نے فرمایا: جو دنیا کا طالب ہے وہ تمہیں نصیحت نہیں کرے گا اور جو آخرت کا طالب ہے وہ تمہارے ساتھ رہے گا نہیں۔ [1]

سخاوت:

آپؒ جس عظیم خاندان کے فرد تھے وہ سخاوت میں معروف بلکہ ضرب المثل تھا، حضرت علیؓ کو "اَسْخَی العَرب" (یعنی عربوں کا سخی آدمی) کہا جاتا تھا او حضرت امام زین العابدینؒ کی سخاوت کا ذکر گزر چکا ہے کہ اہلِ مدینہ کے سو (۱۰۰) گھرانوں کی خفیہ کفالت انہوں نے اپنے ذمہ لے رکھی تھی، سخاوت کا بالکل یہی رنگ بلکہ یہی طرز حضرت امام جعفر صادقؒ میں تھا کہ وہ بھی اپنے دادا کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے رات کی تاریکی میں اپنے پیٹھ پر بوری لادتے جس میں درہم اور کھانے پینے کا سامان ہوتا اور جا کر اہلِ مدینہ کے حاجت مند لوگوں کو دے آتے اور کسی کو پتا بھی نہ چلتا۔ جب آپؒ کا انتقال ہوا اور ان حاجت مند لوگوں کے پاس سامان آنا بند ہو گیا تو اس وقت آپؒ کا یہ راز لوگوں پر ظاہر ہوا۔

اس کے علاوہ بھی آپؒ کی سخاوت عام تھی۔ آپؒ صرف مستحقین کو ہی نہیں دیتے تھے بلکہ اپنے متعلقین کو اس بات کا حکم بھی فرمایا کرتے تھے کہ وہ اپنی طرف سے مال کی ادائیگی کر کے لوگوں کے باہمی مالی جھگڑے ختم کرایا کریں۔ اور آپؒ کا عام دستور یہ تھا کہ خفیہ طور پر مال خرچ کرتے تھے۔ [2]

---

(۱) علماء أهل البيت في عصر التابعين، ص: ۳۸۴

(۲) ينظر: الإمام الصادق، ص: ۸۱

صبر وشکر:

آپ ؒ نہایت صابر وشاکر تھے اور مشکل سے مشکل گھڑیوں میں صبر کیا حتی کہ قریبی دوستوں بلکہ اولاد کی وفات پر بھی صبر کا دامن ہاتھ سے نہیں جانے دیا اور کمال درجہ کے صبر وشکر کا مظاہرہ کیا۔ آپ ؒ کے سامنے آپ ؒ کے چھوٹے بیٹے کے گلے میں کوئی چیز اٹکی اور وہ وہیں فوت ہو گیا۔ اس اچانک اور دل ہلا دینے والے صدمہ سے آپ ؒ کی آنکھوں سے آنسو تو جاری ہوئے (جو ایک فطری اور جائز چیز ہے)، مگر آپ ؒ نے اس وقت میں بھی اللہ کی دوسری نعمتوں کو یاد رکھا اور فرمایا: ''اگر ایک طرف مجھ سے کسی چیز (یعنی اس بیٹے) کو لے لیا گیا ہے تو دوسری طرف کتنی ساری چیزیں میرے پاس باقی بھی تو چھوڑ دی گئی ہیں، اور اگر ایک شئ کے ذریعہ مجھے آزمائش میں ڈالا بھی گیا ہے تو دوسری جانب کتنی ہی چیزوں میں مجھے عافیت بھی تو دے رکھی ہے''۔

پھر وہ بچہ اندر عورتوں کے پاس بھجوا دیا۔ اس بچے کو فوت شدہ دیکھ کر انہوں نے چلانا شروع کر دیا۔ آپ ؒ نے قسم دے کر نہایت تاکید کے ساتھ ان کو چلانے سے روک دیا (کیونکہ حدیث شریف کی رُو سے میت کے اوپر آواز کے ساتھ رونا منع ہے)۔ اس کے بعد آپ ؒ اس کو دفن کرنے کیلیے لے گئے اور اللہ کی تعریف میں یہ الفاظ ارشاد فرما رہے تھے: سُبحانَ مَن یَقبِضُ أولادَنَا وَلا نَزدادُ لَهُ إلّا حُبًّا ''پاک ہے وہ ذات جو ہماری اولادیں واپس بلا لیتی ہے اور ہمارے دلوں میں اُس ذات کی محبت اور بڑھ جاتی ہے''۔

اور تدفین مکمل ہو جانے کے بعد فرمایا: ''ہم اللہ سے اپنے پیاروں کے بارے میں اپنی پسندیدہ چیز مانگتے ہیں اور وہ ہماری دعا قبول فرما کر وہ چیز ہمیں عطا فرماتا ہے، اور اگر وہ ہماری پسند کے خلاف فیصلہ فرما دیتا ہے تو ہم اس پر دل وجان سے راضی ہوتے ہیں''۔[1]

حلم ودرگزر (برداشت کرنا اور معاف کرنا):

بردباری آپ ؒ کا خاص وصف تھا، آپ ؒ لوگوں کی زیادتیوں کو برداشت کر جاتے اور ان کی زیادتی کا جواب حسنِ سلوک سے دیتے، اور فرماتے تھے: جب تمہارا کوئی بھائی تمہارے بارے میں ایسی بات کہے جس سے تمہاری دل آزاری ہو تو اسے کچھ نہ کہنا اور نہ غمزدہ ہونا، کیونکہ اگر تم ویسے ہی ہو جیسے وہ کہہ رہا ہے تو تمہاری غلطی کی سزا یہیں دنیا میں

---

(۱) الإمام الصادق، ص: ۸۰

تمہیں دے دی گئی ہے، اور اگر تم ایسے نہیں ہو تو اس کا یہ بول تمہارے حق میں ایک نیکی ہے جو تمہارے کیے بغیر تمہارے نامۂ اعمال میں درج کردی گئی ہے۔

آپؒ نرم مزاج انسان تھے، اپنے ماتحتوں کی غلطیوں پر انہیں سزا دینے کے بجائے درگزر سے کام لیتے اور نرمی سے سمجھاتے۔ اس سلسلہ میں ایک واقعہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ آپؒ نے اپنا غلام کسی کام کیلیے بھیجا، اس نے واپس آنے میں بہت دیر کردی۔ آپؒ اسے ڈھونڈنے کیلیے باہر نکلے تو دیکھا کہ ایک جگہ سو رہا ہے۔ آپؒ اس کے سر کے پاس بیٹھ گئے اور اسے پنکھا جھلنا شروع کردیا یہاں تک کہ وہ اٹھ گیا۔ آپؒ نے اسے کوئی ڈانٹ ڈپٹ نہیں کی، صرف اتنا کہا: مَا ذٰلِکَ لَکَ، تَنَامُ اللَّیلَ وَالنَّھَارَ، لَکَ اللَّیلُ وَلَنَا النَّھارُ ''تمہارے لیے یہ سونا مناسب نہیں تھا، تم رات کو بھی سوتے ہو اور دن کو بھی۔ رات کو سو یا کرو اور دن کو ہمارے کام کردیا کرو''۔

آپؒ کا لوگوں سے درگزر کرنا تو اس حد تک تھا کہ اگر آپؒ کو پتا چلتا کہ فلاں شخص نے آپؒ کی پیٹھ پیچھے آپؒ کو برا بھلا کہا ہے تو آپؒ اٹھتے، نماز کی تیاری کرتے اور لمبی نماز پڑھتے پھر اس کیلیے دعا کرتے کہ: ''اے اللہ! تُو اس کی پکڑ نہ فرمانا، میں نے اسے معاف کردیا ہے''۔

الغرض ہر ایک کو معاف کرنا آپؒ کا شیوہ تھا، کسی سے بدلہ نہ لیتے۔ بدلہ لینا تو درکنار آپؒ بدلہ لینے والے انسان کو ہی کمتر شخص سمجھتے تھے اور فرماتے: ''معاف کرنے میں کوئی ذلت نہیں اور بدلہ لینے میں کوئی بڑائی نہیں، کہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے: صدقہ و زکوۃ سے مال نہیں گھٹتا، معاف کرنے سے بندے کی عزت ہی بڑھتی ہے اور جو اللہ کیلیے کسی کے آگے جھک جاتا ہے، اکڑتا نہیں اللہ تعالی اس کو بلندیاں اور عزتیں عطا فرماتے ہیں''۔[1]

صحابہ سے آپؒ کی محبت:

حفص بن غیاث کا بیان ہے کہ میں نے خود امام جعفر سَلامُ اللہِ وَرَحمۃُ علیہ، کو یہ فرماتے ہوئے سنا: روزِ محشر جتنی مجھے حضرت علیؓ سے شفاعت کی امید ہے اتنی ہی مجھے حضرت ابوبکر صدیقؓ سے شفاعت کی امید ہے، اور انہوں نے تو مجھے دو مرتبہ جنا ہے۔[2]

---

(۱) الإمام الصادق، ص: ۸۱، ۸۲، وموسوعۃ، ص: ۲/۵۱۶

(۲) تھذیب الکمال فی أسماء الرجال: ۵/۸۲، وسیر أعلام النبلاء: ۶/۲۵۹

ایک مرتبہ فرمایا: اللہ کی قسم! میں اس بات کا امیدوار ہوں کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ کے ساتھ میری رشتہ داری کی وجہ سے اللہ تعالیٰ مجھے نفع عطا فرمائیں گے۔ [۱] اور ایک دفعہ کہا: میں حضرت ابوبکرؓ وعمرؓ سے محبت کرتا ہوں۔ [۲]

ہیبت ووجاہت:

اللہ تعالیٰ نے آپؒ کو کثرتِ عبادت، فضول گوئی سے اجتناب، خواہشاتِ نفسانیہ کی مخالفت اور مصائب پر صبر واستقلال کے سبب، ہیبت وجلال نصیب فرمارکھا تھا حتیٰ کہ امام ابوحنیفہؒ نے جب آپؒ کو خلیفہ ''منصور'' کے ساتھ بیٹھا ہوا دیکھا تو ان کو دیکھنے سے امام ابوحنیفہؒ پر ہیبت طاری ہوگئی، چناں چہ بعد میں اس منظر کا تذکرہ کرتے ہوئے آپؒ نے خود بتایا کہ ''منصور'' جیسے طاقتور بادشاہ (جس کی سلطنت میں سورج غروب نہیں ہوتا) کو دیکھ کر مجھ پر وہ ہیبت طاری نہیں ہوئی جو امام جعفر صادقؒ کے چہرہ کو دیکھ کر طاری ہوئی۔ [۳]

حضرت امام جعفرؒ کی عراق میں ''ابن العوجاء'' سے ملاقات ہوئی، یہ زندیقوں (لادین کافروں) کا بہت بڑا خطیب اور مُبلِّغ تھا۔ آپؒ نے اس سے بات کرنا شروع کی مگر وہ اتنا بڑا خطیب ہونے کے باوجود جواب میں ایک لفظ تک نہ بولا۔ امام جعفرؒ سمیت دیگر حاضرینِ مجلس بھی اس پر بڑے حیران ہوئے، بالآخر آپؒ نے اس سے پوچھا کہ کس چیز نے تمہیں بولنے سے روک رکھا ہے؟ اس نے کہا: آپؒ کی ہیبت اور جلال نے، دراصل میری زبان آپؒ کے سامنے چل ہی نہیں رہی۔ میں مسلمانوں کے کئی علماء سے ملا ہوں اور ان سے مناظرے کیے ہیں مگر میرے اوپر کبھی ایسی ہیبت طاری نہیں ہوئی جو آپؒ کو دیکھ کر ہوئی ہے۔ [۴]

تواضع:

اِس ہیبت وجلال اور اس قدر بڑے آدمی ہونے کے باوجود آپؒ میں نہایت عاجزی وانکساری تھی۔ آپؒ اگرچہ خود بھی ایک عالی مقام عالم وفقیہ تھے مگر آپؒ دوسرے علماء کو عزت واکرام دیتے، ان سے ملاقات کی خواہش رکھتے

---

(۱) تهذيب الكمال: ۸۰/۵، والكامل لابن عدي: ۳۵۸/۲، والرياض النضرة: ۶۹/۱

(۲) سير أعلام النبلاء: ۴/۴۰۶، وتهذيب الكمال: ۸۱/۵، وسمط النجوم: ۳۹۲/۲

(۳) لإمام الصادق، ص: ۸۵ مع الكاشف: ۲۹۵/۱، ومناقب الأسد الغالب لابن الجزري، ص: ۸۳

(۴) لإمام الصادق، ص: ۸۶، وموسوعة آل بيت النبي: ۵۱۷/۲

اور ان سے مل کر خوش ہوتے۔ حضرت امام مالکؒ (جو امام جعفرؒ کے شاگرد ہیں) فرماتے ہیں کہ جب میں آپؒ سے ملنے آتا تو آپؒ (میرے استاد ہونے کے باوجود) اپنے نیچے سے تکیہ اٹھا کر مجھے دے دیتے (اور خود بغیر تکیہ کے بیٹھتے)۔[1]

آپؒ نے کسی قبیلہ کے ایک شخص سے پوچھا: اس قبیلہ کا سردار کون ہے؟ اس نے کہا: ''مَیں''۔ آپؒ نے فرمایا: اگر میں اس قبیلہ کا سردار ہوتا تو میں یہ لفظ (یعنی ''مَیں'') کبھی نہ کہتا۔[2]

حرمازی سے روایت ہے کہ ایک دیہاتی شخص امام جعفرؒ کے پاس آیا کرتا تھا اور آپؒ کافی دیر تک اس کے ساتھ بیٹھے رہتے۔ ایک دن وہ نہیں آیا تو آپؒ نے اس کے بارے میں دریافت کیا۔ وہاں موجود ایک شخص (جو اُسے آپؒ کے سامنے کم حیثیت انسان کے طور پر بیان کرنا چاہتا تھا) نے عرض کی: حضرت! وہ تو بس کھیتی باڑی کرنے والا ایک آدمی ہے۔ آپؒ نے فرمایا: آدمی کی اصلیت اس کی عقل ہے، اس کا حسب اس کا دین ہے اور اس کی شرافت و عزت اس کا تقویٰ ہے۔ اور لوگ آدمی ہونے میں تو سب برابر ہیں، اس میں کسی کو کسی پر کوئی فوقیت نہیں ہے۔ یہ سن کر اس آدمی کو اپنے جواب پر ندامت ہوئی۔[3]

---

(۱) موسوعۃ آل بیت النبي: ۲/ ۵۱۷، ۵۱۸ مع الإمام الصادق، ص: ۸۲

(۲) الطبقات الکبریٰ للشعراني: ۱/ ۶۳

(۳) الفصول المهمة، ص: ۲۱۳ مع صفة الصفوة: ۱/ ۳۹۳

(۵) امام اسماعیل بن جعفر سَلامُ اللہ وَ رَحمۃُ علیہ

(اسماعیل بن جعفر صادق)

بلاشبہ حضرت اسماعیل بن جعفر سَلامُ اللہ وَ رَحمۃُ علیہ، ائمۂ اہلِ بیت میں سے ایک امام تھے [۱]، اگر چہ آپؒ کم عمری میں یعنی نوجوانی میں ہی انتقال فرما گئے تھے، [۲] تاہم اہلِ بیت کا ایک دَرخشندہ ستارہ تھے مگر افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ اِس ہستی کی سیرتِ طیبہ کے احوال ہمیں کتب میں نہیں مل سکے جبکہ اس تلاش میں ہم نے۔بفضلہِ تعالی اپنی ہمت کے بقدر غیر معمولی کوششیں صرف کیں۔

اس کی وجہ بظاہر یہ معلوم ہوتی ہے کہ ایک تو آپؒ نوعمری میں ہی انتقال فرما گئے تھے، دوسرا آپؒ نے کمال تواضع اختیار کرتے ہوئے، شاید اپنے آپ کو مشہور ہونے سے کوسوں دُور رکھا تھا جس سے آپؒ کے حالاتِ زندگی لوگوں سے مخفی رہے اور کتب میں درج نہ ہو سکے جیسا کہ ہماری اس بات کی تائید، علمِ تاریخ وتراجم میں دَورِ قریب کے ماہر عالم، علامہ خیر الدین زِرِکلی (التوفی ۱۳۹۶ھ) کے قول سے ہوتی ہے، کہ وہ اس فن میں اپنی معروف تصنیف "الاعلام" [۳] میں لکھتے ہیں: "جتنی کتب تاریخ ہمارے پاس موجود ہیں اُن میں یہ بات کہیں نہیں ملتی کہ حضرت اسماعیل بن جعفر اپنی زندگی میں کوئی مشہور شخصیت تھے۔"

بہر حال ہمیں اس پر دکھ ہے کہ ہم اہلِ بیت کی اس ہستی کی سیرت سامنے لانے کے عنوان سے کوئی خاطر خواہ خدمت نہ کر سکے تاہم ان کی حیاتِ طیبہ سے متعلقہ جو چند ایک عبارات ہمیں دستیاب ہو سکی ہیں، وہ ہم ذیل میں درج کیے دیتے ہیں:

آپ سَلامُ اللہ وَ رَحمۃُ علیہ، کا اسمِ گرامی "اسماعیل" تھا، آپؒ امام جعفر صادقؒ کے صاحبزادے تھے، اور والدہ ماجدہ کا نام "فاطمہ" تھا یہ امام حسن مثنیٰ کی صاحبزادی تھیں، نسب کے لحاظ سے ہاشمی اور قریشی تھے۔ [۴]

---

(۱) خلاصة تذهيب تهذيب الكمال، ص: ۳۳

(۲) نفس المرجع السابق مع سير أعلام النبلاء: ۶/ ۲۶۹

(۳) الأعلام للزركلي: ۱/ ۳۱۱

(۴) الأعلام للزركلي: ۱/ ۳۱۱، وسير أعلام النبلاء: ۶/ ۲۶۹ مع اتعاظ الحنفاء بأخبار الأئمة الفاطميين الخلفاء: ۱/ ۱۴

نیز والدین میں سے ہر ایک کی طرف سے عالی نسب کے مالک تھے۔ آپؒ کے والد امام جعفر صادقؒ کے چھ صاحبزادے تھے، [1] اُن میں سب سے بڑے بیٹے آپؒ تھے۔ [2] امام اسماعیلؒ نے جوانی میں ہی وفات پائی، [3] جبکہ آپؒ کے والد ماجد ابھی باحیات تھے، [4] چنانچہ روایت میں ہے کہ وقت کے عباسی خلیفہ ابوجعفر منصور نے حضرت اسماعیل کو مدینہ سے اپنے پاس طلب کیا، آپؒ کے والد امام جعفر صادقؒ نے جواب میں ایک تحریر لکھ کر اُسے ارسال کی۔ جس پر آپؒ نے منصور عباسی کے گورنرِ مدینہ کے تصدیقی دستخط بھی کرائے۔ کہ اسماعیل بن جعفر وفات پاچکے ہیں۔ [5]

امام اسماعیلؒ کی وفات ۱۴۳ ہجری میں مدینہ طیبہ میں ہوئی، یعنی اپنے والد ماجد سے پانچ برس قبل انتقال فرمایا اور پھر آپؒ کو وہیں جنت البقیع میں دفن کیا گیا۔ [6]

آپؒ نے اپنی اولاد میں فقط تین بچے چھوڑے (اس سے بھی اشارہ ملتا ہے کہ آپؒ نوعمری میں انتقال فرماگئے تھے): دو صاحبزادے اور ایک صاحبزادی۔ صاحبزادوں کے نام ''محمد'' اور ''علی'' جبکہ صاحبزادی کا نام ''فاطمہ'' تھا۔ [7]

آپؒ اپنے اہلِ خانہ کے ساتھ مدینہ طیبہ میں رہتے تھے، مگر بعد میں جب عباسی حکمرانوں کی طرف سے آلِ رسول ﷺ میں سے آلِ علیؓ پر زیادتیاں حد سے بڑھنے لگیں تو آپؒ کی اولاد نے مدینہ کی سکونت ترک کردی چنانچہ آپؒ کے بڑے صاحبزادے ''محمد'' جو بعد میں ''محمد مکتوم'' کے نام سے معروف ہوئے اور وہ یہیں مدینہ میں ہی پیدا ہوئے تھے اپنے اِس آبائی وطن مدینہ کو چھوڑ کر ''دُماوند'' (''رَیّ'' اور ''طَبَرِستان''

---

(۱) نور الأبصار، ص: ۲۰۲، والفصول المهمة، ص: ۲۱۹، ومطالب السؤول، ص: ۲۸۸

(۲) الوافي بالوفيات: ۹/۲۲، وسير أعلام النبلاء: ۶/۲۶۹، ودائرة المعارف الإسلامية: ۳/۷۵۷، والملل والنحل: ۱/۱۹۱

(۳) سير أعلام النبلاء ط الرسالة: ۶/۲۶۹

(۴) الأعلام للزركلي: ۱/۳۱۱ مع الإسماعيلية لإحسان إلهي ظهير، ص: ۶۴، وتاريخ ابن خلدون: ۴/۳۹، وسير أعلام النبلاء: ۶/۲۶۹، واتعاظ الحنفاء: ۱/۱۵، وأحداث التاريخ الإسلامي: ۱/۸۹۵، ودائرة المعارف الإسلامية: ۳/۷۵۷

(۵) تاريخ ابن خلدون: ۴/۳۹ مع الوافي بالوفيات: ۹/۲۳، والملل والنحل: ۱/۱۹۱

(۶) الأعلام للزركلي: ۱/۳۱۱، وأحداث التاريخ الإسلامي: ۱/۸۹۴ مع موجز دائرة المعارف الإسلامية: ۳/۷۵۷

(۷) سير أعلام النبلاء: ۶/۲۶۹، واتعاظ الحنفاء بأخبار الأئمة الفاطميين الخلفاء: ۱/۱۵، ونسب قريش ص: ۶۳

کے درمیان ایک علاقے کا نام [1]) ‘‘ چلے گئے، اور چھوٹے صاحبزادے ’’علی‘‘ ملکِ شام چلے گئے تھے۔[2] اللہ تعالیٰ نے ان دونوں بیٹوں (محمد مکتوم وعلی) کو صاحبِ اولاد کیا تھا، اس طرح ان دونوں صاحبزادوں کے ذریعے امام اسماعیل کی نسل مبارک آگے چلی۔[3]

اور جو فرقہ ’’اسماعیلیہ‘‘ ہے وہ امام جعفر صادقؒ کے بعد اُن کے انہی صاحبزادے حضرت اسماعیلؒ کو اپنا امام مانتا ہے اور اپنے آپ کو انہی کی طرف منسوب کرتے ہوئے ’’اسماعیلیہ‘‘ کہلاتا ہے۔[4]

---

(۱) معجم البلدان: ۲/۳۳۶، ومراصد الاطلاع على أسماء الأمكنة والبقاع: ۲/۵۱۲، والروض المعطار ص: ۲۴۳

(۲) موجز دائرة المعارف الإسلامية: ۳/۷۵۷ مع الأعلام للزركلي: ۱/۳۱۱ و ۶/۳۴

(۳) ينظر: اتعاظ الحنفاء بأخبار الأئمة الفاطميين الخلفاء: ۱/۱۵ ومابعدها، والأعلام للزركلي: ۶/۳۴

(۴) الأعلام للزركلي: ۱/۳۱۱، وطائفة الإسماعيلية، ص: ۱۱، والوافي بالوفيات: ۹/۱۲ ، والخطط للمقريزي: ۲/۱۸۲

ملحوظة: ينظر للاستزادة في هذا المجال: الإسماعيلية – تاريخ وعقائد – لإحسان إلهي ظهير، و، طائفة الإسماعيلية – تاريخها ونظمها وعقائدها – لمحمد كامل حسين، و، طائفة البهرة لسامي عطاء حسن، و، تاريخ ابن خلدون: ۴/۳۹ و ۱/۲۵۱، ۲۵۲، ودائرة المعارف الإسلامية: ۳/۷۵۷، والملل والنحل: ۱/۱۹۱ ومابعدها، وتاريخ المذاهب الاسلامية، ص: ۵۰ ومابعدها، و ۲۶۱ ومابعدها، وصبح الأعشى في صناعة الإنشاء: ۱۳/۲۳۸، وتبيين المعاني – الفصل الرابع من المقدمة.

(۶) حضرت امام موسیٰ کاظم سلام اللہ و رحمۃ علیہ

(موسیٰ بن جعفر)

نام ونسب:

آپ سلام اللہ و رحمۃ علیہ، کا اسم گرامی ''موسیٰ'' اور کنیت ''ابوالحسن'' تھی۔ کئی القابات سے آپؒ کو نوازا گیا جیسے کاظم، صابر، صالح اور امین، البتہ مشہور لقب جس سے آپؒ عام طور پر یاد کیے جاتے ہیں، وہ ''کاظم'' تھا۔[۱] (''کاظم'' کا عربی میں معنی ہے: ''غصہ پینے والا''، اور آپؒ کو یہ لقب اس وجہ سے حاصل ہوا کہ آپؒ میں غصہ پینے کی صفت بہت ہی زیادہ تھی، جو لوگ آپؒ کے ساتھ زیادتی کرتے آپؒ ان کو معاف کر دیا کرتے بلکہ اس سے بڑھ کر یہ کہ ان کی زیادتی کے بعد بھی آپؒ ان کے ساتھ حسنِ سلوک سے پیش آتے رہتے، اور عمر بھر آپؒ کی یہ مبارک عادت رہی۔[۲]) نسب کے لحاظ سے آپؒ قریشی ہاشمی علوی، اور نسبت کے اعتبار سے مدنی تھے۔ حضرت امام جعفر صادقؒ کے صاحبزادے تھے،[۳] اور والدہ کا نام ''حمیدہ'' تھا، نسبت کے ساتھ ''حمیدہ بربریہ'' کہلاتی تھی، یہ اُمِّ ولد (یعنی باندی) تھیں،[۴] اور صالح بربری کی ہمشیرہ تھیں۔[۵]

ولادت:

آپؒ، ۷ صفر المظفر بروز اتوار ۱۲۸ھ کو ''ابواء'' میں پیدا ہوئے۔[۶] (''ابواء'' مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ کے درمیان ایک بڑی بستی ہے، یہ وہی بستی ہے جس میں سرورِ دو عالم ﷺ کی والدہ ماجدہ حضرت آمنہ بنت وہب کا

---

(۱) مطالب السؤول، ص: ۲۸۹ مع العبر في خبر من غبر ۱/۲۲۱ و میزان الاعتدال ۴/۲۰۱

(۲) تاریخ الخمیس ۲/۲۸۷ مع الکامل في التاریخ ۵/۳۳۲ و مختصر أخبار الخلفاء، ص: ۲۹

(۳) تهذیب الکمال في أسماء الرجال ۲۹/۴۳ و لسان المیزان ۷/۴۰۲

(۴) تاریخ الخمیس ۲/۲۸۷ و مجمع الآداب في معجم الألقاب ۴/۱۰

(۵) مختصر أخبار الخلفاء، ص: ۲۹ و صحاح الأخبار، ص: ۴۴

(۶) تاریخ الخمیس ۲/۲۸۷ و مجمع الآداب ۴/۱۰ و العبر في خبر من غبر ۱/۲۲۲

انتقال ہوا، [1] اور یہیں ان کی قبر ہے۔ [2] یہ بستی چونکہ مدینہ طیبہ کے کچھ قریب ہے، [3] اس لیے آپؒ نے پھر ساری زندگی مدینہ میں ہی رہائش رکھی۔ [4]

حلیہ ولباس:

آپؒ کا رنگ تیز گندمی تھا اور عربوں کا سا لباس زیب تن فرماتے تھے۔ [5] انگوٹھی بھی پہنتے تھے جس پر "اَلْمُلْکُ لِلّٰہِ وَحْدَہٗ" (یعنی بادشاہت صرف اللہ کی ہے) نقش تھا۔ [6]

علمی مقام:

آپؒ کا شمار صرف اکابر علماء ہی نہیں بلکہ نہایت بلند درجہ اکابر علماء میں ہوتا تھا، [7] حتی کہ آپؒ کے متعلق تو یہاں تک کہا جاتا تھا کہ آپؒ اپنے دور کے سب سے بڑے عالم ہیں۔ [8]

اس قدر علمی مقام ومرتبہ حاصل ہونے کے باوجود آپؒ نے اپنی زیادہ تر توجہ، علمِ دین کی تدریس کے بجائے، عبادت اور تبلیغِ دین میں صَرف کی، اسی وجہ سے آپؒ کی حدیثی روایات کی تعداد بہت کم ملتی ہے۔ [9]

علمِ حدیث میں آپؒ نے اپنے والد ماجدؒ اور عبدالملک بن قُدامہ جُمَحی سے روایات لینے میں استفادہ کیا، اور آپؒ سے آپؒ کے صاحبزادوں میں سے علی رضا، ابراہیم، اسماعیل، و حُسین اور بھائیوں میں سے محمد بن جعفر اور علی بن جعفر نے احادیث روایت کیں۔ [10] ان کے علاوہ اور لوگوں نے بھی آپؒ سے احادیثِ مبارکہ کی روایات لیں جیسے صالح بن

---

(۱) الروض المعطار في خبر الأقطار ص: ۲ و الإشارات الی معرفة الزيارات ص: ۷۷

(۲) وفاء الوفاء بأخبار دار المصطفی ۷/۴

(۳) الأعلام للزركلي ۳۲۱/۷

(۴) وفيات الأعيان: ۳۰۸/۵، وشذرات الذهب: ۳۷۷/۲، ومرآة الجنان: ۳۰۵/۱

(۵) الفصول المهمة، ص: ۲۲۲ مع الأعلام للزركلي ۳۲۱/۷

(۶) نور الأبصار، ص: ۳۰۲

(۷) إسعاف الراغبين للصبان ص: ۲۲۶ مع الأعلام للزركلي ۳۲۱/۷ وأحداث التاريخ الإسلامي ۱۰۷۰/۱

(۸) الفصول المهمة، ص: ۲۲۷

(۹) ريحان عترت، ص: ۱۱۳ مع ميزان الاعتدال ۲۰۲/۴

(۱۰) تاريخ الإسلام ۲/۴۱۷ مع كلام ابن حجر في تهذيب التهذيب: ۳۴۰/۱۰

یزید اور محمد بن صدقہ عنبری۔[1]

آپؒ کے علمی مقام کا اندازہ اس مکالمہ سے بھی ہوتا ہے جو ہارون الرشید کے ساتھ پیش آیا۔ اس نے آپؒ سے پوچھا کہ تم کس طرح کہتے ہو کہ ہم رسول اللہ ﷺ کی اولاد ہیں، اور تم لوگوں کو بھی اپنے بارے میں ''اے رسول اللہ کے صاحبزادو!'' کہہ کر پکارنے کی اجازت دیتے ہو حالانکہ تم تو حضرت علیؓ کی اولاد ہو؟ اور ضابطہ یہ ہے کہ آدمی کو اس کے باپ کی طرف منسوب کیا جاتا ہے نہ کہ نانا کی طرف۔

اس کے جواب میں آپؒ نے اعوذ باللہ اور بسم اللہ پڑھ کر یہ آیتیں تلاوت کیں:

{وَنُوحًا هَدَيْنَا مِنْ قَبْلُ وَمِنْ ذُرِّيَّتِهِ دَاوُودَ وَسُلَيْمَانَ وَأَيُّوبَ وَيُوسُفَ وَمُوسَى وَهَارُونَ وَكَذَلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِينَ وَزَكَرِيَّا وَيَحْيَى وَعِيسَى وَإِلْيَاسَ كُلٌّ مِنَ الصَّالِحِينَ [الأنعام: ۸۴،۸۵] ترجمہ: ''اور نوح کو ہم نے پہلے ہی ہدایت دی تھی، اور ان کی اولاد میں سے داؤد، سلیمان، ایوب، یوسف، موسیٰ اور ہارون (علیہم السلام) کو بھی۔ اور اسی طرح ہم نیک کام کرنے والوں کو بدلہ دیتے ہیں * اور زکریا، یحییٰ، عیسیٰ اور الیاس (علیہم السلام) کو (بھی ہدایت عطا فرمائی)۔ یہ سب نیک لوگوں میں سے تھے *'']، کہ دیکھو! ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو حضرت نوح علیہ السلام کی اولاد میں سے قرار دیا ہے حالانکہ حضرت عیسیٰؑ کے تو کوئی والد ہی نہیں تھے، ان کو صرف اپنی والدہ کی طرف سے اولادِ انبیاء میں شامل کیا گیا ہے، بالکل اسی طرح ہمیں بھی ہماری والدہ (حضرت فاطمۃ الزہراءؓ) کی طرف سے نبیٔ کریم ﷺ کی اولاد میں شامل کیا جاتا ہے۔

اس کے بعد فرمایا: امیر المومنین! میں ایک دلیل اور آپ کو دیتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ قرآن مجید میں فرماتا ہے: {فَقُلْ تَعَالَوْا نَدْعُ أَبْنَاءَنَا وَأَبْنَاءَكُمْ وَنِسَاءَنَا وَنِسَاءَكُمْ وَأَنْفُسَنَا وَأَنْفُسَكُمْ....} [آل عمران: ۶۱] ترجمہ: ''(اے میرے نبی! اُن عیسائیوں سے) کہہ دیں کہ: آؤ، ہم اپنے بیٹوں کو بلائیں اور تم اپنے بیٹوں کو، اور ہم اپنی عورتوں کو اور تم اپنی عورتوں کو، اور ہم اپنے لوگوں کو اور تم اپنے لوگوں کو۔۔۔۔'']اس مباہلہ میں حضور ﷺ نے عیسائیوں کو مخاطب کر کے فرمایا تھا کہ تم اپنے بیٹے بلاؤ، میں اپنے بیٹے بلاتا ہوں، چناں چہ آپ ﷺ نے اس میں بیٹوں کے طور پر صرف حضرت حسنؓ و حسینؓ کو بلایا تھا۔ اس سے معلوم ہوا کہ حضرت حسینؓ آپ ﷺ کے بیٹے ہیں اور ہم حضرت حسینؓ

---

(۱) تهذيب التهذيب ۳۴۰/۱۰ وسير أعلام النبلاء ط الرسالة ۲۷۰/۶

کے بیٹے ہیں، لہذا ہم بھی حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بیٹوں میں شامل ہوتے ہیں۔[1]

آپؒ کے دلائل سے عیسائی عالم اور عوام کا اسلام قبول کرنا:

ملکِ شام میں ایک راہب (عیسائی عالم) رہا کرتا تھا جس کی عیسائی لوگ بڑی تعظیم وتکریم کرتے تھے اور ان کے ہاں وہ بڑا عالم شمار ہوتا تھا۔ وہ ہر دوسرے روز اپنے عبادت خانہ سے باہر آ کر لوگوں کے مجمع میں بیان کرتا اور لوگ بڑی توجہ سے اس کی بات سنتے۔ ایک دن جبکہ اس کے بیان کا دن تھا حضرت امام کاظمؒ بھی وہاں پہنچ گئے، اس نے آپؒ کو دیکھ کر کہا: ارے! تم پردیسی ہو؟ آپؒ نے فرمایا: ہاں!

راہب: تم ہم میں سے ہو یا ہمارے مخالفین میں سے ہو؟

امام کاظمؒ: میں تم میں سے نہیں ہوں۔

راہب: تم ''امتِ مرحومہ'' (یعنی حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی امت) میں سے ہو؟

امام کاظمؒ: ہاں!

راہب: اس امت کے عالموں میں سے ہو یا جاہلوں میں سے؟

امام کاظمؒ: اس کے جاہلوں میں سے نہیں ہوں۔

یہ سن کر راہب مت اثر ہوا اور کچھ ایسے مسائل پوچھنے کیلیے آپؒ کی طرف بڑھا جو اس کے نزدیک سب سے پیچیدہ تھے، اور کہا:

راہب: اس ''طوبیٰ'' درخت کی کیا کیفیت وصورت ہے جس کی جڑ ہمارے نزدیک حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور تمہارے نزدیک حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے گھر میں ہے اور اس کی ٹہنیاں ہر ہر امتی کے گھر تک پہنچتی ہیں؟ (سوال کا مقصود اس بات کی وضاحت مطلوب تھی کہ یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ ایک چیز خود ایک ہی جگہ موجود رہے اور اس سے نکلنے والی چیزیں ہر ہر جگہ پہنچ جائیں)۔

امام کاظمؒ: یہ بالکل ایسے ہے جیسے سورج، کہ اس کی روشنی ہر ہر جگہ پہنچتی ہے حالانکہ وہ خود آسمان میں ہی ہوتا ہے۔

راہب: اس جنت کی کیا کیفیت ہے جس کے بارے میں آتا ہے کہ اس کا کھانا ختم نہیں ہوگا اگرچہ جنتی اس میں

---

(1) نثرالدر ۲۲۸/۱ و إسعاف الراغبين، ص: ۲۲۶ مع الفصول المهمة، ص: ۲۲۷ بتسهيل

سے کھاتے رہیں گے۔ کھانے کے باوجود کیسے اس میں کمی نہیں آئے گی؟

امام کاظمؒ: یہ ایسے ہے جیسے یہاں دنیا میں "چراغ"، کہ وہ روشنی دیتا ہے، اس کی روشنی لوگ خرچ کرتے ہیں، اس کے باوجود روشنی میں کمی نہیں آتی۔

راہب: جنت میں "ظِلِّ ممدود" (پھیلا ہوا سایہ) ہوگا، وہ کیا چیز ہے؟

امام کاظمؒ: سورج طلوع ہونے سے پہلے جو ٹھنڈا میٹھا وقت ہے وہ "ظل ممدود" ہے، پھر یہ آیت تلاوت فرمائی:

{اَلَمْ تَرَ اِلٰی رَبِّکَ کَیْفَ مَدَّ الظِّلَّ وَلَوْ شَاءَ لَجَعَلَهٗ سَاکِنًا ثُمَّ جَعَلْنَا الشَّمْسَ عَلَیْهِ دَلِیْلًا} [الفرقان:۴۵]

[ترجمہ: کیا تم نے اپنے رب (کی قدرت) کو نہیں دیکھا کہ وہ کس طرح سائے کو پھیلاتا ہے؟ اور اگر وہ چاہتا تو اسے ایک جگہ ٹھہرا دیتا۔ پھر ہم نے سورج کو اُس کیلیے رہنما بنا دیا ہے۔]

راہب: جنت میں رہنے والے لوگ کھائیں گے، پئیں گے، اس کے باوجود ان کو پیشاب، پاخانے کی حاجت نہیں ہوگی، یہ کیسے ہوگا؟

امام کاظمؒ: یہ ایسے ہوگا جیسے ماں کے پیٹ میں بچہ۔

راہب: اہلِ جنت کے ایسے خدام ہوں گے جو اُن جنتیوں کے پاس اُن کے منہ سے بولے بغیر اُن کی مطلوبہ اشیاء حاضر کر دیں گے؟ (یعنی یہ کیسے ہوگا کہ بتائے بغیر صرف اندر ہی اندر حاجت وضرورت کے پیدا ہونے پر وہ خدام سمجھ جائیں گے اور اس ضرورت کو پورا کر دیں گے)۔

امام کاظمؒ: یہاں دنیا میں انسان کو جب کسی چیز کی ضرورت پڑتی ہے تو اس کے اعضاء اس کو خود ہی سمجھ جاتے ہیں، ان کے خدام بھی اسی طرح سمجھ جائیں گے۔

راہب: جنت کی چابی سونے کی ہے یا چاندی کی؟

امام کاظمؒ: جنت کی چابی انسان کا یہ بول ہے: لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ

یہ سب کچھ سن کر راہب بولا: آپؒ نے سچ کہا، اس کے بعد راہب اور اس کے ساتھ جتنے لوگ تھے سب نے کلمہ پڑھ لیا اور مسلمان ہو گئے۔[1]

(۱) آل البیت حول الرسول، ص: ۲۳۳

امام ابوحنیفہؒ سے ملاقات:

امام کاظمؒ کی جب امام ابوحنیفہؒ سے پہلی بار ملاقات ہوئی تو ان سے فرمایا: کیا فقیہ "نعمان" آپ ہی ہیں؟ عرض کیا: جی ہاں! لیکن آپ نے مجھے کیسے پہچانا؟ امام کاظمؒ نے جواب میں قرآن مجید کی یہ آیت تلاوت کی: {سِيمَاهُمْ فِي وُجُوهِهِمْ مِنْ أَثَرِ السُّجُودِ} [الفتح:۲۹] ترجمہ: اُن کی نشانیاں سجدے کے اثر سے اُن کے چہروں پر نمایاں ہیں]۔[1]

حاضر دماغی:

ہارون الرشید حج کیلیے گیا تو حضور ﷺ کی قبر کی زیارت کیلیے حاضری دی، اس کے ساتھ اشرافِ قریش اور مختلف سردارانِ قبائل بھی تھے۔ حضرت موسیٰ کاظمؒ بھی ساتھ تھے۔ جب ہارون الرشید قبر اطہر کے قریب پہنچا تو اپنے ساتھ والے لوگوں پر فخر جتلانے کیلیے اس طرح سلام کیا: السَّلامُ عَلَيكَ يَا رَسُولَ اللهِ! يَا ابْنَ عَمِّي! "اے اللہ کے رسول، اے میرے چچازاد بھائی! السلام علیکم!" (یعنی حضور ﷺ کو اپنا چچازاد بھائی کہا)۔ اس کے بعد حضرت موسیٰ کاظمؒ قبر اطہر کی طرف بڑھے اور کہا: السَّلامُ عَلَيكَ يَا أَبَتِ! "اے ابا جان! السلام علیکم!"۔ یہ سن کر ہارون الرشید کا رنگ فق ہوگیا اور آپؒ کو مخاطب کر کے کہنے لگا: اے ابوالحسن! واقعی، یہ ہے فخر کی بات۔[2]

جیل خانوں کی آزمائشیں:

اہلِ حق عموماً ہر زمانہ میں مصائب و آزمائش کا شکار ہوئے ہیں، چناں چہ حضرت امام موسیٰ کاظم سلامُ اللہِ و رَحمۃُ علیہ نے بھی کئی مرتبہ جیل کی قید برداشت کی۔ آپؒ مدینہ طیبہ میں رہا کرتے تھے۔ خلیفہ مہدی نے آپؒ کو مدینہ سے بغداد بلوا کر جیل میں قید کر دیا۔ رات کو اُس نے خواب میں حضرت علی بن ابی طالبؓ کو دیکھا کہ آپؓ ناراضگی کے ساتھ مہدی سے کہہ رہے تھے: اے محمد! {فَهَلْ عَسَيْتُمْ إِنْ تَوَلَّيْتُمْ أَنْ تُفْسِدُوا فِي الْأَرْضِ وَتُقَطِّعُوا أَرْحَامَكُمْ} [محمد:۲۲] یعنی تم سے عجب نہیں کہ اگر تم حاکم ہو جاؤ تو ملک میں خرابی کرنے لگو اور اپنے رشتوں کو توڑ ڈالو)۔ مہدی گھبرا کر اٹھا۔ ربیع کہتے ہیں کہ اسی وقت رات کو مہدی نے میرے پاس قاصد بھیج کر مجھے بلوایا، اچانک قاصد کو دیکھ کر

---

(۱) مناقب الإمام الأعظم للكردري، ص: ۲۵۱ ومناقب الإمام الأعظم للموفق، ص ۲۵۴

(۲) تاريخ بغداد و ذيوله ط العلمية ۱۳/۳۲

میں پریشان ہوگیا، بہر حال میں خلیفہ کی خدمت میں حاضر ہوا تو وہ مذکورہ آیت پڑھ رہے تھے، اور ان کی آواز بھی بہت خوبصورت تھی۔ مجھے دیکھتے ہی کہا: ائْتِنِي بِمُوسَى بْنِ جَعْفَرٍ ''موسیٰ بن جعفر کو میرے پاس لاؤ''۔ میں تعمیلِ حکم میں انہیں لے آیا، خلیفہ نے انہیں گلے لگایا اور اپنے ساتھ بٹھایا پھر اُن سے کہا: اے ابوالحسن! میں نے امیر المومنین حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو خواب میں یہ آیت پڑھتے ہوئے دیکھا ہے۔ اب تم مجھے اس بات پر اطمینان دلاؤ کہ تم میرے اور میری اولاد میں سے کسی کے خلاف خروج (بغاوت) نہیں کروگے تاکہ میں تمہیں رہا کردوں۔ آپؒ نے فرمایا: وَاللهِ! لَا فَعَلْتُ ذٰلِكَ وَلَا هُوَ مِنْ شَأْنِي ''میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ میں نے آج تک کبھی خروج نہیں کیا اور نہ ہی یہ مجھے زیب دیتا ہے''۔ خلیفہ نے کہا: آپ سچ کہہ رہے ہیں۔ اس کے بعد ان کو تین ہزار دینار (مساوی تقریباً ساڑھے پانچ کروڑ روپے) دے کر بصد عزت و اکرام انہیں ان کے اہلِ خانہ کی طرف مدینہ طیبہ روانہ کردیا۔[1]

پھر ہارون الرشید کے زمانہ تک آپؒ وہیں مدینہ منورہ میں قیام پذیر رہے۔ ہارون ماہِ رمضان ۱۷۹ھ میں عمرہ کی غرض سے حرمین شریفین گیا، عمرہ کر کے جب مدینہ طیبہ پہنچا تو قبرِ اطہر پہ حاضری دی اور وہاں سے واپسی پر حضرت موسیٰ کاظمؒ کو بھی اپنے ساتھ بغداد لیتے آیا اور ''سندھی بن شاہک'' کے پاس ان کو جیل میں بند کردیا۔ سندھی بن شاہک کی بہن ان کی خدمت پر مامور تھی وہ بہت نیک و دیندار خاتون تھی اس نے ان کی شبانہ روز عبادت کو بڑے قریب سے دیکھا (جس کا تذکرہ آگے ''ذوقِ عبادت'' کے تحت آرہا ہے)۔ وہ آپؒ کو دیکھ کر کہا کرتی: خَابَ قَوْمٌ تَعَرَّضُوا لِهٰذَا الرَّجُلِ الصَّالِحِ! ''ناس ہو اُن لوگوں کا جنہوں نے اس جیسے نیک پارسا شخص کو (جیل میں ڈال کر) تنگ کر رکھا ہے''۔ پھر اسی جیل میں آپؒ انتقال کر گئے۔[2]

جرأت و حق گوئی:

آپؒ جب ہارون الرشید کی قید میں تھے اور عرصۂ قید کافی دراز ہو چلا تھا تو آپؒ نے جیل خانہ سے ہی اُسے ایک خط لکھا جس میں آپؒ کی جرأت و حق گوئی بالکل واضح تھی۔ وہ خط یہ تھا:

أَمَّا بَعْدُ يَا أَمِيرَ الْمُؤْمِنِينَ! إِنَّهُ لَمْ يَنْقَضِ عَنِّي يَوْمٌ مِنَ الْبَلَاءِ إِلَّا انْقَضَى عَنْكَ يَوْمٌ مِنَ الرَّخَاءِ، حَتَّى يُفْضِيَ

---

(۱) وفيات الأعيان ۵/۳۰۸ والمستطرف في كل فن مستطرف ص: ۳۲۲ مع [البداية والنهاية ط الفكر ۱۰/۱۸۳ والمنتظم ۹/۸۷ و[مرآة الجنان ۱/۳۰۵ ومطالب السؤول، ص: ۲۹۰

(۲) الكامل في التاريخ ۵/۳۳۲ مع تهذيب الكمال ۲۹/۴۴ وصفة الصفوة ۱/۴۰۱

بِنَاذٰلِکَ إِلیٰ یَومٍ یَخسَرُ فِیہِ المُبطِلُونَ.

(امیر المومنین! جیسے جیسے میری آزمائش کا دن گزرتا ہے ویسے ویسے تمہارے عیش وراحت کا دن بھی گزر جاتا ہے، حتی کہ ہم دونوں ایک ایسے دن میں پہنچنے والے ہیں جس دن وہ لوگ بہت نقصان اٹھائیں گے جو ناحق تھے)۔[1]

جیل سے رہائی پانے کیلیے دعاءِ نبوی:

آپؒ ایک مرتبہ جیل میں تھے تو خواب میں آپؒ کو رسول اللہ ﷺ کی زیارت نصیب ہوئی اور آپ ﷺ نے حضرت موسیٰ کاظمؒ سے فرمایا:

موسیٰ! تمہیں ناحق جیل میں ڈال رکھا ہے۔ یہ چند دعائیہ کلمات ہیں ان کو پڑھو، ان کی برکت سے یہ رات بھی نہ گزرنے پائے گی کہ تم رہا ہو جاؤ گے:

یا سَامِعَ کُلِّ صَوْتٍ، یا سابِقَ الفَوْتِ، یا کاسِیَ العِظامِ لَحمًا ومُنشِزَھا بَعدَ المَوتِ، أسألُکَ بأسمائِکَ الحُسنٰی، وباسمِکَ الأعظمِ الأکبرِ المَخزُونِ المَکنُونِ الَّذي لَم یَطَّلِعْ عَلَیہ أحَدٌ مِنَ المَخلُوقِینَ، یا حَلیمًا ذا أناۃٍ، یا ذا المَعرُوفِ الَّذي لا یَنقَطِعُ أبَدًا ولا یُحصٰی عَدَدًا! فَرِّجْ عَنّي.

(اے ہر آواز کو سننے والے! اے وہ ذات جس سے کوئی چیز چھوٹ نہیں سکتی! اے ہڈیوں کو گوشت پہنانے والے اور مرنے کے بعد ان ہڈیوں کو دوبارہ جوڑنے والے! میں آپ کے خوبصورت ناموں اور اُس جلیل القدر اسمِ اعظم کے طفیل آپ سے سوال کرتا ہوں جو اس طرح چھپا ہوا ہے کہ اس پر کوئی مخلوق مطلع نہیں ہوسکتی، اے باقدرت حلیم ذات! اے اس احسان کے مالک جو نہ کبھی ختم نہیں ہوتا اور نہ اس کا شمار ممکن ہے! میری تکلیف دور فرما دیجئے۔)

پھر اسی رات ان کو جیل سے رہائی حاصل ہوگئی، یہ اس وقت ہارون الرشید کی طرف سے قید تھے۔[2] (اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہارون الرشید نے ان کو بظاہر ایک سے زائد مرتبہ جیل میں قید کیا تھا، جن میں سے ایک موقع پر امام موسیٰ کاظمؒ کو زیارتِ نبوی والا یہ خواب آیا جس میں وہ رہا بھی ہوگئے اور آخری مرتبہ جب آپؒ کو ہارون الرشید نے قید کیا تو اس بار امام صاحبؒ نے رضا بر قضا کے تحت یہ دعا نہیں کی چناں چہ پھر اسی قید میں ہی ان کا انتقال ہوا، جیسا کہ اوپر گزرا۔ واللہ اعلم)۔

([1]) البدایۃ والنہایۃ ط الفکر ۱۰/۱۸۳ وتاریخ الإسلام ۱۲/۴۱۸ وتذکرۃ الخواص، ص ۳۱۴ مع الفصول المہمۃ، ص: ۲۳۰

([2]) وفیات الأعیان ۵/۳۱۰ وشذرات الذھب في أخبار من ذھب ۲/۳۷۸ ومرآۃ الجنان وعبرۃ الیقظان: ۱/۳۰۶

سفرِ حج اور ظہورِ کرامت:

حضرت شقیق بلخیؒ فرماتے ہیں کہ میں ۱۴۹ھ میں حج کو جا رہا تھا، راستہ میں قادسیہ (ایک شہر کا نام ہے) میں اترا۔ میں لوگوں کی زیب وزینت اور ان کا ہجوم اور کثرت دیکھ رہا تھا، میری نظر ایک خوبصورت نوجوان پر پڑی کہ اس نے کپڑوں کے اوپر، بالوں کا ایک کپڑا پہن رکھا تھا، پاؤں میں جوتا بھی تھا اور سب سے علیحدہ بیٹھا تھا، میں نے خیال کیا کہ یہ لڑکا صوفی قسم کے آدمیوں میں سے معلوم ہوتا ہے کہ راستہ میں دوسروں پر بوجھ ہی بنے گا، میں اس کو جا کر کچھ سمجھاؤں۔ اس خیال سے میں اس کے قریب گیا۔ جب اس نے مجھے اپنی طرف آتے دیکھا، تو کہنے لگا: اے شقیق! {اجْتَنِبُوا كَثِيرًا مِنَ الظَّنِّ إِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ إِثْمٌ} [الحجرات: ۱۲] بدگمانی سے بچو، بعض گمان گناہ ہوتے ہیں) اور یہ کہہ کر مجھے چھوڑ کر چل دیا۔ میں نے سوچا کہ یہ تو بڑی مشکل بات ہوگئی۔ میرا نام لے کر (حالانکہ مجھ کو جانتا بھی نہیں) میرے دل کی بات کہہ کر چل دیا، یہ تو کوئی واقعی بزرگ ہے (جس کو اللہ کی طرف سے الہام ہوتا ہے)۔ میں اس کے پاس جا کر اپنے گمان کی معافی کراؤں۔ میں جلدی جلدی اس کے پیچھے چلا مگر وہ میری نظروں سے غائب ہوگیا، پتا نہ چلا۔

جب ہم مقامِ ''واقصہ'' پہنچے تو دفعۃً اس پر نظر پڑی کہ وہ نماز پڑھ رہا ہے، اس کا بدن کانپ رہا ہے اور آنسو بہہ رہے ہیں۔ میں نے اس کو پہچان لیا اور اس کی طرف بڑھا تا کہ اپنے اس گمان کی معافی کراؤں مگر میں نے اس کی نماز سے فراغت کا انتظار کیا۔ جب وہ سلام پھیر کر بیٹھا تو میں اس کی طرف بڑھا۔ اس نے جب مجھے اپنی طرف بڑھتے ہوئے دیکھا تو کہنے لگا: اے شقیق! پڑھو: {وَإِنِّي لَغَفَّارٌ لِمَنْ تَابَ وَآمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا ثُمَّ اهْتَدَى} [طٰہٰ: ۸۲] (اور بلاشبہ میں بڑا بخشنے والا ہوں ایسے لوگوں کو جو توبہ کرلیں اور ایمان لے آئیں اور پھر سیدھے راستے پر قائم رہیں)۔ یہ آیت پڑھ کر وہ پھر چل دیا، میں نے کہا: یہ شخص تو ابدال میں سے معلوم ہوتا ہے، دو مرتبہ میرے دل کی بات پر متنبہ کر چکا، پھر جب ہم ''زبالا'' میں پہنچے تو دفعۃً میری نظر اس نوجوان پر پڑی کہ وہ ایک کنویں پر کھڑا ہے، ایک بڑا سا پیالہ اس کے ہاتھ میں ہے اور کنویں سے پانی لینا چاہ رہا تھا کہ وہ پیالہ کنویں میں گر پڑا، میں اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس نے آسمان کی طرف دیکھا اور یہ شعر پڑھا:

أَنْتَ رَبِّي إِذَا ظَمِئْتُ مِنَ الْمَـــــا ... ءِ وَقُـــوْتِي إِذَا أَرَدْتُ الطَّعَامَـــــا

(جب مجھے پانی کی پیاس لگتی ہے تو تُو ہی میری پرورش کرنے والا ہے، اور جب کھانے کی مجھے ضرورت ہوتی ہے

تو تُو ہی میری روزی (کا ذریعہ) ہے)۔

اس کے بعد اُس نے کہا: اَللّٰهُمَّ أَنْتَ تَعْلَمُ یا إِلٰهِي ويا سَيِّدِي مَالِي سِوَاهَا فَلَا تُعْدِمْنِي ''اے میرے اللہ! تجھے معلوم ہے۔ اے میرے معبود، میرے آقا! کہ اس پیالے کے سوا میرے پاس کچھ نہیں، اس پیالے سے مجھے محروم نہ فرمایئے''۔ شقیق کہتے ہیں: اللہ کی قسم! میں نے دیکھا کہ کنویں کا پانی اوپر کو آ گیا، اس نے ہاتھ بڑھایا اور پیالہ پانی سے بھر کر نکال لیا۔ پھر وضو کیا اور چار رکعات نماز پڑھی، اس کے بعد ریت کو اکٹھا کر کے ایک ایک مٹھی بھر کر اس پیالہ میں ڈالتا جاتا تھا اور اس کو ہلا کر پی رہا تھا۔ میں اس کے قریب گیا اور سلام کیا، اس نے سلام کا جواب دیا۔ میں نے کہا: اللہ نے جو نعمت تمہیں عطا کی ہے اُس میں سے کچھ اپنا بچا ہوا مجھے بھی کھلا دیجیے۔ کہنے لگا کہ شقیق! اللہ جل شانہ کی ظاہری اور باطنی نعمتیں ہم پر رہی ہیں، اپنے رب کے ساتھ نیک گمان رکھو۔ یہ کہہ کر وہ پیالہ مجھے دے دیا۔ میں نے جو اس کو پیا تو اللہ کی قسم! اس میں ستّو اور شکر گھلی ہوئی تھی۔ اس سے زیادہ خوش ذائقہ اور اس سے زیادہ خوشبودار چیز میں نے کبھی نہیں کھائی تھی۔ میں نے خوب پیٹ بھر کر پیا جس کی برکت سے کئی دن تک نہ تو مجھے بھوک لگی نہ پیاس لگی۔

اس کے بعد مکہ مکرمہ داخل ہونے تک میں نے اس کو نہیں دیکھا۔ جب ہمارا قافلہ مکہ مکرمہ پہنچ گیا تو میں نے ''قُبّة الشراب''[1] کے پاس ایک مرتبہ آدھی رات کے قریب نماز پڑھتے دیکھا، بڑے خشوع سے نماز پڑھ رہا تھا اور خوب رو رہا تھا۔ صبح تک اسی طرح نماز پڑھتا رہا، جب صبح صادق ہوگئی تو وہ اسی جگہ بیٹھا تسبیح پڑھتا رہا، اس کے بعد صبح کی نماز پڑھی اور پھر بیت اللہ کا طواف کیا۔ پھر وہ باہر جانے لگا تو میں اس کے پیچھے لگ لیا۔ باہر جا کر دیکھا تو راستہ میں جس حالت پر دیکھا تھا اس کے بالکل برعکس بڑے حشم وخدم غلام اس کے موجود ہیں، چاروں طرف سے اس کو گھیر رکھا ہے، سلام کر کے حاضر ہو رہے ہیں۔ میں نے ایک شخص سے جو میرے قریب تھا، دریافت کیا کہ یہ بزرگ کون ہیں؟ اس نے بتایا: حضرت امام جعفر صادقؒ کے صاحبزادے حضرت امام موسیٰ کاظمؒ ہیں۔ مجھے تعجب ہوا اور میں نے خیال کیا کہ یہ عجائب واقعی ایسے ہی سید کے ہونے چاہئیں۔[2]

---

(1) ''قبة الشراب'': چاہِ زمزم کے قریب پانی کا ایک گنبد دار حوض ہوا کرتا تھا جس میں زمزم کا پانی ڈال دیا جاتا، تاکہ وہ ٹھنڈا ہو جائے۔ لاحظ: الاستبصار فی عجائب الامصار ۲۳/۱ مع رحلة ابن جبیر ص: ۵۹ و رحلة ابن بطوطة ۳۷۶/۱ ومعجم البلدان ۳۶۴/۲

(2) روض الریاحین، الحکایة: ۴۷ ص: ۱۰۰ ونقلتها إلی الأردية من فضائلِ حج ص: ۲۲۶ ذکرها ابن الصباغ المالکي في لفصول المهمة، ص: ۲۲۴/۲۲۳ وأتى في آخرها بكلام قيم حيث قال: "هذه الحكاية رواها جماعة من أهل التاليف والمحدثين". انتهى. قلت: رواها ابنُ الصباغ نفسه في "الفصول المهمة" كما مر آنفا، وابنُ الجوزي في [مثير الغرام الساكن ص: ۴۰۲ وابن حجر الهيتمي في [الصواعق المحرقة ۵۹۱/۲ وابن طلحة الشافعي في مطالب السؤول، ص: ۲۹۰ والصبّان في [إسعاف الراغبين ص: ۲۲۶

نصائح:

ان حضرات اہلِ بیت کی ہستیاں علم وعمل کا مجموعہ اور زہد وتقویٰ کا مجسمہ تھیں، چناں چہ ان کی نصائح اپنے اندر ایک حقیقی روح اور منفرد اثر سموئے ہوتی تھیں۔ اسی پسِ منظر میں حضرت امام موسیٰ کاظمؒ نے اپنے والد حضرت امام جعفر صادقؒ سے بھی نصیحتیں حاصل کیں اور خود بھی لوگوں کو اپنی بیش قیمت نصائح سے مستفید کیا۔ ذیل میں ان میں سے چند روح پرور نصائح درج کی جارہی ہیں:

(۱) یہ انصاف نہیں ہے کہ دو آدمی کسی جرم میں شریک ہوں پھر اس میں طاقتور کو تو چھوڑ دیا جائے اور کمزور کو سزا دی جائے۔[1]

(۲) دشمن سے دور رہو اور دوست کے ساتھ بھی احتیاط سے رہو، کیونکہ دل کا کوئی پتا نہیں کہ کس وقت بدل جائے۔[2]

(۳) آپؒ نے ایک آدمی کو دیکھا کہ وہ موت کی تمنا کر رہا تھا۔ آپؒ نے اس سے پوچھا:

کیا تمہارے اور اللہ کے درمیان کوئی ایسا تعلق ہے کہ جس کی وجہ سے اللہ تمہارے ساتھ آسانی ونرمی والا معاملہ فرمائے؟ اس نے کہا: نہیں۔ پھر پوچھا: کیا تم نے اتنی نیکیاں آگے بھیج دی ہیں جو تمہارے گناہوں سے بڑھ جائیں؟ کہا: نہیں۔ فرمایا: پھر تم اپنی دائمی ہلاکت کی تمنا کر رہے ہو۔[3]

(۴) جس کے دونوں دن برابر ہوں وہ دھوکے میں پڑا ہوا ہے اور جس کا دوسرا دن پہلے دن کی نسبت برا ہو اس سے اللہ کی رحمت دُور ہو چکی ہے۔[4]

(۵) جو اپنے اندر بہتری اور ترقی محسوس نہ کرے وہ نقصان میں ہے اور جو نقصان میں ہو اس کیلیے جینے سے مرجانا بہتر ہے۔[5]

---

(۱) محاضرات الأدباء ومحاورات الشعراء والبلغاء ۲/۴۴۱

(۲) زهر الأكم في الأمثال والحكم ۱/۱۶۶

(۳) نثر الدر في المحاضرات ۱/۲۴۹

(۴) نثر الدر في المحاضرات ۱/۲۴۹

(۵) نثر الدر في المحاضرات: ۱/۲۴۹

جو نصائح آپؒ نے اپنے والد سے حاصل کیں ان میں سے بعض درج ذیل ہیں:

جو شخص اپنی قسمت کے حصہ پر راضی رہتا ہے وہ لوگوں سے بے نیاز رہتا ہے، جو دوسرے کے مال کی طرف نظر اٹھاتا ہے وہ فقیر مرتا ہے، جو اللہ کی تقسیم پر راضی نہیں ہوتا وہ اللہ کو اس کے فیصلے کے معاملہ میں متہم کرتا ہے، جو دوسرے کی پردہ دری کرتا ہے اس کی اپنی پردہ دری ہوتی ہے، جو بغاوت کی تلوار اٹھاتا ہے وہ خود اسی سے قتل ہوتا ہے، جو نادان لوگوں کے ساتھ رہتا ہے وہ حقیر ہو جاتا ہے، جو علماء کے ساتھ رہتا ہے وہ معزز ہو جاتا ہے۔

حق بات ہی کہنا خواہ تمہارے موافق ہو یا مخالف، قرآن کی تلاوت کرنا، سلام کو عام کرنا، نیکی کا حکم اور برائی سے منع کرنا، توڑنے والے سے جوڑنا، مانگنے والے کو عطا کرنا، اور چغل خوری سے بچنا کہ یہ دلوں میں بغض و عداوت پیدا کرتی ہے۔[1]

وفات:

آپؒ نے پچیس رجب، بروز جمعہ ۱۸۳ھ میں بغداد میں انتقال فرمایا،[2] جبکہ آپؒ کی عمر پچپن برس تھی۔[3] بغداد میں آپؒ کی قبر اب بھی مشہور ہے۔[4]

صحیح بات یہ ہے کہ جیل کے اندر زہر دیے جانے سے آپؒ کا انتقال ہوا (یعنی شہادت کی موت آپؒ کو نصیب ہوئی)۔[5] اس کا مختصر قصہ یہ ہے کہ ہارون الرشید آپؒ کو مدینہ سے بغداد لے آیا اور جیل میں قید کر دیا، ایک مدت تک آپؒ جیل میں رہے،[6] بالآخر وہیں جیل کے اندر کھانے کی کسی چیز میں آپؒ کو زہر ملا کر دیا گیا جس سے آپؒ کی طبیعت خراب ہو گئی اور بخار کی طرح کوئی کیفیت ہو گئی، آخر تین روز بعد اسی زہر کے اثر سے جیل خانہ کے اندر شہید ہو گئے۔[7] بعض کہتے ہیں کہ یحییٰ بن خالد برمکی نے ہارون الرشید کے حکم سے آپؒ کو زہر دیا تھا۔[8]

---

(۱) ملخص من: تهذيب الكمال ۵/۸۹ مع سير أعلام النبلاء ۶/۲۶۳ و مطالب السؤول، ص: ۲۸۵

(۲) تاريخ الإسلام ۱۲/۴۱۹ مع البداية والنهاية ط الفكر ۱۰/۱۸۳ و مختصر أخبار الخلفاء، ص: ۳۰

(۳) ميزان الاعتدال ۴/۲۰۲

(۴) البداية والنهاية ط الفكر ۱۰/۱۸۳ مع امام اعظم ابو حنیفہ شہید اہل بیت، ص: ۱۱۵

(۵) مختصر أخبار الخلفاء، ص: ۳۰ و صحاح الأخبار، ص: ۴۵ مع إسعاف الراغبين للصبان ص: ۲۲۷

(۶) الكامل في التاريخ ۵/۳۳۲ مع العبر في خبر من غبر ۱/۲۲۲

(۷) الفصول المهمة، ص: ۲۲۹ و نور الأبصار، ص: ۲۰۷ مع العبر ۱/۲۲۲

(۸) تاريخ الخميس في أحوال أنفس النفيس ۲/۲۸۷

فضائل وخصائص

آپؒ کی سیرت بیان کرنے والے تمام مصنفین نے آپؒ کے فضائل وخصائص کو بطورِ خاص ذکر کیا ہے، ذیل میں آپؒ کے کچھ اجمالی فضائل ومناقب درج کیے جاتے ہیں:

* آپؒ اپنے زمانہ کے سب سے بڑے عبادت گزار، سب سے بڑے عالم، سب سے زیادہ سخی اور سب سے زیادہ معزز انسان تھے۔[1]

* مسلمانوں کے صادق ومعتمد امام تھے،[2] اور اس کے ساتھ ساتھ اپنی ذات میں ایک نیک، عابد، سخی، متحمل مزاج اور عظیم المرتبت ہستی تھے۔[3]

* آپؒ قائدانہ صفات کے حامل ہونے کے علاوہ بلند درجہ عالم فاضل، لوگوں کی محبوب شخصیت اور اللہ تعالیٰ کے مستجاب الدعوات بندے تھے۔[4]

* آپؒ اعلیٰ درجہ کی عقل وسمجھ کے مالک اور عبادت وتقویٰ سے مزین تھے۔[5]

اجمالی مناقب ذکر کرنے کے بعد، اب چند اوصاف وخصائص قدرے وضاحت کے ساتھ تحریر کیے جاتے ہیں:

ذوقِ عبادت:

آپؒ عبادت میں بہت زیادہ منہمک رہتے۔[6] لوگوں میں آپؒ کی عبادت مشہور تھی۔ اعمالِ صالحہ کو بہت پابندی سے نبھاتے، بے حد محنت ومجاہدہ کرتے، تہجد کا خصوصی اہتمام تھا، رات بھر نماز میں مشغول رہتے، کبھی لمبے لمبے سجدے کرتے اور کبھی قیام میں دیر تک کھڑے رہتے، اس کے ساتھ دن بھی عبادت سے خالی نہ رہتا، دن روزے اور صدقات میں گزرتا یعنی رات کو آپؒ شب بیدار اور دن کو روزہ دار ہوتے۔[7] اس قدر عبادت، مجاہدوں اور شب

---

(۱) الفصول المهمة، ص: ۲۲۷

(۲) الجرح والتعديل لابن أبي حاتم ۸/۱۳۹ وتهذيب التهذيب ۱۰/۳۳۰ وآل رسول الله وأولياؤه، ص: ۱۹۲

(۳) العبر في خبر من غبر ۱/۲۲۲ ومرآة الجنان ۱/۳۰۵ وتذكرة الخواص، ص: ۳۱۴

(۴) النجوم الزاهرة في ملوك مصر والقاهرة ۲/۱۱۲

(۵) ميزان الاعتدال ۴/۲۰۲

(۶) البداية والنهاية ط الفكر ۱۰/۱۸۳

(۷) مختصر أخبار الخلفاء، ص: ۲۹ والفصول المهمة، ص: ۲۲۱ ونور الأبصار، ص: ۳۰۳

بیداری سے آپؒ لوگوں میں "عبدِ صالح" کے خوبصورت لقب سے معروف ہو گئے، [1] حتی کہ آپؒ اپنے زمانہ کے سب سے بڑے عبادت گزار سمجھے جاتے تھے۔ [2]

عبادت کا یہ عالم تھا کہ کثرتِ سجود سے آپؒ کے گھٹنے ایسے سخت ہو گئے تھے جیسے اونٹ کے ہوتے ہیں۔ چناں چہ سجدوں کی ان کثرت کے سبب اپنے جدِ امجد امام زین العابدینؒ کی طرح آپؒ بھی "ذُو الثَفِنات" (یعنی سخت گھٹنوں والے) کے لقب سے یاد کیے جاتے تھے۔ جب نماز کیلیے اللہ کے سامنے کھڑے ہوتے تو عجب کیفیت آپؒ پر طاری ہو جاتی، آنکھوں سے آنسوؤں کی برسات شروع ہو جاتی اور دل دھڑکنے لگتا، اور یہی کیفیت اس وقت بھی ہوتی جب آپؒ اپنے رب سے مناجات اور دعاء میں مشغول ہوتے۔ [3]

ایک مرتبہ ایک شخص نے آپؒ کو دیکھا کہ اخیر شب میں سر سجدہ میں رکھا ہوا ہے اور عاجزی و انکساری کے یہ الفاظ لب پہ جاری ہیں: أَيْ رَبِّ، عَظُمَ الذَّنْبُ مِن عَبدِکَ، فَلْيَحْسُنِ الْعَفْوُ مِن عِندِکَ. (اے میرے رب! تیرے اس بندے کے گناہ بہت زیادہ ہو چکے ہیں، اپنے فضل سے معاف فرما دیجیے)۔ [4]

اور یہ دعا بھی آپؒ کثرت سے کیا کرتے تھے: اَللّٰهُمَّ إِنِّي أَسْأَلُکَ الرَّاحَةَ عِندَ الْمَوتِ وَالْعَفْوَ عِندَ الْحِسَاب (اے اللہ! میں آپ سے موت کے وقت آسانی اور حساب کے وقت معافی کا طلب گار ہوں)۔ [5]

اس کے علاوہ آپؒ کی زبان ہر وقت اللہ کے ذکر میں چلتی رہتی تھی۔ [6]

جب آپؒ کو جیل میں بند کیا گیا اس وقت بھی آپؒ کی شبانہ روز عبادت میں کوئی فرق نہ آیا، چناں چہ جس زمانہ میں آپؒ ہارون الرشید کی طرف سے قید تھے اس وقت جیل میں آپؒ کی خدمت پر جو خاتون مامور تھی اس نے آپؒ کی عبادت کا چشم دید تذکرہ اس طرح بیان کیا:

"جب عشاء کی نماز پڑھ لیتے تو رات گئے تک دعاء و اذکار میں مشغول رہتے، پھر جب کافی رات گزر جاتی تو اٹھتے

---

(۱) تهذيب التهذيب: ۱۰/۳۴۰ والنجوم الزاهرة ۲/۱۱۲ مع الطبقات الكبرى للشعراني ۱/۷۲

(۲) الأعلام للزركلي ۷/۳۲۱ والفصول المهمة، ص: ۲۲۷ وإسعاف الراغبين ص: ۲۲۶

(۳) آل البيت حول الرسول، ص: ۲۲۶

(۴) البصائر والذخائر ۷/۱۲۰ وربيع الأبرار ونصوص الأخيار ۲/۳۵۴

(۵) الفصول المهمة، ص: ۲۲۷ ونور الأبصار، ص: ۲۰۶

(۶) آل البيت حول الرسول، ص: ۲۲۹

اور نوافل پڑھنا شروع کر دیتے یہاں تک کہ فجر کی نماز کا وقت ہو جاتا۔ نمازِ فجر ادا کر کے سورج نکلنے تک ذکرِ الٰہی میں مشغول رہتے، اشراق سے فارغ ہو کر دن چڑھنے تک (عبادت کیلیے) پھر وہیں بیٹھ جاتے۔ جب دن چڑھ جاتا تو مسواک وغیرہ کرتے اور کھانا تناول فرماتے، اس کے بعد زوال تک قیلولہ کرتے۔ پھر ظہر سے لے کر عصر تک نوافل میں مشغول رہتے، عصر کے بعد مغرب تک اذکار میں مصروف رہتے، پھر مغرب اور عشاء کے درمیان بھی نوافل ادا کرتے، انتقال تک یہی معمول رہا''۔ [1]

سخاوت اور انسانی ہمدردی:

آپؒ کا شمار بڑے سخی لوگوں میں ہوتا تھا، [2] بلکہ اپنے دَور کے آپؒ سب سے سخی انسان تھے۔ [3] اور عراق میں تو آپؒ ''باب الحوائج'' (حاجتوں کا دروازہ) سے معروف تھے، کیونکہ آپؒ کے پاس جو بھی حاجتمند آتا وہ کبھی خالی ہاتھ نہ لوٹتا۔ [4] بلکہ آپؒ خود حاجتمندوں کو تلاش کرتے، فقراء مدینہ کا تو خصوصی پتا لگاتے اور اس طریقہ سے پیسے اور سامانِ ضروریات ان کے گھر پہنچا آتے کہ ان کو پتا بھی نہ چلتا کہ یہ سب کچھ کہاں سے آیا ہے، آخر جب آپؒ کا انتقال ہوا تو پھر یہ راز فاش ہوا۔ [5]

بسا اوقات آپؒ درہموں کی تھیلیاں اپنے ساتھ لیے رات کو باہر نکل جاتے، جن کو دینے کے ارادے سے نکلتے ان کو بھی دیتے اور ان کے علاوہ جو راستہ میں مل جاتا اس کو بھی دیتے۔ [6]

آپؒ اپنے مال کیلیے بہترین مصرف یہ سمجھتے تھے کہ اس مال سے کسی بھوکے کی بھوک دور کر دیں، جس کے پاس کپڑے نہ ہوں اسے کپڑا پہنا دیں، جو کسی مصیبت میں گرفتار ہو اس کی دادرسی کر دیں اور جو حالات و پریشانیوں میں گھر چکا ہو اس کی مدد کر دیں۔ [7]

---

(۱) الکامل ۵/۳۳۲ و مختصر أخبار الخلفاء، ص: ۲۸ مع تاریخ بغداد و ذیوله: ۱۳/۳۳

(۲) إسعاف الراغبین ص: ۲۲۶ والجوهرة الشفاف في أنساب السادة الأشراف ۱/۱۴۱

(۳) الفصول المهمة، ص: ۲۲۷ والصواعق المحرقة: ۲/۵۹۰

(۴) أخبار الدول وآثار الأول ۱/۳۳۷ ومثله في [مطالب السؤول، ص: ۲۸۹ وغیره

(۵) نور الأبصار، ص: ۲۰۶ والفصول المهمة، ص: ۲۲۷

(۶) الجوهرة الشفاف في أنساب السادة الأشراف ۱/۱۴۱

(۷) آل البیت حول الرسول، ص: ۲۲۶

اور آپؒ کی سخاوت کے کئی واقعات معروف ہیں:

ایک مرتبہ کسی غلام نے آپؒ کو "حرِیرہ" (یعنی آٹے اور گھی سے تیار کردہ حلوہ) ہدیہ کیا تو آپؒ نے وہ غلام، اور زرعی زمین جس میں وہ غلام کام کرتا تھا، دونوں کو ان کے مالک سے ایک ہزار دینار (مساوی تقریباً پونے دو کروڑ روپے) میں خرید لیا پھر اس غلام کو آزاد کر دیا اور وہ زمین بھی اسی غلام کو دے دی۔ [1]

ابو مغیث قُرظی (جبکہ وہ نوے سال کے ہو چکے تھے) کہتے ہیں: میں نے "جَوَّانِیَہ" (یہ مدینہ طیبہ کے قریب ایک بستی تھی، [2]) میں "اُمّ عِظام" نامی کنویں کے پاس تربوز، کھیرا اور کدو کاشت کر رکھے تھے۔ جب فصل تیار ہو گئی اور آمدنی کا وقت قریب آ گیا تو ایک رات ٹڈیاں آئیں اور سارا کھیت چٹ کر گئیں، حالانکہ میں اس فصل اور اس میں کام کرنے کیلیے دو اونٹوں کی خریداری پر ایک سو بیس دینار خرچ کر چکا تھا۔ میں اسی پریشانی میں بیٹھا تھا کہ حضرت امام کاظمؒ تشریف لے آئے، مجھے سلام کیا اور حال پوچھا۔ میں نے کہا: میں تو کنگال ہو کے رہ گیا ہوں، رات ٹڈیاں آئیں اور میرا سارا کھیت صاف کر گئیں۔ انہوں نے پوچھا: کَمْ غَرِمْتَ فِیهِ؟ "اس میں تمہارا کتنا نقصان ہو گیا ہے؟" میں نے کہا: دو اونٹوں کی قیمت بھی اگر شامل کر لیں تو کل ایک سو بیس دینار بنتے ہیں۔ انہوں نے مجھے ڈیڑھ سو دینار دیے اور فرمایا: نَرْبَحُکَ ثَلَاثِینَ دِینَارًا وَالْجَمَلَیْنِ "تیس دینار اور دو اونٹ ہماری طرف سے آپؒ کا نفع ہے"۔ [3]

حُسنِ اخلاق (برائی کا بدلہ اچھائی سے دینا):

آپؒ نہایت با اخلاق انسان تھے، تحمل و بردباری آپؒ میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ زندگی بھر آپؒ کا یہ دستور رہا کہ برائی کرنے والے کے ساتھ اچھائی سے پیش آتے۔ جب آپؒ کو کسی شخص کے بارے میں معلوم ہوتا کہ اس نے آپؒ کو برا بھلا کہا ہے تو آپؒ سیخ پا ہونے کے بجائے اس کے پاس قیمتی ہدایا و تحائف بھیج کر برائی کا بدلہ اچھائی سے دیتے۔ ایک مرتبہ کسی شخص سے آپؒ کو تکلیف پہنچی تو آپؒ نے اس کو ایک ہزار دینار دلوا بھیجے۔ [4]

---

(۲) مراصد الاطلاع علی أسماء الأمکنة والبقاع ۱/۳۵۶

(۳) تاریخ بغداد و ذیوله: ۱۳/۳۰ مع تهذیب الکمال في أسماء الرجال: ۲۹/۴۶

(۴) ینظر: البدایة والنهایة ط الفکر ۱۰/۱۸۳ مع صفة الصفوة ۱/۳۹۹ و شذرات الذهب في أخبار من ذهب ۲/۳۷۷

(۷) حضرت امام علی رِضا سَلامُ اللّٰہ وَ رَحمۃُ علیہ

(علی بن موسیٰ)

نام ونسب:

آپ سَلامُ اللّٰہ وَ رَحمۃُ علیہ، کا نام ''علی'' تھا، اور امام موسیٰ کاظمؒ کے صاحبزادے تھے۔[۱] والد کی کنیت کی طرح آپؒ کی کنیت بھی ''ابوالحسن'' تھی۔[۲] اور آپؒ کی عمدہ صفات کے پیش نظر آپؒ کو بہت سارے القابات سے نوازا گیا، جیسے: صابر (آزمائشوں پر صبر کرنے والا)، زَکی (پاکیزہ اخلاق والا)، وَفی (لین دین میں دیانتدار)، ولی (اطاعت گزار/نیک وصالح)، تاہم آپؒ کا مشہور لقب ''رِضا'' تھا۔[۳] (اس مبارک لقب کی کئی وجوہات ہیں (جو کہ مختلف اعتبار سے آپؒ کی فضیلت کو بھی ظاہر کرتی ہیں)۔(۱) آپؒ اللہ، اللہ کے رسول ﷺ، اور اُس کی شریعت پر اپنے ظاہر وباطن سے راضی ہو چکے تھے۔[۴] (۲) اللہ بھی آپؒ سے راضی تھا اور لوگ بھی خوش تھے۔[۵] (۳) موافق ومخالف (مجموعی طور پر) سب لوگ آپؒ سے راضی وخوش تھے۔[۶])

نسب کے لحاظ سے آپؒ قریشی ہاشمی علوی تھے۔[۷]

آپؒ کی والدہ ماجدہ باندی تھیں۔ اُن کا نام ''سُکَینہ''، کنیت ''اُم البَنین'' اور لقب ''شَقراء'' تھا۔[۸] بعض نے''

---

(۱) البدایۃ والنہایۃ ط الفکر ۱۰/۲۵۰

(۲) تاریخ الخمیس في أحوال أنفس النفیس: ۲/۲۸۷

(۳) الفصول المهمۃ، ص: ۲۳۴ مع مطالب السؤول، ص: ۲۹۵

فائدہ: آپؒ کا لقب ''رِضا''، راء کی زیر کے ساتھ ہے۔ ملاحظہ ہو: الأنساب للسمعاني: ۶/۱۳۹

(۴) آل البیت حول الرسول، ص: ۲۴۰

(۵) [الفصول المهمۃ، ص: ۲۴۷

(۶) النبراس ص: ۳۱۳

(۷) البدایۃ والنہایۃ ط الفکر ۱۰/۲۵۰ و دیوان الإسلام: ۳/۲۷۲

(۸) الوافي بالوفیات ۲۲/۱۵۴ و سیر أعلام النبلاء: ۹/۳۸۷ مع مطالب السؤول، ص: ۲۹۵

سُکینہ" کے بجائے "اَروَیٰ" نام بتایا ہے۔[1]

ولادت:

آپ سلامُ اللہ وَ رَحمۃُ علیہ، ۱۱/ ربیع الثانی، بروز جمعرات، ۱۵۳ھ کو مدینہ منورہ میں پیدا ہوئے۔[2]

حلیہ مبارک ولباس:

آپؒ کا تیز گندمی رنگ تھا،[3] اور قد مبارک درمیانہ تھا۔[4] لباس میں اُون اور ریشم کی بُنی ہوئی چادر اوڑھنے کا ذکر آتا ہے،[5] اور یہ بھی لکھا ہے کہ جب خلوت میں ہوتے تو فقیرانہ لباس پہنتے اور جب شاہی مجالس وغیرہ میں جاتے تو لباسِ فاخرہ زیبِ بدن فرماتے۔[6] انگوٹھی بھی پہنتے تھے جس کا نقش تھا: "حَسبِيَ الله "یعنی مجھے اللہ کافی ہے۔[7]

اولاد:

آپؒ کے پانچ صاحبزادے اور ایک صاحبزادی تھی:

محمد، حسین، جعفر، ابراہیم، حسن، اور عائشہ۔[8]

علمی مقام:

جہاں آپؒ عالی نسب تھے وہاں آپؒ بلند پایہ عالم، صاحبِ فضل وکمال اور وقت کے امام بھی تھے۔[9] ابراہیم بن عباس کہتے ہیں کہ میں نے آپؒ سے بڑا کوئی عالم نہیں دیکھا۔

---

(۱) انظر: نور الأبصار، ص: ۲۰۸ ومطالب السؤول، ص: ۲۹۵

(۲) [تاريخ الخميس ۲/۲۸۷ ومثله في [وفيات الأعيان ۳/۲۷۰ والشذرات الذهبية، ص: ۹۷

ف: وفي بعض المصادر أنه ولد سنة ثمان وأربعين ومائة، كما في: آل البيت حول الرسول، ص: ۲۴۰ والوافي بالوفيات ۲۲/۱۵۴ والكامل في التاريخ ۵/۵۰۴ ونور الأبصار، ص: ۲۰۸ وأخبار الدُّول، ص: ۳۴۱

(۳) أخبار الدُّول، ص: ۳۴۱

(۴) الفصول المهمة، ص: ۲۳۴ ونور الأبصار، ص: ۲۰۸

(۵) إكمال تهذيب الكمال: ۹/۳۷۹

(۶) ريحانِ عترت، ص: ۱۲۰

(۷) الفصول المهمة، ص: ۲۳۴

(۸) الصواعق المحرقة ۲/۵۹۲ مع الوافي بالوفيات: ۲۲/۱۵۴ ونور الأبصار، ص: ۲۱۹

(۹) الأنساب للسمعاني ۶/۱۴۰ وتهذيب التهذيب ۷/۳۸۹ مع النجوم الزاهرة ۲/۱۷۴

(۱۰) ريحانِ عترت، ص: ۱۱۸

آپؒ نوجوانی کے زمانہ میں ہی مسجدِ نبوی میں بطورِ مفتی مسائل بتایا کرتے تھے۔[1]

افتاء کے ساتھ ساتھ آپؒ نے علمِ حدیث کی تحصیل اور اس کی آگے اشاعت کی خدمات بھی سرانجام دیں۔ بہرحال جن حضرات سے آپؒ نے احادیث روایت کیں ان میں آپؒ کے والدِ ماجد حضرت امام موسیٰ کاظمؒ اور عبید اللہ بن اُرطاۃؒ کے نام سرفہرست ہیں[2] ان کے علاوہ آپؒ نے اپنے چچوں یعنی حضرت امام جعفر صادقؒ کے جلیل القدر واصحابِ فضل وکمال صاحبزادوں: اسماعیل، عبداللہ، اسحاق اور علی رحمہم اللہ سے بھی روایات لیں[3]

اور پھر آگے آپؒ کا فیضِ حدیث تو بہت عام ہوا کہ بہت سارے حضرات نے آپؒ سے احادیث نقل کیں[4] حتی کہ خلیفۂ وقت مامون بن ہارون الرشید سمیت اس زمانہ کے ائمۂ حدیث تک نے آپؒ سے حدیثی روایات لیں جیسے آدم بن ابی ایاسؒ، نصر بن علیؒ اور محمد بن رافع قُشیری وغیرہ۔[5]

اور جس طرح آپؒ کو حدیثِ نبوی کی تحصیل واشاعت میں رغبت تھی اسی طرح تفسیر قرآن سے بھی آپؒ کو شغف تھا اور آیات کی بہت عمدہ اور عام فہم تفسیر بیان فرمایا کرتے تھے۔[6]

محدثین کی طرف سے آپؒ کی تعظیم وعلمی قدردانی کا ایک واقعہ:

آپؒ "نیشاپور" تشریف لائے اور بھورے رنگ کے خچر پر سوار تھے۔ جب بازار میں داخل ہوئے تو دو محدثین حضرات: حافظ ابوزرعہ رازیؒ اور حافظ محمد بن اسلم طوسیؒ، بے شمار طلباء علم، اصحابِ حدیث اور حضراتِ فقہاء کے ساتھ خدمتِ والا میں حاضر ہوئے۔ آپؒ اُس وقت بند پالکی میں تشریف فرما تھے۔ حافظ رازیؒ اور حافظ طوسیؒ دونوں نے نہایت عاجزی سے درخواست کی کہ اے ائمۂ اہلِ بیت کے جانشین! حاضرین کو اپنے رُخِ انور کی زیارت کرادیجئے اور اپنے آبائی سلسلہ سے کوئی حدیث بھی روایت فرمادیجئے۔

آپؒ نے سواری ٹھہرانے اور خدام کو پردہ اٹھانے کا حکم دیا۔ لوگوں کے جمِ غفیر نے آپؒ کے چہرۂ انور کی زیارت سے

---

(۱) سیر اعلام النبلاء: ۹/۳۸۸ مع خلاصۃ الذہب المسبوک، ص: ۲۰۰ وتہذیب التہذیب: ۷/۳۸۷ والمنتظم ۱۰/۱۱۹

(۲) [تہذیب الکمال في أسماء الرجال ۲۱/۱۴۸

(۳) تہذیب التہذیب ۷/۳۸۷ وخلاصۃ الذہب المسبوک، ص: ۲۰۰

(۴) ینظر: تہذیب الکمال في أسماء الرجال ۱۴۸، ۲۱/۱۴۹

(۵) تہذیب التہذیب ۷/۳۸۷ مع تہذیب الکمال في أسماء الرجال ۲۱/۱۴۸ و ۱۴۹

(۶) مستفاد من: نثر الدر في المحاضرات ۱/۲۵۲

آنکھیں ٹھنڈی کیں، زلفیں کندھوں تک لٹک رہی تھیں۔ عقیدت ومحبت کی یہ کیفیت تھی کہ لوگوں کی آہیں تھمتی نہ تھیں، نالہ وبُکاء رکتا نہ تھا، کچھ لوگ مٹی میں لوٹ پوٹ ہورہے تھے اور کچھ بے خودی میں سواری کے پاؤں چوم رہے تھے۔

گویا بقولِ شاعر:

پڑے ہیں تیرے کوچہ میں لاکھوں *** مجروح، مقتول، مذبوح، بسمل

آٹھویں پشت میں حسنِ نبوی کی جھلک کا یہ اثر تھا، تصور کیجئے خود حسنِ نبوی کا کیا حال ہوگا!!!

علماء ومشائخ پکار رہے تھے: لوگو! خاموش ہوجاؤ، اپنے لیے نفع بخش کلام سنو، شور سے اذیت نہ پہنچاؤ۔ جب خاموشی چھاگئی تو حافظ رازیؒ اور حافظ طوسیؒ نے حدیث لکھوادینے کی درخواست کی۔ اس پر آپؒ نے یہ حدیث روایت فرمائی:

حَدَّثَنِي أبِي مُوسَى الكاظم عَنْ أَبِيه جَعْفَر الصَّادِق عَنْ أَبِيه مُحَمَّد الباقر عَنْ أَبِيه زين العابدين عَنْ أَبِيه الْحَسَين عَنْ أَبِيه عَلِيّ بن أبي طَالب رَضِيَ الله عَنهُم قَالَ حَدثنِي حَبِيبِي وقُرَّةُ عَيْني رَسُول الله صلى الله عَلَيْهِ وَسلم قَالَ: "حَدثنِي جِبْرِيلُ قَالَ سَمِعتُ رَبَّ الْعِزَّةِ يَقُولُ لَا إِلَهَ إِلَّا الله حِصْنِي فَمَنْ قَالَهَا دَخَل حِصْنِي وَمَنْ دَخَل حِصْنِي أَمِنَ مِنْ عَذَابِي."

(مجھے حدیث بیان کی میرے والد ماجد موسیٰ کاظم نے اپنے والد ماجد جعفر صادق سے، انہوں نے اپنے والد ماجد محمد باقر سے، انہوں نے اپنے والد ماجد زین العابدین سے، انہوں نے اپنے والد ماجد حضرت حسینؓ سے، انہوں نے اپنے والد ماجد حضرت علیؓ بن ابی طالب سے، انہوں نے فرمایا کہ مجھے میرے حبیب اور میری آنکھوں کی ٹھنڈک رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ مجھے جبریل نے بیان کیا کہ میں نے اللہ رب العزت کو یہ فرماتے ہوئے سنا: "لا الٰہ الا اللہ میرا قلعہ ہے، جس نے یہ کلمہ پڑھا وہ میرے قلعہ میں داخل ہوگیا اور جو میرے قلعہ میں داخل ہوگیا وہ میرے عذاب سے بچ گیا۔"

بس آپؒ نے یہ حدیث روایت کی، پردہ گرانے کا حکم دیا اور روانہ ہوگئے۔

آپؒ کے تشریف لے جانے کے بعد اُن لوگوں کو شمار کیا گیا، جو باقاعدہ قلم دوات لائے اور حدیث لکھ رہے تھے،

تو وہ بیس ہزار سے زائد تھے (یعنی باقی لوگ ان کے علاوہ تھے)۔[1]

ف: امام احمد بن حنبلؒ فرماتے ہیں کہ مذکورہ بالا سندِ حدیث اس قدر بابرکت ہے کہ اگر کسی پاگل شخص پر پڑھ کر اس کا دَم کیا جائے تو اس کی دیوانگی جاتی رہے اور وہ شفایاب ہو جائے۔[2]

مامون کا آپؒ کو ولی عہد بنانا:

خلیفۂ وقت مامون الرشید عباسی آپؒ سے بہت محبت کرتا تھا، حتیٰ کہ اس نے اپنی صاحبزادی "ام حبیب" آپؒ کے نکاح میں دی، اپنے ملک میں رائج کرنسی (درہم و دینار کے سکوں) پر آپؒ کا نام کندہ کرایا، اور سن ۲۰۱ھ میں تو اس نے آپؒ کو اپنا ولی عہد مقرر کر دیا۔[3]

ولی عہد بنانے کا وہ مضمون جسے مامون نے اپنے ہاتھ سے لکھا تھا درج ذیل ہے:

بسم اللہ الرحمن الرحیم

یہ وہ تحریر ہے جسے امیر المومنین عبداللہ بن ہارون الرشید (یعنی مامون) نے حضرت ابوالحسن علی بن موسیٰ رضا کے لیے لکھا ہے جن کا تعلق خاندانِ نبوت سے ہے اور جو اُس (یعنی مامون) کے بعد اُس کی سلطنت کے ولی عہد ہوں گے۔

اما بعد! بے شک اللہ تعالیٰ نے اسلام کو بحیثیتِ دین منتخب کیا ہے، اور اس دین کی طرف رہنمائی کرنے کیلیے اپنے بندوں میں سے رسولوں کو چنا ہے۔ ان رسولوں میں سے پہلا رسول بعد میں آنے والے رسول کی بشارت دیتا رہا ہے، اور بعد میں آنے والا اپنے سے پہلے رسول کی تصدیق کرتا رہا ہے یہاں تک کہ حضرت محمد ﷺ پر نبوت و رسالت ختم ہوگئی اور آپ ﷺ کی بعثت اس وقت ہوئی جب کہ سلسلۂ نبوت میں وقفہ آچکا تھا، علم کے نشانات مٹ چکے تھے، وحی وحجتِ الٰہی میں انقطاع آچکا تھا، زمانۂ قیامت قریب آچلا تھا، چناں چہ اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو آخری نبی بنا کر

---

(۱) الصواعق المحرقة: ۲/۵۹۴ مع نور الأبصار، ص: ۲۱۱ والفصول المهمة، ص: ۲۴۳ وعند نقل هذه الحكاية إلى الأردية أستفيد من "ريحانِ عترت، ص: ۱۱۸" أيضا.

(۲) الصواعق المحرقة ۲/۵۹۵ والتبين في أنساب القرشيين، ص: ۱۱۱ ونور الأبصار، ص: ۲۱۲ وذكرت في بعض المآخذ بركته الأخرى أيضا كما ترى في: جواهر العقدين في فضل الشرفين ۲/۳۴۲ والفصول المهمة، ص: ۲۴۳ وأخبار الدول، ص: ۳۴۴

(۳) مستفاد من: الأعلام للزركلي: ۵/۲۶ مع تذكرة الخواص، ص: ۳۱۶ وأسماء المغتالين، ص: ۱۹۳ وخلاصة الذهب المسبوك، ص: ۱۹۹

مبعوث فرمایا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو سابقہ رسولوں کی امتوں پر گواہ ہونے کا شرف بخشا۔

اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر اپنی وہ معزز و عالی شان کتاب نازل کی جس پر باطل نہ سامنے سے حملہ کر سکتا ہے اور نہ پیچھے سے۔ یہ کتاب اس ذات کی طرف سے نازل کی گئی ہے جو حکمت اور تعریف والی ہے۔ اس کتاب میں حلال و حرام اور پیش آمدہ مسائل و احکام کی تفصیل ہے، اور اس میں اللہ تعالیٰ نے وعدے بھی کیے ہیں اور وعیدیں بھی سنائی ہیں، ڈرایا بھی ہے اور انجام سے باخبر بھی کیا ہے اور یہ سب کچھ بہت وضاحت کے ساتھ بیان فرمایا ہے۔ یہ کتاب اس لیے اتاری ہے تاکہ اس کے ہر قسمی بندوں کیلیے یہ مکمل حجت بن جائے اور پھر ہلاکت و نجات اسی حجت کی بنیاد پر ہو، یقیناً اللہ تعالیٰ سمیع و علیم ذات ہے۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کے پیغامات پہنچائے اور لوگوں کو راہِ نجات کی طرف اُسی حکمت اور خوبصورت نصیحت کے ساتھ دعوت دی جس کا اللہ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا تھا اور بحث و مباحثہ کے وقت نہایت خوبصورت و بہترین انداز اختیار فرمایا پھر (وقت و موقع کی مناسبت سے) جہاد و سختی کے ذریعہ بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا فریضہ انجام دیا۔

یہاں تک کہ جب اللہ تعالیٰ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی روح قبض فرما کر اپنے پاس بلالیا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کیلیے اپنے پاس موجود انعامات پسند فرمالیے، تو دین کے آئندہ قائم رہنے کا ذریعہ ''خلافت'' کو قرار دیا کہ نبوت و رسالت تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر ختم کر دی تھی (لہذا آئندہ کوئی نبی و رسول تو نہیں آئے گا اس لیے اب خلفاء کا سلسلہ چلے گا)۔ چناں چہ انسانوں کے تمام معاملات اب ''خلافت'' کے ذریعے انجام پائیں گے، ایسی خلافت جو اللہ کی اطاعت پر قائم ہو، جس کے ذریعے اللہ تعالیٰ کے فرائض، اس کی حدود، اور اسلام کے احکامات و قوانین کا قیام عمل میں لایا جائے، دشمنانِ اسلام سے جہاد کیا جائے، عوام الناس پر ایسا خلیفہ مقرر کیا جائے جو مسلمانوں کے دینی امور کی حفاظت اور نگہبانی کرے اور مسلمانوں پر لازم ہو کہ وہ اس کی اطاعت کریں، نیز حقوق اللہ کو قائم کرنے، شہروں میں عدل و انصاف کے اظہار، راستوں کے امن و امان، لوگوں کی جانوں کے تحفظ اور آپس کے معاملات کی اصلاح وغیرہ کیلیے اُس کا تعاون کریں۔ جبکہ اس کے برخلاف صورت میں مسلمانوں کے معاملات کا بگاڑ، دین کا مغلوب ہونا، دشمن کا غالب آنا، اسلامی اتحاد میں دراڑ پڑنا؛ الغرض دنیا و آخرت کا خسارہ لازم آئے گا۔

لہذا جس شخص کو اللہ تعالیٰ اپنی زمین میں ''خلافت'' کی ذمہ داری دے اور اپنی مخلوق پر اسے معتمد بنائے تو اس پر لازم ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کیلیے اپنی جان کھپائے، اللہ کی رضا والے کاموں کو ترجیح دے اور جس چیز کا اللہ نے اسے حکم دے کر پابند بنایا ہے اس میں عدل واحسان پر عمل پیرا ہو۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ قرآن مجید میں فرماتا ہے: {يَا دَاوُودُ إِنَّا جَعَلْنَاكَ خَلِيفَةً فِي الْأَرْضِ فَاحْكُمْ بَيْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ وَلَا تَتَّبِعِ الْهَوَى فَيُضِلَّكَ عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ إِنَّ الَّذِينَ يَضِلُّونَ عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيدٌ بِمَا نَسُوا يَوْمَ الْحِسَابِ} [ص:۲۶] (اے داود! ہم نے تمہیں زمین میں خلیفہ بنایا ہے، لہذا تم لوگوں کے درمیان برحق فیصلے کرو، اور نفسانی خواہش کے پیچھے نہ چلو ورنہ وہ تمہیں اللہ کے راستے سے بھٹکا دے گی۔ یقین رکھو کہ جو لوگ اللہ کے راستے سے بھٹک جاتے ہیں اُن کیلیے سخت عذاب ہے کیونکہ انہوں نے حساب کے دن کو بھلا دیا تھا۔)

اور ہمیں حضرت عمرؓ بن خطاب کی طرف سے یہ روایت پہنچی ہے کہ انہوں نے فرمایا: لو ضاعتْ سخلةٌ بشاطئِ الفراتِ لَخِفتُ أن أُوخَذَ بِها (اگر دریائے فُرات کے کنارے بکری کا بچہ بھی مر گیا تو مجھے اس کی وجہ سے اپنے مواخذہ کا ڈر ہے)۔ اس کے علاوہ دیگر صحابہ کرامؓ کے بھی اس طرح کے کئی اقوال ہیں۔

بہرحال جب سے مجھے خلافت ملی ہے میں مسلسل اس بارے میں غور وفکر کرتا آیا ہوں کہ میں یہ معاملہ کس کے سپرد کروں اور کسے ''ولی عہد'' بناؤں۔ مجھے ابوالحسن علی بن موسیٰ رضا کے علاوہ اس کیلیے کوئی شخص موزوں نہیں ملا اور یہ اس لیے کہ میں نے ان میں فضل وکمال، مہارت وفوقیت، علمِ نافع، ظاہری وباطنی تقویٰ، دنیا سے بے رغبتی، اہلِ دنیا سے عدمِ طمع ولالچ، آخرت کی طرف میلان اور اس کیلیے اپنا سب کچھ قربان کرنے کی صفات دیکھی ہیں۔ میرے نزدیک ان کی یہ صفات۔ جن پر لوگوں کی خبریں متواتر اور ان کی زبانیں بھی متفق ہیں۔ پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی ہیں۔ لہذا میں نے ان کو ولی عہد بنانے کا یہ معاہدہ لکھ دیا ہے اور یہ فیصلہ میں نے چند چیزوں کو سامنے رکھتے ہوئے کیا ہے، وہ چیزیں یہ ہیں: اللہ تعالیٰ سے خیر کی امیدِ واثق، مسلمانوں کی ہمدردی، احکامِ دین کے قیام کا جذبہ، رب العالمین کے سامنے حاضری والے دن نجات کی آرزو۔

''عبداللہ (المامون)'' بقلمِ خود

۹/ رمضان المبارک/ ۲۰۱ ہجری

(نوٹ: میرے اہلِ خانہ، میرے خواص، میری اولاد اور اہل وعِیال، میرے فوجیوں اور غلاموں نے بیعت کرلی ہے۔ اللھم صل علی سیدنا محمد و آلہ) والسلام

اس کے بعد امام علی رضاؒ نے اس معاہدہ نامہ کی پشت پر یہ تحریر لکھی:

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد للہ رب العالمین، و صلواتہ علی سیدنا محمد و آلہ الطاہرین

میں ''علی بن موسیٰ بن جعفر'' عرض کرتا ہوں کہ امیر المومنین- اللہ تعالیٰ ان کی صحیح سمت میں مدد کرے اور راہِ راست کی انہیں توفیق عطا فرمائے- نے ہم اہلِ بیت کا وہ حق پہچانا جس سے دوسرے لوگ غافل تھے، ٹوٹے ہوئے رشتوں کو جوڑا، اور گھبرائے ہوئے لوگوں کو امن فراہم کیا بلکہ انہیں ایک نئی زندگی بخشی۔ یہ سب کچھ انہوں نے رضائے الٰہی کی خاطر کیا ہے، وہ کسی اور سے اس کے بدلے کے طلبگار نہیں، اور جلد ہی اللہ تعالیٰ اپنے شکر گزار بندوں کو بہترین بدلہ عطا فرمائے گا اور نیک لوگوں کے عمل کو بیکار نہیں جانے دے گا۔

اس کے بعد عرض ہے کہ امیر المومنین نے مجھے اپنا ولی عہد بنایا ہے اور اپنے بعد سلطنت کی ذمہ داری مجھے سونپی ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کو لمبی عمر عطا فرمائے، اور میرے لیے ان کے خلاف کرنا ممکن نہیں ہے۔ اب (جبکہ انہوں نے معاملہ میرے سپرد کر ہی دیا ہے تو) میں اللہ سے عہد کرتا ہوں کہ میں نہ کوئی ناحق خون بہاؤں گا، نہ کسی کی شرمگاہ اور نہ ہی کسی کے مال کو اپنے لیے جائز سمجھوں گا، اور مقدور بھر کفایت شعاری کو اختیار کروں گا، آخرت کو سامنے رکھ کر میں جس طرح پہلے زندگی گزار رہا تھا اس میں کوئی تبدیلی نہیں لاؤں گا، اور دنیا صرف بقدرِ ضرورت حاصل کروں گا۔

میں سب کے سامنے، اللہ کو گواہ بنا کر، کہتا ہوں کہ اگر میں کوئی نئی بات پیدا کردوں یا میں اپنی اس موجودہ حالت کو بدل لوں تو میں اس ذمہ داری سے ہٹا دیے جانے کا مستحق اور سزا کیلیے خود کو پیش کرنے والا ہوں گا۔

میں اللہ کی ناراضی سے اُس کی پناہ چاہتا ہوں، اور اسی سے رجوع کرتا ہوں کہ وہ مجھے اپنی اطاعت کی توفیق اور اپنی نافرمانی سے اجتناب نصیب فرمائے۔

والسلام

پھر یہ معاہدہ تمام ملکوں میں پڑھا گیا اور بیت اللہ شریف کے پاس اور ''ریاض الجنۃ'' میں بھی پڑھا گیا۔ اس معاہدہ کے حق میں مامون کے خاص لوگوں سمیت اکابر علماء نے بھی گواہی دی۔

فائدہ:

علماءِ سیرت نے لکھا ہے کہ جب مامون نے یہ کام کیا (یعنی "خلافت" آلِ عباس سے نکال کر آلِ علی میں داخل کردی، کیونکہ مامون "عباسی" تھا اور امام علی رضاؒ "علوی" تھے۔) تو بغداد میں بنوعباس کے لوگ بگڑ گئے اور انہوں نے بغاوت کر کے اپنی طرف سے مامون کو معزول کر دیا اور اس کی جگہ "ابراہیم بن مہدی" (یہ بنوعباس میں سے تھا بلکہ مامون کا چچا تھا) کے ہاتھ پر بیعت کر لی اور اسے تخت نشین کر لیا، یہ واقعہ ۵ محرم الحرام بروز جمعرات ۲۰۲ھ کو پیش آیا۔

مامون اس وقت "مَرْو" میں تھا اور بنوعباس کی طرح اُن کے حامیوں کے دل بھی، مامون سے پھر چکے تھے۔ یہ صورتِ حال دیکھ کر امام علی رضاؒ نے مامون الرشید سے کہا: "امیر المومنین! آپ کی خیر خواہی ہم پر لازم ہے، اور اور دل میں کھوٹ رکھنا کسی مسلمان کیلئے بھی جائز نہیں۔ سچی بات یہ ہے کہ عام لوگ آپ کے اس عمل کو پسند نہیں کر رہے جو آپ نے میرے ساتھ کیا ہے، اور جو خاص لوگ ہیں وہ "فضل بن سہل" کو پسند نہیں کرتے۔ اس لیے میرا آپ کو دیانتدارانہ مشورہ ہے کہ ہم دونوں آپ سے دور ہو جائیں یہاں تک کہ خاص اور عام لوگ آپ کے ساتھ درست ہو جائیں اور آپ کا معاملہ صحیح ہو جائے۔"

مگر مامون نے ان کو اپنے سے دُور نہ کیا اور "مَرْو" سے "بغداد" کی طرف لشکر کشی کر دی۔ "ابراہیم بن مہدی" پہلے تو چھپ گیا پھر ہتھیار ڈالنے کا اعلان کر کے مامون کی خلافت کو تسلیم کر لیا۔ مامون نے بھی اسے معاف کر دیا اور قتل نہ کیا۔ اس طرح مامون کی حکومت پھر مستحکم ہوگئی۔

یہاں یہ واضح رہے کہ امام رضاؒ، مامون کی زندگی میں ہی انتقال کر گئے تھے جیسا کہ عنقریب آ رہا ہے اور ان کے خلیفہ بننے کی نوبت نہیں آئی تھی۔[1]

(۱) ینظر: [تذکرۃ الخواص، ص: ۳۱۶ وما بعدھا بتسھیل. ومثلہ في: الفصول المھمۃ: ۲۴۶ ونور الأبصار، ص: ۲۱۳ والاتحاف بحب الأشراف، ص: ۳۴۳

عید نماز پڑھانے کیلیے جانا:

ایک مرتبہ عید کے روز خلیفہ مامون الرشید کی طبیعت ذرا بوجھل اور مزاج بدلا ہوا تھا تو اس نے امام علی رضا سَلامُ اللہ وَرَحمۃُ علیہ سے کہا کہ آج عید نماز آپؒ جا کر پڑھا دیں (یہ ان کو ولی عہد بنانے کے بعد کا واقعہ ہے)۔ حضرت امامؒ نے معذرت کی اور فرمایا کہ میرے اور آپ کے درمیان طے پانے والی شرائط تو آپ کو معلوم ہی ہیں لہذا نماز پڑھانے کے سلسلہ میں میری معذرت قبول کیجئے۔

مامون نے کہا: دراصل بات یہ ہے کہ میں لوگوں میں آپؒ کا نام بلند کرنا چاہتا ہوں تا کہ اس بات کی شہرت عام ہو جائے کہ آپؒ میرے ولی عہد بن چکے ہیں اور میرے بعد خلیفہ آپؒ ہوں گے۔ مامون نے جب اس میں اصرار کیا تو آپؒ نے فرمایا: اگر آپ مجھے اس میں معذور رکھیں تو یہ مجھے زیادہ پسند ہے اور اگر آپ کا اصرار ہی ہے تو پھر میں اس طریقے کے مطابق نماز پڑھانے کیلیے گھر سے نکلوں گا جس طریقہ پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لے جایا کرتے تھے۔ مامون نے کہا: اِفعَلْ کَیفَ ما أَرَدْتَ "جیسے آپؒ چاہیں ویسے کریں"۔ ان کو یہ اختیار دینے کے بعد مامون نے ارکانِ دولت، لشکر کے آگے چلنے والے دستے اور فوجیوں کو حکم نامہ جاری کر دیا کہ سب امام رضاؒ کی خدمت میں پہنچیں اور ان کے ساتھ عید گاہ جائیں، چناں چہ یہ سب لوگ اور مؤذنین ومکبّرین حضرات آپؒ کے دروازہ پر پہنچ کر باہر نکلنے کا انتظار کرنے لگے۔

آپؒ باہر تشریف لائے اور اتباعِ سنت میں آپؒ نے غسل کر رکھا تھا، عمدہ لباس زیب تن فرما رکھا تھا، عمامہ باندھ رکھا تھا اور اس کا شملہ کندھے پر چھوڑ رکھا تھا، خوشبو لگا رکھی تھی اور ہاتھ میں عصا لیے پیدل عید گاہ روانہ ہوئے اور اپنے غلاموں اور متعلقین سے کہا کہ تم بھی ایسے کرنا جیسے میں کروں، چناں چہ سورج نکلنے تک وہ لوگ، اونچی آواز کے ساتھ اللہ اکبر اور لا الٰہ الا اللہ کہتے ہوئے، آپؒ کے آگے چلتے رہے۔ جب اُس سرکاری دستے اور لشکر نے آپؒ کو اس طرح اتباعِ سنت میں پیدل عید گاہ کی طرف جاتے دیکھا تو ان سے بھی نہ رہا گیا اور وہ بھی اپنے گھوڑوں اور سواریوں سے اتر کر آپؒ کے آگے آگے پیادہ پا چلنے لگے اور اپنی سواریاں اپنے غلاموں کے ہمراہ لوگوں کے پیچھے چھوڑ دیں۔ جب حضرت امامؒ تکبیر کہتے تو سب لوگ آپؒ کے ساتھ مل کر تکبیر کہتے، اسی طرح جب آپؒ لا الہ الا اللہ کہتے تو باقی لوگ بھی ساتھ مل کر کہتے اور یہ سب لوگ آپؒ کو عزت دینے کی خاطر خدام کی طرح آپؒ کے آگے آگے چل رہے تھے۔ اس

سے ایک عجب روحانی سماں بندھ گیا حتی کہ لوگوں کو یہ محسوس ہونے لگا کہ آس پاس کے درودیوار بھی ساتھ تکبیر وتہلیل کہہ رہے ہیں اوران صداؤں سے پورا ''مَرْو'' شہر گونج اٹھا، ہر طرف آہ وبکاء کا شور تھا۔

مامون کے پاس اس کی خبر پہنچی تو اس کے خاص آدمی ''فضل بن سہل'' نے اس پر مامون کو مشورہ دیتے ہوئے کہا کہ اگر امام رضاؒ انہی کیفیات وحالات کے ساتھ عیدگاہ پہنچ گئے تو (ناسمجھ) لوگ اس کی وجہ سے فتنہ میں پڑ سکتے ہیں اور ان جذباتی کیفیات سے ہم لوگوں کی جانیں بھی خطرے میں پڑ سکتی ہیں لہٰذا موقع کی نزاکت کو سمجھتے ہوئے آپؒ قاصد بھیج کر امام رضاؒ کو واپس بلوالیں۔ اس پر مامون نے آپؒ کو پیغام کہلا بھیجا: اے ابوالحسن! ہم نے آپؒ کو نماز پڑھانے کا کہا تھا لیکن ہم نہیں چاہتے کہ آپؒ کو کسی قسم کی کوئی مشقت پہنچے، لہٰذا آپؒ واپس تشریف لے آتے، اور لوگوں کو وہی شخص نماز پڑھادے گا جو پہلے پڑھایا کرتا ہے۔ حضرت امام رضاؒ واپس تشریف لے آئے اور مامون نے جا کر لوگوں کو نماز پڑھادی۔[1]

(1) الفصول المھمۃ، ص: ۲۴۹

ارشادات ونصائح

(۱) ایک آدمی نے آپؒ سے اپنے بھائی کی شکایت کی تو آپؒ نے اِن اشعار کے ذریعے نصیحت فرمائی:

اعذِرْ أخاک علی ذُنوبِه   واصْبِرْ وغَطِّ علی عُیوبِه

واصْبِرْ علی سَفهِ السَّفِیـه   و للـزَّمـان علی خُطوبِه

وَ دَعِ الجوابَ تَفضُّـلاً   وکِلِ الظَّلومَ علی حَسِیبِه

[اپنے بھائی کی غلطیاں معاف کردو، اور صبر سے کام لیتے ہوئے اس کی خامیوں پہ پردہ ڈال دو (کہ وہ آخر تمہارا بھائی ہے)۔

ناسمجھ شخص کی نادانی کو برداشت کرلو، اور حالاتِ زمانہ پر صبر ورضا اختیار کرو۔

تم حسنِ خلق کی بناء پر جواب نہ دیا کرو، اور ظالم کو اُس کے مُحاسب (یعنی اللہ) کے حوالے کردو۔][1]

(۲) کسی نے آپؒ سے پوچھا: کیا اللہ تعالیٰ بندوں کو ان احکامات کا پابند بناتا ہے جن کی ان میں طاقت وہمت بھی نہ ہو؟ فرمایا: وہ بہت زیادہ انصاف کرنے والا ہے (یعنی وہ ایسا نہیں کرتا کیونکہ یہ انصاف کے خلاف ہے)۔ اس نے پھر پوچھا: تو کیا بندے جو کچھ چاہیں وہ سب کچھ کرسکتے ہیں؟ فرمایا: وہ بہت زیادہ عاجز ہیں (یعنی وہ اپنی ہر چاہت پوری کرنے پر قادر نہیں ہیں)۔ (اس سب کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ انسان کو حکم وغیرہ دیگر امور بجالانے کی طاقت دیتا ہے، مگر اس کو اتنی طاقت بھی نہیں دے دیتا کہ وہ دنیا میں جو چاہے کرسکے، لہذا اصل طاقت وقوت اللہ ہی کی ہے)۔[2]

(۳) ایک شخص کو نصیحت کرتے ہوئے فرمایا: اے اللہ کے بندے! اللہ کی رضا پر راضی رہ، اور اُس چیز کی تیاری کر جس کا آنا ضروری ہے (یعنی آخرت)۔[3]

(۴) آپؒ کی مجلس میں کسی نے آپؒ سے کہا: منصبِ امامت وخلافت کا تقاضا یہ ہے کہ امیر المومنین کو روکھا سوکھا کھانا چاہیے، موٹا جھوٹا پہننا چاہیے، گدھے کی سواری کرنی چاہیے، مریض کی عیادت کرنی چاہیے اور جنازوں میں

---

(۱) نور الأبصار، ص: ۲۱۲ والاتحاف بحب الأشراف، ص: ۳۱۹

(۲) الوافي بالوفيات ۲۲/۱۵۵ وتهذيب الكمال في أسماء الرجال ۲۱/۱۵۱ وتهذيب التهذيب ۷/۳۸۷

(۳) الصواعق المحرقة ۲/۵۹۴ ونور الأبصار، ص: ۲۱۷

شرکت کرنی چاہیے۔

آپؒ ٹیک لگا کر بیٹھے ہوئے تھے۔ اُس کی بات سن کر سیدھے ہو کر بیٹھ گئے پھر اس سے فرمایا: حضرت یوسف بن یعقوب علیہ السلام نبی (اور شاہِ مصر) تھے، انہوں نے تو سونے کے بٹنوں والے قیمتی ریشم کے چوغے پہنے، سونے سے بُنے ہوئے خاص قسم کے عمدہ مصری لباس پہنے، آلِ فرعون کی مسندوں پر بیٹھے، فیصلے بھی کیے، احکامات بھی جاری کیے اور پابندیاں بھی نافذ کیں۔

سنو! امامت وخلافت کا تقاضا یہ ہے کہ امیر المومنین عادل وحق پرست ہو، جب بات کرے تو سچ بولے، فیصلہ کرے تو عدل وانصاف سے کام لے اور وعدے کرے تو انہیں پورا کرے۔ حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے پہننے اور کھانے کو حرام نہیں قرار دیا، پھر یہ آیت تلاوت فرمائی:

{قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِينَةَ اللهِ الَّتِي أَخْرَجَ لِعِبَادِهِ وَالطَّيِّبَاتِ مِنَ الرِّزْقِ} [الأعراف:۳۲] ان سے کہو کہ: کس نے زینت کی اُن چیزوں کو حرام قرار دیا ہے جو اللہ نے اپنے بندوں کیلیے پیدا کی ہیں اور (اسی طرح، اللہ تعالیٰ کے) پاکیزہ رزق کی چیزوں کو (کس نے حرام قرار دیا ہے)؟]۔[1]

(۵) لوگ دو قسم کے ہیں: ایک وہ شخص جو اِس سے اچھا اور زیادہ متقی ہو، دوسرا وہ شخص جو اِس سے بُرا اور اِس سے کم درجے کا ہو۔ جب یہ اُس شخص سے ملے جو اِس سے بُرا اور کم درجہ ہو تو یہ کہے: شاید اُس کی بھلائی مخفی اور چھپی ہوئی ہو اور وہ اُس کیلیے (روزِ محشر) سراپا خیر ثابت ہو اور میری بھلائی ظاہر صورت میں تو بھلائی ہو لیکن (کل قیامت میں) میرے لیے شر ثابت ہو۔ اِس کے برعکس جب یہ اُس شخص کو دیکھے جو اِس سے اچھا اور زیادہ متقی ہو تو اُس کے سامنے تواضع سے پیش آئے تاکہ یہ بھی اُس جیسا ہو جائے۔

یہ شخص جب یہ سب کچھ کر لے گا تو (اللہ اور لوگوں کے نزدیک) اِس کا مقام بلند ہو جائے گا، اِس کا ذکرِ خیر ہوگا اور یہ اپنی قوم کا سردار ہوگا۔[2]

(۶) دل مختلف کیفیات میں رہتا ہے: کبھی یہ چست ہوتا ہے تو کبھی سست، اور کبھی یہ پُرعزم ہوتا ہے تو کبھی بے

---

(۱) الفصول المهمة، ص: ۲۴۴ ونور الأبصار، ص: ۲۱۲ مع نثر الدر في المحاضرات: ۱/۲۵۳

(۲) آل البيت حول الرسول، ص: ۲۴۸

ہمت، چناں چہ جب یہ چست و پُرعزم ہو تو اس سے فائدہ اٹھالو اور جب یہ سست و بے ہمت ہو تو اُس وقت اِس کی طرف توجہ نہ دو۔ [1]

(۷) جب آپؒ سے "عُجب" (خود پسندی) کے بارے میں دریافت کیا گیا تو فرمایا:

"عُجب" کے کئی درجات ہیں: ایک یہ ہے کہ آدمی کو اپنا بُرا عمل بھی اچھا لگتا ہے اور وہ اس کو اچھا سمجھ کر خوش ہوتا رہتا ہے۔ اور ایک درجہ یہ بھی ہے کہ آدمی اللہ پر ایمان لا کر اللہ پر اپنا احسان سمجھتا ہے حالانکہ اللہ کا اس پر احسان ہے کہ اسے ہدایت دی۔ [2]

(۸) جس شخص میں پانچ صفات نہ ہوں اُس سے کسی شئ کی امید نہ رکھنا: طبیعت میں سخاوت، مزاج میں سنجیدگی، بلندیٔ اخلاق، خوفِ الٰہی اور معتبرَ و مصدَّق نسب (یعنی نسب میں غلط بیانی نہ کر رکھی ہو)۔ [3]

(۹) آپؒ سے پوچھا گیا: کس حالت میں آپؒ نے صبح کی؟ جواب دیا: میں نے اس حال میں صبح کی ہے کہ عمر گھٹ چکی ہے، عمل محفوظ کرلیا گیا ہے، موت سر پر سوار ہے، جہنم کی آگ ہمارے پیچھے ہے اور ہمیں معلوم بھی نہیں کہ ہمارے ساتھ کیا ہوگا؟۔ [4]

(۱۰) فرمایا: مال کے انبار لگانا تو پانچ طریقوں سے ہی ممکن ہے: سخت کنجوسی، لمبی امید، ہر وقت کی حرص، قطع رحمی (رشتہ داروں کو ان کے حقوق نہ دینا)، اور دنیا کو آخرت پر ترجیح دینا۔ [5]

وفات:

جمعہ کی رات، ۲۱ رمضان المبارک، ۲۰۳ھ کو "طُوس" (جس کا موجودہ نام "مَشہد" ہے [6]) میں آپؒ کا انتقال ہوا، جبکہ آپؒ کی عمر ساڑھے اُنچاس سال تھی۔ [7] چناں چہ آپؒ کی قبر وہیں "طُوس" میں ہے جو کہ خُراسان میں واقع

---

(۱) مستفاد من: آل البیت حول الرسول، ص: ۲۴۸

(۲) آل البیت حول الرسول، ص: ۲۴۹

(۳) آل البیت حول الرسول، ص: ۲۴۹ بتقدیم وتاخیر لغرض التسہیل

(۴) آل البیت حول انرسول، ص: ۲۴۹

(۵) آل البیت حول الرسول، ص: ۲۴۹

(۶) رحلۃ ابن فضلان الی بلاد الترک والروس والصقالبۃ ص: ۱۲،۲۰

(۷) تلخیص تاریخ نیسابور ص: ۲۶ مع الوافی بالوفیات: ۲۲/۱۵۴ ودیوان الإسلام ۳/۲۷۲ وسیر أعلام النبلاء ۹/۳۹۳

ہے۔[1] مامون الرشید کی زندگی میں ہی آپؒ کا انتقال ہوا، مامون کو آپؒ کے انتقال کا بہت زیادہ دکھ اور رنج ہوا حتی کہ کئی روز تک اُس پر غم کی یہ کیفیت چھائی رہی؛ نہ کھانے میں اس کا جی لگتا تھا، نہ پینے میں اور دیگر لذات تک ان دنوں میں اُس سے چھوٹ گئی تھیں۔ نمازِ جنازہ اُس نے خود پڑھائی تھی اور اپنے والد ہارون الرشید کے پہلو میں آپؒ کو دفن کیا تھا۔[2]

کئی مؤرخین نے لکھا ہے کہ آپؒ شہید فوت ہوئے۔[3] اور شہادت کا یہ قصہ درج کیا ہے کہ آپؒ غسل خانہ میں گئے، وہاں سے باہر نکلے تو آپؒ کے سامنے ایک تھال میں زہریلے انگور پیش کیے گئے جن میں زہریلی سوئیوں سے اس طرح زہر داخل کیا گیا تھا کہ اس کا اثر ظاہر نہیں ہوتا تھا۔ اُن کے تناول فرمانے سے آپؒ انتقال کر گئے۔[4]

---

(۱) مطالب السؤول، ص: ۳۰۲

(۲) الأعلام للزركلي: ۵/۲۶ مع وفيات الأعيان: ۳/۲۷۰ وتذكرة الخواص، ص: ۳۱۸

(۳) تهذيب التهذيب ۷/۳۸۷ وتلخيص تاريخ نيسابور ص: ۲۶ وتاريخ بغداد وذيوله ۱۹/۱۲۲ وسير أعلام النبلاء ۹/۳۹۳

(۴) تذكرة الخواص، ص: ۳۱۸ وخلاصة تذهيب تهذيب الكمال ص: ۲۸۷

فضائل وخصائص

اللہ تعالیٰ نے آپ سلامُ اللہِ وَ رَحمۃُ علیہ، کو بہت ساری عظمتوں وفضیلتوں سے نوازا تھا، اور نہایت بلند شان واعلیٰ مقام عطا فرمایا تھا۔ آپؒ خاندانِ اہلِ بیت کی جلیل القدر اور صاحبِ فضل وکمال ہستی، اور محبوبِ زمانہ شخصیت تھے، لوگوں کے دلوں میں آپؒ کی بڑی اہمیت ووقعت تھی۔[1] آپؒ اپنے زمانہ میں بنو ہاشم کے سردار اور بزرگ ترین شخصیت کے تعارف سے جانے جاتے تھے۔[2] بلکہ آپؒ کے زمانہ میں آلِ ابو طالب میں سے کوئی شخص بھی مقام ومرتبہ میں آپؒ کے ہم پلہ نہ تھا۔[3] علم، دینداری اور صفتِ قیادت میں آپؒ کی نرالی شان تھی۔[4] اور امیر المومنین بننے کی ساری صلاحیتیں آپؒ میں موجود تھیں۔[5]

مامون الرشید نے جب آپؒ کو "ولی عہد" بنایا تو مامون کے اپنے ہی بعض افراد نے اِس پر اعتراض کیا، اس پر مامون نے اُن کے سامنے آپؒ کی عظمت وفضیلت بیان کرتے ہوئے کہا: اِس وقت روئے زمین پر اُن سے زیادہ فضیلت والا، زیادہ عفت والا، زیادہ تقویٰ والا، زیادہ زُہد (دنیا سے بے رغبتی) والا، اور عوام وخواص میں اُن سے زیادہ محبوب کوئی شخص نہیں ہے۔[6]

آپؒ کو یہ فضل واعزاز بھی حاصل ہے کہ تصوف کے جلیل القدر شیخ اور مرجع الخلائق ہستی حضرت معروف کرخیؒ (جو سری سَقطیؒ کے بھی استاذ تھے) نے آپؒ کے ہاتھ پر اسلام قبول کیا۔[7]

علماء ومشائخ کے علاوہ شعراء نے بھی آپؒ کی ذات کو خراجِ تحسین پیش کیا ہے۔ ابونُواس، دَورِ عباسی کا ایک مشہور شاعر گزرا ہے، اس کے ایک دوست نے اُسے کہا: میں نے تجھ سے زیادہ بے دھڑک شخص نہیں دیکھا، تُو نے شراب

---

(۱) سیر أعلام النبلاء ط الرسالة: ۱۳/۱۲۱ مع أحداث التاريخ الإسلامي بترتيب السنين ۱/۱۱۶۹

(۲) النجوم الزاهرة ۲/۱۷۴ و خلاصة تذهيب تهذيب الكمال ص: ۲۷۸

(۳) الجوهر الشفاف، ص: ۱/۱۵۹

(۴) سير أعلام النبلاء ط الرسالة ۹/۳۸۷

(۵) سير أعلام النبلاء ط الرسالة ۹/۳۹۲

(۶) آل البيت حول الرسول، ص: ۲۴۰

(۷) الصواعق المحرقة: ۲/۵۹۳

جیسی چیز کو بھی نہیں چھوڑا کہ اس ناپاک شیٔ کی تعریف میں بھی کچھ نہ کچھ اشعار کہہ دیے ہیں مگر تُو نے اپنے زمانے کی امامِ علی رضاؒ جیسی عظیم شخصیت کے بارے میں ایک لفظ تک کبھی نہیں کہا؟؟

ابونُواس نے کہا: واللہ! میں نے صرف اُن کی عظمت کے پیشِ نظر ان کے متعلق کوئی شعر نہیں کہا کہ میرے جیسا آدمی اس قدر بڑی ہستی کی کیا تعریف کرسکتا ہے۔ پھر تھوڑی ہی دیر بعد اُن کی شان میں درج ذیل چند اشعار کہے: [1]

قِيلَ لِي: أَنْتَ وَاحِدُ النَّاسِ ... فِي كُلِّ كَلاَمٍ مِنَ الْمَقَالِ بَدِيْهِ

لَکَ فِي جَوْهَرِ الْكَلاَمِ بَدِيعٌ ... يُثْمِرُ الدُّرَّ فِي يَدَيْ مُجْتَنِيْهِ

فَعَلاَمَ تَرَكْتَ مَدْحَ ابْنِ مُوْسَى ... بِالْخِصَالِ الَّتِي تَجَمَّعْنَ فِيْهِ؟

قُلْتُ: لاَ أَهْتَدِي لِمَدْحِ إِمَامٍ ... كَانَ جِبْرِيْلُ خَادِماً لأَبِيْهِ

[مجھے کہا گیا: تُو ہر بات کو کُھل کر اور واضح بیان کرنے میں سب لوگوں سے منفرد ہے۔

کسی کلام کے جوہر سامنے لانے میں تیرے پاس منفرد وانوکھے طریقے ہیں جو اُن جواہر کے چننے والے کے ہاتھوں میں مزید موتی بکھیر دیتے ہیں۔

تو پھر تُو نے ابن موسیٰ (یعنی امام رضاؒ) کی اُن عمدہ صفات کے ذریعہ تعریف کس وجہ سے نہیں کی جو اُن کی ذات میں جمع ہیں؟

میں نے کہا: مجھے دراصل ایسے امام کی تعریف کرنے کا طریقہ ہی نہیں آتا، جس کے والد (یعنی آپ ﷺ) کے خادم، جبریل تھے]۔ [2]

ذوقِ عبادت:

آپؒ کو عبادت سے خاص شغف تھا، آپؒ کی زندگی ہی گویا عبادت کیلئے وقف تھی۔ اپنے زمانہ کے آپؒ سب سے زیادہ متقی اور نہایت اطاعت گزار انسان تھے۔ وضو اور نماز تو آپؒ کی سیرتِ طیبہ کا جزو بن کے رہ گیا تھا، رات بھر وضو کرتے اور نماز پڑھتے رہتے یہاں تک کہ صبح ہوجاتی یعنی شب بیداری گویا آپؒ کی پہچان ہوگئی تھی، چناں چہ آپؒ

(۱) وفیات الأعیان ۳/۲۷۰

(۲) سیر أعلام النبلاء: ۹/۳۸۹ ومثلها في المنتظم: ۱۰/۱۲۰ وأخبار الدُّول، ص: ۳۴۳ والشذرات الذهبية، ص: ۹۷

کے خاندان میں سے ایک فرد کا کہنا ہے کہ میں جب بھی آپؒ کو دیکھتا تو یہ آیات میری آنکھوں کے سامنے گھوم جاتیں:

{كَانُوا قَلِيلًا مِنَ اللَّيْلِ مَا يَهْجَعُونَ (١٧) وَبِالْأَسْحَارِ هُمْ يَسْتَغْفِرُونَ [الذاریات: ١٧، ١٨) رات کو کم سوتے تھے، اور سحری (یعنی تہجد) کے وقت استغفار کرتے تھے]۔ [1]

جس طرح آپؒ رات بھر عبادت میں مشغول رہتے اسی طرح دن کو روزے بھی کثرت سے رکھا کرتے تھے۔ ہر مہینے کے تین روزے تو آپؒ سے کبھی نہیں چھوٹے تھے۔ [2]

فائدہ: سنت سے بھی یہ ثابت ہے کہ رسول اللہ ﷺ ہر ماہ ہمیشہ تین روزے رکھتے تھے، [3] اور ہر ماہ تین روزے رکھنے کا ثواب ایسے ہے جیسے ساری زندگی روزے رکھے ہوں۔ [4] بہتر یہ ہے کہ یہ تین روزے ہر اسلامی مہینے کی تیرہ، چودہ اور پندرہ تاریخ والے دنوں میں رکھے جائیں، اور ان دنوں کو ''ایامِ بیض'' کہا جاتا ہے۔ [5]

آپؒ کا یومیہ معمولِ عبادت اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ فجر کی نماز ادا کر کے وہیں مصلیٰ پر بیٹھ رہتے اور اشراق تک مختلف اذکار و اوراد میں مشغول رہتے، پھر چاشت تک نوافل میں مصروف رہتے۔ چاشت سے فارغ ہو کر لوگوں میں تشریف لاتے، انہیں حدیثیں بیان کرتے اور وعظ و نصیحت فرماتے۔ جب سورج ڈھل جاتا اور ظہر کا وقت داخل ہو جاتا تو وضو تازہ کر کے پھر مسجد میں چلے جاتے۔ بہرکیف آپؒ کے اکثر اوقات عبادت میں ہی گزرتے تھے۔ [6]

رجاء بن ابی ضحاکؒ کہتے ہیں کہ مامون الرشید نے اُنہیں بھیجا تھا کہ وہ امام علی رِضاؒ کو خُراسان لے آئیں۔ رجاء مدینہ منورہ سے مَرْو تک آپؒ کے ساتھ رہے، وہ بیان کرتے ہیں کہ: واللہ! میں نے اپنی زندگی میں امام رِضاؒ سے زیادہ ''متقی'' شخص نہیں دیکھا اور نہ ہی ان سے زیادہ ''ہر وقت اللہ کا ذکر کرنے والا'' اور ''اللہ کا خوف رکھنے والا'' کوئی شخص دیکھا ہے۔ [7]

---

(١) الاتحاف بحب الأشراف، ص: ٣١٢ مع آل البيت حول الرسول، ص: ٢٤٢

(٢) نور الأبصار، ص: ٢١١ والاتحاف بحب الأشراف، ص: ٣٣٨

(٣) سنن ابي داود، ٢/٣٢٨، رقم: ٢٤٥٠

(٤) صحيح البخاري ٣/٤٠، رقم ١٩٧٩ وصحيح مسلم ٢/٨١٧

(٥) سنن الترمذي ٣/١٢٥ وسنن النسائي ٤/٢٢٢ وبدائع الصنائع ٢/٧٩

(٦) آل البيت حول الرسول، ص: ٢٤٢

(٧) آل البيت حول الرسول، ص: ٢٤٢

تواضع:

کثرتِ عبادت وغیرہ دیگر اعلیٰ صفاتِ کے باوجود آپؒ تواضع وعاجزی کے بھی اعلیٰ مقام پر فائز تھے۔ لوگوں میں منفرد اور ممتاز بن کر رہنا آپؒ سے کوسوں دور تھا۔ آپؒ غلاموں کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھالیتے جیسا کہ ابھی آئے گا، اور آپؒ کی نشست گاہ بھی سادی اور متواضعانہ تھی چناں چہ گرمیوں میں ''کھجور کے پتوں کی چٹائی'' اور سردیوں میں کبھی ''ٹاٹ'' اور کبھی ''بکری کی کھال'' پر بیٹھتے۔ [1]

ابراہیم بن عباس نے آپؒ کی تواضع وحسنِ اخلاق کا نقشہ یوں کھینچا ہے:

''میں نے امام علی رضاؒ سے افضل شخص نہیں دیکھا۔۔۔ انہوں نے کبھی کسی کے ساتھ زیادتی نہیں کی، نہ کسی کی بات کاٹی، نہ کسی شخص کی حاجت ٹھکرائی، نہ اپنے ہم نشین کے آگے ٹانگیں پھیلائیں اور نہ ہی اُس سے پہلے خود تکیہ لگایا، اور نہ کبھی اپنے غلاموں کو برا بھلا کہا۔ وہ اپنے غلاموں کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھالیتے''۔ [2]

بلخ کے ایک شخص کا بیان ہے کہ ایک مرتبہ خراسان جاتے ہوئے میں امام رضاؒ کا شریکِ سفر تھا۔ راستے میں ایک مقام پر انہوں نے دسترخوان لگوایا اور اپنے غلاموں کو بھی دسترخوان پر ساتھ ہی بٹھالیا۔ میں نے عرض کی: میں آپؒ پر قربان جاؤں، اگر آپؒ اِن کا دسترخوان الگ کردیتے!!! آپؒ کو یہ بات ناگوار گزری اور فرمایا: إنَ الرَّبَ تَبارَکَ وتَعالیٰ وَاحِدٌ، وَالأُمَّ وَاحِدةٌ وَالجزاءُ بِالأَعمَالِ ''رب ایک ہے اور ماں (یعنی حضرت حواءؑ) بھی ایک ہے، اور جزاء وسزا کا دارومدار اعمال پر ہوگا''۔ [3]

ایک دن آپؒ حمام کے کونے میں بیٹھے غسل فرمارہے تھے کہ ایک فوجی بھی نہانے کیلیے وہیں آگیا اور آپؒ کو اُس جگہ سے ہٹا کر خود نہانا شروع کردیا، بلکہ اس سے بھی بڑھ کر یہ کیا کہ آپؒ سے کہا: اے کالے! میرے سر پر پانی ڈال، آپؒ نے اُس کے سر پر پانی ڈالنا شروع کردیا۔ اتنے میں ایک اور شخص آیا جو آپؒ کو پہچانتا تھا، یہ حیرتناک منظر دیکھ کر اس نے چیخ ماری اور وہیں سے اونچی آواز میں کہا: اے فوجی! تو ہلاک وبرباد ہوگیا، کیا تُو رسول اللہ ﷺ کے صاحبزادے اور امام المسلمین سے خدمت لیتا ہے؟ یہ سنتے ہی فوجی آپؒ کے قدموں میں گرگیا اور پاؤں چومنے لگا اور

(۱) نور الأبصار، ص: ۲۱۱ مع اخبار الدُول، ص: ۳۴۴

(۲) آل البیت حول الرسول، ص: ۲۴۱

(۳) آل البیت حول الرسول، ص: ۲۴۴

عرض کی: حضرت! جب میں نے کہا تھا تو آپؒ نے انکار کیوں نہیں فرما دیا تھا۔ آپؒ نے فرمایا: إنّها لَمثوبۃ وما أَرَدْتُ أن أعصِیَکَ فِیما أُثاب علیہِ ''یہ تو ثواب کا کام ہے، میں نے نہیں چاہا کہ جس کام پر مجھے ثواب ملے اُس میں انکار کروں''، پھر فرمایا:

لَیسَ لِي ذَنبٌ وَلَا ذَنبَ لِمَن ... قَالَ لِي یَا عَبدُ أَو یَا أَسوَدُ

إِنَّمَا الذَّنبُ لِمَن أَلبَسَنِي ... ظُلمَہُ وَھُوَ الَّذِي لَا یُحمَدُ

اس میں نہ مَیں نے کوئی جرم کیا ہے اور نہ ہی اس شخص نے جس نے مجھے کہا ہے: اے غلام! یا اے کالے! مجرم تو وہ شخص ہے جس کے ظلم نے مجھے گھیر رکھا ہے، درحقیقت وہی شخص مذمت کے لائق ہے۔[1]

دنیا سے بے رغبتی:

زہد وقناعت تو اس خاندان کی فطرتِ ثانیہ تھے، اس مبارک ومطہر گھرانے کا ہر فرد ہی دنیا کی حقیقت سے کما حقہ واقف تھا اور اس کی رعنائیوں ورنگینیوں سے بے زار اور آخرت کا مشتاق تھا۔ حضرت امام علی رضاؒ کے افعال واقوال میں بھی صفتِ زہد نمایاں تھی، چناں چہ اُنہی کے چند اشعار، جو زُہد کا درس دیتے ہیں، درج ذیل ہیں:

کُلُّنَا یَأمَلُ مَدًّا فِي الأَجَلِ ... وَالمَنَایَا ھُنَّ آفَاتُ الأَمَلِ

لَا تَغُرَّنکَ أَبَاطِیلُ المُنَی ... وَالزَمِ القَصدَ وَدَعْ عَنکَ العِلَلِ

إِنَّمَا الدُّنیَا کَظِلٍّ زَائِلٍ ... حَلَّ فِیہِ رَاکِبٌ ثُمَّ ارتَحَلَ

۱۔ ہم میں سے ہر ایک لمبی عمر کا خواہشمند ہے، حالانکہ مَوت ان خواہشات وامیدوں پر اچانک آفت بن کر نازل ہوتی ہے۔

۲۔ تجھے دنیا کی جھوٹی آرزوئیں دھوکے میں نہ ڈالیں، تُو راہِ ہدایت اختیار کر اور اپنے عیبوں سے اب باز آ جا۔

۳۔ دنیا کی یہ زندگی تو کچھ بھی نہیں، بس اُس ڈھلتے ہوئے سائے کی طرح ہے جس کے نیچے مسافر تھوڑی دیر بیٹھ کر چل دیتا ہے۔[2]

---

(۱) نور الأبصار، ص: ۲۰۸ وأخبار الدُّول، ص: ۳۴۳

(۲) البدایۃ والنھایۃ طھجر: ۱۲۸/۱۴ وتھذیب الکمال في أسماء الرجال ۱۵۲/۲۱

آپ رحمہ اللہ کی عملی حیات میں بھی زہد کے آثار بالکل واضح تھے، چناں چہ آپ رحمہ اللہ کا کھجور کی چٹائی اور بکری کی کھال کو اپنی نشست گاہ بنانا جہاں آپ رحمہ اللہ کی تواضع کا پتا دیتا ہے وہیں دنیاوی ساز وسامان سے بے رغبتی کی خبر بھی دیتا ہے۔[1]

سخاوت:

آپ رحمہ اللہ اُن لوگوں میں سے تھے جو اللہ کے نام پر کھل کر خرچ کرتے ہیں اور فقراء وحاجتمندوں کی حاجات پوری کرنے میں اپنا مال لٹاتے ہیں۔ حتیٰ کہ ایک مرتبہ ''خُراسان'' میں قیام کے دوران آپ رحمہ اللہ نے اپنا سارا مال ہی خرچ کردیا تھا۔[2]

آپ رحمہ اللہ بہت زیادہ صدقہ وخیرات دیا کرتے تھے اور اکثر اندھیری راتوں میں دیتے (تاکہ اُس غریب شخص کی عزتِ نفس بھی مجروح نہ ہو اور آپ رحمہ اللہ کی نیکی بھی مخفی رہے)۔[3] بعض نے کہا ہے کہ آپ رحمہ اللہ نے اپنی حیاتِ طیبہ میں ایک ہزار غلام آزاد کیے۔[4]

آپ رحمہ اللہ کے پاس کسی برتن میں جب کھانا لایا جاتا تو اُس میں سے عمدہ اور اچھی چیز اٹھا کر غریب لوگوں کو بھجوا دیتے اور یہ آیات تلاوت فرماتے

{فَلَا اقْتَحَمَ الْعَقَبَةَ (۱۱) وَمَا أَدْرَاكَ مَا الْعَقَبَةُ (۱۲) فَكُّ رَقَبَةٍ (۱۳) أَوْ إِطْعَامٌ فِي يَوْمٍ ذِي مَسْغَبَةٍ (۱۴) يَتِيمًا ذَا مَقْرَبَةٍ (۱۵) أَوْ مِسْكِينًا ذَا مَتْرَبَةٍ (۱۶)} (البلد: ۱۱۔۱۶) (اِن آیات کا مفہوم یہ ہے کہ جنت میں داخل ہونے کے اعمال میں سے یہ ہے کہ آدمی غلام آزاد کرے یا کسی غریب ومسکین بھوکے شخص کو کھانا کھلا دے۔)

پھر فرماتے: اللہ کو پتا تھا کہ ہر شخص غلام آزاد نہیں کرسکے گا اس لیے اُس کے واسطے بھی جنت کا راستہ بتادیا۔[5]

ایک مرتبہ ایک شخص نے آکر آپ رحمہ اللہ کو سلام کیا اور کہا: میں آپ رحمہ اللہ اور آپ رحمہ اللہ کے آباء واجداد کے محبین میں سے ہوں اور حج سے واپس آرہا ہوں۔ میرا زادِراہ ختم ہوگیا ہے، اتنے پیسے بھی نہیں ہیں کہ گھر پہنچ سکوں۔ لہٰذا اگر آپ رحمہ اللہ میرے گھر

---

(۱) ینظر: آل البیت حول الرسول، ص: ۲۴۵ مع أخبار الدُّول، ص: ۳۴۴

(۲) آل البیت حول الرسول، ص: ۲۴۲

(۳) نور الأبصار، ص: ۲۱۱

(۴) الاتحاف بحب الأشراف، ص: ۳۱۲ و آل البیت حول الرسول، ص: ۲۴۴

(۵) آل البیت حول الرسول، ص: ۲۴۳

تک پہنچنے کا انتظام کردیں تو میں گھر پہنچ کر اتنی ہی رقم آپؒ کی طرف سے صدقہ کردوں گا (کیونکہ اُس زمانے میں اتنی دُور دراز سے رقم واپس پہنچانا کافی مشکل کام تھا)۔ آپؒ نے اس سے فرمایا: تشریف رکھیے۔ آپؒ اُس وقت لوگوں سے بات کررہے تھے، اپنی بات مکمل کی اور گھر تشریف لے گئے۔ پھر باہر آئے اور اس شخص سے کہا: خُذْ هٰذِهِ الْمِائَتَيْ دِينارٍ، وَاسْتَعِنْ بِها فِي مُؤْنَتِکَ ونَفَقَتِکَ، ولَا تَتَصَدَّقْ بِها عَنِّي ''یہ دوسو دینار (مساوی تقریباً ساڑھے ۷ لاکھ روپے) لے لو اور انہیں اپنے زادِراہ وغیرہ دیگر اخراجات میں استعمال کرو اور پھر میری طرف سے ان کو صدقہ بھی نہ کرنا''۔ وہ شخص خوشی خوشی لے کر چلا گیا۔ [1]

محمد بن یحییٰ فارسی کہتے ہیں کہ ابونُواس نے امام علی رضاؒ کو دیکھا کہ وہ اپنے ایک عمدہ خچر پر سوار، خلیفہ مامون الرشید کے پاس سے ہوکر آرہے تھے۔ یہ اُن کے قریب گئے، انہیں سلام کیا اور کہا: اے رسول اللہ کے صاحبزادے! میں نے آپ حضرات کی شانِ اقدس میں کچھ اشعار کہے ہیں، میں چاہتا ہوں کہ آپ وہ مجھ سے سنیں۔ آپؒ نے فرمایا: بولو۔ ابونُواس نے کہنا شروع کیا:

مُطَهَّرُونَ نَقِيَّـاتٌ ثِيَـابُهُم　　تَجْرِي الصَّلاةُ عَلَيهِم كُلَّمَا ذُكِرُوا

مَن لَم يَكُنْ عَلَوِيًّا حِينَ تَنسِبُه　　فَمَا لَه في قَدِيمِ الدَّهرِ مُفتَخَرُ

أُولئِکَ القَومُ أهلُ البَيتِ عِندَهُم　　عِلمُ الكِتابِ وَمَا جاءَتْ بِه السُّوَرُ

[وہ لوگ پاکیزہ ہستیاں ہیں اور اُن کے لباس بھی پاک وصاف ہیں، جب کبھی اُن کا تذکرہ کیا جاتا ہے تو (انبیاء کی طرح) اُن پر درود بھیجا جاتا ہے۔

اے مخاطب! جو شخص نسب میں ''علوی'' نہ ہو تو اس کو کسی زمانہ میں کوئی فخر حاصل نہیں رہا۔

یہ لوگ (جن کا تذکرہ ہورہا ہے) ''اہلِ بیت'' ہیں۔ یہ حضرات، کتابُ اللہ کے عالم ہیں اور مضامینِ قرآن پر بھی خوب دسترس رکھتے ہیں۔]

یہ سن کر آپؒ نے ابونُواس سے کہا: واقعی یہ اشعار تم سے پہلے کسی نے نہیں کہے۔ پھر آپؒ نے اپنے غلام سے پوچھا: ہمارے خرچہ کے علاوہ، اضافی کتنے پیسے تمہارے پاس رکھے ہیں؟ کہا: تین سو دینار (مساوی تقریباً ۵۶ لاکھ ۲۵ ہزار

(۱) آل البیت حول الرسول، ص: ۲۴۳

روپے)۔ فرمایا: یہ اس کو دے دو۔ پھر جب آپؒ گھر پہنچے تو غلام سے فرمایا: شاید وہ پیسے اُس کو کم معلوم ہوئے ہوں، جاؤ یہ خچر بھی اُسے دے آؤ۔[1]

دِعبل خُزاعی بھی ایک مشہور شاعر ہیں، وہ امام رِضاؒ کے پاس حاضرِ خدمت ہوئے جب کہ آپؒ مقامِ "مَرْو" پر قیام فرما تھے۔ اُس نے کہا: اے رسول اللہ کے صاحبزادے! میں نے آپ حضرات اہلِ بیت کے بارے میں ایک تعریفی قصیدہ کہا ہے اور میں نے عہد کر رکھا ہے کہ میں وہ قصیدہ کسی کو نہیں سناؤں گا، اور میں آپؒ کو سنانا چاہتا ہوں۔ آپؒ نے فرمایا: سناؤ۔ اُس نے قصیدہ شروع کیا:

ذَكَرتُ مَحَلَّ الرَّبعِ مِن عَرَفاتِ *** فَأَجرَيتُ دَمعَ العَينِ بِالعَبَراتِ

وفَلَّ عُرَى صَبرِي وهَاجَتْ صَبَابتي *** رُسُومُ دِيارٍ أَقْفَرَتْ وعَرَاتِ

مَدارسُ آياتٍ خَلَتْ عَن تِلاوة *** ومَنزِلُ وَحيٍ مُقفِرُ العَرَصاتِ

لِآلِ رَسُولِ الله الخَيفُ مِن مِنىً *** وبالبَيتِ والتعريفِ والجَمَراتِ

دِيارُ عَليٍ والحُسينِ وجَعفرٍ *** وحمزةَ والسَّجادِ ذِي الثَّفِناتِ

دِيارُ لِعبدِ الله والفَضلُ صِنوُه *** نَجيِّ رسولِ الله في الخَلَوات

منازِلُ كانتْ لِلصَلاةِ ولِلتقَى *** ولِلصَّومِ والتطهيرِ والحَسَناتِ

منازِلُ جِبريلُ الأمينُ يحِلُّها *** مِن الله بالتسليمِ والرَّحمَات

مَنازِلُ وَحيِ الله مَعدِنُ عِلمِه *** سَبيلُ رَشادٍ واضحِ الطُّرُقات

قِفَا نَسأَلِ الدارَ الَّتي خَفَّ أَهلُها *** مَتى عَهدُها بالصَّوم والصلَوات

وأينَ الأولى شَطَّتْ بهم غُربةُ النَّوَىٰ *** فَأَمسَينَ في الأقطار مُتفرِقات

أُحِبُّ فَضاءَ الدارِ مِن أَجلِ حُبِّهِم *** وأَهجُرُ فيهم أُسرَتي وثِقاتي

وهُم آلُ مِيراثِ النبيِّ إذَا انتَمَوا *** وهُم خَيرُ ساداتٍ وخَيرُ حُماة

مَطاعِيمُ في الإعسارِ في كُلِّ مَشهَدٍ *** لَقد شَرُفُوا بالفضلِ والبركات

---

[1] الفصول المهمة، ص:٢٣٧ ونور الأبصار، ص:٢٠٨ والاتحاف بحب الأشراف، ص:٣٢٠

أئمــةُ عَدلٍ يُقتــدى بفعــالهم *** وتُؤمَنُ منهم زَلّةُ العَثـرات

فيـا ربِّ زِدْ قَلبي هُدىً وبَصيرةً *** وزِدْ حُبَّهم يـا ربِّ في حَسنـاتي

ـــ أَمِنَتْ نَفسي بِهم في حياتها *** وإنّي لَأَرجُو الأَمْنَ بَعدَ وفاتي

أَلم تَرَ أنّي مِن ثَلاثين حِجـةً *** أرُوحُ وأغْـدُو دائمَ الحَسَـرات

أرىٰ فَيئَهُمْ في غيرِهم مُتَقَسَّمـا *** وأَيدِيهم مِن فَيئِهِمْ صِفُـرات

وإذا وُتِرُوا مَدُّوا إلىٰ أهـلِ وَتْرِهم *** أكفّـا عَن الأوتارِ مُنقَبِضـات

وآلُ رسـولِ الله نُحِفٌ جُسـومُهم *** وآلُ زِيادٍ أغلَظُ القَصَـرات

سأَبكِيهم ما ذَرَّ في الأُفقِ شارِقٌ *** ونادىٰ مُنادِي الخيرِ بالصَّلَوات

ومـا طَلَعَتْ شمسٌ وحَانَ غُروبهـا *** وباللّيلِ أَبكِيهم وبِالغَدَوات

دِيـارُ رسـولِ الله أَصبَحْنَ بَلْقَعـا *** وآلُ زيادٍ تَسكُنُ الحُجُرات

وآلُ زيـادٍ في القُصُـورِ مَصُـونةٌ *** وآلُ رسـولِ الله في الفَلَـوات

فَلَو لا الذي أَرجُوه في اليوم أو غَدٍ *** لَقَطَّعَ نَفسي إثْرَهم حَسَراتي

خـروجُ إمـامٍ لا مَحَـالَةَ خـارجٌ *** يَقُومُ عَلىٰ اِسمِ الله بِالبَـرَكات

يمَيِّـزُ فِينـا كُلَّ حقٍّ وباطـلٍ *** ويجْزِيْ عَلَى النَّعمَـاءِ والنِّقَمات

فَيـا نَفسُ طِيبي ثُمّ يا نفسُ فاصْبِري *** فَغيرُ بَعِيدٍ كُلُّ مَا هُوَ آت

۱- مجھے عرفات کے مکانات کی یاد نے تڑپایا تو میری آنکھ سے آنسوؤں کی لڑی بندھ گئی۔

۲- میرے صبر کا کنارہ ٹوٹ گیا اور ویران گھروں اور صحنوں کے آثار ونشانات نے میرے عشق کو بھڑکایا۔

۳- قرآنِ پاک کے مدارس تلاوت سے خالی ہو گئے اور جہاں کسی زمانہ میں وحی اترا کرتی تھی آج وہ جگہ ویران میدانوں کی شکل اختیار کر چکی ہے۔

۴،۵،۶۔ آلِ رسول جیسے حضرت علیؓ، حضرت حسینؓ، حضرت جعفرؓ، حضرت حمزہؓ، حضرت زین العابدینؒ (کثرتِ سجود سے جن کے سجدے والے اعضاء سخت ہو گئے تھے اور ''سجاد'' کے لقب سے معروف تھے)، حضرت

عبداللہ بن عباسؓ وغیرہ کے مکانات مقامِ خیف، بیت اللہ، عرفات اور جمرات (کے قرب وجوار) میں واقع ہیں (اور یہ سب مبارک مکانات اب ویران ہو چکے ہیں)۔ اور اہلِ بیت میں سے حضرت فضلؓ۔ جو حضرت عبداللہ بن عباس کے بھائی تھے۔ کو یہ مقام بھی حاصل تھا کہ وہ رسول اللہ ﷺ سے خلوتوں میں سرگوشی کیا کرتے تھے۔

۹،۸،۷۔ یہ وہ گھر تھے جو نماز و روزہ، تقویٰ وطہارت اور اعمالِ صالحہ کا مرکز تھے، اور یہ ایسے مقامات تھے جہاں جبریل امین اللہ کی طرف سے سلامتی ورحمتیں لے کر اترا کرتے تھے اور یہ گھر اللہ تعالیٰ کی وحی کی جائے نزول، اس کے علم کے سرچشمے، اور بالکل واضح راستوں والی بھلائی کی شاہراہ تھے۔

۱۰۔ (اے میرے دوستو!) ٹھہرو، ذرا ان گھروں سے پوچھتے ہیں، جن کے مکین کوچ کر چکے ہیں، کہ یہ پھر کب روزے اور نمازوں سے آباد ہوں گے؟

۱۱۔ کہاں ہیں وہ (عالی صفت) خواتین جو اپنے دیس سے بہت دُور چلی گئیں اور دنیا کے مختلف کونوں میں الگ الگ جا بسیں۔

۱۲۔ مجھے ان گھروں کی فضا اس لیے محبوب ہے کہ ان کے بسنے والے دراصل میرے دل میں بستے تھے اور میں ان عظیم ہستیوں کے معاملہ میں اپنے اہل وعیال اور خاص دوستوں تک کو پیچھے چھوڑ دیتا ہوں۔

۱۳۔ جب ان کی نسبت بیان کی جاتی ہے تو یہ حضرات، میراثِ نبی (یعنی علومِ نبویہ جو کہ درحقیقت نبی کی میراث ہیں) کے اہل ٹھہرتے ہیں، اور یہ بہترین رہنما اور عظیم محافظِ دین ہیں۔

۱۴۔ خود تنگیوں میں ہونے کے باوجود بھی ہر مجلس میں لوگوں کو کھانا کھلاتے ہیں، بلاشبہ فضل وبرکات کا شرف انہی کے دامن میں ہے۔

۱۵۔ یہ عدل وانصاف کے ایسے امام ہیں کہ ان کے افعال کی اقتداء کی جاتی ہے اور غلطیوں ولغزشوں سے یہ بچ بچ کے چلتے ہیں۔

۱۶۔ اے میرے رب! میرے دل کی ہدایت وبصیرت میں اضافہ فرما (کہ میں ان کے اعلیٰ مقام کو پہچان سکوں)، اور ان سے میری محبت کی وجہ سے، میری نیکیوں میں خوب زیادتی فرما۔

۱۷۔ میرا دل اپنی زندگی میں ان حضرات سے مطمئن ہے، اور میں اس بات کا امیدوار ہوں کہ مرنے کے بعد بھی میں امن و اطمینان میں ہوں گا۔

۱۸۔ (اے مخاطب!) کیا تم مجھے نہیں دیکھتے کہ میں تیس سال سے ان حضرات اہل بیت کے پاس صبح و شام آرہا ہوں اور (ان کے اوصاف دیکھ کر) مسلسل رشک و حسرت کی کیفیت میں رہتا ہوں۔

۱۹۔ میں دیکھتا ہوں کہ (ان کی سخاوت کی وجہ سے) ان کا مال دوسرے لوگوں میں تقسیم ہو جاتا ہے، اور ان کے ہاتھ اپنے ہی مال سے خالی ہوتے ہیں۔

۲۰۔ جب ان کو تکلیف پہنچائی جاتی ہے تو یہ ان ایذاء رسانیوں کے بدلہ میں اُن تکلیف دینے والوں کو (حسن خلق کی بناء پر، اپنے اموال میں سے بطورِ عطیہ و ہبہ) مٹھیاں بھر بھر کر دیتے ہیں۔

۲۱۔ آلِ رسول کے جسم کمزور پڑ چکے جبکہ آلِ زیاد کی گردنیں موٹی ہو چکی ہیں۔

۲۲، ۲۳۔ جب تک سورج کی کرنیں آسمان کے کناروں پہ پڑتی رہیں گی، خیر کا منادی نمازوں کی طرف بلاتا رہے گا، اور سورج طلوع و غروب ہوتا رہے گا میں ان حضرات کی یاد میں روتا رہوں گا۔ غرض دن ہو چاہے رات، میں ان کی یاد میں روتا رہوں گا۔

۲۴۔ رسول اللہ ﷺ (کی آل) کے مکانات ویران ہو گئے جبکہ آلِ زیاد سکون سے گھروں میں رہ رہے ہیں۔

۲۵۔ آلِ زیاد محفوظ محلات میں زندگی گزار رہے ہیں جبکہ آلِ رسول بیابانوں میں ہیں۔

۲۶۔ اگر اُس ہستی نے نہ آنا ہوتا جس کی میں آج یا کل امید لگائے بیٹھا ہوں، تو ان حضرات کے پیچھے حسرت و افسوس سے میری جان نکل جاتی۔

۲۷۔ یعنی مجھے اُس امام کے آنے کی امید ہے جو بہر صورت تشریف لائیں گے (یعنی امام مہدیؒ)، جو برکتوں و رحمتوں کے ساتھ اللہ کے نام پر اٹھ کھڑے ہوں گے۔

۲۸۔ جو ہمارے درمیان ہر حق و باطل کو جدا کر دیں گے، اور نیک لوگوں کو انعامات اور برے لوگوں کو سزائیں دیں گے۔

۲۹۔ بس اے دل! خوش ہو جا، اور اے دل! ذرا صبر کر، کہ جس چیز نے آنا ہے اب وہ کچھ دُور نہیں رہی۔

یہ دراصل ایک لمبا قصیدہ ہے جس کے ایک سو بیس (۱۲۰) اشعار ہیں۔ [۱]

جب دِعبل یہ پورا قصیدہ سنا کر فارغ ہوا تو امام علی رِضاؒ اٹھے اور فرمایا: ٹھہرو، جانا نہیں۔ اس کے بعد اپنے غلام کے ہاتھوں اسے ایک تھیلی بھجوادی جس میں سو دینار (مساوی تقریباً پونے انیس لاکھ روپے) تھے اور ساتھ ہی اُن سے معذرت بھی کی (کہ تمہارا حق نہیں ادا ہوسکا)۔ مگر دِعبل نے یہ کہہ کر وہ تھیلی واپس کردی کہ: واللہ! میں اس غرض کیلیے نہیں آیا تھا، میں تو صرف اُن کی خدمت میں سلام عرض کرنے آیا تھا اور یہ غرض پیش نظر تھی کہ اس بہانے اُن کے مبارک چہرے کی زیارت کر آؤں گا۔ مجھے اس تھیلی کی ضرورت نہیں ہے، البتہ اگر تبرک کیلیے وہ مجھے اپنا کوئی لباس دے دیں تو اس سے مجھے بہت خوشی ہوگی۔ چناں چہ آپؒ نے اسے اپنا جُبّہ دیا اور ساتھ ہی وہ تھیلی بھی واپس فرمادی اور غلام سے کہا: قُلْ لَهُ خذها وَلاتَرُدَّهَا فَإنَّكَ ستَصْرِفها أحْوَجَ مَاتَكُونُ إلَيْهَا ''اسے کہنا کہ یہ تھیلی رکھ لو، اور اب واپس نہ کرنا، ان دیناروں کو تم اس وقت خرچ کرسکو گے جب تمہیں ان کی بہت ضرورت ہوگی''۔ بالآخر دعبل نے وہ دونوں چیزیں (جبہ اور تھیلی) لے لیں۔

اس کے بعد دعبل ایک مدت تک ''مَرْو'' میں قیام پذیر رہا، پھر ایک قافلہ عراق جانے کیلیے تیار ہوا تو دعبل بھی اس کے ساتھ جانے کیلیے تیار ہوگیا۔ لیکن ہوا یہ کہ راستے میں ڈاکوؤں نے اس قافلہ کو روک لیا اور سارا قافلہ لوٹ لیا اور کچھ لوگوں کو پکڑ بھی لیا، جن میں دعبل بھی تھا۔ ڈاکوؤں نے ان کے ہاتھ پیچھے کی طرف رسی سے باندھ دیے اور جو کچھ ان کے پاس تھا وہ سب لے لیا اور ان کو ایک طرف لے گئے پھر لوٹے ہوئے اموال آپس میں تقسیم کرنے بیٹھ گئے۔ ان کے سردار نے اس وقت یہ شعر پڑھا:

أرىٰ فَيْـأهُمْ فِي غيرِهِم مُتَقَسَّمًا *** وأيدِيَهم مِن فَيْـئِهِمْ صِفْـرات

(میں دیکھتا ہوں کہ ان کا مال دوسرے لوگوں میں تقسیم ہوجاتا ہے، اور اُن کے ہاتھ اپنے ہی مال سے خالی ہوتے ہیں)

دعبل یہ شعر سن رہا تھا، اِس نے کہا: تمہیں معلوم ہے کہ یہ شعر کس کا ہے؟ اُس سردار نے کہا: مجھے کیسے معلوم نہیں ہے؟ یہ قبیلہ خُزاعہ کے ''دِعبل'' نامی ایک شخص کا ہے جسے اہلِ بیت کا شاعر کہا جاتا ہے۔ اُس نے اہلِ بیت کی مدح میں

---

(۱) فائدہ: ''الاتحاف'' کے حاشیہ میں ایک سو بیس اشعار پر مشتمل یہ مکمل قصیدہ منقول ہے اور قصیدہ کے آخر میں مشکل الفاظ کے معانی بھی ذکر کردیے گئے ہیں، اصحابِ ذوق اس کی طرف مراجعت کرسکتے ہیں، ملاحظہ ہو: [الاتحاف بحب الأشراف، ص: ۳۲۳-۳۳۵

ایک قصیدہ کہا تھا یہ شعر اُسی قصیدے کا ہے۔ دعبل نے کہا: واللہ! میں وہی دعبل ہوں، یہ قصیدہ میرا ہے اور میں نے لکھا ہے۔ یہ سن کر اُس نے کہا: ہوش کر، دیکھ، کیا کہہ رہا ہے؟ اس نے کہا: واللہ! یہ بات تو کہیں زیادہ مشہور ہے، آپ ان قافلہ والوں سے بھی پوچھنا چاہیں تو پوچھ سکتے ہیں۔ اور جن لوگوں کو آپ نے پکڑ رکھا ہے یہ بھی آپ کو بتادیں گے۔ اُن ڈاکوؤں نے اِن سے پوچھا تو ان سب نے کہا: یہ دعبل خزاعی ہے اور اہل بیت کا مشہور و معروف شاعر ہے۔ پھر دعبل نے ان کو از اول تا آخر سارا قصیدہ اسی وقت زبانی سنادیا۔

وہ کہنے لگے: اے شاعرِ اہلِ بیت! تمہارے حق کی قدر دانی ہمارے اوپر واجب ہوگئی ہے۔ لو، تمہارے اکرام میں، ہم نے یہ سارا قافلہ چھوڑ دیا اور ان کا لوٹا ہوا سارا مال بھی واپس کر دیا۔

اہلِ قافلہ کو تو انہوں نے چھوڑ دیا لیکن دعبل کو وہ اپنے ساتھ "قُم" (ایک شہر کا نام ہے) لے گئے، وہاں جا کر انہوں نے اموال و تحائف کے ذریعہ دعبل کا خوب اکرام کیا، البتہ اس کے ساتھ ساتھ انہوں نے دعبل سے اس بات کا مطالبہ کیا کہ وہ امام علی رضاؒ کا عطا کردہ جبہ انہیں بیچ دیں، اس کے بدلہ میں وہ انہیں ہزار دینار (مساوی ایک کروڑ ۸۷ لاکھ ۵۰ ہزار روپے) دینے کیلیے تیار ہیں مگر دعبل وہ دینے پر تیار نہ ہوئے اور کہا: وَ اللہِ! لَا أَبِيعُهَا وَ إِنَّمَا أَخَذْتُهَا لِلتَّبَرُّكِ مِنْ أَثَرِهِ. "واللہ! میں اس جبہ کو ہرگز نہیں بیچ سکتا، میں نے تو اُن سے یہ جبہ برکت کیلیے لیا تھا"۔ پھر تین دن بعد دعبل وہاں سے روانہ ہوگئے، جب شہر سے نکل کر تین میل کے فاصلہ تک پہنچے تو اُن کے نوجوان لڑکوں نے ڈاکا ڈال کر وہ جبہ چھین لیا۔ دعبل واپس "قُم" آگئے اور ان کے بڑوں کو یہ سارا قصہ سنایا تو انہوں نے وہ جبہ واپس دِلوا دیا البتہ ساتھ یہ بھی کہا کہ ہمیں اس بات کا ڈر ہے کہ یہ جبہ ہمارے علاوہ کوئی اور آپ سے چھین لے گا پھر تمہیں واپس بھی نہیں مل سکے گا، اس لیے ہم تمہیں اللہ کا واسطہ دے کر کہتے ہیں کہ تم اس کے بدلے ہزار دینار لے لو اور اسے ہمارے پاس چھوڑ دو۔ بالآخر دعبل نے ان سے ہزار دینار لے لیے اور جبہ انہیں دے کر قم سے روانہ ہوگئے۔[1]

مہمان نوازی:

آپؒ اپنے مہمانوں کا خوب اِکرام اور اُن کی اعلیٰ و عمدہ مہمان نوازی کرتے تھے۔ مہمان کو ہر طرح کی راحت پہنچانے میں کوشاں رہتے اور اُس کو کسی قسم کا کوئی کام نہ کرنے دیتے تا کہ اس کی خدمت کا حق ادا ہو سکے۔ ایک رات

(1) نور الأبصار، ص: ۲۰۹ مع الاتحاف بحب الأشراف، ص: ۳۲۱ والفصول المهمة، ص: ۲۳۸

آپؒ کے پاس مہمان آیا، آپؒ اُس کے ساتھ باتیں کر رہے تھے کہ اس دوران چراغ کو کچھ ہونے لگا۔ وہ مہمان اس چراغ کو درست کرنے کیلیے اٹھنے لگا تو آپؒ تیزی سے اٹھے اور جلدی سے خود ہی جا کر اُسے ٹھیک کر دیا، پھر مہمان سے فرمایا: إِنَّا قَوْمٌ لَا نَسْتَخْدِمُ أَضْيَافَنَا ''ہم لوگ اپنے مہمانوں سے خدمت نہیں لیا کرتے''۔[1]

کرامات:

آپؒ اللہ تعالیٰ کے ولیٔ مقرب بلکہ اولیاء اللہ کے امام و پیشوا تھے۔ اللہ تعالیٰ کی رحمت و توفیق سے آپؒ سے کئی کرامتوں کا ظہور ہوا، جن میں سے چند درج ذیل ہیں:

(۱) مامون الرشید نے جب آپؒ کو ولی عہد بنایا (یعنی اپنے بعد آپؒ کو اپنا خلیفہ مقرر کیا)، تو مامون کے دائیں بائیں رہنے والے لوگوں میں سے کچھ کو یہ فیصلہ ناگوار گزرا اور ان لوگوں کو یہ اندیشہ ہوا کہ خلافت بنو عباس سے نکل کر بنو فاطمہ میں منتقل ہو جائے گی، چناں چہ انہیں آپؒ کی ذات سے نفرت سی ہوگئی۔

دستور یہ تھا کہ جب امام رضاؒ مامون کے پاس آتے تو دربان اور دیگر حشم و خدم فوراً اٹھ کر سلام کرتے اور دروازے کے سامنے والا پردہ ہٹا دیتے اور آپؒ اندر داخل ہو جاتے، لیکن جب اُن لوگوں کے دل آپؒ سے بیزار ہو گئے تو آپس میں گٹھ جوڑ کر کے ایک دوسرے کو کہنے لگے کہ آج کے بعد جب علی رضا آئیں گے تو نہ ہم ان کیلیے کھڑے ہوں گے اور نہ پردہ ہٹائیں گے۔

حسبِ سابق جب آپؒ تشریف لائے تو اُن سے رہا نہ گیا، اٹھے، سلام کیا اور پہلے کی طرح سامنے سے پردہ ہٹا دیا۔ جب آپؒ اندر چلے گئے تو یہ سب ایک دوسرے کو اس عمل پر ملامت کرنے لگے اور کہا: اس کے بعد اگر وہ آئے تو ہم بالکل پردہ نہیں ہٹائیں گے۔

پھر جب اگلا دن ہوا اور آپؒ تشریف لائے تو یہ لوگ اٹھے اور سلام بھی کیا لیکن اس دفعہ پردہ نہیں ہٹایا، بس ایک طرف کھڑے رہے۔ جب آپؒ دروازے کے قریب آئے تو یکایک ہوا کا ایک جھونکا آیا جس نے پردہ اُس سے بھی زیادہ ہٹا دیا جتنا پہلے ہٹایا جاتا تھا اور آپؒ اندر تشریف لے آئے، پھر جب باہر جانے کا وقت آیا تو دوسری جانب سے پھر ہوا کا ایک زوردار جھونکا آیا جس نے آپؒ کے سامنے سے پردہ ہٹا دیا اور آپؒ باہر تشریف لے گئے۔ یہ منظر دیکھ

---

(۱) آل البیت حول الرسول، ص: ۲۴۴

کر سارے ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے اور کہنے لگے: إِنَّ لِهٰذَا الرَّجُلِ عِنْدَ اللّٰهِ مَنْزِلَةٌ وَلَهُ مِنْهُ عِنَايَةٌ، ارْجِعُوا إِلٰى مَا كُنْتُمْ عَلَيْهِ مِنْ خِدْمَتِهِ فَهُوَ خَيْرٌ لَكُمْ ''بلاشبہ اس شخص کا اللہ کے ہاں کوئی خاص مقام ومرتبہ ہے، اور اللہ کی ان پر کوئی خصوصی عنایت ورحمت ہے، لہٰذا آج سے آئندہ ان کی ایسے ہی خدمت کیا کرو جیسے پہلے کیا کرتے تھے، یہی تمہارے لیے بہتر ہے''۔[1]

(۲) ایک دفعہ آپؒ ایک ایسی جگہ تشریف لے گئے جہاں ہر طرف درندے ہی درندے تھے، آپؒ ان کے درمیان چلتے پھرتے رہے مگر کسی درندے نے آپؒ کو کچھ نہیں کہا بلکہ آپؒ کو دیکھ کر وہ سب اپنی دُموں کے بل وہیں زمین پر بیٹھ گئے۔ آپؒ فرداً فرداً ان میں سے ہر ایک کے پاس گئے، حیرت کی بات یہ ہے کہ جب آپؒ ان میں سے کسی کے پاس جاتے تو وہ آپؒ کو دیکھ کر ایسے دم ہلانے لگتا جیسے پالتو جانور اپنے مالک کو دیکھ کر دُم ہلاتا ہے۔[2]

فائدہ: ان کے علاوہ اور بھی کئی کرامات ہیں جو مختلف کتب میں درج ہیں۔[3]

---

(۱) ينظر: الفصول المهمة، ص: ۲۳۴ ونور الأبصار، ص: ۲۱۶ ومطالب السؤول، ص: ۲۹۶ والاتحاف بحب الأشراف، ص: ۳۱۳ و[أخبار الدُّول، ص: ۳۴۱

(۲) مستفاد من مطالب السؤول، ص: ۲۹۷، بنوع من التلخيص

(۳) مزید کرامات کیلیے درج ذیل کتب ملاحظہ ہوں:

نور الأبصار، ص: ۲۱۶ والاتحاف بحب الأشراف، ص: ۳۱۳ وآل البيت حول الرسول، ص: ۲۴۴ وأخبار الدُّول، ص: ۳۴۱

(۸) حضرت امام محمد تقی جوّاد سلام اللہ و رحمۃ علیہ

(محمد بن علی)

نام و نسب:

آپ سلام اللہ و رحمۃ علیہ، کا نام ''محمد'' تھا، اور امام علی رضاؒ کے صاحبزادے تھے۔ کنیت ''ابوجعفر'' تھی، چونکہ آپؒ کے آبائی سلسلۂ نسب میں امام باقرؒ کی کنیت بھی ''ابوجعفر'' تھی اس لیے آپؒ کو ابوجعفر ثانی کہا جاتا ہے۔[۱] آپؒ کے کئی القابات تھے جو آپؒ کے اوصاف و کمالات کے ترجمان اور فضائل و خصائل کا مظہر تھے، جیسے ''تقی'' (متقی و پرہیزگار)، ''جوّاد'' (بہت سخی)، ''قانع'' (قناعت پسند یعنی تھوڑے پر صبر و شکر کرنے والا) اور ''مرتضیٰ'' (محبوب شخص)، مگر ان میں سے دو القاب ''تقی'' اور ''جوّاد'' زیادہ مشہور تھے، پہلے لقب کی نسبت سے ''امام محمد تقی'' اور دوسرے کے لحاظ سے ''امام محمد جواد'' کہلاتے تھے۔ البتہ عموماً، آپؒ کا تذکرہ عوام الناس میں ''امام تقی'' اور مصنفین کے ہاں ''امام جواد'' سے کیا جاتا ہے۔[۲]

آپؒ کی والدہ ماجدہ باندی تھیں، جن کا نام ''خیزران'' تھا،[۳] بعض نے ''سکینہ'' لکھا ہے۔[۴]

ولادت و مسکن:

آپؒ کے والد امام علی رضاؒ کی چالیس برس سے زائد عمر بیت چکی تھی مگر کوئی اولاد نہیں ہوئی تھی، آخر اللہ تبارک وتعالیٰ نے اس مبارک بچے کی پیدائش کے ذریعے اُن کی آنکھیں ٹھنڈی فرمائیں، آپ کی پیدائش پر سب اتنے خوش ہوئے جس کی کوئی مثال نہیں۔[۵]

---

(۱)[تاریخ الخمیس في أحوال أنفس النفیس ۲/۲۸۷

(۲)ینظر: [النبراس، ص: ۱۳ ۳امع تاریخ الخمیس ۲/۲۸۷ والوافي بالوفیات ۴/۷۹

(۳)تاریخ الخمیس في أحوال أنفس النفیس: ۲/۲۸۷

(۴) [تذکرة الخواص، ص: ۳۲۱ والفصول المهمة، ص: ۲۵۳ ومع طالب السؤول، ص: ۳۰۳

(۵)آل البیت حول الرسول، ص: ۲۵۱

آپؒ ۵ / رمضان المبارک، بروز منگل، سن ۱۹۵ھ میں پیدا ہوئے۔[1]

آپؒ کی پیدائش مدینہ طیبہ میں ہوئی تھی، لیکن بعد میں اپنے والد امام علی رضاؒ کے ساتھ بغداد منتقل ہو گئے تھے، والد کے انتقال کے بعد بھی وہیں بغداد رہے، اور وہیں خلیفہ مامون الرشید عباسی کی صاحبزادی (ام الفضل) سے شادی ہوئی۔ شادی کے بعد آپؒ اہلیہ کے ساتھ مدینہ طیبہ آ کر آباد ہو گئے۔ آخر عمر میں اہلیہ کے ساتھ بغداد تشریف لے گئے تو وہیں انتقال ہو گیا (تفصیل آگے آ رہی ہے)۔[2]

بچپن اور فہم و دانشوری:

آپؒ کے والدِ ماجد کی وفات کے ایک سال بعد کا واقعہ ہے- جب کہ آپؒ کی عمر نو برس تھی- کہ آپؒ بغداد کی گلیوں میں اُن بچوں کے پاس کھڑے تھے جو کھیل رہے تھے، اتنے میں مامون الرشید وہاں سے گزرا اور سب بچے دائیں بائیں بھاگ گئے مگر آپؒ سکون سے وہیں ٹھہرے رہے۔ یہ دیکھ کر مامون نے آپؒ سے پوچھا: یَا غُلَام! مَا مَنَعَکَ مِنَ الِانْصِرَافِ؟ "بچے! تم کس وجہ سے نہیں گئے؟" آپؒ نے بغیر ہچکچائے کہا: امیر المومنین! راستہ تنگ نہیں تھا کہ میں آپ کیلیے جگہ چھوڑتا، میں نے کوئی جرم بھی نہیں کر رکھا کہ آپ سے ڈرتا اور آپ امیر المومنین ہیں، ہم آپ کے ساتھ اچھا گمان رکھتے ہیں کہ آپ بے قصور آدمی کو کچھ نہیں کہتے۔ مامون آپؒ کی یہ فہیمانہ گفتگو سن کر بہت متاثر ہوا۔ کہنے لگا: تمہارا نام کیا ہے اور کس کے صاحبزادے ہو؟ آپؒ نے فرمایا: میں محمد بن علی رِضا ہوں۔ مامون نے کہا: اللہ تعالیٰ آپؒ کے والد پر رحمتیں نازل فرمائے۔ یہ دُعا دے کر مامون نے گھوڑے کو ایڑ لگائی اور چل دیا۔ دراصل مامون اس وقت شکار کیلیے نکلا تھا اور اس کے پاس چند شکاری باز بھی تھے۔ جب وہ آبادی سے ذرا باہر نکلا تو اُس نے ان میں سے ایک باز کو تیتر پر چھوڑا۔ باز ہَوا میں اُڑا اور دیکھتے ہی دیکھتے آنکھوں سے اوجھل ہو گیا۔ پھر کچھ ہی دیر بعد فضا میں اڑتا ہوا واپس آ گیا، لیکن حیران کن بات یہ تھی کہ اُس نے چونچ میں ایک چھوٹی سی مچھلی پکڑ رکھی تھی اور وہ بھی زندہ!!!

---

(۱) [وفیات الأعیان ۴/۱۷۵ والشذرات الذهبية، ص: ۱۰۴

ملحوظة: ذکر البعض غيرَ ما أثبتناه من تاريخ الولادة، إن شئت فراجع: [تاريخ الخميس ۲/۲۸۷ والفصول المهمة، ص: ۲۵۴ ومطالب السؤول، ص: ۳۰۳ وتجدفي كل منهاما يخالف الآخر.

(۲) ينظر: [الأعلام للزركلي ۶/۲۷۲ وأحداث التاريخ الإسلامي بترتيب السنين ۱/۱۱۲۹

یہ ماجرا دیکھ کر مامون کو نہایت تعجب ہوا کہ ہوا میں مچھلی کہاں سے آ گئی؟۔ بہر حال اُس نے وہ مچھلی ہاتھ میں لی اور اسی ادھیڑ بُن میں شکار کا ارادہ ترک کر کے جس راستے سے آیا تھا اُسی راستے سے واپس گھر چل دیا۔ جب اُسی جگہ پہنچا تو دیکھا کہ بچے اُسی طرح کھیل رہے ہیں اور ''محمد'' بھی ان کے پاس کھڑا ہے۔ حسبِ سابق ''محمد'' کے علاوہ سب بچے بھاگ گئے۔ مامون ''محمد'' کے قریب آیا اور آپؒ سے امتحان لیتے ہوئے کہا: بتاؤ، میرے ہاتھ میں کیا ہے؟ اللہ تعالی نے اُسی وقت آپؒ کے دل پر الہام کیا، آپؒ نے کہا: امیر المومنین! بات یہ ہے کہ اللہ تعالی نے اپنی مشیت سے اپنی قدرت کے سمندر میں چھوٹی چھوٹی مچھلیاں پیدا کی ہیں جنہیں خلفاء و بادشاہوں کے باز شکار کرتے ہیں پھر وہ بادشاہ ان کے ذریعے آلِ رسول کا امتحان لیتے ہیں اور اللہ تعالی (صحیح جواب کا الہام کر کے) ان آلِ رسول کو عزت سے سرفراز فرماتا ہے۔

مامون آپؒ کا یہ جواب سُن کر پہلے سے زیادہ متاثر و حیران ہوا، اور آپؒ سے کہا: أَنْتَ ابْنُ الرِّضَا حَقًّا وَمِنْ بَيْتِ الْمُصْطَفٰى صِدْقًا ''آپؒ اپنے والد امام رضاؒ کے حقیقی جانشین ہیں اور واقعی آپؒ خاندانِ نبوت کے چشم و چراغ ہیں''۔ اور پھر اُس نے آپؒ کو اپنے ساتھ لے لیا اور آپؒ کا حد سے زیادہ اعزاز و اکرام کیا۔ [1]

حلیہ مبارک:

آپؒ حسین و جمیل اور وجیہ شخصیت کے مالک تھے۔ آپؒ کا رنگ گورا سفید، اور قد معتدل تھا، نہ لمبا تھا نہ چھوٹا۔ [2]

شادی:

جب امام جواد سلامُ اللہ وَ رَحمۃُ علیہ، نے اس طرح بحسن و خوبی علمی دلائل سے لبریز جوابات دے دیے اور حاضرینِ مجلس بھی آپؒ کے علم وادب اور فضل و کمال کا مشاہدہ کر چکے تو خلیفہ مامون الرشید نے کہا: الحمد للہ! اللہ تعالی نے مجھے اپنی بیٹی کے نکاح کے معاملہ میں صحیح فیصلہ ہی سجھایا تھا۔ پھر امام جوادؒ کی طرف متوجہ ہو کر کہا: إِنِّي مُزَوِّجُكَ ابْنَتِي أُمَّ الْفَضْلِ، وَإِنْ رَغَمَ لِذٰلِكَ أُنُوْفُ قَوْمٍ ''میں اپنی بیٹی ام الفضل کا آپ سے نکاح کرنے لگا ہوں، اگرچہ میری قوم کو یہ ناپسند ہی کیوں نہ ہو''۔ اِس کے بعد اُسی مجلس میں نکاح کر دیا۔ اور حضرت فاطمۃ الزہراءؓ کے حق مہر کے

---

(۱) مستفاد من مجموعة: الصواعق المحرقة: ۲/۵۹۶ والاتحاف بحب الأشراف، ص: ۳۵۰ ومطالب السؤول، ص: ۳۰۴ ونور الأبصار، ص: ۲۱۹

(۲) اخبار الدول وآثار الأول، ص: ۳۴۶ والفصول المهمة، ص: ۲۵۴ ونور الأبصار، ص: ۲۱۹

برابر (۵۰۰ درہم یعنی ایک سو، ۳۱ تولے، ۳ ماشے چاندی) مہر مقرر ہوا۔ نکاح ہو چکنے کے بعد عرقِ گلاب اور نہایت عمدہ قسم کی خوشبوئیں لائی گئیں، تمام حاضرینِ مجلس نے وہ خوشبوئیں استعمال کیں۔ پھر دسترخوان لگائے گئے جس میں میٹھی ڈش بطورِ خاص پیش کی گئی، چناں چہ لوگوں نے کھانا تناول کیا اور آخر میں حاضرین مجلس کو ان کے مراتب کے لحاظ سے ہدایا وتحائف سے نوازا گیا۔ اس کے علاوہ مامون نے فقراء ومساکین، صوفیاء واولیاء، اور طلباء وعلماء کی بھی صدقات وعطیات سے خدمت کی۔

امام جواد سَلامُ اللہِ وَ رَحمَۃُ علیہ، جب تک مامون کے پاس رہے تو مامون اُن کی بہت عزت واکرام کرتا رہا، آخر آپؒ اپنی اہلیہ "ام الفضل" کے ہمراہ "مدینہ طیبہ" تشریف لے آئے اور یہیں رہنا شروع فرمادیا کہ "مدینہ طیبہ" آپؒ کے آباء واجداد کا وطن ہونے کے علاوہ آپؒ کو محبوب بھی بہت تھا۔[1]

مامون نے شادی کے وقت بھی آپؒ کو بہت سارا مال بطورِ گفٹ دیا تھا،[2] اور آپؒ کے مدینہ طیبہ پہنچنے کے بعد بھی ہر سال اہتمام کے ساتھ مال ودولت کی ایک بہت بڑی مقدار آپؒ کی خدمت میں بھیجا کرتا تھا، عام طور پر سالانہ ۱۰ لاکھ درہم (مساوی تقریباً ۲۱ کروڑ روپے)،[3] بعض دفعہ ۱۰ لاکھ درہم سے بھی زائد،[4] اور کبھی ۵۰ ہزار دینار (مساوی تقریباً ۹۳ کروڑ ۸۷ لاکھ روپے)[5] بھیجا کرتا تھا۔

ام الفضل نے وہاں مدینہ طیبہ میں قیام کے دوران ایک مرتبہ اپنے والد مامون الرشید کو خط لکھا جس میں ایک لحاظ سے حضرت جوادؒ کی شکایت کا پہلو تھا۔ اُس خط میں تحریر تھا کہ انہوں نے یہاں میرے ساتھ گھر میں ایک باندی رکھ رکھی ہے اور یہ بات میرے لیے باعثِ غیرت ہے۔ اس پر مامون نے اپنی بیٹی کو تنبیہ کرتے ہوئے واپسی جواب لکھا کہ: ہم نے ابوجعفر کے ساتھ تمہارا نکاح اس لیے نہیں کیا تھا کہ ہم اُن پر حلال چیزوں کو حرام کردیں، لہٰذا دوبارہ مجھے اس طرح کا خط نہ لکھنا۔[6]

---

(۱) نور الأبصار، ص: ۲۲۰ و الفصول المهمة، ص: ۲۵۷ والاتحاف بحب الأشراف، ص: ۳۵۵ مع[آل البيت حول الرسول، ص: ۲۵۲، ۲۵۳

(۲) المنتظم في تاريخ الملوك والأمم ۱۱/۶۲

(۳) منهاج السنة النبوية ۴/۶۸ والعبر في خبر من غبر ۱/۳۰۰ ومرآة الجنان وعبرة اليقظان ۲/۶۰

(۴) شذرات الذهب في أخبار من ذهب ۳/۹۷ والوافي بالوفيات ۴/۷۹

(۵) دُوَل الإسلام ۱/۱۹۱

(۶) نور الأبصار، ص: ۲۲۱ والصواعق المحرقة ۲/۵۹۸ والاتحاف بحب الأشراف، ص: ۳۵۶ والفصول المهمة، ص: ۲۵۸

ف: واضح رہے کہ اُس مجلسِ مناظرہ میں، جبکہ آپؒ ابھی کم سِن تھے، صرف نکاح ہوا تھا اور رخصتی، ایک روایت کے مطابق، سن ۲۱۰ھ میں ہوئی جب آپؒ پندرہ برس کے تھے۔[1] اور دوسری روایت کے مطابق سن ۲۱۵ھ میں ہوئی جب کہ آپؒ کی عمر بیس برس ہو چکی تھی۔[2]

اولاد:

آپؒ کے چار صاحبزادے اور اتنی ہی صاحبزادیاں تھیں:

صاحبزادے: علی الہادی، موسیٰ المبرقع، محمد، حسن

صاحبزادیاں: حکیمہ، بریہہ، اُمامہ، فاطمہ۔[3]

تاہم آپؒ کی نسل صرف دو صاحبزادوں (علی الہادی اور موسیٰ المبرقع) سے آگے چلی۔[4]

کچھ عبارات سے معلوم ہوتا ہے کہ جب آپؒ کے انتقال کا وقت آیا تو آپؒ کی اولاد میں سے صرف دو صاحبزادے اور دو صاحبزادیاں باحیات رہ گئی تھیں۔[5]

علمی مقام اور علوم حدیث کی خدمت:

کم عمری کے باوجود آپؒ میں علم وفضل، اور کمالِ عظمت کو دیکھ کر مامون الرشید عباسی بغداد میں آپؒ کے قیام کے دوران مسلسل آپؒ کے ساتھ حسنِ سلوک اور شفقت ومحبت سے پیش آتا رہا، حتی کہ اُس نے اپنی صاحبزادی ''اُمّ الفضل'' کا نکاح آپؒ کے ساتھ کر دینے پر، عزم بلکہ عزمِ مصمّم کر لیا۔ اِس ارادے کو جان کر بنو عباس کو تشویش لاحق ہونا شروع ہو گئی کہ امیر المومنین کل اُن کو بھی اُن کے والد (امام علی رضاؒ) کی طرح اپنا ''ولی عہد'' نہ بنا دیں (اور پھر خلافت آلِ عباس سے نکل کر آلِ علی میں چلی جائے) چناں چہ بنو عباس کے خاص لوگوں نے آ کر مامون سے بات کی کہ آپ ''محمد'' کو یہ نکاح نہ دیں۔

---

(۱) المعارف لابن قتيبة، ص: ۳۹۱ في بيان أحداث سنة ۲۱۰

(۲) تاريخ الطبري: ۲۲۳/۸ والكامل في التاريخ ۵/۵۶۴

(۳) الجوهر الشفاف في أنساب السادة الأشراف: ۱/۱۶۱

(۴) صحاح الأخبار، ص: ۵۴ والجوهر الشفاف في أنساب السادة الأشراف: ۱/۱۶۱

(۵) الصواعق المحرقة: ۲/۵۹۸ والاتحاف بحب الأشراف، ص: ۳۵۸

مامون عباسی نے اُن کی بات سن کر کہا: میں نے ''محمد'' کا انتخاب صرف اس لیے کیا ہے کہ وہ کم عمری کے باوجود علم وحلم، اور معرفت وادب میں اِس وقت کے تمام اہلِ علم وفضل پر فوقیت رکھتا ہے۔ وہ کہنے لگے: یہ بچہ ہے، ابھی کم عمر ہے۔ اِس عمر میں کونسا علم اور کونسی معرفت وادب اس کو حاصل ہوگیا ہے۔ ابھی آپ اِس کو رہنے دیں تاکہ یہ کوئی علم وادب حاصل کرلے، پھر آپ جو چاہیں اِس کے ساتھ کریں۔

مامون نے کہا: اگر تمہیں اِس کے علم وفضل میں شک ہے تو تم اِس کا امتحان لے لو، یا کسی اور کو بلوالو جو اِس کا امتحان لے۔ اس کے بعد تمہیں میرے اِس فیصلہ پر اعتراض کا حق حاصل ہوگا۔ انصاف کی یہ بات سُن کر وہ وہاں سے اٹھ کر چلے گئے اور سب نے مل کر متفقہ طور پر علامۂ وقت قاضی یحییٰ بن اکثمؒ کا انتخاب کیا کہ وہ امتحان لیں گے۔ اور مقررہ وقت پر خلیفہ مامون کی بارگاہ میں، امتحان ومناظرہ کی مجلس قائم کی گئی اور وہ قاضی یحییٰ بن اکثمؒ کو اپنے ساتھ بلالائے۔ مجلس لگ گئی اور حاضرینِ مجلس اپنی اپنی نشستگاہوں پر بیٹھ گئے۔

قاضی یحییٰ بن اکثمؒ، بغرضِ امتحان، مسائل تیار کرکے لائے تھے اور امام تقیؒ سے وہ مسائل پوچھے۔ [۱]

آپؒ نے چہرے پر کوئی ہچکچاہٹ وگھبراہٹ لائے بغیر فصیح زبان، سلاستِ کلام، اور ہمت وجرأت کے ساتھ اُن کو شافی ووافی ایسے جوابات دیے جنھوں نے آپؒ کے علم وفضل پر پڑے ہوئے پردے اٹھادیے اور آپؒ کا علمی قد وقامت روزِ روشن کی طرح کھل کر سامنے آگیا، الغرض مامون سمیت سب حاضرینِ مجلس آپؒ کی فصاحت اور باسلیقہ گفتگو سے بہت ہی زیادہ متأثر ہوئے۔ مامون نے فرطِ مسرت میں بے قابو ہوکر کہا: أَجَدْتَ وَ أَحْسَنْتَ يَا أَبَا جَعْفَر! ''شاباش، ابوجعفر! شاباش''۔

اس کے بعد مامون نے امام تقیؒ سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا: اگر چاہیں تو آپ بھی قاضی یحییٰ سے کچھ پوچھ سکتے ہیں اگرچہ ایک ہی مسئلہ ہو۔

امام تقیؒ نے فرمایا: امیر المومنین! اس بارے میں تو پہلے اُن کی رائے لے لینا مناسب ہے۔ قاضی یحییٰؒ نے فرمایا: کوئی حرج نہیں، یہ پوچھیں۔ اگر مجھے جواب آتا ہوگا تو ٹھیک، ورنہ اِنہی کے جواب سے مجھے فائدہ ہوجائے گا۔

---

(۱) ''الاتحاف'' کے حاشیہ میں یحییٰ بن اکثمؒ کے سوال اور امام جوادؒ کے جواب کو مفصل ذکر کیا ہے، جو اہلِ علم کیلیے واقعی دلچسپ اور قابلِ دید ہے۔ ملاحظہ ہو:
الاتحاف بحب الأشراف، ص: ۳۵۲، ۳۵۴ ومثله في آل البيت حول الرسول، ص: ۲۵۵

امام تقی سلامُ اللہ وَرَحمۃُ علیہ نے پوچھا: وہ کون شخص ہے جس نے صبح کے وقت ایک عورت کو شہوت سے دیکھا تو اُس کا یہ دیکھنا حرام تھا، جب دن چڑھ گیا تو وہ عورت اُس کیلیے حلال تھی، پھر جب ظہر کا وقت ہوا تو اُس پر حرام ہوگئی، جب عصر کا وقت ہوا تو حلال ہوگئی، پھر جب سورج غروب ہوا تو حرام ہوگئی، جب عشاء کا وقت داخل ہوا تو حلال ہوگئی پھر جب آدھی رات ہوئی تو حرام ہوگئی اور جب سورج طلوع ہوا تو حلال ہوگئی۔ تو یہ بتائیں کہ وہ عورت ان اوقات میں کس طرح اُس کیلیے حلال ہوئی اور کس طرح حرام؟

قاضی یحییٰؒ نے فرمایا: مجھے معلوم نہیں ہے۔ اگر آپ ہمیں اس کے جواب سے بھی مستفید فرمانا چاہیں تو فرمادیں۔

آپؑ نے فرمایا: یہ عورت کسی آدمی کی باندی تھی، ایک اجنبی شخص نے شروع دن میں اِسے شہوت سے دیکھا تو یہ اُس شخص پر حرام تھی، جب دن چڑھ گیا، اِس شخص نے وہ باندی اُس کے مالک سے خرید لی تو وہ اِس کیلیے حلال ہوگئی۔ پھر جب ظہر کا وقت ہوا، اُسے آزاد کردیا تو وہ حرام ہوگئی۔ جب عصر کا وقت ہوا تو اُس سے نکاح کرلیا اور وہ حلال ہوگئی، جب مغرب کا وقت ہوا، اُس سے ''ظِہار''[1] کرلیا تو وہ حرام ہوگئی، پھر جب عشاء کا وقت داخل ہوا، تو ظِہار کا کفارہ دے دیا اور وہ حلال ہوگئی۔ جب آدھی رات ہوئی تو اُس کو ایک طلاق دے دی جس سے وہ حرام ہوگئی اور جب فجر ہوئی تو اُس ایک طلاق سے رجوع کرلیا اور وہ حلال ہوگئی۔

اس کے بعد مامون نے اپنے خاندان کے ان عباسی لوگوں سے کہا: هَلْ فِيكُم أَحَدٌ يَسْتَحْضِرُ أَنْ يُجِيبَ عَن هٰذِهِ الْمَسَائِلِ بِمِثْلِ هٰذَا الْجَوَابِ؟ ''اب بتاؤ، کیا تم میں ایسا کوئی آدمی ہے جو اس طرح کے سوالات کا اس طرح جواب دے سکے''۔ وہ سب یک زبان ہوکر بولے: ذٰلِکَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيهِ مَنْ يَشَاءُ (یہ اللہ کا فضل ہے، وہ جسے چاہتا ہے عطا فرماتا ہے)۔ اس پر مامون نے بنو عباس کے اُن لوگوں سے کہا: دیکھو، جس حقیقت سے تم ناواقف تھے، اب وہ تم پر واضح ہوگئی ہے۔ (اس کے بعد مامون نے اپنے اس عزمِ نکاح کو عملی شکل دینے کے اقدامات شروع کر دیے)۔[2]

---

(۱) ''ظِہار'' ایک شرعی اصطلاح ہے جس میں شوہر اپنی بیوی سے کہتا ہے کہ تو میرے لیے میری ماں کی ظَہر (یعنی پیٹھ) کی طرح ہے اور اُس کی نیت یہ ہوتی ہے کہ میری ماں کی طرح تو بھی مجھ پر حرام ہے۔ اس سے وہ عورت اپنے شوہر پر حرام ہوجاتی ہے، پھر اگر شوہر اس ''ظِہار'' کا کفارہ دے دے تو وہ دوبارہ حلال ہوجاتی ہے اور نکاح کی ضرورت بھی نہیں پڑتی۔ اس کے مفصل احکام فقہ کی کتابوں میں موجود ہیں۔

(۲) مستفاد من مجموعة مایلي: [الصواعق المحرقة ۲/۵۹۷ واخبار الدول وآثار الأول، ص: ۳۴۷ والاتحاف بحب الأشراف، ص: ۳۵۴ والفصول المهمة، ص: ۲۵۵ ونور الأبصار، ص: ۲۱۹

آپؒ نے روایتِ حدیث کی خدمات بھی سرانجام دیں چناں چہ آپؒ اپنے آبائی سلسلہ سے حدیث روایت کرتے ہوئے اپنے جدِ امجد حضرت علی بن ابی طالبؓ تک پہنچ کر اُن سے روایت کرتے ہیں کہ حضرت علیؓ نے فرمایا: مجھے رسول اللہ ﷺ نے یمن کی طرف بھیجا، بھیجتے ہوئے یہ نصیحت فرمائی کہ: علی! استخارہ کرنے والا کبھی نقصان نہیں اٹھاتا اور مشورہ کر کے چلنے والا کبھی پچھتاتا نہیں، پھر فرمایا: اے علی! سفر، رات کو کیا کرو کیونکہ رات کے وقت زمین دن کی بنسبت کہیں زیادہ سمٹتی چلی جاتی ہے۔ اور آخر میں فرمایا: علی! اللہ کا نام لے کر اپنے کام کی ابتداء صبح کے وقت ہی کر دیا کرو کیونکہ اللہ تعالیٰ نے میری امت کیلیے صبح کے وقت میں برکت رکھ دی ہے۔[1]

علمِ حدیث میں جہاں آپؒ نے روایتِ حدیث کے ذریعہ الفاظِ احادیث کی اشاعت کی وہاں صحیح تشریح و توضیح بیان کر کے معنیٔ حدیث کی بھی حفاظت کی، چناں چہ جعفر بن محمد بن مزید کا بیان ہے کہ مَیں بغداد میں تھا، محمد بن مَندہ نے مجھے کہا: حضرت محمد بن علی رضاؒ سے تمہاری ملاقات کراؤں؟ میں نے کہا: ضرور کرائیں۔ پھر وہ مجھے اُن کے پاس لے گئے، ہم نے اُنہیں سلام کیا اور وہیں بیٹھ گئے۔ محمد بن مَندہ نے آپؒ سے رسول اللہ ﷺ کی اس حدیث کا مطلب دریافت کیا: {إِنَّ فَاطِمَةَ أَحْصَنَتْ فَرْجَهَا فَحَرَّمَ اللهُ ذُرِّيَّتَهَا عَلَى النَّارِ} (حضرت فاطمہؓ نے اپنی ساری زندگی پاکدامنی کے ساتھ گزاری، جس پر اللہ تعالیٰ نے اُن کی نسل کو جہنم پر حرام فرمادیا)۔

آپؒ نے فرمایا: یہ اعزاز و فضیلت اُن کی نسل میں سے صرف حضرت حسن و حسین رضی اللہ عنہما کے ساتھ خاص ہے (آپؒ کی مراد یہ تھی کہ اس حدیث میں نسل سے مراد بلاواسطہ نسل ہے)۔[2]

مذکورہ بالا مثالوں سے معلوم ہوا کہ آپؒ نے اپنے زمانہ میں حدیث کی اشاعت و حفاظت؛ ہر دو خدمات سرانجام دیں۔

---

(۱) وفيات الأعيان: ۴/۱۷۵ ومرآة الجنان وعبرة اليقظان ۲/۶۱ والوافي بالوفيات: ۴/۸۰ والشذرات الذهبية، ص: ۱۰۳

(۲) وفيات الأعيان: ۴/۱۷۵ والوافي بالوفيات: ۴/۷۹ والشذرات الذهبية، ص: ۱۰۳ وتاريخ بغداد: ۳/۲۶۶

ارشادات ونصائح

کتبِ تاریخ میں آپؒ کے ارشادات ونصائح کا ایک وسیع ذخیرہ موجود ہے، تاہم اُن میں سے چند درج ذیل ہیں:

۱۔مومن کی عزت اس میں ہے کہ وہ لوگوں سے مستغنی ہوکر رہے یعنی اُن سے کوئی طمع ولالچ نہ رکھے۔[1]

۲۔جس نے اللہ کیلیے کسی کو دوست بنایا تو اس نے جنت میں گھر بنایا۔[2]

۳۔اللہ اپنے بعض بندوں کو اموال ونعمتوں سے نوازتا ہے۔جب تک وہ ان میں سخاوت سے کام لیتے رہتے ہیں وہ نعمتیں ان کے پاس برقرار رہتی ہیں اور جب وہ بخل شروع کردیتے ہیں تو اللہ تعالی ان سے وہ نعمتیں لے کر اپنے دوسرے بندوں کو دے دیتا ہے۔

۴۔جو کسی انسان کو بڑا سمجھتا ہے وہ اُس انسان کی تعظیم بھی کرتا ہے، جو شخص کسی چیز سے ناواقف ہوتا ہے وہ اس چیز کو (اپنی ناواقفیت وجہالت کی وجہ سے) غلط سمجھتا ہے، فرصت غنیمت ہے، جو اکثر پریشان وغمگین رہتا ہے وہ امراض کا شکار ہوجاتا ہے، حیاتِ مسلم کے مضمون کا مرکزی خیال ''حسنِ اخلاق'' ہے۔

۵۔فقر کی زینت، سوال سے بچنا ہے۔آزمائش کی زینت، شکر ہے۔خاندانی شرافت کی زینت، عاجزی ہے۔گفتگو کی زینت، فصاحت ہے۔احادیث وغیرہ بیان کرنے کی زینت، قوتِ حافظہ ہے۔علم کی زینت، تواضع ہے۔کسی کے ساتھ بھلا کرنے کی زینت، اُس پر احسان نہ جتلانا ہے۔نماز کی زینت، خشوع ہے۔قناعت (تھوڑے پر راضی رہنا) کی زینت، چہرے پر مسکراہٹ ہے، اور تقویٰ کی زینت، لایعنی سے بچنا ہے۔

۶۔کمالِ مروت یہ ہے کہ آدمی کے قول وفعل سے کسی کو ناگواری نہ پہنچے، کسی کو تکلیف نہ پہنچانا آدمی کے اچھے اخلاق کی علامت ہے، حقدار (کی ادائیگیِ حق کے ساتھ ساتھ، اُس) کے ساتھ اچھے معاملے سے پیش آنا سخاوت کی علامت ہے، دوسرے کو اپنی ذات پر ترجیح دینا شرافت کی علامت ہے، حق سمجھ آجانے پر اُسے قبول کرلینا انصاف کی علامت ہے، جو چیز اپنے لیے ناپسند ہو دوسرے کو اُس سے روکنا ہمدردی کی علامت ہے، تمہارے حریف کی موجودگی میں، کسی شخص کا تمہیں برا بھلا نہ کہنا اُس شخص کے تمہارے لیے شفیق ومہربان ہونے کی علامت ہے، کسی شخص کا اکثر تمہاری

---

(۱) آل البیت حول الرسول، ص: ۲۵۸

(۲) وفیات الأعیان: ۴/۱۷۵ ومرآۃ الجنان: ۲/۶۱ والشذرات الذھبیۃ، ص: ۱۰۳

موافقت کرنا اور (بوقتِ ضرورت) کبھی کبھار مخالفت کرنا اُس کے سچے دوست ہونے کی علامت ہے، احسان کرنے والے کے احسان کو احسان سمجھنا قدردانی کی علامت ہے، اپنی حیثیت (وحقیقت) کی پہچان رکھنا تواضع کی علامت ہے، دوسروں کے عیوب سے بے توجہی اور اپنے عیوب پر توجہ دینا، نیک انسان ہونے کی علامت ہے۔

۷۔ظلم کرنے والا، ظلم پر مدد کرنے والا اور ظلم پر راضی رہنے والا: یہ سب ظلم میں باہم شریک ہیں۔اور جو کسی برائی کو اچھا سمجھے وہ بھی اس برائی میں شریک کار ہے۔

۸۔جاہلوں کی کثرت کی وجہ سے علماء اجنبی معلوم ہوتے ہیں۔

۹۔مصیبت پر صبر کرنا، دشمن کیلیے مصیبت ہے۔

(۱۰)تین چیزیں بندے کو اللہ کی رضا تک پہنچادیتی ہیں: کثرتِ استغفار، نرم مزاجی، اور کثرتِ صدقہ۔

تین صفات ایسی ہیں کہ جس شخص میں ہوں وہ کبھی پچھتاتا نہیں: جلد بازی نہ کرنا، مشورہ کرنا، اور پختہ ارادہ کرکے اللہ پر بھروسا کرلینا۔

اور تین اعمال ایسے ہیں جن سے دلوں میں محبت پیدا ہوتی ہے: ساتھ رہنے والوں میں انصاف برتنا، مشکل وقت میں ہمدردی وغمخواری کرنا، اور صاف دل والا ہونا۔

۱۱۔آدمی کی قتل گاہ اُس کے دو جبڑوں کے درمیان ہے۔

۱۲۔رائے تو وہ ہوتی ہے جو غور وفکر کے ساتھ دی جائے، اور جو رائے بن سوچے سمجھے دی جائے وہ بے قیمت ہوتی ہے۔

۱۳۔لوگ آپس میں بھائی ہیں، جس کی دوستی اور بھائی چارہ اللہ کیلیے نہ ہو (بلکہ کسی دنیاوی غرض کی وجہ سے ہو) تو وہ دوستی انجام کار دشمنی میں بدل جاتی ہے۔

۱۴۔نعمت کی ناشکری اللہ کی ناراضگی کا سبب ہے۔اور دنیا میں جو شخص تمہارے کسی احسان کا بدلہ ''شکریہ'' سے دے دے تو اُس نے تمہیں اُس سے کہیں زیادہ دے دیا ہے جو اُس نے تم سے لیا تھا۔

۱۵۔جو اپنے کسی بھائی کو ایک طرف بلا کر نصیحت کرتا ہے وہ اُسے سنوار دیتا ہے، اور جو سب کے سامنے نصیحت کرنا شروع کر دیتا ہے وہ اُسے بگاڑ دیتا ہے۔

۱۶۔حقیقی معززین، تو علماء ہیں اور اصل سردار تو متقی لوگ ہیں۔

۱۷۔اپنے کمزور لوگوں پر رحم کرو، اور خود رحم کرکے اللہ سے رحم حاصل کرو۔

۱۸۔ گناہوں کی وجہ سے انسان کا روحانی طور پر مرجانا، اُس کی ظاہری اور بدنی موت سے کہیں بڑی موت ہے۔ اور اِطاعت و برکات والی زندگی، اِس ظاہری زندگی سے کہیں بڑی حیات ہے۔

۱۹۔ جو اللہ پر اعتماد و بھروسا کرتا ہے، اللہ تعالیٰ ہر پریشانی سے اُسے نجات دیتا ہے اور ہر دشمن سے اس کی حفاظت کرتا ہے۔

دین سراپا عزت ہے، علم خزانہ ہے، بے فائدہ باتوں سے چپ رہنا نُور ہے، دنیا سے بے رغبتی کی انتہاء تقویٰ و پرہیزگاری ہے، بدعت سے بڑھ کر کوئی چیز دین کی عمارت کو گرانے والی نہیں ہے، حرص و طمع سے بڑھ کر کوئی چیز لوگوں کو خراب کرنے والی نہیں ہے، حاکم (کی نیکی) کی وجہ سے عوام نیک بنتی ہے، دعاء (کے اہتمام) کی وجہ سے مصیبت ٹلتی ہے، جو "صبر" کی سواری پر سوار ہوتا ہے وہ "نصرتِ الٰہی" کی منزل پر پہنچتا ہے، اور جو تقویٰ کے درخت بوتا ہے وہ امیدوں کے پھل توڑتا ہے۔[1]

وفات:

آپ مدینہ طیبہ سے اپنی اہلیہ "ام الفضل" کے ہمراہ، خلیفۂ وقت کے پاس بغداد تشریف لائے۔ خلیفۂ وقت ("ابو اسحاق محمد بن ہارون الرشید" جو "خلیفہ معتصم" کے لقب سے معروف تھا اور مامون الرشید کے بعد خلیفہ بنا تھا[2]) آپ کی اہلیہ کا چچا تھا، اُس نے آپؒ کا بہت اعزاز و اکرام کیا۔[3] پھر ۵/ ذی الحجہ، بروز منگل، سن ۲۲۰ھ میں آپؒ وہیں بغداد میں انتقال فرما گئے۔ (بعض نے کہا ہے کہ آپؒ کو زہر دی گئی تھی، لیکن یہ بات صحیح نہیں ہے۔)[4] عین جوانی کے زمانہ میں، جبکہ آپؒ کی عمرِ عزیز صرف ۲۵ برس اور چند ماہ تھی، آپؒ نے انتقال فرمایا۔ واثق بن معتصم نے نمازِ جنازہ پڑھائی اور وہیں بغداد (کے علاقہ "کاظمیہ") کے اندر "مقبرۂ قریش" میں آپؒ کو اپنے دادا امام موسیٰ کاظمؒ کے پہلو میں دفن کیا گیا۔[5]

آپؒ کے انتقال کے بعد "ام الفضل" کو ان کے چچا خلیفہ معتصم باللہ کے گھر منتقل کر دیا گیا اور پھر وہ وہیں رہنا شروع ہو گئیں۔[6]

---

(۱) مستفاد من نور الأبصار، ص: ۲۲۲، ۲۲۳ مع الفصول المهمة، ص: ۲۶۰، ۲۶۳ بتلخيص (مع شيء من تقديم وتاخير) وتسهيل.
(۲) المختصر في أخبار البشر ۲/۳۳
(۳) [تاريخ بغداد و ذيوله ۳/۲۶۵ مع تاريخ الإسلام ۳۸۵، ۱۵/۳۸۶ والوافي بالوفيات: ۴/۷۹
(۴) تاريخ الخميس في أحوال أنفس النفيس: ۲/۲۸۷
(۵) وفيات الأعيان ۴/۱۷۵ وتذكرة الخواص، ص: ۳۲۱ وتاريخ ابن الوردي ۱/۲۱۲ مع المختصر في أخبار البشر ۲/۳۳
(۶) تاريخ الإسلام ۱۵/۳۸۶ و الوافي بالوفيات: ۴/۷۹ مع وفيات الأعيان: ۴/۱۷۵ وتاريخ بغداد و ذيوله: ۳/۲۶۶

فضائل وخصائص

اپنے والد ماجد کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے آپؒ بھی علم وتقویٰ، اور زہد وسخاوت جیسے عمدہ اوصاف میں اعلیٰ مقام پر فائز تھے۔ [1] اگرچہ عمر کے لحاظ سے آپؒ بڑے نہیں تھے لیکن مرتبہ کے لحاظ سے جلیل القدر شخصیت اور عظیم الشان حیثیت کے مالک تھے، [2] اور رفعت ومرتبت (بلندئ شان) میں اَسلاف کے حقیقی جانشین تھے، علاوہ ازیں ذہین وفطین، حاضر دماغ، اور فصیح اللسان تھے، [3] اور کم عمری کے باوجود اپنے زمانہ کی معروف ومشہور شخصیات میں سے تھے، [4] چناں چہ آپؒ خاندانِ اہلِ بیت کے قائدین ومعززین میں سے شمار ہوتے تھے۔ [5]

ذیل میں آپؒ کے چند اوصافِ جمیلہ درج کیے جاتے ہیں:

عبادت:

آپؒ اپنے زمانہ کے بڑے عبادت گزار، نہایت فرمانبردار، اور خوفِ الٰہی سے سرشار تھے۔ نماز کی کیفیت یہ تھی کہ فرض نمازوں کے خصوصی اہتمام کے ساتھ نوافل کی بھی کثرت رکھتے تھے اور تہجد کا تو خاص طور پر اہتمام تھا۔

جہاں تک روزوں کا تعلق ہے تو نفلی روزے بھی بکثرت رکھتے تھے، اور ''اَشْہرِ حُرم'' (یعنی ذی القعدہ، ذی الحجہ، محرم اور رجب کے مہینوں) میں روزے رکھنے کا بطورِ خاص اہتمام فرماتے تھے۔ اس کے علاوہ عمرہ وحج بھی کثرت سے کیا کرتے تھے، ہر مرتبہ حجرِ اسود کو بوسہ دیتے، زمزم نوش فرماتے اور اپنے بدن پر اُسے چھڑکتے۔

دعائیں مانگنے کی طرف بھی خصوصی توجہ دیتے، اکثر وبیشتر دعاء کی ابتداء، حمد وثناء کے اِن کلمات سے کرتے:

اللهم يَا مَن لا شَبِيهَ له، ولَا مَثِيلَ له، أنتَ اللهُ لا إلـه إلا أنتَ، ولَا خالقَ إلا أنتَ، تُفْنِي المَخلُوقِينَ وتَبقَى أنتَ، حَلُمتَ عَمَّن عَصَاكَ، وَفِي المَغفِرةِ رِضَاكَ.

(اے اللہ! اے وہ ذات جس کے کوئی مشابہ نہیں، اور نہ ہی اس کی کوئی مثل ہے، تُو اللہ ہے تیرے سوا

---

(۱) تذكرة الخواص، ص: ۳۲۱

(۲) الجوهر الشفاف في أنساب السادة الأشراف ۱/۱۶۱ ونور الأبصار، ص: ۲۱۹

(۳) الأعلام للزركلي: ۶/۲۷۳ وأحداث التاريخ الإسلامي بترتيب السنين ۱/۱۲۵۹

(۴) نور الأبصار، ص: ۲۱۹

(۵) تاريخ الإسلام ۱۵/۳۸۵ والوافي بالوفيات: ۴/۷۹

کوئی معبود نہیں، اور نہ ہی تیرے سوا کوئی پیدا کرنے والا ہے، تُو تمام مخلوقات کو فنا کرے گا اور تُو خود باقی رہے گا۔ اے اللہ! تُو اپنے نافرمان بندے سے حلم سے کام لیتا ہے، اور مغفرت میں تیری خوشنودی ہے)......اِس کے بعد اپنی دعاء مانگنا شروع کرتے۔

اپنی دعاؤں میں آہ وزاری کرتے، اور کثرت سے مناجاتِ الٰہی میں مشغول رہتے، رات کو تہجد کے وقت اٹھ کر دعاء ومناجات میں مشغول رہنا تو خاص وظیفہ تھا۔ آپؒ کی بعض مناجات سے معلوم ہوتا ہے کہ آپؒ اللہ کی بارگاہ میں گڑگڑا کر اپنے گناہوں سے معافی مانگتے تھے اور بعض دیگر مناجات سے ظاہر ہوتا ہے کہ آپؒ دیر تک اللہ کے سامنے اپنی عاجزی وکمزوری ظاہر کرتے رہتے، اُس کی نعمتوں کا شکر ادا کرتے اور اُس سے اپنی حاجات طلب کرتے۔[1]

دنیا سے بے رغبتی:

امام تقی سلام اللہ ورحمۃ علیہ، آخرت کے مشتاق اور دنیا سے بے رغبت انسان تھے، اس فانی دنیا کا مال ومتاع اور اس کی زیب وزینت ان کو آخرت سے غافل نہیں کرتی تھی۔ آپؒ جوانی کے دور سے گزر رہے تھے اس کے باوجود سادہ لباس زیب تن فرماتے اور سادہ کھانا تناول فرماتے۔ دورِ شباب عموماً خواہشات پوری کرنے کیلیے مال اکٹھا کرنے کا زمانہ ہوتا ہے مگر آپؒ مال کی دنیوی محبت سے یکسر خالی تھے، مامون الرشید آپؒ کے پاس ہر سال لاکھوں دراہم (یعنی کروڑوں روپے) بھیجتا تھا مگر آپؒ ان کو اپنی خواہشات پر صرف کرنے کے بجائے غریبوں، حاجتمندوں اور خاص طور پر سفید پوش ضرورت مندوں پر خرچ فرماتے تھے۔

اگرچہ بادشاہِ وقت کے داماد ہونے کے سبب آپؒ مال ومتاع اور عزت وشہرت کے ماحول میں رہتے تھے مگر آپؒ کے دل میں ان چیزوں کی کوئی حقیقت وحیثیت نہ تھی، چناں چہ ایک مرتبہ بغداد میں تھے اور آپؒ کے اردگرد لوگوں کا مجمع تھا جس نے تعظیم وتکریم کے آداب بجالاتے ہوئے آپؒ کو گھیر رکھا تھا، وہیں قریب ہی ''حسین'' نامی ایک شخص کھڑا یہ سارا منظر دیکھ رہا تھا، اور سوچ رہا تھا کہ مالی وسعت اور عزت وشہرت کے اس مقام کو چھوڑ کر اب یہ اپنے وطن (مدینہ منورہ) نہیں جائیں گے۔ اُس کی ان حیرت زدہ اور سوچوں میں گم نظروں کو دیکھ کر آپؒ نے بھانپ لیا، اور اُسے قریب کر کے فرمایا: يَا حُسَيْنُ! خبزُ الشَّعِيرِ ومِلْحُ الْجَرِيشِ فِي حَرَمِ جَدِّي رَسُولِ اللهِ صلی اللہ علیہ وسلم

---

(1) انظر: آل البیت حول الرسول، ص: ۲۵۱ و۲۵۸، ۲۶۰ وفیہ الکلام بسط

أَحَبُّ إِلَيَّ مِمَّا تَرَانِي فِيهِ ''حسین! مجھے رسول اللہ ﷺ کے شہر میں رہ کر جَو کی روٹی اور کُوٹے ہوئے نمک کے ساتھ زندگی گزارنا، بغداد میں ملنے والی اس عزت اور مال ومتاع سے کہیں زیادہ محبوب ہے''۔

واقعی آپؒ آخرت کے عشاق میں سے تھے اور اپنے آباء واجداد کی طرح دنیا سے دل ہٹا کر اللہ کی طرف یکسو ہو چلے تھے۔[1]

سخاوت:

آپؒ کی سخاوت تو حد درجہ مشہور ومعروف تھی، اسی وجہ سے آپؒ کو ''جَوّاد'' (یعنی بہت سخی) کا لقب ملا۔[2]

(۱) لوگوں کے ساتھ آپؒ کے مالی تعاون اور سخاوت کے کئی واقعات ہیں جن میں سے بطورِ نمونہ چند درج ذیل ہیں: ''(۱) احمد بن حدید'' اپنے ساتھیوں کی ایک جماعت کے ساتھ حج کیلیے جارہے تھے، راستے میں ڈاکوؤں نے حملہ کر دیا اور جو کچھ مال وسامان ساتھ تھا سب لُوٹ لیا۔ یہ لُٹا پٹا قافلہ جب مدینہ طیبہ پہنچا تو ''احمد بن حدید'' امام جوادؒ کے پاس حاضر خدمت ہوئے اور اُن کو سارا ماجرا کہہ سنایا۔ آپؒ نے اُن کو کپڑے، اور بہت سارے دینار دیے کہ یہ اہلِ قافلہ میں تقسیم کر دو۔ راوی کہتے ہیں اِن کی مقدار اُس لوٹے ہوئے سامان کے برابر یا اُس سے کچھ زائد تھی۔[3]

(۲) ایک علوی شخص کہتے ہیں کہ مدینہ منورہ میں ایک باندی تھی جو مجھے بہت ہی پسند تھی لیکن اس کی قیمت زیادہ ہونے کی وجہ سے، مَیں اُس کے خریدنے سے عاجز تھا۔ ایک دن میں نے امام تقی سلامُ اللہ وَرَحمۃُ علیہ، سے اپنی اس حسرت کا تذکرہ کیا۔ اس کے بعد انہوں نے چپکے سے اُسے خرید لیا۔ جب مجھے پتا چلا کہ وہ بِک گئی ہے تو مجھے اس کا بہت زیادہ قلق وافسوس ہوا۔ میں اسی پریشانی میں آپؒ کے پاس آیا اور کہا کہ وہ اب بِک گئی ہے۔ انہوں نے پوچھا: مَنِ اشْتَرَاهَا؟ ''کس نے خریدی ہے؟'' میں نے کہا: یہ پتا نہیں ہے لیکن وہ بہرحال بِک گئی ہے۔ فرمایا: ابھی تمہارے پاس کچھ وقت ہے؟ میں نے کہا: جی ہاں، ابھی میں فارغ ہوں۔ پھر وہ مجھے ساتھ لے کر اپنے اُس مکان کی طرف چلے جو اُن کے باغ میں واقع تھا (اُن کے کچھ اور احباب بھی ساتھ چل دیے)، ہمارے جانے سے پہلے ہی انہوں نے کھانا اور بستر وغیرہ وہاں بھجوا دیا تھا۔ بہرحال جب ہم باغ کی چاردیواری کے پاس پہنچے تو انہوں نے میرا ہاتھ پکڑا اور اندر لے گئے

---

(۱) ینظر: آل البیت حول الرسول، ص: ۲۵۲

(۲) تاریخ الإسلام ۱۵/۳۸۵ ومنهاج السنة النبوية: ۴/۶۸ والوافي بالوفيات ۴/۷۹

(۳) آل البیت حول الرسول، ص: ۲۵۳

جبکہ اپنے ساتھ آنے والے احباب کو وہیں باہر ہی ٹھہرا دیا۔ آپ اندر داخل ہو کر مجھ سے یہ فرماتے جا رہے تھے: بِيعَتْ فُلَانَةُ وَلَا تَدْرِيْ مَنِ اشْتَرَاهَا؟ ''وہ بک بھی گئی اور تمہیں پتا بھی نہیں کہ کس نے خریدی ہے؟'' میں روتے ہوئے کہہ رہا تھا: جی ہاں! مجھے نہیں پتا چل سکا۔ اُس وسیع باغ میں چلتے چلتے ہم ایک کمرے کے پاس پہنچے جس پر پردہ پڑا ہوا تھا، اور اس میں ایک بیش بہا بستر پر ایک باندی بیٹھی ہوئی تھی، میں پیچھے ہٹنے لگا۔ انہوں نے مجھے فرمایا: واللہ! میرے ساتھ تمہیں بھی اس میں ضرور داخل ہونا ہوگا۔ میں داخل ہوا تو کیا دیکھتا ہوں کہ یہ بعینہ وہی باندی ہے جس سے میں محبت کرتا تھا، یہ دیکھ کر میری حیرانی کی حد نہ رہی۔ فرمایا: اِسے پہچانا ہے؟ میں نے کہا: جی ہاں! پھر فرمانے لگے: یہ باغ، اس کی آمدنی، یہ گھر اور یہ کھانا و بستر: اِس سب سمیت یہ باندی میں نے تمہیں ہدیہ کی ہے۔ تم خوشی خوشی اس باندی کے ساتھ زندگی گزارو۔ یہ کہا اور مجھے وہیں بٹھا کر باغ سے باہر تشریف لے گئے۔[1]

ہمدردی و غم خواری:

لوگوں کے ساتھ ہمدردی و غم خواری اور ان کے ساتھ حسنِ سلوک آپؒ کی خاص صفت تھی، ذیل میں اس کے چند نمونے ذکر کیے جاتے ہیں:

(۱) ''سجستان'' کے قبیلہ بنو حنیفہ کے ایک شخص کہتے ہیں کہ خلیفہ معتصم کے ابتدائی دورِ خلافت میں جب امام جوادؒ حج کے لیے تشریف لے گئے تو میں بھی اس وقت اُن کا رفیقِ سفر تھا۔ ہم ایک دفعہ دستر خوان پر بیٹھے ہوئے تھے، میں نے ان سے عرض کیا: میں آپ پر قربان جاؤں، ایک عرض کرنی ہے کہ ''گورنرِ سجستان'' آپ اہلِ بیت حضرات سے بہت محبت کرتا ہے، اور میرے اوپر ''خراج'' (زمین پر عائد کی جانے والی ایک خاص رقم) کی ادائیگی واجب ہے۔ اگر آپ مناسب سمجھیں تو اُس ''گورنر'' کے نام رقعہ لکھ دیں کہ وہ میرے ساتھ آسانی اور مہربانی والا معاملہ کرے۔

آپؒ نے فرمایا: لَا أَعْرِفُهُ ''میں اُسے نہیں جانتا''۔ اس شخص نے کہا: میں آپ پر قربان جاؤں، جیسا کہ میں نے عرض کیا کہ وہ آپ حضرات سے محبت کرتا ہے، آپ کا رقعہ یقیناً میرے لیے نفع بخش ثابت ہوگا۔ آپؒ نے اُس کی بات مان لی اور گورنرِ سجستان کے نام اُسے رقعہ لکھ دیا۔ رقعہ کے شروع میں لکھا کہ حاملِ رقعہ ہٰذا نے مجھے بتایا کہ آنجناب ہم اہلِ بیت سے محبت کرتے ہیں، پھر اُس ''گورنر'' کو اس شخص کے ساتھ حسنِ معاملہ کرنے کی درخواست کی۔

---

(۱) تاریخ ابن الجوزی = المنتظم في تاريخ الملوك والأمم ۱۱/۶۲

شخصِ مذکور جب اِس رقعہ کے ہمراہ سجستان واپس ہوا تو اُدھر اُس "گورنر" (حسین بن عبداللہ نیشاپوری) کو پتا چل چکا تھا کہ ایک شخص حضرت امام تقیؒ کا میرے نام رقعہ لے کر آ رہا ہے تو اُس نے سجستان سے دو فرسخ (تقریباً دس کلو میٹر) باہر آ کر اُس کا استقبال کیا، رقعہ لیا، اُس کو چوما، اُسے اپنے لیے باعثِ شرف سمجھا۔ پھر اُس شخص سے اس کی حاجت پوچھی۔ اُس نے وہی "خراج" والی پریشانی بتائی کہ میرے لیے اس کی ادائیگی مشکل ہے۔

اس پر اُس نے کہا: لَا تُؤَدِّ لِيْ خَرَاجًا مَا دَامَ لِيْ عَمَلٌ "جب تک میں گورنر ہوں تم "خراج" نہ دینا"، پھر اُس کے اہل وعیال کے بارے میں پوچھا۔ اس نے بتایا کہ ہم اہلِ خانہ اتنے افراد ہیں۔ گورنر نے اس شخص سمیت ان سب افراد کیلیے وظیفہ مقرر کر دیا۔ چناں چہ گورنر کی زندگی بھر اس شخص سے خراج معاف رہا اور گورنر کی جانب سے مقرر شدہ وہ وظیفہ بھی جاری رہا۔

(۲) آپؒ، اپنی ہمت وبساط کے بقدر، لوگوں کے دکھ سکھ میں شریک رہتے تھے۔ اہلِ تاریخ نے لکھا ہے کہ ابراہیم بن محمد ہمدانی پر وقت کے گورنر کی طرف سے زیادتیاں ہو رہی تھیں۔ اُس نے حضرت امام جوادؒ کو اپنی یہ صورتِ حال لکھ کر بھیجی۔ آپؒ کچھ کر تو نہیں سکتے تھے البتہ آپؒ کو دکھ بہت ہوا اور اس کی پریشانی میں شریک ہو کر اسے واپسی یہ خط لکھا: میری اللہ تعالی سے دلی دعا ہے کہ اللہ آپ کی مدد ونصرت فرمائے۔ امید رکھو انشاء اللہ دنیا میں بھی جلد اللہ تعالی کی مدد شاملِ حال ہوگی اور آخرت میں بھی، اور اس کے ساتھ کثرت سے اللہ تعالی کا شکر ادا کرتے رہو۔

(۳) آپؒ پریشان حال اور مصیبت زدہ لوگوں کے غم میں شریک ہو کر انہیں تسلی دیا کرتے تھے، چناں چہ ایک شخص جس کا بیٹا فوت ہو گیا تھا، کی طرف خط لکھ کر روانہ کیا جس میں تھا کہ مجھے معلوم ہوا ہے کہ آپ اس وقت اپنے صاحبزادے کی وجہ سے دکھ ومصیبت میں ہیں، اور مجھے یہ بھی بتایا گیا ہے کہ وہ آپ کو اولاد میں سے سب سے زیادہ پیارا تھا۔ دیکھو، اللہ تعالی اولاد وغیرہ دیگر اشیاء میں سے بھی عموماً عمدہ چیز لیتا ہے تاکہ اس بڑی مصیبت پر صبر کرنے سے بڑا اجر نصیب ہو۔ اللہ تعالی آپ کو اجرِ عظیم اور صبرِ جمیل عطا فرمائے، اور آپ کو جلد اس کا نعم البدل عطا فرمائے، اور مجھے اللہ تعالی سے قوی امید ہے کہ انشاء اللہ، اُس نے آپ کے حق میں یہ طے فرما دیا ہے۔

آپؒ کی انہی ہمدردیوں کا ہی نتیجہ تھا کہ لوگوں کے دلوں میں آپؒ کی محبت گھر کر چکی تھی اور وہ آپؒ پر دل وجان سے فدا ہوتے تھے۔[1]

---

(۱) ینظر: آل البیت حول الرسول، ص: ۲۵۳ بتلخیص وتسہیل

کرامات:

آپؒ کی کئی کرامات ہیں۔[1] ان میں سے ایک خاص کرامت نیچے درج کی جارہی ہے:

آپؒ جب بغداد سے مدینہ منورہ جانے لگے تو لوگوں کی ایک بڑی تعداد الوداع کرنے کیلیے آپؒ کے ساتھ چل دی، جب آپؒ شہر کے "بابِ کوفہ" پر پہنچے تو مغرب ہوگئی، آپؒ سواری سے اترے اور مغرب کی نماز ادا کرنے کیلیے وہیں قریب ایک پرانی مسجد میں تشریف لے گئے۔ مسجد کے صحن میں بیر کا درخت تھا جس نے کبھی پھل نہیں اٹھایا تھا۔ آپؒ نے پانی کا ایک مٹکا منگوایا اور اس درخت کی جڑ میں وضو کیا۔ پھر اٹھے اور لوگوں کو مغرب کی نماز پڑھائی۔ پہلی رکعت میں سورۃ فاتحہ کے ساتھ سورۃ النصر اور دوسری رکعت میں فاتحہ کے بعد سورۃ الاخلاص کی تلاوت کی۔ نماز سے فارغ ہوکر وہیں تھوڑی دیر بیٹھے ذکر میں مشغول رہے، پھر اٹھے اور چار رکعات نوافل ادا کیے۔ آخر میں آپؒ نے سجدۂ شکر ادا کیا پھر کھڑے ہوئے، اور لوگوں نے الوداع کیا۔ اس کے بعد آپؒ سفر پر روانہ ہوگئے۔

جب اگلے دن صبح ہوئی تو لوگوں نے دیکھا کہ رات ہی رات میں اس درخت نے پھل اٹھا لیے ہیں اور عمدہ قسم کے بیروں سے لدا ہوا ہے۔ لوگوں کو بہت حیرانی ہوئی اور اس سے بھی زیادہ حیرت اس وقت ہوئی جب ان بیروں کو کھایا تو ان میں گٹھلی نہیں تھی۔ لوگ اس کرامت سے بہت بہت حیران ہوئے۔[2]

---

(۱) ملاحظہ ہو: نور الأبصار، ص: ۲۲۱، ۲۲۲

(۲) الفصول المهمة، ص: ۲۵۸ وجامع کرامات الاولیاء: ۱۶۸/۱ و[أخبار الدول وآثار الأول، ص: ۳۴۸ ونور الأبصار، ص: ۲۲۲

(۹) حضرت امام علی نَقی ہادِی سلامُ اللہ ورحمۃُ علیہ

(علی بن محمد)

نام ونسب:

آپ سلامُ اللہ وَ رَحمۃُ علیہ، کا نام ''علی'' تھا، اور امام محمد تقی جوادؒ کے صاحبزادے تھے۔ آپؒ کی والدہ باندی تھیں اور اُن کا نام ''سَمانہ'' تھا۔[1]

آپؒ کی کنیت ''ابوالحسن'' تھی، اور آپؒ کو ''ابوالحسن ثالث'' کہا جاتا تھا (کیونکہ آپؒ سے پہلے حضرت علیؓ، اور امام زین العابدینؒ کی کنیت بھی ''ابوالحسن'' تھی، جیسے کہ ان حضرات کی سیرت میں گزر چکا ہے)،[2] اور آپ ''ابوالحسن عسکری'' سے بھی معروف تھے۔ ''عسکر'' ایک شہر ہے جس کی نسبت سے آپؒ کو ''عسکری'' کہا جاتا تھا حالانکہ آپؒ کا وطنِ ولادت مدینہ منورہ تھا اور آپؒ مدینہ طیبہ میں ہی رہتے تھے۔

''عسکری'' کہنے کی دراصل وجہ یہ ہے کہ بعض ناعاقبت اندیش لوگوں نے خلیفہ متوکل عباسی کے پاس کثرت سے آپؒ کی شکایتیں کیں، جس سے خلیفہ نے آپؒ کو ''مدینہ منورہ'' سے بلوا کر ''سامَرا''[3] شہر میں ٹھہرادیا اور اس

---

(۱) تاریخ الخمیس ۲/۲۸۷ ومطالب السؤول، ص: ۳۰۷ والفصول المھمۃ، ص: ۲۶۵

(۲) تاریخ الخمیس ۲/۲۸۷ والفصول المھمۃ، ص: ۲۶۵ ونور الأبصار، ص: ۲۲۴

(۳) ''سامَرا'': خلیفہ معتصم باللہ نے جب دیکھا کہ اس کے فوجی لشکر کی کثرت کی وجہ سے ''بغداد'' تنگ پڑ گیا ہے حتیٰ کہ لوگوں کو بھی اس سے اذیت ہونے لگی ہے تو اُس نے سن ۲۲۱ھ میں ''تکریت'' اور ''بغداد'' کے درمیان، دریائے دِجلہ کے مشرقی کنارے ایک بہت بڑا، خوبصورت اور عالیشان شہر آباد کیا جس کا نام ''سُرَّ مَنْ رَأَیٰ'' (یعنی جس نے بھی اسے دیکھا خوش ہوگیا) رکھا جو بعد میں مختصر ہوکر ''سامَرَّا'' (بالتشدید)، پھر مزید مختصر ہوکر ''سامَرَا'' (بلا تشدید) ہوگیا۔ اور کبھی ''سامَرَۃ'' اور ''سامَرَ آء'' بھی کہہ دیا جاتا ہے، جب شہر تیار ہوگیا تو خلیفہ اپنے ''عسکر'' (یعنی لشکر) سمیت وہیں منتقل ہوگیا، اسی مناسبت سے اس شہر کا نام ''عسکر'' پڑ گیا، حتیٰ کہ وہ باقی شہروں کے مقابلہ میں سب سے بڑے شہر کی شکل اختیار کر گیا، اور ایک مدت تک یہ خلفاء کا ''دار الخلافہ'' رہا، لیکن آج وہ ویران ہو چکا ہے اور اس میں سوائے چند لوگوں کے کوئی نہیں رہتا اور اب وہ بمشکل ایک چھوٹی سی بستی لگتا ہے (سچ ہے کہ ہر شے کو زوال ہے، باقی رہنے والی چیز صرف آخرت ہے، لہٰذا اسی گھر کو آباد کرنے کی فکر کرنی چاہیے)۔ ملاحظہ ہو: [سیرۃ آل بیت النبی الأطھار، ص: ۳۸۴ مع نور الأبصار، ص: ۲۲۴ والنبراس، ص: ۳۱۴ ومراصد الاطلاع ۲/۶۸۴]۔

شہر کو "عسکر" کہا جاتا تھا۔ چونکہ اب آپؒ کی رہائش مستقل طور پر "عسکر" میں ہوگئی تھی اس لیے آپؒ کو "عسکری" کہا جانے لگا اور پھر اسی نسبت سے ہی مشہور ہوئے۔ آپؒ نے اپنی حیاتِ طیبہ کے بیس سال اور نو ماہ یہاں گزارے اور یہیں انتقال ہوا۔ [1]

آپؒ کئی القابات سے نوازے گئے تھے، جیسے: نَقی، ہادِی، زَکی، متوکل، تَقی، ناصح، فَتاح، مرتضیٰ، فقیہ، متقی، امین، مؤتمن، اور طیّب۔ [2] لیکن ان میں سے دو لقب زیادہ مشہور تھے: نَقی اور ہادِی۔ پہلے لقب کی نسبت سے "امام علی نقی" اور دوسرے کے لحاظ سے "امام علی ہادی" کہلاتے ہیں، اور دونوں کو اکٹھا ملا کر "امام علی نقی ہادی" کہا جاتا ہے۔ البتہ عموماً عوام الناس میں آپؒ کا تذکرہ "امام نقیؒ" اور مصنفین کے ہاں "امام ہادیؒ" سے کیا جاتا ہے۔

ولادت:

آپؒ، ۱۳/ رجب، بروز اتوار، سن ۲۱۴ھ میں مدینہ طیبہ میں پیدا ہوئے۔ [3]

حلیہ مبارک:

آپؒ کا گندمی رنگ تھا۔ [4]

اولاد:

آپؒ کے چار صاحبزادے اور ایک صاحبزادی تھی:

حسن (جو امام حسن عسکریؒ کے نام سے مشہور ہوئے)، حسین، محمد، جعفر اور عائشہ۔ [5]

---

(۱) الأعلام للزركلي: ۴/۳۲۳ مع وفيات الأعيان ۳/۲۷۳ واللباب في تهذيب الأنساب: ۲/۳۴۰ وتاريخ بغداد وذيوله ۱۲/۵۶ و المنتظم في تاريخ الملوك والأمم ۱۲/۷۴

(۲) النبراس، ص: ۳۱۳ مع تاريخ ابن الوردي ۱/۲۲۳ ومطالب السؤول، ص: ۳۰۷ وآل البيت حول الرسول، ص: ۲۶۴ ونور الأبصار، ص: ۲۲۴ والفصول المهمة، ص: ۲۶۲

(۳) تاريخ الخميس ۲/۲۸۷ مع وفيات الأعيان ۳/۲۷۳ ومرآة الجنان وعبرة اليقظان ۲/۱۱۹ والشذرات الذهبية، ص: ۱۰۸

(۴) الفصول المهمة، ص: ۲۶۶ ونور الأبصار، ص: ۲۲۴ وأخبار الدول وآثار الأول، ص: ۳۴۹

(۵) الصواعق المحرقة ۲/۵۹۹ مع صحاح الأخبار، ص: ۵۴ والفصول المهمة، ص: ۲۷۱

علمی مقام اور تعظیمِ علماء:

اصحابِ سیرت وتاریخ نے لکھا ہے کہ آپ جلیل القدر مفتی بلکہ امامِ فقیہ تھے۔ [1] اور علم میں اپنے والد "امام محمد تقیؒ" کے حقیقی جانشین تھے۔ [2]

ایک مرتبہ خلیفہ واثق باللہ کی مجلس لگی ہوئی تھی، علماء وفقہاء کی ایک بڑی جماعت موجود تھی۔ قاضی یحییٰ بن اکثم نے وہاں موجود اُن فقہاء سے یہ سوال کیا: حضرت آدم علیہ السلام نے جب حج کیا تو ان کا "سَر" کس نے مونڈا تھا؟ جب سب جواب دینے سے عاجز آ گئے تو خلیفہ نے کہا: اب میں تمہارے سامنے ایسا آدمی پیش کروں گا جو اِس کا جواب دے گا، یہ کہا اور امام علی نقیؒ کے پاس ایک شخص بھیج کر انہیں بلوایا، پھر اُن سے مخاطِب ہو کر کہا: ابوالحسن! حج کے موقع پر حضرت آدم علیہ السلام کا سر، کس نے مونڈا تھا؟ امامِ عالی مقام نے فرمایا: امیر المومنین! اللہ کے واسطے اس کے جواب کی ذمہ داری مجھ پر نہ ڈالیں (کہ یہ بڑے بڑے فقہاء موجود ہیں ان سے دریافت کرلیں)۔ خلیفہ نے کہا: میں آپ کو قسم دیتا ہوں کہ اس کا جواب ضرور دینا ہوگا۔ آپؒ نے فرمایا: اگر اِصرار ہی ہے تو میں عرض کرتا ہوں کہ میرے والد (امام تقیؒ) نے حدیث بیان کی میرے دادا (امام رضاؒ) سے، انہوں نے اپنے والد (امام کاظمؒ) سے اور انہوں نے اپنے دادا (امام باقرؒ) سے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: أُمِرَ جِبْرِيلُ أَنْ يَنْزِلَ بِيَاقُوتَةٍ مِنَ الْجَنَّةِ فَهَبَطَ بِهَا فَمَسَحَ بِهَا رَأْسَ آدَمَ فَتَنَاثَرَ الشَّعْرُ مِنْهُ، فَحَيْثُ بَلَغَ نُورُهَا صَارَ حَرَمًا "حضرت جبریل علیہ السلام کو حکم دیا گیا کہ جنت سے یاقوت کا پتھر لے کر زمین پر اتریں، چناں چہ تعمیلِ حکم میں وہ یاقوت لے کر آئے، اور اُس کو آدم علیہ السلام کے سر مبارک پر پھیرا جس سے سر کے بال نیچے گر گئے (اور ان سے ایک نور نمودار ہوا)، جہاں جہاں تک وہ نور پہنچا وہ جگہ حدودِ حرم کے طور پر مقرر ہوگئی"۔ [3]

خلیفہ متوکل اپنے دورِ خلافت کے شروع میں ہی بیمار ہوگیا۔ اُس نے مَنت مانی کہ اگر میں اس بیماری سے شفایاب ہوگیا تو "بہت سے دینار" صدقہ کروں گا۔ جب وہ ٹھیک ہوگیا تو اُس نے فقہاء کو جمع کیا اور اُن سے پوچھا کہ اب کتنے

---

(1) کذا فی الإسلام، ص: ۱/۲۲۵ مع العبر فی خبر من غبر ۱/۳۶۴ و مرآۃ الجنان وعبرۃ الیقظان ۲/۱۱۹ وتاریخ الإسلام ۱۸/۲۱۹

(2) الصواعق المحرقۃ ۲/۵۹۸

(3) تاریخ بغداد وذیوله: ۱۲/۵۶ و تذکرۃ الخواص، ص: ۳۲۳ أما الحدیث فمذکور فی: [الدر المنثور فی التفسیر بالمأثور: ۱/۱۳۷ و کنز العمال ۱۲/۱۹۸

دینار صدقہ کروں؟ وہ کسی ایک جواب پر متفق نہ ہوسکے اور ان میں اختلاف ہوگیا۔ پھر خلیفہ نے امام علی نقی سلامُ اللہ وَرَحمۃُ علیہ، کے پاس قاصد بھیج کر مسئلہ دریافت کیا: انہوں نے فرمایا: تراسی (۸۳) دینار صدقہ کریں۔ بادشاہ کے پاس، قاصد جب یہ جواب لے کر حاضر ہوا تو اُن لوگوں کو اِس سے تعجب ہوا اور انہوں نے کہا: امیر المومنین! آپ اُن سے دریافت کریں کہ انہوں نے کہاں سے یہ جواب دیا ہے؟ خلیفہ نے پھر قاصد روانہ کردیا۔

آپؒ نے قاصد سے فرمایا: امیر المومنین سے کہنا کہ اِن سے آپ کی مَنت اس لیے پوری ہوجائے گی کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: {لَقَدْ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ فِي مَوَاطِنَ كَثِيرَةٍ} [التوبة: ۲۵] ترجمہ: (اے پیغمبر!) اللہ تعالیٰ نے بہت سے مقامات پر تمہاری مدد کی ہے}۔ اور یہ مقامات جن کو اللہ تعالیٰ نے ''بہت سے'' کے لفظ سے ذکر فرمایا ہے، (غزوات وسرایا سب ملا کر) اِن کی کل تعداد ''تراسی'' بنتی ہے (لہٰذا ''بہت سے دینار'' کہنے کی صورت میں تراسی دینار ادا کردینے سے وہ منت پوری ہوجائے گی)۔ ویسے امیر المومنین اپنی طرف سے جتنا زیادہ دیں، اُن کیلیے دنیا و آخرت میں اِس کا فائدہ ہی فائدہ ہے۔[1]

آپؒ ایک جلیل القدر عالم تھے اس کے باوجود آپؒ دوسرے علماء کی علمی مجالس میں شرکت کرتے، انہیں اہمیت ومقام دیتے اور اُن کی بات توجہ سے سنتے۔ ایک مرتبہ آپؒ ایک عالم کے درسِ حدیث میں شریک ہوکر اُس کی بات کو پوری اہمیت وتوجہ کے ساتھ سن رہے تھے کہ اس مجلس میں موجود بعض ہاشمی حضرات پر یہ بات گراں گزری اور وہ آپؒ کو کہنے لگے کہ آپؒ ساداتِ بنو ہاشم پر اس شخص کو اتنی ترجیح کیوں دے رہے ہیں؟ آپؒ نے اُنہیں تنبیہ کرتے ہوئے فرمایا: اُن لوگوں میں سے شمار ہونے سے بچو جن کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں فرمایا ہے: {أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ أُوتُوا نَصِيبًا مِنَ الْكِتَابِ يُدْعَوْنَ إِلَى كِتَابِ اللّٰهِ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ يَتَوَلَّى فَرِيقٌ مِنْهُمْ وَهُمْ مُعْرِضُونَ} [آل عمران: ۲۳] ترجمہ: کیا تم نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جنہیں کتاب کا ایک حصہ دیا گیا تھا، کہ انہیں کتاب اللہ کی طرف دعوت دی جاتی ہے تا کہ وہ کتاب ان کے درمیان فیصلہ کرے، اس کے باوجود ان میں سے ایک گروہ منہ موڑ کر انحراف کرجاتا ہے} پھر اُن سے فرمایا: کیا تم کتاب اللہ کے ''فیصل'' ہونے پر راضی نہیں ہو؟

---

(۱) المنتظم في تاريخ الملوك والأمم ۱۲/۷۵ والوافي بالوفيات ۲۲/۵۶ والأنساب للسمعاني ۹/۳۰۳ و تاريخ بغداد وذيوله ۱۲/۵۶ وتاريخ الإسلام ۱۹/۲۱۸

انہوں نے کہا: کیوں نہیں۔

اس پر آپؒ نے فرمایا: کیا اللہ نے اپنی کتاب میں یہ نہیں فرمایا: {يَرْفَعِ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا مِنكُمْ وَالَّذِينَ أُوتُوا الْعِلْمَ دَرَجَاتٍ} (المجادلة: ١١) یعنی تم میں سے جو لوگ ایمان لائے ہیں اور جن کو علم عطا کیا گیا ہے، اُن کو اللہ تعالیٰ بلند درجے عطا فرمائے گا۔

تو پھر تم یہ کیوں اعتراض کررہے ہو کہ میں اس عالم کو اہمیت ومقام دے رہا ہوں اوران کی تعظیم وتکریم کررہا ہوں، حالانکہ ان کو اللہ نے بلند درجہ اور عزت وعظمت دی ہے۔[1]

''مدینہ طیبہ'' سے ''سامَرا'' کی طرف منتقلی، اور بادشاہ سے آپؒ کی شکایت کا قصہ:

خلیفہ متوکل عباسی نے آپؒ کو مدینہ طیبہ سے جہاں بدخواہ لوگوں کی شکایتوں کی وجہ سے بلوایا تھا وہاں یہ وجہ بھی تھی کہ وہ خود امام علی نقی سَلامُ اللہِ وَ رَحمۃُ علیہ اوران کی اولاد سے بغض رکھتا تھا۔ اُس کو جب یہ پتا چلا کہ اہلِ مدینہ امام علی نقیؒ کی بڑی عزت کرتے ہیں اوران کی طرف قلبی رجحان رکھتے ہیں تو اُس کو امامؒ کے اس عالی مقام سے خوف ہوا۔ اِس صورتِ حال کے تناظر میں اُس نے یحییٰ بن ہَرثَمہ کو بلا کر کہا: تم مدینہ جاؤ، علی نقی کے حالات کی تحقیق کرو اور پھر اُسے میرے پاس لے آؤ۔

یحییٰ بن ہَرثَمہ کہتے ہیں: میں مدینہ منورہ روانہ ہوگیا (اور وہاں کے لوگوں کو شاید میری اطلاع ہوچکی تھی)۔ جب میں وہاں پہنچا تو اہلِ مدینہ، امام علی نقیؒ پر خوف کھاتے ہوئے، چیخ اٹھے اور اس قدر آہ وبکاء کی آوازیں گونجیں کہ اہلِ مدینہ نے شاید اتنی اونچی آوازیں کبھی نہیں سنی ہوں گی، یہ سب اس وجہ سے تھا کہ آپؒ اہلِ مدینہ کے ساتھ بہت اچھے تھے، اکثر مسجد میں وقت گزارتے اور دنیا کی طرف کوئی میلان نہیں تھا۔ یحییٰ کہتے ہیں کہ میں اُن لوگوں کو تسلی دیتا اور قسم کھاتا کہ مجھے اُن کے بارے میں کوئی ناخوشگوار بات کہہ کر نہیں بھیجا گیا، اور میں یہ حقیقت کہہ رہا ہوں کہ اُن کو کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔

اس کے بعد تحقیقِ حال کیلیے میں نے اُن کے گھر کی تلاشی لی تو مجھے سوائے قرآن مجید کے چند نسخوں، اور دینی کتابوں کے کچھ نہ ملا۔ اس سے میرے دل میں اُن کی بڑی عظمت بیٹھ گئی۔ اور تعمیلِ حکم میں اُن کو بغداد لاتے ہوئے،

---

(1) آل البيت حول الرسول، ص: ٢٦٦

مَیں سفر کے دوران اُن کی خدمت کرتا رہا اور اُن کے ساتھ حسنِ سلوک سے پیش آتا رہا۔ جب میں اُن کو ساتھ لیے بغداد پہنچا تو سب سے پہلے مَیں اسحاق بن ابراہیم طاہری کے پاس گیا، وہ اُس وقت بغداد کے گورنر تھے۔ انہوں نے مجھے کہا: یَا یَحیٰی! اِنَّ هٰذَا الرَّجُلَ قَدْ وَلَدَهٗ رَسُولُ اللهِ، وَالْمُتَوَکِّلُ مَنْ تَعْلَمُ، فَاِنْ حَرَّضْتَهٗ عَلَيْهِ قَتَلَهٗ وَکَانَ رَسُوْلُ اللهِ خَصْمَکَ یَوْمَ الْقِیَامَةِ "یحییٰ! یہ شخص (یعنی امام علی نقیؒ) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مبارک اولاد (و پاکیزہ خاندان) میں سے ہے، اور "متوکل" کو تم جانتے ہو (کہ وہ کیسا سخت آدمی ہے)، لہٰذا اگر تم نے اِن کے خلاف اُسے کوئی بات کہی تو وہ انہیں قتل کردے گا، اور پھر روزِ محشر خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تیرے خلاف مدعی ہوں گے"۔ میں نے کہا: واللہ! مجھے تو ان کا ہر کام ہی بھلا لگا ہے۔ پھر میں آپؒ کو لے کر "سُرَّ مَنْ رَأٰی"[1] پہنچا اور سب سے پہلے "وصیف" کے پاس گیا اور انہیں بتایا کہ میں اُن کو لے آیا ہوں۔ وہ کہنے لگے: واللہ! اگر اُن کا ایک بال بھی بیکا ہو گیا تو اُس کے بھی تم ہی ذمہ دار ہوگے۔ یحییٰ کہتے ہیں: میں بڑا حیران ہوا کہ کیسی عجیب بات ہے کہ اِنہوں نے بھی وہی بات کہی جو اسحاق طاہری نے کہی تھی۔

قصہ مختصر، میں جب خلیفہ متوکل کے پاس حاضر ہوا تو اُس نے اُن کے بارے میں پوچھا۔ میں نے کہا: "وہ بہت نیک سیرت شخص ہے، فتنہ فساد سے کوسوں دُور، پُرامن انسان ہے، بہت ہی پرہیزگار اور دنیا سے بے رغبت آدمی ہے۔ میں نے اُس کا گھر چھان مارا مگر قرآن مجید کے چند نسخوں اور دینی کتب کے سوا مجھے کچھ نہیں ملا، اور اہلِ مدینہ اُن کے بارے میں بڑے گھبرائے ہوئے ہیں"۔

اِس پر متوکل نے آپؒ کے ساتھ عزت و اکرام والا معاملہ کیا، آپؒ کو مالی ہدیہ بھی دیا اور نہایت حسنِ سلوک سے پیش آیا، پھر وہیں "سُرَّ مَنْ رَأٰی" میں آپؒ کو ٹھہرا دیا۔[2]

باوجودیکہ امام علی نقی سَلَامُ اللهِ وَرَحْمَتُهٗ علیہ اُسی شہر میں رہتے تھے جس میں متوکل رہتا تھا اور حکومتی جاسوس آپؒ کے

---

(۱) "سُرَّ مَنْ رَأٰی": یہ ایک شہر کا نام ہے، اس کی وضاحت پیچھے قریب ہی گزر چکی ہے۔

(۲) تذکرۃ الخواص، ص: ۳۲۲ و آل البیت حول الرسول، ص: ۲۷۱

ملحوظة: حُكي سبب شخوص الإمام علي المذكور رحمه الله من المدينة إلى سامراء في [الفصول المهمة، ص: ۲۶۷] غير ما ذكر ههنا. ولا يكاد ان يعوّل على تلك الحكاية نظراً إلى ما كان من عداوة المتوكل العباسي للإمام علي رحمه الله فأعرضنا عنها ونقلنا ما نقلنا من مصادر اخرى. والله أعلم.

تعاقب میں رہتے تھے، تاہم کسی نے متوکل کے پاس آپؒ کے متعلق یہ شکایت کی کہ اس کے گھر میں ہتھیار ہیں اور اس کے حمایتی گروہ کے خطوط بھی موجود ہیں، اور یہ آنجناب کا پایۂ تخت الٹنا چاہتا ہے۔ چناں چہ متوکل نے ایک فوجی دستہ بھیجا جو رات کی تاریکی میں چپکے سے آپؒ کے گھر گھس گیا۔ انہوں نے دیکھا کہ آپؒ ایک بند کمرے میں ہیں، بالوں کا چوغہ پہن رکھا ہے، سر پر اُون کی چادر لیے رُو بقبلہ بیٹھے ہیں، کبھی جنت کی آیات اور کبھی جہنم کی آیات کو پُرسوز آواز میں بار بار پڑھتے ہیں اور ننگی زمین پر بیٹھے ہیں، نیچے ریت و کنکریوں کے سوا کوئی بچھونا نہیں۔

بہرکیف، آدھی رات کو ہی اِسی حالت میں آپؒ کو اٹھا لیا گیا، اور اُسی وقت بادشاہ کے پاس آپؒ کو پیش کر دیا گیا۔ متوکل کے پاس اس وقت شراب کا دَور چل رہا تھا اور متوکل کے ہاتھ میں جامِ شراب تھا۔ اُس نے آپؒ کو اپنے سامنے کھڑا دیکھا تو آپؒ کو اہمیت دی اور اپنے ساتھ بٹھا لیا، پھر شراب کا پیالہ جو اُس کے ہاتھ میں تھا، آپؒ کی طرف بڑھایا۔ اِس پاکیزہ ہستی نے کہا: **يَا أَمِيرَ الْمُؤْمِنِينَ! إِنَّهُ لَمْ يَدْخُلْ بَاطِنِي وَلَمْ يُخَالِطْ لَحْمِي وَدَمِي قَطُّ، فَاَعْفِنِي مِنْهُ** ''امیر المومنین! آج تک شراب کا ایک گھونٹ بھی میرے اندر نہیں گیا اور میرے گوشت وخون میں اس کے ایک قطرے کی آمیزش بھی نہیں ہے، برائے مہربانی مجھے اس سے آزاد رکھیں''۔ اس نے پیالہ پیچھے کر لیا اور کہنے لگا: چلو کچھ اشعار سناؤ جو مجھے اچھے لگیں۔ آپؒ نے فرمایا: مجھے اشعار زیادہ نہیں آتے۔ اس نے کہا: یہ تو سنانے ہی پڑیں گے۔ پھر آپؒ نے درج ذیل اشعار سنائے:

بَاتُوا عَلَى قُلَلِ الْأَجْبَالِ تَحْرُسُهُمْ ... غُلْبُ الرِّجَالِ فَمَا أَغْنَتْهُمُ الْقُلَلُ

وَاسْتُنْزِلُوا بَعْدَ عِزٍّ عَنْ مَعَاقِلِهِمْ ... فَأُوْدِعُوا حُفَرًا يَا بِئْسَ مَا نَزَلُوا

نَادَى بِهِمْ صَارِخٌ مِنْ بَعْدِ مَا قُبِرُوا ... أَيْنَ الْأَسِرَّةُ وَالتِّيجَانُ وَالْحُلَلُ

أَيْنَ الْوُجُوهُ الَّتِي كَانَتْ مُنَعَّمَةً ... مِنْ دُونِهَا تُضْرَبُ الْأَسْتَارُ وَالْكِلَلُ

فَأَفْصَحَ الْقَبْرُ عَنْهُمْ حِينَ سَاءَلَهُمْ ... تِلْكَ الْوُجُوهُ عَلَيْهَا الدُّودُ يَقْتَتِلُ

قَدْ طَالَ مَا أَكَلُوا دَهْرًا وَمَا لَبِسُوا ... فَأَصْبَحُوا بَعْدَ طُولِ الْأَكْلِ قَدْ أُكِلُوا

۱۔ وہ لوگ (یعنی بادشاہ) پہاڑوں کی چوٹیوں پر رات اس حال میں گزارتے تھے کہ بہادر لوگ ان کا پہرہ دیتے تھے، مگر وہ چوٹیاں اُن کے کسی کام نہ آئیں۔

۲۔ عزت والی زندگی گزارنے کے بعد ان کے محفوظ قلعوں سے انہیں نیچے اتارا گیا، اور گڑھوں کے سپرد کر دیا گیا۔ ہائے! کیا ہی بُری ہے وہ جگہ جس میں وہ اترے۔

۳۔ قبروں میں اتار دیے جانے کے بعد گویا کسی منادی نے ان کو آواز دی، کہ کہاں ہیں وہ تخت (جن پر تم بیٹھا کرتے تھے)؟ کہاں ہیں وہ تاج (جنہیں تم سروں پر سجایا کرتے تھے)؟ اور کہاں ہیں وہ عمدہ قسم کے لباس (جنہیں تم زیب تن کیا کرتے تھے)؟

۴۔ وہ نرم و نازک چہرے کہاں گئے جن کو (عام لوگوں کی پہنچ سے) دور رکھنے کیلیے، ان کے آگے پردے اور باریک کپڑے ڈال دیے جاتے تھے؟

۵۔ جب کسی نے ان کا پوچھا تو قبر نے یہ کہہ کر ان کی حقیقت کو واضح کر دیا، کہ ان چہروں پر کیڑے آپس میں لڑ رہے ہیں۔

۶۔ لمبے زمانے تک انہوں نے کھایا اور پہنا۔ طویل کھانے پینے کے بعد وہ کیڑوں کی خوراک بن گئے۔

یہ اشعار سن کر حاضرینِ مجلس آپؒ کے بارے میں ڈر گئے کہ ابھی ان کے بارے میں کوئی ناخوشگوار حکم جاری ہو جائے گا۔ مگر معاملہ برعکس ہوا کہ متوکل پر گریہ طاری ہو گیا، وہ دیر تک روتا رہا یہاں تک کہ اس کی ڈاڑھی گیلی ہو گئی اور دوسرے حاضرین بھی رو دیے۔ متوکل نے کہا: شراب اٹھا لو۔ پھر آپؒ سے کہا: ابوالحسن! کیا آپ پر کچھ قرض ہے؟ فرمایا: جی ہاں، چار ہزار دینار ہیں۔ متوکل نے کہا: ان کو یہ رقم دے دی جائے، پھر ان کو عزت واحترام کے ساتھ گھر بھجوا دیا۔ [1]

کسبِ حلال کیلیے کھیتوں میں کام کرنا:

آپؒ اپنے بال بچوں کی کفالت کیلیے اپنی زمین میں خود اپنے ہاتھوں سے کھیتی باڑی کرتے تھے اور اس میں عار بھی محسوس نہیں کرتے تھے۔ علی بن حمزہ کہتے ہیں کہ میں نے ابوالحسن ثالثؒ کو دیکھا کہ وہ زمین میں کام کر رہے تھے اور ان کے پاؤں تک پسینا بہہ رہا تھا۔ میں نے عرض کی: میں آپ پر قربان جاؤں، کوئی اور آدمی نہیں ہے (کہ آپ کے

---

(۱) الوافي بالوفيات ۲۲/۴۸ وتاريخ ابن الوردي ۱/۲۲۳ و وفيات الأعيان ۳/۲۷۲ و مرآة الجنان وعبرة اليقظان ۲/۱۱۹ و[شذرات الذهب في أخبار من ذهب ۳/۲۴۲ والمختصر في أخبار البشر ۲/۴۴ والشذرات الذهبية، ص:۱۰۷ وتذكرة الخواص، ص:۳۲۳ مع البداية والنهاية ط الفكر ۱۱/۱۵

بجائے، وہ یہ کام کردیتا)؟ امام ہادیؒ نے فرمایا: یَا عَلِيُّ! قَدْ عَمِلَ بِالْمِسْحَاةِ مَنْ هُوَ خَيْرٌ مِنِّي وَمِنْ أَبِي، فِي أَرْضِهِ: ''علی! کدال سے زمین میں کام تو اُس ہستی نے کیا تھا جو مجھ سے اور میرے والد سے بہتر تھی''۔ میں نے کہا: وہ کون؟ فرمایا: وہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں، اُن کے علاوہ امیر المومنین حضرت علیؓ اور میرے تمام آباء واَجداد نے اپنے ہاتھوں سے کام کیا ہے، پھر فرمایا: هٰذَا مِنْ عَمَلِ النَّبِيِّينَ وَالْمُرْسَلِينَ وَالصَّالِحِينَ ''یہ نبیوں، رسولوں اور صالحین کا کام ہے''۔[1]

وفات:

آپؒ نے چالیس برس کی عمر پائی اور ۲۵/ جُمادَی الثانیہ، بروز پیر، سن ۲۵۴ھ کو ''سُرَّ مَنْ رَأَى'' میں انتقال فرمایا۔[2]
خلیفہ ''متوکل علی اللہ'' نے آپؒ کو مدینہ منورہ سے ''سُرَّ مَنْ رَأَى'' بلوایا تھا جیسا کہ شروع میں گزرا، پھر آپؒ نے یہیں اقامت اختیار کرلی تھی اور بیس سال نو ماہ قیام پذیر رہے بالآخر یہیں (''سُرَّ مَنْ رَأَى'' میں) انتقال ہوا اور آپؒ کو یہیں اپنے گھر میں دفن کیا گیا، جو آپؒ نے دلیل بن یعقوب نصرانی سے خریدا تھا۔[3] اب آپؒ کی قبر وہیں ''سُرَّ مَنْ رَأَى'' میں ہے۔ بعض کا خیال ہے کہ آپؒ کی قبر ایران کے شہر ''قُم'' میں ہے لیکن یہ بات صحیح نہیں ہے، صحیح یہ ہے کہ امام موسیٰ کاظمؒ کی صاحبزادی ''فاطمہ'' کی قبر ''قُم'' میں ہے۔[4] متوکل کے بیٹے ''ابو احمد'' نے آپؒ کی نمازِ جنازہ پڑھائی اور یہ نماز ''ابو احمد'' کی طرف منسوب ایک شاہراہِ عام پر ادا کی گئی۔[5]

بعض نے کہا ہے کہ زہر دیے جانے سے آپؒ کا انتقال ہوا اور آپؒ شہید فوت ہوئے تھے، واللہ اعلم۔[6]
آپؒ نے اپنے والد ماجد کی وفات کے بعد چھ خلفاء کا زمانہ پایا: مُعتصِم باللہ، واثق باللہ، مُتوکّل علی اللہ، مُنتصِر باللہ، مُستعین باللہ، اور مُعتز باللہ۔ اِسی معتز باللہ کے اخیر دورِ حکومت میں آپؒ کا انتقال ہوا۔[7]

---

(۱) آل البيت حول الرسول، ص: ۲۶۵
(۲) الفصول المهمة، ص: ۲۷۰ والوافي بالوفيات: ۲۲/۴۹ ووفيات الأعيان: ۳/۲۷۲ وتاريخ بغداد وذيوله: ۱۲/۵۷ والشذرات الذهبية، ص: ۱۰۹.
(۳) تاريخ بغداد وذيوله: ۱۲/۵۶ والأنساب للسمعاني: ۹/۳۰۳ مع الأعلام للزركلي ۴/۳۲۳
(۴) مطالب السؤول، ص: ۳۰۸ وتذكرة الخواص، ص: ۳۲۴ مع تاريخ الخميس ۲/۲۸۷
(۵) تاريخ الطبري ۹/۳۸۱ والمنتظم في تاريخ الملوك والأمم ۱۲/۷۴ والكامل في التاريخ ۶/۲۵۱
(۶) صحاح الأخبار، ص: ۵۴ والفصول المهمة، ص: ۲۷۱ ونور الأبصار، ص: ۲۲۶ وتذكرة الخواص، ص: ۳۲۴
(۷) الفصول المهمة، ص: ۲۷۰ وصحاح الأخبار، ص: ۵۴ والأنساب للسمعاني ۹/۳۰۳

فضائل وخصائص

آپؒ کے ہم عصر مشائخ کا اس بات پر اتفاق ہے کہ آپؒ وسیع علم، عظیم فضل، بلند و بالا حکمت، وقار و متانت اور حلم وہیبت کے مالک تھے۔[1] آپؒ کی شرافت وجلالت مشہور تھی۔[2] اور فضل وکمال اور عزت وعظمت کی بلندیوں کو چھوتے تھے۔[3] جہاں آپؒ بہت بڑے مفتی تھے وہاں نیکی وتقوی کی بھی چوٹیوں پر فائز تھے۔[4] اور آپؒ کا شمار بلند پایہ متقین اور صالحین میں ہوتا تھا۔[5]

بعض علماء نے نہایت خوبصورت تعبیرات کے ساتھ آپؒ کی شان بیان کی ہے، چناں چہ لکھا ہے کہ:

ابوالحسن علی نقیؒ کے فضل وکمال نے زمین پر اپنے خیمے گاڑ لیے تھے، ستاروں پر اپنے کمند ڈال دیے تھے، جس خاندانی خوبی کو بھی شمار کیا جاتا ہے اُس کی راہیں آپؒ پر اختتام پذیر ہوتی ہیں، جس شریفانہ فعل کا بھی تذکرہ کیا جاتا ہے اُس کا اعزاز آپؒ کو حاصل ہوتا ہے، جو قابلِ ستائش عمل بھی بیان کیا جاتا ہے وہ اپنے کمال کے ساتھ آپؒ میں پایا جاتا ہے، اور جس کیفیتِ عالیہ کو بھی نگاہِ عظمت سے دیکھا جاتا ہے اُس کے آثار آپؒ پر نمایاں ہوتے ہیں۔

دراصل آپؒ کا اِن تمام فضائل کے مستحق ٹھہرنے کی وجہ یہ ہے کہ آپؒ نے اپنی ذات میں ایسی شرافت پیدا کرلی تھی جس کی بدولت آپؒ ایک منفرد شخصیت کے حامل ہوگئے تھے، اور کردار کی ایسی بلندی اپنالی تھی جس میں آپؒ کو اپنی طبیعت پر مکمل قابو ہوگیا تھا، اور یہ قابو اس طرح حاصل ہوا تھا کہ آپؒ نے نفس وطبیعت کی ایسی کڑی حفاظت کی جیسے کوئی چرواہا اپنی بیش بہا جوان اونٹنیوں کی حفاظت کرتا ہے، چناں چہ آپؒ ترقی کی اس منزل پر پہنچ گئے کہ آپؒ کا نفس مہذب وشائستہ، اخلاق عمدہ وعالی، سیرت صالحانہ، اور عادات فاضلانہ ہوگئی تھیں، نیز احسان وکرم کے طلب گاروں کے ساتھ آپؒ کی امتیازی خصوصیات مربوط ہوگئی تھیں، اور بھلائی کی راہیں آپؒ کے دَم قدم سے آباد وشاداب ہوگئی تھیں۔

---

(۱) آل البيت حول الرسول، ص: ۲۶۴

(۲) سير أعلام النبلاء ۱۲۱/۱۳

(۳) الجوهر الشفاف في أنساب السادة الأشراف: ۱/۱۶۱

(۴) دُوَل الإسلام، ص: ۲۲۵/۱ مع أحداث التاريخ الإسلامي، ۱۳۱/۲ أحداث سنة: ۲۵۴ھ

(۵) الأعلام للزركلي ۳۲۳/۴

اور وقار ومتانت، اطمینان وعفت، پاکیزگی اور نام ونمود سے دُوری میں آپؒ نے نبوی طریقے، علوی عادات، پاکیزہ نفس اور بلند ہمتی کو مشعلِ راہ بنایا تھا، اور آپؒ ایسے خوبصورت طریقۂ حیات پر گامزن ہوگئے تھے کہ اُس وقت اِس میں آپؒ کا کوئی شریک وہم مرتبہ نہیں تھا، شرکت تو درکنار اُس مقام ومرتبے کی حرص کرنا بھی کوئی آسان کام نہ تھا۔[1]

عبادت:

اللہ تعالیٰ کی طرف ہر وقت رجوع وانابت، خاص طور پر راتوں کی مناجات وعبادت، اور ذکر وتلاوت تو اہلِ بیت کی خصوصی شناخت اور امتیازی علامت تھی۔ امام علی نقیؒ میں بھی عبادت کا یہ پہلو نمایاں تھا۔ آپؒ کے بارے میں آتا ہے کہ آپؒ صرف عبادت گزار ہی نہیں بلکہ خلوتوں وتنہائیوں میں یکسوئی کے ساتھ عبادت میں لگنے والے تھے۔ اور آپؒ کے زمانہ میں لوگوں کی آنکھوں نے عبادت وریاضت اور تقویٰ کے اندر آپؒ جیسا کوئی فرد نہیں دیکھا۔ اہتمامِ عبادت تو اسی سے ظاہر ہوتا ہے کہ شب وروز کی کوئی نفل نماز بھی آپؒ سے نہیں چھوٹتی تھی۔[2]

نماز کے ساتھ ساتھ آپؒ دعاء ومناجات میں بھی بطورِ خاص مشغول رہتے۔ الحاح وزاری سے لبریز متعدد پُرسوز وپُرمغز دعائیں آپؒ سے منقول ہیں، جن میں سے چند درج ذیل ہیں:

اَللّٰھُمَّ إِنِّي أَسأَلُکَ بِاسْمِکَ الَّذِي خَلَقْتَ بِهِ خَلْقَکَ، وَرَزَقْتَھُم کَیفَ شِئتَ، وکَیفَ شَاءُوا، یَامَن لَا یُغَیِّرُہ الأیَّامُ واللَّیَالِي، أَدْعُوکَ بِمَا دَعَاکَ بِهِ نُوحٌ حِینَ نَادَاکَ فَأَنْجَیتَه، ومَن مَعَه، وأَھلَکتَ قَومَه... وأَدعُوکَ بِمَا دَعَاکَ بِهِ إِبرَاھِیمُ خَلِیلُکَ، حِینَ نَادَاکَ، فَأَنْجَیتَه، وجَعَلتَ النَّارَ عَلَیهِ بَرْدًا وسَلَامًا... وأَدْعُوکَ بِمَا دَعَاکَ بِهِ مُوسٰی کَلِیمُکَ، حِینَ نَادَاکَ، فَفَلَقتَ لَه البَحرَ، فَأَنْجَیتَه، وبَنِي إِسْرائِیلَ، وأَغْرَقتَ فِرعونَ وقَومَه فِي الْیَمِّ... وأَدْعُوکَ بِمَا دَعَاکَ بِهِ عِیسٰی رُوحُکَ حِینَ نَادَاکَ، فَنَجَّیتَه مِن أَعدَائِکَ، وإِلَیکَ رَفَعتَه... وأَدْعُوکَ بِمَا دَعَاکَ بِهِ حَبِیبُکَ وصَفِیُّکَ ونَبِیُّکَ مُحَمَّدٌ صلی الله علیه وسلم فَاسْتَجَبْتَ لَه، ومِنَ الأَحزَابِ نَجَّیتَه، وعَلٰی أَعدَائِه نَصَرتَه. وأَسأَلُکَ بِاسْمِکَ الَّذِي إِذَا

---

(۱) الفصول المهمة، ص: ۲۷۰ بتلخیص وتسهیل

(۲) آل البیت حول الرسول، ص: ۲۶۵ مع العبر في خبر من غبر: ۱/۳۶۳ و مرآة الجنان وعبرة الیقظان: ۲/۱۱۹

دُعِیتَ بِهٖ أَجَبتَ.

اے اللہ! میں تیرے اُس نام کے طفیل تجھ سے سوال کرتا ہوں جس سے تُو نے اپنی مخلوق کو پیدا کیا، اور اُسے اپنی اور اُن کی چاہت کے مطابق روزی دی۔ اے وہ ذات، جس میں شب و روز کی گردش تغیّر نہیں لاسکتی! میں تجھ سے وہ دعاء مانگتا ہوں جو نوحؑ نے تجھ سے مانگی تھی اور اُس پر تُو نے اُن کے ساتھیوں سمیت انہیں نجات دی تھی اور اُن کی قوم کو ہلاک کیا تھا، میں تجھ سے وہ دعاء بھی مانگتا ہوں جو تیرے خلیل ابراہیمؑ نے مانگی تھی پھر تُو نے انہیں نجات دی تھی اور ان کیلیے آگ ٹھنڈی اور سلامتی والی بنادی تھی، میں تجھ سے وہ دعاء بھی مانگتا ہوں جو تیرے کلیم موسیٰؑ نے مانگی تھی پھر تُو نے سمندر میں راستے بنا کر انہیں بنی اسرائیل سمیت نجات دی تھی اور فرعون کو اُس کی قوم سمیت غرق کیا تھا، میں تجھ سے وہ دعاء بھی مانگتا ہوں جو تجھ سے عیسیٰؑ نے مانگی تھی پھر تُو نے انہیں دشمنوں سے بچا کر اپنے پاس (زندہ) اٹھالیا تھا، اور میں وہ دعاء مانگتا ہوں جو تجھ سے تیرے حبیب و محبوب، نبی و رسول حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ نے مانگی تھی پھر تُو نے وہ دعاء قبول کر کے انہیں مخالفین سے نجات دی تھی اور دشمنوں کے مقابلہ میں ان کی مدد و نصرت فرمائی تھی۔ اے اللہ! میں تیرے اُس نام کے طفیل تجھ سے سوال کرتا ہوں کہ جب اُس نام کے واسطہ سے کوئی دعاء کی جاتی ہے تو تُو ضرور قبول کرتا ہے۔

یَا مَن لَهُ الخَلقُ وَ الأَمرُ! یَا مَن أَحَاطَ بِکُلِّ شَيءٍ عِلمًا! یَا مَن أَحصیٰ کُلَّ شَيءٍ عَدَدًا! یَا مَن لَا تُغَیِّرُهُ الأَیَّامُ وَ اللَّیَالِي وَ لَا تَتَشَابَهُ عَلَیهِ الأَصوَاتُ، وَ لَا تَخفیٰ عَلَیهِ اللُّغَاتُ، وَ لَا یُبرِمُهُ إِلحَاحُ المُلِحِّینَ! أَسأَلُکَ أَن تُصَلِّيَ عَلیٰ مُحَمَّدٍ وَ آلِ مُحَمَّدٍ خَیرَتِکَ مِن خَلقِکَ.. فَصَلِّ عَلَیهِم بِأَفضَلِ صَلَوَاتِکَ.. وَ صَلِّ عَلیٰ جَمِیعِ النَّبِیِّینَ وَ المُرسَلِینَ، الَّذِینَ بَلَّغُوا عَنکَ الهُدیٰ.. وَ عَقَدُوا لَکَ المَوَاثِیقَ بِالطَّاعَةِ.. وَ صَلِّ عَلیٰ عِبَادِکَ الصَّالِحِینَ.

اے وہ ذات، جو خالق ہے اور جس کا حکم چلتا ہے! اے وہ ذات، جس کے علم سے کوئی شئ باہر نہیں! اے وہ ذات، جو سب کچھ جانتی ہے! اے وہ ذات، جس میں دن رات کے بدلنے سے کوئی تبدیلی نہیں آتی! اے وہ ذات، جس کے آگے مخلوقات کی آوازیں آپس میں ملتی نہیں، جس پر کوئی بولی مخفی نہیں، اور جو مانگنے والوں کے بار بار مانگنے سے اکتاتا نہیں! میں تجھ سے عرض کرتا ہوں کہ اپنی مخلوق میں سب سے بہترین ہستی محمد رسول اللہ ﷺ اور اُن کی آل پر رحمت

نازل فرما اور افضل واعلیٰ رحمت نازل فرما، اور تمام نبیوں و رسولوں پر رحمت نازل فرما جنہوں نے تیری طرف سے پیغامِ ہدایت پہنچایا اور تیری اطاعت پر بخوبی کاربند رہے، اور اپنے نیک بندوں پر بھی رحمت نازل فرما۔

يَا مَن لَا يُخلِفُ المِيعَادَ! أَنجِزْ لِي مَا وَعَدْتَنِي، وَاجْمَعْ لِي أَصْحَابِي، وَصَبِّرْهُم، وَانْصُرْنِي عَلَى أَعْدَائِكَ، وَأَعْدَاءِ رُسُلِكَ.. وَلَا تُخَيِّبْ دَعْوَتِي.. فَإِنِّي عَبْدُكَ وَابْنُ عَبْدِكَ، ابْنُ أَمَتِكَ.. أَسِيرٌ بَينَ يَدَيكَ.

سَيِّدِي! أَنتَ الَّذِي مَنَنتَ عَلَيَّ بِهٰذَا المَقَامِ، وَتَفَضَّلْتَ بِهِ عَلَيَّ دُونَ كَثِيرٍ مِن خَلْقِكَ.. أَسأَلُكَ أَن تُصَلِّيَ عَلَى مُحَمَّدٍ وَآلِ مُحَمَّدٍ، نَّكَ عَلَى كُلِّ شَيءٍ قَدِيرٌ.

اے وہ ذات، جو وعدے کی خلاف ورزی نہیں کرتی! اُس وعدے کی تکمیل فرما جو تُو نے ہم سے کر رکھا ہے، اور میرے ساتھیوں کو میرے ساتھ اکٹھا فرما کر اُنہیں ثابت قدمی عطا فرما اور پھر اپنے اور اپنے رسولوں کے دشمنوں کے خلاف میری مدد و نصرت فرما، اور میری دعاء کو رَد نہ فرما، کہ میں تیرا بندہ ہوں اور تیرے بندے اور بندی کی اولاد ہوں، اور تیرے آگے قیدی کی طرح حاضر ہوں۔

اے میرے آقا! تُو نے ہی احسان فرما کر مجھے (اسلام واطاعت کا) یہ مقام عطا فرمایا اور اپنی بہت ساری مخلوق میں سے مجھ پر فضل فرمایا۔ میں تجھ سے اس بات کا سوال کرتا ہوں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی آل پر خصوصی رحمتیں نازل فرما، بلاشبہ تُو ہر چیز پر قادر ہے۔

(۲) اپنی دعاؤں میں اللہ کی حمد وثناء بیان کیا کرتے، اور کہا کرتے:

اَلحَمدُ لِلّٰهِ الَّذِي يُؤمِنُ الخَائِفِينَ، وَيُنَجِّي الصَّالِحِينَ، وَيَرفَعُ المُستَضعَفِينَ، وَيَضَعُ المُستَكبِرِينَ، وَيُهلِكُ مُلُوكًا، وَيَستَخلِفُ آخَرِينَ.

وَالحَمدُ لِلّٰهِ قَاصِمِ الجَبَّارِينَ مُبِيرِ الظَّالِمِينَ مُدرِكِ الهَارِبِينَ نَكَالِ الظَّالِمِينَ صَرِيخِ المُستَصرِخِينَ مَوضِعِ حَاجَاتِ الطَّالِبِينَ مُعتَمَدِ المُؤمِنِينَ.

تمام تعریفیں اُس اللہ کیلیے ہیں جو خوفزدہ لوگوں کو امن بخشتا ہے، نیکوں کو راہِ نجات عطا فرماتا ہے، کمزوروں کو بلندیاں نصیب فرماتا ہے، متکبروں کو پستیوں میں دھکیلتا ہے، بادشاہوں کو ہلاک کرتا ہے اور دوسروں کو اُن کا جانشین

بناتا ہے۔

اور تمام تعریفیں اُس اللہ کیلیے ہیں جو سرکشوں کی گردنیں توڑتا ہے، ظالموں کو ہلاک وتباہ کرتا ہے، حق سے بھاگنے والوں پر اپنی گرفت کرتا ہے، ظلم وستم ڈھانے والوں پر اپنا قہر نازل کرتا ہے، فریاد کرنے والوں کی فریاد سنتا ہے، اور طلبگاروں کا ماویٰ وملجا اور مومنوں کا سہارا و آسرا ہے۔

(۳) اَللّٰھُمَّ ارْزُقْنَا تَوفِیقَ الطَّاعَۃِ، وبُعْدَ المَعْصِیَۃِ، وصِدْقَ النِّیَّۃِ، وعِرفَانَ الرَّحْمَۃِ، وأَکْرِمْنَا بِالْھُدیٰ وَالْاِسْتِقَامَۃِ، وسَدِّدْ أَلْسِنَتَنَا بِالصَّوابِ والْحِکْمَۃِ.. وَامْلَأْ قُلُوبَنَا بِالْعِلمِ والْمَعْرِفَۃِ.. وطَھِّرْ بُطُونَنَا مِن الْحَرامِ والشُّبْھَۃِ.. وَاکْفُفْ أَیْدِیَنا عَنِ الظُّلمِ والسَّرِقۃِ.. وَاغْضُضْ أَبْصَارَنا عَنِ الفُجُورِ وَالْخِیانَۃِ.. وَاسْدُدْ أَسْمَاعَنَا عَنِ اللَّغْوِ والْغِیبَۃِ.

وتَفَضَّلْ عَلیٰ عُلَمائِنا بِالزُّھْدِ والنَّصِیحَۃِ.. وَعَلیٰ الْمُتَعَلِّمِینَ بِالْجُھْدِ والرَّغْبَۃِ.. وَعَلیٰ الْمُسْتَمِعِینَ بِالاِتِّبَاعِ وَالْمَوْعِظَۃِ.. وَعَلیٰ مَشَایِخِنا بِالْوَقَارِ وَالسَّکِینَۃِ.. وَعَلیٰ الشَّبابِ بِالإِنَابَۃِ والتَّوْبَۃِ.. وَعَلیٰ النِّسَاءِ بِالْحَیاءِ وَالْعِفَّۃِ.. وَعَلیٰ الْأَغْنِیاءِ بِالتَّواضُعِ والسِّعَۃِ.. وَعَلیٰ الفُقَراءِ بِالصَّبرِ والقَنَاعَۃِ. بِفَضْلِکَ وَرَحْمَتِکَ یَا أَرْحَمَ الرَّاحِمِینَ!

اے اللہ! ہمیں فرمانبرداری کی توفیق، نافرمانی سے اجتناب، صدقِ نیت اور رحمت شناسی نصیب فرما، ہدایت واستقامت سے سرفراز فرما، حق اور حکمت کو ہماری زبانوں پر جاری فرما، علم ومعرفت سے ہمارے دلوں کو پُر فرما، حرام و مشتبہ چیزوں سے ہمارے پیٹوں کو پاک فرما، ظلم و چوری سے ہمارے ہاتھوں کو دور رکھ، فسق وخیانت سے ہماری آنکھوں کو جھکا دے، بے ہودہ گفتگو اور غیبت سے ہمارے کانوں کو محفوظ فرما۔

ہمارے علماء کو "دنیا سے بے رغبتی" اور "امت کی خیر خواہی"، طلباء کو محنت اور ذوق وشوق، عوام الناس کو اتباع اور نصیحت پزیری، ہمارے بزرگوں کو وقار وسنجیدگی، نوجوانوں کو رجوع الی اللہ اور توبہ، عورتوں کو حیاء و پاکدامنی، مال داروں کو عاجزی وسخاوت، اور غریبوں کو صبر وقناعت کی نعمتوں سے مالا مال فرما۔

اے ارحم الراحمین! اپنے فضل وکرم سے دعاء قبول فرما!

(۱) ھذا بعض ما فی [آل البیت حول الرسول، ص: ۲۶۸، ۲۷۱

دنیا سے بے رغبتی:

امام علی ہادی سلامُ اللہ و رحمۃُ علیہ نے دنیا کی رنگینیوں سے کنارہ کش ہوکر نہایت زاہدانہ زندگی بسر کی۔ عمر بھر عبادت وزہد کا دامن تھامے رکھا، دنیاوی دھوکے سے بچ کر آخرت کے خیال کو اس طرح سینے سے لگا رکھا تھا کہ ہر معاملہ میں اطاعتِ الٰہی کو ترجیح دیتے تھے۔ آپؒ دنیا میں زیادہ ساز وسامان جمع کرنے میں نہیں لگے بلکہ اس کے بجائے آخرت کی تیاری پر توجہ صرف کی۔ یہ اسی کا نتیجہ تھا کہ مدینہ منورہ میں رہائش کے دوران جب حکومتی کارندے کی طرف سے آپؒ کے گھر کی تلاشی لی گئی تو چند اشیاء کے سوا کچھ نہ مل سکا، اور اسی طرح پھر جب فوجی دستے نے آپؒ کے ''سامَراء'' والے گھر کی تلاشی لی تھی تو اُس وقت بھی آپؒ کے گھر کی یہی کیفیت تھی کہ صرف ضروری سامان موجود تھا جیسا کہ یہ قدرے تفصیل سے پیچھے گزر چکا ہے۔ بہرحال یہ وہ حضرات تھے جو واقعی دنیا سے بے رغبت اور آخرت کے مشتاق تھے۔[1]

سخاوت:

آپؒ سخاوت میں بھی اپنے والد ماجد (امام تقیؒ) کے حقیقی جانشین تھے۔[2]

ایک مرتبہ عثمان بن سعید، احمد بن اسحاق اشعری اور علی بن جعفر ہمدانی، امام نقیؒ کے پاس آئے۔ ان میں سے احمد بن اسحاق نے اپنی پریشانی ذکر کی کہ اُن پر قرض چڑھ چکا ہے۔ آپؒ نے اُسی وقت اپنے وکیل ''ابوعمرو'' سے کہا کہ انہیں تیس ہزار دینار (مساوی سوا ۵۶ کروڑ روپے) دے دو۔

ذرا ملاحظہ فرمائیے کہ یہ کس قدر سخاوت ہے، ایسی سخاوت تو کوئی بادشاہ ہی کرسکتا ہے۔ واقعی یہ بے مثل سخاوتوں میں سے ایک سخاوت تھی۔[3]

لوگوں کی حاجات پوری کرنا اِن حضرات کی گھٹی میں اس طرح پڑ چکا تھا کہ یہ اپنی عزت ووجاہت کی پرواہ کیے بغیر لوگوں کے قرضے ادا کیا کرتے، چناں چہ اسی نوعیت کا، امام نقیؒ کا ایک عجب واقعہ بہت سارے مصنفین نے ذکر کیا ہے

---

(۱) آل البیت حول الرسول، ص: ۲۶۵ مع البدایۃ والنہایۃ ط الفکر: ۱۱/۱۵

(۲) الصواعق المحرقۃ ۲/۵۹۸ ونور الأبصار، ص: ۲۲۴

(۳) آل البیت حول الرسول، ص: ۲۶۶

جو نیچے درج کیا جارہا ہے:

ایک دن آپؒ، کسی کام کے سلسلہ میں، ''سامَرا'' سے باہر ایک بستی میں تشریف لے گئے۔ پیچھے سے کوفہ کا ایک دیہاتی شخص آپؒ کو ڈھونڈتے ڈھونڈتے آپؒ کے گھر پہنچ گیا، وہاں جا کر پتا چلا کہ آپؒ گھر پر نہیں ہیں۔ کسی کام سے، باہر فلاں جگہ گئے ہوئے ہیں۔ الغرض وہ شخص وہیں آپؒ کے پاس پہنچ گیا۔ آپؒ نے اُس سے دریافت فرمایا: مَا حَاجَتُکَ؟ ''کس کام سے آنا ہوا؟'' اُس نے کہا: مَیں کوفہ کے ایک دیہات کا رہنے والا ہوں، اور آپؒ کے جدِ امجد حضرت علی بن ابی طالبؓ کے محبین میں سے ہوں۔ عرض یہ کرنی ہے کہ میرے اوپر اتنے قرضے چڑھ چکے ہیں کہ اُن کے بوجھ نے میری کمر توڑ کر رکھ دی ہے، ادائیگی کیلیے مجھے آپ کے علاوہ کوئی شخص نظر نہیں آیا، اس لیے حاضر خدمت ہوا ہوں۔ آپؒ نے فرمایا: کتنا قرض ہے؟ کہا: تقریباً دس ہزار درہم (مساوی تقریباً اکیس لاکھ روپے)۔ آپؒ نے اُس سے فرمایا: پریشانی کی ضرورت نہیں، اطمینان رکھو، انشاء اللہ تمہارا قرض ادا ہوجائے گا۔

پھر اس کو اپنے پاس ٹھہرایا، جب صبح ہوئی تو اُس سے فرمایا: بھائی! ایک گزارش ہے، انکار بالکل نہ کرنا، اور تمہارا کام ہوجائے گا انشاء اللہ۔ اُس نے کہا: آپ جو حکم کریں، مَیں بالکل انکار نہیں کروں گا۔ اس کے بعد امام نقیؒ نے ایک کاغذ لیا اور اُس میں اپنے ہاتھ سے اِس شخص کے متعلق لکھا کہ اِس نے اُن (یعنی امام نقیؒ) سے دس ہزار درہم لینے ہیں۔ یہ تحریر لکھ کر اُس کے حوالے کر دی اور فرمایا: یہ اپنے پاس سنبھال کر رکھنا، جب مَیں ''سامَرا'' واپس آجاؤں اور تم دیکھو کہ لوگوں کی مجلس اچھی طرح لگ چکی ہے اور میں بھی آکر بیٹھ گیا ہوں تو تم یہ تحریر لے کر آنا اور سب کے سامنے، اس میں مذکور رقم کا مجھ سے مطالبہ کرنا اور سختی سے مطالبہ کرنا، میری طرف سے تمہیں اس کی اجازت ہے۔ دیکھو، جو کچھ میں نے کہا ہے، ذرا بھر بھی اس کے خلاف نہ کرنا۔

پھر آپؒ جب ''سامَرا'' پہنچے اور مجلس کا وقت ہوگیا، آپؒ جا کر وہاں بیٹھ گئے، شہر کی اہم شخصیات اور خاص لوگ بھی آگئے حتیٰ کہ خلیفۂ وقت ''متوکل علی اللہ'' کے قریبی اور خاص قسم کے لوگ بھی اُس مجلس میں پہنچ گئے، اور مجلس جم گئی تو عین اُسی وقت وہ شخص سامنے سے نمودار ہوا، اُس کے ہاتھ میں وہ تحریر تھی، اس نے آپؒ کے قریب آکر اس تحریر میں مذکور رقم کا مطالبہ کیا اور آہستہ آہستہ سخت لب ولہجہ پر اتر آیا۔ آپؒ اُس سے معذرت کے انداز میں، نرمی کے ساتھ بات کر رہے تھے اور اُس سے وعدہ کر رہے تھے کہ انشاء اللہ، عنقریب جیسے ہی میرے پاس رقم آئے گی میں

ادا کردوں گا، جب اُس کے کلام کی سختی حد سے بڑھنے لگی تو آپؒ نے اُس سے تین دن کی مہلت مانگ لی، اس پر وہ شخص راضی ہوکر چلا گیا۔

پھر جب مجلس برخاست ہوئی تو حاضرینِ مجلس میں سے کسی نے جا کر یہ سارا ماجرا خلیفہ متوکل کو سنایا۔ خلیفہ نے فوراً حکم جاری کیا کہ ابوالحسن علی ہادیؒ کو ابھی تیس ہزار درہم دے دیے جائیں۔ آپؒ کے پاس جب وہ تیس ہزار درہم کی تھیلی پہنچی تو آپؒ نے اُسے وہیں سنبھالے رکھا اتنے میں وہ شخص بھی آ گیا۔ آپؒ نے اُسے فرمایا: یہ لو رقم، اس سے اپنا قرضہ ادا کرو، جو بچ جائے وہ اپنے بال بچوں پر خرچ کرلینا۔ اُس نے کہا: اے رسول اللہ ﷺ کے صاحبزادے! مجھے تو دس ہزار ہی کافی ہیں، اِنہی سے میری ضرورت پوری ہو جائے گی۔ آپؒ نے فرمایا: وَاللهِ لَتَاخُذَنَّ ذٰلِکَ جَمِیْعَهٗ، وَهُوَ رِزْقُکَ سَاقَهُ اللهُ لَکَ، وَلَوْ کَانَ أَکْثَرَ مِنْ ذٰلِکَ مَا نَقَصْنَاهُ ”واللہ! یہ ساری رقم تمہیں لینی ہوگی، یہ سب تمہارا ہی رزق ہے جسے اللہ نے تمہارے لیے بھیجا ہے، اگر یہ رقم اس سے بھی زیادہ ہوتی تب بھی ہم اس میں سے کچھ نہ لیتے“۔ اُس شخص نے وہ تیس ہزار درہم لیے اور چلتا بنا اور جاتے ہوئے کہہ رہا تھا: {اللهُ أَعْلَمُ حَيْثُ يَجْعَلُ رِسَالَتَهٗ} (الأنعام: ۱۲۴) یعنی اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ وہ اپنی پیغمبری کس کو سپرد کرے)۔ مراد یہ تھی کہ اِس ہستی (امام نقی سلامُ اللہ وَرَحمۃُ علیہ) میں اِس بات کے واضح آثار موجود ہیں کہ یہ اللہ کے رسول کے خاندان میں سے ہیں۔[1]

---

(۱) نور الأبصار، ص: ۲۲۳ مع الاتحاف بحب الأشراف، ص: ۳۶۱ ومثله في مطالب السؤول، ص: ۳۰۷ والصواعق المحرقة: ۲/۵۹۸ وأخبار الدول، ص: ۳۴۹ والفصول المهمة، ص: ۲۶۲

(۱۰) حضرت امام حسن عسکری سَلامُ اللہ وَ رَحمۃُ علیہ

(حسن بن علی)

نام ونسب:

آپ سَلامُ اللہ وَ رَحمۃُ علیہ، کا نام ''حسن''، اور کنیت ''ابو محمد'' تھی۔[۱] ''خالص''، ''سراج''، اور ''زکی'' جیسے عمدہ القابات سے نوازے گئے۔[۲] البتہ آپؒ کی شہرت ''عَسکری'' کے لفظ سے ہوئی جیسا کہ آپؒ کے والد ماجد بھی اسی نسبت سے معروف ہوئے جس کی وجہ پیچھے گزر چکی ہے کہ خلیفہ متوکل علی اللہ نے آپؒ کے والد ''امام علی نقی سَلامُ اللہ وَ رَحمۃُ علیہ'' کو مدینہ منورہ سے ''عسکر'' بلوالیا تھا اور انہوں نے اپنی بقیہ زندگی وہیں گزاری پھر اسی نسبت سے عسکری معروف ہوئے۔ چونکہ آپؒ بھی اپنے والد کے ہمراہ مدینہ طیبہ سے ''عسکر'' آ گئے تھے اور پھر یہیں آباد ہو گئے، اس لیے آپؒ بھی ''عسکری'' سے مشہور ہو گئے۔[۳] البتہ آپؒ کو ''عسکری ثانی'' بھی کہا جاتا تھا،[۴] تا کہ فرق ہو سکے۔

آپؒ کا آبائی شجرۂ نسب تو بیان کرنے کی ضرورت نہیں کہ آپؒ امام علی نقیؒ کے صاحبزادے تھے، البتہ آپؒ کی والدہ باندی تھیں، جن کا نام اکثر روایات کے مطابق ''سُوسَن''[۵] تھا۔[۶]

ولادت:

اکثر روایات کے مطابق آپؒ ۶/ ربیع الاول، بروز جمعہ، سن ۲۳۱ھ کو مدینہ طیبہ میں پیدا ہوئے۔[۷]

---

(۱) تاريخ الخميس ۲۸۷، ۲/۲۸۸ والجوهر الشفاف: ۱/۱۲۰ وأخبار الدُّوَل، ص: ۳۵۱ ومطالب السؤول، ص: ۳۰۹

(۲) تاريخ الخميس ۲/۲۸۸ والفصول المهمة، ص: ۲۷۴ ونور الأبصار، ص: ۲۲۶

(۳) تاريخ الخميس: ۲/۲۸۸ مع تاريخ الإسلام ۱۹/۱۱۳ والأعلام للزركلي: ۲/۲۰۰ ووفيات الأعيان ۲/۹۴

(۴) النبراس، ص: ۳۱۴

(۵) "سَوسَن": ضبطه من إكمال الإكمال لابن نقطة ۳/۲۵۴

(۶) تاريخ الخميس ۲/۲۸۸ وتذكرة الخواص، ص: ۳۲۴ ومطالب السؤول، ص: ۳۰۹

(۷) النبراس، ص: ۳۱۴ مع تاريخ الخميس: ۲/۲۸۸ والمنتظم: ۱۲/۱۵۸ واللباب في تهذيب الأنساب ۲/۳۳۰ والأنساب للسمعاني: ۹/۳۰۱ وتاريخ بغداد وذيوله: ۷/۳۷۸ ومطالب السؤول، ص: ۳۰۹ وتذكرة الخواص، ص: ۳۲۴

بچپن کا ایک واقعہ:

حضرت امام حسن عسکری سَلامُ اللہِ وَ رَحمۃُ علیہ، کا اپنے بچپن میں، حضرت بہلولؒ (جو ایک مشہور بزرگ گزرے ہیں) کے ساتھ ایک مشہور واقعہ پیش آیا جو ذیل میں درج کیا جاتا ہے:

حضرت بہلول رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ میں ایک مرتبہ بصرہ کی ایک سڑک پر جا رہا تھا، راستہ میں چند لڑکے اخروٹ اور بادام سے کھیل رہے تھے اور ایک لڑکا ان کے قریب کھڑا رو رہا تھا، مجھے یہ خیال ہوا کہ اس لڑکے کے پاس بادام اور اخروٹ نہیں ہیں، ان کی وجہ سے رو رہا ہے۔

میں نے اس کو کہا: بیٹا! تجھے میں اخروٹ، بادام خرید دوں گا، تو بھی ان سے کھیلنا، اس نے میری طرف نگاہ اٹھا کر کہا: ارے بے وقوف! کیا ہم کھیل کے واسطے پیدا ہوئے ہیں، میں نے پوچھا: پھر کس کام کے واسطے پیدا ہوئے ہو؟ کہنے لگا کہ علم حاصل کرنے کے واسطے اور عبادت کرنے کے واسطے، میں نے کہا: تو نے یہ بات کہاں سے معلوم کی؟ کہنے لگا: حق تعالیٰ شانہ کا ارشاد ہے: {أَفَحَسِبْتُمْ أَنَّمَا خَلَقْنَاكُمْ عَبَثًا وَأَنَّكُمْ إِلَيْنَا لَا تُرْجَعُونَ} (المؤمنون:١١٥) ترجمہ: کیا تمہارا یہ گمان ہے کہ ہم نے تم کو یونہی بے کار پیدا کیا ہے اور یہ کہ تم ہمارے پاس نہیں لوٹائے جاؤ گے۔)

میں نے کہا: بیٹا! تُو تو بڑا حکیم معلوم ہوتا ہے، مجھے کچھ نصیحت کر، اُس نے چار شعر پڑھے:

أَرَى الدُّنيَا تَجَهَّزُ بِانْطِلَاقٍ مُشَمِّرَةً عَلَى قَدَمٍ وَسَاقٍ

فَلَا الدُّنيَا بِبَاقِيَةٍ لِحَيٍّ وَلَا حَيٌّ عَلَى الدُّنيَا بِبَاقٍ

كَأَنَّ المَوْتَ وَالحَدَثَانِ فِيهِمَا إِلَى نَفْسِ الفَتَى فَرَسَا سِبَاقٍ

فَيَا مَغْرُورًا بِالدُّنيَا زُوَيْدًا وَمِنْهَا خُذْ لِنَفْسِكَ بِالوَثَاقِ

ترجمہ: دنیا ہر وقت چل چلاؤ میں ہے (آج یہ گیا، کل وہ گیا)، ہر وقت چلنے کے لئے دامن اٹھائے قدم اور پنڈلی پر (دوڑنے کے لئے تیار رہتی ہے)، پس نہ تو دنیا کسی زندہ کے لئے باقی رہتی ہے، نہ کوئی زندہ دنیا کے لئے باقی رہتا ہے۔

ایسا معلوم ہوتا ہے جیسا کہ موت اور حوادث، دو گھوڑے ہیں جو تیزی سے آدمی کی طرف دوڑے چلے آرہے ہیں، پس او بیوقوف جو دنیا کے ساتھ دھوکہ میں پڑا ہوا ہے! ذرا غور کر اور دنیا سے اپنے

لئے کوئی (آخرت میں کام آنے والی) اعتماد کی چیز لے لے۔

یہ شعر پڑھ کر اُس لڑکے نے آسمان کی طرف منہ کیا اور دونوں ہاتھ اُٹھائے اور آنسوؤں کی لڑی اس کے رخساروں پر جاری تھی اور یہ دو شعر پڑھے:

يَامَنْ إِلَيهِ المُبْتَهَلْ يَا مَن إِلَيهِ المُتَّكَلْ

يامَنْ إِذَا مَا آمِلْ يَرْجُوهُ لَمْ يَخْطِ الأَمَلْ

ترجمہ: اے وہ پاک ذات کہ اُس کی طرف عاجزی کی جاتی ہے اور اُسی پر اعتماد کیا جاتا ہے، اے وہ پاک ذات کہ جب اُس سے کوئی شخص امید باندھ لے، تو وہ نامراد نہیں ہوسکتا، اس کی امید ضرور پوری ہوتی ہے۔

یہ شعر پڑھ کر وہ بیہوش ہوکر گر گیا، میں نے جلدی سے اُس کا سر اٹھا کر اپنی گود میں رکھ لیا اور اپنی آستین سے اُس کے منہ پر جو مٹی وغیرہ لگ گئی تھی، پونچھنے لگا، جب اُس کو ہوش آیا، تو میں نے کہا: بیٹا! ابھی سے تمہیں اتنا خوف کیوں ہوگیا، ابھی تو تم بہت بچے ہو، ابھی تمہارے نامہ اعمال میں کوئی گناہ بھی نہ لکھا جائے گا، کہنے لگا: بہلول! ہٹ جاؤ، میں نے اپنی والدہ کو ہمیشہ دیکھا کہ جب وہ آگ جلانا شروع کرتی ہیں، تو پہلے چھوٹی چھوٹی کھپچیاں ہی چولہے پر رکھتی ہیں، اُس کے بعد بڑی لکڑیاں رکھتی ہیں، مجھے یہ ڈر ہے کہ کہیں جہنم کی آگ میں چھوٹی لکڑیوں کی جگہ میں نہ رکھ دیا جاؤں، میں نے کہا: صاحبزادہ! تم تو بڑے حکیم معلوم ہوتے ہو، مجھے کوئی مختصر سی نصیحت کرو، اُس نے اِس پر چودہ (۱۴) شعر پڑھے:

غَفَوْتُ وحَادِيْ المَوتِ فِيْ أَثْرِي يَحْذُوْ *** فإنْ لَمْ أَرُحْ يَوْمًا فَلا بُدَّ أَنْ أَغْدُو

أُنَعِّمُ جِسْمِيْ بِاللِّبَاسِ ولِيْنِهِ ***ولَيسَ لِجسْمِي مِنْ لِباسِ البَلا بُدُّ

كَأَنِّي بِهِ قَدْ مَرَّ فِي بَرْزَخِ البِلَىٰ***ومِنْ فَوقِهِ رَدْمٌ ومِن تَحتِهِ لَحْدُ

وقَدْ ذَهَبَتْ مِنِّي المَحاسِنُ وَامَّحَتْ***ولمْ يَبْقَ فَوقَ العَظْمِ لَحْمٌ ولا جِلْدُ

أَرَى العُمْرَ قَدْ وَلّىٰ ومَن أَدْرَكَ الْمُنىٰ***ولَيسَ مَعِيَ زادٌ وفِي سَفَرِي بُعْدُ

وقد كُنتُ جَاهَرْتُ المُهَيْمِنَ عاصِيًا***وأَحْدَثْتُ أَحْداثًا ولَيسَ لَها رَدُّ

وأَرْخَيتُ خوفَ الناسِ سِترًا مِنَ الحَياءِ*** وما خِفتُ مِنْ سِرّي غَدًا عِندَه يَبْدُوْ

بَلىٰ خِفتُهُ، لٰكِنْ وَثِقْتُ بِحِلْمِهِ *** وأَنْ لَيسَ يَغفُرُ غَيرُهُ فلَهُ الحَمْدُ

فَلو لَمْ يَكُنْ شَيءٌ سِوَى المَوتِ والبِلىٰ***ولَمْ يَكُ مِن رَبّي وَعِيدٌ ولا وَعْدُ

لكَانَ لَنا فِي المَوتِ شُغلٌ وفِي البِلىٰ***عَنِ اللَّهْوِ، لٰكِنْ زَالَ عَنْ رَأْيِنا الرُّشْدُ

عَسىٰ غَافِرُ الزَّلَّاتِ يَغفِرُ زَلَّتِي *** فَقَدْ يَغفِرُ المَولىٰ إذا أَذْنَبَ العَبْدُ

أَنَا عَبْدُ سُوْءٍ خُنْتُ مَوْلَايَ عَهْدَهُ *** كَذٰلِكَ عَبْدُ السُّوءِ لَيسَ لَهُ عَهْدُ

فَكَيفَ إذا أُحْرِقَتْ بِالنارِ جُثَّتِي*** ونارُكَ لَا يَقْوَى لَها الحَجَرُ الصَّلْدُ

أَنَا الفَرْدُ عِندَ المَوتِ والفَرْدُ فِي البِلىٰ *** وأُبْعَثُ فَرْدًا فَارْحَمِ الفَرْدَ يَا فَرْدُ

ترجمہ: میں غفلت میں پڑا رہا اور موت کو ہانکنے والا میرے پیچھے پیچھے موت کو ہانکے چلا آ رہا ہے، اگر میں آج نہ گیا تو کل ضرور چلا جاؤں گا۔

میں نے اپنے بدن کو اچھے اچھے اور نرم نرم لباس سے آراستہ کیا، حالانکہ میرے بدن کے لئے (قبر میں جا کر) گلنے اور سڑنے کے علاوہ چارہ کار نہیں۔

وہ منظر گویا اِس وقت میرے سامنے ہے، جب کہ میں قبر میں بوسیدہ پڑا ہوا ہوں گا، میرے اوپر مٹی کا ڈھیر ہوگا اور نیچے قبر کا گڑھا ہوگا۔

اور میرا یہ حسن و جمال سارا کا سارا جاتا رہے گا اور بالکل مٹ جائے گا، حتیٰ کہ میری ہڈیوں پر نہ گوشت رہے گا، نہ کھال رہے گی۔

میں دیکھ رہا ہوں کہ عمر تو ختم ہوتی جارہی ہے اور آرزوئیں ہیں کہ پوری نہیں ہو چکتیں، اور بڑا طویل سفر سامنے ہے اور توشہ ذرا سا بھی ساتھ نہیں ہے۔

اور میں نے کھلم کھلا گناہوں کے ساتھ اپنے نگہبان اور محافظ کا مقابلہ کیا، اور بڑی بُری حرکتیں کی ہیں، جواب واپس بھی نہیں ہو سکتیں (یعنی جو گناہ کر چکا ہوں، وہ بے کیا نہیں ہو سکتا)۔

اور میں نے لوگوں سے چھپانے کے لئے پردے ڈالے کہ میرا عیب کسی پر ظاہر نہ ہو، لیکن میرے

جتنے مخفی گناہ ہیں، وہ کل کو اُس مالک کے سامنے ظاہر ہوں گے (اُس کی پیشی میں پیش ہوں گے)۔

اِس میں شک نہیں کہ مجھے اُس کا خوف ضرور تھا، لیکن میں اُس کے غایت حِلم پر بھروسہ کرتا رہا (جس کی وجہ سے جرأت ہوتی رہی)، اور اُس پر اعتماد کرتا رہا کہ وہ بڑا غفور ہے، اُس کے سوا کون معافی دے سکتا ہے، بے شک تمام تعریفیں اُسی پاک ذات کے لئے ہیں۔

اگر موت کے اور مرنے کے بعد گلنے اور سڑنے کے سوا کوئی دوسری آفت نہ بھی ہوتی، اور میرے رب کی طرف سے جنت کا وعدہ اور دوزخ کی دھمکی نہ بھی ہوتی۔

تب بھی مرنے اور سڑنے ہی میں اِس بات پر کافی تنبیہ موجود تھی کہ لہو ولعب سے احتراز کیا جاتا، لیکن کیا کریں ہماری عقل زائل ہوگئی (کسی بات سے عبرت حاصل نہیں ہوتی، پس اب اِس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ)۔

کاش گناہوں کا بخشنے والا میری مغفرت کردے، جب کسی غلام سے کوئی لغزش ہوتی ہے، تو آقا ہی اُس کو معاف کرتا ہے۔

بے شک میں بدترین بندہ ہوں، جس نے اپنے مولیٰ کے عہد میں خیانت کی، اور نالائق غلام ایسے ہی ہوتے ہیں کہ ان کا کوئی قول وقرار معتبر نہیں ہوتا۔

میرے آقا جب تیری آگ میرے بدن کو جلائے گی، تو میرا کیا حال بنے گا، جب کہ سخت سے سخت پتھر بھی اُس آگ کو برداشت نہیں کرسکتے۔

میں موت کے وقت بھی تنِ تنہا رہ جاؤں گا، قبر میں بھی اکیلا ہی جاؤں گا، قبر سے بھی اکیلا ہی اُٹھوں گا (کسی جگہ بھی کوئی میرا مُعین و مددگار نہ ہوگا)، پس اے وہ پاک ذات، جو خود اکیلی ہے، وحدہ لاشریک لہ ہے، ایسے شخص پر رحم کر جو بالکل تنِ تنہا رہ گیا۔

بہلول رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ یہ اشعار سُن کر مجھ پر ایسا اثر ہوا کہ میں غَش کھا کر گر گیا، بڑی دیر میں جب مجھے ہوش آیا تو وہ لڑکا جا چکا تھا، میں نے اُن بچوں سے دریافت کیا کہ یہ بچہ کون تھا؟ وہ کہنے لگے: تُو اُس کو نہیں جانتا؟ یہ حضرت حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی اولاد میں سے ہے۔ میں نے کہا: قَدْ عَجِبْتُ مِنْ أَيْنَ تَكُونُ هٰذِهِ الثَّمَرَةُ إِلَّا مِنْ

تِلْکَ الشَّجَرَۃِ ''مجھے خود ہی حیرت ہو رہی تھی کہ یہ پھل کس درخت کا ہے؟ واقعی یہ پھل اُسی درخت کا ہو سکتا تھا۔''
حق تعالیٰ شانہٗ ہمیں اس خاندان کی برکتوں سے مُنتفع فرمائے، آمین''۔ [1]

حلیہ مبارک وانگوٹھی:

سفید اور گندمی رنگ کے درمیان آپؒ کا رنگ تھا۔ اور آپؒ کی انگوٹھی کا نقش تھا: ''سبحانَ مَن لَه مَقالِیدُ السَّماواتِ والأرْضِ'' یعنی پاک ہے وہ ذات جو زمین وآسمان کی کنجیوں کی مالک ہے۔ [2]

اولاد:

آپؒ نے اپنی اولاد میں صرف ایک صاحبزادہ چھوڑا جن کا نام ''محمد'' تھا۔ جو آپؒ کی وفات کے بعد دو سال زندہ رہے، پھر چار، پانچ سال کی عمر میں ہی انتقال کر گئے۔ [3] چناں چہ آپؒ (یعنی حضرت حسن عسکریؒ) کی میراث آپؒ کے بھائی ''جعفر بن علی نقیؒ'' نے لی تھی۔ [4]

اور بعض حضرات نے فرمایا ہے کہ اکثر علماء اور کتبِ تاریخ کے مطابق آپؒ کی کوئی اولاد نہیں تھی۔ [5]

علمی مقام:

علمی میدان میں آپؒ کو بلند مقام حاصل تھا، [6] کہ طلباء تو طلباء، علماء بھی آپؒ کے شاگردوں میں شمار ہوتے تھے، یہی وجہ ہے کہ آپؒ کو ''استاذ العلماء'' کے خوبصورت واعزازی لقب سے یاد کیا گیا۔ [7] علمِ حدیث میں

---

(۱) ذکرها ابن حجر الهیتمي في الصواعق المحرقة ۲/۶۰۰ والشَّبلَنجي في نور الأبصار، ص: ۲۲۶ مختصرةً، والیافعي في روض الریاحین، رقم الحکایة: ۵۶ مفصلةً، واللفظ لآخر الذکر. أما نقلها إلی الأردیة فمن ''فضائل صدقات، ص: ۶۷۵''

(۲) أخبار الدُّوَل وآثار الأُوَل، ص: ۳۵۱ والفصول المهمة، ص: ۲۷۴ ونور الأبصار، ص: ۲۲۶

(۳) نور الأبصار، ص: ۲۲۹ مع الصواعق المحرقة: ۲/۲۰۱ ومطالب السؤول، ص: ۳۰۹ والفصول المهمة، ص: ۲۷۴ والوافي بالوفیات: ۱۲/۷۰، والاتحاف بحب الأشراف، ص: ۳۶۵ وصحاح الأخبار، ص: ۵۴ ولوامع الأنوار البهیة: ۲/۷۱

(۴) الإشاعة لأشراط الساعة، ص: ۱۷۶ ولوامع الأنوار البهیة شرح العقیدة السفارینیة: ۲/۷۱

(۵) الصواعق المحرقة: ۲/۶۸۳ مع ''المهدي'' لعادل زکي، ص: ۱۷۹ وسیر أعلام النبلاء: ۱۳/۱۲۱ ومکان رأس الحسین، ص: ۵ وحقوق آل البیت بین السنة والبدعة، ص: ۵۱

(۶) الجوهر الشفاف في أنساب السادة الأشراف ۱/۱۶۱

(۷) آل البیت حول الرسول، ص: ۲۷۵

آپؒ اونچی شان کے حامل عالم تھے، آپؒ کا شمار اُن راویانِ حدیث میں ہوتا تھا جن کی احادیث کو قبول و اعتماد کا درجہ حاصل تھا۔ آپؒ نے کئی احادیث بیان فرمائیں، ذیل میں اُن میں سے صرف ایک حدیث نقل کی جاتی ہے۔ واضح رہے کہ یہ وہ حدیث ہے جو ائمۂ اہلِ بیت کی مبارک سند سے منقول ہے، اس لیے تبرکا یہ حدیث اپنی مکمل سند سمیت درج کی جاتی ہے:

قال أبو المظفر يوسف بن قِزْغلِي البغدادي فيه: ذكره جَدِّيْ أبو الفرج في كتابه المسمى بـ "تحريم الخمر" ونقلته من خطه وسمعته يقول أَشْهَدُ بالله لقد سمعتُ أبا عبد الله الحسين بن علي يقول أَشْهَدُ بالله لقد سمعتُ عبد الله بن عطا الهروي يقول أشهد بالله لقد سمعت عبد الرحمان بن أبي عبيد البيهقي يقول أشهَد بالله لقد سمعت أبا عبد الله الحسين بن محمد الدينوري يقول أشهد بالله لقد سمعت محمد بن علي بن الحسين العلوي يقول أشهد بالله لقد سمعت أحمد بن عبد الله السبيعي يقول أشهد بالله لقد سمعت الحسن بن علي العسكري يقول أشهد بالله لقد سمعت أبي علي بن محمد يقول أشهد بالله لقد سمعت أبي محمد بن علي بن موسیٰ الرضا يقول أشهد بالله لقد سمعت أبي علي بن موسیٰ يقول أشهد بالله لقد سمعت أبي موسیٰ يقول أشهد بالله لقد سمعت أبي جعفر بن محمد يقول أشهد بالله لقد سمعت أبي محمد بن علي يقول أشهد بالله لقد سمعت أبي علي بن الحسين يقول أشهد بالله لقد سمعت أبي الحسين بن علي يقول أشهد بالله لقد سمعت أبي علي بن أبي طالب يقول أشهد بالله لقد سمعت محمدا رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول أشهد بالله لقد سمعت جبرئيل يقول أشهد بالله لقد سمعت ميكائيل يقول أشهد بالله لقد سمعت إسرافيل يقول أشهد بالله على اللوح المحفوظ أنه قال سمعت "اللّٰـه" يقول: "شاربُ الخَمرِ كـعَابِدِ الوَثَن".

ترجمہ: علامۂ بغداد، ابومظفر یوسف بن قِزْغلی بیان کرتے ہیں کہ میں نے اپنے نانا علامہ ابن جوزیؒ سے سنا، انہوں نے کہا: میں اللہ کی قسم کھاتا ہوں کہ میں نے ابوعبداللہ حسین بن علی کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ میں اللہ کی قسم کھاتا ہوں کہ میں نے عبداللہ بن عطاء ہَروی کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ میں اللہ کی قسم کھاتا ہوں کہ میں نے عبدالرحمن بن ابی عبید بیہقی کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ میں اللہ کی قسم کھاتا ہوں کہ میں نے ابوعبداللہ حسین بن محمد دِینوری کو یہ کہتے ہوئے سنا

کہ میں اللہ کی قسم کھاتا ہوں کہ میں نے محمد بن علی بن حسین علوی کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ میں اللہ کی قسم کھاتا ہوں کہ میں نے احمد بن عبداللہ شبعی کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ میں اللہ کی قسم کھاتا ہوں کہ میں نے حسن بن علی عسکری کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ میں اللہ کی قسم کھاتا ہوں کہ میں نے اپنے والد علی بن محمد کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ میں اللہ کی قسم کھاتا ہوں کہ میں نے اپنے والد محمد بن علی بن موسیٰ رضا کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ میں اللہ کی قسم کھاتا ہوں کہ میں نے اپنے والد علی بن موسیٰ کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ میں اللہ کی قسم کھاتا ہوں کہ میں نے اپنے والد موسیٰ کاظم کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ میں اللہ کی قسم کھاتا ہوں کہ میں نے اپنے والد جعفر بن محمد کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ میں اللہ کی قسم کھاتا ہوں کہ میں نے اپنے والد محمد بن علی کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ میں اللہ کی قسم کھاتا ہوں کہ میں نے اپنے والد علی بن حسین کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ میں اللہ کی قسم کھاتا ہوں کہ میں نے اپنے والد حسین بن علی کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ میں اللہ کی قسم کھاتا ہوں کہ میں نے اپنے والد علی بن ابی طالب کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ میں اللہ کی قسم کھاتا ہوں کہ میں نے محمد رسول اللہ ﷺ کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ میں اللہ کی قسم کھاتا ہوں کہ میں نے جبریل ؑ کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ میں اللہ کی قسم کھاتا ہوں کہ میں نے میکائیل ؑ کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ میں اللہ کی قسم کھاتا ہوں کہ میں نے اسرافیل ؑ کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ میں لوحِ محفوظ پر اللہ کی قسم کھاتا ہوں کہ میں نے ''اللہ تبارک وتعالیٰ'' کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ: ''شراب پینے والا ایسے ہے جیسے بُت کی عبادت کرنے والا۔''

میرے نانا (علامہ ابن جوزیؒ) نے یہ حدیث سنانے کے بعد فرمایا تھا کہ یہ وہ صحیح اور مبارک حدیث ہے جسے پاک ومقدس خاندان نے نقل کیا ہے۔ [1]

ارشادات ونصائح:

آپ سلامُ اللہِ وَرَحمۃُ علیہ، کے وہ بیش بہا و مفید تر ارشادات ونصائح، جن سے امت کو رہنمائی ملی اور انسانیت فیض یاب ہوئی، کا ایک انمول ذخیرہ ہے۔ اُس میں سے چند درج ذیل ہیں:

(۱) ایک مرتبہ اپنے رفقاء وطلباء کو نصیحت کرتے ہوئے فرمایا:

میں تمہیں نصیحت کرتا ہوں کہ اللہ کا خوف دل میں رکھنا، اپنے دین میں تقویٰ اختیار کرنا، اللہ کیلئے مجاہدہ ومحنت

---

(۱) تذکرۃ الخواص، ص: ۳۲۲

کرتے رہنا، سچ بولنا، جو شخص تمہارے پاس امانت رکھوائے- خواہ وہ نیک ہو یا فاسق اُس میں خیانت نہ کرنا، لمبے سجدوں کو لازم پکڑنا اور اچھے پڑوسی بن کر رہنا۔ پھر فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ یہی تعلیمات لے کر تشریف لائے تھے۔

اس کے بعد کچھ مزید نصیحتیں فرمائیں:

جنازوں میں شرکت کرنا، بیماروں کی عیادت کرنا، حقوق کی ادائیگی میں کوتاہی نہ کرنا، لوگوں کے ساتھ حسنِ اخلاق سے پیش آنا، اللہ سے ڈرتے رہنا، اچھے انسان بن کر رہنا، بُرا انسان بننے سے بچنا، ہم اہلِ بیت سے بھرپور محبت کرنا، اور اگر کوئی ہماری طرف فساد و بُرائی کی نسبت کرے تو اس میں ہمارا دفاع کرنا، کیونکہ ہم اہلِ بیت خیر و خوبی کے اہل ہیں اور شر و فساد کے سزاوار نہیں ہیں۔ کتاب اللہ میں ہمارے حقوق مذکور ہیں اور رسول اللہ ﷺ سے ہماری رشتہ داری ہے (اس لیے اہلِ بیت کا خاص خیال رکھنا)۔ اس کے علاوہ اللہ کا ذکر، موت کی یاد، اور تلاوتِ قرآن کثرت سے کرنا، اور نبی کریم ﷺ و آلِ نبی پر درود کی بھی کثرت کرنا۔ اور جو کچھ میں نے عرض کیا ہے اسے محفوظ رکھنا۔

(۲) ایک موقع پر درج ذیل نصائح ارشاد فرمائیں:

جہاں تک ہو سکے سوال سے بچنا کہ ہر آنے والے دن کیلیے نئی روزی ہوتی ہے، یہ بات ذہن نشین رکھنا کہ بار بار سوال کرنے سے عزت جاتی رہتی ہے اور تکلیف و مشقت کا بھی سامنا ہوتا ہے لہذا سوال کرنے کے بجائے صبر کرنا یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ تمہارے لیے سہولت و عافیت والا کوئی دروازہ کھول دے۔ جو پھل ابھی پکا نہ ہو اس میں جلدی نہ کرنا کہ وہ اپنے وقت پر ہی تمہیں ملے گا۔

دیکھو تمہارے کاموں کی تدبیر کرنے والا (اللہ تعالیٰ) اُس وقت کو بہتر جانتا ہے جس میں تمہارے حالات درست ہوں گے، لہذا اپنے تمام امور میں اسی کے انتخاب پر اعتماد کرو، وہ تمہارے حالات درست کر دے گا۔ اور اپنی حاجات کے معاملہ میں اُن کا وقت آنے سے پہلے جلدی نہ مچاؤ ورنہ اضطراب و پریشانی کا شکار رہو گے اور مایوسی چاروں طرف سے گھیر لے گی۔

(۳) ایک مرتبہ ایک عالم کو چند نصیحتیں فرمائیں۔ یہ نصائح چونکہ سب علماء کیلیے مشعلِ راہ کا کام دیتی ہیں، اس لیے افادۂ عام کی خاطر ذیل میں درج کی جاتی ہیں:

امابعد! اے میرے بزرگ اور میرے قابلِ اعتماد فقیہ! میری آپ کیلیے دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو اپنی رضائے

عالی کیلیے مُوَفِّق فرمائے اور اپنی رحمت سے آپ کو نیک و صالح اولاد عطا فرمائے۔

میں آپ کو چند باتیں عرض کرتا ہوں:

خوفِ الٰہی کے ساتھ زندگی بسر کرنا، نماز کو اچھے طریقہ سے ادا کرنا، ادائیگیٔ زکوۃ کا اہتمام کرنا، قصور والے کا قصور معاف کر دینا، غصہ آئے تو پی جانا، صِلہ رحمی (یعنی رشتہ داروں کے ساتھ حسنِ سلوک) کرنا، اپنے بھائیوں اور ساتھ رہنے والوں کے ساتھ ہمدردی کرنا، دکھ سکھ میں ان کے کام آنے کی کوشش کرنا اور اگر وہ زیادتی کریں تو برداشت کر جانا، اور علمِ دین میں کمال حاصل کرنے کی کوشش کرنا، اپنے کام نظم و ضبط سے سرانجام دینا، احکاماتِ قرآنیہ کا پابند رہنا، اچھے اخلاق اختیار کرنا، نیکی کا حکم کرنے اور برائی سے روکنے کا فریضہ ادا کرتے رہنا کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں فرمایا ہے: {لَا خَيْرَ فِي كَثِيرٍ مِنْ نَجْوَاهُمْ إِلَّا مَنْ أَمَرَ بِصَدَقَةٍ أَوْ مَعْرُوفٍ أَوْ إِصْلَاحٍ بَيْنَ النَّاسِ وَمَنْ يَفْعَلْ ذَلِكَ ابْتِغَاءَ مَرْضَاتِ اللَّهِ فَسَوْفَ نُؤْتِيهِ أَجْرًا عَظِيمًا} (النساء: ۱۱۴) ترجمہ: لوگوں کی بہت سی خفیہ سرگوشیوں میں کوئی خیر نہیں ہوتی، سوائے یہ کہ کوئی شخص صدقے کا، یا کسی نیکی کا، یا لوگوں کے درمیان اصلاح کا حکم دے۔ اور جو شخص اللہ کی خوشنودی حاصل کرنے کیلیے ایسا کرے گا ہم اس کو زبردست ثواب عطا کریں گے۔)

اور تمام برائیوں سے بالکل الگ تھلگ رہنا، تہجد کا بالخصوص اہتمام کرنا، جو شخص تہجد کی نماز کو اہمیت نہ دے اس کا ہم سے کوئی تعلق نہیں۔

ان جامع نصیحتوں کے علاوہ آپؒ کے ایسے فرامین بھی ہیں جو دیکھنے میں مختصر مگر درحقیقت بہت پُر اثر ہیں، ان میں سے کچھ درج ذیل ہیں:

(۱) معزز شخص، کسی کا حق دبا لینے سے ذلیل اور ذلیل شخص حقوق ادا کرنے سے معزز ہو جاتا ہے۔

(۲) چھوٹی عمر میں اپنے والد کے سامنے بے باک ہونا، بڑی عمر میں پہنچ کر والد کی نافرمانی کا سبب بنتا ہے۔

(۳) تواضع (عاجزی) ایسی نعمت ہے جس پر حسد نہیں کیا جاتا۔

(۴) جو اپنے بھائی کو تنہائی میں نصیحت کرتا ہے وہ اُسے سنوار دیتا ہے اور جو سب کے سامنے سمجھانا شروع کر دیتا ہے وہ اسے بگاڑ دیتا ہے۔

(۵) ہر آزمائش، اللہ تعالیٰ کی کسی نہ کسی نعمت کو بھی اپنے اندر لیے ہوتی ہے۔

(۶) مومن کیلیے یہ کتنی بری شے ہے کہ اسے کوئی ایسی چیز پسند ہو جو اس کی ذلت کا سبب ہو۔

(۷) آدابِ زندگی سے ناواقفیت کی علامت ہے کہ آدمی کسی غمزدہ شخص کے سامنے خوشی کا اظہار کرے۔

(۸) وہ رزق جو اللہ نے اپنے ذمہ لے رکھا ہے، وہ تجھے کسی فرض عمل کی ادائیگی سے غفلت میں نہ ڈال دے۔

(۹) بے وقوف آدمی کا دل اُس کے منہ میں، جبکہ سمجھدار شخص کا منہ اُس کے دل میں ہوتا ہے۔

(۱۰) آدمی زیادہ جاگا ہوا ہو تو نیند لذیذ معلوم ہوتی ہے اور بھوک زیادہ لگی ہو تو کھانا لذیذ معلوم ہوتا ہے۔

(۱۱) جو "باطل" کی پیٹھ پر سوار ہوتا ہے، اس کی منزل "دار الندامۃ" (شرمندگی کا گھر) ہوتی ہے۔

(۱۲) تمہارا بہترین دوست وہ ہے جو تمہارا جرم بھول جائے اور احسان یاد رکھے۔

(۱۳) جو اپنی دشمنی ظاہر کر دے، تدبیر کے لحاظ سے وہ سب سے کمزور دشمن ہے۔

(۱۴) شکل کی خوبصورتی، ظاہری حسن و جمال ہے جبکہ عقل کی خوبصورتی باطنی جمال ہے۔

(۱۵) جو اللہ سے لَو لگا لیتا ہے اس کا پھر لوگوں میں دل نہیں لگتا۔ اور اللہ سے لَو لگنے کی علامت یہ ہے کہ لوگوں کی محفلوں میں اس کا دل نہ لگے۔[۱]

وفات:

آپؒ کی وفات ۸ / ربیع الاول، بروز جمعہ، سن ۲۶۰ھ میں ہوئی، جبکہ آپؒ کی عمر عزیز اُنتیس برس تھی۔ خلیفہ "مُعتَمِد علی اللہ" کے دورِ حکومت میں "سُرَّ مَن رَأی" میں انتقال ہوا تھا اور وہیں اپنے والد امام علی نقیؒ کے پہلو میں دفن ہوئے۔[۲] یہ بھی کہا گیا ہے کہ زہر دیے جانے سے انتقال ہوا تھا، واللہ اعلم۔[۳]

علامہ ابن صَبّاغ ؒ نے آپؒ کی وفات کو قدرے تفصیل سے بیان کیا ہے، جو درج ذیل ہے:

"عبداللہ بن خاقان" کا بیان ہے کہ امام حسن عسکری سَلامُ اللہِ وَ رَحمۃُ علیہ، کی وفات کے وقت، خلیفہ معتمِد علی اللہ (احمد بن متوکل) کی جو کیفیت ہو گئی تھی اُس سے ہمیں بڑا تعجب ہوا، ہمارا خیال نہیں تھا کہ کسی کی بیماری اور وفات پر

---

(۱) مستفاد۔بتلخیص۔من آل البیت حول الرسول، ص:۲۷۶۔۲۷۸

(۲) تاریخ الإسلام ۱۹/۱۱۳ ووفیات الأعیان : ۲/۹۴ والوافي بالوفیات:۱۲/۷۰ وتاریخ بغداد وذیوله : ۷/۳۷۸ والفصول المهمة، ص:۲۷۸ مع مطالب السؤول، ص:۳۲۳

(۳) الصواعق المحرقة ۲/۶۰۱

ایک بادشاہ جیسے انسان کی اس قدر عجب کیفیت ہوسکتی ہے (کہ وہ اپنی پوری توجہ ان کی دیکھ بھال میں صرف کردے)۔ بہر حال، ہُوا یہ تھا کہ ابو محمد امام حسن عسکریؒ کی جب طبیعت خراب ہوئی تو خلیفہ نے اپنے پانچ خاص اور معتمَد اَفراد (جو بڑے درجے کے عالم اور فقیہ تھے) امام عسکریؒ کے گھر بھیجے اور انہیں حکم دیا کہ ہر وقت امام کے گھر رہیں، ان کی خیر خبر معلوم کرتے رہیں اور بیماری میں جو کوئی تکلیف وغیرہ انہیں درپیش ہو اس میں اُن کے ساتھ رہیں۔ ان کے علاوہ کچھ طبیب بھیجے جنہیں صبح شام امام کے پاس جانے اور اُن کا مکمل خیال رکھنے کا حکم دیا۔

ابھی دو تین دن ہی گزرے تھے کہ خلیفہ کو اطلاع دی گئی کہ ان کی حالت کافی خراب ہو چکی ہے اور شفایابی کی بظاہر کوئی امید نظر نہیں آ رہی۔ اس پر خلیفہ نے اِدھر طبیبوں کو حکم جاری کر دیا کہ اب ہر وقت اُن کے ساتھ رہنا شروع کردیں اور اُدھر قاضیٔ وقت ''ابنِ بختیار'' کو پیغام بھجوادیا کہ وہ دس قابلِ اعتماد اور نیک و دیانتدار افراد کو چھانٹ کر فوراً امام کے گھر بھیجے جو صبح شام اُن کے پاس رہیں، چناں چہ وہ افراد مسلسل ان کے پاس رہے یہاں تک کہ چند روز بعد اُن کا انتقال ہوگیا۔

جب انتقال کی خبر ''سامرا'' میں پھیلی تو پورا ''سامرا'' کانپ اٹھا، ہر طرف آہ و بکاء کا شور تھا، فریاد و گریہ زاری کی آہیں تھیں، لوگوں نے اپنی دکانیں بند کردیں اور آن کی آن میں سارے بازاروں میں ایک سناٹا چھا گیا۔ کیا عوام، کیا خواص، سب لوگ ہی جنازے کیلیے پہنچ گئے۔ صدمہ میں لوگوں کی عجیب حالت ہو رہی تھی، پورا سامرا غم سے نڈھال تھا اور ایک محشر بپا تھا۔ بہر حال جنازے سے پہلے، جب ''جسدِ مبارک'' کی تجہیز و تکفین مکمل ہو چکی تو نمازِ جنازہ پڑھانے کیلیے خلیفہ نے خود اپنے بھائی ''عیسیٰ بن متوکل'' کو بھیجا۔ نماز پڑھانے کیلیے جب جنازہ زمین پر رکھا گیا، تو ''عیسیٰ بن متوکل'' نے جنازے کے قریب آ کر اُن کے چہرہ مبارک سے کپڑا ہٹایا اور علوی و عباسی بنو ہاشم کو اور دیگر خواص کو چہرہ دکھلایا اور کہا: هٰذَا أَبُو مُحَمَّدٍ الْعَسْكَرِيُّ، مَاتَ حَتْفَ أَنْفِهِ عَلَى فِرَاشِهِ، وَحَضَرَهُ مِنْ خُدَّامِ أَمِيرِ الْمُؤْمِنِينَ فُلَانٌ وَفُلَانٌ ''دیکھو، یہ ابو محمد امام حسن عسکریؒ ہیں، اور فطری و طبعی موت سے ان کا انتقال ہوا ہے۔ اس بات کے گواہ امیر المومنین کے فلاں فلاں خدام ہیں جو وفات کے وقت اُن کے پاس موجود تھے''۔ اس کے بعد اُن کا چہرہ ڈھانپ دیا، پھر نماز جنازہ پڑھائی اور اُن کی تدفین کا حکم دے دیا۔[1]

---

(1) الفصول المهمة، ص: ۲۷۷

فضائل وخصائص

اللہ تعالیٰ نے آپ کو لوگوں میں اعلیٰ مقام اور ایک بلند شان نصیب فرمائی تھی۔[1] اور عمدہ اوصاف وعالی خصائص سے نوازا تھا جس سے لوگ آپ کے ساتھ والہانہ عقیدت رکھتے تھے، اور عقیدت ومحبت میں آپ کی طرف لپکتے تھے بلکہ ایک جاں نثاری کی کیفیت ہوا کرتی تھی۔[2]

عبادت:

آپ تقویٰ اور عبادت وریاضت میں اپنے اسلاف کے نقشِ قدم پر تھے۔[3] اور عبادت میں اتنا اعلیٰ مقام پایا کہ آپ کو "قُدوۃُ العابِدین" (یعنی اِمامُ العابدین) کے خوبصورت لقب سے یاد کیا گیا۔[4] دن کو روزہ رکھتے اور رات نوافل میں گزارتے، شب کے اخیر حصہ میں تہجد کی نماز ادا کرتے۔[5] اور روزہ رکھنے کا اہتمام تو اس قدر تھا کہ جب آپ کو جیل میں قید کیا گیا تو آپ نے وہاں بھی روزے نہیں چھوڑے تھے۔[6] قرآن کریم کی تلاوت اور اذکار ودعاؤں کے ساتھ آپ کو خصوصی لگاؤ تھا۔[7]

آپ کی دعاؤں سے آپ کے تعلق باللہ کا خوب اندازہ ہوتا ہے کہ کس قدر آپ عشقِ الٰہی میں ڈوب کر اور عجز وتواضع میں فناء ہوکر اپنے خالق ومالک سے راز ونیاز کی باتیں کیا کرتے تھے، ذیل کی چند دعاؤں سے اس کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے:

اَللّٰھُمَّ أَنْتَ السَّلامُ، وَمِنْکَ السَّلامُ، وإلَیْکَ یَرْجِعُ السَّلامُ، تَبارَکْتَ یَا ذَا الْجَلالِ وَالإِکْرامِ، وَالْمِنَنِ الْعِظَامِ، والأَیَادِي الجِسَامِ.

---

(۱) جواهر العقدين في فضل الشرفين–المخطوط–، لوحة/ورقة: ۱۲۱ الوِجهة اليسرى

(۲) ينظر: آل البيت حول الرسول، ص: ۲۷۵

(۳) الأعلام للزركلي: ۲/۲۰۰

(۴) آل البيت حول الرسول، ص: ۲۷۵

(۵) آل البيت حول الرسول، ص: ۲۷۵

(۶) الفصول المهمة، ص: ۲۷۵ ونور الأبصار، ص: ۲۲۷

(۷) آل البيت حول الرسول، ص: ۲۷۵

إلٰهي! مَسَّني وَأهلِي الضُرّ ، وَأنتَ أرحَمُ الرَّاحِمين ، وَأرأَفُ الأرأفِينَ وَأجوَدُ الأَجوَدِينَ ، وأحكَمُ الحاكِمين، وأعدَلُ الفاصِلين.

اَللّٰهُمَّ إنِّي قَصَدتُ بَابَکَ ، وَنَزَلتُ بِفِنائِکَ واعتَصَمتُ بِحَبلِکَ ، وَاستَغَثتُ بِکَ ، وَاستَجَرتُ بِکَ ، يَاغِيَاثَ المُستَغِيثِينَ ! أَغِثني . يَاجَارَ المُستَجِيرِينَ ! أَجِرني . يَاإلٰهَ العَالَمِينَ ! خُذ بِيَدِي .

اے اللہ! تو ''سَلَام'' (سلامتی کا مالک) ہے، تجھ سے سلامتی ملتی ہے اور تجھ پر ہی ختم ہوتی ہے۔ اے وہ ذات جو جلال وکرم، عظیم احسانات اور بڑی طاقت والی ہے! تو بہت بابرکت ذات ہے۔

اے میرے معبود! مجھے اور میرے اہلِ خانہ کو پریشانیوں نے گھیر لیا ہے، تُو سب سے بڑا رحیم، سب سے بڑا مہربان، سب سے بڑا سخی، سب سے بڑا حاکم اور سب سے بڑا منصف وعادل ہے (ہم پر مہربانی فرما)۔

اے اللہ! میں تیرے دروازے پہ چل کر آیا ہوں، تیرے گھر کے صحن میں بیٹھا ہوں، تیری رسی کو تھام رکھا ہے، تجھ سے فریاد کرتا ہوں اور تیری پناہ میں آتا ہوں۔ اے فریاد کرنے والوں کی فریاد سننے والے! میری فریاد سن لے، اے پناہ طلب کرنے والوں کو پناہ دینے والے! مجھے پناہ عطا فرما، اے سارے جہانوں کے معبود! میری دستگیری فرما۔

يَامَولَايَ ! أنتَ سامِعُ كُلِّ دَعوَةٍ وَرَاحِمُ كُلِّ عَبرَةٍ ، ومُقِيلُ كُلِّ عَثرَةٍ ، سامِعُ كُلِّ نَجوىٰ ، ومَوضِعُ كُلِّ شَكوىٰ . لَايَخفىٰ عَلَيهِ شَيءٌ فِي الأرضِ ولَا فِي السَّمَاءِ .

اَللّٰهُمَّ ! إنِّي عَبدُکَ ، ابنُ أُمَتِکَ ، ذَلِيلٌ بَينَ بَرِيَّتِکَ ، مُسرِعٌ إلىٰ رَحمَتِکَ ، رَاجٍ لِثَوَابِکَ .

مَولَايَ ! قَد أَتَيتُکَ رَاجِيًا ، وقَصَدتُکَ مُؤَمِّلًا ، يَا خَيرَ مَأمُولٍ ! وَيَا أكرَمَ مَقصُودٍ ! صَلِّ علىٰ مُحَمَّدٍ وآلِهِ ، ولَاتُخَيِّبْ أَمَلِي ، وَلَاتَقطَعْ رَجائِي ، وَاستَجِبْ دُعَائِي ، وَارحَمْ تَضَرُّعِي يَاغِيَاثَ المُستَغِيثِين ! أَغِثنِي . يَاجَارَ المُستَجِيرِين ! أَجِرنِي . يَاإلٰهَ العَالَمِينَ ! خُذ بِيَدِي . .

اے میرے مالک! تُو ہر دعا کو سننے والا ہے، ہر آنسو پر رحم فرمانے والا ہے، ہر لغزش کو معاف کرنے والا ہے، ہر سرگوشی کو سننے والا ہے، اور ہر دکھ درد کی جائے پناہ ہے، تُو وہ ذات ہے جس کے سامنے زمین وآسمان کی کوئی چیز مخفی نہیں ہے۔

اے اللہ! میں تیرا بندہ ہوں، تیری بندی کی اولاد ہوں، تیری مخلوق میں نکما و ناکارہ ہوں، تیری رحمت کی طرف جلدی کرنے والا اور تیرے ثواب کا امیدوار ہوں۔

اے میرے مولیٰ! میں امیدوار بن کر تیری بارگاہ میں حاضر ہوا ہوں۔ اے وہ ذات جو اُن سب سے بہتر ہے جن سے امید کی جاسکتی ہے اور اُن سب سے کریم تر ہے جن کی طرف رخ کیا جاسکتا ہے! حضور ﷺ اور اُن کی آل پر رحمت نازل فرما، میری امید کو نامراد نہ فرما، میری دعا کو شرفِ قبول عطا فرما اور میری آہ وزاری پر رحم فرما۔ اے فریاد کرنے والوں کی فریاد سننے والے! میری فریاد سن لے، اے پناہ طلب کرنے والوں کو پناہ دینے والے! مجھے پناہ عطا فرما، اے سارے جہانوں کے معبود! میری دستگیری فرما۔

اَللّٰهُمَّ اِيَّاکَ اَمَلْتُ، وَلَکَ اَسْلَمْتُ، وَلِبَابِکَ قَرَعْتُ، صَلِّ عَلٰى مُحَمَّدٍ و آلِ مُحَمَّدٍ، وَلَا تَرُدَّنِي بِالْخَيْبَةِ مَحْرُوْمًا، وَاجْعَلْنِي مِمَّنْ تَفَضَّلْتَ عَلَيْهِ بِاِحْسَانِکَ، وَاَنْعَمْتَ عَلَيْهِ بِتَفَضُّلِکَ، وَ جُدْتَ عَلَيْهِ بِنِعْمَتِکَ، وَاَسْبَغْتَ عَلَيْهِ آلَائَکَ.

اَللّٰهُمَّ اَنْتَ غِيَاثِي وعِمَادِي، وَاَنْتَ عِصْمَتِي وَرَجَائِي. مَالِيَ اَمَلٌ سِوَاکَ وَلَا رَجَاءٌ غَيْرُکَ.

اے اللہ! میں صرف تجھ سے ہی امیدوار ہوں، تیرے ہی آگے سرنگوں ہوں، اور تیرے ہی دَر کا بھکاری ہوں۔ حضور ﷺ اور اُن کی آل پر رحمت نازل فرما، مجھے نامراد و محروم واپس نہ فرما، مجھے ان لوگوں کے زمرہ میں شامل فرما جن پر تُو نے اپنی مہربانی سے فضل فرمایا ہے، اپنا خوب انعام واحسان فرمایا ہے اور اپنی نعمتوں کی بارش برسائی ہے۔

اے اللہ! تُو ہی میرا فریادرس، میرا سہارا، اور میری حفاظت کرنے والا ہے۔ میری ساری امیدوں کا محور ومرکز تیری ہی ذات ہے، تیرے علاوہ کسی اور سے میری کوئی امید وابستہ نہیں (بس تجھ سے ہی میری ہر امید وابستہ ہے)۔

اَللّٰهُمَّ جُدْ عَلَيَّ بِفَضْلِکَ، وَامْنُنْ عَلَيَّ بِاِحْسَانِکَ، وَافْعَلْ بِي مَا اَنْتَ اَهْلُه، وَلَا تَفْعَلْ بِي مَا اَنَا اَهْلُه.

يَا اَهْلَ التَّقْوٰى وَالْمَغْفِرَةِ! اَللّٰهُمَّ! تَعَطَّفْ عَلَيَّ بِاِحْسَانِکَ، وَمُنَّ عَلَيَّ بِعَفْوِکَ وَعَافِيَتِکَ، وَحَصِّنْ دِيْنِي بِالْغِنٰى، وَاشْغَلْ قَلْبِي بِطَاعَتِکَ، وَلِسَانِي بِذِکْرِکَ، وَجَوَارِحِي بِمَا يُقَرِّبُنِي مِنْکَ..

اے اللہ! اپنے فضل اور مہربانی کی میرے اوپر سخاوت کر کے احسان فرما، میرے ساتھ وہ معاملہ فرما جو تیری ذات کے شایانِ شان ہے اور وہ معاملہ نہ فرما جس کے میں لائق ہوں۔

اے وہ ذات جو اِس کے اہل ہے کہ اُس سے ڈرا جائے اور جو اِس کے اہل ہے کہ لوگوں کی مغفرت کرے! اے اللہ! اپنے کرم سے میرے اوپر مہربانی فرما، اپنی معافی وعافیت سے مجھے ممنون فرما، استغناء کی دولت عطا فرما کر میرے دین کی حفاظت فرما، اور میرے دل کو اپنی اطاعت، زبان کو اپنے ذکر اور اعضاء کو اپنے قریب کر دینے والے اعمال میں مشغول فرما۔

اَللّٰهُمَّ ارْزُقْنِي قَلْبًا خَاشِعًا، وَلِسَانًا ذَاكِرًا، وَطَرْفًا غَاضًّا، وَيَقِينًا صَحِيحًا، حَتَّى لَا أُحِبَّ تَعْجِيلَ مَا أَخَّرْتَ، وَلَا تَقْدِيمَ مَا أَجَّلْتَ، يَا رَبَّ الْعَالَمِينَ! وَيَا أَرْحَمَ الرَّاحِمِينَ!

اَللّٰهُمَّ! صَلِّ عَلَى مُحَمَّدٍ وَآلِ مُحَمَّدٍ، وَاسْتَجِبْ دُعَائِي، وَارْحَمْ تَضَرُّعِي وَكُفَّ عَنِّي الْبَلَاءَ، وَلَا تُشْمِتْ بِيَ الْأَعْدَاءَ، وَلَا تَكِلْنِي إِلَى نَفْسِي طَرْفَةَ عَيْنٍ أَبَدًا، يَا رَبَّ الْعَالَمِينَ!

اے اللہ! مجھے ڈرنے والا دل، ذکر کرنے والی زبان، اور جھک جانے والی آنکھ نصیب فرما اور صحیح یقین کی نعمت سے بھی سرفراز فرما تاکہ میں اُس چیز میں جلدی نہ کروں جس کو تُو نے مؤخر کر رکھا ہے اور اُس چیز کو پہلے طلب نہ کروں جس کو تُو نے کسی خاص مدت تک روک رکھا ہے۔ اے سارے جہانوں کے رب! اے سب سے زیادہ مہربان!

اے اللہ! حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور اُن کی آل پر رحمت نازل فرما، میری دعا قبول فرما، میری انکساری و بے بسی پر رحم فرما، مجھ سے آزمائش ومصیبت کو دور فرما، میرے دشمنوں کو خوش ہونے کا موقع نصیب نہ فرما، اور مجھے پلک جھپکنے کے بقدر بھی میرے نفس کے حوالے کبھی نہ فرما، اے سارے جہانوں کے رب![1]

کرامات:

آپؒ کی کئی کرامات ہیں،[2] جن میں سے بطورِ نمونہ ایک کرامت نیچے ذکر کی جارہی ہے:

علامہ نبہانیؒ بعض مصنفین سے شکوہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ انہوں نے امام حسن عسکری سَلامُ اللہِ وَرَحمَتُہٗ علیہ، کی سیرت تو بیان کی ہے مگر ایک تو مختصر بیان کی ہے اور دوسری اُن کی کوئی ایک کرامت تک بھی ذکر نہیں کی، حالانکہ اُن کی ایک کرامت تو میں خود دیکھ چکا ہوں:

---

(۱) مستفاد من آل البیت حول الرسول، ص: ۲۷۹۔ ۲۸۰ بتسھیل

(۲) ملاحظہ ہو: نور الأبصار، ص: ۲۲۷ و ما بعدہ و الفصول المھمۃ، ص: ۲۷۴ و مابعدھا

سَن ۲۹۶ھ کی بات ہے، مَیں اُس وقت "کُوی سَنُخَق" (عراق کا ایک شہر ہے [1]) میں بطورِ قاضی متعین تھا۔ میں نے وہاں کی شدید مہنگائی اور قحط کی وجہ سے اُسے چھوڑ کر بغداد جانے کا ارادہ کر لیا حالانکہ اُس شہر میں میری "عہدۂ قضاء" کی تعیُّناتی کی مدتِ مقررہ بھی ابھی پوری نہیں ہوئی تھی، لیکن اس کے باوجود میں نے وہاں سے جانے کا پکا ارادہ کر لیا۔ یہ وہی سال ہے جس میں قحط نے عراق کے کئی شہروں کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔

بہر حال میں نے چند افراد پر مشتمل مختصر سے قافلہ کے ساتھ بغداد کی جانب سفر شروع کر دیا، جب یہ قافلہ سفر کرتا ہوا شہرِ "سامرہ" کے بالمقابل پہنچا، جو کہ عباسی خلفاء کا دار الحکومت تھا، تو ہم نے چاہا کہ یہاں سے گزر تو رہے ہی ہیں، حضرت امام حسن عسکریؒ کی قبر پر حاضری دیتے جائیں، چناں چہ سامرہ پہنچ کر ہم زیارت کیلیے چلے گئے، جب میں آپؒ کی قبر شریف کے پاس پہنچا تو مجھے ایک ایسی عجیب روحانی کیفیت حاصل ہوئی کہ ایسی کیفیت تو مجھے زندگی بھر کبھی نصیب نہیں ہوئی تھی، سوائے ایک مرتبہ کے کہ جب میں نے شہرِ "مَوصِل" میں حضرت یونس علیہ السلام کی قبرِ اطہر کی زیارت کی تھی، تو اس وقت بھی مجھے ایک عظیم کیفیت نصیب ہوئی تھی۔ بہر حال یہ حضرت امام حسن عسکریؒ کی ایک خاص کرامت ہے کہ اُن کے انتقال کے بعد بھی ان کی قبر پر حاضری دینے سے اللہ تعالیٰ نے اس قدر عالی کیفیتِ روحانیہ عطا فرمائی۔ پھر میں قرآن مجید کی کچھ تلاوت اور اللہ تعالیٰ سے دعائیں کر کے وہاں سے باہر آ گیا۔ [2]

ملاحظہ: مؤرخین نے لکھا ہے کہ آپؒ چونکہ زیادہ عرصہ باحیات نہیں رہے، اس لیے آپؒ کی سیرت طیبہ کے زیادہ پہلو اور مناقب وخصائل سامنے نہیں آ سکے۔ [3]

تمت بعون اللہ

۴ر رمضان المبارک ر ۱۴۳۹ھ الموافق ۲۰ر مئی ۲۰۱۸ م

---

(۱) المنجد في الأعلام، ص: ۴۸۱

(۲) جامع کرامات الاولیاء: ۲/۲۱ بتصرف یسیر.

(۳) أخبار الدُّوَل وآثار الأُوَل، ص: ۳۵۱ ومطالب السؤول، ص: ۳۰۹ والفصول المهمة، ص: ۲۷۴

فهــرس المصـــادر والمـــراجع

أ

١ـ آثار البلاد وأخبار العباد: لزكريا بن محمد بن محمود القزويني (المتوفى: ٦٨٢هـ)، ط: دار صادر – بيروت، جزء واحد

٢ـ الآحاد والمثاني: لابن أبي عاصم وهو أحمد بن عمرو الشيباني (المتوفى: ٢٨٧هـ)، ت: د. باسم فيصل أحمد الجوابرة، ط: دار الراية – الرياض، الأولى ١٤١١ - ١٩٩١م، ٦ أجزاء

٣ـ آل رسول الله وأولياؤه – موقف أهل السنة والشيعة من عقائدهم وفضائلهم وفقههم وفقهائهم - : لخصه ورتبه من منهاج السنة النبوية لابن تيمية: محمد بن عبد الرحمن، ط: لم يوجد اسم المكتبة، الطبعة الثانية، ١٤٢١ه، جزء واحد

٤ـ الأئمة الإثنا عشر = الشذرات الذهبية في تراجم الأئمة الإثني عشر عند الإمامية: لشمس الدين محمد بن طولون الحنفي – مؤرخ دمشق - رحمه الله (٩٥٣هـ)، ت: الدكتور صلاح الدين المنجّد، ط: دار صادر – بيروت، ١٣٧٧ه، جزء واحد

٥ـ أبو حنيفة: حياته وعصره - آراؤه وفقهه: للإمام محمد أبي زهرة، ط: دار الفكر العربي، دون طبعة وتاريخ، جزء واحد

٦ـ آپ کے مسائل اور ان کا حل: لمحمد يوسف اللدهيانوي رحمه الله، ط: مكتبه لدهيانوي - كراتشي، ١٩٩٥م، ١٠ أجزاء

٧ـ الاتحاف بحُبّ الأشراف: لعبد الله بن محمد الشّبراوى الشافعي ١١٧١هـ)، ت: سامي الغريري، ط: مؤسسة دار الكتاب الإسلامي، الأولى، ١٤٢٣هـ، جزء واحد

٨ـ اتحاف السائل بما لفاطمة من المناقب والفضائل: لزين الدين محمد المدعو بعبد الرؤوف بن تاج العارفين المناوِي (١٠٣١هـ)، ت: عبد اللطيف عاشور، ط: مكتبة القرآن - القاهرة، جزء واحد

٩ـ اتحاف الورى بأخبار أم القرى: لنجم الدين عمر بن محمد ابن فهد القرشي المكي (٨٨٥ه)، ت: فهيم محمد شلتوت، ط: مكتبة الخانجي - القاهرة، ثم من مطابع جامعة أم القرى، ٥ أجزاء

١٠ـ اتعاظ الحنفاء بأخبار الأئمة الفاطميين الخلفاء: للمَقريزي وهو تقي الدين أبو العباس أحمد بن علي بن عبد القادر، الشافعي المَقريزي (المتوفى: ٨٤٥هـ)، ت: د جمال الدين الشيال و د محمد حلمي، ط: لجنة

إحياء التراث الإسلامي، الأولى، ٣أجزاء

١١ـ آثارِ قیامت (اردو): المؤلف بالفارسية: الشاه رفيع الدين الدهلوي، المترجم إلى الأردية: محمد أسلم زاهد، ط: عمر پبلیکیشنز-لاهور، دون طبعة وتاريخ، جزء واحد

١٢ـ الاحتجاج بالأثر على من أنكر المهدي المنتظر: لحمود بن عبد الله التويجري، ط: الرئاسة العامة لإدارات البحوث العلمية، الرياض، السعودية، الأولى، ١٤٠٣ـهـ، جزء واحد

١٣ـ أحداث التاريخ الإسلامي بترتيب السنين، للدكتور عبد السلام بن إبراهيم التِرمانِيني، ط: طلاس للدراسات والترجمة والنشر - دمشق، الثانية، ١٤٠٨ـهـ، ١٤جزاء

١٤ـ أحسن الفتاوى: للمفتي رشيد أحمد (١٤٢٢ھ)، ط: ايچ ايم سعيد كمپنى كراچى، الحادي عشر، ١٤٢٥ھ، ٩أجزاء

١٥ـ أحكام القرآن: لأحمد بن علي أبو بكر الرازي الجصاص الحنفي (المتوفى: ٣٧٠هـ)، ت: عبد السلام محمد علي شاهين، ط: دار الكتب العلمية بيروت-لبنان، الأولى، ١٤١٥هـ/١٩٩٤م، ٣أجزاء

١٦ـ إحياء المَيت بفضائل أهل البيت: للإمام جلال الدين عبد الرحمن بن أبي بكر السيوطي (٩١١ھ)، ت: السيد عباس أحمد صقر الحسيني، ط: دار المدينة المنورة، الأولى، ١٤٢٠ھ، جزء واحد

١٧ـ إحياء علوم الدين: لأبي حامد محمد بن محمد الغزالي الطوسي (٥٠٥هـ)، ط: دار المعرفة-بيروت، ٤ اجزاء

١٨ـ الأخبار الطوال: لأبي حنيفة أحمد بن داود الدينوري (المتوفى: ٢٨٢هـ)، ت: عبد المنعم عامر، مراجعة: الدكتور جمال الدين الشيال، ط: دار إحياء الكتب العربي - عيسى البابي الحلبي وشركاؤه / القاهرة، الأولى، ١٩٦٠م، جزء واحد

١٩ـ أدب الدنيا والدين: للماوَرْدِيّ وهو أبو الحسن علي بن محمد بن محمد بن حبيب البصري (المتوفى: ٤٥٠هـ)، ط: دار مكتبة الحياة، ١٩٨٦م، جزء واحد

٢٠ـ الإذاعة لما كان وما يكون بين يدي الساعة: لأبي الطيب محمد صديق خان القِنَّوْجي الهندي (١٣٠٧هـ)، ط: دار ابن حزم، بيروت، لبنان، الأولى، ١٤٢١هـ، جزء واحد

٢١ـ الأربعون حديثا في المهدي: لأبي نعيم أحمد بن عبد الله الأصبهاني (٤٣٠هـ)، تعليق: أبو يعلى البيضاوي، ط: سلسلة كشف خبايا الزوايا، (من ثرات السلف وكنوز الخلف: ٥)، (دون طبعة وتاريخ (وقد حصَلنا عليه

بالتنزيل من الشبكة)، جزء واحد

٢٢- إزالة الخفاء عن خلافة الخلفاء: المؤلف (بلغة فارسية): قطب الدين المعروف بالشاه ولي الله المحدث الدهلوي بن عبد الرحيم الدهلوي (١١٧٦هـ)، المترجم (إلى اللغة الأردية): مولانا محمد عبد الشكور، ط: قديمي كتب خانه - كراتشي، دون طبعة وتاريخ، ٤أجزاء

٢٣- ازواج مطهرات حيات وخدمات: للدكتور حافظ حقاني مياں قادرى، ط: مكتبة دار الإشاعت - كراتشى، ١٩٩٨م، جزء واحد

٢٤- آسان ترجمۂ قرآن = توضيح القرآن: لـمحمد تقى العثمانى، ط: مكتبة معارف القرآن- كراتشى، ١٤٣١هـ، جزء واحد

٢٥- أساس البلاغة: لجار الله الزمخشري وهو أبو القاسم محمود بن عمرو بن أحمد (المتوفى: ٥٣٨هـ)، ت: محمد باسل عيون السود، ط: دار الكتب العلمية، بيروت-لبنان، الأولى، ١٤١٩هـ-١٩٩٨م، جزءان

٢٦- الاستبصار في عجائب الأمصار: لكاتب مراكشي (من القرن السادس)، ط: دار الشؤون الثقافية، بغداد، ١٩٨٦م، جزء واحد

٢٧- استجلاب ارتقاء الغُرَف بحُبّ أقرباء الرسول وذوي الشَّرَف: للحافظ شمس الدين محمد بن عبد الرحمن السخاوي (٩٠٢هـ)، ت: خالد بن أحمد الصُّمّي بابطين، ط: دار البشائر الإسلامية مجلد واحد

٢٨- الاستقصاء لأخبار دُوَل المغرب الأقصى: لشهاب الدين أبي العباس أحمد بن خالد بن محمد الناصري الدرعي الجعفري السلاوي (المتوفى: ١٣١٥هـ)، ت: جعفر الناصري/محمد الناصري، ط: دار الكتاب - الدار البيضاء، دون تاريخ، ٣أجزاء

٢٩- الاستيعاب في معرفة الأصحاب: لابن عبد البر القرطبي (٤٦٣هـ)، ت: علي محمد البجاوي، ط: دار الجيل، بيروت، الأولى، ١٤١٢هـ، ٤أجزاء

٣٠- أسد الغابة في معرفة الصحابة: لعز الدين ابن الأثير (630هـ)، ت: علي محمد معوض - عادل أحمد عبد الموجود، ط: دار الكتب العلمية، الأولى، ١٤١٥هـ، ٨أجزاء

٣١- إسعاف الراغبين في سيرة المصطفى وفضائل أهل بيته الطاهرين - على هامش نور الأبصار -: لأبي العرفان محمد بن علي الصَّبّان، المصري الشافعي (١٢٠٦هـ)، :مكتبة الفجر الجديد، طبعة قديمة، دون طبعة وتاريخ، جزء واحد

۳۲۔ اسلام میں امام مہدی کا تصور: افادات: مولانا محمد یوسف خان (جامعہ اشرفیہ لاہور)، تالیف: مولانا محمد ظفر اقبال، ط: بیت العلوم—لاہور، جزء واحد

۳۳۔ أسماء المغتالين من الأشراف في الجاهلية والإسلام: لأبي جعفر محمد بن حبيب البغدادي، (۲۴۵ھ)، ت: سيد كسروي حسن، ط: دار الكتب العلمية—بيروت—لبنان، الأولى، ۱۴۲۲ھ، جزء واحد

۳۴۔ الإسماعيلية— تاريخ وعقائد- :لإحسان إلهي ظهير (۱۹۸۷م)، ط: إدارہ ترجمان السنة — لاهور- باكستان، جزء واحد

۳۵۔ أسمى المطالب في سيرة علي بن ابي طالب: للدكتور علي محمد الصَّلَّابي، ط: دار التوزيع والنشر الإسلامية- القاهرة- مصر، الثانية، 1427ھ، جزء واحد

۳۶۔ اسوۂ حسینی یعنی شہید کربلاء: لمحمد شفیع المفتی الموقر (۱۳۹۶ھ)، ط: المكتبة الحقانية—ملتان، دون طبعة وتاريخ، جزء واحد

۳۷۔ الإشارات إلى معرفة الزيارات: لأبي الحسن علي بن أبي بكر بن علي الهروي، (۶۱۱ھ)، ط: مكتبة الثقافة الدينية، القاهرة، الأولى، ۱۴۲۳ھ، جزء واحد

۳۸۔ الإشارة إلى سيرة المصطفى وتاريخ من بعده من الخلفاء: لعلاء الدين، أبي عبد الله، مغلطاي بن قليج بن عبد الله المصري الحنفي، (المتوفى: ۷۶۲ھ)، ت: محمد نظام الدين الفُتَيح، ط: دار القلم - دمشق، الدار الشامية—بيروت، الأولى، ۱۴۱۶ھ، جزء واحد

۳۹۔ الإشاعة لأشراط الساعة (مخطوط): لمحمد بن رسول البَرْزَنْجي الحسيني (۱۱۰۳ھ)، محل المخطوط: مكتبة جامعة الملك سعود، رياض، السعودية، رقم المخطوط: ۶۹۹۰، عدد الأوراق / اللوحات: ۱۴۰، تاريخ النسخ: بخط غير واضح، جزء واحد

۴۰۔ الإشاعة لأشراط الساعة (مطبوع): لمحمد بن رسول البَرْزَنْجي الحسيني (۱۱۰۳ھ)، ت: محمد زكريا الكاندلوي (۱۴۰۲ھ)، ط: دار المنهاج، لبنان، بيروت، الثالثة، ۱۴۲۶ھ، جزء واحد

۴۱۔ الاشتقـــــاق: لأبي بكر محمد بن الحسن بن دُرَيد الأزدي (المتوفى: ۳۲۱ھ)، تحقيق وشرح: عبد السلام محمد هارون، ط: دار الجيل، بيروت—لبنان، الأولى، ۱۴۱۱ھ- ۱۹۹۱م، جزء واحد

۴۲۔ الإصابة في تمييز الصحابة: لأبي الفضل أحمد بن علي بن محمد بن أحمد بن حجر العسقلاني (۸۵۲ھ)، ت: عادل أحمد عبد الموجود وعلى محمد معوض، ط: دار الكتب العلمية - بيروت، الأولى - ۱۴۱۵ھ

۸أجزاء

۴۳۔ أطلس تاريخ الإسلام: للدكتور حسين مؤنس، ط: الزهراء للإعلام العربي-القاهرة، الأولى، ۱۴۰۷ھ، جزء واحد

۴۴۔ الاعتقاد والهداية إلى سبيل الرشاد على مذهب السلف وأصحاب الحديث: لأحمد بن الحسين الخُسْرَوْجِردي الخراساني، أبي بكر البيهقي (۴۵۸ھ)، ت: أحمد عصام الكاتب، ط: دار الآفاق الجديدة -بيروت، الأولى، ۱۴۰۱ھ، جزء واحد

۴۵۔ الأعـــــــلام: لخير الدين بن محمود بن محمد، الزركلي الدمشقي (۱۳۹۶ھ)، ط: دار العلم للملايين، الخامسة عشر، مايو ۲۰۰۲م

۴۶۔ الإعلام بمن في تاريخ الهند من الأعلام المسمى بـ "نزهة الخواطر وبهجة المسامع والنواظر": لعبد الحي بن فخر الدين بن عبد العلي الحسني الطالبي (المتوفى: ۱۳۴۱ھ)، ط: دار ابن حزم - بيروت، لبنان، الأولى، ۱۴۲۰ھ، ۱۹۹۹م، ۸أجزاء

۴۷۔ إعلام الموقعين عن رب العالمين: لشمس الدين محمد بن أبي بكر، الشهير بابن قيم الجوزية (۷۵۱ھ)، ت: محمد عبد السلام إبراهيم، ط: دار الكتب العلمية-بيروت، الأولى، ۱۴۱۱ھ ۴أجزاء

۴۸۔ الأغـــــاني: لأبي الفرج علي بن الحسين الأصفهاني الشيعي (۳۵۶ھ)، ت: سمير جابر، ط: دار الفكر - بيروت، الطبعة الثانية، ۲۴جزءا

۴۹۔ الإفادة في تاريخ الأئمة السادة: لأبي طالب يحيى بن الحسين بن هارون الحسني الزيدي (۴۲۴ھ)، ت: دار النفائس، كريم پارک، لاهور -تحت إشراف السيد نفيس الحسيني-، دون طبعة وتاريخ، جزء واحد

۵۰۔ الاكتفاء بما تضمنه من مغازي رسول الله - صلى الله عليه وسلم - والثلاثة الخلفاء: لأبي الربيع سليمان بن موسى بن سالم بن حسان الكلاعي الحميري (المتوفى: ۶۳۴ھ)، ط: دار الكتب العلمية - بيروت، الأولى، ۱۴۲۰ھ، جزءان

۵۱۔ آكام المرجان في ذكر المدائن المشهورة في كل مكان: لإسحاق بن الحسين المنجم (المتوفى: ق 4ھ)، ط: عالم الكتب، بيروت، الأولى، ۱۴۰۸ھ، جزء واحد

۵۲۔ إكمال الإكمال (تكملة لكتاب الإكمال لابن ماكولا): لمحمد بن عبد الغني بن أبي بكر بن شجاع، أبي بكر، معين الدين، ابن نقطة الحنبلي البغدادي (۶۲۹ھ)، ت: د. عبد القيوم عبد ريب النبي، ط: جامعة أم

القرى-مكة المكرمة، الأولى، ١٤١٠ه، ٥أجزاء

٥٣- إكمال تهذيب الكمال في أسماء الرجال: لمغلطاي بن قليج البكجري المصري الحنفي، أبي عبد الله، علاء الدين (٧٦٢هـ)، ت: أبو عبد الرحمن عادل بن محمد - أبو محمد أسامة بن إبراهيم، ط: الفاروق الحديثة للطباعة والنشر، الأولى، ١٤٢٢هـ ١٢ ، جزءًا

٥٤- آل البيت حول الرسول صلى الله عليه وسلم: لمحمد عبد العاطي بحيرى، ط: دار التوفيقية للتراث، جزء واحد

٥٥- الأماكن أو ما اتفق لفظه وافترق مسماه من الأمكنة: لأبي بكر محمد بن موسى بن عثمان الحازمي الهمداني، زين الدين (٥٨٤هـ)، ت: حمد بن محمد الجاسر، ط: دار اليمامة للبحث والترجمة والنشر، ١٤١٥هـ، جزء واحد

٥٦- الأمالي - فيها مراث وأشعار أخرى وأخبار ولغة وغيرها -: لأبي عبد الله محمد بن العباس بن محمد بن أبي محمد بن المبارك اليزيدى (المتوفى: ٣١٠هـ)، ط: مطبعة جمعية دائرة المعارف، حيدر آباد الدكن — الهند، الأولى، ١٣٦٧هـ-١٩٣٨م، جزء واحد

٥٧- امام ابوحنيفه كى سياسى زندگى: لمناظر أحسن الكيلاني (١٣٧٥ه)، ط: مكتبة الحق، بمبئى — الهند، دون طبعة وتاريخ، جزء واحد

٥٨- امام اعظم ابوحنيفه شهيد اهل بيت: لأبي الحسن شريف الله الكوثرى، التقديم: شيخ المشايخ السيد نفيس الحسيني، التقريظ: شيخ الحديث فضيلة الشيخ عبد المجيد اللدهيانوى، ط: سيد أحمد شهيد اكاديمى — لاهور، الثانية، ١٤٣١هـ، جزء واحد

٥٩- الإمام الحسن بن علي: للأستاذ حسن كامل الملطاوي (بعد ١٣٨٥ه)، ط: المجلس الأعلى للشؤون الإسلامية، وزارة الأوقاف بالقاهرة—مصر، ١٤١٤ه، جزء واحد

٦٠- الإمام الحسين في محراب الكتاب والسنة والتاريخ الإسلامي: لعبد الواحد الجزائري، ط: مكتبه سيد أحمد شهيد- لاهور- باكستان، الأولى، ١٤٢١هـ، جزء واحد

٦١- الإمام الصادق : حياته وعصره - آراؤه وفقهه: لأبي زهرة وهو محمد بن أحمد بن مصطفى المصري (المتوفى: ١٣٩٤هـ)، ط: دار الندوة الجديدة - بيروت، جزء واحد

٦٢- الإمام زيد: لأبي زهرة وهو محمد بن أحمد بن مصطفى المصري (المتوفى: ١٣٩٤هـ)، ط: دار الفكر العربي

بمدينة نصر، ثم طبع عكسه من دار النفائس بمدينة لاهور، دون طبعة و تاريخ، جزء واحد

٧٣۔ الإمام زيد بن علي المفترى عليه: لشريف الشيخ صالح أحمد الخطيب (المتوفى ١٤٠٣ھ)، ط: مكتبة سيد أحمد شهيد—لاهور، الأولى، ١٤٢٢ھ، جزء واحد

٧٤۔ إمتاع الأسماع بما للنبي من الأحوال والأموال والحفدة والمتاع: لأحمد بن علي، أبي العباس الحسيني العبيدي، تقي الدين المقريزي الشافعي (المتوفى: ٨٤٥ھ)، ت: محمد عبد الحميد النميسي، ط: دار الكتب العلمية—بيروت، الأولى، ١٤٢٠ھ، ١٥ جزءا

٧٥۔ إمداد الفتاوى: لأشرف علي التهانوي (١٣٦٢ھ)، ط: مكتبه دار العلوم كراتشي، ١٤٢٥ھ، ٦ أجزاء

٧٦۔ أمهات المؤمنين: لفضيلة الشيخ عاشق الهي بلندشهرى، ط: عمر پبلی کیشنز، لاہور، ٢٠٠٢م، جزء واحد

٧٧۔ إنارة الدجى في مغازي خير الورى صلى الله عليه وآله وسلم: لحسن بن محمد المشاط المالكي (المتوفى: ١٣٩٩ھ)، ط: دار المنهاج—جدة، الثانية- ١٤٢٦ھ، جزء واحد

٧٨۔ الإنباء في تاريخ الخلفاء: لمحمد بن علي بن محمد المعروف بابن العمراني (المتوفى: ٥٨٠ھ)، ت: قاسم السامرائي، ط: دار الآفاق العربية، القاهرة، الأولى، ١٤٢١ھ- ٢٠٠١م، جزء واحد

٧٩۔ الانتقاء في فضائل الثلاثة الأئمة الفقهاء مالك والشافعي وأبي حنيفة رضي الله عنهم: لأبي عمر يوسف بن عبد الله بن محمد بن عبد البر القرطبي (٤٦٣ھ)، ط: دار الكتب العلمية—بيروت، جزء واحد

٨٠۔ أنساب الأشراف: لأحمد بن يحيى بن جابر بن داود البَلاذُري (٢٧٩ھ)، ت: سهيل زكار ورياض الزركلي، ط: دار الفكر—بيروت، الأولى، ١٤١٧ھ، ١٣ جزءا

٨١۔ الأنساب: لأبي سعد عبد الكريم بن محمد بن منصور التميمي السمعاني، (٥٦٢ھ)، ت: عبد الرحمن بن يحيى المعلمي اليماني وغيره، ط: مجلس دائرة المعارف العثمانية، حيدر آباد، الأولى، ١٣٨٢ھ، جزء واحد

۷۲ـ الأنوار الباهرة بفضائل أهل البيت والذرية الطاهرة: لأبي الفتوح عبد الله بن عبد القادر التليدي المغربي (١٤٣٨ھ)، ت: محمد كاظم الموسوي، ط: المجمع العالمي للتقريب بين المذاهب الإسلامية—طهران، الأولى، ١٤٢٨ھ، جزء واحد

۷۳ـ اهل بيت كا مختصر تعارف: لأبي ريحان ضياء الرحمن الفاروقي (١٤١٧ھ)، ط: [صفحة اسم المطبع والناشر مفقودة في نسخة لدي]، رسالة وجيزة

۷۴ـ اهل بيت كى پاكيزه زندگى: لمحمد نديم القاسمي، ط: عمر پبلى كيشنز، لاهور، ٢٠٠٩م، جزء واحد

ب

۷۵ـ البحر المحيط في التفسير: لأبي حيان محمد بن يوسف، أثير الدين الأندلسي (745ھ)، ت: صدقي محمد جميل، ط: دار الفكر-بيروت، ١٤٢٠ھ، ١٠ أجزاء

۷۶ـ بدائع الصنائع في ترتيب الشرائع: لعلاء الدين، أبي بكر بن مسعود الكاساني الحنفي (٥٨٧ھ)، ط: دار الكتب العلمية، الثانية، ١٤٠٦ھ، ٨ أجزاء

... البداية والنهاية، ط: الفكر: لأبي الفداء إسماعيل بن عمر بن كثير الدمشقي (٧٧٤ھ)، ط: دار الفكر، ١٤٠٧ھ، ١٥ جزءا

۷۷ـ البداية والنهاية، ط: هجر: لأبي الفداء إسماعيل بن عمر بن كثير الدمشقي (٧٧٤ھ)، ت: عبد الله بن عبد المحسن التركي، ط: دار هجر، الأولى، ١٤١٨ھ، ٢١ جزءا

۷۸ـ بذل المجهود في حل أبي داود: لخليل أحمد السهارنفوري الهندي (١٣٤٦ھ)، ت: محمد زكريا الكاندلوي (١٤٠٢ھ)، ط: المكتبة الخليلية—سهارنفور—الهند، 5 أجزاء

۷۹ـ البرهان في علامات مهدي آخر الزمان: لعلاء الدين علي بن حسام الدين الشهير بالمتقي الهندي (٩٧٥ھ)، ت: أحمد علي سليمان، ط: دار الغد الجديد—المنصورة—مصر، الأولى، ١٤٢٤ھ، جزء واحد

۸۰ـ البر والصلة: لجمال الدين أبي الفرج عبد الرحمن بن علي الجوزي (٥٩٧ھ)، ت: عادل عبد الموجود، علي معوض، ط: مؤسسة الكتب الثقافية، بيروت، الأولى، ١٤١٣ھ، جزء واحد

۸۱ـ بريقة محمودية في شرح طريقة محمدية وشريعة نبوية في سيرة أحمدية: لمحمد بن محمد، أبي سعيد

الخادمي الحنفي (١١٥٦هـ)، ط: مطبعة الحلبي، ١٣٤٨هـ ۴أجزاء

۸۲۔ البصائر والذخائر: لأبي حيان التوحيدي، علي بن محمد بن العباس (نحو ٤٠٠هـ)، ت: د. وداد القاضي، ط: دار صادر—بيروت، الأولى، ١٤٠٨هـ، ١٠أجزاء

۸۳۔ بغية الطلب في تاريخ حلب: لابن العديم وهو عمر بن أحمد العقيلي، (المتوفى: ٦٦٠هـ)، ت: سهيل زكار، ط: دار الفكر، ١٢ جزءا

۸۴۔ بغية الوعاة في طبقات اللغويين والنحاة: لجلال الدين عبد الرحمن بن أبي بكر، السيوطي (المتوفى: ٩١١هـ)، ت: محمد أبو الفضل إبراهيم، ط: المكتبة العصرية- لبنان/صيدا، جزءان

۸۵۔ بنات اربعه: لـمحمد نافع، ط: دار الكتاب—لاهور، ١٤٣٢م، جزء واحد

۸۶۔ بنات الصحابة: للدكتور أحمد خليل جمعة، ط: اليمامة—دمشق، الثانية، ١٤٢٥ھ، جزء واحد

۸۷۔ بهجة المَجالِس وأنس المُجالِس وشحذ الذاهن والهاجس: لأبي عمر يوسف بن عبد الله الشهير بابن عبد البر القرطبي (٤٦٣هـ)، ت: محمد مرسي الخولي، ط: دار الكتب العلمية _ بيروت، ۳أجزاء

۸۸۔ البيان والتبيين: للجاحظ وهو أبو عثمان، عمرو بن بحر بن محبوب الكناني المعتزلي (المتوفى: ٢٥٥هـ)، ط: دار ومكتبة الهلال، بيروت، ١٤٢٣هـ ۳أجزاء

ت

۸۹۔ التاج المكلل من جواهر مآثر الطراز الآخر والأول: لأبي الطيب محمد صديق خان بن حسن بن علي ابن لطف الله الحسيني البخاري القِنَّوجي (المتوفى: ١٣٠٧هـ)، ط: وزارة الأوقاف والشؤون الإسلامية، قطر، الأولى، ١٤٢٨هـ-٢٠٠٧م، جزء واحد

... تاريخ ابن الجوزي: ينظر: المنتظم في تاريخ الملوك والأمم

۹۰۔ تاريخ ابن خلدون، المسمى بــــ "ديوان المبتدأ والخبر في تاريخ العرب والبربر ومن عاصرهم من ذوي الشأن الأكبر": لعبد الرحمن بن محمد بن محمد، ابن خلدون أبي زيد، ولي الدين الحضرمي الإشبيلي (المتوفى: ٨٠٨هـ)، ت: خليل شحادة، ط: دار الفكر، بيروت، الثانية، ١٤٠٨هـ-١٩٨٨م، ٨أجزاء

۹۱۔ تاريخ ابن معين / رواية أحمد بن محمد بن القاسم بن محرز: لأبي زكريا يحيى بن معين البغدادي (المتوفى: ٢٣٣هـ)، ت: الجزء الأول: محمد كامل القصار، ط: مجمع اللغة العربية—دمشق، الأولى، ١٤٠٥هـ، ١٩٨٥م، جزءان

٩٢- تاريخ ابن الوردي: لعمر بن مظفر، أبي حفص، زين الدين ابن الوردي المعري الكندي (٧٤٩هـ)، ط: دار الكتب العلمية-لبنان/بيروت، الأولى، ١٤١٧هـ، جزءان

٩٣- تاريخ إربل: للمبارك بن أحمد بن المبارك بن موهوب اللخمي الإربلي، المعروف بابن المستوفي (٦٣٧هـ)، ت: سامي بن سيد خماس الصقار، ط: وزارة الثقافة والإعلام، دار الرشيد للنشر، العراق، ١٩٨٠م، جزءان

٩٤- تاريخ الإسلام ووفيات المشاهير والأعلام: لشمس الدين أبي عبد الله محمد بن أحمد بن عثمان بن قَايماز الذهبي (٧٤٨هـ)، ت: عمر عبد السلام التدمري، ط: دار الكتاب العربي، بيروت، الثانية، ١٤١٣هـ، ٥٢ جزءا

٩٥- تاريخ اسلام: لأكبر شاه خان النجيب آبادي (المتوفى بعد ١٣٤٣هـ)، ط: اسلامي اكيڈمي- لاهور، الأولى، ١٩٩٧م، ٣أجزاء

٩٦- تاريخ أصبهان = أخبار أصبهان: لأبي نعيم أحمد بن عبد الله الأصبهاني (٤٣٠هـ)، ت: سيد كسروي حسن، ط: دار الكتب العلمية-بيروت، الأولى، ١٤١٠هـ، جزءان

٩٧- تاريخ بغداد وذيوله: لأبي بكر أحمد بن علي الخطيب البغدادي (٤٦٣هـ)، ط: دار الكتب العلمية- بيروت، ت: مصطفى عبد القادر عطا، الأولى، ١٤١٧هـ، ٢٤ جزءا

٩٨- تاريخ حلب: لمحمد بن علي بن محمد، أبي عبد الله التَّنُوخي الحلبي، المعروف بالعَظِيمي (٥٥٦هـ)، ت: إبراهيم زعرور، ط: [ومن العجب أن اسم المطبع غير مكتوب]، جزء واحد

٩٩- تاريخ الخلفاء: لجلال الدين عبد الرحمن السيوطي، (٩١١هـ)، ط: قديمي كتب خانه-كراتشي، تصحيح وتخريج: محمد محيي الدين عبد الحميد، جزء واحد

١٠٠- تاريخ خليفة بن خياط: لأبي عمرو خليفة بن خياط بن خليفة البصري (٢٤٠هـ)، ت: د. أكرم ضياء العمري، ط: دار القلم، مؤسسة الرسالة-دمشق، الثانية، ١٣٩٧ه، جزء واحد

١٠١- تاريخ الخميس في أحوال أنفس النفيس: لحسين بن محمد بن الحسن الدِّيار بَكْري (٩٦٦هـ)، ط: دار صادر-بيروت، جزءان

١٠٢- تاريخ دمشق: لأبي القاسم علي بن الحسن بن هبة الله المعروف بابن عساكر (٥٧١هـ)، ت: عمرو بن غرامة العمروي، ط: دار الفكر، ١٤١٥هـ، ٨٠ جزءا

١٠٣ـ تاريخ الطبري = تاريخ الرسل والملوك، وصلة تاريخ الطبري: لمحمد بن جرير الآملي، أبي جعفر الطبري (٣١٠هـ) [صلة تاريخ الطبري لعريب بن سعد القرطبي، المتوفى: ٣٦٩هـ]، ط: دار التراث — بيروت، الثانية-١٣٨٧هـ، ١١ جزءا

١٠٤ـ تاريخ القضاعي = عيون المعارف و فنون أخبار الخلائف: لأبي عبدالله القاضي محمد بن سلامة بن جعفر الشافعي القضاعي (المتوفى ٤٥٤هـ)، ت: د. جميل عبدالله محمد المصري ط: مركز البحوث وإحياء التراث الإسلامي مكة المكرمة، ١٤١٥ه، جزء واحد.

١٠٥ـ التاريخ الكبير: لمحمد بن إسماعيل البخاري، أبي عبدالله (٢٥٦هـ)، ط: دائرة المعارف العثمانية، حيدر آباد — الدكن، ٨ أجزاء

١٠٦ـ تاريخ الكوفة: لحسين بن أحمد البراقي النجفي الشيعي (١٣٣٢ه)، ط: دار الأضواء — بيروت، الرابعة، ١٤٠٧ه، جزء واحد

١٠٧ـ تاريخ المدينة: لعمر بن شبة (واسمه زيد) البصري، الشهير بابن شَبَّة (٢٦٢هـ)، ت: فهيم محمد شلتوت، طبع على نفقة: السيد حبيب محمود أحمد — جدة، ١٣٩٩هـ، ٤ أجزاء

١٠٨ـ تاريخ المذاهب الإسلامية في السياسة والعقائد وتاريخ المذاهب الفقهية: لأبي زهرة وهو محمد بن أحمد بن مصطفى المصري (المتوفى: ١٣٩٤هـ)، ط: دار الفكر العربي — القاهرة، جزء واحد

١٠٩ـ التبيين في أنساب القرشيين: لموفق الدين أبي محمد عبدالله بن أحمد المقدسي، الشهير بابن قدامة الحنبلي (٦٢٠هـ)، ت: محمد نايف الدُلَيمي، ط: منشورات المجمع العلمي العراقي، الأولى، ١٤٠٢هـ، جزء واحد

١١٠ـ تبيين المعاني في شرح ديوان ابن هاني: للدكتور زاهد علي (الأستاذ بالعربية في حيدر آباد دكن، الهند)، ط: مطبعة المعارف ومكتبتها — مصر، ١٣٥٢ه، جزء واحد

١١١ـ تجارب الأمم وتعاقب الهمم: لأبي علي أحمد بن محمد بن يعقوب مسكويه (المتوفى: ٤٢١هـ)، ت: أبو القاسم إمامي، ط: سروش، طهران، الثانية، ٢٠٠٠م، ٧ أجزاء

١١٢ـ التحفة اللطيفة في تاريخ المدينة الشريفة: لشمس الدين أبي الخير محمد بن عبد الرحمن السخاوي (المتوفى: ٩٠٢هـ)، ط: الكتب العلميه، بيروت — لبنان، الاولى ١٤١٤ه/١٩٩٣م، جزءان

١١٣ـ تحفة الأحوذي بشرح جامع الترمذي: لأبي العلا محمد عبد الرحمن بن عبد الرحيم المباركفورى

(۱۳۵۳هـ)، ط: دار الكتب العلمية-بيروت، ۱۰ أجزاء

...تحفة النظار في غرائب الامصار وعجائب الأسفار: انظر: رحلة ابن بطوطة

۱۱۴- تدريب الراوي في شرح تقريب النواوي: للسيوطي وهو جلال الدين عبد الرحمن بن أبي بكر، السيوطي (المتوفى: ۹۱۱هـ)، ت: أبو قتيبة نظر محمد الفاريابي، ط: دار طيبة، جزءان

۱۱۵- التذكرة الحمدونية: لمحمد بن الحسن بن محمد بن علي بن حمدون، أبي المعالي، بهاء الدين البغدادي (۵۶۲هـ)، ط: دار صادر، بيروت، الأولى، ۱۴۱۷هـ، ۱۰ أجزاء

۱۱۶- التذكرة بأحوال الموتى وأمور الآخرة: لأبي عبد الله محمد بن أحمد، شمس الدين القرطبي (۶۷۱هـ)، ت: د. الصادق بن محمد بن إبراهيم، ط: مكتبة دار المنهاج، الرياض، الأولى، ۱۴۲۵هـ، جزء واحد

۱۱۷- تذكرة الحفاظ: لشمس الدين أبي عبد الله محمد بن أحمد بن عثمان بن قَايْماز الذهبي (۷۴۸هـ)، ط: دار الكتب العلمية بيروت-لبنان، الأولى، ۱۴۱۹هـ، ۴ أجزاء

۱۱۸- تذكرة خواص الأمة بذكر خصائص الأئمة، المعروف بـــ "تذكرة الخواص": لشمس الدين أبي المظفر يوسف بن قِزْغلي بن عبد الله-سبط ابن الجوزي- (۶۵۴هـ)، ط: منشورات الشريف الرضي، أمير-قم، ۱۴۱۸هـ، جزء واحد

۱۱۹- تذكره محبوب كبريا صلى الله عليه وسلم وسيدنا حسين: لمحمد عبد الكريم نديم، ط: انجمن خدام الاسلام حنفيه قادريه-لاهور، السابعة، ۱۴۲۶هـ، جزء واحد

۱۲۰- تذهيب تهذيب الكمال في أسماء الرجال: لشمس الدين أبي عبد الله محمد بن أحمد الذهبي (۷۴۸ه)، ت: غُنَيم عباس غنيم و مجدي السيد أمين، ط: الفاروق الحديثة للطباعة والنشر - القاهرة، الأولى، ۱۴۲۵ه، ۱۱ جزءا

۱۲۱- تراجم سيدات بيت النبوة رضي الله عنهن: للدكتورة عائشة عبد الرحمن (الشهيرة بـــ "بنت الشاطئ")، ط: دار الحديث-القاهرة، ۱۴۲۸هـ، جزء واحد

۱۲۲- ترجمان السنة: لبدر عالَم الميرتهي الهندي (۱۳۸۵هـ)، ط: مكتبه رحمانيه - لاهور، دون طبعة وتاريخ، ۴ أجزاء

۱۲۳- تسهيل بهشتي زيور: تاليف: أشرف علي التهانوي (۱۳۶۲ه)، تسهيل: أساتذة جامعة الرشيد كراتشي تحت إشراف المفتي أبي لبابه شاه منصور، ط: الحجاز كراتشي، ۱۴۳۳ه، جزءان

١٢٤ـ التصريح بما تواتر في نزول المسيح: لمحمد أنور شاه بن معظم شاه الكشميري الهندي (١٣٥٣هـ)، ت: عبد الفتاح أبو غدة، ط: مكتبة المطبوعات الإسلامية بحلب - ودار القرآن الكريم بيروت، الثالثة - ١٤٠١هـ، جزء واحد

١٢٥ـ تفسير ابن عطية = المحرر الوجيز في تفسير الكتاب العزيز: لأبي محمد عبد الحق بن غالب بن عبد الرحمن بن تمام بن عطية الأندلسي المحاربي (542هـ)، ت: عبد السلام عبد الشافي محمد، ط: دار الكتب العلمية —بيروت، الأولى- ١٤٢٢هـ، ٦ أجزاء

...تفسير البحر المحيط: انظر: البحر المحيط في التفسير

١٢٦ـ تفسير البغوي = معالم التنزيل في تفسير القرآن: لمحيي السنة، أبي محمد الحسين بن مسعود البغوي الشافعي (٥١٠هـ)، ت: عبد الرزاق المهدي، ط: دار إحياء التراث العربي —بيروت، الأولى، ١٤٢٠هـ ٥ أجزاء

١٢٧ـ تفسير الرازي: لأبي عبد الله محمد بن عمر الرازي الملقب بفخر الدين الرازي خطيب الري (٦٠٦هـ)، ط: دار إحياء التراث العربي —بيروت، الثالثة- ١٤٢٠هـ ٣٢ جزءا

...تفسير روح المعاني: انظر: روح المعاني في تفسير القرآن العظيم و السبع المثاني

١٢٨ـ تفسير الطبرى = جامع البيان في تأويل القرآن: لمحمد بن جرير الآملي، أبي جعفر الطبري (٣١٠هـ)، ت: أحمد محمد شاكر، ط: مؤسسة الرسالة، الأولى، ١٤٢٠هـ، ٢٤ جزءا

١٢٩ـ تفسير القرآن العظيم: لأبي الفداء إسماعيل بن عمر بن كثير الدمشقي (٧٧٤هـ)، ت: سامي بن محمد سلامة، ط: دار طيبة، الثانية ١٤٢٠هـ، ٨ أجزاء

١٣٠ـ تفسير القرطبي = الجامع لأحكام القرآن: لأبي عبد الله محمد بن أحمد، شمس الدين القرطبي (٦٧١هـ)، ت: أحمد البردوني وإبراهيم أطفيش، ط: دار الكتب المصرية —القاهرة، الثانية، ١٣٨٤هـ، ٢٠ جزءا

...التفسير الكبير: انظر: تفسير الرازي

...التفسير لابن كثير: انظر: تفسير القرآن العظيم لابن كثير

١٣١ـ التفسير المظهري: لمحمد ثناء الله، ت: غلام نبي التونسي، ط: مكتبة الرشدية —الباكستان، ١٤١٢هـ، ١٠ أجزاء

١٣٢ـ تفسير النسفي = مدارك التنزيل و حقائق التأويل: لأبي البركات عبد الله بن أحمد بن محمود حافظ الدين

النسفي (۷۱۰هـ)، ت: يوسف علي بديوي، ط: دار الكلم الطيب، بيروت، الأولى، ۱۴۱۹هـ، ۳أجزاء

۱۳۳ـ تقريب التهذيب: لأبي الفضل أحمد بن علي ابن حجر العسقلاني (۸۵۲هـ)، ت: محمد عوامة، ط: دار الرشيد—سوريا، الأولى، 1406ه، جزء واحد

۱۳۴ـ تكملة فتح الملهم: لمحمد تقي العثماني، ط: مكتبه دار العلوم—كراتشي، ۱۴۲۴ه، ۶أجزاء

۱۳۵ـ تلخيص تاريخ نيسابور: لأبي عبد الله الحاكم محمد بن عبد الله النيسابوري المعروف بابن البيع (۴۰۵هـ)، تلخيص: أحمد بن محمد بن الحسن بن أحمد المعروف بالخليفة النيسابوري، تعريب عن الفارسية: د. بهمن كريمي-طهران، ط: كتابخانة ابن سينا—طهران، جزء واحد

۱۳۶ـ التمهيد والبيان في مقتل الشهيد عثمان: لأبي عبد الله محمد بن يحيى الأندلسي (۷۴۱هـ)، ت: د. محمود يوسف زايد، ط: دار الثقافة-الدوحة—قطر، الأولى، ۱۴۰۵ه، جزء واحد

۱۳۷ـ التَّنويرُ شَرحُ الجَامِعِ الصَّغِيرِ: لمحمد بن إسماعيل بن صلاح الحسني، الكحلاني ثم الصنعاني، أبي إبراهيم، عز الدين، المعروف كأسلافه بالأمير (المتوفى: ۱۱۸۲هـ)، ت: د. محمَّد إسحاق محمَّد إبراهيم، ط: مكتبة دار السلام، الرياض، الأولى، ۱۴۳۲هـ، ۱۱جزءا

۱۳۸ـ تهذيب التهذيب: لأبي الفضل أحمد بن علي، ابن حجر العسقلاني (۸۵۲هـ)، ط: مطبعة دائرة المعارف النظامية، الهند، الأولى، ۱۳۲۶هـ، ۱۲جزءا

۱۳۹ـ تهذيب الكمال في أسماء الرجال: ليوسف بن عبد الرحمن بن يوسف، أبي الحجاج القضاعي المزي (۷۴۲هـ)، ت: د. بشار عواد معروف، ط: مؤسسة الرسالة—بيروت، الأولى، ۱۴۰۰ه، ۳۵جزءا

۱۴۰ـ التواضع والخمول: لأبي بكر عبد الله بن محمد المعروف بابن أبي الدنيا (۲۸۱هـ)، ت: محمد عبد القادر أحمد عطا، ط: دار الكتب العلمية—بيروت، الأولى، ۱۴۰۹ه، جزء واحد

۱۴۱ـ توجيه النظر إلى أصول الأثر: لطاهر بن صالح السمعوني الجزائري، ثم الدمشقي (المتوفى: ۱۳۳۸هـ)، ت: عبد الفتاح أبو غدة، ط: مكتبة المطبوعات الإسلامية—حلب، الأولى، ۱۴۱۶هـ-۱۹۹۵م، جزءان ...

توضيح القرآن: انظر: آسان ترجمهٔ قرآن

ث

۱۴۲۔ الثغور الباسمة في مناقب سيدتنا فاطمة: لعبد الرحمن بن ابي بكر الشهير بجلال الدين السيوطى (۹۱۱هـ)، ت: السيد حسن الحسيني، ط: دار البشائر الإسلامية- بيروت، الأولى، ۱۴۳۱هـ، جزء واحد

۱۴۳۔ ثمار القلوب في المضاف والمنسوب: للثعالبي وهو أبو منصور عبد الملك بن محمد بن إسماعيل الثعالبي (المتوفى: ۴۲۹هـ)، ط: دار المعارف- القاهرة، جزء واحد

۱۴۴۔ ثورة زيد بن علي: لناجي حسن، تقديم: الدكتور محمد عبد الهادي الأستاذ بجامعة عين الشمس بالقاهرة، ط: مكتبة النهضة- بغداد، الثانية، ۲۰۰۷م، جزء واحد

ج

۱۴۵۔ الجامع الصغير وزيادته: لعبد الرحمن بن أبي بكر، جلال الدين السيوطي (المتوفى: ۹۱۱هـ) ...

الجامع لأحكام القرآن: انظر: تفسير القرطبي

۱۴۶۔ الجد الحثيث في بيان ما ليس بحديث: لأحمد بن عبد الكريم بن سعودي الغزي العامري (۱۱۴۳هـ)، ت: بكر عبد الله أبو زيد، ط: دار الراية- الرياض، الأولى، ۱۴۱۲هـ، جزء واحد

۱۴۷۔ الجرح والتعديل: لابن أبي حاتم وهو أبو محمد عبد الرحمن بن محمد التميمي، الرازي (المتوفى: ۳۲۷هـ)، ط: طبعة مجلس دائرة المعارف العثمانية- بحيدر آباد الدكن- الهند، دار إحياء التراث العربي- بيروت، الأولى، ۱۲۷۱هـ ۱۹۵۲م، ۹ أجزاء۔

۱۴۸۔ الجزء المتمم لطبقات ابن سعد [الطبقة الرابعة من الصحابة ممن أسلم عند فتح مكة وما بعد ذلك]: لأبي عبد الله محمد بن سعد البغدادي المعروف بابن سعد (۲۳۰هـ)، ت: الدكتور/ عبد العزيز عبد الله السلومي، ط: مكتبة الصديق- الطائف، المملكة العربية السعودية، ۱۴۱۶هـ، جزء واحد

۱۴۹۔ جلاء الأفهام في فضل الصلاة على محمد خير الأنام: لمحمد بن أبي بكر، شمس الدين ابن قيم الجوزية (۷۵۱هـ)، ت: شعيب الأرناؤوط- عبد القادر الأرناؤوط، ط: دار العروبة- الكويت، الثانية، ۱۴۰۷ه، جزء واحد

۱۵۰۔ الجليس الصالح الكافي والأنيس الناصح الشافي: لأبي الفرج المعافى بن زكريا بن يحيى الجريرى النهرواني (المتوفى: ۳۹۰هـ)، ت: عبد الكريم سامي الجندي، ط: دار الكتب العلمية، بيروت- لبنان،

الأولى ١٤٢٦هـ ـ ٢٠٠٥م جزء واحد

جمع الجواهر في المُلَح والنوادر: لأبي إسحاق إبراهيم بن علي بن تميم الأنصاري الحصري القيرواني (٤٥٣هـ)، ط: المطبعة الرحمانية، شارع الخرنفش-مصر، بعد ١٣٥٣هـ، جزء واحد

١٥٢ـ جمع الوسائل في شرح الشمائل: لأبي الحسن علي بن (سلطان) محمد الشهير بالملا علي القاري (المتوفى: ١٠١٤هـ)، ط: المطبعة الشرفية-مصر، جزءان

١٥٣ـ جمهرة أنساب العرب: لأبي محمد علي بن أحمد بن سعيد بن حزم الأندلسي القرطبي (٤٥٦هـ)، ت: لجنة من العلماء، ط: دار الكتب العلمية-بيروت، الأولى، ١٤٠٣هـ، جزء واحد

١٥٤ـ جمهرة نسب قريش وأخبارها: للزبير بن بكار بن عبد الله القرشي الأسدي المكي (المتوفى: ٢٥٦هـ)، ت: محمود محمد شاكر، ط: مطبعة المدني، ١٣٨١هـ، جزء واحد

١٥٥ـ جواهر العِقدين في فضل الشرفين (شرفي العلم والنسب) [المخطوط]: لعلي بن عبد الله بن أحمد الحسني الشافعيّ الشهير بالسَّمهُودي (٩١١هـ)، محل المخطوط: مكتبة مؤسسة الملك عبد العزيز، الدار البيضاء، رقم المخطوط: ١٢٥، عدد الورقات: ١٧٥، تاريخ النسخ: ١١٣١هـ، الناسخ: أحمد بن أبي القاسم بن أحمد بن الرشيد

١٥٦ـ جواهر العِقدين في فضل الشرفين (شرفي العلم والنسب) [المطبوع]: لعلي بن عبد الله بن أحمد الحسني الشافعيّ الشهير بالسَّمهُودي (المتوفى: ٩١١هـ)، ت: الدكتور موسى بناي العليلي، ط: مطبعة العاني — بغداد، ١٤٠٥هـ، جزءان

١٥٧ـ الجوهر الشفاف في أنساب السادة الأشراف: لعارف أحمد عبد الغني، ط: دار كنان — دمشق، دون طبعة وتاريخ، جزءان

١٥٨ـ الجوهرة في نسب النبي وأصحابه العشرة: لمحمد بن أبي بكر الأنصاري التِلمساني المعروف بالبَرِّي (المتوفى: بعد ٦٤٥هـ)، ت: د محمد التونجي، الأستاذ بجامعة حلب، ط: دار الرفاعي للنشر والطباعة والتوزيع—الرياض، الأولى، ١٤٠٣هـ ـ ١٩٨٣م، جزءان

ح

١٥٩ـ الحاوي للفتاوي (متضمنا العَرف الوَردي في أخبار المهدي): لعبد الرحمن بن أبي بكر، جلال الدين السيوطي (٩١١هـ)، ط: دار الفكر للطباعة والنشر، بيروت-لبنان، ١٤٢٤هـ، جزءان

۱۷۰۔ الحدائق الوردية في مناقب أئمة الزيديه: للقاضي الشهيد المحلي وهو حميد بن احمد المَحَلّي الهمداني، أبي عبد الله حسام الدين، الزيدي (۶۵۲ھ)، ت: المرتضى الحسني، ط: مكتبة بدر- صنعاء، الأولى، ۱۴۲۳ھ، جزءان.

۱۷۱۔ حسن الصحابة في شرح أشعار الصحابة: لعلي فهمي الجابي السمو منتاري (بعد ۱۳۲۶ھ)، ط: روشن مطبعه، ۱۳۲۴ھ، جزء واحد (وله ثلاثة أجزاء وطُبع منها الجزء الأول فقط على ما يظهر من كلام الزركلي في الأعلام).

۱۷۲۔ حقوق آل البيت بين السنة والبدعة: لأبي العباس أحمد بن عبد الحليم الشهير بشيخ الإسلام ابن تيمية (۷۲۸ھ)، ت: عبد القادر أحمد عطا، ط: دار الكتب العلمية – بيروت- لبنان، الثانية، ۱۴۰۷ھ، رسالة وجيزة

۱۷۳۔ حلية الأولياء وطبقات الأصفياء: لأبي نعيم أحمد بن عبد الله الأصبهاني (۴۳۰ھ)، ط: السعادة - بجوار محافظة مصر، ۱۳۹۴ھ، ۱۰ أجزاء

۱۷۴۔ الحماسة البصرية: لصدر الدين، أبي الحسن علي بن أبي الفرج بن الحسن، البصري (المتوفى: ۶۵۹ھ)، ت: مختار الدين أحمد، ط: عالم الكتب — بيروت، جزءان

۱۷۵۔ الحياة الأدبية في عصر بني أمية: لمحمد عبد المنعم خفاجي المصري (۱۴۲۷ھ)، ط: دار الكتاب اللبناني- بيروت، الثانية، ۱۹۷۳م، جزء واحد

۱۷۶۔ حياة الحيوان الكبرى: لمحمد بن موسى الشافعي الشهير بالدميري (۸۰۸ھ)، ط: دار الكتب العلمية، بيروت، الثانية، ۱۴۲۴ھ، جزءان

۱۷۷۔ الحور العين عن كتب العلم الشرائف دون النساء العفائف: لأبي سعيد نشوان بن سعيد بن نشوان الحميري المعتزلي (۵۷۳ھ)، ت: كمال مصطفى، ط: دار آزال — بيروت، الثانية، ۱۹۸۵م، جزء واحد

۱۷۸۔ الحيوان: للجاحظ وهو أبو عثمان عمرو بن بحر بن محبوب الكناني (المتوفى: ۲۵۵ھ)، ط: دار الكتب العلمية — بيروت، الثانية، ۱۴۲۴ھ 7 أجزاء

خ

۱۷۸۔ خاندان نبوی کے چشم وچراغ (اردو ترجمہ "أبناء النبي صلى الله عليه وسلم"): مؤلف "أبناء النبي صلى الله عليه وسلم": الشيخ إبراهيم محمد حسن الجمل، المترجم: مولانا محمد أويس سرور، ط: بيت العلوم—

لاهور، دون طبعة وتاريخ، جزء واحد

۱۶۰۔ خديجة بنت خويلد سيدة في قلب المصطفى: للدكتور محمد عبده يماني (۱۴۳۱ھ)، ط: مؤسسة علوم القرآن-دمشق، الأولى، ۱۴۲۱ھ، جزء واحد

۱۶۱۔ خزانة الأدب ولب لباب لسان العرب: لعبد القادر بن عمر البغدادي (۱۰۹۳ھ)، تحقيق وشرح: عبد السلام محمد هارون، ط: مكتبة الخانجي-القاهرة، الرابعة، ۱۴۱۸ھ۔۱۹۹۷ھ م، ۱۳ جزءا

۱۶۲۔ الخصائص الكبرى: لعبد الرحمن بن أبي بكر، جلال الدين السيوطي (المتوفى: ۹۱۱ھ)، ط: دار الكتب العلمية—بيروت، جزءان

۱۶۳۔ خصائص أمير المؤمنين علي بن أبي طالب: لأبي عبد الرحمن أحمد بن شعيب النسائي (۳۰۳ھ)، ت: أحمد ميرين البلوشي، ط: مكتبة المعلا—الكويت، الأولى، ۱۴۰۶ھ، جزء واحد

۱۶۴۔ الخِطَط المَقرِيزية = المواعظ والاعتبار بذكر الخِطَط والآثار: لتقي الدين المقريزي وهو أبو العباس أحمد بن علي بن عبد القادر، الحسيني، الشافعي، (المتوفى: ۸۴۵ھ)، ط: دار الكتب العلمية، بيروت، الأولى، ۱۴۱۸ھ، ۴ أجزاء

۱۶۵۔ خلاصة الذهب المسبوك: لبدر الدين، أبي محمد عبد الرحمن بن إبراهيم، الشهير بالإربلي (۷۱۶ھ)، ط: مكتبة المثنى—بغداد، ط: [إنما هي نسخة قديمة جدا إلا أنها طُبعت بعد ۱۸۸۵ھ على ما يظهر من أوائل الكتاب]، جزء واحد

۱۶۶۔ خلاصة تذهيب تهذيب الكمال في أسماء الرجال: لصفي الدين أحمد بن عبد الله اليمني، (بعد ۹۲۳ھ)، ت: عبد الفتاح أبو غدة، ط: مكتب المطبوعات الإسلامية/دار البشائر - حلب /بيروت، الخامسة، ۱۴۱۶ھ، جزء واحد

۱۶۷۔ خلاصة سير سيد البشر: لأبي العباس، أحمد بن عبد الله بن محمد، محب الدين الطبري (المتوفى: ۶۹۴ھ)، ت: طلال بن جميل الرفاعي، ط: مكتبة نزار مصطفى الباز - مكة المكرمة—السعودية، الأولى، ۱۴۱۸ھ۔ ۱۹۹۷م، جزء واحد

۱۶۸۔ الخليفة المهدي في الأحاديث الصحيحة: للسيد حسين أحمد المدني، ت: حبيب الرحمن القاسمي، ط: عالمي مجلس تحفظ ختم نبوت—ملتان، دون طبعة وتاريخ، جزء واحد

د

....دائرة المعارف الإسلامية: انظر: موجز دائرة المعارف الإسلامية

۱۷۹۔ دَرّ السحابة في مناقب القرابة والصحابة: لمحمد بن علي الشوكاني الصنعاني (۱۲۵۰ھ)، ت: د. حسين بن عبد الله العمري، ط: دار الفكر — دمشق — سورية، الأولى، ۱۴۰۴ھ، جزء واحد

۱۸۰۔ الدر المنثور في طبقات ربات الخدور: لزينب بنت علي بن حسين ابن يوسف فواز العاملي (المتوفاة: ۱۳۳۲ھ)، ط: المطبعة الكبرى الأميرية - مصر، الأولى، ۱۳۱۲ھ، جزء واحد

۱۸۱۔ الدعاء للطبراني: لأبي القاسم سليمان بن أحمد الشامي، الطبراني (المتوفى: ۳۶۰ھ)، ت: مصطفى عبد القادر عطا، ط: دار الكتب العلمية — بيروت، الأولى، ۱۴۱۳، جزء واحد

۱۸۲۔ الدعوات الكبير: لأحمد بن الحسين الخراساني، أبي بكر البيهقي (المتوفى: ۴۵۸ھ)، ت: بدر بن عبد الله البدر، ط: غراس للنشر والتوزيع — الكويت، الأولى للنسخة الكاملة، ۲۰۰۹م، جزءان

۱۸۳۔ دلائل النبوة: لأحمد بن الحسين بن علي بن موسى الخُسْرَوْجِردي الخراساني، أبي بكر البيهقي (۴۵۸ھ)، ت: د. عبد المعطي قلعجي، ط: دار الكتب العلمية، دار الريان للتراث، الأولى - ۱۴۰۸ھ، ۷ أجزاء

۱۸۴۔ دُوَل الإسلام: لشمس الدين أبي عبد الله محمد بن أحمد بن عثمان الذهبي (۷۴۸ھ)، ت: حسن إسماعيل مَرْوَة، ط: دار صادر بيروت، الأولى، ۱۹۹۹م، جزءان

۱۸۵۔ ديوان الإسلام: لشمس الدين أبو المعالي محمد بن عبد الرحمن بن الغزي (۱۱۶۷ھ)، ت: سيد كسروي حسن، ط: دار الكتب العلمية، بيروت — لبنان، الأولى، ۱۴۱۱ھ، ۴ أجزاء

۱۸۶۔ ديوان الإمام الشافعي: صاحب الديوان: الامام أبو عبد الله محمد بن إدريس الشافعي (۲۰۴ھ) جمع وترتيب وتحقيق: الدكتور صابر القادري، ط: اسلامی کتب خانه کراتشي، الأولى، ۱۴۲۵ھ، جزء واحد

۱۸۷۔ ديوان بشار بن برد: لأبي مُعاذ بشار الملقب بالـمُرَعَّث - بن برد بن يَهْمَنا العُقيلي الطخارستاني (۱۶۷ھ)، ط: لم نجد الكتاب المطبوع فراجعنا نسخةً غير مطبوعة، موفّرة في المكتبة الشاملة.

۱۸۸۔ ديوان عروة بن أُذَينة: لعروة بن يحيى (ولقبه أذينة) بن مالک بن الحارث الليثي المدني (المتوفى نحو ۱۳۰ھ)، ط: دار صادر - بيروت، الأولى، ۱۹۹۶م، جزء واحد

۱۸۹۔ ديوان الصبابة: لابن أبي حَجَلة وهو شهاب الدين أبو العباس أحمد بن يحيى بن أبي بكر التلمساني (المتوفى:

٧٧٦هـ)، ط: دار ومكتبة الهلال- بيروت، ١٤٠٣هـ، جزء واحد

ذ

١٩٠_ ذخائر العقبى في مناقب ذوي القربى: لمحب الدين أحمد بن عبد الله الطبري (٦٩٤هـ)، عُنِيَتْ بنشره: مكتبة القدسي لصاحبها حسام الدين القدسي بباب الخلق بحارة الجداوي بدرب سعادة بالقاهرة -عن نسخة: دار الكتب المصرية، ونسخة الخزانة التيمورية-، عام النشر: ١٣٥٦هـ، جزء واحد

١٩١_ الذرية الطاهرة النبوية: لأبي بشر محمد بن أحمد الدولابي (٣١٠هـ)، ت: سعد المبارك الحسن، ط: الدار السلفية—الكويت، الأولى، ١٤٠٧هـ، جزء واحد

ر

١٩٢_ ربيع الأبرار ونصوص الأخيار: لجار الله الزَمَخشَري وهو أبو القاسممحمود بن عمر الخوارزمي الزمخشري (٥٣٨هـ)، ط: مؤسسة الأعلمي، بيروت، الأولى، ١٤١٢هـ، ٥ أجزاء

١٩٣_ رحلة ابن بطوطة = تحفة النظار في غرائب الأمصار وعجائب الأسفار: لأبي عبد الله، محمد بن عبد الله الطنجي، الشهير بابن بطوطة (٧٧٩هـ)، ط: أكاديمية المملكة المغربية، الرباط، ١٤١٧هـ، ٥ أجزاء

١٩٤_ رحلة ابن جبير: لمحمد بن أحمد بن جبير الكناني الأندلسي (٦١٤هـ)، ط: دار ومكتبة الهلال، بيروت، جزء واحد

١٩٥_ رحمة للعالمين: لمحمد سليمان المنصور فوري (١٣٤٨هـ)، ت: مياں طاهر ط: مركز الحرمين الإسلامي —فيصل آباد—باكستان، ٢٠٠٧م، جزءان

١٩٦_ الرحيق المختوم: لصفي الرحمن المباركفوري (المتوفى: ١٤٢٧هـ)، ط: دار الهلال- بيروت، الأولى، جزء واحد

١٩٧_ الرسائل السياسية: لأبي عثمان عمرو بن بحر الليثي المعتزلي، الشهير بالجاحظ (٢٥٥هـ)، ط: مكتبة الهلال، بيروت، جزء واحد

١٩٨_ رشفة الصادي من بحر فضائل بني النبي الهادي: لأبي بكر بن عبد الرحمن الحسيني الشافعي (١٣٤١هـ)، ت: السيد علي عاشور، ط: دار الكتب العلمية، بيروت، الأولى، ١٤١٨هـ جزء واحد

١٩٩_ روح المعاني في تفسير القرآن العظيم والسبع المثاني: لشهاب الدين محمود بن عبد الله الحسيني الألوسي (١٢٧٠هـ)، ت: علي عبد الباري عطية، ط: دار الكتب العلمية—بيروت، الأولى، ١٤١٥هـ ١٦ جزءا

٢٠٠ـ روض الأخيار المنتخب من ربيع الأبرار: لمحيي الدين، محمد بن قاسم بن يعقوب الأماسي الحنفي، (المتوفى: ٩٤٠هـ)، ط: دار القلم العربي، حلب، الأولى، ١٤٢٣هـ، جزء واحد

٢٠١ـ روض الرياحين في حكايات الصالحين: لأبي محمد عبد الله بن أسعد اليمني اليافعي (٧٦٨هـ)، الناشر: [ما كانت لدي إلا نسخته القديمة جدًا وقد ذهبت منها صفحتها الأولى التي كتب فيها اسم الناشر والطبعة]، جزء واحد

روض الرياحين في حكايا الصالحين: لأبي محمد عبد الله بن أسعد اليمني اليافعي (٧٦٨هـ)، ت: محمد عزت، ط: المكتبة التوفيقية، دون طبعة وتاريخ، جزء واحد

٢٠٢ـ الروض الأنف في شرح السيرة النبوية لابن هشام: لأبي القاسم عبد الرحمن بن عبد الله السهيلي (المتوفى: ٥٨١هـ)، ت: عمر عبد السلام السلامي، ط: دار إحياء التراث العربي، بيروت، الطبعة الأولى، ١٤٢١هـ/ ٢٠٠٠م، ٧أجزاء

٢٠٣ـ الروض المعطار في خبر الأقطار: لأبي عبد الله محمد بن عبد الله الحِمْيَرى (٩٠٠هـ)، ت: إحسان عباس، ط: مؤسسة ناصر للثقافة- بيروت، الثانية، ١٩٨٠م، جزء واحد

٢٠٤ـ الروض النضير شرح مجموع الفقه الكبير: للحسين بن أحمد بن الحسين السياغي، الفقيه الزيدي (١٢٢١هـ)، ط: دار الجيل —بيروت، ٣أجزاء

٢٠٥ـ الرياض النَّضِرة في مناقب العشرة: لأبي العباس، أحمد بن عبد الله، محب الدين الطبري (٦٩٤هـ)، ط: دار الكتب العلمية، الثانية، ٣أجزاء

ز

٢٠٦ـ زاد المسير في علم التفسير: لجمال الدين أبي الفرج عبد الرحمن بن علي الجوزي (٥٩٧هـ)، ت: عبد الرزاق المهدي، ط: دار الكتاب العربي —بيروت، الأولى، ١٤٢٢هـ، ٣أجزاء

٢٠٧ـ زاد المعاد في هدي خير العباد: لشمس الدين محمد بن أبي بكر بن أيوب الشهير بابن قيم الجوزية (٧٥١هـ)، ط: مؤسسة الرسالة- بيروت، السابعة والعشرون، ١٤١٥هـ، ٥أجزاء

٢٠٨ـ زبدة الحلب في تاريخ حلب: لابن العديم وهو كمال الدين عمر بن أحمد العقيلي (المتوفى: ٦٦٠هـ)، تعليق: خليل المنصور، ط: دار الكتب العلمية، بيروت—لبنان، الأولى، ١٤١٧هـ ـ ١٩٩٦م، جزء واحد

٢٠٩ـ الزهد والرقائق لابن المبارك: لأبي عبد الرحمن عبد الله بن المبارك بن واضح المروزي (المتوفى:

۱۸۱ھ)، ت: حبیب الرحمن الأعظمي، ط: دار الكتب العلمية—بيروت، جزء واحد

۲۱۰۔ زهر الآداب وثمر الألباب: لأبي إسحاق القيرواني وهو إبراهيم بن علي بن تميم الأنصاري القيرواني، (المتوفى: ۴۵۳ھ)، ط: دار الجيل، بيروت، ۴أجزاء

۲۱۱۔ زَهْرُ الأَكَمْ في الأمثال والحِكَم: لأبي علي، الحسن بن مسعود بن محمد، نور الدين اليوسي (۱۱۰۲ھ)، ت: د محمد حجي، د محمد الأخضر، ط: الناشر: الشركة الجديدة - دار الثقافة، الدار البيضاء — المغرب، الأولى، ۱۴۰۱ھ، ۳أجزاء

۲۱۲۔ زواج أبي العاص بزينب بنت الربيع: لتقي الدين، أبي محمد، عبد الغني بن عبد الواحد المقدسي الحنبلي (المتوفى: ۶۰۰ھ)، ط: مخطوط نُشر في برنامج جوامع الكلم المجاني التابع لموقع الشبكة الإسلامية، الأولى،]. ۲۰۰۴ أما نحن فحصلنا على هذا المخطوط من المكتبة الشاملة في ذيل مجموعتها "مخطوطات حديثية".]

۲۱۳۔ زوجات النبي محمد وأسرار الحكمة في تعددهن: لإبراهيم محمد حسن الجمل، ط: دار التوفيق النموذجية —الأزهر—مصر، الثانية، جزء واحد

س

۲۱۴۔ سر السلسلة العلوية في أنساب السادة العلوية: لأبي نصر سهل بن عبد الله البخاري (كان حيا سنة ۳۴۱ھ)، تقديم وتعليق: محمد صادق بحر العلوم، ط: المكتبة الحيدرية—النجف، ۱۳۸۱ھ، جزء واحد

۲۱۵۔ سلسلة الأحاديث الصحيحة وشيء من فقهها وفوائدها: للألباني وهو أبو عبد الرحمن محمد ناصر الدين، بن الحاج نوح بن نجاتي بن آدم، الأشقودري الألباني (المتوفى: ۱۴۲۰ھ)، ط: مكتبة المعارف للنشر والتوزيع، الرياض، الأولى، ۶أجزاء

۲۱۶۔ السمط الثمين في مناقب أمهات المؤمنين: المؤلف: لأبي جعفر محب الدين أحمد بن عبد الله، الطبري (۶۹۴ھ)، ت: علي أحمد الطهطاوي، ط: دار الكتب العلمية—بيروت، الأولى ۱۴۲۶ھ، جزء واحد

۲۱۷۔ سمط النجوم العوالي في أنباء الأوائل والتوالي: لعبد الملك بن حسين بن عبد الملك العصامي المكي (۱۱۱۱ھ)، ت: عادل أحمد عبد الموجود-علي محمد معوض، ط: دار الكتب العلمية—بيروت، الأولى، ۱۴۱۹ھ، ۴أجزاء

۲۱۸۔ السنة لابن أبي العاصم: وهو أبو بكر أحمد بن عمرو بن الضحاك بن مخلد الشيباني (المتوفى: ۲۸۷ھ)،

ت: محمد ناصر الدين الألباني، ط: المكتب الإسلامي—بيروت، الأولى، ١٤٠٠م، جزءان

٢١٩ـ سنن ابن ماجه: لابن ماجه أبي عبد الله محمد بن يزيد القزويني، (٢٧٣هـ)، ت: محمد فؤاد عبد الباقي، ط: دار إحياء الكتب العربية - فيصل عيسى البابي الحلبي، جزءان

٢٢٠ـ سنن أبي داود: لأبي داود سليمان بن الأشعث السِجِستاني (٢٧٥هـ)، ت: محمد محيي الدين عبد الحميد، ط: المكتبة العصرية، صيدا—بيروت، ٤ أجزاء

٢٢١ـ سنن الترمذي: لأبي عيسى محمد بن عيسى بن سَوْرة بن موسى، الترمذي، (٢٧٩هـ)، ت: مجموعة من المحققين، ط: شركة مكتبة ومطبعة مصطفى البابي الحلبي—مصر، الثانية، ١٣٩٥، ٥ أجزاء

٢٢٢ـ السنن الكبرى: للنسائي وهو أبو عبد الرحمن أحمد بن شعيب بن علي الخراساني (المتوفى: ٣٠٣هـ)، ت: حسن عبد المنعم شلبي، ط: مؤسسة الرسالة—بيروت، الأولى، ١٤٢١هـ ـ ٢٠٠١م، ١٢ جزءا

٢٢٣ـ السنن الواردة في الفتن وغوائلها والساعة وأشراطها: لأبي عمرو عثمان بن سعيد الداني (٤٤٤هـ)، ت: د. رضاء الله بن محمد إدريس المباركفوري، ط: دار العاصمة—الرياض، الأولى، ١٤١٦هـ، ٦ أجزاء

٢٢٤ـ سيده فاطمة الزهراء: لأبي ريحان ضياء الرحمن الفاروقي (١٤١٧هـ)، ط: [صفحة اسم المطبع والناشر مفقودة في نسخة لدي]، رسالة وجيزة

٢٢٥ـ سير أعلام النبلاء: لشمس الدين أبي عبد الله محمد بن أحمد بن عثمان بن قَايْماز الذهبي (٧٤٨هـ)، ت: مجموعة من المحققين بإشراف الشيخ شعيب الأرناؤوط، ط: مؤسسة الرسالة، الثالثة، ١٤٠٥هـ، ٢٥ جزءا

٢٢٦ـ سير الصحابة: لمعين الدين الندوي وجماعة من المؤلفين، ط: دار الإشاعت — كراتشي، ٢٠٠٤م، ٩ أجزاء

٢٢٧ـ السيرة النبوية (لابن هشام)/سيرة ابن هشام: لأبي محمد عبد الملك بن هشام المعافري، (٢١٣هـ)، ت: مصطفى السقا وإبراهيم الأبياري وعبد الحفيظ الشلبي، ط: شركة مكتبة ومطبعة مصطفى البابي الحلبي وأولاده بمصر، الثانية، ١٣٧٥هـ، جزءان

٢٢٨ـ السيرة النبوية (من البداية والنهاية لابن كثير): لأبي الفداء إسماعيل بن عمر بن كثير القرشي الدمشقي (٧٧٤هـ)، ت: مصطفى عبد الواحد، ط: دار المعرفة بيروت—لبنان، ١٣٩٥هـ، ٤ أجزاء

٢٢٩ـ السيرة النبوية على ضوء القرآن والسنة (لأبي شُهبة): لمحمد بن محمد بن سويلم أبي شُهبة (المتوفى:

١٤٠٣هـ)، ط: دار القلم—دمشق، الثامنة-١٤٢٧هـ، جزءان

٢٢٩- السيرة النبوية كما جاءت في الأحاديث الصحيحة: لأبي عمر محمد بن حمد الصوياني، ط: مكتبة العبيكان، الأولى، ١٤٢٤هـ-٢٠٠٤م، ٤أجزاء

٢٣١- سيرة ابن إسحاق (كتاب السير والمغازي): لمحمد بن إسحاق بن يسار المدني (١٥١هـ)، ت: سهيل زكار، ط: دار الفكر—بيروت، الأولى ١٣٩٨هـ، جزء واحد

... سيرة الحسن للصلابي - انظر: سيرة أمير المومنين خامس الخلفاء الراشدين الحسن بن علي بن أبي طالب—شخصيته وعصره-

٢٣٢- سير أمهات المؤمنين: لمحمد عبد المعبود، ط: مكتبه رحمانيه—لاهور، دون طبعة وتأريخ، جزء واحد

٢٣٣- سيرة امير المومنين خامس الخلفاء الراشدين الحسن بن علي بن ابي طالب—شخصيته وعصره-: للدكتور علي محمد الصلابي، ط: دار المعرفة—بيروت، العاشرة، ١٤٣٣هـ، جزء واحد

٢٣٤- سيرت سيدنا علي المرتضى: لمحمد نافع، ط: دار الكتاب—لاهور، ٢٠١٣م، جزء واحد

٢٣٥- سيرت عائشه صديقه رضي الله عنها: للسيد سليمان الندوى، ط: شوكت بك ڈپو گجرات، دون طبعة وتاريخ. جزء واحد

٢٣٦- سيرتِ مصطفى صلى الله عليه وسلم: لمحمد إدريس الكاندهلوي (١٣٩٤هـ)، ط: كتب خانه مظهري-كراتشي، ٣أجزاء

٢٣٧- سيرت فاطمة الزهراء رضي الله عنها: لطالب الهاشمي، ط: البدر پبلي كيشنز- لاهور، السابعة عشر، ٢٠٠٥م، جزء واحد

ش

٢٣٨- الشجرة المباركة في أنساب الطالبية: للإمام فخر الدين الرازي الشافعي وهو أبو عبد الله محمد بن عمر بن الحسن التيمي الرازي (المتوفى: ٦٠٦هـ)، ت: السيد مهدي الرجائي، ط: مكتبة آية الله المرعشي، قُم—إيران، الأولى، ١٤٠٩ه، جزء واحد

٢٣٩- شجرة الأشراف: للسيد نفيس الحسيني، (١٤٢٩هـ)، ط: حلقه معارفِ گيسو دراز لاهور، الأولى، ١٤٢٣هـ، جزء واحد

٢٤٠- شذرات الذهب في أخبار من ذهب: لأبي الفلاح عبد الحي بن أحمد العَكري، الشهير بابن العماد الحنبلي،

(١٠٨٩هـ)، ت: محمود الأرناؤوط، ط: دار ابن كثير، دمشق-بيروت، الأولى، ١٤٠٦هـ، ١١ جزءا

... الشذرات الذهبية في تراجم الأئمة الإثني عشر عند الإمامية: انظر: الأئمة الإثناعشر.

٦٤١ـ شرح الزرقاني على المواهب اللدنية بالمنح المحمدية: لأبي عبد الله محمد بن عبد الباقي الزرقاني المالكي (١١٢٢هـ)، ط: دار الكتب العلمية، الأولى ١٤١٧هـ، ١٢ جزءا

٦٤٢ـ شرح السنة: للبغوي وهو محيي السنة، أبو محمد الحسين بن مسعود البغوي الشافعي (المتوفى: ٥١٦هـ)، ت: شعيب الأرنؤوط-محمد زهير الشاويش، ط: المكتب الإسلامي - دمشق، بيروت، الثانية، ١٤٠٣هـ، ١٥ جزءا

٦٤٣ـ شرح الشفا: لأبي الحسن علي بن (سلطان) محمد، الشهير بالملا علي القاري (١٠١٤هـ)، ط: دار الكتب العلمية-بيروت، الأولى، ١٤٢١هـ، جزءان

٦٤٤ـ شرح الصدور بشرح حال الموتى والقبور: المؤلف: لجلال الدين عبد الرحمن بن أبي بكر، السيوطي (٩١١هـ)، ت: عبد المجيد طعمة حلبي، ط: دار المعرفة-لبنان، الأولى، ١٤١٧هـ، جزء واحد

٦٤٥ـ شرح العقائد النسفية: لسعد الدين مسعود بن عمر التفتازاني، (٧٩٣هـ)، ط: قديمي كتب خانه-- كراتشي، جزء واحد

... شرح العقيدة السفارينية: انظر: لوامع الأنوار البهية وسواطع الأسرار الأثرية لشرح الدرة المضية في عقد الفرقة المرضية.

٦٤٦ـ شرح الفقه الأكبر: الماتن (صاحب الفقه الأكبر): الامام الأعظم أبو حنيفة نعمان بن ثابت (١٥٠هـ)، الشارح: علي بن سلطان محمد، الشهير بملا علي القارى (١٠١٤هـ)، ط: مكتبه حقانيه-ملتان، دون طبعة وتاريخ، جزء واحد

٦٤٧ـ شرح النووي على مسلم: لأبي زكريا محيي الدين يحيى بن شرف النووي (٦٧٦هـ)، ط: دار إحياء التراث العربي-بيروت، الثانية، ١٣٩٢هـ، ١٨ جزءا

٦٤٨ـ شرح ديوان الحماسة: للتبريزي وهو أبو زكريا يحيى بن علي التبريزي، (المتوفى: ٥٠٢هـ)، ط: دار القلم-بيروت، جزء واحد

٦٤٩ـ شرح ديوان الحماسة: للمرزوقي وهو أبو علي أحمد بن محمد بن الحسن المرزوقي الأصفهاني (المتوفى: ٤٢١هـ)، ت: غريد الشيخ، ط: دار الكتب العلمية، بيروت-لبنان، الأولى، ١٤٢٤هـ-٢٠٠٣م، جزء

واحد

٢٥٠- شرح صحيح البخاري: لابن بطال وهو أبو الحسن علي بن خلف بن عبد الملك (المتوفى: ٤٤٩هـ)، ت: أبو تميم ياسر بن إبراهيم، ط: دار النشر: مكتبة الرشد - السعودية، الرياض الطبعة: الثانية، ١٤٢٣هـ- ٢٠٠٣م، ١٠ أجزاء

٢٥١- الشرف المؤبد لآل محمد: ليوسف بن إسماعيل بن يوسف النَّبهَاني (١٣٥٠هـ)، ط: مكتبة الثقافة الدينية-القاهرة، الأولى، ١٤٢٨هـ، جزء واحد

٢٥٢- الشريعة: لأبي بكر محمد بن الحسين الآجُرِّيُّ البغدادي (المتوفى: ٣٦٠هـ)، ت: الدكتور عبد الله بن عمر الدميجي، ط: دار الوطن - الرياض / السعودية، الثانية، ١٤٢٠هـ- ١٩٩٩م، ٥ أجزاء

٢٥٣- الشعر والشعراء: لابن قتيبة وهو أبو محمد عبد الله بن مسلم بن قتيبة الدينوري (المتوفى: ٢٧٦هـ)، ط: دار الحديث، القاهرة، ١٤٢٣هـ، جزءان

٢٥٤- الشفا بتعريف حقوق المصطفى: لأبي الفضل القاضي عياض بن موسى اليحصبي (٥٤٤هـ)، الحاشية: أحمد بن محمد بن محمد الشمنى (٨٧٣هـ)، ط: دار الفكر، ١٤٠٩هـ، جزءان

٢٥٥- شفاء الغرام بأخبار البلد الحرام: لتقي الدين، أبي الطيب محمد بن أحمد بن علي، المكي الحسني (المتوفى: ٨٣٢هـ)، ط: دار الكتب العلمية بيروت، الأولى ١٤٢١هـ- ٢٠٠٠م، جزءان

٢٥٦- الشكوى والعتاب وما وقع للخلّان والأصحاب: ينسب إلى الثعالبي وهو أبو منصور عبد الملك بن محمد بن إسماعيل الثعالبي (المتوفى: ٤٢٩هـ)، ت: د. إلهام عبد الوهاب المفتي - كلية التربية الأساسية، قسم اللغة العربية، جامعة الكويت، ط: المجلس الوطني للثقافة والفنون والآداب، الأولى، ١٤٢١هـ- ٢٠٠٠م، جزء واحد

٢٥٧- شهادتِ حسين رضي الله عنه: المرتب: محمد إسحاق الملتاني، ط: اداره تاليفات اشرفيه ملتان، ١٤٣٠هـ، جزء واحد

...شهيد كربلاء: انظر: اسوۂ حسيني يعني شهيد كربلاء

٢٥٨- شهيد كربلاء اور يزيد: لمحمد طيب، القارى، رحمه الله الشهير بحكيم الإسلام، ط: إداره إسلاميات- لاهور- باكستان، دون طبعة وتاريخ، جزء واحد

ص

٢٥٩ـ صبح الأعشى في صناعة الإنشاء: لأحمد بن علي بن أحمد القاهري (٨٢١هـ)، ط: دار الكتب العلمية، بيروت، ١٥جزءا

٢٦٠ـ صحاح الأخبار في نسب السادة الفاطمية الأخيار: لعبيد الله محمد سراج الدين بن عبد الله الرفاعي المخزومي (٨٨٥هـ)، ط: مطبعة محمد أفندي مصطفى [طبعة قديمة جدا]، جزء واحد

٢٦١ـ صحيح الجامع الصغير وزياداته: لأبي عبد الرحمن محمد ناصر الدين، بن الحاج نوح بن نجاتي بن آدم، الأشقودري الألباني (١٤٢٠هـ)، ط: المكتب الإسلامي، جزءان

٢٦٢ـ صحيح مسلم، المسمى بـــ المسند الصحيح المختصر بنقل العدل عن العدل إلى رسول الله صلى الله عليه وسلم: لأبي الحسن مسلم بن الحجاج القشيري النيسابوري (٢٦١هـ)، ت: محمد فؤاد عبد الباقي، ط: دار إحياء التراث العربي —بيروت، ٥ أجزاء

٢٦٣ـ صفة الصفوة: لأبي الفرج عبد الرحمن بن علي الجوزي (٥٩٧هـ)، ت: أحمد بن علي، ط: دار الحديث، القاهرة، ١٤٢١هـ، جزءان

٢٦٤ـ صفة جزيرة العرب: لابن الحائك، وهو أبو محمد الحسن بن أحمد الشهير بالهمداني (المتوفى: ٣٣٤هـ)، ط: مطبعة بريل -ليدن، ١٨٨٤م، جزء واحد

٢٦٥ـ الصواعق المحرقة على أهل الرفض والضلال والزندقة: لشهاب الدين أحمد بن محمد، الشهير بابن حجر الهيتمي (٩٧٣هـ)، ت: عبد الرحمن بن عبد الله التركي - كامل محمد الخراط، ط: مؤسسة الرسالة — لبنان، الأولى، ١٤١٧هـ، جزءان

٢٦٦ـ صور من حياة التابعين: لعبد الرحمن رأفت الباشا (١٤٠٦هـ)، ط: دار الأدب الإسلامي، القاهرة، مصر، السابعة، ٢٠١٠م، جزءان

ط

٢٦٧ـ طائفة الإسماعيلية —تاريخها. نظمها. عقائدها—: لمحمد كامل حسين (أستاذ الأدب بجامعة القاهرة)، ط: مكتبة النهضة المصرية —القاهرة، الأولى، ١٩٥٩م، جزء واحد

٢٦٨ـ طائفة البهرة وتأويلاتها الباطنية لآيات القرآن الكريم: للدكتور سامي عطاء حسن، ط: جامعة آل البيت — المفرق —المملكة الأردنية الهاشمية، رسالة وجيزة

٧٣٩_ الطبقات السنية في تراجم الحنفية: لتقي الدين بن عبد القادر التميمي الداري الغزي المصري الحنفي (المتوفى ١٠١٠ه)، ت: د. عبد الفتاح محمد الحلو، ط: دار الرفاعي، ٣أجزاء

٧٤٠_ الطبقات الكبرى (لابن سعد): لأبي عبد الله محمد بن سعد بن منيع ، البغدادي المعروف بابن سعد (٢٣٠هـ)، ت: محمد عبد القادر عطا، ط: دار الكتب العلمية—بيروت، الأولى، ١٤١٠ه، ٨أجزاء

٧٤١_ الطبقات الكبرى - القسم المتمم لتابعي أهل المدينة ومن بعدهم -: لأبي عبد الله محمد بن سعد بن منيع الهاشمي بالولاء، البصري، البغدادي المعروف بابن سعد (المتوفى: ٢٣٠ه)، ت: زياد محمد منصور، ط: مكتبة العلوم والحكم-المدينة المنورة، الثانية، ١٤٠٨ه، جزء واحد

٧٤٢_ الطبقات الكبرى (للشعراني) = لواقح الأنوار في طبقات الأخيار: لأبي محمد عبد الوهاب بن أحمد بن علي الشعراني (٩٧٣ه)، ت: أحمد عبد الرحيم السايح و توفيق علي وهبة، ط: مكتبة الثقافة الدينية—القاهرة، الأولى، ١٤٢٦هـ، جزءان

٧٤٣_ طبقات الشافعية الكبرى: لتاج الدين عبد الوهاب بن تقي الدين السبكي (٧٧١ه)، ت: د. محمود محمد الطناحي و د. عبد الفتاح محمد الحلو، ط: هجر للطباعة والنشر والتوزيع، الثانية، ١٤١٣ه، ١٠ أجزاء

٧٤٤_ طبقات الصوفية = الكواكب الدرية في تراجم السادة الصوفية = الطبقات الكبرى (للمناوى): لزين الدين محمد عبد الرؤوف المُناوي (١٠٣١ه)، ت: محمد أديب الجادر، ط: دار صادر—بيروت، ٥أجزاء

٧٤٥_ طبقات خليفة بن خياط: لأبي عمرو خليفة بن خياط البصري (المتوفى: ٢٤٠ه)، رواية: أبي عمران موسى بن زكريا بن يحيى التستري (ت ق ٣هـ)، محمد بن أحمد بن محمد الأزدي (ت ق ٣هـ)، ت: د. سهيل زكار، ط: دار الفكر للطباعة والنشر والتوزيع، ١٤١٤هـ_١٩٩٣م، جزء واحد

ع

٧٤٦_ العبر في خبر من غبر: لشمس الدين أبي عبد الله محمد بن أحمد بن عثمان بن قَايْماز الذهبي (٧٤٨ه)، ت: أبو هاجر محمد السعيد بن بسيوني زغلول، ط: دار الكتب العلمية—بيروت، ٤أجزاء

٧٤٧_ عثمان بن عفان ذو النورين: لمحمد رضا المصري (المتوفى: ١٣٦٩ه)، جزء واحد

٧٤٨_ العَجَاجَةُ الزَّرْنَبِيَّةُ فِي السُّلَالَةِ الزَّيْنَبِيَّةِ: هذه الرسالة مطبوعة ضمن "الحاوي للفتاوى" فيرجى أن يلاحظ الحاوي للفتاوى للسيوطي

٧٤٩_ الغدّة في شرح العُمْدة في أحاديث الأحكام: لابن العطار وهو أبو الحسن، علاء الدين علي بن إبراهيم بن داود

(المتوفى: ٩٢٢هـ)، ط: دار البشائر الإسلامية للطباعة والنشر والتوزيع، بيروت – لبنان، الأولى، ١٤٢٧هـ-٢٠٠٦م، ٣أجزاء

٢٨٠- العَرف الوَردِي في أخبار المهدي - ضمن الحاوي للفتاوي - :لعبد الرحمن بن أبي بكر، جلال الدين السيوطي(٩١١هـ)، ط:دار الفكر، بيروت-لبنان، ١٤٢٤هـ، جزءان

٢٨١- عقائد اهل السنة والجماعة: لمحمد طاهر مسعود، تقديم: فضيلة الشيخ سليم الله خان، ط:الميزان - لاهور، ٢٠١٠م، جزءواحد

٢٨٢- العقد الفريد: لأبي عمر، شهاب الدين أحمد بن محمد المعروف بابن عبد ربه الأندلسي (المتوفى: ٣٢٨هـ)، ط: دار الكتب العلمية—بيروت، الأولى، ١٤٠٤هـ، ٨أجزاء

٢٨٣- العقد المفصل في قبيلة المجد المؤثل: لحيدر بن سليمان بن داود الحلي الحسيني (المتوفى: ١٣٠٤هـ)، ط: لم نجد الكتاب المطبوع فراجعنا إلى نسخة، غير مطبوعة، موفرة في المكتبة الشاملة.

٢٨٤- عقد الدرر في أخبار المنتظر وهو المهدي عليه السلام: ليوسف بن يحيى السلمي الشافعي (بعد ٦٥٨هـ)، ت: الشيخ مهيب بن صالح بن عبد الرحمن البوريني، ط: مكتبة المنار، الزرقاء—الأردن، الثانية، ١٤١٠هـ، جزءواحد

٢٨٥- عقيدة أهل السنة والأثر في المهدي المنتظر: لعبد المحسن بن حمد بن عبد المحسن بن عبد الله بن حمد العباد البدر، ط: مجلة الجامعة الإسلامية بالمدينة المنورة، العدد: السنة الأولى، العدد الثالث، ذو القعدة ١٣٨٨هـ/شباط ١٩٦٩م

٢٨٦- علاماتِ قيامت اور نزولِ مسيح: لمحمد رفيع العثماني، ط: مكتبه دار العلوم—كراتشي، ط: ١٤٣١هـ، جزء واحد

٢٨٧- العلل ومعرفة الرجال: لأبي عبد الله أحمد بن محمد بن حنبل الشيباني (المتوفى: ٢٤١هـ)، ت: وصي الله بن محمد عباس، ط: دار الخاني، الرياض، الثانية، ١٤٢٢هـ-٢٠٠١م، ٣أجزاء

٢٨٨- علماء أهل البيت في عصر التابعين... سيرهم— آثارهم: للدكتور أحمد خليل جمعة، ط: دار أضواء البيان— سوريا، الأولى، ١٤٣١هـ، جزءواحد

٢٨٩- علّموا أولادكم محبة آل بيت النبي صلى الله عليه وسلم: للدكتور محمد عبده يماني (١٤٣١هـ)، ط: دار القبلة—جدة، الثانية، ١٤١٢هـ، جزءواحد.

٧٩٠ـ عمدة القاري شرح صحيح البخاري: لأبي محمد محمود بن أحمد الحنفي بدر الدين العيني (٨٥٥هـ)، ط: دار إحياء التراث العربي ــ بيروت، ٢٥ جزءا

٧٩١ـ عمل اليوم والليلة: لأبي عبد الرحمن أحمد بن شعيب الخراساني، النسائي (المتوفى: ٣٠٣هـ)، ت: د. فاروق حمادة، ط: مؤسسة الرسالة ــ بيروت، الثانية، ١٤٠٦ جزء واحد

٧٩٢ـ العواصم من القواصم في تحقيق مواقف الصحابة بعد وفاة النبي صلى الله عليه وسلم: للقاضي محمد بن عبد الله أبي بكر بن العربي المالكي (٥٤٣هـ)، تقديم وتعليق: محب الدين الخطيب رحمه الله، ط: وزارة الشؤون الإسلامية والأوقاف والدعوة والإرشاد - المملكة العربية السعودية، الأولى، ١٤١٩هـ، جزء واحد

٧٩٣ـ عيون الأثر في فنون المغازي والشمائل والسير: لمحمد بن محمد، ابن سيد الناس، اليعمري الربعي (٧٣٤هـ)، تعليق: إبراهيم محمد رمضان، ط: دار القلم ــ بيروت، الأولى، ١٤١٤هـ، جزءان

٧٩٤ـ عيون الأخبار: لأبي محمد عبد الله بن مسلم بن قتيبة الدِّينَوَرِيُّ (٢٧٦هـ)، ط: دار الكتب العلمية ــ بيروت، ١٤١٨هـ، ٤ أجزاء

غ

٧٩٥ـ غاية الاختصار في أخبار البيوتات العلوية المحفوظة من الغبار: المنسوب إلى ابن زهرة الحسيني وهو تاج الدين محمد بن حمزة (٩٢١هـ)، ت: محمد صادق بحر العلوم، ط: المكتبة الحيدرية ــ النجف، ١٣٨٢هـ، جزء واحد

٧٩٥ـ الغاية في شرح الهداية في علم الرواية: للسخاوي وهو شمس الدين أبو الخير محمد بن عبد الرحمن السخاوي (المتوفى: ٩٠٢هـ)، ت: أبو عائش عبد المنعم إبراهيم، ط: مكتبة أولاد الشيخ للتراث، الأولى، ٢٠٠١م، جزء واحد

٧٩٧ـ غاية المقصد في زوائد المسند: لأبي الحسن علي بن أبي بكر الهيثمي (٨٠٧هـ)، ت: خلاف محمود عبد السميع، ط: دار الكتب العلمية، بيروت ــ لبنان، الأولى، ١٤٢١هـ، ٤ أجزاء

٧٩٨ـ الغُصن النَّدِيّ في سيرة الإمام الحسن بن عليّ رضي الله عنهما: لعبد المؤمن أبي العَينَين حفيشة، ط: مبرة الآل والأصحاب ــ الكويت، ٢٠٠٦م، جزء واحد

ف

۲۹۹۔ فاطمة الزهراء البتول: لإبراهيم محمد حسن الجمل، ط: دار الفضيله–القاهرة-مصر، دون طبعة وتأريخ، جزء واحد

۳۰۰۔ فتاوى قاسميه: للمفتي شبير أحمد القاسمي حفظه الله تعالى، ط: مكتبه أشرفيه – ديوبند – الهند، الأولى، ۱۴۳۷ھ، ۲۶ جزءا

۳۰۱۔ فتاوى محموديه: للمفتي محمود حسن الكنكوهي (۱۴۱۷ھ)، ط: إدارة الفاروق- كراتشي، الثانية، ۱۴۲۹ھ، ۲۴ جزءا

۳۰۲۔ فتاوى دار العلوم ديوبند: للمفتي عزيز الرحمان العثماني (۱۳۴۷ھ)، ط: مكتبه إمداديه–ملتان، دون طبعة وتاريخ، ۱۲ جزءا

۳۰۳۔ الفتح الكبير في ضم الزيادة إلى الجامع الصغير: لعبد الرحمن بن أبي بكر، جلال الدين السيوطي (۹۱۱ھ)، ت: يوسف النبهاني، ط: دار الفكر-بيروت/لبنان، الأولى، ۱۴۲۳ھ، ۳ أجزاء

۳۰۴۔ فتح الباري شرح صحيح البخاري (لابن حجر): لأبي الفضل أحمد بن علي، ابن حجر العسقلاني الشافعي (۸۵۲ھ)، ط: دار المعرفة-بيروت، ۱۳۷۹ھ، تعليق: عبد العزيز بن عبد الله بن باز، ۱۳ جزءا

۳۰۵۔ فتح الباري شرح صحيح البخاري (لابن رجب): لزين الدين عبد الرحمن بن أحمد بن رجب بن الحسن، الدمشقي، الحنبلي (۷۹۵ھ)، ت: مجموعة من المحققين، ط: مكتبة الغرباء الأثرية - المدينة النبوية، الأولى، ۱۴۱۷ھ، ۹ أجزاء

۳۰۶۔ فتح المغيث بشرح "الفية الحديث للعراقي": لأبي الخير شمس الدين محمد بن عبد الرحمن السخاوي (۹۰۲ھ)، ط: علي حسين علي، ط: مكتبة السنة–مصر، الأولى، ۱۴۲۴ھ، ۴ أجزاء

۳۰۷۔ فتح الملهم: لفضل الله المدعو بشبير أحمد بن فضل الرحمن العثماني الهندي (۱۳۶۹ھ)، ط: المكتبة الرشيدية–كراتشي، دون طبعة وتاريخ، ۳ أجزاء

۳۰۸۔ الفتن: لأبي عبد الله نُعَيم بن حَمّاد المروزي (۲۲۸ھ)، ت: سمير أمين الزهيري، ط: مكتبة التوحيد –القاهرة، الأولى، ۱۴۱۲ھ، جزءان

۳۰۹۔ الفتنة ووَقْعة الجَمَل: لسيف بن عمر التَمِيمي (۲۰۰ھ)، ت: أحمد راتب عرموش، ط: دار النفائس، السابعة ۱۴۱۳ھ، جزء واحد

٣١٠ـ فتنة مقتل عثمان بن عفان رضي الله عنه: لمحمد بن عبد الله بن عبد القادر الغبان الصبحي، ط: عمادة البحث العلمي بالجامعة الإسلامية، المدينة المنورة، المملكة العربية السعودية، الثانية، ١٤٢٤هـ، جزءان

٣١١ـ الفتوح: لابن أعثم وهو أبو محمد أحمد بن محمد بن علي بن أعثم الكوفي، (المتوفى: نحو ٣١٤هـ)، ت: علي شيري، ط: دار الأضواء، بيروت، الأولى، ١٤١١هـ ـ ١٩٩١م، ٩ أجزاء

٣١٢ـ فتوح البلدان: لأحمد بن يحيى البَلاذُري (٢٧٩هـ)، ط: دار ومكتبة الهلال- بيروت، ١٩٨٨م، جزء واحد

٣١٣ـ الفخري في الآداب السلطانية والدول الإسلامية: لمحمد بن علي بن طباطبا المعروف بابن الطقطقي (المتوفى: ٧٠٩هـ)، ت: عبد القادر محمد مايو، ط: دار القلم العربي، بيروت، الأولى، ١٤١٨هـ ـ ١٩٩٧م، جزء واحد

٣١٤ـ الفخري في أنساب الطالبيين: للإمام عزيز الدين، أبي طالب المَرْوَزِي الحنفي، وهو إسماعيل بن الحسين بن محمد بن الحسين بن أحمد بن محمد بن عزيز بن الحسين بن محمد بن علي بن الحسين بن علي بن محمد بن جعفر الصادق بن محمد الباقر بن علي زين العابدين بن الحسين بن علي بن أبي طالب (المتوفى بعد ٦١٤ه) ، ت: السيد مهدي الرجائي، ط: مكتبة آية الله المرعشي، قُم– إيران، الأولى، ١٤٠٩ه، جزء واحد.

٣١٥ـ الفرائد على مجمع الزوائد ترجمة الرواة الذين لم يعرفهم الحافظ الهيثمي الأبي عبد الله، خليل بن محمد بن عوض الله المطيري العربي، ط: دار الإمام البخاري، الدوحة – قطر، الأولى، ١٤٢٩هـ ـ ٢٠٠٨م، جزء واحد

٣١٦ـ فرائد فوائد الفِكَر في الإمام المهدي المنتظَر: لمَرْعِيّ بن يوسف المَقدِسي الحنبلي (١٠٣٣هـ)، ت: سامي الغريري، ط: دار الكتاب الإسلامي، الأولى، ١٤٢٢هـ، جزء واحد

٣١٧ـ الفرج بعد الشدة: لأبي بكر عبد الله بن محمد القرشي المعروف بابن أبي الدنيا (المتوفى: ٢٨١ه)، خرجه وعلق عليه: أبو حذيفة عبيد الله بن عالية، ط: دار الريان للتراث، مصر، الثانية، ١٤٠٨هـ ـ ١٩٨٨م، جزء واحد

٣١٨ـ فص الخواتم فيما قيل في الولائم: لابن طولون الحنفي وهو شمس الدين محمد بن علي الدمشقي (٩٥٣ه)، ت: نزار أباظه، ط: دار الفكر- دمشق، الأولى، ١٤٠٣ه، جزء واحد

٣١٩ـ الفصول المهمة في معرفة أحوال الأئمة: لعلي بن محمد بن أحمد المالكي المكي الشهير بابن الصَّبَّاغ المالكي (٨٥٥ه)، ط: دار الأضواء– بيروت، الثانية، ١٤٠٩هـ، جزء واحد

٣٢٠۔ الفصول في السيرة: لأبي الفداء إسماعيل بن عمر بن كثير الدمشقي (٧٧٤هـ)، ت: محمد العيد الخطراوي، محيي الدين مستو، ط: مؤسسة علوم القرآن، الثالثة، ١٤٠٣هـ، جزء واحد

٣٢١۔ فضائل حج: لشيخ الحديث محمد زكريا الكاندلوي (١٤٠٢هـ)، ط: كتب خانه فيضي — لاهور، دون طبعة وتاريخ، جزء واحد

٣٢٢۔ فضائل الصحابة (لابن حنبل): لأبي عبد الله أحمد بن محمد بن حنبل الشيباني (٢٤١هـ)، ت: د. وصي الله محمد عباس، ط: مؤسسة الرسالة — بيروت، الأولى، ١٤٠٣ه، جزءان

٣٢٣۔ فضائل الصحابة ومناقبهم وقول بعضهم في بعض صلوات الله عليهم (للدارقطني): لأبي الحسن علي بن عمر الدارقطني (٣٨٥هـ)، اعتنى به: محمد بن خليفة الرباح، ط: مكتبة الغرباء الأثرية، المملكة العربية السعودية، الأولى، ١٤١٩هـ، جزء واحد

٣٢٤۔ فضائلِ صدقات: لمحمد زكريا الكاندلوي (١٤٠٢هـ)، ط: كتب خانه فيضي — لاهور، دون طبعة وتاريخ، جزء واحد

٣٢٥۔ فضل آل البيت: لتقي الدين أبي العباس أحمد بن علي بن عبد القادر المَقرِيزي - السُّنِّي، - (٨٤٥ه)، ت: د. محمد أحمد عاشور، ط: دار الاعتصام، ١٣٩٢ه، جزء واحد

٣٢٦۔ فضل أهل البيت وحقوقهم: لتقي الدين أبي العباس أحمد بن عبد الحليم الحنبلي الدمشقي، الشهير بابن تيمية (٧٢٨هـ)، تعليق: أبو تراب الظاهري، ط: دار القبلة للثقافة الإسلامية - جدة — المملكة العربية السعودية، الأولى، ١٤٠٥هـ، جزء واحد

٣٢٧۔ فضل أهل البيت وعلوّ مكانتهم عند أهل السنة والجماعة: لعبد المحسن بن حمد العباد البدر، ط: دار ابن الأثير — رياض — المملكة العربية السعودية، الأولى ١٤٢٢هـ، جزء واحد

٣٢٨۔ فضل الصلاة على النبي صلى الله عليه وسلم: للقاضي أبي إسحاق إسماعيل بن إسحاق الأزدي (المتوفى: ٢٨٢هـ)، ت: محمد ناصر الدين الألباني، ط: المكتب الإسلامي — بيروت، الثالثة، ١٣٩٧ جزء واحد

٣٢٩۔ الفقيه والمتفقه: للخطيب البغدادي وهو أبو بكر أحمد بن علي بن ثابت (المتوفى: ٤٦٣هـ)، ت: أبو عبد الرحمن عادل بن يوسف الغرازي، ط: دار ابن الجوزي — السعودية، الثانية، ١٤٢١ه، جزءان

٣٣٠۔ فوائد نافعه (سيرتِ حسنين شريفين رضي الله عنهما): لمحمد نافع، ط: دار الكتاب — لاهور، ٢٠٠٥م

٣٣١۔ فيروز اللغات: لفيروز الدين، ط: فريد بكڈپو لميٹڈ دهلي — الهند، ١٩٨٧م، جزء واحد

٣٣٢- فيض القدير شرح الجامع الصغير: لزين الدين محمد المدعو بعبد الرؤوف بن تاج العارفين بن علي بن زين العابدين الحدادي ثم المناوي القاهري (المتوفى: ١٠٣١ هـ)، ط: المكتبة التجارية الكبرى – مصر، الأولى، ١٣٥٦ه، ٦ أجزاء

ق

٣٣٣- القاموس المحيط: لمجد الدين أبي طاهر محمد بن يعقوب الفيروزآبادى (٨١٧هـ)، ت: مكتب تحقيق التراث في مؤسسة الرسالة، ط: مؤسسة الرسالة، بيروت–لبنان، الثامنة، ١٤٢٦ هـ، جزء واحد

٣٣٤- القاموس الوحيد: لوحيد الزمان القاسمي الكيرانوي (١٤١٥ه)، تقديم: عميد الزمان القاسمي، ط: إداره إسلاميات، لاهور–باكستان، الأولى، ١٤٢٢ه، جزء واحد

٣٣٥- قصص الأنبياء: لأبي الفداء إسماعيل بن عمر بن كثير الدمشقي (المتوفى: ٧٧٤هـ)، ت: مصطفى عبد الواحد، ط: مطبعة دار التأليف – القاهرة، الأولى، ١٣٨٨هـ-١٩٦٨م، جزءان

٣٣٦- قوت القلوب في معاملة المحبوب ووصف طريق المريد إلى مقام التوحيد: لأبي طالب محمد بن علي بن عطية الحارثي، المكي (المتوفى: ٣٨٦هـ)، ت: د. عاصم إبراهيم الكيالي، ط: دار الكتب العلمية - بيروت / لبنان، الثانية، ١٤٢٦هـ-٢٠٠٥م، جزءان

٣٣٧- القول المختصر في علامات المهدي المنتظر: لشيخ الإسلام، أبي العباس أحمد بن محمد بن علي بن حجر الهيتمي (٩٧٤هـ)، ت: مصطفى العاشور، ط: مكتبة القرآن، بولاق، القاهرة، دون طبعة وتاريخ، جزء واحد

ك

٣٣٨- الكاشف في معرفة من له رواية في الكتب الستة: لشمس الدين أبي عبد الله محمد بن أحمد الذهبي (٧٤٨هـ)، ت: محمد عوامة أحمد محمد نمر الخطيب، ط: دار القبلة للثقافة الإسلامية - مؤسسة علوم القرآن، جدة، الأولى، ١٤١٣هـ، جزءان

٣٣٩- الكامل في التاريخ: لأبي الحسن علي بن أبي الكرم محمد، الشهير بابن الأثير الجزري (٦٣٠هـ)، ت: عمر عبد السلام تدمري، ط: دار الكتاب العربي، بيروت، لبنان، الأولى، ١٤١٧هـ، ١٠ أجزاء

٣٤٠- الكامل في اللغة والأدب: للمبرد وهو أبو العباس محمد بن يزيد بن عبد الأكبر الثمالى الأزدي، (المتوفى: ٢٨٥هـ)، ت: محمد أبو الفضل إبراهيم، ط: دار الفكر العربي – القاهرة، الثالثة ١٤١٧هـ-١٩٩٧م، ٤ أجزاء

٦٤١۔ كشف المشكل من حديث الصحيحين: لابن الجوزي وهو جمال الدين أبو الفرج عبد الرحمن بن علي بن محمد الجوزي (المتوفى: ٥٩٧هـ)، ت: علي حسين البواب، ط: دار الوطن — الرياض، ٤ أجزاء

٦٤٢۔ الكشكول: لبهاء الدين محمد بن حسين بن عبد الصمد الحارثي العاملي الهمذاني، (المتوفى: ١٠٣١هـ)، ت: محمد عبد الكريم النمري، ط: دار الكتب العلمية، بيروت — لبنان، الأولى، ١٤١٨هـ - ١٩٩٨م، جزءان

٦٤٣۔ كنز العمال في سنن الأقوال والأفعال: لعلاء الدين علي بن حسام الدين الهندي الشهير بالمتقي الهندي (٩٧٥ هـ)، ت: بكري حياني - صفوة السقا، ط: مؤسسة الرسالة، الخامسة، ١٤٠١هـ، ١٦ جزءا

٦٤٤۔ الكنى والأسماء: للدولابي وهو أبو بِشر محمد بن أحمد الأنصاري الدولابي (المتوفى: ٣١٠هـ)، ت: أبو قتيبة نظر محمد الفاريابي، ط: دار ابن حزم - بيروت/لبنان، الأولى، ١٤٢١هـ - ٢٠٠٠م، ٣ أجزاء

٦٤٥۔ الكنى والأسماء: لمسلم بن الحجاج أبي الحسن القشيري النيسابوري (المتوفى: ٢٦١هـ)، ت: عبد الرحيم محمد أحمد القشقري، ط: عمادة البحث العلمي بالجامعة الإسلامية، المدينة المنورة، المملكة العربية السعودية، الأولى، ١٤٠٤هـ/١٩٨٤م، جزءان

ل

٦٤٦۔ لباب الأنساب والألقاب والأعقاب: لأبي الحسن ظهير الدين علي بن زيد البيهقي، الشهير بابن فندمه (المتوفى: ٥٦٥هـ) (بترقيم الشاملة)

٦٤٧۔ لسان العرب: لمحمد بن مكرم بن على، أبي الفضل، الشهير بابن منظور الإفريقي (٧١١هـ)، ط: دار صادر — بيروت، الثالثة، ١٤١٤هـ، ١٥ جزءا

٦٤٨۔ اللطائف الأحمدية في المناقب الفاطمية: المؤلف: مولانا سيد احمد حسن سنبهلى رحمہ اللہ خليفه حضرت حكيم الامت تهانوى رحمہ اللہ الناشر: دار النفائس كريم پارک راوى روڈ لاهور، جزء واحد

٦٤٩۔ لوامع الأنوار البهية وسواطع الأسرار الأثرية لشرح الدرة المضية في عقد الفرقة المرضية [المعروف بـ شرح العقيدة السفارينية]: لشمس الدين، أبي العون محمد بن أحمد بن سالم السفاريني الحنبلي (١١٨٨ هـ)، ط: مؤسسة الخافقين ومكتبتها — دمشق، الثانية، ١٤٠٢هـ، جزءان

م

۳۵۰۔ مآثر الإنافة في معالم الخلافة: لأحمد بن علي بن أحمد الفزاري القلقشندي ثم القاهري (المتوفى: ۸۲۱هـ)، ت: عبد الستار أحمد فراج، ط: مطبعة حكومة الكويت—الكويت، الثانية، ۱۹۸۵م، ۳جزءا

۳۵۱۔ المتفق والمفترق: لأبي بكر أحمد بن علي بن ثابت الخطيب البغدادي (۴۶۳هـ)، ت: الدكتور محمد صادق آيدن الحامدي، ط: دار القادري، دمشق، الأولى، ۱۴۱۷هـ، ۳أجزاء

۳۵۲۔ مثير الغرام الساكن إلى أشرف الأماكن: لجمال الدين أبي الفرج عبد الرحمن بن علي بن محمد الشهير بابن الجوزي (۵۹۷هـ)، ت: د/مصطفى محمد حسين الذهبي، ط: دار الحديث، القاهرة، الأولى، ۱۴۱۵هـ، جزء واحد

۳۵۳۔ مجمع الآداب في معجم الألقاب: لكمال الدين أبي الفضل عبد الرزاق بن أحمد المعروف بابن الفوطي الشيباني الحنبلي (۷۲۳هـ)، ت: محمد الكاظم، ط: مؤسسة الطباعة والنشر - وزارة الثقافة والإرشاد الإسلامي، إيران، الأولى، ۱۴۱۶هـ، ۶أجزاء

۳۵۴۔ مجمع بحار الأنوار في غرائب التنزيل ولطائف الأخبار: لجمال الدين، محمد طاهر بن علي الصديقي الهندي الفَتَّنِي الكجراتي الشهير بطاهر الفَتَّنِي (۹۸۶هـ)، ط: مطبعة مجلس دائرة المعارف العثمانية، الثالثة، ۱۳۸۷هـ، ۵أجزاء

۳۵۵۔ مجمع الزوائد ومنبع الفوائد: لأبي الحسن نور الدين علي بن أبي بكر بن سليمان الهيثمي (۸۰۷هـ)، ت: حسام الدين القدسي، ط: مكتبة القدسي، القاهرة، ۱۴۱۴هـ، ۱۰أجزاء

۳۵۶۔ المجموع اللفيف: لأبي جعفر أمين الدولة محمد بن محمد بن هبة الله العلوي الحسيني (المتوفى: بعد ۵۵۱هـ)، ط: دار الغرب الإسلامي، بيروت، الأولى، ۱۴۲۵هـ، جزء واحد

۳۵۷۔ محاضرات الأدباء ومحاورات الشعراء والبلغاء: لأبي القاسم الحسين بن محمد المعروف بالراغب الأصفهاني (۵۰۲هـ)، ط: شركة دار الأرقم بيروت، الأولى، ۱۴۲۰هـ، جزءان

۳۵۸۔ المحبـــر: لمحمد بن حبيب، أبي جعفر البغدادي (۲۴۵هـ)، ت: إيلزة ليختن شتيتر، ط: دار الآفاق الجديدة، بيروت، جزء واحد

... المحرر الوجيز في تفسير الكتاب العزيز: انظر: تفسير ابن عطية

۳۵۹۔ مختصر التحفة الاثني عشرية: المؤلف بالفارسية: الشاه عبد العزيز الدهلوي (۱۲۳۹ه)، اختصره وهذبه

بالعربية: محمود شكري الألوسي، ت: محب الدين الخطيب، ط: المكتبة السلفية-القاهرة، جزء واحد

٣٦٠- مختصر أخبار الخلفاء: لأبي طالب، تاج الدين علي بن أنجب بن عثمان، الشهير بابن الساعي (٦٧٤هـ)، ط: المطبعة الأميرية، بولاق، مصر، الأولى، ١٣٠٩هـ، جزء واحد

٣٦١- مختصر "تاريخ دمشق لابن عساكر": لجمال الدين أبي الفضل، محمد بن مكرم، الشهير بابن منظور الإفريقي (٧١١هـ)، ت: مجموعة من المحققين، ط: دار الفكر، دمشق—سوريا، الأولى، ١٤٠٢ه، ٢٩ جزءا

٣٦٢- المختصر في أخبار البشر: لأبي الفداء عماد الدين إسماعيل بن علي (٧٣٢هـ)، ط: المطبعة الحسينية المصرية، الأولى، ٤ أجزاء

٣٦٣- مختصر كتاب الموافقة بين أهل البيت والصحابة: للحافظ إسماعيل بن علي بن الحسن الشهير بابن زَنجويه الرازي (٤٤٥ه)، واختصره: جار الله الزمخشري (٥٣٨ه)، ت: السيد يوسف أحمد، ط: دار الكتب العلمية—بيروت، الأولى، ١٤٢٠ه، جزء واحد

٣٦٤- مرآة الجنان وعبرة اليقظان في معرفة ما يعتبر من حوادث الزمان: لأبي محمد عفيف الدين عبد الله بن أسعد بن علي بن سليمان اليافعي (٧٦٨هـ)، وضع حواشيه: خليل المنصور، ط: دار الكتب العلمية، بيروت—لبنان، الأولى، ١٤١٧هـ، ٤ أجزاء

٣٦٥- مراصد الاطلاع على أسماء الأمكنة والبقاع: لصفي الدين عبد المؤمن بن عبد الحق، ابن شمائل البغدادي، الحنبلي، (٧٣٩هـ)، ط: دار الجيل، بيروت، الأولى، ١٤١٢ه، ٣ أجزاء

٣٦٦- مرج البحرين في ذكر شهادة الحسنين: لمحمد عبد الرب بن عبد الخالق الحنفي القادري الدهلوي، ط: [ما كانت لديّ إلا نسخته القديمة جدًا ولم أعثر على اسم أية مكتبة ومطبعة عليه]، جزء واحد

٣٦٧- مرقاة المفاتيح شرح مشكاة المصابيح: لعلي بن سلطان محمد، أبي الحسن نور الدين الملا الهروي القاري (١٠١٤هـ)، ط: دار الفكر، بيروت—لبنان، الأولى، ١٤٢٢ه، ٩ أجزاء

٣٦٨- مروج الذهب ومعادن الجوهر: لأبي الحسن علي بن الحسين بن علي، المسعودي المعتزلي (٣٤٦ه)، اعتنى به وراجعه: كمال حسن مرعي، ط: المكتبة العصرية، صيدا-بيروت، الأولى، ١٤٢٥ه، ٤ أجزاء

٣٦٩- المستدرك على الصحيحين: لأبي عبد الله الحاكم محمد بن عبد الله النيسابوري المعروف بابن البيع (405هـ)، ت: مصطفى عبد القادر عطا، ط: دار الكتب العلمية—بيروت، الأولى، ١٤١١ه، ٤ أجزاء

۳۷۰- المستطرف في كل فن مستظرف: لأبي الفتح شهاب الدين محمد بن أحمد الأبشيهي (۸۵۲هـ)، ط: عالم الكتب—بيروت، الأولى، ۱۴۱۹هـ، جزء واحد

۳۷۱- مستعذب الإخبار بأطيب الأخبار: لأبي مدين بن أحمد بن محمد الفاسي (المتوفى: بعد ۱۱۳۲هـ)، ط: دار الكتب العلمية—بيروت، الأولى- ۱۴۲۵هـ/۲۰۰۴م، جزء واحد

۳۷۲- مسند ابن الجعد: لعلي بن الجَعْد بن عبيد الجَوْهَري البغدادي (المتوفى: ۲۳۰هـ)، ت: عامر أحمد حيدر، ط: مؤسسة نادر—بيروت، الأولى، ۱۹۹۰-۱۴۱۰، جزء واحد

۳۷۳- مسند أبي حنيفة—رواية أبي نعيم-: لأبي نعيم أحمد بن عبد الله الأصبهاني (المتوفى: ۴۳۰هـ)، ت: نظر محمد الفاريابي، ط: مكتبة الكوثر—الرياض، الأولى، ۱۴۱۵هـ، جزء واحد

۳۷۴- مسند أبي داود الطيالسي: لأبي داود سليمان بن داود بن الجارود الطيالسي البصري (۲۰۴هـ)، ت: الدكتور محمد بن عبد المحسن التركي، ط: دار هجر—مصر، الأولى، ۱۴۱۹هـ، ۴ أجزاء

۳۷۵- مسند أبي يعلى: لأبي يعلى أحمد بن علي التميمي، الموصلي (۳۰۷هـ)، ت: حسين سليم أسد، ط: دار المأمون للتراث—دمشق، الأولى، ۱۴۰۴هـ، ۱۳ جزءا

۳۷۶- مسند إسحاق بن راهويه: لأبي يعقوب إسحاق بن إبراهيم المروزي المعروف بـ ابن راهويه (المتوفى: ۲۳۸هـ)، ت: د. عبد الغفور بن عبد الحق البلوشي، ط: مكتبة الإيمان - المدينة المنورة، الأولى، ۱۹۹۱-۱۴۱۲، ۵ أجزاء

۳۷۷- مسند الإمام أحمد بن حنبل: لأبي عبد الله أحمد بن محمد بن حنبل بن هلال بن أسد الشيباني (۲۴۱هـ)، ت: شعيب الأرنؤوط وآخرون، ط: مؤسسة الرسالة، الأولى، ۱۴۲۱هـ، ۴۵ جزءا

۳۷۸- مسند الإمام زيد بن علي: للإمام زيد بن علي بن الحسين بن أبي طالب، (۱۲۲هـ)، جمعه: عبد العزيز بن إسحاق البغدادي، ط: دار الكتب العلمية—بيروت، جزء واحد

۳۷۹- مسند البزار المنشور باسم البحر الزخار: لأبي بكر أحمد بن عمرو العتكي المعروف بالبزار (۲۹۲هـ)، ت: مجموعة من المحققين، ط: مكتبة العلوم والحكم - المدينة المنورة، الأولى، ۱۸ جزءا

۳۸۰- مسند الرُّوياني: لأبي بكر محمد بن هارون الرُّوياني (۳۰۷هـ)، ت: أيمن علي، ط: مؤسسة قرطبة القاهرة، الأولى، ۱۴۱۶هـ، جزءان

۳۸۱- مسند فاطمة الزهراء رضي الله عنها: لجلال الدين عبد الرحمن بن أبي بكر السيوطي (۹۱۱هـ)، ت: الحافظ

عزيز بيک الهندي، ط: لجنة أنوار المعارف-حيدر آباد-الهند، الأولى، ١٤٠٦ه، جزء واحد

٣٨٢ـ مشارق الأنوار على صحاح الآثار: لأبي الفضل عياض بن موسى السبتي، الشهير بالقاضي عِياض (٥٤٤هـ)، ط: المكتبة العتيقة ودار التراث، جزءان

٣٨٣ـ مشاهير علماء الأمصار وأعلام فقهاء الأقطار: لأبي حاتم محمد بن حبان الدارمي، البستي (المتوفى: ٣٥٤ هـ)، ت: مرزوق على ابراهيم، ط: دار الوفاء للطباعة والنشر والتوزيع - المنصورة، الأولى ١٤١١هـ - ١٩٩١م، جزء واحد

٣٨٤ـ المشرب الوَردي في مذهب المهدي / رسالة في المهدي، (مخطوط): لأبي الحسن علي بن سلطان محمد، الشهير بالملا علي القاري (١٠١٤هـ)، محل المخطوط: مركز إحياء التراث الإسلامي، قُم، تاريخ النسخ: ربيع الثاني، ١٤١٨ه، رقم القلم: ١٣٢١ عدد الصفحات: ٣٣ جزء واحد

٣٨٥ـ مشكاة المصابيح: لمحمد بن عبد الله الخطيب العمري، أبي عبد الله، الشهير بالخطيب التبريزي (٧٤١هـ)، ت: محمد ناصر الدين الألباني، ط: المكتب الإسلامي-بيروت، الثالثة ١٩٨٥م، ٣ أجزاء

٣٨٦ـ المصابيح من أخبار المصطفىٰ والمرتضىٰ والأئمة من وُلدهما الميامين الأطهار: لأبي العباس أحمد بن إبراهيم، الحسني، الفقيه الزيدي (٣٥٣ه)، ت: عبد الله بن عبدالله الحوثي، ط: مكتبة الإمام زيد بن علي، صنعاء-اليمن- الثانية، ١٤٢٣ه، جزء واحد

٣٨٧ـ مصارع العشاق: لأبي محمد جعفر بن أحمد بن الحسين السراج القاري البغدادي، (المتوفى: ٥٠٠هـ)، ط: دار صادر، بيروت، جزءان

٣٨٨ـ المصباح المضي في كتاب النبي الأمي ورسله إلى ملوك الأرض من عربي وعجمي: لمحمد (أو عبد الله) بن علي بن أحمد الأنصاري، أبي عبد الله، جمال الدين ابن حديدة (المتوفى: ٧٨٣ هـ)، ت: محمد عظيم الدين، ط: عالم الكتب-بيروت، جزءان

٣٨٩ـ المصنف (لعبد الرزاق): لأبي بكر عبد الرزاق بن همام الصنعاني (٢١١هـ)، ت: حبيب الرحمن الأعظمي، ط: المكتب الإسلامي-بيروت، الثانية، ١٤٠٣ه، ١١ جزءا

٣٩٠ـ المصنف في الأحاديث والآثار (لابن أبي شيبة): لأبي بكر بن أبي شيبة، عبد الله بن محمد بن إبراهيم العبسي (٢٣٥هـ)، ت: كمال يوسف الحوت، ط: مكتبة الرشد-الرياض، الأولى، ١٤٠٩ه، ٧ أجزاء

٣٩١ـ مطالب السَّؤول في مناقب آل الرسول: لكمال الدين محمد بن طلحة بن محمد الشافعي (٦٥٢هـ)،

ط: مؤسسة البلاغ، دون طبعة وتاريخ، جزء واحد

۳۹۲ـ مظاهر حق: لمحمد قطب الدين خان الدهلوي (۱۲۸۹ھ)، ط: دار الإشاعت – كراتشي، ۲۰۰۲م، ۵ أجزاء

۳۹۳ـ المعارف: لأبي محمد عبد الله بن مسلم الدينوري الشهير بابن قتيبة (المتوفى: ۲۷۶ھـ)، ت: ثروت عكاشة، ط: الهيئة المصرية العامة للكتاب-القاهرة، الثانية، ۱۹۹۲م، جزء واحد

۳۹۴ـ معارف الحديث: لمنظور احمد النعماني (۱۴۲۴ھ)، ط: دار الاشاعت—كراتشي، ۲۰۰۷م، ۸ أجزاء

۳۹۵ـ معارف القرآن: لمحمد ادريس الكاندلوي (۱۳۹۴ھ)، ط: مكتبة المعارف دار العلوم الحسينية شهداد پور سند—باكستان، الثانية، ۱۴۳۳هـ، ۸ أجزاء

۳۹۶ـ معارف القرآن: لمحمد شفيع العثماني، (۱۳۹۶هـ)، ط: إدارة المعارف، كراتشي—باكستان، ۱۴۲۳ه، ۸ أجزاء

۳۹۷ـ المعالم الأثيرة في السنة والسيرة: لمحمد بن محمد حسن شُرَّاب، ط: دار القلم، الدار الشامية - دمشق- بيروت، الأولى- ۱۴۱۱هـ، جزء واحد

۳۹۸ـ المعجم الأوسط: لأبي القاسم سليمان بن أحمد، الطبراني (۳۶۰هـ)، ت: طارق بن عوض الله بن محمد و عبد المحسن بن إبراهيم الحسيني، ط: دار الحرمين—القاهرة، ۱۰ أجزاء

۳۹۹ـ المعجم الكبير: لسليمان بن أحمد الشامي، أبي القاسم الطبراني (۳۶۰هـ)، ت: حمدي بن عبد المجيد السلفي، ط: مكتبة ابن تيمية—القاهرة، الثانية، ۲۵ جزءا

۴۰۰ـ معجم البلدان: لشهاب الدين ياقوت بن عبد الله الرومي الحموي (۶۲۶هـ)، ط: دار صادر، بيروت، الثانية، ۱۹۹۵م، ۷ أجزاء

۴۰۱ـ معجم الأدباء = إرشاد الأريب إلى معرفة الأديب: لشهاب الدين أبي عبد الله ياقوت بن عبد الله الرومي الحموي (المتوفى: ۶۲۶هـ)، ت: إحسان عباس، ط: دار الغرب الإسلامي، بيروت، الأولى، ۱۴۱۴هـ-۱۹۹۳م، ۷ أجزاء

۴۰۲ـ معجم الشعراء: للإمام أبي عبيد الله محمد بن عمران المرزباني (المتوفى: ۳۸۴هـ)، تصحيح وتعليق: الأستاذ الدكتور ف. كرنكو، ط: مكتبة القدسي، دار الكتب العلمية، بيروت—لبنان، الثانية، ۱۴۰۲هـ- ۱۹۸۲م، جزء واحد

٤٠٣- معجم قبائل العرب القديمة والحديثة: لابن كحالة وهو عمر بن رضا بن محمد راغب بن عبد الغني كحالة الدمشق (المتوفى: ١٤٠٨هـ)، ط: مؤسسة الرسالة، بيروت، السابعة، ١٤١٤هـ-١٩٩٤م، ٥ أجزاء

٤٠٤- معجم ما استعجم من أسماء البلاد والمواضع: لأبي عبيد عبد الله بن عبد العزيز بن محمد البكري الأندلسي (المتوفى: ٤٨٧هـ)، ط: عالم الكتب، بيروت، الثالثة، ١٤٠٣هـ، ٤ أجزاء

٤٠٥- معجم المَعالِم الجُغرافية في السيرة النبوية: لعاتق بن غيث بن زوير البلادي الحربي (المتوفى: ١٠١٠هـ)، ط: دار مكة للنشر والتوزيع، مكة المكرمة، الأولى، ١٤٠٢هـ-١٩٨٢م، جزء واحد

٤٠٦- معجم المفسرين "من صدر الإسلام وحتى العصر الحاضر": لعادل نويهض، تقديم: مُفتي الجمهورية اللبنانية الشَيخ حسن خالد، ط: مؤسسة نويهض الثقافية للتأليف والترجمة والنشر، بيروت—لبنان، الثالثة، ١٤٠٩هـ-١٩٨٨م، جزءان

٤٠٧- معجم المؤلفين: لعمر بن رضا بن محمد راغب بن عبد الغني كحالة الدمشق (المتوفى: ١٤٠٨هـ)، ط: مكتبة المثنى- بيروت، دار إحياء التراث العربي بيروت، ١٣ جزءا

٤٠٨- معرفة الصحابة: لابن مَنْدَه وهو أبو عبد الله محمد بن إسحاق بن محمد بن يحيى بن مَنْدَه العبدي (المتوفى: ٣٩٥هـ)، حققه وقدم له وعلق عليه: عامر حسن صبري، ط: مطبوعات جامعة الإمارات العربية المتحدة، الأولى، ١٤٢٦هـ-٢٠٠٥م، جزء واحد

٤٠٩- معرفة الصحابة: لأبي نُعَيم أحمد بن عبد الله الأصبهاني (٤٣٠هـ)، ت: عادل بن يوسف العزازي، ط: دار الوطن للنشر، الرياض، الأولى، ١٤١٩هـ، ٧ أجزاء

٤١٠- المعرفة والتاريخ: لأبي يوسف يعقوب بن سفيان بن جوان الفارسي الفسوي، (المتوفى: ٢٧٧هـ)، ت: أكرم ضياء العمري، ط: مؤسسة الرسالة، بيروت، الثانية، ١٤٠١-١٩٨١م، ٣ أجزاء

٤١١- المغني عن حمل الأسفار في الأسفار، في تخريج ما في الإحياء من الأخبار (مطبوع بهامش إحياء علوم الدين): لأبي الفضل زين الدين عبد الرحيم بن الحسين العراقي (٨٠٦هـ)، ط: دار ابن حزم، بيروت — لبنان، الأولى، ١٤٢٦هـ، جزء واحد

... مفاتيح الغيب: انظر: تفسير الرازي

٤١٢- مَقاتِل الطالبيين: لأبي الفرج الأصبهاني وهو علي بن الحسين بن محمد القرشي الأصبهاني الشيعي، (المتوفى: ٣٥٦هـ)، ت: السيد أحمد صقر، ط: دار المعرفة، بيروت، جزء واحد

٤١٣- المقتطف من أزاهر الطرف: لأبي الحسن علي بن موسى بن سعيد المغربي الأندلسي (المتوفى: ٦٨٥ هـ)، ط: شركة أمل، القاهرة، ١٤٢٥هـ، جزء واحد

٤١٤- المقتنى في سرد الكنى: لشمس الدين أبي عبد الله محمد بن أحمد الذهبي (المتوفى: ٧٤٨هـ)، ت: محمد صالح عبد العزيز المراد، ط: المجلس العلمي بالجامعة الإسلامية، المدينة المنورة، المملكة العربية السعودية، الأولى، ١٤٠٨هـ، جزءان

٤١٥- مكان رأس الحسين: لأبي العباس أحمد بن عبد الحليم الشهير بشيخ الإسلام ابن تيمية الحنبلي (٧٢٨هـ)، ت: أبو يعلى محمد أيمن الشَّبراوي، ط: دار الجيل — بيروت، الأولى، ١٤١٧هـ، رسالة وجيزة

٤١٦- الملل والنحل: لأبي الفتح محمد بن عبد الكريم الشهرستاني الشافعي (٥٤٨هـ)، ط: مؤسسة الحلبي، ٣ أجزاء

٤١٧- الممتع في صنعة الشعر: لعبد الكريم النهشلي القيرواني، ت: الدكتور محمد زغلول سلام، ط: منشأة المعارف، الإسكندرية - جمهورية مصر العربية، جزء واحد

٤١٨- المنار المنيف في الصحيح والضعيف: لمحمد بن أبي بكر، الشهير بابن قيم الجوزية (٧٥١هـ)، ت: عبد الفتاح أبو غدة، ط: مكتبة المطبوعات الإسلامية، حلب، الأولى، ١٣٩٠هـ، جزء واحد

٤١٩- المنازل والديار: لأبي المظفر أسامة بن مرشد ابن منقذ الكناني الكلبي الشيزري (٥٨٤هـ)، ت: مصطفى حجازي، ط: دار سعاد الصباح - مصر، الأولى، جزء واحد

٤٢٠- مناقب الأسد الغالب مُمزق الكتائب ومُظهر العجائب ليث بن غالب أمير المؤمنين أبي الحسن علي بن أبي طالب رضي الله عنه: لشمس الدين أبي الخير ابن الجزري، محمد بن محمد بن يوسف (٨٣٣هـ)، ت: طارق الطنطاوي، ط:: مكتبة القرآن، الأولى ١٩٩٤م، جزء واحد

٤٢١- مناقب الإمام الأعظم: لحافظ الدين محمد بن محمد المعروف بابن البزاز الكَرْدَري (٨٢٧هـ)، ط: مجلس دائرة المعارف النظامية — حيدر آباد دكن — الهند، الأولى، ١٣٢١هـ، جزء واحد

٤٢٢- مناقب الإمام الأعظم أبي حنيفة: لأبي المؤيد الإمام الموفَّق بن أحمد بن محمد المكي (٥٦٨هـ)، ط: مجلس دائرة المعارف النظامية — حيدر آباد دكن — الهند، الأولى، ١٣٢١هـ، جزء واحد

٤٢٣- مناقب الإمام الشافعي: لمحمد بن الحسين بن إبراهيم السجستاني، الشهير بأبي الحسن الآبري (٣٦٣هـ)، ت: د/جمال عزون، ط: الدار الأثرية، الأولى ١٤٣٠هـ، جزء واحد

۶۲۴۔ مناقب أمير المؤمنين علي بن أبي طالب رضي الله عنه: لابن المغازلي وهو أبو الحسن علي بن محمد الواسطي المالكي (المتوفى: ۴۸۳ هـ)، ت: أبو عبد الرحمن تركي بن عبد الله الوادعي، ط: دار الآثار – صنعاء، الأولى ۱۴۲۴ھ۔۲۰۰۳م، جزء واحد

۶۲۵۔ المنتخب من ذيل المذيل: لأبي جعفر محمد بن جرير الطبري (۳۱۰ھ)، ط: مؤسسة الأعلمي للمطبوعات -بيروت، جزء واحد

۶۲۶۔ المنتظم في تاريخ الأمم والملوك: لجمال الدين أبي الفرج عبد الرحمن بن علي بن محمد الجوزي (۵۹۷ هـ)، ت: محمد عبد القادر عطا، مصطفى عبد القادر عطا، ط: دار الكتب العلمية، بيروت، الأولى، ۱۴۱۲ھ، ۱۹ جزءا

۶۲۷۔ المنتقى شرح الموطإ: لأبي الوليد سليمان بن خلف الأندلسي الشهير بالباجي (۴۷۴ھ)، ط: مطبعة السعادة -بجوار محافظة مصر، الأولى، ۱۳۳۲ھ، 7 أجزاء

۶۲۸۔ المنجد في الأعلام: لِلُويس مَعْلُوف اليَسوعي (۱۳۶۵ هـ)، ط: منشورات ذوي القربى، الثانية، ۱۴۲۳ هـ، جزء واحد

... المنهاج شرح صحيح مسلم بن الحجاج: انظر: شرح النووي على مسلم

۶۲۹۔ منهاج السنة النبوية في نقض كلام الشيعة القدرية: لأبي العباس تقي الدين أحمد بن عبد الحليم، الشهير بابن تيمية الحنبلي (۷۲۸ھ)، ت: محمد رشاد سالم، ط: جامعة الإمام محمد بن سعود الإسلامية، الأولى، ۱۴۰۶ھ، ۹ أجزاء

۶۳۰۔ المنهل الروي في مختصر علوم الحديث النبوي: لأبي عبد الله محمد بن إبراهيم بن سعد الله بن جماعة الكناني الحموي الشافعي (المتوفى: ۷۳۳ھ)، ت: د. محيي الدين عبد الرحمن رمضان، ط: دار الفكر – دمشق، الثانية، ۱۴۰۶ھ، جزء واحد

... المواعظ والاعتبار بذكر الخطط والآثار: ينظر: الخطط المقريزية

۶۳۱۔ المواهب اللدنية بالمنح المحمدية: لأبي العباس أحمد بن محمد المصري، الشهير بالقسطلاني (۹۲۳ هـ)، ط: المكتبة التوفيقية - القاهرة - مصر، ۳ أجزاء

۶۳۲۔ موجز دائرة المعارف الإسلامية: تحرير: م. ت. هوتسما، ت. و. أرنولد، ر. باسيت، ر. هارتمان، المراجعة والإشراف: أ. د. حسن حبشي، أ. د. عبد الرحمن عبد الله الشيخ، أ. د. محمد عناني، ط: مركز الشارقة

للإبداع الفكري، الأولى، ۱۴۱۸ھ، ۳۳جزءا

۴۳۳۔موسوعة آل بيت النبي صلى الله عليه وسلم: للدكتور مجدى محمد سرور باسلوم، و سميرة جميل مسكى، ط: دار الكتب العلمية-بيروت، الأولى، ۲۰۱۱م، جزءان

۴۳۴۔موسوعة أقوال الإمام أحمد بن حنبل في رجال الحديث وعلله: جمع وترتيب: السيد أبو المعاطي النوري - أحمد عبد الرزاق عيد-محمود محمد خليل، ط: عالم الكتب، الأولى، ۱۴۱۷ھ-۱۹۹۷م، ۴أجزاء

۴۳۵۔الموطأ: للإمام مالك بن أنس الأصبحي المدني (۱۷۹ھ)، ت: محمد مصطفى الأعظمي، ط: مؤسسة زايد بن سلطان آل نهيان للأعمال الخيرية والإنسانية-أبو ظبي-الإمارات، الأولى، ۱۴۲۵ھ، ۸أجزاء

۴۳۶۔ موعظة المؤمنين من إحياء علوم الدين: لمحمد جمال الدين بن محمد سعيد بن قاسم الحلاق القاسمي (المتوفى: ۱۳۳۲ھ)، ت: مأمون بن محيي الدين الجنان، ط: دار الكتب العلمية، ۱۴۱۵ھ-۱۹۹۵م، جزءواحد

۴۳۷۔المهدي: لأبي أسامة عادل زكي، ط: دار ابن حزم-بيروت-لبنان، الأولى، ۱۴۲۶ھ، جزءواحد

۴۳۸۔ المهدي المنتظر في ضوء الأحاديث والآثار الصحيحة: للدكتور عبد العليم عبد العظيم البستوي، ط: المكتبة المكية، حي الهجرة، مكة المكرمة، الأولى، ۱۴۲۰ھ، جزءواحد

۴۳۹۔ميزان الاعتدال في نقد الرجال: لشمس الدين أبي عبد الله محمد بن أحمد الذهبي (المتوفى: ۷۴۸ھ)، ت: علي محمد البجاوي، ط: دار المعرفة للطباعة والنشر، بيروت-لبنان، الأولى، ۱۳۸۲ھ-۱۹۶۳م، ۴ أجزاء

ن

۴۴۰۔ النبراس شرح شرح العقائد النسفية: لمحمد عبد العزيز الفرهاري، ط: مكتبه حقانيه-ملتان، دون طبعة وتاريخ، جزءواحد

۴۴۱۔ نثر الدر في المحاضرات: لأبي سعد منصور بن الحسين الرازي، الشهير بالآبي (۴۲۱ھ)، ت: خالد عبد الغني محفوظ، ط: دار الكتب العلمية-بيروت/لبنان، الأولى، ۱۴۲۴ھ، ۷أجزاء

۴۴۲۔النجوم الزاهرة في ملوك مصر والقاهرة: لأبي المحاسن يوسف بن تغري بردي بن عبد الله الظاهري الحنفي (۸۷۴ھ)، ط: وزارة الثقافة والإرشاد القومي، دار الكتب، مصر، ۱۶ جزءا

۴۴۳۔ نزل الأبرار بما صح من مناقب أهل البيت الأطهار: لمحمد بن معتمد خان البدخشاني الحارثي (السني)،

(المتوفى بعد ١١٢٦ه)، ت: د. محمد هادي الأميني، ط: مكتبة الإمام أمير المومنين علي - اصفهان، الأولى، ١٤٠٣ه، جزء واحد

٢٤٤۔ نزهة الأبصار بطرائف الأخبار والأشعار: لابن درهم وهو عبد الرحمن بن عبد الله بن أحمد بن درهم (المتوفى: ١٣٦٢هـ)، ط: دار العباد—بيروت، إلا أن ترقيم الصفحات حسب "الشاملة" دون الكتاب المطبوع لعدم وجدانه.

٢٤٥۔ نزهة الألباب في الألقاب: لأبي الفضل أحمد بن علي بن محمد بن أحمد بن حجر العسقلاني (المتوفى: ٨٥٢هـ)، ت: عبد العزيز محمد بن صالح السديري، ط: مكتبة الرشد — الرياض، ط: الأولى، ١٤٠٩هـ-١٩٨٩م، جزءان

٢٤٦۔ نساء أهل البيت في ضوء القرآن والحديث: للدكتور أحمد خليل جمعة، ط: دار اليمامة—دمشق، الأولى، ١٤١٥ه، جزء واحد

٢٤٧۔ نساء حول الرسول: لـمحمد برهان، دون طبعة وتاريخ، جزء واحد

٢٤٨۔ نساء مبشرات بالجنة: للدكتور أحمد خليل جمعة، ط: دار ابن كثير — دمشق، السادسة، ١٤٣٣ه، جزء واحد

٢٤٩۔ نسب قريش: لـمصعب بن عبد الله الزبيري (٢٣٦هـ) ت: ليفي بروفنسال، ط: دار المعارف، القاهرة، الثالثة، جزء واحد

٢٥٠۔ النسب والمصاهرة بين أهل البيت والصحابة: للسيد علاء الدين شمس الدين المدرس (بعد ١٤٢٠ه)، ط: دار الأمل—أربد—الأردن، الأولى، ١٤٢١ه، جزء واحد

٢٥١۔ نوادر الفقه: لمحمد رفيع العثماني، ط: مكتبه دار العلوم كراتشي، ١٤٢٥ه، جزءان

٢٥٢۔ نور الأبصار في مناقب آل بيت النبي المختار: لـمومن بن حسن الشِبْلَنجي الشافعي (بعد ١٣٠٨ هـ)، ط: المكتبة العصرية—بيروت، ١٤٢٦ هـ، جزء واحد

٢٥٣۔ نور اليقين في سيرة سيد المرسلين: لمحمد بن عفيفي الباجوري، المعروف بالشيخ الخضري (المتوفى: ١٣٤٥هـ)، ط: الناشر: دار الفيحاء—دمشق، الطبعة: الثانية- ١٤٢٥هـ، جزء واحد

٢٥٤۔ النهاية في غريب الحديث والأثر: لمجد الدين أبي السعادات المبارك بن محمد الشيباني، الشهير بابن الأثير الجزري (٦٠٦ هـ)، ت: طاهر أحمد الزاوى - محمود محمد الطناحي، ط: المكتبة العلمية -

بيروت، ١٣٩٩هـ، ٥أجزاء

٤٥٥۔ النهاية في الفتن والملاحم: لأبي الفداء إسماعيل بن عمر بن كثير الدمشقي (٧٧٤هـ)، ت: محمد أحمد عبد العزيز، ط: دار الجيل، بيروت–لبنان، ١٤٠٨هـ، جزءان

٤٥٦۔ نهاية الأَرَب في فنون الأدَب: لأحمد بن عبد الوهاب البكري، شهاب الدين النويري (٧٣٣هـ)، ط: دار الكتب والوثائق القومية، القاهرة، الأولى، ١٤٢٣هـ، ٣٣جزءا

٤٥٧۔ نهاية الأرب في معرفة أنساب العرب: لأبي العباس أحمد بن علي القلقشندي (المتوفى: ٨٢١هـ)، ت: إبراهيم الإبياري، ط: دار الكتاب اللبنانين، بيروت، الثانية، ١٤٠٠هـ-١٩٨٠م، جزء واحد

٤٥٨۔ نهاية الإيجاز في سيرة ساكن الحجاز: لرفاعة رافع بن بدوي بن علي الطهطاوي (المتوفى: ١٢٩٠هـ)، ط: دار الذخائر–القاهرة، الأولى- ١٤١٩هـ، جزء واحد

٤٥٩۔ نهر الذهب في تاريخ حلب: لكامل بن حسين الحلبي، الشهير بالغزي (١٣٥١هـ)، ط: دار القلم–حلب، الثانية، ١٤١٩هـ، ٣أجزاء

ه

٤٦٠۔ همارى بادشاهى / مختصر تاريخ اسلام: لعبد السلام الندوي (المتوفى ١٩٧٩م)، تقديم: السيد سليمان الندوي، ط: الميزان للطباعة والنشر- لاهور، ٢٠٠٣م، جزء واحد

و

٤٦١۔ الوافي بالوفيات: لصلاح الدين خليل بن أيبک بن عبد الله الصَفَدِي (٧٦٤هـ)، ت: أحمد الأرناؤوط وتركي مصطفى، ط: دار إحياء التراث–بيروت، ١٤٢٠هـ، ٢٩ جزءا

٤٦٢۔ وفاء الوفاء بأخبار دار المصطفى: لأبي الحسن نور الدين علي بن عبد الله الشافعي، السَمْهُودِي (٩١١هـ)، ط: دار الكتب العلمية–بيروت، الأولى ١٤١٩هـ، ٤أجزاء

٤٦٣۔ وَفَيات الأعيان وأنباء أبناء الزمان: لأبي العباس شمس الدين أحمد بن محمد البرمكي الإربلي، الشهير بابن خَلِّكان (٦٨١هـ)، ت: إحسان عباس، ط: دار صادر–بيروت، 7أجزاء

ي

٤٦٤۔ اليواقيت الغالية في تحقيق وتخريج الأحاديث العالية: إفادات: محمد يونس الجونبوري، ترتيب وتهذيب: محمد أيوب السورتي، ط: مجلس دعوة الحق–إنجلترا (انگلينڈ)، الثانية، ١٤٣٠هـ، ٤أجزاء